سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
بازی گر
PDFBOOKSFREE.PK
تیسرا حصہ

راوی : بابو زماں خاں
تحریر: شکیل عادل زادہ

ضرور سونیا نے مجھے پہچان لیا تھا مگر اُس نے منہ کیوں چھپا لیا؟ ڈبے میں داخل ہوتے وقت مجھے دیکھ کے وہ پیٹھ کر کے بیٹھ گئی تھی۔ ہم لوگوں نے کھانا کھایا، ماما جان کے لیے بستر لگایا۔ اس تمام عرصے وہ سر جھکائے ایک کونے میں سکڑی سمٹی بیٹھی رہی۔ مجھے دیکھتے ہی اُسے سلام کرنا چاہیے تھا۔ شاید میں بھی یہی کرتا، اگر پہلی نظر میں اُسے پہچان لیتا۔ جیل میں اُسے میں بلاناغہ پڑھانے جاتا تھا۔ جیلر صاحب مجھے اس قدر پسند کرنے لگے تھے کہ انھوں نے مجھ سے سونیا کو پڑھائی میں مدد دینے کی خواہش ظاہر کی۔ اِس میں میرا بھی بھلا تھا۔ ہر روز دو ایک گھنٹے اُسے پڑھا کے میں واپس سلاخوں کے پیچھے آجاتا تھا۔ اُس وقت وہ ایف اے کے پہلے سال میں تھی اور میں بی اے کے پہلے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ ایف اے میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئی، میں نے بھی بی اے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ وہ بہت سنجیدہ، متین اور حسین تھی۔ ہم دونوں میں تعلیمی موضوعات کے سوا دوسری باتیں کم ہی ہوتی تھیں۔ میں جب دوپہر کو وہاں جاتا تو وہ کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہوتی۔ واپس آنے لگتا تو دروازے تک مجھے چھوڑنے آتی۔ اُس کا سونا رنگ کچھ اور نکھر گیا تھا اور چہرے پر پہلے سے زیادہ سنجیدگی نظر آتی تھی۔ مجھے خوب یاد تھا، شروع شروع میں وہ مجھ سے میرے بارے میں طرح طرح کے سوال کرتی تھی، میرے کتنے بھائی بہن ہیں، میرا گھر کہاں ہے؟ اُسے حیرت تھی کہ میں قتل جیسا جرم کیسے کر سکتا ہوں۔ ہو نہ ہو، میں کسی دھوکے میں پکڑا گیا ہوں اور کسی خوف سے میں نے سارا الزام اپنے سر لے لیا ہے۔ کئی بار اُس نے ٹوہ لینے کی کوشش کی، آخر ایسی کیا بات تھی جو میں اس انتہائی اقدام پر مجبور ہو گیا۔ جب وہ یہ سمجھنے لگی کہ ان سوالات کے جوابات میرے پاس نہیں ہیں اور مجھے اُن سے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ محتاط ہو گئی۔ یوں بھی وہ بولتی کم، سوچتی زیادہ تھی، ہر وقت نگاہیں نیچی کیے دھیمے دھیمے مسکراتی رہتی، شرماتی رہتی۔ اُسے کپڑے پہننے کا خوب سلیقہ تھا، بال بہت لمبے تھے۔ اُس کے قریب بیٹھ کے سوندھی سوندھی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ کبھی مجھے ایسا لگتا جیسے میں کنوارے کے سامنے بیٹھا ہوں۔ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ گھر میں کوئی نئی چیز پکی ہوتی تو میرے سامنے لا کے رکھ دیتی۔ جیلر صاحب کے ہاں کھانا کھاتے مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لگتا تھا جیسے سونیا مجھ پہ ترس کھا کے میری تواضع کر رہی ہے۔ میرے انکار پر وہ مضطرب ہو جاتی۔ اُس نے مجھے ناخن تراش، کنگھے، رومال اور چھوٹی موٹی بہت سی چیزیں دی تھیں۔

میں ایم اے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک دن سونیا نے مجھے بتایا کہ جیلر صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے، اب وہ لوگ جلد ہی یہاں سے

چلے جائیں گے۔ یہ خبر سناتے ہوئے سونیا کی آواز بھ[illegible] اُس کی گھنیری پلکوں پر آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں کیا کہہ سکتا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگی "رہا ہونے کے بعد آپ ہمارے گھر آئیں گے؟ آپ سیدھے ہمارے ہی گھر آئیں۔" میں نے اُس کی خاطر ہاں کر دی تھی۔ اُس نے بتایا تھا کہ جیلر صاحب گھر میں اکثر میرا ذکر کرتے ہیں کہتے ہیں جیل سے چھوٹنے کے بعد وہ میرے لیے اعلا ملازمت کی کوشش کریں گے۔ کہتے ہیں دیکھنا، لاڈلا ایک دن نام پیدا کرے گا۔ میں سنتا رہا، پھر جیلر صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور سونیا بھی چلی گئی۔ جیلر صاحب کا گھر جیل کی چار دیواری کے اندر تھا مگر وہ ایک گھر تھا۔ اُن کے جانے کے بعد اُس کے دروازے ہمیشہ کے لیے مجھ پر بند ہو گئے۔ نیا جیلر بہت درشت تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد مجھے کبھی موقع ہی نہ ملا کہ ان لوگوں کے بارے میں کسی سے پوچھتا۔

یہ سونیا ہی تھی۔ وہ نہ ہوتی تو مجھے دیکھ کے اس طرح نہ چونکتی اور یوں منہ نہ چھپاتی۔ کوئی اجنبی لڑکی ایسا نہیں کر سکتی۔ میں اسے ہزاروں میں پہچان سکتا ہوں۔ آتے وقت میرے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنے برسوں بعد سونیا مجھے اس طرح اچانک نظر آجائے گی۔ میں نے اُس وقت بس اُس کی ایک جھلک دیکھی تھی مگر سونیا نے خود مجھ سے بات کیوں نہیں کی میری سمجھ میں اس کا کوئی سبب نہیں آرہا تھا۔ شاید یہ نوجوان ہی اس کا سبب تھا جو اُس کے ساتھ تھا۔ وہ اُس کے سامنے مجھ سے اپنی کسی پرانی واقفیت کا اظہار کرنا نہیں چاہتی ہوگی یا مجھ سے میرے ساتھ آنے والے لوگوں کو دیکھ کے کچھ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ پیرو، زورا قد و قامت میں بہت سے لوگوں میں نمایاں تھے۔ اُن کے لہجے بھی مختلف تھے۔ ممکن ہے اُس نے کچھ اور سوچا ہو۔ سوچا ہو کہ جیل کے آخری سالوں جب وہ وہاں سے جا چکی تھی، میں بدل نہ گیا ہوں۔ اُس نے ایک قیدی کو اپنے گھر دیکھا تھا، ایک آزاد شخص کو نہیں۔ مجھے کھلا دیکھ کے اُس کے دل میں کوئی خوف جاگزیں ہو گیا ہو گا۔ اُسے معلوم تھا کہ میں نے تین قتل کیے ہیں۔ اُس کے باپ جیلر تھے اور جیل کے قیدیوں کے بارے میں وہ اُن سے روز ہی کچھ نہ کچھ سنتی ہوگی بہت سی باتیں ہو سکتی تھیں جو وہ مجھ سے اپنا تعلق ظاہر کرنا نہیں چاہتی ہوگی۔ آدمی پلک جھپکتے بدل جاتا ہے۔ پھر یہاں تو اتنے سال گزرے تھے۔

مجھے بھی پھر اُس سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ نوجوان ضرور اُس کا شوہر ہوگا۔ وہ خوش قسمت تھا جو اُسے سونیا جیسی لڑکی ملی۔ سونے میں تولی جاتی تو بھی اس کی قیمت زیادہ ہوتی۔ میں نے اُسے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اُس وقت بھی اتنی اچھی تھی تو اب [illegible] کی اچھائیوں میں اضافہ ہی ہوا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا [illegible] شادی حال میں ہوئی ہے۔ پتہ نہیں وہ کہاں جا رہی تھی۔ اپنی سسرال، سیر و تفریح کی غرض سے یا اپنے میکے یا کہیں اور —

نوجوان اوسط قد کا ایک صحت مند شخص تھا۔ پڑھا لکھا بھی نظر آتا تھا۔ سونیا کے لیے کوئی پڑھا لکھا لڑکا ہی موزوں ہو سکتا تھا۔ نوجوان کا تعلق کسی بڑے گھر سے ہوگا۔ فرسٹ کلاس میں پیسے والے ہی سفر کر سکتے ہیں۔ میں نے سونیا کو اُس سے باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہوں گے۔ سونیا کے ساتھ کون خوش نہیں رہ سکتا۔ سلیقہ مند وہ شروع سے تھی۔ سارا گھر آئینہ رکھتی تھی۔ اُس کی چھوٹی بہن بِملا اُس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ گھر بگاڑتی تو یہ سنوارتی رہتی تھی۔ سونیا کے لیے نوجوان کو یہ بتا دینے میں کیا حرج تھا کہ میں کبھی جیل میں اُسے پڑھایا کرتا تھا۔ سونیا کو اُس پر اتنا اعتماد ہونا چاہیے تھا۔ بہرحال وہی بہتر سمجھتی ہوگی اچھا ہی ہوا جو اُس نے مجھے نہیں پہچانا۔ اباجان کو بھی پتہ چل جاتا کہ میں نے ایک طویل سزا کاٹی ہے پھر سونیا کو بھی مجھے اپنے بارے میں بہت کچھ بتانا پڑتا۔ یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ میری ہی خاطر خاموش رہی ہو۔

میں نے کروٹ بدل کے اپنی آنکھیں اُس کی جانب سے ہٹا لیں۔ رات کو پھر کسی وقت بے اختیار میں نے نیچے دیکھا تو وہ کھڑکی کی طرف منہ کیے نڈھال بیٹھی تھی، گُم صُم۔ اُسے میری آہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ میں اُسے آنکھیں نیم وا کیے دیکھتا رہا۔ سونیا کی گہری گہری سانسوں کا اندازہ اُس کے سینے کے تموج سے ہو رہا تھا۔ کھڑکی کا آدھا شیشہ کھلا ہوا تھا اور سونیا کے بال اُڑ رہے تھے۔ اُسے کوئی تکلیف تھی۔ وہ تھکی تھکی، بہت اُداس لگ رہی تھی اور یہ دیکھ کے مجھے بہت حیرت ہوئی کہ اُس کے رُخسار بھیگے ہوئے ہیں۔ قمقمے کی مدھم روشنی میں اُس کے آنسو چمک رہے تھے۔ میں نے سوچا، نیچے جا کے اُس سے پوچھوں، اُسے کیا دکھ ہے، اُس کی طبیعت تو خراب نہیں ہے۔ نوجوان سو رہا تھا میں سوچتا ہی رہ گیا۔ میرا نیچے جانا کہیں سونیا کے لیے کسی اُلجھن کا سبب نہ بن جائے۔ میرے لیے خود کو روکنا بہت مشکل ہو گیا تھا لیکن وہ اجنبیت کا رویہ نہ رکھتی تو میں فوراً چلا جاتا۔ کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی تو سونیا کو جیسے ہوش آ[illegible] اُس نے گھبرائے ہوئے انداز میں سر اُٹھا کے میری طرف دیکھ[illegible] میں نے حرکت نہیں کی۔ یوں ہی دم سادھے پڑا رہا۔ سونیا نے اپ[illegible] بدن پر جلدی سے چادر لپیٹی اور کچھ اور سمٹ کے بیٹھ گئی، جیسے اُسے سردی لگ رہی ہو۔ اسٹیشن پر گاڑی چند منٹ کے لیے ٹھیری تھی، دوبارہ چلی تو وہ اُسی نشست سے سر ٹکائے جاگتی رہی۔ اِس دوران کئی بار اُس کی ڈوبی ہوئی بے چین نظریں میری جانب اُٹھیں۔ وہ رات بھر نہیں سوئی۔

ڈبے میں سورج کی روشنی خوب پھیل گئی تو میں اپنی برتھ سے اُٹھا۔ پیرو، زورا اور مارٹی پہلے ہی نیچے آگئے تھے۔ نوجوان بھی جاگ گیا تھا۔ میں نے احتیاط کی تھی کہ سونیا سے نگاہیں چار نہ ہوں جھانسی اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری تو پیرو نے مارٹی کو ناشتے وغیرہ کا انتظام کرنے کی ہدایت کی۔ مارٹی کے ساتھ میں بھی پلیٹ فارم پر چلا آیا۔ کچھ دیر میں اباجان، پیرو اور زورا بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلے آئے۔ سب نے ایک ایک پیالی چائے، باہر اسٹال ہی پر پی لی۔ اباجان نے پوریاں، کچوریاں کھانے سے انکار کر دیا تھا چنانچہ گاڑی کے ساتھ چلنے والے بیرول کو ڈبے میں ناشتہ فراہم کرنے کا آرڈر دے دیا گیا۔ صبح ہونے کے بعد یہ پہلا اسٹیشن آیا تھا اِس لیے گاڑی کے تقریباً آدھے مسافر نیچے اُتر آئے تھے ٹھیلوں اور خوانچے والوں کی صداؤں نے سارا اسٹیشن سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ میں اور مارٹی گاڑی کے اِس سرے سے اُس سرے تک بے مقصد چکر لگاتے رہے۔ مرادآباد میں مولوی صاحب کا پتہ معلوم نہ ہو جاتا تو میں ایک ایک ڈبے میں جھانک کے دیکھتا۔ سفر میں پہلی مرتبہ مجھے مسافروں کے چہرے ٹٹولنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جتنی دیر میں باہر رہا، سونیا کا چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا رہا۔ درمیان میں مارٹی نے نہ جانے کیا کیا باتیں کیں، میں جواب میں بس ہُوں ہاں کرتا رہا۔ مجھے کچھ ایسا شبہ ہو رہا تھا کہ ڈبے میں ہمارے واپس پہنچنے پر وہ دونوں وہاں موجود نہیں ہوں گے۔ سگنل گر گیا تھا۔ میں نے اور مارٹی نے جلدی جلدی اپنے ڈبے تک کا راستہ طے کیا۔

وہ وہیں تھے۔ سونیا اور نوجوان اب ایک ہی برتھ پر قریب قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے آنے پر نوجوان کچھ اُچھل سا گیا۔ اُس کی پھٹی ہوئی آنکھیں یکایک مجھ پر آ کے جم گئی تھیں۔ اُس کی نظروں میں اضطراب بھی تھا، ویرانی بھی تھی۔ سونیا نے ساڑی کا پلّو اپنے سر پہ سرکا لیا تھا اور ترچھی ہو گئی تھی لیکن گھونگٹ کی آڑ سے اُس کا آدھا چہرہ جھانک رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ سونیا نے نوجوان کو میرے بارے میں کچھ بتا دیا ہے۔ اس کے باوجود وہ میری نگاہوں سے اوجھل رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں زورا کے ساتھ خود ایک کونے میں آ کے چپ چاپ بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی چلنے سے پہلے بیرا، ناشتہ رکھ گیا تھا۔

اباجان نے اُن دونوں کو بھی مدعو کیا اور مکھن، ٹوسٹ، آملیٹ وغیرہ کی پلیٹیں اُن کی جانب بڑھا دیں۔ پیرو اور اباجان کے اصرار پر نوجوان نے سپر ڈال دی تاہم اُس نے ایک ٹوسٹ اور ذرا سے آملیٹ کے سوا کچھ نہیں کھایا۔ سونیا نے کچھ بھی نہیں لیا۔ میں نے آتے ہی محسوس کیا تھا کہ نوجوان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ اُس کے سانولے چہرے پر کبھی سرخی نمودار ہو جاتی، کبھی سفیدی جھلکنے لگتی۔ اُس کی حالت کچھ اضطراری سی تھی۔ کبھی وہ سونیا کی طرف دیکھتا، کبھی میری طرف اور کبھی ڈبے میں چاروں طرف نظریں دوڑاتا۔ سونیا البتہ ساکت بیٹھی تھی۔

گاڑی پہاڑی سلسلے میں داخل ہو گئی تھی، کھڑکیوں سے ہری بھری پہاڑیاں نظر آرہی تھیں، ہم تبت کے پہاڑ دیکھ چکے تھے۔ یہ پہاڑ اُن کے مقابلے میں چھوٹے چھوٹے ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔ ناشتے کے بعد نوجوان سرگوشیوں میں سونیا سے چند لمحے باتیں کرتا رہا پھر اباجان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اباجان کے استفسار پر اُس نے بھی اپنی منزل حیدرآباد بتائی اور کہا کہ وہ اپنے ایک عزیز کے ہاں جا رہے ہیں۔ اُس نے اُنھیں بتایا کہ فی الحال وہ دلّی ہی سے سوار ہوئے ہیں۔ میں اُس سے دور تھا۔ گاڑی کے شور کی وجہ سے اس کی ایک آدھ ہی بات سنائی دے جاتی تھی لیکن اس کے لہجے کی بے چینی مجھ سے چھپی نہ رہ سکی۔ اباجان نے بھی اِسے محسوس کیا ہوگا، اتنی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ نوجوان مجھ سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہے۔ اباجان سے باتیں کرتے کرتے وہ چونک کے ایک دم میری طرف دیکھنے لگتا اور اُس کی نظریں سٹ پٹا سی جاتیں۔ میں اُس کی اِس دہشت کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا، آخر سونیا نے اسے میرے بارے میں ایسی کون سی بات بتائی ہے جو وہ اتنا اُلجھا ہوا نظر آرہا ہے۔ بینا اسٹیشن تک زورا اور مارٹی نیچے بیٹھے رہے تھے پھر جب اونگھنے لگے تو اُوپر چلے گئے۔ اُدھر اباجان نے بھی آنکھیں بند کر لی تھیں، بینا اسٹیشن کے بعد نوجوان از خود میری برتھ پر چلا آیا۔ مجھے تعجب ہوا لیکن میں نے اٹھ کے اُس کا استقبال کیا۔ "مجھے …. مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" وہ کسی تمہید کے بغیر سرگوشیانہ لہجے میں جھجکتے ہوئے بولا۔

"مجھ سے؟" میں نے تذبذب سے کہا۔ "میں، میں …."

"مجھے آپ کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔" اُس کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔

"میرے بارے میں!"

"ہاں!" [illegible]

مجھے آپ کو دیکھنے کی آرزو تھی، واقعی جیسا میں نے سنا تھا، آپ ویسے ہی ہیں۔" وہ آدھی انگریزی آدھی ہندوستانی میں بولا۔

میں پلکیں پٹ پٹا کے رہ گیا۔

"سونیا کو آپ پہچان گئے ہوں گے۔"

مجھے جواب دینے میں تامل ہوا۔ "آپ کے ساتھ سونیا ہی ہیں؟"

"وہی ہے۔" وہ گہری سانس لے کے بولا

"مجھے شبہ تو ہوا تھا۔"

"میں آپ سے اسی کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" ایک لمحے توقف سے وہ بولا۔ اس کے ہونٹوں میں لرزش تھی۔

"کیا : کیا؟" میں نے سٹ پٹا کے کہا۔ "میں سن رہا ہوں۔"

"سونیا نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ اس نے بہت پہلے بتا دیا تھا اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر آپ کبھی لوٹ کے آگئے تو میں چلا جاؤں گا۔" وہ بھینچی بھینچی آواز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"بہتر یہی ہے کہ میں کسی لاگ لپیٹ کے بغیر آپ سے بات کروں، میری صاف گوئی آپ کو گراں گزرے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ مجھے آپ اپنا دوست، اپنا بھائی ہی سمجھیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سونیا کو آپ کا بہت انتظار تھا۔"

"میرا انتظار!"

"آپ ہی کا انتظار۔ اور اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کبھی آپ لوٹ آئے تو..." اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"سونیا کی خوشی کے لیے میں اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔ میں نے اسے اپنی زندگی سمجھا ہے۔ وہ بھی مجھے بہت پسند کرتی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ سونیا صرف آپ کو اپنا دیوتا سمجھتی ہے۔"

"مجھے!" میرے کان سن سنانے لگے۔

"شاید آپ کو اس کا اتنا احساس نہ ہو۔ سونیا نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ آپ ایک قیدی تھے، آپ کہہ بھی کیا سکتے تھے۔ اسے آپ کی بہت فکر تھی کہ جیل سے نکلنے کے بعد نہ معلوم آپ کو کیسی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ جیل سے نکلے ہوئے آدمی کو دنیا بہت ستاتی ہے، اچھوت سمجھتی ہے۔ وہ طرح طرح سے سوچتی تھی۔ اسے ایک اور بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں سونیا کا مذہب آپ کو اس کے دروازے پر آنے سے نہ روکتا ہو مگر یقین کیجیے، سونیا صرف آپ کی منتظر تھی۔"

میرا سارا جسم منجمد ہو گیا۔

"وہ مجھ سے بہت قریب رہی ہے، بہت زیادہ۔" وہ تیزی سے بولا۔ "لیکن وہ ویسی ہی آئینہ ہے جس طرح آپ سے جدا ہوئی تھی، آپ وقت پر مل گئے، کچھ دیر سے ملتے تو پتہ نہیں کیا ہوتا۔ شاید میں اپنا وعدہ پھر بھی نبھاتا۔"

میں اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کیا۔

"مجھے خوشی ہے، اب سونیا کو چین آجائے گا۔"

"بس کیجیے۔" میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر اس کی دہکتی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ "اس نے خود کو سدا آپ کی امانت سمجھا ہے۔ وہ روز جاپ کرتی تھی، بھگوان سے آپ کے لیے پرارتھنا کرتی تھی۔"

میرا سر جھن جھنا رہا تھا۔ "معلوم نہیں، آپ.... آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" میں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ کے لیے یہ سب کچھ عجیب ہو سکتا ہے لیکن ہے ایسا ہی جو میں کہہ رہا ہوں، رہی ہے۔" وہ اٹک اٹک کے بولا۔ "یقین کیجیے مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں.... میں، میں۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور حلق تر کر کے بولا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد آپ کے ساتھ زندگی کا کیا برتاؤ رہا اور آپ نے اس سے کیسا سلوک کیا۔ آپ کہاں ہیں، کیا کرتے ہیں، کتنے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے پر یہ سوچنا میرا کام نہیں۔ نہ.... نہ سونیا کا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے لیے دوسری باتیں اتنی اہمیت نہیں رکھتیں جتنی اہمیت صرف آپ رکھتے ہیں، آپ جیسے بھی ہیں، اس کا بھاگیہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سونیا کا آدرش ایسا ویسا نہیں ہوگا۔ آپ اتنے ہی اچھے ہوں گے جتنے اس کے تصور میں رہے ہیں جیسا اس نے آپ کو دیکھا تھا۔ آپ کے لیے اس کی پرارتھنائیں بھگوان نے ضرور سنی ہوں گی۔"

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں مگر وہ خواب نہیں تھا۔ نوجوان میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ سب کچھ خود ہی بولتا رہا۔ مجھے اس نے کچھ نہیں کہنے دیا یا خود میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ میں کسی بت کی طرح بیٹھا سنتا رہا مگر آدمی اتنا ہی سن سکتا ہے جتنا وہ اس کا اہل ہے۔

"آپ.... آپ چپ کیوں ہیں؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"میں، میں کیا کہوں۔" میں نے بدحواسی کے انداز میں کہا۔

"آپ ذرا جا کے سونیا کو دیکھیے تو سہی۔ اس نے رات آپ کو دیکھا تھا۔ نہ جانے یہ رات اس نے کس طرح کاٹی ہوگی۔" میری نظریں غیر ارادی طور پر سونیا کی طرف جھپٹیں، نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن اس کی تڑختی آنکھیں اس مسکراہٹ کی چغلی کھا رہی تھیں۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہا ہے یا اسے میری کوئی آزمائش تو مقصود نہیں ہے۔ اس کی ہندوستانی شستہ اور انگریزی رواں تھی۔ کبھی وہ تیز تیز بولنے لگتا، کبھی اس کی آواز ڈوبنے لگتی۔ میں نے اپنے حواس جمع کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ اباجان کی آنکھ کسی وقت بھی کھل سکتی ہے یا اوپر سے کوئی نیچے آسکتا ہے۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ سراسیمگی سے بولا۔

میں نے سر جھکا لیا۔ میرا سینہ پھٹنے لگا تھا۔

"شاید آپ کے ذہن میں میرے بارے میں سوال گونج رہے ہوں۔ میں کون ہوں اور سونیا سے اپنے کس رشتے، کس حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ میں اس کا کوئی بھی نہیں ہوں اور سب کچھ ہوں۔ شاید اس کے لیے میں کچھ بھی نہیں ہوں، پر وہ میرے لیے سب کچھ ہے۔ میرے لیے وہ ایک دیوی کے مانند ہے، میری بھگوان! اس کے لیے میں ایک دوست، پجاری، ایک ہمدرد سے زیادہ کچھ نہیں۔ دیوی کو اپنے پجاری پر ترس آگیا تھا اس لیے وہ اس پر مہربان ہو گئی مگر اس کے من میں آس اپنے دیوتا ہی کی بندھی تھی۔ سو بھگوان نے اس کی سن لی۔ ہو سکتا ہے، آپ کے دماغ میں یہ بات چبھی ہو کہ رات آپ کو دیکھنے کے باوجود سونیا آپ سے چھپ گئی تھی۔ اس کی جھجک فطری تھی، اتنے عرصے کی تمنا کے بعد اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا ہوگا۔ کسی کو بھی نہیں آسکتا کہ اتنی بڑی خوشی ناگہاں کیسے مل سکتی ہے، جیسے آپ کو بھگوان نے اس کے پاس بھیجا ہے۔ ہمارا کہیں اور جانے کا پروگرام تھا، اچانک حیدرآباد کا ارادہ ہو گیا اور ہم اس گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی بھی وقت پر مل گئی ورنہ ہمیں تو خاصی تاخیر ہو گئی تھی۔ آج ہی سونیا کی دعاؤں کی گھڑی لکھی تھی۔ آپ کو دیکھ کے سونیا ایک اور عذاب سے دوچار ہو گئی ہوگی۔ میں بھی یہاں موجود تھا، اس کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔ اسے میری دیوار کا خیال آگیا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں، میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ اسے میرا اتنا احساس تھا۔ میری بھگتی کا حاصل اتنا ہی ہے تو مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔ رات اس نے مجھے نہیں بتایا تھا، مجھے صبح معلوم ہوا۔ وہ روک رہی تھی مجھے۔ کہہ رہی تھی، بس اپنے تک رکھنا، یہ وہی ہیں۔ نہ جانے مجھے کیا سمجھ کے روک رہی تھی۔ میں آپ کے پاس اس کی اجازت کے بغیر آیا ہوں کیونکہ سونیا کی محرومی میری بھی محرومی ہے۔ رات جس وقت آپ کو اس نے یکایک ڈبے میں داخل ہوتے دیکھا تھا، وہ ایک اور بات سے بھی ہراساں تھی۔ ہم چار دن سے اپنے سائے سے بھی بھاگتے پھر رہے ہیں۔ پولیس ہمارے پیچھے ہے۔"

"پولیس!"

"ہاں!" وہ ٹھنڈی سانس لے کے بولا۔ "لکھنؤ میں ہم تقریباً پکڑے گئے تھے۔ پٹنے میں بھی یہی ہوا، قسمت تھی جو بچتے رہے۔ لکھنؤ میں اتفاق سے ہمیں وقت پر سواری مل گئی اور ہم ان کی نظروں سے دور ہونے میں کامیاب ہو گئے۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں آپ کو کیا بتاؤں۔" وہ پژمردہ لہجے میں بولا۔ "مگر شاید آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔ لمبی کہانی ہے۔ آپ سونیا کے پتا جی کشور بابو سے واقف ہی ہیں، ویسے ہر آدمی کے لیے وہ دل کے بہت اچھے ہیں لیکن میرے اور سونیا کے لیے بہت کٹھور بن گئے تھے۔ ہم نے انہیں منانے کے بہت جتن کیے لیکن وہ مجھ سے کوئی بیر رکھتے تھے۔ وہ پولیس کے ایک بڑے افسر ہیں۔ ان کے پاس عزت ہے، حیثیت ہے۔ میرے پتا جی میرے بچپن ہی میں مجھے چھوڑ گئے تھے۔ ماتا جی نے جیسے تیسے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو پڑھایا ہے۔ چھوٹا بھائی بی اے میں ہے۔ میں ایم اے کے بعد اچھی ملازمت حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کی لیکن اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہے۔ کشور بابو سونیا کے لیے کسی اور طرح کا شخص پسند کرتے تھے۔ کئی جگہ سے بات آئی، بڑے بڑے گھرانوں سے۔ سونیا ہی تیار نہیں ہوتی تھی۔ ہم دونوں بردوان میں ساتھ پڑھتے تھے۔ وہیں میں نے سونیا کو پہلی بار دیکھا تھا مگر اسے دیکھے بنا بھی میں اسے دیکھتا رہا تھا۔ سونیا سے جب ہمت کر کے کچھ کہا تو اس نے اسی وقت مجھے بتا دیا تھا کہ اس کا روم روم کہیں اور بندھا ہوا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ سونیا مجھ سے کنارہ کر لیتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے بوجھتے رہے۔ ہمیں ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین بھی نہیں آتا تھا۔ میں کبھی کالج نہیں جاتا تھا تو وہ مجھے پوچھنے گھر چلی آتی تھی۔ میں نے سونیا سے دوبارہ کبھی کچھ نہیں کہا۔ میں جان گیا تھا کہ میرا کہنا لاحاصل ہے، سونیا اپنی دنیا میں مگن ہے، میں تو اس کی بھگتی کرتا رہا۔ شروع شروع میں جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آپ جیل سے رہا ہو گئے ہیں تو میں آپ کو کلکتے ڈھونڈنے بھی گیا۔ وہاں استاد جبل نامی ایک شخص کے گھر جا کے بھی آپ کو پوچھا، معلوم ہوا کہ آپ وہاں آئے ہی نہیں، ان سب کو آپ کے نہ آنے پر حیرت تھی۔ سونیا کا خیال تھا کہ آپ کے لیے اس کا کھوج لگانا کچھ ایسا مشکل نہیں ہوگا، کشور بابو کے بارے میں آپ کسی سے بھی پوچھ سکتے تھے۔ اسے امید تھی، ایک دن آپ ضرور آئیں گے۔ جتنے دن گزرتے جا رہے تھے، اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔"

"ایک بار پھر میرا کلکتے جانا ہوا، پوچھنے پر کسی نے ٹھیک بات نہیں بتائی۔ اتنا پتہ ضرور چلا کہ آپ آئے تھے اور اب آپ کا کوئی ٹھکانا معلوم نہیں۔ جب بہت دن بیت گئے، سال گزر گئے تو کشور بابو نے آخر اپنا حکم جاری کر دیا۔ اس بیچ کلکتے کے ایک بڑے آدمی کا رشتہ سونیا کے لیے آیا تھا، لڑکا آئی سی ایس ہے۔ کشور بابو نے اس مرتبہ سونیا سے پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی، صاف کہہ دیا کہ اب وہ اُس کی ایک نہیں سُنیں گے۔ باہر لوگ قسم قسم کی باتیں کرتے تھے۔ وہ بھی ٹھیک کہتے تھے۔ سونیا کی ایک چھوٹی بہن بھی جوان تھی۔ سونیا کا بس چلتا تو وہ عمر بھر آپ کی راہ تکتی۔ جب کوئی چارہ نہ رہا تو اُس نے کشور بابو سے میرا نام لیا۔ میرے سوا وہ اور کس کی طرف اشارہ کرتی۔ کشور بابو نے مجھے بلایا اور بُرا بھلا کہہ کے گھر سے نکال دیا۔ انھوں نے دھمکی دی کہ اگر میں پھر کبھی سونیا سے ملا تو میرے حق میں بُرا ہوگا۔ سونیا میری بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ یہ گھر ہی چھوڑ دے گی۔ جہاں اُس کی مرضی نہیں چلتی، اُس گھر میں رہنے سے کیا حاصل۔ سونیا کا بھری دُنیا میں ایک میں ہی سہارا تھا، ہم نے پھر بھی کشور بابو کی بڑی منتیں کیں۔ انھوں نے کان بند کر لیے تھے۔

"گھر سے یوں نکلنا بھی ایسا آسان نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آگے کتنی دشواریاں پیش آ سکتی ہیں، ہم کہاں جائیں گے، کہاں جا کے چھُپیں گے۔ قریب کی کسی جگہ جا بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں اتنی دور چلا جانا چاہیے تھا جہاں ہمیں تلاش کرنے والے ہاتھ پہنچنے کا امکان نہ ہو۔ ہمارے پاس پیسوں کا بھی بندوبست نہیں تھا۔ سونیا گھر سے روپے لینا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ اُس کی اپنی بچت تھی، کچھ پیسے اُس نے اپنی چھوٹی بہن بِمّو سے لیے۔ میں نے ماں کو بتا دیا تھا، اُس نے مجھے منع کیا لیکن میری ضد کے آگے وہ بھی مجبور ہو گئی۔ اُس نے مجھے وہی کپڑے دیے جو میری شادی کے لیے جانے کب سے تیار کر رہی تھی۔ جو کچھ اُس نے بچا رکھا تھا سب میرے حوالے کر دیا۔ دلّی آ کے میں نے روزگار کی تلاش کی۔ یہاں پتا جی کے ایک جگری دوست رہتے تھے، وہ بھی نہیں تھے۔ پتہ چلا کہ وہ حیدرآباد چلے گئے ہیں۔ ویسے ہمارا ارادہ بمبئی جانے کا تھا مگر بمبئی جا کے بھی یہی حالات پیش آتے اس لیے ہم حیدرآباد کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کا سبب یہ ہے کہ پولیس والے اُونچے درجے کے مسافروں کا لحاظ کر لیتے ہیں لیکن اب تو ایسا جان پڑتا ہے جیسے کسی نے ہمیں اِس گاڑی میں بیٹھنے پر اُکسایا تھا اور خاص کر اسی ڈبے میں۔ آپ جو یہاں آنے والے تھے۔" وہ چپ ہو کے مجھے سہمی سہمی نظروں سے دیکھنے لگا پھر رُندھی ہوئی آواز میں بولا "ہم جا رہے تھے اس لیے کہ ہمارے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ آگے جا کے ہمیں کسی جگہ ذرا سا نس لینے پر ایک دوسرا کا موجانا تھا مگر یہ ایک طرح کا دکھاوا ہوتا۔ زمانے کی نگاہوں اور باتوں سے بچنے کے لیے ایک دکھاوا، مجھے اپنے وچن پر قائم رہنا تھا جب تک سونیا خود اُسے توڑنے کو نہ کہہ دیتی۔ وہ جانتی ہے کہ میں ایسا ہی کرتا۔ اِسی بھروسے پر وہ میرے ساتھ آئی تھی۔ میرے لیے یہی کیا کم مان تھا کہ وہ ہر دم، ہر پل میرے ساتھ رہے گی میری آنکھوں کے سامنے۔ آپ یقین کیجیے، بعد میں بھی کبھی آپ کے ملنے پر سونیا کو مجھے میرا وچن یاد دلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ میں خود ہی ہٹ جاتا۔ میں اُس کے سُکھ....."

میں نے اپنا منہ کھسوٹ لیا۔ "بس کرو، بس کرو۔"

وہ ٹھٹک گیا۔ "میں آپ سے....."

"نہیں، نہیں۔" میری آواز جھرجھرا رہی تھی۔ "مجھے یقین ہے تم یہی کرتے مگر میں..... میں۔"

"آپ اُٹھیے تو سہی۔ جا کے اُسے دیکھیے، اُس کی آنکھوں میں جھانک کے دیکھیے، معلوم ہوتا ہے رات بھر وہ روتی رہی ہے۔"

میں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے تنہا چھوڑ دے، مجھ سے کچھ نہ کہے کوئی بات نہ کرے۔ وہ میرے سامنے بیٹھا رہا۔

"اُس پر ایک ایک پل بھاری گزر رہا ہوگا۔" ایک بار جا کے اُسے....."

"نہیں....!" میں نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔

"میں سمجھ سکتا ہوں، آپ اپنی کن اُلجھنوں میں پھنسے ہوں گے۔ میں نے کہا نا، میں نے جان بوجھ کے آپ سے کچھ نہیں پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں، کہاں رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، زنجیریں صرف جیل کے اندر ہی نہیں ہوتیں۔ کوئی ایسی ہی بات ہوگی جو آپ نے لوٹ کے سونیا کی خبر نہیں لی۔ آپ کے ساتھ بھی کچھ وہی حالات ہو سکتے ہیں جو میرے ساتھ رہے ہیں، مجھ سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں پر میرے لیے اور کون سا وقت تھا جسے مناسب سمجھ کے میں آپ سے کچھ کہتا۔ جب تک اُس نے آپ کو دیکھا نہیں تھا، میں سنبھالا دیتا رہا، اب وہ مجھ سے نہیں سنبھلے گی۔ میں آپ سے کیا کہہ رہا ہوں کہ وہ ایک ہی آس پر زندہ رہی ہے۔ وہ آپ سے کچھ زیادہ نہیں مانگے گی۔"

"خدا کے لیے کچھ اور مت کہو۔" میں نے لڑکھڑاتی آواز میں التجا کی۔

"مجھے بتائیے کیا بات ہے؟ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"اب میں تم سے کیا کہوں، مجھ سے کچھ مت پوچھو۔" میں نے آپ سے بنتی کی ہے، مجھے اپنا دوست، اپنا بھائی سمجھیے۔"

"مگر میں تمھیں کیا بتاؤں، تم کچھ نہیں سمجھو گے، نہ میں تمھیں سمجھا سکتا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے، ایسا ہی ہو لیکن سونیا، وہ تو....."

"بس یہ سمجھو کہ میں اُس کے سامنے آنے کے لائق نہیں ہوں۔"

"اطمینان رکھیے، وہ شاید آپ سے زیادہ آپ کو پہچانتی ہے۔"

"مجھ سے اتنی باتیں مت کرو۔"

"پھر میں جا کے اُس سے کیا کہوں؟"

"تم اُس سے..... اُس سے کہو۔" میری زبان بہکنے لگی۔ "میں مر گیا ہوں۔ اُس نے جس شخص کو دیکھا ہے، وہ اُس کی آنکھوں کا دھوکا ہے۔ کچھ بھی کہہ دو، کہہ دو کہ وہ ایک بہت بُرا آدمی ہے اور اُسے اگر مجھے کوئی حکم دینے کا حق ہے تو اُس سے کہہ دو کہ تمھیں اُس کے پاس میں نے بھیجا ہے۔ تم مجھ سے ہر اعتبار سے بہتر ہو، تمھارا دل بہت بڑا ہے۔ تمھارا میرا کوئی مقابلہ نہیں، میں تمھارے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہوں۔ سونیا مجھے بہت عزیز ہے، میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں نے کتنی بار سوچا کہ اُس کے پاس آؤں لیکن مجھے وقت نہیں مل سکا۔ میں جیل سے نکل کے بھی جیل میں ہوں۔ اِس جیل میں اور اُس جیل میں بس تھوڑا سا فرق ہے۔ پنجرا نہ ہو تو پرندے کے پر کاٹ دیے جاتے ہیں۔ آدمی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ اچھا ہوا تم مجھے مل گئے۔ جیلر صاحب کبھی خود ہی تسلیم کر لیں گے کہ تم سے بڑا آدمی سونیا کے لیے کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ تمھیں کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ اور نہیں کر سکتا تو تمھارے اور سونیا کے لیے ایک گھر مہیا کر سکتا ہوں، جہاں کوئی تم تک تمھاری اجازت کے بغیر نہیں پہنچ سکے گا۔ تم چاہو تو سونیا کے لیے اُسے جنت بنا سکتے ہو۔ کہو گے تو میں خود بھی وہیں رہوں گا، میں سونیا سے دُور نہیں رہوں گا۔" میرے منہ میں جو آیا، میں کہتا رہا۔

"آپ..... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "شاید آپ نے میرا کہا دھیان سے نہیں سُنا۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟"

"تمھاری ہر بات میرے دل نے سُنی ہے لیکن اُنھی لوگوں سے کچھ کہنا چاہیے جو کوئی جواب دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں، میں تو خود مت تہی دست ہوں۔"

"آپ اُس سے یہی کچھ خود کہہ دیجیے۔"

"مجھے اُس کے پاس جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

"مجھے آپ سے زیادہ....."

"ٹھہرو! میری بات سنو، شاید وقت مناسب نہیں ہے مگر جو میں اُس سے نہیں کہہ سکتا، تم سے کہہ سکتا ہوں۔ تم حیدرآباد جانے کے بجائے بمبئی چلے جاؤ، تم نے مجھے اپنا بھائی اور دوست کہا ہے تو میں تم سے جو کہہ رہا ہوں اُسے غور سے سُننا، منع مت کرنا۔ تم بمبئی چلے جاؤ، دو تین روز میں مجھے بھی وہاں آ جانا ہے۔ بمبئی جا کے تم کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہر جانا، میں تمھیں کسی گھر کا پتہ بھی دے سکتا تھا لیکن بہتر ہے تم وہاں میرے ساتھ ہی چلو، وہاں ایک گھر نہیں، کئی گھر ہیں اور کئی گھر بن سکتے ہیں۔ وہاں بہت اچھے لوگ ہیں۔ سونیا اُن کے پاس بہت خوش رہے گی۔ وہ ایک طرح سے اپنے ہی گھر جائے گی اور وہاں میں بھی ہوں گا، پھر میں اُس سے کوئی بات کر سکوں گا اور وہ خود سمجھ جائے گی۔ میں ایک بہت ضروری کام سے حیدرآباد جا رہا ہوں ورنہ تمھارے ساتھ ہی چلتا۔"

وہ گم صم نظروں سے مجھے تکتا ہوا تیزی سے اُٹھ گیا اور چند قدم کا فاصلہ طے کر کے سونیا کے پاس بیٹھ گیا۔ سونیا نے یک بارگی سر اُٹھا کے اُسے دیکھا۔ بِمل کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس سے قبل کہ سونیا میری طرف رُخ کرتی، میں نے سر جھکا لیا۔ گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اباجان شاید بہت گہری نیند سو رہے تھے۔ اُوپر زورا، مارٹی اور بیرو کی برتھوں پر بھی خاموشی طاری تھی۔ ڈبے میں صرف گاڑی کا شور تھا اور اس شور کے باوجود ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ چند لمحوں بعد مجھے نوجوان بِمل کی سرگوشیاں سُنائی دیں۔ مجھے یہ بہت عجیب سا لگا کہ وہ میرے متعلق باتیں کر رہا ہے اور میں یہاں بیٹھا ہوں۔ اُسے میرے پاس سے اُٹھے دیر نہیں ہوئی تھی، میں نے خود سونیا کے سامنے جانے کا ارادہ کیا اور اُسی لمحے یک لخت اُٹھ بیٹھا لیکن فرش پر پیر رکھتے ہی میرا دل دھڑ دھڑانے لگا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کے بِمل کھڑا ہو گیا۔ سونیا نے بھی چونک کے میری طرف دیکھا، اُس کی نظروں میں کوئی بجلی تھی کہ میرے جسم پر ٹوٹ کے گری۔ میرے پیر لڑکھڑا گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے یہ فاصلہ کس طرح عبور کیا۔ جب میں اُس کے پاس پہنچا تو میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ میں نے واپس بھاگنا چاہا لیکن میرے پیروں میں بالکل جان نہیں رہی تھی۔ بِمل نے میرے لیے جگہ چھوڑ دی تھی۔ نہ جانے کتنے لمحے ایسے ہی بیت گئے ہوں گے۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی، میں سُن بیٹھا رہا۔ وہ میرے قریب ہی تھی، اتنے قریب کہ میں اُس کے بدن سے اُٹھتی ہوئی خوشبو سونگھ سکتا تھا۔ یہ خوشبو میں خوب پہچانتا تھا۔

"سونیا!" بمل نے میرے بجائے اُسے ٹوکا۔ سونیا کی گھٹری میں لرزش سی ہوئی۔ "دیکھو کون بیٹھا ہے۔"

"ہاں ہیں، میں ظہیر ہوں لاڈلا" میں نے حواس باختگی سے کہا۔

اُس نے جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ مجھ سے اُس کا چہرہ نہ دیکھا جا سکا۔ اُس کے گالوں کا ضہار رنگ جیسے جل رہا تھا۔ آنکھیں انگارا تھیں، پپوٹے سُوجے ہوئے تھے۔ نتھنے اور ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ پھر اُس نے اپنا منہ چھپا لیا۔

"وہاں وہاں سے نکل کے مجھے ایک دن بھی چین نہیں ملا۔" میں نے ڈولتی آواز میں کہنے کی کوشش کی۔ "کتنی ہی بار تمھارا خیال آیا لیکن کچھ ایسی ہی رکاوٹیں تھیں جو میں نہیں آسکا۔ میں تمھیں نہیں بھولا تھا۔ تمھیں کون بھول سکتا ہے، تم اتنی اچھی، اتنی....."

میری زبان لکنت کر رہی تھی۔ "مجھے یقین تھا کہ تم میرے آنے کی توقع کر رہی ہوگی، چلتے وقت میں نے تم سے وعدہ بھی کیا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد ہے، وہاں کی ایک ایک بات، گھر کا سارا نقشہ، یہاں تک کہ دیواروں کا رنگ بھی۔ تمھارے ہاتھ کے کھانوں کا ذائقہ، تمھارے کپڑوں کے رنگ، مجھے سب کچھ یاد ہے۔ اتنے دن ساتھ رہا تھا۔" لفظ میرے منہ میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ نہ جانے میں کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہہ رہا تھا۔ اُس کی سسکاری سُن کے میرے حواس اور منتشر ہو گئے۔ "مت رو، مت رو۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "قسمت نے ہمیں پھر ملا دیا ہے۔ میں اب تمھارے سامنے موجود ہوں۔ سمجھو آج سے سارے دُکھ ختم ہو گئے۔ سمجھو مجھے آج ہی جیل سے رہائی ملی ہے، مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔ بمل بابو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔" یکایک مجھے خود بخود احساس ہوا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مجھے جھرجھری سی آگئی۔ میں نے اپنا خشک حلق تر کرنے کے لیے چند لمحے توقف کیا۔ "میں نے ان سے، بمل بابو سے کہا ہے کہ یہ بمبئی چلے جائیں۔" میری آواز بھٹکی ہوئی تھی۔ "چند دن بعد مجھے بھی وہاں پہنچ جانا ہے۔ میں آجاؤں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم سب ساتھ رہیں گے۔ وہاں اور لوگ بھی ہیں۔ میں تمھیں اپنے ساتھ حیدرآباد لے چلتا لیکن میں اکیلا نہیں ہوں۔ سامنے کی برتھ پر یہ میرے ابّا جان سو رہے ہیں۔ اُوپر کی برتھوں پر جو لوگ ہیں، وہ بھی غیر نہیں ہیں مگر ان کی موجودی میں تم گھٹن محسوس کرو گی اور پھر میں تو آ ہی رہا ہوں، تمھیں شاید زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔ وہیں تم سے ٹھیک طرح باتیں ہوں گی، وہاں وقت ہی وقت ہوگا۔"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بمل کے ٹوکنے پر بھی نہیں۔ میرے سر میں بھن بھناہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آپ میں سِمٹی بیٹھی رہی۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ اُس سے اور کیا کہوں۔ اُس کے سامنے میں خود کو بھی اجنبی لگ رہا تھا۔

"سونیا! سونیا!" بمل نے آہستگی سے اُسے دوبارہ مخاطب کیا۔ اُس کی لمبی لمبی انگلیاں آپس میں پیوست تھیں۔ وہ کسمسانے لگی۔

"یہ کیا!" بمل شکایتی لہجے میں بولا۔ "تم نے سُنا، ظہیر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟ ٹھیک ہے نا!"

وہ دلھنوں کی طرح سر ہلا کے رہ گئی۔

"تم نے جیسا مجھے بتایا تھا، یہ بالکل ویسے ہی ہیں۔ میں نے اپنے دماغ میں ان کی جو تصویر بنائی تھی، یہ اُس سے بہت ہی ملتے جلتے ہیں کسی راج کمار یا شہزادے کی طرح۔ ان کا چہرہ مجھے اجنبی محسوس نہیں ہوا۔" وہ تیزی سے بولا۔

سونیا کے سراپا میں ایک ثانیے کے لیے کوئی چمک سی اُٹھی اور ماند پڑ گئی۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لوں، اُسے خوب پیار کروں، اُس کے تمام آنسو پی لوں لیکن میرے بازو اینٹھے رہے۔ پھر بمل بھی چپ ہو گیا، دیر تک سکوت طاری رہا، یہاں تک کہ گاڑی کی رفتار مدھم پڑنے لگی۔ میں نہیں اُٹھا۔ سونیا کو اس حالت میں چھوڑ کے اُس کے پاس سے اُٹھ جانا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنے ذہن میں وہ لفظ ڈھونڈ رہا تھا جو سونیا سے کہہ سکوں اور اُسے تسلی دے سکوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو اور میرا کہا سب رائگاں گیا ہو یا میری زبان سے کوئی لغزش ہو گئی ہو۔ بمل کہتا تھا، آنکھوں کی روشنی اتنی ضروری نہیں جتنی سر کی ضروری ہے۔ سر میں اندھیرا بھرا ہو تو آنکھوں کو بھی نظر نہیں آتا۔ اُسی لمحے بمل مجھ سے معذرت کر کے اُٹھ کھڑا ہوا، صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے سونیا سے بات کرنے کا موقع دینا چاہتا ہے۔ میری زبان سے ایک لفظ نہیں پھوٹا۔ چند منٹ بعد بمل واپس آیا تو گاڑی آہستہ آہستہ رکنے لگی تھی۔ کوئی اسٹیشن آ رہا ہوگا۔ ابّا جان کی آنکھ کھُل جانے کا اندیشہ تھا لیکن میں وہاں سے نہیں اُٹھا۔ میں نے سوچ لیا تھا، ابّا جان بمل کی جگہ سونیا کے پاس مجھے بیٹھا دیکھ کے چونکیں گے تو میں اُن سے کوئی بھی بہانہ کر دوں گا، کہہ دوں گا کہ سونیا میرے ایک محسن کی بیٹی ہے۔ گاڑی ٹھیری تو ابّا جان آنکھیں ملتے اُٹھ بیٹھے اور وہی ہوا، اِدھر اُدھر بھٹکتی ہوئی اُن کی نظریں مجھ پر پڑیں تو تو ٹھٹک سی گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکرانے لگے۔ اُنھوں نے پیرو کو آواز دی۔ پیرو پہلے ہی جاگ گیا تھا اور نیچے اُترنا ہی چاہتا تھا۔ گاڑی کسی غیر متوقع اسٹیشن پر ٹھیری تھی۔ اسٹیشن پر چہل پہل نہیں تھی۔ پیرو کے ساتھ زورا اور مارٹی بھی یکے بعد دیگرے نیچے آ گئے۔ وہ تینوں بھی مجھے سونیا کے پاس اتنے قریب بیٹھے دیکھ کے حیران ہوئے لیکن منہ سے کچھ نہیں بولے۔ میرا یہاں بیٹھنا اُن کے لیے اتنا عجیب نہیں ہوگا جتنا ہم تینوں کا گُم صُم ہونا۔ بمل ہی کو اس کا احساس ہوا۔ وہ مجھ سے مارٹی، زورا اور پیرو کے مشاغل کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اُس کی آواز اُچٹتی ہوئی تھی۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو میں نے کہہ دیا، "یہ سب بمبئی میں تجارت کرتے ہیں۔" بمل نے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی۔ مارٹی نے ڈبے سے اُتر کے تحقیق کر لی تھی کہ آگے لائن کلیر نہیں ہے۔ گاڑی کے دوبارہ حرکت میں آنے میں دیر لگ گئی۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا اور بمل کو اپنے امتحانات اور موضوعات کے بارے میں اُلٹے سیدھے جوابات دیتا رہا۔ پھر میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا اور کن انکھیوں سے سونیا کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ یوں ہی سر جھکائے ساکت بیٹھی تھی۔ "میں بس دو دن بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔" میں نے بدبداتے ہوئے کہا۔ سونیا نے ضرور سُن لیا تھا۔ اُس کے بدن میں اچانک ایک تلاطم سا نمودار ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں جنون آیا ہوا تھا۔ میں تیزی سے پلٹ کے سامنے کی برتھ پر آ بیٹھا۔ میری سانس اُکھڑ گئی تھی۔ یہاں آ کے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بہت دور سے بھاگتا ہوا آ رہا ہوں اور میرا جسم ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ سونیا کی آنکھوں میں کوئی سمندر بھرا تھا۔ اُس کی نظریں میرے سارے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھی ہوئی تھیں۔ پیرو کو کچھ اندازہ ہو گیا تھا، اُس نے میرا سر اپنی آغوش میں چھپا لیا اور میری کمر پر آہستہ آہستہ گھونسے مارنے لگا۔ میرا سینہ اُمڈ رہا تھا لیکن میں رو بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنے آنسو آنکھوں ہی میں گھونٹ رکھے تھے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر رُکی تو وہ کھانے پینے کا سامان لے آئے۔ میں نے صاف منع کر دیا تھا۔ سونیا اور بمل نے بھی کچھ نہیں کھایا حالانکہ ابّا جان نے اُن سے بہت اصرار کیا تھا۔ مارٹی اور پیرو کی باتوں سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اگلا اسٹیشن ناگ پور ہے۔ بمبئی جانے کے لیے بمل کو ناگ پور ہی پر اُتر جانا چاہیے تھا۔ بمل سے اُس کا ارادہ پوچھتے یا اُسے ٹوکتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اگر اُس نے میری بات مان لی ہے تو اُسے خود احساس ہوگا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ بمبئی چلے جائیں۔ مجھے یقین تھا، وہاں جولین کے ساتھ سونیا کا دل کچھ بہل جائے گا۔ شبہ پارہ بھی وہاں موجود ہے۔ سونیا مولوی اکرام کے ہاں فریحہ اور فریال وغیرہ کے ساتھ بھی ٹھیر سکتی تھی۔ پھر پیرو دادا کا گھر بھی تھا جہاں گیتا اور اُس کی ماں ہمہ وقت اُس کا خیال رکھتیں لیکن ناگ پور اُترنے سے پہلے مجھے بمل کو کچھ روپے دے دینے چاہئیں تھے۔ میری جیب میں چیک بک تھی، نقدی نہیں تھی۔ بمبئی کے بینک میں ساٹھ ہزار چھوٹے کے تقریباً سارے روپے محفوظ تھے۔ میں چیک کاٹ کے اُسے دے سکتا تھا۔ دو دن تک اُنھیں وہاں کسی اچھے ہوٹل میں رہنے کے لیے روپوں کی ضرورت پڑے گی۔ چیک کی وصولی میں دیر لگ سکتی ہے۔ اچھا تھا کہ نقد رقم اُن کے ساتھ ہو اور چیک کا یہ تھا کہ بعد میں بمل کے دل میں کچھ اور خیال آ جائے، وہ چیک بھُنانے سے کترانے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ پیرو کے پاس بھی بڑی رقم نہیں ہے، ہاں ابّا جان کے پاس لکھنؤ میں تجھروں کی فروخت سے حاصل کی ہوئی ڈھائی لاکھ روپے کی رقم موجود ہوگی۔ اُس میں سے اُنھوں نے زیادہ سے زیادہ کتنا خرچ کیا ہوگا۔ ابّا جان سے روپے مانگنے کی مجھے ہمت نہیں پڑتی تھی، پیرو کے ذریعے ہی اُن سے کہلوایا جا سکتا تھا لیکن پیرو کے لیے اُن کے آگے ہاتھ پھیلانا مناسب نہیں تھا۔ ابّا جان فوراً سمجھ جاتے کہ پیرو کو اُن کے پاس میں نے بھیجا ہے اور رقم کی ضرورت اصل میں مجھے ہے، وہ اگر پوچھیں گے نہیں تو سوچیں گے ضرور کہ آخر ریل کے ڈبے میں رقم کی یہ ضرورت اچانک کیسے پیش آگئی۔ میں سوچتا رہا کہ ابّا جان سے کس طرح کہوں۔ اگر اُنھوں نے منع کر دیا؟ منع کر دیا تو بہرحال میرے پاس چیک بک موجود ہے، شاید وہ منع نہ کریں۔ میں نے اُن سے بات کرنے کا عزم کر لیا۔ میں جھجکتا ہوا اُن کے پاس اُن کی برتھ پر پہنچا پھر میں نے آہستگی سے کہا کہ مجھے کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔

اُنھوں نے چونک کے مجھے دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے اپنے سرھانے رکھا ہوا چرمی کیس میری طرف بڑھا دیا، دوسرے ہاتھ سے اُنھوں نے جیب سے چابی نکالی اور بولے "اِس میں سے لے لو۔"

میں نے چرمی کیس چادر کی آڑ میں کھولا۔ اُس میں کئی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ ساری رقم نہیں تھی۔ یقیناً ابّا جان نے باقی رقم کہیں اور بھی رکھی تھی۔ میں نے سَو سَو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ میرے اندازے کے مطابق دس ہزار روپے ہوں گے۔ گڈی بنڈی کی جیب میں رکھ کے میں نے چرمی کیس بند کیا اور ابّا جان کے حوالے کر دیا۔ روپے جیب میں آنے سے مجھے کچھ تسلی ہو گئی تھی۔ کچھ دیر تک میں اپنی جگہ چپ بیٹھا رہا، پھر میں نے بمل کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ اُس کے میرے پاس آنے سے ابّا جان کا ماتھا ٹھنکا ہوگا کہ میں نے یہ رقم کس کے لیے لی ہے لیکن مجھے اس بات کی اتنی فکر نہیں تھی۔ بمل کے آ جانے پر ابّا جان نے ہماری

طرف نظر نہیں کی۔

„ناگ پور آرہا ہے۔“ میں نے بمل سے سرگوشی میں کہا۔ ”یہاں سے بمبئی کے لیے گاڑی مل جائے گی۔“ وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

„مجھے شاید زیادہ وقت نہ لگے، اس عرصے میں تم بمبئی کے کسی اچھے ہوٹل میں ٹھیر جانا۔ میرا خیال ہے تاج محل ہوٹل مناسب رہے گا، وہ سب سے بڑا ہے۔ اونچے ہوٹلوں میں مسافروں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ میں کوئی وقت نہیں دے سکتا لیکن میری کوشش یہی ہوگی کہ جلد سے جلد پہنچ جاؤں، تمھیں میرا انتظار کرتے رہنا ہے۔ چاہے مجھے دو دن سے زیادہ لگ جائیں، شاید ایسا ہو نہیں“

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

„کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، میرے آنے کے بعد سمجھو ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ میں نے گڈی اپنی نشست کے نیچے دبا رکھی تھی۔ ”یہ رکھ لو۔“ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے گڈی کھسکاتے ہوئے کہا۔

„یہ کیا ہے؟“ گڈی دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں وحشت اُتر آئی۔

„کچھ نہیں ہے، بس اسے رکھ لو، تمھیں وہاں ضرورت پڑے گی۔“

„میرے پاس ابھی کچھ پیسے ہیں۔“ وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔

„پھر بھی احتیاطاً انھیں رکھ لینا چاہیے۔“

„نہیں نہیں۔“ وہ کسی قدر پیچھے ہٹ کے بولا۔

„منع کرو گے تو مجھے دُکھ ہوگا، کیا میں تمھیں یاد دلاؤں کہ تم نے ابھی ابھی مجھے کیا کہا ہے۔ سب دیکھ رہے ہیں، انکار مت کرو۔“

„مگر...!“ وہ کسمسانے لگا۔

„مگر کچھ نہیں۔“ میں نے ترشی سے کہا۔ ”پھر کیا میں یہ سمجھوں کہ جو تم نے کہا تھا، سب غلط تھا۔“

„لیکن اس کی شاید ضرورت نہ پڑے، دو دن بعد تو آپ ہی جائیں گے۔“ وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔

„پھر بھی رکھ لینے میں کیا حرج ہے۔“

اُس نے بہت انکار کیا لیکن میری ضد پر آخر ہار مان لی۔ گڈی جیب میں ڈال کے وہ ندامت کا اظہار کرتا رہا اور کچھ دیر تک میرے پاس بیٹھا، پھر اسباب سمیٹنے کے لیے اُٹھ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ شکستہ اور آزردہ نظر آرہا تھا۔ اپنی برتھ پر جا کے اُس نے سونیا سے کچھ کہا، سونیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کے پاس زیادہ سامان نہیں تھا۔ ایک بستر بند، دو سوٹ کیس، چمڑے کا ایک کھلا ہینڈ بیگ۔ انھیں سامان سمیٹتے دیکھ کے ابا جان بمل سے پوچھے بغیر نہ رہ سکے کہ کیا وہ ناگ پور اُترنے کا ارادہ رکھتا ہے؟

„ہاں۔“ بمل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”کچھ پروگرام بدل گیا ہے۔“

„اچھا! ہمارا خیال تھا، سفر ساتھ ساتھ کٹے گا۔“

„بس سوچا، پہلے بمبئی کیوں نہ چلیں۔“

ابا جان تذبذب میں پڑ گئے لیکن وہ بمل سے اور کیا پوچھ سکتے تھے، چپ ہو رہے۔ سونیا برتھ پر بچھا ہوا گدا اٹھانے کے لیے ایک بار اُٹھی تھی پھر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی۔ اُس کا رُخ میری ہی طرف تھا لیکن اُس کا سر جھکا ہوا تھا اور ساڑی کے پلو کے گھونگٹ نے اُس کا آدھا چہرہ اوجھل کر دیا تھا۔ ساڑی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہوا کا تیز جھونکا آتا تو اُس کا گھونگٹ اُڑا دیتا اور اُس کے چہرے پر بالوں کی لٹیں بکھر جاتیں۔ سونیا کا قد پہلے ہی نکلتا ہوا تھا۔ ساڑی میں وہ اور لمبی دیکھی ہو گئی تھی۔ اُس کے ترشے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی سی لرزش تھی۔ رُخساروں کا سونے جیسا رنگ کھلایا ہوا تھا۔ سونیا کو میں نے متعدد بار دیکھا تھا، ایک زمانے میں تو روز ہی دیکھتا تھا لیکن اِس وقت وہ مجھے کوئی مجسمہ لگ رہی تھی، ترشا ہوا، قدرت نے جیسے اُسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہو، شائستہ اور بُرد بار۔ بمل ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا کہ بڑے بڑے لوگوں کے ہاں سے اُس کے رشتے آئے تھے۔ سونیا کسی محل ہی میں موزوں لگتی۔ جیل میں بھی جب میں اُسے پڑھانے جاتا تھا، اُس کی چھب بہت سی لڑکیوں سے الگ تھی۔ ٹھیر ٹھیر کے ہلکی دھیمی آواز میں باتیں کرتی تھی۔ میں نے کبھی اُس کے لباس پر ایک دھبا نہیں دیکھا تھا۔ کتابوں، گھر کی آرائش اور کھانوں، ہر بات سے اُس کی نفاست پسندی جھلکتی تھی۔ جتنی وہ نازک ہے، اتنے ہی اُس کے احساسات بھی نازک ہیں۔ سونیا کو اِس دیکھ کے میرا دل بہت گھبرا رہا تھا، بار بار میری نظریں اُس کی طرف مرکوز ہو جاتی تھیں، مجھے اُمید تھی، اُس دوران کسی بار وہ مجھے ضرور دیکھے گی مگر اُس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ پتہ نہیں بمل نے اُسے کیا بتایا تھا۔ گاڑی کی رفتار سست پڑنے کے ساتھ ساتھ بمل کا اضطراب بڑھ گیا۔ ناگ پور شہر کے آثار کھڑکیوں سے نظر آنے لگے تھے۔

تھوڑی دیر میں وہ چلے جائیں گے، بچھڑتے ہیں ہمی بھی جائیں گے۔ میں نے اُن سے جانے کو کہہ تو دیا تھا لیکن اب کچھ عجیب معلوم ہو رہا تھا کہ یہ ہم سے جُدا ہو رہے ہیں۔ کل صبح وہ مسلسل سفر کرتے رہیں گے۔ انھیں شاید یوں نہیں جانا چاہیے۔ بمل پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ پولیس اُن کے پیچھے ہے، وہ بہت حواس باختہ، گھبرایا گھبرایا نظر آرہا ہے۔ راستے میں کسی کو شک گیا تو نئی اُلجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ بمبئی تو وہ پہلی مرتبہ جا رہے ہیں، بمبئی کا ہنگامہ دیکھ کے دونوں ویسے ہی اکتا جائیں گے۔ میرے جی میں آئی، انھیں روک لوں۔ جیسے ابا جان، پیرو، زورا اور مارٹی وغیرہ ساتھ جا رہے ہیں، یہ بھی کیوں نہ چلیں، جس طرح وہ سب وہاں رہیں گے، یہ بھی رہ لیں گے۔ اسی اثنا میں گاڑی ناگ پور اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ مارٹی نے دونوں کے سوٹ کیس اور بستر بند اُٹھا کے دروازے کے قریب رکھ دیے تھے۔ اب میرا انھیں روکنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں بھلا اُن سے کیا کہوں گا اور ابا جان کیا سوچیں گے۔ درمیان کا یہ مختصر عرصہ وہ کسی طرح گزار ہی لیں گے۔ آخر گھر سے بھی تو یہاں تک آئے ہیں۔ ناگ پور سے بردوان خاصی دُور ہے، آگے وہ اور دُور ہوتے رہیں گے۔ جیلر صاحب نے تمام ہندوستان میں منادی تو نہیں کرا دی ہوگی۔ بمل ایک ہوش مند تعلیم یافتہ نوجوان ہے، سنبھل سنبھل کے ہی قدم اُٹھائے گا۔ میں انھیں روکتے روکتے ٹھیر گیا۔

سونیا بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی پہلے مارٹی اُترا اور اُس نے زورا کی مدد سے دونوں سوٹ کیس اور بستر بند نیچے اُتار دیے۔ بمل نے ابا جان کو سلام کیا۔ میرا خیال تھا، سونیا بھی انھیں سلام کرے گی مگر اُسے تو جیسے اپنی کوئی سُدھ بُدھ نہیں تھی۔ وہ بمل کے پیچھے سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی رہی۔ اُس کا چہرہ میرے مقابل تھا۔ پتھر کی آنکھیں، رخساروں پر ویرانی چھائی ہوئی۔ وہ چکرائی چکرائی، گری گری سی نظر آتی تھی۔ بمل نیچے اُتر گیا تو وہ دروازے تک چلی۔ ابا جان بھی انھیں رخصت کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے ارادہ کیا تھا، جتنی دیر گاڑی ٹھیرے گی، میں انھی کے پاس رہوں گا اور جو میں سونیا سے نہیں کہہ سکا تھا، اِس دوران کہنے کی کوشش کروں گا۔ سونیا کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، دروازے تک پہنچ کے وہ ٹھیر گئی اور اُس نے پلٹ کے میری جانب دیکھا، اُس کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ میرے سارے جسم میں ایک سرد لہر سی اُٹھی۔ سونیا کی سانس چل رہی تھی۔ اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ ابا جان قریب ہی کھڑے تھے۔ میں نے سونیا کو سہارا دینے کے لیے قدم آگے بڑھائے اور مجھے ایسا لگا کہ وہ مجھ سے گلے ملنے کی آرزومند ہے۔ اُس کی آنکھیں یہی کہہ رہی تھیں۔ بے اختیار میں نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ سونیا جیسے ٹوٹ کے گری۔ دوسرے ہی پل وہ میرے بازوؤں میں سمٹی ہوئی تھی اور اُس کا دل! اُس کے سینے کی تیز تیز دھڑکنیں سُن کے میرا جسم لرزنے لگا۔ میں نے اُسے اور زور سے دبوچ لیا۔ سونیا چند لمحوں تک سسکتی رہی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میرے اندر پیوست ہو جانا چاہتی ہے، میرے جسم کا جزو بن جانا چاہتی ہے مگر یکایک اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اُس کی گردن میرے شانوں پر ڈھلک گئی۔

اُسی لمحے مجھے ابا جان کی چیخ سُنائی دی۔

مجھے نہیں معلوم کیا ہوا، میرا جسم مفلوج ہو گیا تھا۔ ابا جان نے جھپٹ کے سونیا کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ انھوں نے اُسے فوراً برتھ پر لٹا دیا۔ اُن کی چیخ سُن کے مارٹی، زورا اور بمل آناً فاناً اوپر چڑھ آئے تھے۔ میں گُنگ نظروں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ آتے ہی اُنھوں نے دروازہ بند کر دیا اور سب سونیا کے گرد گھیرا ڈال کے بیٹھ گئے۔ اُسی دم پیرو میری طرف لپکا۔ ”راجا!“ اُس کی سَن سناتی آواز میرے کانوں میں گونجی، وہ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ ”جلدی بول، کون ہے یہ؟“

„یہ.... یہ سونیا!“ میری زبان ٹھٹھر گئی۔

„سونیا! کون سونیا؟ اپن کو جلدی بول۔“

„یہ جیلر صاحب کی لڑکی سونیا ہے۔“ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”اِسے کیا ہو گیا ہے؟“

„تو کیسے جانتا ہے اِسے؟“

„وہ، وہ، میں اور وہ....“ مجھے ہر چیز گھومتی نظر آرہی تھی۔

„دیری نہ کر۔“ وہ غصّے سے بولا اور مجھے جھٹکے دینے لگا۔

میں نے اُسے نہ جانے کیا بتایا۔

„ٹھیک ہے راجا!“ وہ میری کمر تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

„اِسے کیا ہو گیا ہے دادا؟“

„کچھ نہیں راجا! ابھی ہوش میں رہنا، ایک دم ہوش میں۔“

وہ تیزی سے بمل کی طرف پلٹ گیا۔ بمل سونیا کے پیر پکڑے پاگلوں کی طرح اُسے پکار رہا تھا۔ زورا نے بدقت تمام اُسے کھینچ کے سونیا کے پاس سے ہٹایا۔ بمل مجھ سے آکے چمٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ میری آنکھیں سرد پڑی تھیں، میں بے حس و حرکت کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔ مارٹی نے ساری کھڑکیاں گرا دی تھیں۔ ابا جان نے سونیا کو چادر سے ڈھانپ دیا۔ چند لمحے ابا جان اور پیرو اُس کے سرہانے بیٹھے سرگوشیاں کرتے رہے۔ ابا جان کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ کسی تاخیر کے بغیر انھوں نے اپنا سامان اور جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیا۔ نوٹوں کی بہت سی گڈیاں انھوں نے پیرو کے حوالے کر دیں، پیرو نے انھیں میری جیبوں میں ٹھونس دیا اور کچھ زورا اور مارٹی کی طرف پھینک دیں، زورا دروازے پر پشت

کرکے ہینڈل تھامے کھڑا تھا۔ اُدھر مارتی نے سامان سمیٹ لیا تھا۔ اُسی وقت پیرو بمل کے پاس آیا: "اپن کی بات دھیان سے سنو۔" اُس نے بمل کا بازو تھام کے تیز لہجے میں کہا: "ابھی اپنے کو باندھ کے رکھو بابو صاحب! وہ چلا گیا ہے۔ پر تم کو ابھی اپنے کو ٹھیک رکھنا ہے۔ ابھی پولیس آئے گا۔ سمجھا!! ایدر پولیس آئے گا۔" وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہہ رہا تھا: "جیسا ہوا ہے' اُن کو ویسا ہی بولنا۔ اُن لوگ سے کچھ مت چھپانا۔ ایک بھی بات نئیں۔ اپن لوگ ایدر سے نکل رہا ہے۔ ایدرا اپنے رہنے سے اور اُلٹا ہو جائے گا اور... اور ایک دم فکر نئیں کرنا' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اور تم بھی راجا!" وہ میرے گالوں میں انگلیاں گاڑ کے بولا۔ "بڑا صاحب ایدر اکیلا ہے' اُس کو پریشان مت کرنا۔" وہ یہ کہتا ہوا سامان اُٹھا کے نیچے اُتر گیا۔ چلتے چلتے بھی وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے اور بمل کو تلقین کرتا رہا۔ اُن کے جاتے ہی ابا جان نے کھڑکیاں اوپر کر دیں اور بمل کے پاس آ کے بیٹھ گئے۔ اُنھوں نے اُس کے ہاتھ پکڑ کے سینے سے لگا لیے۔ بمل اُن کے شانے سے لگ کے بلکنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں گاڑی رینگنے لگی اور پچھلے ڈبے ابھی پلیٹ فارم کے کنارے تک آئے ہوں گے کہ ابا جان نے اُٹھ کے زنجیر کھینچ دی۔ اچانک پہیے گھسٹنے کا شور بلند ہوا۔ گاڑی جھٹکے لیتی ہوئی رُک گئی۔ جیسے ہی گاڑی ٹھہری، ابا جان نے دروازہ کھول کے چلانا شروع کر دیا: "ڈاکٹر! ڈاکٹر! کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔" وہ مسلسل چیخ رہے تھے۔ مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ انھیں چیختے دیکھ کے میں بھی دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے غیر ارادی طور پر نیچے اُترنے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ابا جان نے مجھے روک لیا اور کہنی مار کے اندر کی جانب دھکا دے دیا۔

سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ بہت سے مسافر نیچے اُتر آئے تھے۔ ایک طرف سے گارڈ اور اُس کے ساتھ کچھ سپاہی ہمارے ڈبے کی طرف تیز قدموں سے چلے آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں ہم ریلوے تھانے میں پولیس افسر کے سامنے بیٹھے تھے۔ ہمارے اِرد گِرد سپاہی کھڑے تھے۔ تھانے کے گیٹ پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ قریب ہی اسٹریچر پر سونیا لیٹی تھی اور میز کے اُس طرف بیٹھا ہوا بھاری جسم' گندمی رنگت کا ایک ادھیڑ پولیس افسر ابا جان سے سوالات کر رہا تھا: "یہ کس کے ساتھ ہے؟" اُس نے اسٹریچر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درشتی سے پوچھا۔

"اپنے ہی ساتھ سمجھیے۔" ابا جان نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا ہوا اسے؟"

"خدا جانے کیا ہو گیا' اچانک' بالکل اچانک..." ابا جان کی آواز ڈگمگا رہی تھی۔

"نام؟" پولیس افسر نے سرد لہجے میں پوچھا: "آپ کا نام؟"

"صفدر علی۔" ابا جان بے تابی سے بولے: "مگر آپ یہ سب کچھ بعد میں پوچھ لیجیے گا' پہلے کسی ڈاکٹر کو بلا لیجیے۔"

"ڈاکٹر بھی آ رہا ہے۔" پولیس افسر کی متجسس نظریں ابا جان کے چہرے پر جمی رہی تھیں: "اس بیچ اِدھر کی کارروائی بھی ہو جائے۔"

"جیسا آپ بہتر سمجھتے ہوں لیکن ڈاکٹر کب آئے گا؟"

"آدمی بھیج دیا گیا ہے۔" وہ تندی سے بولا: "کیا کرتے ہیں آپ؟"

"تھوڑی بہت زمیں داری ہے۔"

"کون سی جگہ رہتے ہیں؟"

"بمبئی میں!" ابا جان نے جواب دیا۔

"زمیں داری بھی بمبئی میں ہے؟"

"جی' وہ فیض آباد میں ہے۔" ابا جان ناگواری سے بولے۔

"یہ لڑکی آپ کی کون ہے؟"

ابا جان کو جواب دینے میں دشواری پیش آئی۔ انھوں نے پہلے بمل کی طرف پھر میری طرف دیکھا مگر ہم دونوں کو درمیان میں دخل دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اِسی دوران ایک سپاہی ہاتھ میں ڈاکٹر کا بیگ سنبھالے اندر داخل ہوا' اُس کے پیچھے ایک سفید پوش معمر شخص بھی تھا' وہی ڈاکٹر ہو گا۔ پولیس افسر اپنی نشست سے اُٹھ گیا۔ ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر سونیا کے اسٹریچر کی طرف پلٹا تو میرا دل دہلنے لگا۔ مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ پولیس افسر نے سونیا کے بدن سے چادر ہٹا دی۔ سونیا کا چہرہ پھر میرے سامنے تھا۔ پہلے سے بدلا ہوا' پُرسکون' مسکراتا ہوا۔ ابا جان نے شاید اُس کے بال کھول دیے تھے۔ سُرخی مائل سیاہ بالوں کی اوٹ میں اُس کا چہرہ کسی پھول کے مانند کھلا ہوا تھا یا چاند کی طرح روشن تھا۔ لگتا تھا' اُس نے آنکھیں موند لی ہیں' ابھی ابھی کھول دے گی۔ اے کاش یہ آنکھیں کھول دے۔ میرا دل دعائیں کر رہا تھا۔ "اے خدا! یہ آنکھیں کھول دے' میں اس سے ایک بات کہہ سکوں' جو اس کی مرضی ہو گی' جو یہ کہے گی' میں وہی کروں گا۔" سونیا نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ ڈاکٹر چند ثانیوں تک ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس نے جھجکتے ہوئے سونیا کی کلائی ٹٹولی اور سینے پر آلہ رکھ کے دیکھا۔ بمل کا منہ کھلا ہوا تھا' وہ دہشت زدہ آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کو چند لمحوں سے زیادہ نہیں لگے۔ وہ پولیس افسر کو اشارہ کرتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔ سونیا کا بدن دوبارہ چادر سے چھپا دیا گیا۔

ابا جان نے ڈاکٹر سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا اور ابا جان کا کندھا تھپ تھپاتا ہوا اُٹھ گیا۔ بمل گڑگڑاتا ہوا کچھ دُور تک ڈاکٹر کے پیچھے چلتا رہا مگر آگے اُسے سپاہیوں نے تھام لیا۔ بمل منہ چھپا کے سسکاریاں بھرنے لگا۔

ڈاکٹر کو دروازے تک پہنچا کے پولیس افسر واپس آیا تو اُس نے سپاہیوں کو اسٹریچر اُٹھانے کا حکم دیا۔ ہم بھی ساتھ جانے کے لیے بڑھ گئے تھے مگر پولیس افسر کی بھاری آواز نے ہمیں روک دیا: "آپ ابھی یہیں ٹھہریے۔"

"پر اِسے آپ کہاں بھیج رہے ہیں؟" ابا جان لپکتے ہوئے [illegible]

"ڈاکٹر کا کام ابھی باقی رہ گیا ہے۔" پولیس افسر نے خشونت سے کہا۔

"لیکن' لیکن...": ابا جان اُس کی تند نظریں دیکھ کے چُپ ہو گئے۔

"تسلی سے بیٹھو۔" وہ تلخی سے بولا: "جو کچھ آپ سے پوچھا جائے' اُس کا ٹھیک ٹھیک جواب دیجیے' آپ [illegible] دار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ معاملہ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ہمیں آپ سب کے بیانات کی ضرورت پڑے گی۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" ابا جان سر ہلا کے بولے: "مجھے خوب اندازہ ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا: "ڈاکٹر کہتا ہے یہ آدھ گھنٹے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔"

"ہو سکتا ہے' تقریباً اتنے ہی وقفے سے یہ بے سُدھ ہے۔"

"کیا بیماری تھی اِس کو؟"

"کوئی بھی نہیں' کچھ دیر پہلے اچھی بھلی تھی۔"

"پھر ایک دم یہ کیا ہوا؟" وہ جھڑکتی آواز میں بولا۔

"کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"یہ کوئی معقول جواب نہیں ہے۔"

"اس کے سوا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"

"ہنھ۔" وہ ٹھہر کے اپنے برابر بیٹھے ہوئے سپاہی کو سرگوشی میں کوئی ہدایت دینے لگا۔ سپاہی کاغذ پر تیزی سے کچھ لکھ رہا تھا۔ "دیکھو بڑے میاں!" پولیس افسر کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ اُس کے تخاطب سے ابا جان پر اضطراری کیفیت طاری ہونے لگی: "اپنے بارے میں تم کو پتہ نہیں ہے۔" وہ منہ بنا کے بولا: "ہم نے اب تک بہت لحاظ کیا ہے لیکن ہم سیدھے آدمیوں کے ساتھ سیدھے' ٹیڑھوں کے ساتھ پھر بہت ٹیڑھے ہیں۔ ایسی ویسی کوئی بات ہو تو ابھی بول دو۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" ابا جان کپکپاتے ہوئے بولے۔

"ہم ایک نمبر صاف بات کر رہے ہیں۔ ہم سے اُلٹا سیدھا بولو گے تو سب اُلٹا ہو جائے گا' اپنی بزرگی کا خود خیال کرو' ٹھیک ٹھیک سب بول دو۔"

"آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"جو ہم پوچھنا چاہتے ہیں' وہ تم خود بتا دو تو اچھا ہے ورنہ ہم پوچھیں گے تو شکایت مت کرنا۔"

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔"

"ایسے کیسوں میں ہم کو یہ غلط فہمی ہو جایا کرتی ہے۔ ہم کو غلط فہمی ہو گئی ہے تو تم اُسے دُور کر دو۔"

"مجھے وہ طریقہ بتا دیجیے۔"

پولیس افسر کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں: "تم لوگ کہاں جا رہے تھے؟" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"حیدر آباد۔"

"حیدر آباد کیوں؟"

"کام سے؟"

"کس کام سے؟"

"ذاتی کام سے۔"

"آ کہاں سے رہے ہو؟"

"فی الحال دلّی سے لیکن کل صبح ہم فیض آباد سے چلے تھے۔"

"یہ دونوں کون ہیں؟"

"ایک میرا بیٹا ہے' دوسرا..." ابا جان کہتے کہتے رُک گئے۔

"دوسرا کون ہے؟" وہ تیزی سے بولا۔

"اِسے بھی بیٹا سمجھیے۔"

"سمجھیے کیا' صاف صاف بتاؤ۔"

"یہ میرا ہم سفر ہے۔"

"ہم سفر ہے۔" وہ چونک کے بولا: "تمھارا اِس کا بس سفر کا ساتھ ہے؟"

"میں یہی کہہ رہا ہوں۔" ابا جان دھیمی آواز میں بولے۔

"لڑکی تمھاری کون ہے؟" وہ ترش روئی سے بولا۔

"لڑکی بھی میری ہم سفر تھی۔"

"میں پوچھتا ہوں' لڑکی سے تمھارا رشتہ کیا ہے۔" وہ اونچی آواز میں بولا۔

"آدمیت کا رشتہ تھا۔"

"صرف آدمیت کا؟"

"دیکھیے جناب! ایسے سوالات کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ آپ لڑکی کے بارے میں ڈاکٹر کی رپورٹ کا انتظار کرلیں۔" اباجان نے عاجزی سے کہا۔ "آپ جو سمجھ رہے ہیں، وہ غلط ہے۔ ہم سے ہمدردی کرنے کے بجائے آپ ہمی کو...."

"بڑے میاں! جانتے ہو کہاں بیٹھے ہو؟"

"جانتے ہیں، اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"جانتے تو ایسی باتیں نہ کرتے۔ رپورٹ کا کیا ہم کو انتظار نہیں ہے پر اُس سے پہلے تمھاری رپورٹ مکمل کرلیں تو کیا حرج ہے۔"

"کوئی حرج نہیں، ضرور کیجیے۔"

"رپورٹ آنے تک تم لوگ یہیں رہو گے۔"

جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" اباجان کچھ اور کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہ سکے۔

دفعتہً برابر بیٹھے ہوئے سپاہی نے پولیس افسر سے کانا پھوسی کے انداز میں کچھ کہا۔ وہ مضطرب ہوگیا اور چلّا کے بولا۔ "تم لوگوں نے ان کی تلاشی لی؟" اردگرد کھڑے سپاہیوں نے انکار میں گردن ہلائی۔ پولیس افسر نے انھیں سخت سُست کہا، یہاں تک کہ گالیاں بکنے لگا۔

"میں سمجھتا ہوں، یہ قبل از وقت ہے۔"

پولیس افسر نے جیسے کچھ نہیں سُنا۔ میں چُپ چاپ بیٹھا اُن کی باتیں سُن رہا تھا مگر جب سپاہی اباجان کی تلاشی لینے کے لیے اُن کے سامنے کھڑا ہوگیا تو میری رگوں میں کھولن ہونے لگی۔ میں نے درمیان میں دخل دینے کا ارادہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ میں زبان کھولتا، اباجان نے آنکھ کے اشارے سے مجھے تحمل کی تلقین کی۔

سپاہی نے سب سے پہلے اباجان ہی کی تلاشی لی۔ اُس نے نہ صرف اُن کی جیبیں کھکھوڑیں بلکہ تمام جسم ٹٹول کے دیکھا۔ اباجان کی بنڈی کی جیبوں سے نوٹوں کی دو ایک گڈیاں، ٹکٹ، چند مڑے تڑے کاغذات، دو شکستہ نوٹ بکیں، ایک بڑی نوٹ بک جیسی چیزوں کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔ سپاہی اُن کی جیب سے ایک ایک چیز نکال کے پولیس افسر کو دکھاتا رہا۔ بمل کی جیب سے بھی ایک گڈی نکلی، وہی گڈی جو ناگ پور اسٹیشن آنے سے پہلے میں نے اُسے دی تھی، اس کے علاوہ ایک چھوٹی ڈائری، ایک بٹوا، رومال، کنگھی، قلم، ریل کے ٹکٹ، چند خط، کاغذ اور تین چار سو کے کھلے نوٹ۔ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ سپاہی اُن دونوں کی تلاشی لے کے میرے پاس آیا۔ میری جیب سے اُسے چیک بک، بینک سے متعلق دو ایک رسیدیں، زرّیں کا دیا ہوا رومال، نیساں کی دی ہوئی جیبی حمائل شریف۔ نیساں ہی کے دیے ہوئے گلاب کے پھول کی خشک پتیاں ملیں اور چاقو۔ چاقو دیکھ کے سپاہی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس نے اُسے بے تابی سے افسر کے حوالے کردیا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ میری جیب میں چاقو بھی ہے۔

"چاقو!" افسر چاقو اُلٹ پلٹ کے اور دھار پہ اُنگلی پھیرتے ہوئے حیرت سے بولا۔ "یہ کس کی جیب سے نکلا ہے؟"

"اِس کی۔" میری تلاشی لینے والے سپاہی نے مستعدی سے کہا۔

"خاص قسم کا ہے۔" افسر بڑبڑایا۔ "اِن عزت دار لوگوں کو بھلا ایسا چاقو رکھنے کی ضرورت کیوں پڑگئی؟" وہ چاقو پر اس طرح نظریں جمائے ہوئے تھا جیسے اُسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

میں چُپ رہا۔ سپاہی کا ہاتھ میرا جسم ٹٹولتے ہوئے میرے گلے تک پہنچ گیا تھا۔ ہار کے دانے اُس کی اُنگلیوں میں چبھے تو وہ بے چین ہوگیا۔ "یہ کیا ہے؟" وہ بھڑکتی آواز میں بولا۔

"ہار ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"ذرا باہر نکالو۔" اُس نے حکم دیا۔

میں نے کسی حجّت کے بغیر ہار نکال کے اُس کے سامنے کردیا۔ اباجان اُسے دیکھ کے پلکیں جھپکانے لگے، ہیرے جواہر کے معاملے میں اُن کی نظریں بہت تیز تھیں۔ شاید اُنھیں یاد آگیا ہو کہ یہ ہار اُنھوں نے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ ممکن ہے، اُنھیں کراچی یاد آگئی ہو۔ سپاہی نے ہار ہاتھوں میں تولتے ہوئے پولیس افسر کے سامنے احتیاط سے میز پر رکھ دیا۔ گو اندھیرا بڑھ گیا تھا مگر ہار کے سفید موتی دمک رہے تھے۔ پولیس افسر اُسے ٹٹولتا رہا۔ "قیمتی معلوم ہوتا ہے، سچے موتیوں کا۔" اُس کے برابر بیٹھے ہوئے سپاہی نے بھی ہار چھو کے دیکھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ کہیں چاقو کی طرح ہار بھی اپنی میز پر نہ رکھ لے۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ اگر اُس نے ہار واپس نہ کیا تو میں جھپٹ کے خود اُسے اُٹھا لوں گا لیکن پولیس افسر نے ہار اپنے پاس نہیں رکھا، مجھے واپس کردیا۔

"بیٹھ جاؤ بڑے میاں!" وہ دوبارہ اباجان سے مخاطب ہوا۔ اباجان نے فوراً اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ "ہاں تو تم لڑکی سے اپنا کیا رشتہ بتا رہے تھے؟ آدمیت کا رشتہ؟ اس سے بڑا رشتہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ یہی بتایا تھا نا تم نے؟"

"یہی کہا تھا جناب!" اباجان نے دھیمی آواز میں کہا۔

"رپورٹ میں کیا یہی لکھ لیا جائے؟"

"قلم آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ حاکم ہیں۔"

"یہ رشتہ اِدھر نہیں چلتا بڑے میاں! آگے کٹہرے میں جا کے بھی نہیں چلے گا، سمجھے؟ ابھی تم کو احساس نہیں ہے کہ معاملہ کتنا آگے جاسکتا ہے۔ ہم تم سب کو علاقے کے تھانے کے حوالے بھی کرسکتے ہیں۔ بعد میں ہمیں یہی کرنا پڑے گا۔ وہ لوگ ذرا دوسری قسم کے ہیں، اُن کی زبان بھی دوسری ہے۔"

"پہلے آپ میری بات سن لیجیے۔" اباجان نے درخواست کی۔

"اور ہم یہاں کیا جھک مار رہا ہے۔" وہ اپٹ کے بولا۔

"آپ بدگمانی کررہے ہیں، پہلے آپ اپنے دل سے یہ نکال دیجیے..."

"تمھارا مطلب ہے کہ جو تم کہتے جاؤ، ہم اُسے منظور کرتے چلے جائیں؟ یہ بال دیکھ رہے ہو؟ تم سے زیادہ سفید تو نہیں ہیں پر اِن پہ دھوپ بالکل نہیں لگی ہے۔ ساری عمر یہی کھیل تماشا دیکھتے بیتی ہے۔" اُس کا لہجہ اچانک سخت ہوگیا۔ "جو تم سے پوچھا جائے، اُسی کا جواب دو۔" وہ پھر تلملاتی آواز میں پوچھنے لگا۔ "لڑکی کا نام؟"

اباجان نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ "کماری سونیا۔"

"کماری سونیا!" وہ آنکھیں پھاڑ کے بولا۔

"جی!۔"

"اور تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟" وہ کاغذ دیکھتے ہوئے بولا۔ "صفدر علی!۔۔۔ تم نے اپنا یہی نام بتایا تھا؟"

"جی ہاں!۔"

"صفدر علی!" وہ غصے سے بولا۔ "یہ لڑکی کون تھی؟"

"کسی شریف گھرانے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔"

"میں اُس کی ذات پات نہیں پوچھ رہا۔۔۔! چکّر بتاؤ۔"

"کیسا چکّر جناب! یہ محض ایک حادثہ تھا۔ لڑکی میرے اور میرے بیٹے کی ہم سفر تھی۔ دِلّی سے ہم...."

"یہ میں نے پہلے بھی سُن لیا ہے۔ اتنی سی بات سے کام نہیں بنے گا۔" اُس نے رازدارانہ لہجے میں اباجان سے پوچھا۔ "یہ لڑکی تنہا تھی؟"

"نہیں۔" اباجان نے ٹھنڈی سانس بھر کے جواب دیا۔

"پھر کس کے ساتھ تھی؟" وہ جھنجلا کے بولا۔ "آکاشش سے اُتری تھی؟"

"وہ... وہ...." اباجان سراسیمہ نظروں سے مجھے اور بمل کو دیکھنے لگے۔

اُنھوں نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ پولیس افسر کی تیز آواز گونجی۔ "ہاں، ہاں بولو۔ رُک کیوں گئے۔ کون سی ایسی بات ہے جو تمھیں بتاتے ہوئے شرم آرہی ہے، اِن دونوں کو باہر بھیج دیں؟ لڑکی کو کسی نے...."

مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں نے اباجان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "آپ کو جو کچھ پوچھنا ہو، مجھ سے پوچھیے۔" میری آواز کانپ رہی تھی۔ "آپ کے خیال میں آپ کو ہم پر کوئی شبہ ہے تو اُسے دُور مت کیجیے۔ میں اپنے جرم کا اقرار کرلیتا ہوں۔ مجھے حوالات میں ڈال دیجیے مگر ان سے فضول سوالات مت کیجیے۔"

پولیس افسر نے گھورتی نظروں سے مجھے سرتاپا دیکھا۔ "چاقو اِسی کی جیب سے نکلا تھا؟" اُس نے بپھرے ہوئے لہجے میں سپاہی سے پوچھا۔

"ہاں، میری جیب سے نکلا تھا۔" سپاہی کے جواب دینے سے پہلے میں نے چیخ کر کہا۔ "میں چاقو چلانا خوب جانتا ہوں، یہ ہمیشہ میرے پاس رہتا ہے۔"

"تمیز سے بولو، یہ پولیس اسٹیشن ہے۔"

"معلوم ہے، پولیس اسٹیشن ہے مگر آپ بھی سیدھی طرح بات کریں۔"

"تم ایک پولیس افسر سے بات کررہے ہو۔"

"پولیس افسر ہی ہیں، خدائی فوج دار نہیں ہیں، میں نے آپ جیسے پولیس افسر بہت دیکھے ہیں۔"

"کیا بکتا ہے۔" اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔

اباجان مجھ پر ناراض ہونے لگے۔ "یہ پولیس افسر ہیں۔" اُنھوں نے مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ "اِن کا کام ہی یہ ہے۔ افسروں سے اِس طرح بات نہیں کرتے۔ معاف کیجیے۔" وہ اُس سے مخاطب ہو کے لجاجت سے بولے۔ "اس کا غصہ کچھ تیز ہے، ابھی خون گرم ہے، اِس کی باتوں پر توجہ مت دیجیے۔"

"اسے کھونٹے سے باندھ کے رکھو۔" پولیس افسر کے برابر بیٹھے ہوئے سپاہی نے گرج کے کہا۔ "اس سے کہو زبان بند رکھے، صاحب کا غصہ ابھی دیکھا نہیں ہے۔ ابھی تک تم لوگوں سے نرمی سے بات کررہے ہیں۔ تم کو ہوش نہیں ہے کہ تم اپنے ساتھ کیا لائے تھے۔ ایک بے جان لڑکی۔ اور نوجوان لڑکی۔"

پولیس افسر نے سپاہی کو جھڑک دیا اور تلخ لہجے میں بولا۔ "ابھی اِس نے جرم کا اقرار کیا ہے۔"

"کیا ہے۔" میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ اباجان اپنی کُرسی سے اُٹھ کے تیزی سے میری طرف لپکے اور کپکپاتے ہاتھوں سے میرا شانہ جھنجوڑنے لگے۔ "آپ، آپ اطمینان سے بیٹھیے۔" میں نے متوحش لہجے میں کہا۔ "ان کے کسی سوال کا جواب مت دیجیے، ٹھیک ہے، یہ ہمیں حوالات میں ڈال دیں۔"

"برو! خدا کے لیے خاموش رہ" ابا جان میری منت کرنے لگے۔ میری آنکھوں میں گھٹن ہونے لگی، ایک مدت بعد میں نے ابا جان کی زبان سے برو سنا تھا، تبت میں ملنے کے بعد سے اب تک انھوں نے مجھ سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔

"اپنی جگہ بیٹھو بڑے میاں" پولیس افسر نے دھتکارتے لہجے میں ابا جان کو مخاطب کیا "یہ ٹھیک کہتا ہے تم چپ رہو۔ ابھی اس سے ہمیں کو دو باتیں کر لینے دو۔"

"جناب! اس کا کہا درگزر کر دیجیے" ابا جان نے فریاد کی۔ "میں آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں، آپ میڈیکل رپورٹ کا انتظار کر لیں" ابا جان میرے پاس ہی کھڑے رہے۔

"وہ تو جب آئے گی، دیکھیں گے، میں اس کے لیے ہتھکڑیاں منگواتا ہوں۔ ابھی اس نے کیا اعتراف کیا ہے" وہ طیش میں بولا۔

"آپ کے پاس اس کے سوا کیا رکھا ہے۔"

"تجربہ کار معلوم ہوتا ہے۔"

"بہت زیادہ، آپ سے زیادہ" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "مگر میں نے زندگی میں آپ جیسا شخص نہیں دیکھا۔ شاید آپ کو پہلی بار ایسا تماشا دیکھنے کو ملا ہے۔ مجھے آپ ایک پولیس افسر سے زیادہ مداری معلوم ہوتے ہیں، ان دونوں کو چھوڑ دیجیے، مجھے گرفتار کر لیجیے۔ میرے اعتراف کے بعد انھیں روکنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اپنی رپورٹ مکمل سمجھیں اور اسے فریم میں لگا کے اوپر بھیج دیں۔"

ابا جان دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔

"قاعدہ قانون کچھ ہم بھی جان سکتے ہیں، ہم آپ کے پاس اس لیے نہیں آئے تھے کہ آپ اس طرح کی باتیں کریں گے اور چھان بین کیے بغیر، سوچے سمجھے بغیر جو منہ میں آئے گا، کہتے رہیں گے۔ اگر آپ کی کوئی لڑکی ہوتی اور یہ سب کچھ آپ کے ساتھ پیش آتا؟ ہماری جگہ آپ ہوتے تبھی کچھ جان سکتے تھے کہ بہت سی باتیں زبان پر نہیں لائی جا سکتیں۔ نہ معلوم کون کس عالم میں آپ کے پاس آتا ہے، کون سے کانٹے اس کے سینے میں چبھے ہوتے ہیں۔ آپ کو اس لڑکی کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، نہ سوچنے کا ہے۔ وہ چلی گئی ہے لیکن اس کے پوچھنے والے موجود ہیں۔ جو باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتیں، انھیں آپ کیوں جاننا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس ایک ہی لاٹھی، ایک ہی پیمانہ ہے۔ یہ کچھ نہیں جانتے" میں نے ابا جان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "انھوں نے جو کہا ہے، اس سے زیادہ انھیں معلوم نہیں ہے۔ پر میں جانتا ہوں کہ وہ کون تھی۔ وہ میرے ساتھ تھی۔ میں اُسے برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ ایک ایسے گھر کی لڑکی تھی جہاں سر آونچے نگاہیں نیچی رکھی جاتی ہیں۔ وہ کسی گھر کی ناموس تھی۔ وہ اتنی پاک، اتنی اچھی تھی کہ اُس کے متعلق بدگمانی کرنا گناہ ہے۔ اس کی اجازت آپ کو نہیں دی جا سکتی۔ آپ کم سے کم اتنا کر سکتے ہیں کہ خاموش رہیں، آپ کو ایک مجرم کی تلاش ہے، میں سامنے موجود ہوں۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ مجرم آپ کی دسترس میں ہے۔ ایسی ویسی غیر ضروری باتوں سے آپ کو کیا ملے گا۔ وہ میرے بازوؤں میں ختم ہوئی تھی۔ میرے لیے سب کچھ میرے لیے" میری آواز جھرجھرانے لگی "یہ کسی کا قصور نہیں ہے، میرا قصور ہے۔ مجھے اس کی سزا دے دیجیے ان لوگوں کو جانے دیجیے۔ وہ میں ہی تھا، یہ نہیں تھے۔ ضرورت پڑی تو میں آپ کو اپنا ریکارڈ بھی بتا دوں گا۔ اس سے آپ کی کچھ تسلی ہو جائے گی کہ آپ نے ٹھیک آدمی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی ہیں۔"

میرے خاموش ہو جانے کے باوجود پولیس افسر دیر تک مجھے گھورتا رہا۔ سپاہی ہتھکڑی لیے سامنے کھڑا تھا، میں نے اس کے آگے ہاتھ بڑھا دیے۔ ابھی سپاہی نے مجھے ہتھکڑی نہیں پہنائی تھی۔ وہ پولیس افسر کے حکم کا منتظر تھا کہ بمل ہذیان بکنے لگا "نہیں نہیں ٹھیرو، ٹھیرو" وہ چیختے ہوئے بولا اور سپاہی پر جھپٹ پڑا۔ اس نے اپنے ہاتھ اُس کے آگے کر دیے "میرے ہاتھوں میں، میرے ہاتھوں میں" وہ دیوانگی سے بولا "انھیں میرے ہاتھوں میں ڈال دو۔ وہ ان کے ساتھ نہیں میرے ساتھ آئی تھی، بردوان سے، میں اُسے بردوان سے لایا تھا۔ ہم دونوں حیدر آباد جا رہے تھے، یہ لوگ بس اتفاقاً، بالکل اتفاقاً ہمیں مل گئے تھے۔ میں تمھیں بتاتا ہوں۔ وہ بردوان کے ایک بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ اُس کے باپ بہت بڑے افسر ہیں۔ وہ میرے ساتھ اپنے گھر والوں کی اجازت کے بغیر جا رہی تھی۔ ہم دونوں کے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم گھر ہی چھوڑ دیں۔ یہ لوگ ہمیں دلی میں ملے تھے، گاڑی میں، اسٹیشن پر" بمل سانس لیے بغیر کہتا رہا "سب میرا قصور ہے۔ نہ میں اُسے گھر سے لاتا، نہ وہ اس طرح روٹھ کے جاتی۔"

وہ بین کرنے لگا، میں نے اُس کی زبان بند رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن بمل اپنے آپے میں نہیں رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو اُبل رہے تھے۔ آواز پھٹی ہوئی تھی۔ اسے جیسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، نہ جانے کیا کیا بکے جا رہا تھا۔

"بیٹھو، بیٹھو۔ شور مت مچاؤ" پولیس افسر نے گرج کے کہا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُسے قابو میں رکھیں۔

"انسپکٹر صاحب! یہ سب غلط کہہ رہے ہیں۔ مجھے پھانسی دے دیجیے۔ مجھے سولی پر لٹکا دیجیے۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا، اُس کے بغیر میں زندہ رہ بھی نہیں سکتا۔ ان کا کوئی دوش نہیں ہے، کوئی دوش نہیں ہے۔ یہ نہ جانے کہاں جا رہے تھے۔ ان سے کچھ مت پوچھیے" سارا کمرہ اُس کی بلکتی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

"بیٹھو" پولیس افسر نے خود کرسی سے اُٹھ کے اُسے بٹھانے کی کوشش کی۔ "اوسان میں رہو، جو کہنا چاہتے ہو، رسان سے کہو۔"

"مجھے کچھ نہیں کہنا، آپ سے میری صرف ایک بنتی ہے" وہ گڑگڑا کے بولا "مجھے اُس کے ساتھ ہی جلا دیجیے۔ میں اُس کے ساتھ ساتھ...."

"دھیرج رکھو" پولیس افسر نے ٹھیر ٹھیر کے کہا "تم کہتے ہو کہ وہ تمھارے ساتھ تھی۔"

"ہاں ہاں میرے ساتھ" بمل سینے پر ہاتھ مار کے بولا "ہم بردوان سے آ رہے تھے، بردوان سے۔"

"تم بردوان میں رہتے ہو؟"

"جی، جی" وہ ہچکیوں کے درمیان بولا "پانچ دن پہلے ہم بردوان سے چلے تھے۔"

"اِن دنوں میں کہاں رہے؟"

"پٹنے، لکھنؤ، دلی۔ دلی سے ہم حیدر آباد جا رہے تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

بمل نے اپنے بال کھسوٹ لیے "مجھے اُس کے سامنے رہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ مجھے اُسی وقت ہٹ جانا چاہیے تھا جب اُس نے اپنے دیوتا کو دیکھا تھا۔ میں نے ہی اُس کے لیے مشکل پیدا کر دی تھی۔ مجھے اُس کا خیال رکھنا چاہیے تھا کہ میرے سامنے ہونے کی وجہ سے وہ کتنی اُلجھن میں گھر گئی ہوگی۔ میں چلا جاتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ میرا کیا کام رہ گیا تھا جو میں اُس کے سامنے موجود رہا۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"یہی بات تھی انسپکٹر صاحب! یہی بات تھی، میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں، میری بات کا یقین کیجیے۔"

"تمھاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں، کھل کے بتاؤ۔"

"آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا، آپ کچھ مت پوچھیے۔" وہ دیوانوں کے مانند چلانے لگا "وہ کہاں ہے؟ اُسے آپ نے کہاں بھیج دیا ہے؟ مجھے اُس کے پاس لے جائیے، صرف ایک بار، ایک بار کے لیے، میں اُس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں ہے انسپکٹر صاحب؟ مجھے اُس کے پاس لے چلیے۔"

"لے چلیں گے، تمھیں اُس کے پاس بھی لے چلیں گے۔" پولیس افسر نے مضحکہ خیز انداز میں اُسے چمکارتے ہوئے کہا "مجھے بتاؤ، تم نے اُس کے ساتھ کون سی زیادتی کی تھی، کس بات کی معافی مانگنا چاہتے ہو؟"

"میں نے اُس کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے، سب سے بڑا دوشی میں ہوں، میرے دل میں ضرور کوئی کھوٹ آ گئی تھی انسپکٹر صاحب!"

"کیسی کھوٹ؟" پولیس افسر متجسس لہجے میں بولا "تم نے اُسے دھوکا دیا تھا؟"

"نہیں، نہیں" وہ وحشت سے اپنا سر جھٹکنے لگا۔

"پھر.... پھر تم نے کیا کیا؟" پولیس افسر نے چلبلے پن سے پوچھا "تم کہتے ہو کہ تم اُسے بھگا کے لائے تھے؟"

"ایسا مت کہیے" بمل ہذیانی انداز میں بولا "وہ دیوی تھی۔"

"پانچ دن تک تم اُس دیوی کے ساتھ رہے، تنہا۔ تم نے اُس کے ساتھ ضرور کوئی...." پولیس افسر اپنی اوچھی بات پوری نہیں کر سکا تھا کہ بمل نے اُس کا گریبان پکڑ لیا اور اُس کے منہ پر طمانچے مارنے لگا۔ قریب کھڑے ہوئے سپاہیوں نے اُسے کمر سے پکڑ لیا تھا مگر اُس کی پچھاڑوں سے وہ اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اُس کے جسم میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ کسی کے ہاتھ نہیں آیا، چند لمحوں تک وہ دیوانہ وار کمرے میں منڈلاتا، شور مچاتا رہا، وہ سامنے کے دروازے سے بھاگ جانا چاہتا تھا، وہاں سپاہیوں کی دیوار دیکھ کے پلٹ پڑا جس لمحے اُس نے پولیس افسر کے گریبان پر ہاتھ ڈالا تھا میں بھی بڑھ گیا تھا مگر ایک طرف سے ابا جان میرے بازو سے چمٹ گئے تھے، دوسری طرف سے سپاہیوں نے مجھے روک لیا تھا۔ پولیس افسر ایک کونے میں ہو گیا تھا اور چیخ چیخ کے سپاہیوں کو حکم دے رہا تھا۔ اتنی دیر میں بمل نے پولیس افسر کی میز پر رکھا ہوا چاقو اُٹھا لیا۔ جیسے ہی میں نے اُس کے ہاتھ میں چاقو دیکھا، ابا جان اور سپاہیوں کی گرفت سے خود کو چھڑا کے میں نے اُس کی جانب جست لگائی۔ میں اُسے ضرور تھام لیتا لیکن مجھے دیر ہو گئی۔ بمل چاقو اُتار چکا تھا۔ میں نے جب اُسے سنبھالا اور چاقو اُس کے سینے سے باہر نکالا تو وہ اتنا ہی کہہ سکا کہ اُسے سونیا کے ساتھ ساتھ جلایا جائے، اِس کے سوا اُسے کچھ کہنے کا وقت نہیں ملا۔ اُس نے میرے

سارے کپڑے میرے ہاتھ خون سے رنگ دیے۔

اس رات کے بعد میں نے پولیس افسر کو نہیں دیکھا۔ اُس کے بجائے دوسرے کئی افسران پولیس اسٹیشن آ گئے تھے، میں نے انھیں سونیا کے باپ جیلر صاحب کا پتہ بتا دیا تھا۔ اباجان کے استفسار پر ایک سپاہی کے ذریعے ہمیں میڈیکل رپورٹ کا پتہ بھی چل گیا تھا لیکن انھوں نے ہمیں تیسرے دن صبح آزاد کیا۔ ہم حوالات کی کوٹھری سے باہر آئے تو جیلر صاحب وہاں موجود تھے، انھیں اپنے سامنے دیکھ کے مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ اُن کی آنکھیں سوجی ہوئی، اُبلی ہوئی تھیں۔ مجھ سے انھیں سلام بھی نہیں کیا جا سکا۔ وہ پہلے سے بہت بوڑھے نظر آ رہے تھے۔ میں اُن کے سامنے کسی مجرم ہی کی طرح کھڑا تھا۔ سب مجھے اُن سے بہت ڈر لگ رہا تھا کہ یہ مجھ سے کیسے کیسے سوال کریں گے مگر جیلر صاحب نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا، ایک لفظ بھی نہیں۔ وہ مجھے خالی خالی نظروں سے تکتے رہے اور انھوں نے خود ہی بڑھ کے مجھے گلے لگا لیا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں، جیلر صاحب اُلٹا مجھے تسلی دینے لگے۔

اُسی دن وہ سونیا اور رمبل کو اپنے ساتھ لے گئے۔ میں نے ساتھ چلنے کو کہا تھا لیکن انھیں اپنا ہی ہوش نہیں تھا جو مجھے جواب دیتے۔ میں خود رُک گیا، میں وہاں جا کے کیا کرتا۔ میں نے چلتے وقت اُن سے سونیا اور رمبل کے چہرے دیکھنے کی بھی التجا نہیں کی۔ جس وقت اُن کی گاڑی روانہ ہونے والی تھی، اُن کے ڈبے کے گرد بھیڑ لگ گئی تھی، بہت سے پولیس افسران، مسافر، اسٹیشن کے لوگ انھیں رخصت کرنے آئے تھے۔ بھیڑ میں مجھے وہاں پیرو، زورا اور مارٹی بھی کھڑے نظر آئے۔

جیلر صاحب کی گاڑی ۲ بجے کے قریب چلی گئی تھی۔ ۵ بجے ہم بھی ایک گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ ہمارے سوار ہوتے ہی پیرو، زورا اور مارٹی بھی ڈبے میں آ گئے۔ اُن سب کے چہرے دھندلائے ہوئے تھے اور تھکے ہوئے بھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کون سی گاڑی میں بیٹھے ہیں، کس طرف جا رہے ہیں۔ میرا دل اب کہیں جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ اباجان ساتھ نہ ہوتے تو میں کسی طرف بھی نکل جاتا، کسی ویرانے کی طرف، جہاں آدمی نہ بستے ہوں۔ اباجان نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا، میں بیٹھ گیا۔ وہ ٹھیرے رہتے تو میں بھی ٹھیرا رہتا، مجھے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا تھا، وہ جہاں چاہیں لے جائیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا، کوئی ضد نہیں کروں گا۔ ڈبے میں چڑھتے ہی میں ایک برتھ پر آ کے پڑ رہا۔ میرا بند بند دُکھ رہا تھا۔ گاڑی چلی تو پیرو دادا میری برتھ پر آ گیا اور میرا سر اپنے زانوؤں پر رکھ کے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا، مجھے سب کچھ اپنی آنکھوں کا دھوکا لگ رہا تھا جیسے میری آنکھیں جھوٹ دیکھ رہی ہوں۔ اپنا وجود بھی مجھے ایک دھوکا نظر آتا تھا۔ پیرو کی تھپکیوں سے میرا جسم اور ڈھیر ہونے لگا مگر میں اُسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن بینائی صرف آنکھوں کی تھوڑی ہوتی ہے۔

اُن تینوں کے آنے کے باوجود ڈبے کے سکوت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ سب ایک دوسرے سے بے تعلق سے اپنی نشستوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ گاڑی اسٹیشنوں پر ٹھیرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ اسٹیشن آنے پر کوئی باہر نہیں گیا۔ رات کو پیرو میرے پاس سے اُٹھ کے چلا گیا وہ جب تک بیٹھا رہا، مجھ پر بوجھ بنا رہا۔ سب مختلف برتھوں پر لیٹ گئے تھے لیکن اُن میں سے کسی کو نیند نہیں آئی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتے اور گہری گہری سانسیں بھرتے رہے۔ رات کو کسی وقت اباجان اپنی برتھ سے اُٹھ کے میرے پاس آ گئے۔ انھوں نے جھجکتے ہوئے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور جھک کے میرا چہرہ دیکھا، میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اُن کے ہاتھ مجھے اپنی پیشانی پر برف کی طرح سرد محسوس ہوئے۔ اباجان بے چینی سے میرے ہاتھ، کلائیاں اور میری گردن ٹٹولنے لگے۔ میرا سارا جسم جل رہا تھا وہ فوراً ہی پلٹ گئے۔ مجھے سامان کھکھوڑنے کی آواز آئی۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آئے تو اُن کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ انھوں نے آہستگی سے مجھے دوا پینے کے لیے کہا، میں نے کسی اکراہ کے بغیر دوا حلق میں انڈیل لی۔ پیرو، زورا اور مارٹی بھی اُٹھ گئے تھے۔ اباجان پھر وہیں میرے سرہانے بیٹھ گئے اور میرا سر دبانے لگے۔ انھوں نے کوئی اشارہ کیا ہوگا جبھی پیرو، زورا اور مارٹی میرے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔ اباجان نے میرا جسم کمبل، چادروں سے لپیٹ دیا تھا۔ وہ وہیں بیٹھے نہ جانے کیا کیا پڑھ کے پھونکتے رہے۔ "برو! برو!" باربار وہ چونک کے میرے کانوں میں سرگوشی کرتے۔ انھیں باربار شاید یہ خدشہ ہوتا تھا کہ کہیں میں مر تو نہیں گیا ہوں۔ ہر بار میں آنکھیں کھول کے انھیں یقین دلا دیتا تھا کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ میں اُن سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ بے فکر ہو کے سو جائیں، میرے لیے اتنے پریشان نہ ہوں، موت میری قسمت میں شاید نہیں لکھی ہے، میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گا، مرنے والے اور لوگ ہوتے ہیں۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مجھے کچھ ہوش نہیں ہے۔ انھیں کیا پتا تھا کہ ہوش جاتا ہی نہیں، کسی بچھو کی طرح میرے جسم میں کہیں چمٹ کے بیٹھ گیا ہے، اندر ہی اندر مجھے ڈنک مارتا رہتا ہے، میں کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کرتا ہوں تو میری رگیں کاٹنے لگتا ہے۔ میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو مجھے بہت عجیب عجیب شکلیں نظر آتی ہیں۔ بے ہنگم سا ایک شور سنائی دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی چپکے چپکے میری جان کھینچ رہا ہے، کوئی میری روح مٹھی میں بند کر لیتا ہے۔

میں اباجان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اپنی برتھ پر چلے جائیں، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں لیکن میرے ہونٹ تھرتھرا کے رہ جاتے تھے۔ میرے حلق سے آواز ہی نہیں نکلتی تھی۔ رات کا آخری پہر ہوگا کہ پیرو نے انھیں میرے پاس سے اُٹھا دیا اور خود اُن کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اباجان کے ہٹ جانے سے میرے سر سے کوئی بار سا اُتر گیا تھا۔ صبح سورج جب خوب نکل آیا تھا اور گاڑی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی کہ اباجان نے ایک بار پھر مجھے دوا پلائی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ دوبارہ اُن کے اُٹھانے پر ہی میری آنکھ کھلی۔ گاڑی ٹھیری ہوئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ باہر اسٹیشن پر بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ میرے اُٹھتے ہی مارٹی بھیگی ہوئی تولیا سے میرا منہ صاف کرنے لگا۔ زورا کے ہاتھ میں تھمے ہوئے گلاس سے میں نے کُلی کی۔ تمام سامان دروازے کے قریب رکھا ہوا تھا۔ سامان دیکھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ یہیں اترنا چاہتے ہیں۔ زورا اور مارٹی نے مجھے سہارا دے کے اُٹھانا چاہا، میں نے انھیں اپنے پاس سے ہٹا دیا، میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ ڈبے سے اترتے ہی اسٹیشن کی عمارت دیکھ کے میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ حیدرآباد کا نام پلی اسٹیشن تھا۔

"ابھی ذرا سنبھل کے راجا!" پیرو نے میرا بازو زور سے تھام لیا۔

وہ حیدرآباد ہی آئے تھے۔ فضول اپنا وقت ضائع کرنے آئے تھے۔ کاش ناگ پور سے چلتے وقت میں اُن سے کہہ سکتا کہ وہ اپنا راستہ کھوٹا نہ کریں، میں بھی انھی کے ساتھ چل رہا ہوں، میرا کہیں اور جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ میں اُن سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب کوئی ضد نہیں کروں گا، کسی سے بھی نہیں۔ وہ کہیں گے تو میں گھر سے باہر بھی نہیں نکلوں گا۔ میرا دل کہتا ہے، یہاں کوئی نہیں ہوگا مگر اب وہ حیدرآباد آ ہی گئے تھے تو نہ میرا اُن سے لوٹ جانے کو کہنا مناسب تھا، نہ اس سے کچھ حاصل تھا۔ میں اُن کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتا رہا۔ اسٹیشن پر معمولی بھیڑ تھی، باہر آنے پر بہت سے لوگوں نے ہمیں گھیر لیا، ہر شخص ہمیں اپنے ہوٹل لے جانے کے لیے اصرار کر رہا تھا لیکن اباجان نے شاید پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ وہ کون سے ہوٹل میں ٹھیریں گے۔

ابھی بتیاں نہیں جلی تھیں، شام کی سُرمئی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، اسٹیشن کے سامنے تینوں اطراف ہوٹل اور چائے خانے بنے ہوئے تھے اور سڑک پر سائکلوں، رکشاؤں، گاڑیوں کا شور گونج رہا تھا، سواری کے انتظار میں ہم باہر کھڑے تھے کہ کچھ ہی دیر میں ایک جانب سے زورا ویگن میں بیٹھا ہوا آیا۔ ہم اُسی میں سوار ہو کے عابد شاپ روڈ پر واقع ویکاجی ہوٹل میں اُتر گئے۔ یہ ایک بڑا، سرسبز اور صاف و شفاف ہوٹل تھا، کسی محل کے مانند جس حصے میں ہم آ کے ٹھیرے، اُس کی سجاوٹ بھی شاہانہ تھی۔ وہ پورا ایک مکان تھا۔ سونے کے لیے دو کمرے، بیٹھنے کا ایک وسیع کمرہ، قالین، فانوس، صوفے، بڑی گول میز، آئینے، کھڑکیوں پر رنگ برنگے پردے، وہاں دُنیا بھر کی چیزیں موجود تھیں۔ مؤدب باوردی خدمت گار الگ۔ پیرو کی طلبی پر حجام کمرے میں آ گیا، نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد اُن کے چہروں کی اصل رنگت کچھ واپس آئی، اباجان کے کہنے پر میں نے بھی کپڑے بدل لیے تھے۔ چائے پی کے وہ چاروں نشست گاہ میں میرے گرد بیٹھ گئے اور خاموش ہی بیٹھے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ اُن کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ باربار اُن کی سوالیہ نظریں میری طرف اُٹھتی تھیں جیسے پوچھتے ہوں، اب کیا حکم ہے لیکن پیرو نے زیادہ دیر تک مجھے اُن کی سہمتی نظروں کا ہدف نہیں بننے دیا۔ ہمیں وہاں ہوٹل کے کمرے میں ٹھیرے ابھی ایک گھنٹے سے زیادہ نہ گزرا ہوگا کہ اُس نے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُس کے اشارے پر میں سٹ پٹا گیا تھا مگر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں اُن سے کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر آ گئے تھے، ہوٹل کی گزرگاہ میں رُک کے اُس نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا "جانی! ابھی چلے!"

"کہاں؟" میں نے بدحواسی سے کہا۔

"اُودر ہی۔ ابھی ٹیم ہے راجا! دیا جلے دیری نہیں ہوا ہے۔ ہاتھ پیر ٹھیک چلتا ہے تو ابھی اودر جا کے دیکھتا ہے۔"

"نہیں دادا! کہیں مت جاؤ۔"

"کیوں راجا؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"بس دادا! گھر چلو۔"

"اوئے نئیں۔" وہ میری پیٹھ پر دھپ مارتے ہوئے بولا۔ "ایسا کیسے بولتا ہے، ایدر پھر کیا مخول کرنے کو آیا ہے؟"

"ہاں! ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "میرا جی

ب.... کہیں جانے کو نہیں چاہتا۔ وہاں جانے سے کچھ بھی
ں ہوگا، کہیں بھی، کہیں بھی جانے سے کچھ نہیں ہوگا، بس دادا!
لَوٹ چلو۔ ادھر بھی کوئی نہیں ہوگا۔"
"کیسے نہیں ہوگا۔" وہ تنک کے بولا۔ "اُدھر تونے اپنی
کھوں سے پتہ دیکھا تھا۔"
"دیکھا تھا لیکن....."
اُس نے مجھے گلے سے چمٹا لیا اور کہنے لگا کہ یوں حوصلہ
ہیں ہارتے۔ آدمی کو آخری دم تک اُمید باقی رکھنی چاہیے۔
"دادا! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔
"کاہے کا ڈر؟" وہ میرے بازو پکڑ کے جھنجوڑنے لگا اور
بے قراری سے بولا۔ "اپن یہ کیا سنتا ہے راجا جانی! قسم سے بھل
ہائی ایدر ہوتا تو ابھی تیرے کو اُلٹے ہاتھ کا دکھاتا۔"
"میری بات مان لو دادا!" میں نے عاجزی سے کہا۔
"ابھی سب کچھ اپن پر چھوڑ دے راجا! اپنے پر اتنا بوجھ مت
ال۔ ایدر اپن کا کچھ ٹھیک چلتا ہے۔" وہ آنکھیں مٹکا کے بولا۔ پھر
نرمی سے کہنے لگا۔ "پر اپن سمجھتا ہے، ابھی تیرے ملتھے سے اودر
ناگ پور والا بڑی کا نشہ نہیں اُترا ہے، ایسے اُتر بھی نہیں سکتا
راجا! وہ تجھ کو جامنی بائی والا بات یاد ہوگا۔ اودر بھی سالا ایسا ہی
کچھ ہوا تھا۔ اُوپر جاکے جامنی بائی ابھی تک اپن سے مستی کرتا ہے۔
جا تو وہ اپنے کو مار کے نہیں گیا تھا، اپن کی چھاتی میں بھونک کے
گیا تھا پر راجا! تیرے دادا نے مردن کے ہی جامنی بائی کا داؤ
بھگتا یا ہے۔ جامنی بائی کے ٹیم اپن بھی تیری عمروں کا تھا۔ سونیا
اپن کو بھی...." اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ ایک دم دیوی کے مانگت
میرا جسم تھرانے لگا تھا۔
پیرو مجھے دھکیلتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ "ابھی چل کے
اُودر دیکھتا ہے۔" وہ حتمی لہجے میں بولا۔ "سالا اب نہیں تو سویرے
کا گاڑی پکڑ لے گا، ابھی تو اپنے من میں اندھیرا رکھ کے ہی چل۔
زیادہ سے زیادہ لوٹ آئے گا، پھر اور کیا ہوئے گا۔" وہ ہوٹل سے
باہر آگیا تھا، گیٹ کے سامنے ہی ہمیں ہاتھ کا رکشا مل گیا۔ اُسے
یاد تھا کہ مرادآباد کے مسافر خانے کے رجسٹر میں مولوی صاحب
نے حمایت نگر کا پتہ لکھوایا تھا۔ عابد شاپ روڈ سے وہاں کا
فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا، روشنیاں جل چکی تھیں لیکن ابھی اندھیرا
گہرا نہیں ہوا تھا۔ سڑکوں پر ہر جانب راہ گیروں اور سواریوں کا اژدہام
متحرک تھا۔ ساری دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ کنگ کوٹھی سے گزرتا
ہوا رکشا جلد ہی حمایت نگر کے علاقے میں داخل ہوگیا۔ پیرو نے پہلے
ہی نکڑ پر اُسے چھوڑ دیا اور اندر چوڑی گلی میں کچھ دور تک پیدل
ہی چلتا رہا، اُس کی تیز رفتاری کا مجھے بھی ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔
پیرو کو پورا پتہ ازبر تھا۔ راستے میں ایک راہ گیر کو متوجہ کرکے اُس
نے خرم منزل کا پتہ پوچھا، وہ شخص خود نووارد تھا مگر کچھ آگے چل
کے پرچون کی ایک دکان سے ہمیں خرم منزل کا راستہ معلوم ہوگیا۔
حمایت نگر کے سارے علاقے میں بڑے بڑے مکانات تھے۔
اُن کی طرزِ تعمیر ہی سے ظاہر تھا کہ وہاں بڑے لوگ بستے ہیں۔
یہاں مولوی صاحب کے رہنے کا ویسے بھی کوئی امکان نہیں تھا
لیکن پیرو دُکان دار کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھتا رہا۔
چند منٹ کی مسافت کے بعد ہم خرم منزل کے سامنے تھے۔ لمبی
چوڑی چار دیواری کے اندر وہ ایک جدید طرز کی کوٹھی تھی، چاروں
میں ہر طرف اُونچے اُونچے درخت اُٹھے ہوئے تھے، یہاں آکے
جیسے مجھے کچھ ہوش آگیا تھا، میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا
مسافر خانے کے رجسٹر پر یہی پتہ لکھا تھا۔ کیا عجب وہ یہیں ہوں
کوئی تو بات ہوگی جو مولوی صاحب نے یہاں کا پتہ لکھوایا تھا
کیا معلوم ابھی وہ میرے سامنے کھڑے ہوں، میرے سارے جسم سے
پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔ لوہے کے بڑے گیٹ پر سیاہ رُو
دربان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، وضع قطع سے وہ کوئی عرب معلوم
ہوتا تھا۔ پیرو نے اُسے سلام کیا اور تصدیق کی کہ خرم منزل یہی ہے۔
دربان نے اثبات میں جواب دیا۔ پیرو نے اُس سے مولوی
صاحب کا نام لیا۔
"نکو بابا!" دربان اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہاں اس نام
کوئی آدمی نہیں رہتا، یہاں نواب غازی ثروت یار جنگ رہتے ہیں۔"
میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہ سُن کے مجھے کچھ سکون ہوا
تھا۔ "ایدر مولوی محمد شفیق نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا؟" پیرو نے
تکرار کی۔
"ابھی کیا بولاتا آپ کو؟" دربان نے تلخی سے کہا۔
"کبھی رہتا بھی نہیں تھا؟"
دربان نے اُسے بتایا کہ جب سے کوٹھی تعمیر ہوئی ہے، یہاں
ہی خاندان رہتا ہے، نواب قدرت یار جنگ کا خاندان۔
پیرو اُس کا جواب سُن کے چند لمحے دَم سادھے کھڑا رہا
نے بیچ میں دخل نہیں دیا۔ "کیا اپن نواب صاحب کو مل سکتا ہے؟"
پیرو نے اُس سے التجا کی۔ "اپن بہت دُور سے آئے ہیں، ہو سکے
اپنے ساتھ تھوڑا مہربانی کرو۔"
دربان کسمسانے لگا اور آخر پیرو کے اصرار پر آمادہ ہوگیا۔
وہاں ٹھہرا کے اور دروازہ بند کرکے وہ کوٹھی میں گیا اور چند ہی منٹ
بعد واپس آگیا، نواب صاحب نے اجازت دے دی تھی۔ دربان

ہمیں عمارت کے ایک آراستہ کمرے میں لے جاکے بٹھا دیا۔ اندر سے
ایک ملازم نے آکے ہمارے آگے خشک میوہ، میوے کے پیالے رکھ
دیے۔ کچھ دیر بعد شیروانی میں ملبوس درمیانے قد، مضبوط کاٹھی کا ایک
شخص اندر داخل ہوا، عمر پچیس ۲۵ سال کے قریب ہوگی، رنگ سرخی،
آنکھیں بڑی اور لال لال تھیں، ہم دونوں کھڑے ہوگئے۔ "یہ نیازمند کو
ثروت یار کہتے ہیں۔" وہ بھاری آواز میں بولا اور ہمیں بیٹھ جانے کا
اشارہ کیا، وہ ہمیں دیکھ کے کچھ متذبذب سا ہوگیا تھا لیکن متانت
سے پوچھنے لگا کہ وہ ہماری کیا خدمت کرسکتا ہے۔
"اپن کو ایک آدمی کی تلاش ہے نواب صاحب!" پیرو نے
بے لہجے میں زبان کھولی۔ "اپن کو پتہ لگا تھا کہ وہ ایدر ہی رہتا ہے۔"
"کون سے آدمی کی؟" نواب نے تردد سے پوچھا۔
"اُس کا نام مولوی محمد شفیق ہے۔"
"مولوی محمد شفیق!"
"ہاں ہاں۔" پیرو نے اضطراب سے کہا۔ "اپن کو مرادآباد سے
پتہ چلا تھا کہ وہ ایدر ہی رہتا ہے۔ اپن نے اس واسطے آپ کو
تکلیف دیا ہے کہ اگر وہ ایدر نہیں رہتا تو شاید آپ کو اُس کا پتہ ہوئے۔"
"آپ مرادآباد والے مولوی شفیق صاحب کو پوچھ رہے ہیں؟"
میرے کان دھمکنے لگے تھے۔ پیرو کے بجائے میں نے تیزی
سے کہا۔ "ہاں ہاں وہی، وہی مولوی شفیق صاحب! کیا، کیا آپ
انھیں جانتے ہیں؟"
اُس کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ "ہاں۔" وہ پلکیں پٹ پٹاتے
ہوئے بولا۔ "مجھے اُن سے کسی قدر نیاز حاصل ہے لیکن اصل میں...."
ایک دم وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور متوحش نگاہوں سے ہمیں گھورتا
ہوا بولا۔ "معاف کیجیے، مجھے آپ حضرات کے تعارف کا موقع نہیں
مل سکا۔"
"اوہ۔" پیرو اُچھل کے بولا۔ "اِس کا نام بابر زماں ہے اور اپن
کا صفدر علی۔" پیرو کو جلدی میں کوئی اور نام یاد نہ آیا تو اُس نے
جان ہی کا نام لے دیا۔
"خوب!" نواب نے سر ہلا کے کہا۔
وہ کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ پیرو نے اُسے بولنے نہیں دیا۔
"اپن مولوی صاحب کی کھوج میں ہے، بہت دِنوں سے اُس کا کوئی
پتہ نہیں چلا، جیسے ہی اپن کو مرادآباد میں ایدر کا معلوم ہوا، اپن سیدھا
رستا بولو آگیا، اپن بہت مجبوری میں آپ کے پاس آیا ہے، اگر
آپ کچھ جانتے ہو تو اپن کو بتادو، آپ کا بڑا احسان ہوگا۔" پیرو نے
ایک ہی سانس میں کہنے کی کوشش کی۔
"ضرور، ضرور۔" نواب جھجکتے ہوئے بولا۔ "مگر ایسی کیا بات ہے
جو آپ کو اُن کی اس قدر تلاش ہے؟"
"ایسا ہی کچھ ہے نواب صاحب!" پیرو نے اضطراری
لہجے میں کہا۔
"اگر آپ مناسب سمجھتے ہوں تو مجھے کچھ بتائیں۔"
"ابھی اپن آپ کو کیا بولے، سمجھو اپن کو اُس کا کوئی چیز لوٹانا
ہے۔" نواب غور سے سنتا رہا، پیرو کا جواب سُن کے اُس کی
آنکھوں کی بے چینی کم نہیں ہوئی، شائستگی سے بولا۔ "آپ کی بات
مجھ پر واضح نہیں ہوئی، شاید آپ کی مراد ہے کہ آپ کو اُن کی کوئی
امانت لوٹانی ہے اور وہ آپ کو نہیں مل رہے ہیں؟"
"ایک دم ایسا ہی۔" پیرو اُچک کے بولا۔
نواب مولوی صاحب کے بارے میں مزید کچھ جانتا تھا۔ میں
نے سوچا، اُس سے وضاحت کر دوں لیکن میری سانسیں حلق میں
اٹکی ہوئی تھیں۔
"آپ مولوی صاحب قبلہ کے کوئی عزیز....."
نواب کی بات ادھوری رہ گئی۔ پیرو نے بے عجلت کہا۔ "ایسا
کوئی بات نہیں ہے جو آپ کچھ اور سوچو۔ ابھی اپن کا بات ذرا دھیان
سے سنو نواب صاحب! یہ مولوی صاحب کا رشتے دار ہے اور اپن کا
اس سے چھوٹے بڑے کا ناتا ہے۔ اپن کا بیٹا مانگ سمجھو۔ یہ اودر بمبئی
میں اپن کے باڑے میں ساتھ کام کرتا ہے۔" پیرو ایک ایک لفظ
پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "ابھی کچھ سمجھا نواب صاحب! مولوی صاحب
آٹھ نو سال سے مرادآباد میں نہیں رہتا، یہ اُس کے لیے بہت پریشان
ہے۔" پیرو نے رُک کے پوچھا۔ "ٹھیک ہے؟" نواب نے مسکراتے
ہوئے سر ہلایا۔
"ایدر یہ بمبئی میں تھا کہ مولوی صاحب سالوں بعد وطن لوٹا اور
اپنا مکان بیچ کے پھر کہیں چل دیا۔ بمبئی سے گھر لوٹنے پر اس کو پتہ
چلا کہ مولوی صاحب مرادآباد آیا تھا اور مسافر خانے میں ٹھہرا تھا، کاغذ
پہ ایدر آپ کا پتہ لکھا تھا۔ ابھی آپ نہیں سمجھے ہو تو اپن کو بولو۔"
"نہیں نہیں۔" نواب نے کسی قدر خجالت سے کہا۔ "میں سمجھ گیا،
آپ کو میری یہ حجت ناگوار گزری ہے تو مجھے افسوس ہے، آپ اتنی
دُور سے تشریف لائے ہیں، آپ کے کسی کام آنے پر مجھے مسرت
ہوگی مگر ایک بات غور طلب ہے۔ آپ فرما رہے ہیں کہ مولوی
صاحب سالوں بعد مرادآباد آئے تھے اور وہاں سے پھر کہیں چلے
گئے، لازماً وہ مرادآباد میں مشترک دوستوں اور عزیزوں سے ملے ہوں
گے، اُن سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہنی چاہیے کہ کسی امانت کی

واپسی کے سلسلے میں اُن کے عزیز بابرزماں صاحب اُن کے لیے مضطرب ہیں مولوی صاحب کو اُن کے ذریعے بابرزماں صاحب کا پتہ بھی مل جانا چاہیے۔ ظاہر ہے مُراد آباد سے اپنی عدم موجودی کے سبب آپ نے اتنی احتیاط یقیناً کی ہوگی کہ اگر کبھی بھولے بھٹکے وہ اِدھر آنکلیں تو آپ کا بمبئی کا پتہ دے دیا جائے۔ آپ کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے آپ سے رابطہ قائم نہیں کیا، گویا انھیں اُس امانت کے سلسلے میں کوئی تردد نہیں ہے اور وہ اپنی گوشہ نشین زندگی میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔“

نواب کا لب و لہجہ شائستگی سے عاری نہیں تھا۔ ”آپ نے اس پہلو پر غور نہیں کیا؟“ وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

پیرو نے پہلو بدل کے میری طرف دیکھا اور تندی سے کہنے لگا۔ ”نواب صاحب! آپ ٹھیک ہی بولتا ہے، شاید ایسا ہی ہو کہ وہ اس سے ملنا نہیں چاہتا ہو۔ اُو دو برس گزرے، آپس میں ایسا ہی کوئی اُنیس بیس بات ہو گیا تھا جو وہ سدا کے لیے روٹھ کے چلا گیا، خط پتر کچھ بھی نہیں بھیجا۔“ پیرو کو پھر بہانہ ہی تراشنا پڑا، کسمساتا ہوا بولا۔ ”ابھی یہ اُس سے مل کے معافی مانگنا چاہتا ہے، مولوی صاحب کی بہو نے اُس کا جو جائداد ہتھیا لیا تھا، یہ اُس کا بیٹا، اب اُس کو واپس کرنا چاہتا ہے، اِس کو اُس سے ملنے دیو، دونوں ایک بار ملے گا تو سارا بادل خلاص ہو جائے گا۔“

نواب نے ہنکاری بھری اور پہلی بار اُس کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمودار ہوئے مگر چند ثانیوں کے لیے، پھر وہ جیسے کہیں کھو سا گیا۔ ”ابھی آپ کیا سوچنے لگے ہو نواب صاحب! کیا آپ کو اپنے بولے پر یقین نہیں آتا ہے؟“ پیرو نے اُسے چپ دیکھ کے ٹوکا۔

”نہیں حضرت!“ وہ سر اُٹھا کے بوجھل لہجے میں بولا۔ ”ایسی بات نہیں ہے۔“

”پھر آپ چپ کیوں ہوتے ہو؟“

”سوچتا ہوں کیا بتاؤں آپ کے کس کام آسکتا ہوں۔“ نواب نے افسردگی سے کہا۔ ”کاش میں آپ سے یہ سب کچھ نہ پوچھتا۔ آپ کا اضطراب دیکھ کے مجھے کچھ وحشت سی ہوئی تھی، چونکہ بہرحال مولوی صاحب سے ایک ربطِ خاطر مجھے بھی رہا ہے۔ نہ جانے آپ نے میری ان غیر ضروری باتوں سے کیا توقع باندھ لی ہو۔ مجھے آپ کو پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا کہ میں مولوی صاحب قبلہ کے موجودہ کوائف سے قطعی لاعلم ہوں۔“

”کیا مطلب! ابھی آپ کیا بولتے ہو نواب صاحب؟“

”ہاں حضرت! سچ یہی ہے کہ میں اُن کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ آپ کی تاثر انگیز باتیں سن کے مجھے اب خفت ہو رہی ہے کہ میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتا۔“

”آپ کو آپ کو کچھ نہیں معلوم؟“

”یہی سمجھیے۔“ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کو بتاتا ہوں، مولوی صاحب سے میری شناسائی والدِ مرحوم کے توسط سے ہوئی تھی۔ ان دونوں کے مراسم دیرینہ تھے۔ میرا اُن کا تعلق بھی و ادب سے زیادہ نہیں رہا۔ دو سال ہوئے، والد صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کوئی ڈیڑھ مہینے پہلے غالباً اتنا ہی عرصہ ہوا ہوگا، مولوی صاحب یہاں تشریف لائے تھے۔“

”وہ یہاں آئے تھے؟“ میں نے ڈولتی آواز میں پوچھا۔

”جی ہاں، وہ تشریف لائے تھے۔“ وہ زیرِ لبی سے بولا۔

”پھر وہ کہاں؟ اِن کا مطلب ہے، وہ کچھ بول کے نہیں گیا؟“

”میں یہی عرض کر رہا ہوں۔“ نواب کے لہجے میں مایوسی شامل تھی۔ ”بہت عرصے پہلے جب وہ تشریف لاتے تھے، یہیں قیام کرتے تھے لیکن اب زمانے بعد اُن کا آنا ہوا۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُن کے رفیقِ خاص، والد صاحب اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ اصل میں وہ انھی سے ملنے آئے تھے۔ باواجان کی موت اُن کے لیے ایک بڑا صدمہ تھی۔ دیر تک سکتے میں بیٹھے رہے۔ ویسے بھی کچھ پریشان نظر آتے تھے۔ میں نے اُن سے گزارش کی کہ وہ یہیں ٹھہریں جس طرح والد صاحب مرحوم کے وقت ٹھہرا کرتے تھے۔ اِس گھر کے مکینوں میں اب کوئی بزرگ نہیں رہا۔ وہ عجلت میں تھے، فرمانے لگے، میں ایک ضروری کام سے مراد آباد جا رہا ہوں، جلد ہی واپس ہوں گا پھر یہیں حیدر آباد میں مستقل قیام کا ارادہ ہے۔ ان شاء اللہ ملاقات ہوتی رہے گی۔ میں نے عرض کی کہ یہاں بہت جگہ ہے، میری خواہش ہے کہ حیدر آباد آکے آپ غریب خانے ہی کو اپنا گھر سمجھیں، آپ کو کہیں اور قیام کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ چپ ہو گئے، کوئی جواب نہیں دیا۔ اُن کے چہرے کے غبار سے یہ احساس ہو چلا تھا کہ وہ کسی دُکھ میں ہیں لیکن کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ غالباً اُن کا یہیں آنے کا خیال ہوگا جو انھوں نے یہاں کا پتہ لکھوایا تھا۔ اب آپ سے معلوم ہوا کہ وہ مراد آباد سے روانہ ہو چکے ہیں، ضرور راستے میں کوئی اُلجھن پیش آگئی ہوگی جو اب تک نہیں آسکے۔ یہی کچھ تشویش کا باعث تھا اور ہے جو مجھے آپ سے اتنا کچھ جاننے کی جستجو ہوئی اور آپ کی دل شکنی ہوئی۔ دُنیا بہت بُری ہے، اپنے سائے سے بھی آدمی کو شک ہوتا ہے، کسی شخص کے ماتھے پر اُس کی نیت نہیں لکھی ہوتی، اتنے دنوں بعد کوئی انھیں اچانک اس طرح پوچھتا ہوا آتا ہے تو ایک

پیدا ہو جاتا، میرا خیال ہے قدرتی امر ہے، آپ بھی میری جگہ ہوتے تو.....“

وہ فضول باتیں کر رہا تھا، میں نے اُس کی بات کاٹ کے پوچھا۔ ”اُن کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا؟“ میری آواز مجھ کو بوجھ لگ رہی تھی۔

”نہیں۔“ نواب نے مستعدی سے کہا۔ ”وہ اکیلے آئے تھے۔“

لمحوں سکوت چھایا رہا، پھر نواب ہی نے یہ خاموشی توڑی، کہنے لگا۔ ”ایک خیال آتا ہے، ہو سکتا ہے وہ حیدر آباد واپس آگئے ہوں اور یہاں کسی سبب سے نہ آسکے ہوں۔ وہ ایک خود دار باوضع آدمی ہیں۔ ممکن ہے انھوں نے یہاں رہنا مناسب سمجھا ہو۔ حیدر آباد کوئی چھوٹا شہر نہیں، آدمیوں کا جنگل ہے، ہو سکتا ہے کہ مولوی صاحب.....“

پیرو یکایک کرسی سے اُٹھ گیا، اُس کے ساتھ ہی میں بھی۔ نواب ہڑبڑا سا گیا اور لجاجت آمیز لہجے میں ہم سے کچھ دیر مزید ٹھیرنے کا اصرار کرنے لگا۔ چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی ہوگی، نواب کو اُس کا خیال آیا تو وہ اور خجل ہو گیا مگر کچھ کھانے اور پینے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ ہم نے جیسے تیسے معذرت کر لی۔ پوچھنے لگا، کہاں قیام ہے، کب تک رہنے کا ارادہ ہے، اپنا مہمان بنانے کی دعوت بھی اُس نے دی۔ آخر تک رد کرتا رہا، عمارت کے دروازے تک وہ ہمیں چھوڑنے آیا، ہم باہر آگئے تھے کہ پیچھے سے اُس کی آواز پھر سنائی دی اور اس سے پہلے کہ ہم پلٹ کے اُس کے پاس پہنچتے، وہ خود لپکتا ہوا ہمارے پاس آگیا اور نرم لہجے میں بولا۔ ”مناسب ہو تو مجھے اپنا پتہ دیتے جائیے۔ خوش قسمتی سے کبھی مولوی صاحب واپس آگئے، جلد یا بدیر تو مجھے آپ تک رسائی کے لیے آسانی رہے گی۔ میری دُعا ہے، خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ اور خود ہی بولا۔ ”یقین رکھیے۔ میں مولوی صاحب کو آپ کی آمد کی اطلاع نہیں دوں گا، پہلے آپ کو خبر کر دی جائے گی۔ کوئی عجب نہیں کسی دن وہ آہی جائیں، آپ کے اور اُن کے درمیان رفاقت کا وسیلہ بننے میں مجھے خوشی ہوگی۔“ جانے وہ کیا کیا کہتا رہا، میں نے اُسے بمبئی میں جولین کا پتہ دے دیا۔

راستے میں نہ پیرو مجھ سے، نہ میں نے اُس سے کوئی بات کی۔ خرّم منزل سے نکلنے کے بعد دُور تک آہستہ قدموں سے ہم پیدل چلتے رہے۔ سڑکوں پر اتنی چہل پہل نہیں تھی، اِکا دُکا دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ بہت دُور آکے پیرو رکشا میں بیٹھ گیا، وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ہوٹل میں بھی وہ چپ چپ رہا۔ باباجان، زورا اور ماسٹی میں سے شاید کوئی باہر نہیں گیا تھا، سب ہمارے منتظر تھے اور انھوں نے رات کا کھانا ابھی نہیں کھایا تھا۔ اُن کی وجہ سے ہم بھی کھانے پر بیٹھ گئے اور کھانے کے دوران پیرو سر جھکائے لقمے ٹونگتا رہا۔ درمیان میں ماسٹی نے ڈرتے ڈرتے مخاطب ہونے کی جرأت کی اور پوچھا، ”دادا! طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ پیرو نے اُسے جھڑک دیا۔ اُن کے پاس کوئی اور کام نہیں تھا۔ کھانا کھا کے کچھ دیر تو کھڑکیوں پر کھڑے باہر کا منظر دیکھتے رہے پھر اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ زورا، پیرو کی ٹانگیں دبانے اُس کے بستر پر آیا تھا۔ پیرو نے اُسے بھی منع کر دیا، وہ میرے ساتھ ہی کے بستر پر لیٹ گیا تھا اور رات گئے تک کروٹیں بدلتا، گہری گہری سانسیں بھرتا رہا۔ اُس کی اس گھٹن سے مجھے بہت اذیت ہو رہی تھی۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا مگر اُسے شاید کچھ ایسا ہی یقین تھا کہ صرف جانے کی دیر ہوگی، مولوی صاحب خرّم منزل کے دروازے پر ہمیں اپنے منتظر ملیں گے۔

اُسے کیا خبر تھی کہ میں اور مجل مہینوں شہروں شہروں، گلیوں کوچوں کی خاک چھانتے رہے ہیں، ہر جگہ ایک ہی جواب ملتا تھا۔ میں پیرو سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ میری وجہ سے اتنا پریشان نہ ہو، میں تو اس کا عادی ہو چکا ہوں جیسے بھکاری دروازے پر دستک دے کے نامراد لوٹنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، آدمی کا نصیب ہی کالا ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ میرا نصیب یاوری کرے گا تو مولوی صاحب مجھے خود ڈھونڈ لیں گے۔ کبھی اُن کے دل میں خدا رحم ڈال دے۔ میرے لیے نہیں تو کورا کے لیے سہی۔ جو زہرہ کہتی تھی، وہی نواب ثروت یار نے بتایا تھا اور وہی مراد آباد میں عادل صاحب کہتے تھے کہ مولوی صاحب کو سکھ نہیں ہے۔ انھیں کہیں بھی چین نہیں ملے گا۔ وہ کورا کو مجھ سے دُور رکھنے کے کتنے ہی جواز ڈھونڈیں لیکن اُن کا دل خود انھیں کچوکتا ہوگا کہ کورا کسی کی امانت ہے۔ کورا کی خاموشی، اُس کی اُداسی ہی بار بار انھیں اس امانت کا احساس دلاتی ہوگی۔ انھیں اتنے عرصے میں یہ جان لینا چاہیے تھا کہ کورا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ واپس لانے کے لیے کوئی دوسری تدبیر ممکن نہیں ہے۔ وہ لاکھ اُس کا سایہ بنے رہیں، اُس کے لیے دُنیا بھر کا عیش فراہم کر دیں، اپنی جان نچھاور کر دیں مگر اُس کی آنکھوں، اُس کے سینے سے وہ میرا چہرہ نہیں کھرچ سکتے۔ ارشد کا رشتہ، رانا مہتاب کا رشتہ، کتنے رشتے اُس کے لیے آئے ہوں گے، اُن سب کو مسترد کر دینے کا سبب محض یہی نہیں ہوگا کہ وہ کسی شہزادے کے انتظار میں تھے یا اُس کی جدائی کا تصور اُن کے لیے بہت شاق تھا۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں گے کہ اُس دن اُن کا سایہ بھی کارگر نہیں

ہوگا جس دن اُس کی آس ٹوٹ گئی۔ اُنھوں نے اتنے دنوں میں خوب جان لیا ہوگا کہ وہ کسی کا گھر نہیں بسا سکتی۔ وہ اُس کا آخری دن ہوگا جس دن میرے بجائے وہ اُسے کسی اور کے حوالے کرنے کا گناہ کریں گے یا پھر مولوی صاحب کو یہ توقع ہے کہ ایک دن وہ خود تھک جائے گی، وقت کی گرد بہت کاری ہوتی ہے، بڑے بڑے شگاف بھر جاتے ہیں۔

مولوی صاحب کو اسی دن کا انتظار ہوگا، اُس لمحے کا جب وہ اُس کے متعلق جو چاہیں فیصلہ کر سکیں لیکن اگر وہ لمحہ نہیں آیا! یہ تلخ حقیقت بھی تو اُن کے ذہن میں ہونی چاہیے کہ وہ لمحہ نہ آنے کی صورت میں کیا کریں گے: کیا وہ زندگی بھر یوں ہی اُسے زمانے بھر کی نظروں سے بچائے شہر شہر مارے مارے پھرتے رہیں گے اور کیا اپنی زندگی کا اُنھیں ایسا اعتماد ہے۔ نو سال اُن کی زندگی میں بڑھے نہیں، گھٹے ہی ہیں، پھر اُنھوں نے کورا کے لیے کون سا سائبان دیکھ رکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی بات اُن کے ذہن میں نہیں ہے، بس اُنھیں کورا اتنی عزیز ہو گئی ہے کہ وہ اُسے کسی طرح جُدا کرنا نہیں چاہتے۔ دُنیا میں اُن کا اپنا کوئی بھی نہیں رہ گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اُن کا گھر بنا ہے اور اس گھر میں کورا جیسی لڑکی ہے۔ کورا کی صورت میں اُنھیں سب کچھ مل گیا تھا۔

وہ اُسے دیوانگی کی حد تک چاہتے ہوں گے جبھی وہ کچھ نہیں سوچتے۔ زہرہ کہتی تھی کہ مولوی صاحب کو دُنیا میں جیسے کورا کے سوا کسی سے واسطہ نہیں تھا۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ لڑکیاں تو پرائی ہوتی ہیں، اُنھیں کسی نہ کسی روز گھر سے جانا ہی ہوتا ہے۔ ارشد کے لیے منیر علی کی بات مان کے وہ اُس سے دُور نہیں ہو جاتے۔ ارشد اور منیر علی اُنھیں اپنے ساتھ ہی رکھتے مگر ایک تو اُنھیں کورا کی طرف سے اطمینان نہیں ہوگا کہ وہ اُن کا فیصلہ قبول کر لے گی، دوسرے اُنھیں اپنی طرف سے اطمینان نہیں ہوگا کہ وہ کورا کی اتنی جُدائی بھی برداشت کر سکیں گے، کورا پر اُن کا اختیار جو ختم ہو جائے گا۔ وہ کسی اور کی مِلک ہو جائے گی اور اُن کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی۔ اس کے سوا اور کیا بات ہو سکتی ہے، پر ایک دن وہ خود سپر ڈال دیں گے، ایک دن اُنھیں میری تلاش میں نکلنا ہی ہوگا، کلکتہ جیل جا کے وہ میرے بارے میں پوچھ گچھ کریں گے اور وہاں سے مجھ تک پہنچنے میں اُنھیں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ وہ لامحالہ اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ کورا کے لیے وہ کوئی اور فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یقیناً وہ مجھ سے بہت خوف زدہ ہو گئے ہیں لیکن کبھی نہ کبھی اُنھیں مجھ قاتل، سزا یافتہ، مجھ آوارہ کے پاس آنا ہی پڑے گا۔ کورا کی آہیں ایک دن ضرور رنگ لائیں گی۔

کمرے میں نسبتہً گرمی تھی، میں بستر پہ لیٹا ہوا اُنھی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا، روز ہی یہ بے سروپا تاویلیں میرے سر میں بلبلانے لگتی تھیں۔ ہر روز میں ارادہ کرتا تھا کہ اب کچھ نہیں سوچوں گا، اندھوں کی طرح سب دیکھتا، بہروں کی طرح سب سُنتا رہوں گا، میں خود کو کوئی فریب نہیں دوں گا مگر یہ میرے بس میں ہی نہیں تھا۔ آدمی معذور و لاچار ہو تو قرار آجاتا ہے کہ کوئی دیکھ نہیں سکتا، کوئی سُن نہیں سکتا، کوئی چل نہیں سکتا۔ جن کے ہاتھ پیر سلامت ہیں، وہ تو معذور و مفلوج سے بدتر ہیں کہ اُن کی آنکھوں کی روشنی محض ایک فریب ہے، وہ دیکھنے کے باوجود بھی نہیں دیکھ سکتے اور سُننے کے باوجود نہیں سُن سکتے۔ اُن کی معذوری ہی اُن کی لاچاری ہے۔ کس کے پیروں میں ایسی جان ہے کہ وہ ساری سمتیں کھوج سکے۔ کس کی آنکھوں میں وہ نور ہے کہ دیوار کے پار دیکھ سکے۔

آدھی رات گزر گئی ہوگی، ہوٹل میں ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا اور فضا میں مسلسل کوئی سیٹی سی گونج رہی تھی۔ کبھی دُور سڑک پر کوئی گاڑی گزرتی تو دیر تک بازگشت سُنائی دیتی رہتی۔ پھر سناٹا چھا جاتا۔ میں آنکھیں بند کیے اپنے گلے میں پڑی کورا کی دی ہوئی مالا کے دانے گنتا رہا۔ کسی لمحے مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی تھی کہ یکایک باہر نشست گاہ میں اُبھرتی قدموں کی آہٹ سے میری آنکھ پھر کھل گئی، کسی نے ایک نظر اندر جھانک کے دیکھا۔ نشست گاہ میں مدھم روشنی کے باوجود میں پہچان گیا کہ وہ مارتی ہے۔ دوسرے لمحے وہ دروازے سے ہٹ گیا اور میں نے اُسے دائیں طرف جاتے دیکھا جب کہ اُس کا کمرہ بائیں طرف تھا۔ دروازہ کھُلا ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں واپس جاتا تو بستر سے مجھے نظر آجاتا۔ دیر ہو گئی اور وہ نہیں پلٹا تو مجھے اُلجھن ہونے لگی کہ اس وقت وہ تنہا وہاں کیا کر رہا ہے۔ پیرو کی آنکھ کھُلنے کے خیال سے میں آہستگی سے اُٹھ کے دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور یہ دیکھ کے میرا دل بیٹھنے لگا کہ مارتی کھڑکی پر کُہنیاں ٹکائے گم صُم کھڑا باہر پھیلا ہوا اندھیرا تک رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اُسے بھی میری طرح نیند نہیں آرہی ہے، شاید وہ سبھی جاگ رہے ہوں۔ اُس وقت بادل گرج رہے تھے، ہوا بھی بند بند تھی۔ بارش کے آثار تھے۔ میں اُس کے قریب پہنچا تبھی اُسے میرے آنے کا احساس ہوا اور وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔ "راجا استاد!" وہ سرگوشی میں بولا۔ "تم؟ ابھی تم بھی.....!"

"کیا بات ہے مارتی؟" میں نے اُس کا بازو پکڑ کے پوچھا۔

"کچھ نہیں راجا!" وہ نگاہیں چراتے ہوئے بولا۔

"تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

وہ سر کھُجانے لگا۔ "نیند اور سالا بستر اپن کو چبھتا ہے، ایک دم اندر کو کھینچ لیتا ہے۔ لگتا ہے آدمی اندر زمین میں دھنس رہا ہے۔"

"مجھ سے کچھ مت چھپاؤ مارتی! مجھے بتاؤ، تمھیں کیا پریشانی ہے؟"

"کچھ نہیں راجا۔" وہ کسمسا کے بولا۔ "اپن بالکل فِٹ فاٹ ہے۔"

"بس چند دن کی تکلیف اور ہے مارتی!"

"کیسا تکلیف؟" وہ چونک کے بولا۔

"میں جانتا ہوں مارتی! بمبئی سے نکلے ہوئے تمھیں کتنے دن ہو گئے۔ بمبئی یاد آرہی ہوگی، مہینے ہو رہے ہیں۔"

"ابھی تم کیا بولتا ہے۔" وہ بے تابی سے بولا۔ "اپن کے لیے اس سے بڑا پلیزر کیا ہو سکتا ہے کہ اپن تمھارے ساتھ ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن....."

"ابھی آگے کچھ نہیں بولنے کا۔" اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا اسٹرینج باتیں کرے گا تو بائی گاڈ اپن ابھی چاقو اُتار لے گا۔"

"مارتی!" میں نے بے اختیار اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

مارتی اچانک بُری طرح سسکنے لگا اور رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی تمھارے سوا اپن کا اور کوئی نہیں ہے راجا!"

"ہاں ہاں۔" میں نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔ "مگر تمھیں ایسا خیال کیوں آیا۔ مجھ سے اگر کوئی غلطی ہو گئی ہے تو مجھے معاف کر دو۔ میں تمھیں کیا بتاؤں کہ کبھی مجھے اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔"

"اپن کو پتہ ہے، ابھی جانتا نہیں ہے تو کچھ کچھ سمجھتا ہے۔ تم اباجان کے ملنے کے بعد بھی کتنا ڈسٹرب ہے، پر اپن تو تمھارا نوکر ہے۔" وہ ہچکیوں سے بولا۔ "ابھی تم کو تڑتڑ بولے۔ کبھی اپن کو ایسا لگتا ہے کہ تم اپن سے رُوٹھا ہوا ہے۔ تم اپن کے ساتھ رہ کے بھی بہت دُور ہے۔ مارتی پر تمھارا بھروسا نہیں ہے کہ تم اُس کو اپنا دُکھ شیئر کر سکو۔ اپن اس سے بہت خوار ہوتا ہے راجا!"

"ایسا مت سوچو مارتی! اتنی باتیں مت کرو۔" میں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم وہ جان کے کیا کرو گے جو تمھارے بس میں نہیں ہے۔ پہلے ہی میری وجہ سے تم اتنے دُکھ اُٹھا چکے ہو، اور پریشان ہونا چاہتے ہو؟"

مارتی جانے کب سے بھرا بیٹھا تھا، مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میرے چھیڑنے کی دیر ہوگی اور اُس کی آنکھوں سے اتنے سوتے پھوٹ پڑیں گے۔ وہ بچوں کی طرح سُبکنے لگا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کے میرے ہاتھ پیروں میں بھی جان نہیں رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اُسے کیسے سمجھاؤں، کیا کیا بتاؤں لیکن میں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اُس کا غبار دُور کرنے کی کوشش کی۔

میں نے اُس سے کہا کہ یہ بھروسے کی بات نہیں ہے، اُس پر بھروسا نہ ہوتا تو بھلا میں اُسے اپنے ساتھ تبت کیوں لے جاتا، جہاں سے زندہ واپس آجانا کسی معجزے سے کم نہیں۔ کوئی اعتبار ہی تو تھا جو اُسے بمبئی سے بُلایا گیا تھا، کسی پر کوئی ایسا ناز ہی ہوتا ہے جبھی اُس سے کوئی مطالبہ کیا جاتا ہے اور یہ تو ایک طرح زندگی کا معاملہ تھا۔ اُس نے ایسا کیوں تصوّر کر لیا۔ میں نے مارتی کو کبھی اتنا نڈھال اور شکستہ نہیں دیکھا تھا۔ میرے لیے اُس کا یہ رُوپ بالکل نیا تھا۔ یقیناً مارتی کو میرے ہی کسی رویّے سے دُکھ پہنچا تھا۔

رات کھانے کے وقت پیرو نے بھی اُسے جھڑک دیا تھا۔ نواب ثروت یار کے ہاں سے واپسی پر میرے اور پیرو کے مضطرب چہرے دیکھ کے اُس کے دل میں طرح طرح کے خدشے سر اُبھار رہے ہوں گے۔ ہمارا اچانک مراد آباد تک جانا اور راستے میں بمبئی جانے کے بجائے حیدرآباد کا ارادہ کر لینا بھی اُس کے لیے تشویش کا سبب ہوگا۔ اُسے یہی دھڑکا لگا ہوگا کہ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہے تو اُس سے کیوں چھپائی جا رہی ہے۔ مارتی کی یہ گھٹن بے جا نہیں تھی۔ کلکتے اور فیض آباد میں اُسے یہی گمان ہو گیا تھا کہ میں اُس سے دُور دُور رہتا ہوں، اُس سے بہت کم بات کرتا ہوں لیکن اُس نے صرف اپنی طرف دیکھا۔ میں بھلا سے، پیرو سے، زہرا، کلنتی سے یا اباجان، زرّیں، جہاں گیر کس سے ہر وقت چمٹا رہتا تھا؟ پر اِس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ میری نظر میں وہ بے حیثیت، بے منزلت تھے۔ میں تو اُن کے سامنے منفعلانہ کم کم آتا تھا کہ مجھ سے اپنا چہرہ چھپایا نہ جاتا تھا۔ جب بھی میں اُن کے سامنے جاتا تھا، اُن سب کی منڈلاتی نگاہیں مجھے اپنے جسم میں کھُبتی محسوس ہوتی تھیں۔

میں نے اُس سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگی تو وہ اور منتشر ہو گیا، اُلٹا میرے پیر پکڑ کے گڑگڑانے لگا کہ وہ تو میرا غلام ہے۔ جب تک میں نے اُسے اُٹھا کے صوفے پر نہیں بٹھایا، وہ میرے پیروں سے چمٹا اپنا سر رگڑتا رہا۔ میں نے اُس سے کہا کہ اگر کچھ جان کے ہی اُس کا تکدر دُور ہو سکتا ہے تو میں اُسے سب کچھ بتائے دیتا ہوں کہ وہ کوئی راز نہیں ہے لیکن اُس سے اُسے رنج کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا، وہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے جاننا میری اور اُس کی دل داری کی شرط ہو، وہ اباجان کو بھی شاید نہیں معلوم، جہاں گیر کو بھی۔ اُسے دُہراتے ہوئے میرا سینہ بہت جلتا ہے، میری رگوں میں اینٹھن ہونے لگتی ہے، مجھ سے اُسے سنایا نہیں جاتا۔ بس وہ سمجھ لے کہ میری کوئی چیز کھو گئی ہے جو مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔ مارتی کا کوئی بڑا مطالبہ نہیں تھا، اُسے جیسے بس کسی لفظ کی ضرورت تھی۔ مجھ سے یہ سُن کے وہ شرمسار سا ہو گیا تھا

سو مجھے اپنی زبان تھامنی پڑی۔ اُس کی اس عاجزی سے مجھے ندامت ہونے لگی تھی، میں نے موضوع ہی بدل دیا اور اُس کی دل بستگی کے لیے کہا۔ "اب ہم بمبئی جا رہے ہیں وہاں خاصی فرصت ہوگی، ہم اکٹھے گھومیں پھریں گے تم مجھے جہاں چاہو، ساتھ لے جانا۔ مجھے یاد ہے تبت سے جاتے وقت تم نے کہا تھا کہ میں تمھیں چاقو وغیرہ کے تمام داؤ باقاعدہ سکھاؤں۔ جو کچھ مجھے آتا ہے، وہ سب تمھیں بتادوں گا، بلّم اور لاٹھی چلانا بھی۔ ویسے تمھارا ہاتھ اب کافی رواں ہوگیا ہے، جو تھوڑی بہت جھجک ہے، مشق سے دُور ہو جائے گی۔ اصل میں تمھاری خامی بس نگاہ اور یک سُوئی کی ہے، ٹھیک ٹھیک ہاتھ چلاتے چلاتے تم اچانک بہک جاتے ہو۔ جگل بھائی کے کہنے کے مطابق چاقو سے زیادہ نظر کی مشق کرنی چاہیے، ہاتھ کی لرزش کی تلافی ممکن ہے، نظر کی نہیں۔ چاقو تو بعد کی بات ہے، وہ کہتے ہیں کہ مقصد بھی چاقو اُٹھانے کا کوئی ہونا چاہیے، بے کار میں نہیں، دھاندلی میں نہیں، چاقو بازی پورے جسم کا کھیل ہے مارٹی!"

میں نے اُسے اُس کی سمجھ میں آنے والے لفظوں میں بتانے کی کوشش کی کہ چاقو چلاتے وقت پورے جسم کی حاضری ضروری ہے، اپنے آپ کو بھول جانے کی اور کچھ کرتے رہنے سے کچھ آتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو داؤ پر لگا دینے کی مشق ہے۔

وہ میری باتیں سر جھکائے سنتا رہا، اُس نے درمیان میں دخل نہیں دیا لیکن جیسے ہی میں خاموش ہوا، وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ "راجا اُستاد، اپن کو یاد ہے اُودر تبت میں تم کو ایسا بولا تھا لیکن اُس کو بھول جاؤ، مارٹی تم کو آگے کبھی ایسا نہیں بولے گا۔"

"کیوں مارٹی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"بس اپن کو ابھی چاقو سے اتنا انٹرسٹ نہیں رہا۔"

"مگر کیوں؟"

"اپن نے چاقو سے بڑی دُنیا دیکھا ہے۔" وہ پھڑکتے ہونٹوں سے بولا۔ "چاقو جہاں سالا کشتل ہو جاتا ہے، ایک دم خلاص، اُودر ایسا کوئی ہتھیار نہیں چلتا، اُودر دوسرا ہتھیار ہوتا ہے جو دکھائی نہیں دیتا پر جس کی دھار بہت شارپ ہوتا ہے۔ اپن اب چاقو نہیں اُٹھائے گا راجا استاد! ضرورت پڑے تو بھی اوائڈ کرنے کی سوچے گا، مجبوری الگ بات ہے۔"

"یہ تو آج کیسی باتیں کر رہا ہے مارٹی؟"

"اپن سینٹ پرسینٹ ریلٹی بولتا ہے، ہتھیار دھوکا دے جاتا راجا! ہوا اپن جس ہتھیار کی بات کرتا ہے اُس کا کوئی توڑ نہیں ہے اور اُس کا کوئی داؤ پیچ نہیں ہے، ایک دم نیٹ اینڈ کلین۔"

"مارٹی!" میں نے متجسس لہجے میں کہا۔ "شاید میں سمجھ رہا ہوں، تمھارا اشارہ کس طرف ہے۔"

"ہاں راجا!" وہ تمتماتی آواز میں بولا۔ "تم یہ بات جلد سمجھ سکتا ہے کیونکہ تم اور جگل بارے کا آدمی نہیں ہے۔ اپن کو ایسا لگتا ہے کہ کسی ڈریم لینڈ گیا تھا، ایک دم اُوپر آسمان پر، جہاں فرشتہ لوگ رہتا ہے۔ اُودر زرّیں جیسا سسٹر ہے، اُودر وہ نانی، سوئٹی نیساں ہے۔ جہاں گیر، زہرہ، بڑے صاحب، جگل خانم اور ارشد صاحب ہے، وہ سب اپن سے تیز چاقو رکھتا ہے۔ آدمی کے آر پار ہو جاتا ہے۔ اپن نے دیکھا، اُودر جگل دادا بھی شرماتا ہے۔ وہ زرّیں سسٹر اُس پر حکم چلاتا ہے، دادا سر جھکا کے سنتا رہتا ہے۔ ابھی اپن کو پتہ چلا، چاقو سالا تو بہت چھوٹا ہتھیار ہے اور اڈّا، باڑا سب مخول ہے۔ اُودر دیکھو، جگل دادا چاقو کا جادو کرتا ہے۔ سوتے میں بھی مارے تو ٹارگٹ پر لگے لیکن جگل دادا چاقو اتنا کہاں اُٹھاتا ہے۔ ہتھیار تو وہ آخر کو چھوتا ہے، جب کوئی وے آوٹ نہیں ہوتا۔ پہلے وہ اَن سین ہتھیار سے ہی کام لیتا ہے اور اُس کو اِس میں بھی وہی جادو آتا ہے۔ سب جگل دادا نہیں بن سکتا۔ ابھی اپن ایک بات خوب سمجھتا ہے، جگل دادا بھی اڈّا گیری میں بلیو نہیں کرتا۔ اپن نے اس کو اسی پیراڈائز میں زیادہ گلیڈ دیکھا ہے۔ ہر آدمی اُس کے مانک دو کشتی میں سوار نہیں ہو سکتا۔ ایک جگل دادا، پیرو دادا، جامو بھائی، ہزاریں سالا گنتی کا دس بیس لوگ باگ، اُتّا پالا اور ایدر زرّیں سسٹر کا حویلی میں بیلنس کرنا بہت چکر کا کام ہے، ایزی جاب نہیں۔ اپن ایک ہی کشتی سے سیفلی کنارے پہنچ سکتا ہے تو دوسر کا لفڑا کیوں کھڑا کرے راجا!" وہ ہکلاتے لہجے میں بولا۔ "ابھی اپن کو ایسا جان پڑتا ہے کہ پہلی بار کنارے کو دیکھا ہے، ابھی مارٹی، حرام کے جننے نے دیکھنا سیکھا ہے۔"

میں گنگ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ میری نظروں میں اُس مارٹی کی شکل گھوم رہی تھی جسے میں نے پہلی مرتبہ بمبئی کی ایک گلی میں دندناتے دیکھا تھا۔ وہ جولین کے گھر پر میری آمد و رفت پر مجھ سے دھاندلی بازی کرنے لگا تھا۔ میں نے اُسے ٹالنا چاہا لیکن وہ ایک نمبر کا مجتنی تھا۔ فقرے کسے تو بھی درگزر کرکے آگے بڑھ گیا لیکن ایک دن اُس کا رویہ برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔ نتیجتہً مجھے اُس کے سامنے آنا پڑا۔ چاقو میں اُس کا ہاتھ بہت کچا تھا، مجھے کچھ بھی دیر نہیں لگی۔ گلی سے میرے لوٹتے وقت اُسے اپنی سُدھ بدھ نہیں تھی لیکن اس کے بعد وہ بمبئی کے کوچے کوچے مجھے تلاش کرتا رہا اور آخر ایک دن اُس نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا۔

میں نے مارٹی کی کسی بات کی تردید نہیں کی۔ مجھے مبہوت دیکھ کے وہ سٹ پٹا سا گیا۔ "ابھی تم کیا سوچتا ہے راجا! بولو کہ ایسا ہے کہ نہیں؟ کیا اپن ابھی سب جھوٹ بولتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے اُلجھی ہوئی سانسوں سے کہا۔

"راجا! ابھی مارٹی تم سے ایک ریکوئسٹ کرنا مانگتا ہے۔"

"کیا... کیا ہے مارٹی؟"

اُس کی پلکیں کانپ رہی تھیں۔ "تم بمبئی میں ابھی کیدر رہنے کا ہے؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"بمبئی میں!" میں نے چونک کے کہا۔ "مجھے... مجھے ابھی کچھ نہیں معلوم مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میرے گھٹنوں پر سر رکھ کے وہ دھڑکتی آواز میں کہنے لگا۔ "ابھی اَبا جان کہیں نہ کہیں اپنا ریگولر ٹھکانا تو بنائے گا؟"

"ہاں ہاں۔" میں نے ترشی سے کہا۔ "اب وہ کب تک بھٹکتے رہیں گے، اپنی جس ضد میں انھوں نے گھر بار برباد کر دیا تھا، آخر انھیں اس میں کامرانی نصیب ہوئی لیکن مارٹی؟ اس سلسلے میں ابا جان سے میری کوئی بات نہیں ہوئی ہے، میں کچھ نہیں بتا سکتا کہ اُن کے دل میں کیا ہے، کیا معلوم، ابھی وہ کسی اور دُھن میں ہوں۔"

"اپن ایسا نہیں سمجھتا، ابھی وہ بہت تھکا ہوا لگتا ہے، بالکل ٹوٹا پھوٹا۔ ابھی وہ سارا اٹینشن گھر دوبارہ جوڑنے پر ڈائی ورٹ کرے گا۔"

"ہونا تو یہی چاہیے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اور اُس گھر میں راجا! پھر تم بھی وہیں رہے گا۔ نہیں رہے گا تو بھی وہ گھر تو تمھارا ہی ہوگا۔" وہ حسرت بھرے لہجے میں بولا۔ "راجا! اُس میں مارٹی کے لیے بھی کوئی کونا ریزرو رکھو۔ دروازے پر سرونٹ کوارٹر میں۔ اپن بھی وہیں تمھارے سنگ رہنا مانگتا ہے، مارٹی پرامس کرتا ہے، عمر بھر تمھارا اور ابا جان کی سروس میں رہے گا۔" کہنے لگا کہ میں ابا جان سے اُس کی سفارش کر دوں۔

میں نے اُس کی پیشانی چوم لی۔ "تجھے سفارش کی ضرورت ہے؟" میں نے ناراضی سے کہا۔ "تو بالکل پگلا ہو گیا ہے مارٹی! ابا جان تجھے اتنا کچھ جاننے، دیکھنے کے باوجود بھی سفارش چاہیں گے؟ ہر آدمی اپنی سفارش آپ ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے ابا جان تجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں، جب کوئی کام پڑتا ہے، پہلے تجھی کو آواز دیتے ہیں۔"

"ایسا ہی ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "کوشش اُوپر والا مارٹی کے لیے اس کو ایسا ہی رکھے، اپن بھی راجا! اُس کو شکایت کا چانس نہیں دے گا۔ اُس کا سرونٹ بن کے رہے گا۔ جو وہ بولے گا، کبھی پلٹ کے سوچے گا بھی نہیں۔"

"مارٹی!" میں نے اُس کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی۔ "کیسی اُوٹ پٹانگ باتیں کر رہا ہے، گھر کا ہر آدمی ایک دوسرے کا ذکر ہوتا ہے۔"

وہ مسرت سے اپنا سر میرے گھٹنوں سے رگڑنے لگا اور اُس نے مجھے بتایا، اُسے یقین ہے کہ فیض آباد میں زرّیں نے ابا جان سے کیا کہا ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اُس نے ابا جان سے یہ التجا نہ کی ہو، وہ بمبئی سے نریما، فرہاد، فاد ہمہ اور اکبر کو لے کے یہیں آجائیں۔ حویلی میں بہت جگہ ہے۔ ابا جان نے اس سے وعدہ بھی کر لیا ہوگا کہ زرّیں کی بات ٹالنا کسی کے لیے بہت مشکل ہے، پھر جگل اور منیر علی نے بھی اُن سے یہی اصرار کیا ہوگا۔ مارٹی کی قیاس آرائی غلط نہیں ہوگی۔ ابا جان کے ذہن میں بھی کچھ ہونا چاہیے۔ وہ مستقل طور پر نہیں تو کسی مدت کے لیے زرّیں کی حویلی میں قیام کا ارادہ کر سکتے تھے۔ اس عرصے میں جب تک اُن کے خوابوں کا محل تعمیر ہو جائے، انھیں کہیں نہ کہیں تو عارضی طور پر ٹھیرنا ہوگا اور زرّیں کی حویلی سے بہتر جگہ کون سی ہو سکتی ہے۔ وہاں اُن کے دو بیٹے پہلے ہی سے رہتے تھے اور اُسے اپنا گھر سمجھتے تھے۔ حویلی میں اتنے دن رہنے کے بعد انھوں نے وہاں کے مکینوں کو خوب پرکھ لیا ہوگا۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت وہ دل گرفتہ بھی نظر آتے تھے۔

مارٹی اس بات پر بہت خوش تھا کہ اگر ابا جان نے واقعی فیض آباد میں بسنے کا ارادہ کر لیا تو وہ سب وہیں رہیں گے اور وہ اُن سب لوگوں سے قریب رہے گا، خصوصاً زرّیں سے۔ کہہ رہا تھا کہ زرّیں نے اُس کے لیے کئی جوڑی کپڑے بنوائے تھے، وہ صبح و شام اُسے پوچھتی تھی۔ نیساں اُس کے لیے طرح طرح کی چیزیں پکا کے لاتی تھی۔ زرّیں کے نام پر مارٹی آب دیدہ ہو جاتا تھا، کہتا تھا کہ مریم کی کوئی بیٹی ہوتی تو اُسی کی طرح ہوتی۔ اُس نے مجھ سے نہیں چھپایا کہ چلتے وقت زرّیں نے اُسے کیا تاکید کی تھی۔ زرّیں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ میرے قریب ہی رہنے کی کوشش کرے، میرا کچھ ٹھیک نہیں ہے کس وقت کیا من میں سما جائے، میں کس طرف نکل جاؤں، کن خطروں میں گھر جاؤں۔ اُس نے مارٹی سے کہا تھا کہ اُسے میری کوئی بات بُری لگے تو خاطر میں نہ لائے۔ مجھے معاف کرے اور نہ جانے کیا کیا۔ زرّیں نے مارٹی سے کیا، کسی سے یہی کچھ کہا ہوگا۔ زود رانے پیرو سے۔ مارٹی اُس کا ذکر اس انداز میں کر رہا تھا جیسے عبادت کر رہا ہو۔ زرّیں کی ایک ایک بات اُس کے دل پر نقش معلوم ہوتی تھی اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے زرّیں یہیں موجود ہو، کسی دیوار کی آڑ میں چھپی ہوئی ہماری باتیں سن رہی ہو۔

بادلوں کی گرج تیز ہو گئی تھی اور ساتھ ہی موسلا دھار بارش۔ چند منٹ کے لیے بجلی چلی گئی تھی اور گھپ اندھیرا چھا گیا تھا لیکن

ہم دونوں وہیں نشست گاہ کے صوفے پر بیٹھے رہے۔ مارٹی کو شاید کوئی شبہ تھا کہ آج کے بعد پھر ایسی تنہائی کا موقع ملے نہ ملے۔ وہ مجھے شو کے ہلتا، گنتی گنا تا رہا کہ وہ کتنے پھول ایسے چہرے ہیں جو میرے لیے کھلائے رہتے ہیں وہ جیسے مجھے میرا بھولا ہوا یاد دلا رہا تھا۔ ان سب کے بارے میں ایسے انکشاف کے انداز میں بتلا رہا تھا جیسے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ مارٹی نے چند دنوں میں جیسا بوجھا ہے میں اس سے بے خبر ہوں۔ اسے کیا اندازہ تھا کہ منیر علی کو کن حالات میں اپنا آبائی گھر چھوڑنا پڑا، نیساں اور خانم کس طرح حویلی میں آئی تھیں اور زریں۔ زریں کو اس کی سگی خالہ نے نسترن جیسی سفاک عورت پر بھروسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مارٹی ان سب کی داستانوں سے کہاں آشنا تھا۔ میں نے اسے نہیں ٹوکا کہ یہ سب تو میرے رگ و پے میں کھبا ہوا ہے، اسے اتنا کچھ جتلانے کی ضرورت نہیں ہے، کیا مجھے احساس نہیں ہے کہ پیرو اپنی اکلوتی بیٹی گیتا سے کتنے مہینوں سے دور ہے، گیتا کے بغیر اسے ایک پل چین نہیں آتا تھا اور وہ جولین! مارٹی مجھے بتا رہا تھا کہ "بمبئی سے تیرے جانے کے بعد اسے چپ سی لگ گئی ہے۔ کانتے بھی یہی کچھ کہتا تھا۔" وہاں چمپا بیگم اور شہ پارہ بھی موجود ہیں وہ سب میرے لیے دست بدعا رہتے ہیں۔ مجھے سب معلوم ہے لیکن بس اچانک نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ میری کوئی بات کسی کی آنکھوں میں گھٹن، کسی کی پیشانی پر شکن کا سبب بنے۔ سب خود بخود ہو جاتا ہے۔ بہرحال ایک دن کی بات اور تھی، مارٹی کے تنکے چبھونے سے پہلے میں نے طے کر لیا تھا کہ اب کوئی ضد نہیں کروں گا۔ جبل بھی پیر ٹھیک ہو جانے کے بعد مولوی صاحب کو ڈھونڈنے کے لیے باہر چلنے کو کہے گا تو میں منع کر دوں گا۔ گھر سے نکلنے کا نتیجہ میں نے خوب دیکھ لیا ہے۔ جتنا کم لوگوں سے واسطہ پڑے، اتنا ہی اچھا ہے۔ راستے میں اچانک کوئی بھی مل جاتا ہے، کبھی کرشنا جی، کبھی نشانم، کبھی سونیا۔ پیرو سے میں حیدرآباد چلنے کی ضد نہ کرتا تو سونیا مجھے کبھی نہیں ملتی اور یوں اس کی آگ اس کے سینے میں دبی رہتی جیسا کہ اتنے دنوں تک دبی رہی تھی۔

صبح ہونے والی تھی اور بارش کم نہیں ہوئی تھی۔ مارٹی نے مجھے کچھ دیر سو جانے کا مشورہ دیا، نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ میں نے اس سے کہا، اگر اسے نیند آرہی ہے تو جا کے سو جائے مگر وہ تو میرے خیال سے کہہ رہا تھا، وہیں بیٹھا رہا اور خوابیدہ لہجے میں مجھ سے بولا۔ "راجا استاد! ابھی اور بمبئی جا کے تم کتنے دنوں بعد اپنا بہن بھائی سے ملے گا؟"

مجھے جھرجھری آگئی۔ "برسوں بعد!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "دس سال سے زیادہ ہو گئے، اب تو ان کی شکلیں بھی بدل گئی ہوں گی۔"

"راجا!" وہ چمکتی آنکھوں سے بولا۔ "ابھی کیسا لگتا ہے تم کو؟ اپن تمھاری جگہ ہوتا تو سالا ہارٹ فیل ہونے کو بولتا۔ اپن سوچتا ہے اتنے دنوں بعد تم ان سے ملے گا تو کیسا سین ہوگا۔"

"ہاں مارٹی!" میں نے ڈگمگاتی آواز میں کہا۔ "پر شاید وہ پہلی نظر میں مجھے نہ پہچان پائیں، مجھ سے ڈر جائیں۔"

"ماوے نیئں۔" وہ تیزی سے بولا اور ہنسنے لگا۔ "ابھی کوئی تمھارے سر پہ سینگ اُٹھ گیا ہے، اُودر جو بلڈزود کرے گا اس کی آنکھیں کھلا رہ جائے گا کہ ابھی یہ کون سامنے پرنس کھڑا ہے، سمجھے گا ڈریم دیکھتا ہے۔"

میں نے مارٹی سے کہنا چاہا کہ انھیں تو منہ پھیر لینا چاہیے کہ کیسا بھائی ہے جو انھیں چھوڑ کے چلا گیا تھا جس کی وجہ سے ان کی ماں چھن گئی، سارا گھر اُجڑ گیا۔ ان کی بہن فہمیدہ روٹھ گئی، جہاں گیر جدا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کے تو ان کے سارے زخم تازہ ہو جائیں گے۔ انھیں تو مجھ پر تھوکنا، مجھے جوتے مارنا چاہیے۔ "ابھی اُودر ہی کی سوچتا ہے مارا جا استاد!" میری خاموشی پر مارٹی نے آنکھ مار کے مجھے چٹکی بھری۔

"ہاں مارٹی!" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"شاید ابا جان بھی اندر سے بہت گلیڈ ہوگا۔"

"ہاں شاید بہت زیادہ۔"

"ابھی ان لوگ کو ایک دم پتہ نیئں ہے کہ اپن لوگ پہنچنے والا ہے۔ بیچ میں ابا جان کو چٹھی بھیجنے کا ٹائم نہیں مل سکا۔ ایدر فادر، اُودر برادر دونوں کو آگے پیچھے دیکھے گا تو ان کا کیا ہوگا۔ دھانسو سرپرائز راجا! اپن یہی دیکھنے کو اینکشس ہے۔" وہ مچلتے ہوئے بولا۔ "ابھی اس ٹائم تم اپن کو ساتھ رکھنا، اپن تم کو سنبھالے رکھے گا۔"

"ٹھیک ہے مارٹی!" میں نے اکڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کی آواز بھڑک رہی تھی جیسے میں نہیں، وہ سال بعد وہ اپنے بہن بھائیوں سے ملنے جا رہا ہے۔ اسے مجھ سے کسی اور جواب، کسی اور لہجے کی توقع تھی جو اس کی آنکھیں بجھنے لگیں۔ لمحوں تک وہ مراسیمہ نظروں سے میری صورت تکتا رہا پھر گردن ڈال کے خاموش بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ مارٹی نے یہ ذکر دانستہ چھیڑا ہے، اس کا مقصد میرا دھیان بٹانا ہے۔ میں خود یہی چاہتا تھا لیکن میرا دماغ بار بار بھٹک جاتا تھا، میری آنکھوں میں یکایک سونیا کا چہرہ اُتر آتا تھا اور مجھے ایسا گمان ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک میرے جسم سے پیوست ہے اور میرے بازوؤں میں جھول رہی ہے۔ ابھی وقت ہے، میں اسے بچا سکتا ہوں۔ بار بار وہ میرے سامنے آ کے کھڑی ہو جاتی تھی۔ فیض آباد سے چلتے وقت فرخ، نرالا،

فارہ اور اکبر کو دیکھنے کے تصور سے میری رگوں میں سنسنی دوڑنے لگتی تھی مگر اب سارا جسم پتھر جیسا ہو گیا تھا۔ میرا کسی سے ملنے، کسی کو دیکھنے، کسی سے بولنے کو جی نہیں کرتا تھا۔ میرا وجود خود میری چڑ بن گیا تھا۔

مارٹی دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ میں نے بھی کچھ نہیں کہا لیکن پھر میں نے ہی اس کے بکھرے بال سنوارتے ہوئے اسے کچھ دیر کے لیے کمر ٹکا لینے کی تلقین کی، وہ اور مچل گیا اور اضطراری لہجے میں بولا۔ "اپن بولتا ہے راجا! ابھی سب بھولنے کا ٹرائی کرو۔"

"کیا بھولنے کی؟" میں نے ناتوانی سے کہا۔

"بس راجا! ابھی سامنے بھی کچھ کم دیکھنے کا نیئں پڑا ہے، تم تو بہت بہادر ہے راجا!"

"ہاں مارٹی! بہت بہادر۔۔۔"

"ابھی اپن تمھارے آگے کیا منہ کھولے لیکن راجا! اُودر سب فنش ہو گیا ہے، لوٹ کے کچھ نیئں آنے کا۔"

"میں۔۔۔ میں جانتا ہوں۔" میں نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ تو کوئی بجلی تھا راجا! چمکا اور بجھ گیا، اپن کو بھی بہت یاد آتا ہے۔ قسم سے ابھی اپن کو سب دھوکا لگتا ہے۔ لگتا ہے اپن کی آنکھ نے مسخری کیا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بھرّائے لہجے میں بولا۔ وہ تو موم کا بنا تھا، کانچ کا موتی۔ یہ کہنے لگا کہ مرنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ نجات تو صرف انھی کو ملتی ہے، زندگی بھر وہ ترک و ایثار کا درجہ رکھتے ہیں پھر اچانک ان پہ یہ کیسی خود غرضی طاری ہو جاتی ہے۔ مارٹی مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ یہ کون سا طور ہے، اذیت سہنے والے دوسروں کو ایک مستقل اذیت سے دوچار کر کے کیوں چلے جاتے ہیں۔ انھیں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ دوسروں کے پاس تلافی کے لیے پھر کوئی گوشہ نہیں رہتا۔ دوسروں کو اتنی مہلت تو دینی چاہیے۔ وہ مجھے بہلا رہا تھا۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں سے بولا۔ "راجا! ابھی سمجھو اوپر والے نے اس کا لائن اُسی ٹائم کھینچا تھا۔"

پیرو کی طرح اس نے بھی مجھے وہی تسلیاں دلاسے دینا شروع کر دیے تھے جو مجھے اور ہلکان کر دیتے تھے، جن سے میری رگوں میں خون جمنے لگتا تھا مگر ان کے پاس کہنے کے لیے اور کیا تھا، یہی کچھ کہہ سکتے تھے۔ انھوں نے سونیا کو زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ ان کے لیے بس وہ ایک جھماکا تھی۔ سونیا کے ساتھ سفر کرنے والے نوجوان بمل کمار نے وہ سب کچھ انھیں نہیں بتایا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ میرے دل پر نقش تھا، وہ اس کے بازوؤں پر ٹوٹ کے نہیں گری تھی۔ آنکھوں نے اس کی دھڑکنیں کہاں سنی، اس کی خون بار آنکھیں کہاں دیکھی تھیں، اس کی لرزیدہ سانسیں ان کے سینے پر کہاں بکھری تھیں۔ انھوں نے اس کے بدن میں گونجتا ہوا شور کب سنا تھا، وہ ابھی تک میرے کانوں میں دھمکتا تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ میں نے کیا کیا سنا، کیا کیا دیکھا تھا۔ سب میری وحشت، میرے ہذیان کا خمیازہ ہے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود کچھ نہ جاننے کا جرم ہی مجھ سے سرزد ہوا تھا جو وہ چلی گئی۔ مارٹی کو وہ سب کیا اور کتنا معلوم تھا، یہ تو بس میرا دل جانتا تھا کہ میں اسے روک سکتا تھا۔ موت کے کسی بہانے کی اسے تلاش تھی تو میرے پاس بھی اس کے جینے کا کوئی بہانہ تھا۔ میں نے اس کے اظہار میں تنگی برتی۔ مجھے حیدرآباد جانے کی ایسی ہی بے کلی تھی تو اسے ساتھ رکھنے میں کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔ میں نے اسے بمبئی جانے اور ہوٹل میں ٹھیرنے کا مشورہ کیوں دیا تھا؟ اگر مجھے ابا جان کا لحاظ تھا تو ابا جان کو مزید میرے بارے میں جاننے سے کون سا فرق پڑنا تھا۔ ادّا، چاقو، سبھی کچھ انھوں نے دیکھ لیا تھا۔ سونیا کے بارے میں وہ کچھ جان کے کیا کر لیتے مگر میرے حواس ہی ٹھکانے نہیں تھے۔ بمل اس سے زیادہ مجھ سے کیا کہتا اور کس زبان میں کہتا۔ جو اس نے نہیں کہا تھا، وہ سب سونیا کے ہونٹوں کی لرزش، اس کی بے قرار خاموشی نے کہنا چاہا تھا۔ آدمی، خنجر، گولی، ہتھیار ہی سے ہلاک نہیں ہوتا، کسی کے لیے بس ایک اجنبی نگاہ کا چھرا ہی بہت ہوتا ہے۔ مارٹی نہیں جانتا تھا کہ میں نے اسے قتل کیا ہے۔ جتنا میں سوچتا تھا، اتنا ہی مجھے اپنے جرم کی سنگینی کا احساس سِوا ہوتا تھا، اتنا ہی میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ سورج کی روشنی پھیلنے تک مارٹی مجھ سے اسی کی باتیں کرتا رہا، طرح طرح میری دل جوئی کی کوشش کرتا، مجھے طمانچے مارتا رہا۔

صبح کے ساتھ ہی بارش بھی ختم ہو گئی تھی۔ ابا جان سب سے پہلے اُٹھے تھے۔ انھیں نشست گاہ میں آتے دیکھ کے ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ غسل کے لیے گرم پانی کا انتظام تھا۔ سب غسل کر کے نشست گاہ میں جمع ہو گئے اور وہیں سب نے ایک ساتھ ناشتہ کیا۔ صبح صبح ایک انگریزی، ایک اردو اخبار بیرا کمرے میں ڈال گیا تھا، ابا جان اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھتے رہے۔ مجھے بمبئی جانے والی گاڑی کے وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن انھیں اور پیرو کو روانگی کی کوئی جلدی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ممکن ہے وہ کسی ایسی گاڑی سے سفر کرنا چاہتے ہوں جو دن میں بمبئی پہنچے۔ یہی سوچ کے میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ آسمان بالکل صاف ہو گیا تھا اور دھوپ کھڑکیوں سے اندر کمرے تک آ

گئی تھی۔ کوئی دس بجے ہوں گے کہ دفعتہ پیرو نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا، میں نے بدحواسی سے اسے دیکھا۔ "چلو راجا! ابھی باہر چلنا ہے۔" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"کہاں دادا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ابھی ذرا باہر کی سیر کرتا ہے۔"

"ابھی اپن بھی ساتھ چلے دادا؟" ماٹی بیچ میں تیزی سے بولا۔

"تم ادھر ہی رہنے کا ماسٹر!" پیرو نے تنک کے کہا۔

"مگر تم، تم کہاں جارہے ہو دادا!" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

پیرو نے جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ میرا بازو پکڑ کے اس نے جھٹکے سے مجھے اٹھالیا۔ دروازے سے نکلنے سے پہلے جب اس نے رک کے آیا جان سے کہا کہ وہ دوپہر کے کھانے پر ہمارا انتظار نہ کریں، ہمیں دیر بھی ہوسکتی ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ اتنی دیر کے لیے وہ کہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہے؟ باہر آتے ہی میں نے اس سے پھر پوچھا۔

"ابھی ذرا اور گھوم کے دیکھتا ہے۔" وہ نرمی سے بولا۔

"اب اور کیا دیکھنا رہ گیا ہے دادا!"

"ابھی شہر بہت بڑا ہے۔"

"نہیں دادا!" میں نے اس کے آگے آکے راستہ روک لیا۔ "واپس چلو دادا! کہیں مت جاؤ۔ میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ٹھوکریں کھانے سے کیا فائدہ، مجھے اب کسی کو نہیں ڈھونڈنا، مجھے کسی کی تلاش نہیں ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں دادا! بعد میں بھی میں تم سے.... کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ بس اب گھر چلو، وقت ضائع کیوں کرتے ہو۔"

وہ مجھے اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے بیزاری سے بولا۔ "ابھی ٹھیک طرح چل۔ ادھر ہوٹل کا سارا لوگ دیکھتا ہے۔"

"دادا! میری بات مان لو۔"

"ابھی ایک دن سے سالا ٹیم میں کون سا بل آجائے گا۔ اُودر جا کے بھی اپن کو ٹیم کا کون سا حساب چکانے کا ہے۔"

"ایک دن میں تم کہاں کہاں جاسکو گے، میں اس شہر میں خوب گھوم چکا ہوں، تجمل بھائی کے ساتھ بھی، اکیلا بھی۔ یہ شہر دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ سیدھے بمبئی چلو، مولوی صاحب کے دل میں کبھی خدا ڈال دے گا تو وہ خود مجھے ڈھونڈ لیں گے۔"

"ابھی اڑی مت کر راجا!" وہ تندی سے بولا اور آگے ہی بڑھتا رہا۔

"ادھر بمبئی میں گیتا تمھارے لیے بے چین ہوگی۔ بھابی الگ راہ تکتی ہوں گی۔ ابا جان بھی اُن سب سے ملنے کے لیے مجے [illegible]

رکن رہے ہوں گے۔ ایسا ہی ہے تو بمبئی سے ہو کے پھر یہیں آجائیں گے۔"

"پھر بھی آجائے گا، ابھی ادھر آیا ہے تو اس بہانے تھوڑا سیر بھی کرلے۔"

"مجھے معلوم ہے تم سیر کرنے نہیں جارہے ہو۔"

"سیر بھی ساتھ ساتھ ہوجائے گا جانی!"

"پتہ نہیں دادا! میں تمھیں کس طرح سمجھاؤں، ہوسکے تو میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، دادا مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا، انھیں ڈھونڈنے کے خیال سے میرا دل اب بہت گھبرا رہا ہے۔" میں نے اٹک اٹک کے کہا۔ "اچھا ہے کہ لوٹ چلو، اس وقت ہمارا بمبئی جانا ہی ٹھیک ہے۔ دیر بھی ہوسکتی ہے، کیا بھی ہوسکتا ہے، ہوتا رہا ہے اس لیے میں کہہ رہا ہوں راستہ کیوں کھوٹا کرتے ہو۔"

اُس نے پلٹ کے مجھے گھور کے دیکھا اور منہ اٹھائے چلتا ہی رہا۔ ہوٹل سے چند قدم آگے عابد شاپ روڈ کے چوراہے پر میں نے اُس سے ایک بار پھر منت کی تو وہ ناراض ہونے لگا۔ "ابھی ایسا کیا ہے راجا! اپن بولتا ہے، ابھی ایک دن اور ٹھہر جائے تو سارا دنیا اُلٹ جائے گا کیا۔ کرا کھلوانے کے لیے کھٹ کھٹ ہی کرنا پڑتا ہے، سمجھا جانی! ابھی کچھ بولے گا تو کوئی سنے گا، اُودر اوپر والے کو ایک طرف دھیان لگانا ہی نہیں ہوتا ہاں، پاؤں چھوڑ کے بیٹھ جائے گا تو وہ بھی منہ پھیر لے گا۔"

وہ سب ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اپنی زبان بند ہی رکھی۔ اُسے کوئی جلدی نہیں تھی تو مجھے اس قدر اصرار، تکرار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔ اُس نے رکشا نہیں کیا، پیدل ہی عابد شاپ روڈ کے چوراہے سے دائیں طرف مڑ گیا اور سو ڈیڑھ سو قدم چلنے کے بعد جیسے ہی کسی مسجد کے مینار نظر آئے، اُس کے قدم رکنے لگے۔ مسجد سے متصل پرچون کی ایک دُکان پر جا کے اُس نے مولوی صاحب کا نام اور حلیہ بتایا۔

رات نواب ثروت یار نے خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید مولوی صاحب حیدرآباد ہی میں ہوں اور اب تک کسی وجہ سے اُس سے ملنے نہ آسکے ہوں۔ پیرو کے من میں یہی بات سمائی، ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مولوی صاحب نے تھک ہار کے حیدرآباد میں مستقل طور پر بسنے کا ارادہ کرلیا ہو ورنہ وہ نواب

ثروت یار سے اس کا تذکرہ کیوں کرتے۔ وہ ایک عالم آدمی ہیں، حیدرآباد میں ایسے لوگوں کی بہت قدر کی جاتی ہے، یہاں انھیں روپے پیسے کی اتنی مشکل پیش نہیں آسکتی تھی جتنی اور شہروں میں۔ یہاں نواب ثروت یار جیسے اُن کے اور شناسا بھی ہوں گے، کسی زمانے میں اُن کی بہن بھی یہاں بیاہی گئی تھی۔ میں نے انھیں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ بہرحال مولوی صاحب تو اپنی بہن کے سسرالیوں سے خوب واقف ہوں گے، اگر وہ لوگ واقعی حیدرآباد ہی میں موجود ہوئے۔ مولوی صاحب روپے پیسے سے اتنے ہی تنگ ہوگئے تھے جو انھیں مرادآباد میں اپنا مکان بیچنے کی ضرورت پڑی اور پہلی بار یہاں اپنے واقف کاروں کے سہارے کی۔ اب تک وہ اپنے جاننے والوں سے دُور دُور رہے تھے، کاش انھیں معلوم ہوتا، انھیں کسی کی مدد، کسی کا سہارا لینے، کسی کے سامنے اپنا اٹھا ہوا سر جھکانے کی کوئی ضرورت نہیں، میرے پاس کرشنا جی کے چھوڑے ہوئے اتنے روپے ہیں کہ وہ ساری زندگی شاہوں کی طرح بسر کریں تو بھی بچ جائیں اور کرشنا جی بھی اگر یہ سب نہ چھوڑتے تو بھی میرے ہاتھ پیر سلامت تھے۔ میں نے جیل میں کچھ حاصل ہی کیا تھا جو باہر آکے میرے کام آسکتا تھا۔

پہلے ہم عابد شاپ روڈ کے نزدیک ترین علاقوں میں گھومتے رہے، پھر کچھ اور آگے بڑھ گئے۔ ہر محلے، گلی، اسکول اور فاصلے فاصلے سے عام ضروریاتِ زندگی کی دُکانوں پر جا کے پیرو مولوی صاحب کا نام لے کے پوچھتا رہا۔ پیرو اُن سے یہ وضاحت بھی کردیتا تھا کہ مولوی صاحب ایک ڈیڑھ ماہ پہلے ہی اس علاقے میں آئے ہوں گے۔ یہ مدت محلے والوں اور دکان داروں سے شناسائی کے لیے بہت کم تھی لیکن یہ بھی ہے کہ محلے میں آنے والے کسی اجنبی پر فوراً ہی نظر پڑجاتی ہے۔ درمیان کے بہت سے علاقے دیکھتے ہوئے ہم چار مینار کے نزدیک آگئے۔ سہ پہر ہوگئی، کہیں کوئی شخص مولوی صاحب کے نام اور حلیے پر نہیں چونکا۔ ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملتا تھا۔ چنچل گوڑا، یاقوت پورہ، بھورے کی کھڑکی، شاہ گنج، پتھر گٹی، چار کمان کا سارا علاقہ، لاڈ بازار، مغل گنج، معظم جاہی، مکرم جاہی مارکیٹ، بیگم بازار، نرائن گوڑا وغیرہ۔ جہاں جہاں بھی ممکن ہوسکا، ہم اِدھر سے اُدھر چکر کاٹتے رہے۔ معظم جاہی مارکیٹ سے نکل کے پیرو نے دن بھر کے لیے رکشا کرائے پر لے لیا تھا جسے ہم نے چار مینار پر چھوڑ دیا اور آگے پھر پیدل چلتے رہے۔ راستے میں صرف ایک جگہ چند منٹ ٹھہر کے ہم نے چائے پی تھی۔ پیرو ایک ہی دن میں سارا حیدرآباد چھان مارنے کی دُھن میں نظر آتا تھا۔ احتیاطاً وہ اردگرد کے مدرسوں اور مسجدوں کے بارے میں بھی پوچھ لیتا تھا چنانچہ ہم انھیں راستے میں چھوڑتے جاتے تھے۔

جس وقت ہم پتھر گٹی کے علاقے سے گزر رہے تھے، دھوپ اُوپر چلی گئی تھی۔ بازاروں میں بھیڑ بھی بڑھ گئی تھی۔ سائکلوں پر دفتر سے لوٹنے والوں کا ہجوم ہر طرف رواں دواں تھا۔ دُکانوں پر بھی خوب رونق ہوگئی تھی۔ اسکول چار بجے کے قریب بند ہوگئے تھے۔ مدرسے بھی عصر کے وقت بند ہوگئے تھے لیکن مسجد کے مدرسوں میں کوئی نہ کوئی شخص ہمیں ایسا ضرور مل جاتا تھا جو وہاں پڑھانے والے اُستادوں کے بارے میں واقفیت رکھتا ہو۔ ابھی ہم پتھر گٹی میں تھے اور موسیٰ ندی کا پل ہم نے پار نہیں کیا تھا کہ اچانک ایک جگہ پیرو نے میرا بازو تھام لیا اور بدبداتے ہوئے بولا۔ "راجا! ابھی لگتا ہے، اپن لوگ کا پیچھا کیا جارہا ہے۔"

میں نے بے اختیار پلٹ کے دیکھنا چاہا لیکن پیرو کے ہاتھ دبانے پر میں ٹھٹھک کے رہ گیا اور مجھ سے چند ہی لمحوں کا توقف ہوسکا کہ دو قدم آگے بڑھ کے میں ایک دُکان کے سامنے رک گیا۔ پیرو کا اندازہ درست تھا۔ ایک شخص ہم سے کچھ فاصلے پر نپے تلے قدموں سے ہمارے پیچھے آرہا تھا۔ ہمیں یکایک ٹھہرا دیکھ کے اُس کی رفتار ایک ثانیے کے لیے منتشر ہوئی مگر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ ایک دُبلا پتلا، پھرتیلا سا تیس سال کے قریب عمر کا شخص تھا۔ رنگ سیاہ اور وضع قطع سے الگ پہچانا جاسکتا تھا۔ میں اور پیرو چمڑے کی دُکان پر مختلف چیزوں کے نرخ پوچھتے رہے مگر ہماری نگاہیں اُسی پر مرکوز تھیں۔ کچھ آگے جا کے وہ پان کی ایک دُکان پر ٹھیر گیا۔ اُس نے پان کا بیڑا منہ میں رکھا، سگریٹ سلگایا اور بے نیازی کے انداز میں ہماری طرف بھی اچٹتی نظریں ڈالتا رہا، اسی دوران میری نظر سڑک کے پار ایک اور شخص پر بھی گئی۔ مجھے اُس پر بھی وہی شبہ ہوا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں پیرو کو اشارہ کیا تو وہ سر ہلانے لگا۔ "یہ کون لوگ ہوسکتا ہے؟" وہ اُلجھی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تو پہلے بھی ادھر کئی بار آچکا ہے نا!"

"ہاں۔" میں نے تذبذب سے کہا اور اس لمحے مجھے شاہ کبیر کا خیال آیا۔ میں نے مختصراً اُسے شاہ کبیر کا واقعہ سنایا۔ "ہم چل کے اُن سے پوچھتے ہیں دادا!"

"نئیں۔" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے انکار کردیا۔

"پھر سیدھے ہوٹل واپس چلو اور بمبئی چلنے کی تیاری کرو، ضروری نہیں کہ مولوی صاحب نے جو ثروت یار سے کہا تھا وہی ٹھیک ہو۔ ممکن ہے، مرادآباد سے وہ کہیں اور چلے گئے

ہوں کچھ اور دماغ میں سما گیا ہو۔"

"ابھی دو تین جگہ مل کے دیکھنا ہے۔ ہوٹل کی طرف جانا بھی ابھی ٹھیک نہیں ہے۔" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

پتھر گٹی سے آگے پُل عبور کر کے ہم نے تین چار جگہ اور بھی مولوی صاحب کو بوجھنے کی کوشش کی مگر سرسری طور پر۔ اس عرصے میں پیچھا کرنے والے دونوں آدمی بھی ساتھ ساتھ آتے رہے حالانکہ ہم نے رفتار کم کر کے انھیں اپنے پاس آنے اور بات کرنے کا کئی بار موقع دیا تھا۔ وہ نہ ہمارے قریب آتے تھے، نہ ہم سے کچھ پوچھنا یا اُلجھنا چاہتے تھے۔ میں نے بہت غور کیا مگر شاہ کبیرا کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور ظاہر ہے بے سبب انھوں نے ہمیں اپنی نگاہوں کا مرکز نہیں بنائے رکھا ہوگا۔ صورت شکل سے وہ سادہ لباس والے بھی نہیں معلوم ہوتے تھے اور یہ امکان بھی نہیں تھا کہ انھیں ہم پر کسی اور کا دھوکا ہو گیا ہو۔ اتنی پختہ غلط فہمی بھی قرینِ قیاس نہیں تھی۔ پتھر گٹی سے ہم نے خاصا راستہ پیدل طے کیا تھا، کہیں بھی وہ ہمارے راستے کی رُکاوٹ نہیں بنے اور نہ کہیں انھوں نے ہمیں اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے دیا۔ عابد شاپ روڈ سے ہم رکشا میں بیٹھ سکتے تھے لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ وہ ہمارے پیچھے دُوسرے رکشا میں نہیں آئیں گے۔ پُل عبور کرنے کے بعد ہم نے ایک تنگ گلی سے نکل کے کسی اور طرف نکلنا چاہا، راستہ ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ہم گلی میں گھستے گئے۔ بہت دُور چکر کاٹ کے جیسے ہی ہم باہر نکلے، وہ موجود تھے، ایک دُوسرے سے دُور کھڑے ہوئے اور وہاں ہمیں احساس ہوا کہ وہ صرف دو نہیں ہیں۔ جتنے اِرد گِرد ہماری نظروں میں آسکے، اُن کی تعداد پانچ سے کم نہیں تھی۔ اُن میں ایک سائیکل سوار بھی تھا۔ چلتے چلتے پیرو نے کہنی مار کے بظاہر پُرسکون لہجے میں مجھ سے پوچھا "راجا! ابھی پہچاننے کی کوشش کرو۔"

"مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے انھیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔"

"اڈے پاڑے کے لوگ دکھائی دیتا ہے۔"

"مجھے بھی کچھ یہی لگتا ہے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ابھی دباکے ہی رکھنا۔" اُس نے مجھے تحمل کی تاکید کی۔

میں خود اُس سے یہی منت کرنا چاہتا تھا۔ ہمیں اپنی جانب سے کوئی پیش قدمی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بہتر یہی تھا کہ ہم کسی طرح راستہ کاٹ کے ہوٹل واپس پہنچ جائیں۔ میں نے پیرو کو مشورہ دیا، اگر ہمارا ہوٹل جانا سرِدست مناسب نہیں ہے تو ہم انھیں تھکانے بھٹکانے کے لیے اِدھر اُدھر گھومتے رہیں، دیکھتے ہیں وہ کہاں تک جاتے ہیں لیکن میں نے کہنے کو کہہ دیا تھا، مجھے خود اپنی بات کی بے وزنی، بے یقینی کا احساس تھا۔ پہلے ہمیں اُن کے مقصد کا کوئی اندازہ ہونا چاہیے تھا، اس کے بعد ہی کوئی اقدام مناسب تھا۔

اُس وقت ہم ایک بڑی سڑک سے گزر رہے تھے کہ ایک بس آ کے رُکی، وہ سکندر آباد جا رہی تھی۔ سکندر آباد شہر حیدر آباد سے ملا ہوا ہی ہے۔ صرف ایک ندی درمیان میں پڑتی ہے۔ سکندر آباد سے ہم کسی دوسری بس میں واپس آ سکتے تھے۔ بس کچھ آگے جا کے رُک گئی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار سست کر دی اور جیسے ہی بس چلی، ہم بھاگ کے پائدان پر چڑھ گئے۔ اُن میں سے کوئی بس میں نہیں آسکا تھا لیکن ایک اسٹاپ چھوڑ کے، دُوسرے اسٹاپ پر جو شخص دُوسرے مسافروں کے ساتھ ہڑبڑاتا ہوا بس میں داخل ہوا، وہ اُن پانچوں میں سے ایک تھا جنھیں ہم نے موسیٰ ندی کے پل کے پار آ کے دیکھا تھا۔ بس شہر میں چل رہی تھی اس لیے اُس کی رفتار تیز نہیں تھی، فاصلہ بھی کم تھا اور دو اسٹاپوں پر رُکنے کی وجہ سے اس شخص کو خاصا وقت مل گیا تھا۔ اتنی دیر میں کوئی بھی تیز رفتار چلاتا ہوا بس پکڑ سکتا تھا۔ وہ پائدان کے قریب ایک نشست پر بیٹھ گیا اور خاموش رہا۔ بس معظم جاہی مارکیٹ سے آگے جا کے عابد شاپ روڈ پر آئی تو پیرو اُتر گیا۔ پیچھے وہ بھی اُتر گیا۔ نیچے اُتر کے کچھ دُور چلنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ وہ سب موجود ہیں۔ ضرور کسی دوسری سواری سے وہ بس کا پیچھا کر رہے تھے۔

پیرو کی آنکھوں کی لالی بڑھ گئی تھی۔ ہمیں جلد ہی کوئی تدبیر کرنی چاہیے تھی مگر اتنی آسانی سے کوئی بھی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے اب تک ہماری جانب کوئی کنکر نہیں پھینکا تھا اور اُن کے تیوروں سے آگے بھی کوئی ایسا امکان نظر نہیں آتا تھا تاہم ہر طرف سے ہم اُن کی نظروں کے حصار میں تھے۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا اب مشکل نہیں تھا کہ انھیں کسی بھی وجہ سے ہماری ضرورت ہے اور فی الحال انھیں ہمارا ٹھکانا جاننے کی بے چینی ہے۔ ہوٹل قریب ہی تھا، زیادہ سے زیادہ آدھ فرلانگ کے بہ قدر فاصلہ ہوگا۔ ہم ہوٹل پہنچ کے ابا جان، زورا اور ماری کو لے کر اسٹیشن کی طرف نکل سکتے تھے اور کسی بھی پہلی گاڑی میں بیٹھ سکتے تھے۔ وہ تب بھی ہمارا پیچھا کرتے تو کہاں تک! بمبئی تک! بمبئی میں اُن سے نمٹا جا سکتا تھا لیکن کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ یہی سلسلہ برقرار رکھیں گے، محض تعاقب ہی اُن کا مقصد ہے، وہ یوں آسانی سے ہمیں حیدر آباد سے جانے دیں گے۔ اُن سے یہاں بھی نمٹا جا سکتا تھا لیکن جو بات میرے ذہن میں تھی، وہی پیرو کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ ایک ذرا سی جلد بازی سے کوئی بھی بڑی اُلجھن کھڑی ہو سکتی تھی۔ بمبئی پہنچنے میں خواہ مخواہ اور دیر لگ سکتی تھی۔ ابا جان بھی ہمارے ہم سفر ہونے کی وجہ سے لازماً ملوث ہوتے، زورا، ماری، پیرو اور میری بات ہوتی تو یہ آنکھ مچولی اتنی دیر نہ رہتی۔ بار بار یہ اندیشہ میرا جسم جھنجھنا دیتا تھا کہ کہیں پیرو کا پیمانہ نہ چھلک جائے۔ اُس کی زندگی میں شاید یہ پہلا موقع ہوگا کہ اُسے ذلت کی حد تک یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ پیرو کو نہیں جانتے تھے۔ وہ کس سے یہ مذاق کر رہے ہیں، کون اُن کے سامنے ہے۔ بمبئی شہر کا سب سے بڑا دادا، بمبئی کے سارے پاڑے جس کی ملکیت ہیں۔ پیرو کی پیشانی پر شکنوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ میری رگوں میں بھی خون جل رہا تھا، انھیں مزید وقت نہیں دینا چاہیے تھا اور نہ اپنی کش مکش اور تردد کا کوئی تاثر۔ رفتہ رفتہ وہ پانچ ہو گئے تھے، آگے اور بڑھ سکتے تھے۔ عابد شاپ روڈ پر ہوٹل کی طرف جانے کے بجائے پیرو ساڑیوں کی ایک دُکان میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ وہاں مختلف رنگوں کی ساڑیاں دیکھتا پرکھتا رہا اور اُس نے کوئی سو ساڑیوں میں سے دو قیمتی ساڑیاں منتخب کیں، یقیناً ایک گیتا کے لیے، دوسری اس کی ماں کے لیے۔

پیکٹ بغل میں دبا کے ہم دُکان سے باہر نکلے تو انھیں اپنا منتظر پایا، وہ اِدھر اُدھر منتشر تھے۔ پیرو نے جیسے اُن کی طرف نہیں دیکھا اور دُکان سے نکلتے ہی گزرتا ہوا ایک رکشا روک کے اُس پر بیٹھ گیا۔ شام ہو گئی تھی اور دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ ہم نے کہیں پیچھے مُڑ کے نہیں دیکھا کہ وہ ہمارے ساتھ آ رہے ہیں یا نہیں۔ اب اِس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، انھیں آنا ہی چاہیے تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم پھر موسیٰ ندی کے پل کی طرف آ گئے تھے لیکن ہم نے پل پار نہیں کیا، اس سے پہلے ہی اُتر گئے اور اسی سنسان سی گلی میں داخل ہو گئے جہاں ہم شام کے ابتدائی وقت آ چکے تھے۔ گلی کے ایک طرف خشک ندی کا پاٹ تھا، دوسری جانب مکانات۔ ہم مسلسل اندر گلی میں بڑھتے رہے اور ایک نسبتاً خاموش اور کم آباد مقام پر پیرو نے مجھے ٹھیرنے کا اشارہ کیا۔ وہاں سے چند قدم بعد دوسری گلی کا نکڑ تھا۔ اس طرف بجلی کے کھمبے نہیں تھے لیکن دُور پل پر نصب روشنیاں جل گئی تھیں اور اندھیرا اتنا گہرا نہیں ہوا تھا کہ ہم اپنے نزدیک ہوتے ہوئے لوگوں کو نہ دیکھ سکیں۔ وہ دو آدمی تھے جو ہمیں ٹھیرا دیکھ کے پہلے کی طرح ٹھیرے نہیں، آگے آتے رہے، اُن کی چال البتہ مدھم پڑ گئی تھی۔ ابھی وہ ہمارے مقابل نہیں آئے تھے کہ گلی کے قریبی نکڑ سے ہم نے اُن کے دو اور ساتھیوں کو آتے دیکھا۔ اسی اثنا میں پہلے دو آدمی ہم سے ذرا سا فاصلہ رکھتے ہوئے جیسے ہی بے نیازانہ ہمارے مقابل سے گزرے، پیرو نے روک لیا، انھیں آگے نہیں جانے دیا۔ ساڑھی کا بنڈل میری طرف اُچھال کے وہ جست لگانے کے مانند آگے بڑھا۔ دوسرے ہی پل اُن دونوں کی گردنیں اُس کے پنجے میں دبی ہوئی تھیں۔ بولو سالا! ابھی تم کیا مانگتا ہے۔"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" وہ بُری طرح سٹ پٹا گئے تھے۔ "کیا، کیا، تم...."

پیرو نے اُن کی گردنیں پکڑے پکڑے یکے بعد دیگرے اُن کے کولھوں کے اُوپر ریڑھ کی ہڈی کے کنارے گھٹنے مارے۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اُن کی چیخ بھی نہیں نکل سکی۔ "بولو، ابھی تم سور کا جنا اپن لوگ کا پیچھا کیوں کرتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔" بہ مشکل تمام وہ کراہتے ہوئے بولے "تم کو دھوکا ہوا ہے، ہم لوگ تو اپنی راہ جا رہے تھے۔"

"اپنا راہ جا رہا تھا۔" پیرو نے پھنکارتے ہوئے کہا "ابھی تم ٹھیک جگہ چلا جائے گا، ایک دم اپنا ٹھکانے پر۔"

"ہم کو معاف کر دو، ہم کو۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔ "ہماری کوئی غلطی نہیں ہے، ہم کو معاف کر دو۔"

"ابھی تم کو خلاص کرے یا ٹھیک ٹھیک بولتا ہے؟"

پیرو نے اُن کی گردن پر پنجے کی گرفت سخت کر دی تھی۔ وہ تڑپتے، گڑگڑاتے ہوئے بولے "ہماری بات سنو، ہم سب بولے دیتے ہیں، ابھی ہم کو کچھ انکار نہیں ہے، ذرا صبر کرو۔" درد کی شدت سے اُن کی آنکھیں نکل آئی تھیں۔ پیرو نے اُن کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا۔ "مائی باپ، بالکل دھوکا ہو گیا تھا۔" وہ زمین پر پاؤں پٹخنے لگے۔ "ہماری آنکھیں بالکل بہک گئی تھیں۔ تم وہ نہیں ہو جس کی ہم کو تلاش تھی۔"

پیرو کا غصہ اور بڑھ گیا۔ "ابھی تم کو پتہ چلا کہ اپن وہ نہیں ہے۔ اپن تم کو بولتا ہے کہ اپن وہی ہے، ایک دم وہی۔"

"نہیں دادا! بالکل نہیں، بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ تم کو اپنی ماں کا، اپنی بہن کا واسطہ تم کو۔ ہم کو چھوڑ دو۔" وہ دونوں دُہائیاں دے رہے تھے اور ساتھ ہی اپنے آپ کو گالیاں دیتے جاتے تھے۔ اُن کی آہ و بکا سُن کے اُن کے وہ دو ساتھی پلٹ آئے جو چند قدم آگے گلی کے نکڑ سے داخل ہوئے تھے اور ایک نگاہ ہمیں ساکت کھڑے دیکھ کے آہستہ قدموں سے آگے بڑھ گئے تھے۔ انھوں نے جان بوجھ کے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہونے میں دیر لگائی ہوگی لیکن پھر وہ دیوانگی سے ہماری جانب لپکے اور اجنبیوں کے لہجے میں پوچھنے لگے "کیا، کیا بات ہے؟" وہ پیرو کے بازو پکڑ کے اُس کی دست بُرد سے ان دونوں کی گردنیں چھڑانے کی کوشش کرنے لگے اور ساتھ ہی نرم و سخت لہجے میں اُسے سمجھا رہے تھے "بس کرو استاد! غصہ تھوک دو، غلطی آدمی سے ہوتی ہے۔"

اُن کی ڈھٹائی حیرت انگیز تھی۔ رد راہ گیروں کے انداز میں

ہم سے مخاطب تھے جیسے پیرو کی گرفت میں بلکتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے اُن کا کوئی تعلق نہ ہو۔ "اب جانے دو، انھیں چھوڑ دو، اتنا بہت ہے۔ اپنے کیے کی انھیں کافی سزا مل گئی ہے۔"

اُنھوں نے پیرو کو دونوں جانب سے کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دو لمحوں تک تو میں اس خیال سے الگ خاموش کھڑا دیکھتا رہا کہ پیرو کے اشارے کے بغیر میری مداخلت ٹھیک نہیں ہے۔ اچھا ہے، بات طول کھینچنے سے پہلے یہیں ختم ہو جائے لیکن وہ پیلے بن رہے تھے۔ میں نے پھر بھی توقف کیا اور مجھے ایسا لگا کہ وہ پیرو کے بازو پکڑ کے اپنے دونوں ساتھیوں کو چھڑانا ہی نہیں چاہتے، پیرو پر اُن کی جانب سے لوٹ کے ہاتھ اٹھانے کا موقع دینے کی تاک میں بھی ہیں، یہ اُن کی نادانی تھی یا کٹ حجتی۔ ماننی پڑے گی۔ انھیں پیرو کے متعلق کوئی اندازہ قائم کر لینا چاہیے تھا۔ کاش کوئی اُنھیں بتا سکتا کہ اُن کی دُگنی تعداد کے لیے بھی اکیلا پیرو کافی ہے اور پیرو کو اتنا وقت بھی یوں لگا ہے کہ اُسے اُن سے کچھ جاننا مقصود ہے۔ پیرو نے اُن کے دونوں ساتھیوں کو تقریباً معطّل کر دیا تھا۔ اُن کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے لیکن اُن سے کام لینے کا انھیں یارا نہیں تھا۔ اُن کی گردنوں میں پیرو کے پنجوں کی اُنگلیاں اس طرح پیوست ہو گئی تھیں کہ جسم کی ذرا سی حرکت پر اُن کی اذیت دو چند ہو جاتی تھی۔ پیرو نے بعد میں آنے والے آدمیوں کی دخل اندازی پر اتنا دھیان نہیں دیا تھا جتنا پہلے آدمیوں کی گرفت پر۔ جب دوسروں کی کھینچا تانی میں تندت آگئی تو پیرو نے اُن کی ٹانگوں پر پیروں سے ضربیں لگائیں۔ وہ پاگل سے ہو گئے اور ایک نے پیرو کی کمر پر پوری قوت سے سر مارا۔ پیرو لڑکھڑا گیا تھا لیکن اُس کے پنجے اُن کے ساتھیوں کی گردن سے نہیں ہٹے بلکہ اس کش مکش میں پیرو کی اُنگلیوں کی پیوستگی اُن کے لیے اور کاری ہو گئی تھی۔ اُن کے حلق سے گھٹی گھٹی خرخراتی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ اِدھر میں نے ساڑی کا پیکٹ پھینک کے کھلے ہوئے دونوں آدمیوں سے نمٹنے کے لیے قدم بڑھا دیے تھے لیکن مجھے رُکنا پڑا۔ میری توقع کے خلاف پیرو نے اچانک پہلے والوں کو جھٹکا دے کے چھوڑ دیا تھا۔ اُسی لمحے وہ پچھاڑ سا کھاتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ جس طرح مجھے توقع نہیں تھی، اُسی طرح پیرو کو کھینچنے، گھسیٹنے والے آدمیوں کو بھی اُس کی اس ناگہاں دست برداری یا پینترے کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ پیرو کو پیچھے ہٹتا دیکھ کے اپنی دانست میں اُسے قابو میں کرنے اور کوئی دوسرا موقع نہ دینے کے خیال سے بے تحاشا اُس پر جھپٹے۔ پیرو کو جیسے اُن کے اِس ردِ عمل کا یقین تھا۔ اُن کے دوبارہ قریب آنے پر اُسے اُن دونوں کی گردنیں اپنے بازوؤں میں جکڑنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

پہلے والے آدمی آزاد ہو گئے تھے لیکن پیرو کے جھٹکے سے اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکے تھے، اندھوں کی طرح ڈگمگاتے ہوئے زمین پر اوندھے گرے۔ میری آنکھیں انھی پر جمی ہوئی تھیں اور میرے قدم ان کے اُٹھنے کے منتظر تھے۔ وہ نیم جاں ہو گئے تھے مگر ہوش و حواس کچھ قائم تھے۔ گرتے ہی اُنھوں نے اُٹھنے کی کوشش کی اور بھاگا ہی چاہتے تھے کہ اُنھیں اپنے ساتھیوں کی چیخیں سنائی دیں جن کے سر پیرو کے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اور جن کے جسم بُری طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ پیرو نے مجھے اشارہ نہیں کیا تھا پر مجھے ایک ایک پل کاٹنا دوبھر ہو رہا تھا۔ ہمیں زیادہ وقت بالکل نہیں لگانا چاہیے تھا۔ گو گلی میں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی، اندھیرا ابھی بڑھ رہا تھا۔ ہم جس جگہ تھے، وہ شاید کوئی گودام تھا۔ چالیس پچاس گز کے لگ بھگ اِدھر اور آگے گلی کے قریبی نکڑ تک اُدھر ایک شکستہ دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ درمیان میں لکڑی کے لمبے چوڑے دروازے پر بھاری تالا لگا ہوا تھا۔ پیرو نے یہ جگہ اسی لیے منتخب کی تھی لیکن مقابل ندی کے پشتے کی پتھریلی دیوار کے باوجود نزدیک ہی گلی کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے، کچے پکے مکانات کی قطار دُور تک چلی گئی تھی۔ اُن کی چیخیں سُن کے دُور دُور کے مکیں اور راہ گیر متوجہ ہو سکتے تھے۔ یہ بھی طے نہیں تھا کہ جتنے لوگ ہماری نظروں میں آئے ہیں، اُن کی تعداد اتنی ہی ہو۔ گلی کے دہانوں پر اور بھی لوگ ہو سکتے تھے۔ سائکل سوار کا نہ ہونا بھی بے سبب نہیں ہوگا۔ میرے ذہن میں یہی خدشے منڈلا رہے تھے۔ پیرو بھی اِن سے بے خبر نہیں ہوگا۔

جیسے ہی میں اُٹھتے ہوئے اُن دونوں آدمیوں کو ان کے سنبھلنے سے پہلے تھامنے کے خیال سے آگے بڑھا، وہ اُلٹے قدموں یکایک پیچھے کی طرف بھاگے۔ اُنھوں نے چند لمحوں کے لیے مجھے متذبذب کر دیا تھا۔ اس اثنا میں اُنھیں چاقو نکالنے کی مہلت مل گئی تھی اور چاقو ہاتھ میں آجانے کے بعد اُن میں جولا جان سی آگئی تھی۔ ایک میری طرف، دوسرا پیرو کی جانب ہاتھ پھیلاتا، چاقو لہراتا آنے لگا۔ اُن کی حد سے زیادہ چیختی، پھنکار اور پھنکاریں میرے لیے اُن کے خوف کا مظہر تھیں۔ دوسرا جس کا رُخ پیرو کی طرف تھا، پہلے مجھے اُسے روکنا چاہیے تھا۔ پیرو نے بھی دیکھ لیا ہوگا۔ وہ پلٹ کے اُن کے ساتھیوں ہی کو آگے کر سکتا تھا مگر مناسب یہی تھا کہ اُسے پیرو کی طرف جانے ہی نہ دیا جائے۔ ہم دونوں میں سے وہ مجھی کو پہچانتے ہوں گے۔ پیرو پہلی بار حیدرآباد آیا تھا۔ وہ میں ہی ہو سکتا تھا کہ

مجھے پہچانتے تھے تو اُنھیں شاہ کبیر والا واقعہ بھی یاد ہوگا۔ چاقو ہاتھ میں آجانے کے باوجود اُن کی احتیاط اور جھجک کا یہی مطلب ہو سکتا تھا اور یہی وجہ ہوگی کہ اُن کی نظریں میری طرف اُٹھتی رہی تھیں۔ اپنی بوکھلاہٹ میں وہ کوئی بھی اوچھا پن کر سکتے تھے۔ میں نے جب پیرو کی طرف بڑھنے والے آدمی کو روکنے کے لیے اُس کے راستے میں آنا چاہا تو وہ گھبرا گیا اور اُس کا رُخ میری ہی طرف ہو گیا۔ پھر معاً ایک ہی تدبیر میرے دماغ میں آئی کہ کوئی توقف کیے بغیر میں اُسے منتشر کرنے کے لیے بے مقصد ہاتھ پیر چلاؤں اور کرد میں بدل تار ہوں۔ یہ ایسا بے مقصد بھی نہیں تھا۔ بچھلے نے بھی جیل میں ایک مرتبہ میرے اور کانتے کے ساتھ یہی کیا تھا۔ اس طرح اُن کے فیصلے کی قوت درہم برہم ہو سکتی تھی اور کسی بھی لمحے اُن کا ہاتھ میرے قبضے میں آسکتا تھا۔ ایک کا آنا ہی کافی تھا اور یہی ہوا۔ مجھے آناً فاناً کئی زاویے بدلنے پڑے کہ اُن میں سے ایک کا ہاتھ میرے پنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف سے بھی میری نظریں غافل نہیں تھیں لیکن مجھ سے بس ایک پَل کی چوک ہو گئی۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ دوسرے پر اتنی وحشت طاری ہو سکتی ہے، اُس نے اپنے ساتھی کو میرے قبضے میں دیکھ کے دیوانہ وار مجھ پر چاقو تول لیا۔ اب مجھے لازماً اُس کے ساتھی کو اُس کے سامنے کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے کچھ جلدی کر دی تھی سو وہ اپنا بڑھا ہوا ہاتھ کھینچ نہیں سکا۔ اُس نے روکنے کی بھی کوشش کی لیکن چاقو اُس کے ساتھی کی پسلی سے گزر گیا تھا۔ اِدھر اُس نے حواس باختگی سے چاقو کھینچا، اُدھر چشم زدن میں مَیں نے اُس کے زخمی ساتھی کو ایک جانب دھکیل کے اور کسی قدر ترچھا ہو کے اُس کے جبڑے پر ضرب لگانا چاہا۔ اُس کا سمٹا ہوا چاقو والا ہاتھ جتنی دیر میں دوبارہ میری طرف کھلتا، اتنی دیر میں ضرب لگا کے میرا ہاتھ واپس آسکتا تھا۔ وہ ایسا گڑبڑا گیا تھا کہ چاقو اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پھر اُسے زمین پر پٹخنے اور ٹھوکریں مارنے میں مجھے کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ زخمی ہونے والا آدمی زمین پر لوٹ رہا تھا اور دھاڑیں مار رہا تھا۔ چاقو اُٹھانے کی تو کیا، اُس میں اپنا جسم سنبھالنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اُسے گہرا زخم نہیں لگنا چاہیے تھا۔ لگا بھی ہوگا تو صرف ایک جگہ۔ میں اُسے بروقت نہ کھینچ لیتا تو وہ اب تک دم توڑ رہا ہوتا۔

مجھ سے قریب ہی پیرو نے اُن دونوں کی گردنیں جکڑی ہوئی تھیں۔ "ابھی ایک دم سب بول دو۔ منٹ میں تم کو سدا کے لیے چُپ کر دے گا۔" وہ اُن سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ وہ سب کچھ صاف صاف بتا دیں۔ اس طرف میں نے بھی ایک آدمی کو

دبوچ کے اُس کے نرخرے پر چٹکی بھر رکھی تھی۔ اُنھیں اگل ہی دینا چاہیے تھا۔ مزید اُنھیں مدد کے لیے کسی اور ساتھی کے آنے کی اُمید ہو گی جبھی اُنھوں نے اتنا وقت بھی لے لیا تھا مگر اب اُن کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اُن کا ایک ساتھی زمین پر پڑا سسک رہا تھا۔ خون سے اُس کے کپڑے تربتر ہو گئے تھے، پہلے تو وہ اپنی پُرانی رٹ لگاتے رہے پھر اُنھوں نے جھجکتے، اٹکتے ہوئے زبان کھولی کہ اُنھیں آکا نے ہمارا پیچھا کرنے کے لیے بھیجا ہے۔

"آکا کون؟" پیرو نے قہر آلود لہجے میں پوچھا۔

"آکا بھائی اِدھر شہر کا سب سے بڑا دادا ہے۔"

"کیا بولا تھا، اُس گیدڑ کا اولاد نے؟"

"اُس نے ہم کو صرف تمھارا پیچھا کرنے بولا تھا۔"

"کیوں؟ اُودر اُس کا ماں کو نیند نہیں آتا کیا؟"

"ہم کو کچھ اور نہیں معلوم، ہم تو حکم کے غلام ہیں۔"

"تم اُلّو کا پٹھا ہے، کیدر رہتا ہے وہ؟"

"اُس نے ابھی بازار میں ٹھکانا کر رکھا ہے۔"

"بازار میں!" میں نے تندی سے پوچھا۔ "بازار میں تو ہم شاہ کبیر کو نکال کے کالے بِلوا کو چھوڑ کے....."

دفعتہً گلی میں بائیں جانب سے بھاگتے ہوئے آدمیوں کی چاپیں سنائی دیں، میری آواز حلق میں گھُٹ گئی۔ میں نے گھوم کے دیکھا تو وہ کئی آدمی تھے، ہم سے زیادہ دُور نہیں تھے اور ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ مجھے بے چین کیے ہوئے تھا۔ اُن تینوں اور اُن کے زخمی ساتھی کی چیخ پکار نے آخر گلی کے مکینوں اور راہ گیروں کو متوجہ کر لیا۔ پیرو نے بھی اُنھیں دیکھ لیا تھا لیکن اُس نے اپنے بازوؤں میں جکڑے ہوئے آدمیوں کی گردنیں نہیں چھوڑیں، نہ میں نے اپنے دبوچے ہوئے آدمی کے نرخرے سے ہاتھ ہٹایا۔ ہم اُنھیں یوں کیسے چھوڑ سکتے تھے، بھاگنے کا محل بھی نہیں تھا۔ درمیان میں آنے والوں کا اتنا ہی احساس تھا تو ہمیں کسی ایسی جگہ اُنھیں نہیں چھیڑنا چاہیے تھا لیکن وہ کوئی جگہ تو ہوتی۔ ہم نے ان سے جلد از جلد نمٹنے کی پوری کوشش کی تھی، چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے، اتنی دیر بھی انھی کے لیت و لعل کی وجہ سے ہوئی۔ وہ اڈّے کے آدمی تھے اور اتنی جلدی زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ کسی کی دخل اندازی کا تو ہر لمحے امکان تھا۔ وہ اگر فیل نہ مچاتے تو بھی یہاں کوئی کسی وقت پھٹک سکتا تھا۔ جیسے ہی گلی کے لوگ ہمارے نزدیک آئے، پیرو کے اشارے پر میں نے اپنے قابو میں کیے ہوئے آدمی

پھ نذر بڑھا دیا اور پے درپے اُس کے منہ پر ہاتھ رسید کیے۔ ساتھ ہی پیرو نے اپنے بازو اُن کی گردنوں پر اور تنگ کر دیے۔ نتیجتہً اُن کا بین بھی بڑھ گیا۔ "ابھی ایک دم چالو رکھو۔" پیرو کے لہجے میں کوئی لچک نہیں تھی۔

"ہم کو اِس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔" ایک نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ باقی دونوں نے بھی تڑپتے ہوئے یہی تکرار کی۔

"تم کہہ رہے تھے کہ آکا نے بازار میں ٹھکانا بنا رکھا ہے؟" میں نے لپکتی آواز میں پوچھا۔

"ہاں، ہاں، تمہارے جانے کے بعد کالے دادا کچھ دن ہی اُدھر ٹھیک چلا۔ شاہ کبیر حرام زادہ تو پھر اُدھر کبھی نہیں پھٹکا لیکن آکا نے کالے دادا کو بازار سے نکال دیا۔ اِدھر شہر میں اب آکا کا ہی راج ہے دادا!"

"لیکن وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟"

"ماں قسم اپنے کو کچھ نہیں معلوم۔" وہ بلکتا ہوا بولا۔ "جو تم سے جھوٹ بولے، وہ اپنی بہن سے منہ کالا کرے۔"

پیرو نے جھپکتی پلکوں سے میری طرف دیکھا، اُن کی بات میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی لیکن اس عالم میں وہ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ گلی سے اُمڈتے ہوئے لوگوں کی آمد اور شور کے باعث اُن سے کچھ اور جاننا دشوار ہو گیا تھا۔ آتے ہی کوئی میری، کوئی پیرو کی اور کوئی زخمی آدمی کی طرف لپکا۔ زخمی شخص نے بھی اُنھیں دیکھ کے کچھ زیادہ ہی ڈکرانا شروع کر دیا تھا۔ میری اور پیرو کی گرفت میں جکڑے تینوں آدمیوں کی آوازیں بھی اُونچی ہو گئی تھیں۔ جو ہم تک پہنچ چکے تھے، اُن کے پیچھے بھی لوگ بھاگے ہوئے آ رہے تھے، اُن میں گلی کے لڑکے وغیرہ بھی شامل تھے۔ کئی آدمی مجھے اور پیرو کو سمجھانے اور کمر سے پکڑ کے کھینچنے لگے تھے۔ پیرو نے اُنھیں منع بھی کیا کہ بہتر ہے وہ دُور دُور رہیں اور بیچ میں نہ بولیں۔ وہ باز نہیں آئے بلکہ تحمل تحمل کی صدائیں بلند کرنے لگے۔ جب اُن کا شور نہیں تھما اور دست درازی جاری رہی تو پیرو نے گرجتی آواز میں اُنھیں تنبیہ کی کہ وہ دونوں آدمیوں کی گردنیں توڑ دے گا اور اُن سب کے لیے بھی کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔ پیرو کی تنبیہ اتنی کارگر نہیں ہوئی تھی جتنی اُن دونوں کی التجا جو اُس کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک ساتھ سسکتے ہوئے التجا کی کہ وہ دُور دُور رہ کے اُن کے لیے بہتری کریں گے۔ "یہ ہمارا اِن کا آپس کا معاملہ ہے۔" لوگوں نے مجبوراً ہاتھ کھینچ لیے تھے لیکن اُن کا اضطراب سوا ہو گیا تھا۔ وہ ہمارے قریب ہی منڈلاتے رہے۔ کوئی کچھ، کوئی کچھ کہہ رہا تھا۔ زخمی آدمی کے لیے کوئی چارپائی منگوانے، کوئی اسپتال لے چلنے، کوئی وہیں ڈاکٹر کو بلوانے کا

مشورہ دے رہا تھا۔ اُسی دم میرے کانوں میں پولیس کی آواز بھی آئی، کسی نے پولیس کا نام بھی لیا تھا۔

پیرو کو جیسے کچھ سنائی، کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ "کام کا بات بولو۔" اُس نے سرد لہجے میں دوبارہ اُن دونوں کو مخاطب کیا۔ "کالے دادا ابھی کیدر ہے؟"

"کالے دادا آکا کے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔"

"تم نے ہمیں کیسے پہچانا؟" میں نے درمیان میں تیزی سے پوچھا۔

"ہم نے تم کو شاہ کبیرے کا ناڑا کاٹتے دیکھا تھا۔ آکا نے اُن سب کو جو اُس وقت وہاں موجود تھے، بولا تھا کہ اگر تم کبھی حیدرآباد میں پھر دکھائی دو تو ہم تمھارا پیچھا کریں اور ٹھکانا معلوم کر کے ہی لوٹیں۔"

"اپن ابھی یہی پوچھنا مانگتا ہے کہ اُس کتے کا پلے نے تم کو ایسا کیوں بولا؟"

"ہم نے لوٹ کے نہیں پوچھا تھا دادا! آکا جو بات بولنا نہیں چاہتا، اُس کو کوئی بھی نہیں جان سکتا۔" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ "ایک منٹ میں وہ آدمی کو ٹانگ دیتا ہے۔"

"ابھی اُودر مل کے اُس کا چوکھٹا بھی دیکھ لیتا ہے۔ اقا اپن لے نتھ اُترائی میں اُس کا ماں کو نہیں دیا تھا۔"

"ہم کو سب پتہ ہے دادا! ابھی ہم کیا بولے۔"

"اپن کو تمھاری طرح وہ بھی کوئی اُٹھائی گیرا لگتا ہے۔"

"ایک دفعہ اُدھر مجھے دادا نے سامنے بول دیا تھا کہ آکا تو سالا چوکی دار ہے، اصلی آسی بادشاہ کالا ہے جس نے بیچ بازار میں شاہ کبیرے کا تختہ کر دیا تھا۔ جسے کہ پھر شہر ہی چھوڑنا پڑا۔ آکا بس چاقو کا بات سمجھتا ہے۔"

دیکھتے دیکھتے ہمارے گرد خاصی بھیڑ جمع ہو گئی تھی اور اُن کی تعداد لمحہ بہ لمحہ بڑھ ہی رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گلی اور گرد و نواح کے سارے لوگ یہیں ٹوٹ پڑیں گے۔ زخمی شخص کو انھوں نے چارپائی پہ اُٹھا کے دُور کر دیا تھا اور بہت سے لوگ اُس پر جھکے ہوئے تھے۔ گو انھوں نے ہمیں روکنے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن وہ تلے کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو اکسانے کے ساتھ، تحمل کی تلقین بھی کر رہے تھے۔ پیرو نے اُن دونوں آدمیوں سے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ چند لمحے وہ یوں ہی خاموش کھڑا خونخوار نظروں سے آمنے سامنے دیکھتا رہا اور اُس نے مجھ سے آنکھ کے اشارے سے کچھ پوچھنا چاہا۔ میں جواب میں اُس سے کیا کہتا۔ اگر صرف اتنی سی بات تھی کہ کالے کے بعد آکا نامی کسی شخص نے بازار کا اقتدار سنبھال لیا تھا اور ہماری واپسی کی طرف سے محتاط تھا تو اُسے یہ طریقۂ کار اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی اور ہم اتنی سی بات پہ اس قدر دھیان کیوں دیا تھا، یا تو وہ ابھی تک

کچھ چھپا رہے تھے یا انھیں واقعی کچھ معلوم نہیں تھا مگر اب اُن سے کچھ اور جاننے میں وقت برباد نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں کسی طرح فی الفور یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ میں نے پیرو سے کچھ نہیں کہا۔ میرا سارا جسم جکڑا رہا تھا۔ یہاں سے نکلنا بھی اب آسان نہیں رہا تھا۔ گلی میں جیسے آگ لگ گئی تھی۔ لوگوں نے زندگی میں جیسے پہلی بار کوئی ایسا تماشا دیکھا ہو۔ اِس سے پہلے کہ اُن میں سے کوئی سر پھرا میری اور پیرو کی طرف بڑھنے کا ارادہ کرتا، پیرو نے اُن دونوں کو دھکا دے کے چھوڑ دیا۔ دونوں چکراتے ہوئے چوپٹ زمین پہ گرے، ماتھے پہ چوٹ لگی ہوگی۔ میں بھی پیرو کی پیروی میں فوراً اُس شخص کے جسم سے اُٹھ گیا تھا جس کی سانسیں میرے دباؤ اور ضربوں کی وجہ سے اکھڑنے لگی تھیں۔ تینوں نڈھال ہو گئے تھے۔ آنکھیں پھٹی پھٹی، منہ کھلا ہوا، رنگ پیلا۔ پیرو نے اُن میں سے ایک کا شانہ تھپتھپایا تو وہ تھر تھر لرزنے لگا۔ "اُس حرام کا جنے کے پاس اپن کو لے کے چلو، ابھی اُس زنانے کا پردہ اُٹھا کے دیکھنا ہے۔"

"دادا!" وہ ہکلانے لگا۔

"دیری مت کرو، اپن کے پاس ابھی ٹیم زیادہ نہیں ہے۔" پیرو نے تلخی سے کہا اور باقی دونوں کو حکم دیا کہ وہ جا کے اپنے ساتھی کو سنبھالیں۔ لوگوں پر سناٹا چھا گیا تھا۔ پیرو اس آدمی کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھا تو وہ سُن کھڑے رہے اور خود بخود راستے سے اُن کی بھیڑ چھٹتی گئی، ہمیں اُن کے درمیان راستہ بنانے، اُن سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پیرو نے نکڑ کے قریب مڑ کے دیکھا تو وہ ایک دوسرے پر لوٹتے پڑ رہے تھے۔ پیرو کے مڑنے پر اُن میں ایک کھلبلی سی مچی اور غیر ارادی طور پر اُلٹے قدموں اُن کا ریلا کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ ہم نکڑ سے دوسری گلی میں داخل ہو گئے تھے لیکن کچھ ہی دُور گئے ہوں گے کہ پیچھے سے پھر اُن کا شور اُٹھا جو ہمارے قدموں کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا تاہم ہم اپنی رفتار سے چلتے رہے اور اُنھوں نے کہیں ہمارے اور اپنے درمیان کا فاصلہ کم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے ساتھ آنے والا آدمی بار بار پلٹ کے کبھی انھیں، کبھی ہمیں دیکھتا تھا۔ گلی میں آگے چل کے ہمیں اور بھی بہت سے آدمی اپنی طرف دوڑتے دکھائی دیے جو ہمیں اور ہمارے پیچھے ہجوم کو آتا دیکھ کے جہاں جہاں تھے، وہیں ٹھٹھر کے رہ گئے۔ مجھ سے پیرو کی رفتار کا ساتھ نہیں دیا جا رہا تھا۔ اندر گلیوں میں دو منزلہ، سہ منزلہ پختہ عمارتیں بھی بنی ہوئی تھیں جن کی کھڑکیوں، چھجوں اور دروازوں سے عورتیں جھانک رہی تھیں۔ آگے جن لوگوں کے سامنے سے ہم گزرتے تھے، وہ دہشت زدہ نظروں سے ہمیں گھورتے ہوئے ایک طرف سمٹ جاتے تھے۔ پیچھے طرح طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں، جانے وہ ہمیں کیا سمجھ رہے تھے۔ پیرو دوسری گلی کے پہلے ہی موڑ

پر پھر مڑ گیا۔

"دادا!" "اب اِدھر آکا کے پاس جانے کا ارادہ ملتوی کر دو، اُسے پھر کبھی آ کے دیکھ لیں گے۔" موقع ملتے ہی میں نے دبے لفظوں میں اُس سے درخواست کی۔

اُس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور آہستگی سے میرا ہاتھ دبایا۔ یہ ایک مصنوعی اور جبری مسکراہٹ نہیں تھی۔ اُس کے چہرے پر پھیلے ہوئے سکون سے میرے قدم بھی زمین پر جمنے لگے تھے۔ دوسرے ہی لمحے گلی میں ایک روشن حصے میں اُس نے ہمارے ساتھ آنے والے آکا کے آدمی کی کنپٹی پہ ایک ضرب لگائی۔ وہ وہیں لڑکھڑا کے گر گیا اور اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھا۔ پیرو نے اُسی وقت جیب سے چاقو نکال کے ہوا میں اُچھال دیا۔ یہ دیکھ کے میرے سر میں چھناکا سا ہوا۔ میں نے بے اختیار اُس کے ہاتھ پر جھپٹا مارنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا تھا لیکن پیرو کا مقصد کچھ اور نہیں تھا، میرا ہاتھ اینٹھ کے رہ گیا۔ پیرو میری کمر تھپکتا ہوا اُسی لمحے آگے چل پڑا تھا، رفتہ رفتہ شور کم ہوتا گیا اور آگے جا کے بالکل ختم ہو گیا۔ گلیوں کے راستے ہمیں معلوم نہیں تھے، نہ ہم نے کسی سے راستہ پوچھا، نہ لوٹ کے دیکھا۔ تین چار گلیوں کا چکر کاٹ کے ہم آخر ایک بڑی سڑک پر نکل آئے اور وہاں آ کے مجھے ایسا لگا جیسے ہم کسی تہ خانے، کسی محبس سے نکل آئے ہوں۔ اندھیرا خاصا گہرا ہو گیا تھا اور سڑکوں پر ہر سمت روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ رکشا ملنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ گدی پر بیٹھ کے ہماری نظر گلی کے نکڑ پر گئی۔ وہاں کئی آدمی کھڑے تھے اور ہماری طرف بوکھلائے ہوئے انداز میں اشارے کر رہے تھے۔ یقیناً وہ کسی دوسرے راستے سے سڑک پر آئے ہوں گے۔ ہم سے نگاہیں چار ہوتے ہی اُن کے جسم چوب بن گئے۔ پیرو نے اُن کی جانب سے منہ پھیر کے رکشا والے کو ٹہوکا مارا، رکشا تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑنے لگا۔ اتفاق سے رکشا والا بھی خاصا پھرتیلا تھا، وہ گھوڑے کے مانند رکشا کھینچتا ہوا ہمیں جلد ہی وہاں سے دُور لے آیا۔ اُس کی چال میں غیر معمولی تیزی کچھ پیرو کے دیے ہوئے نوٹ کی وجہ سے بھی آ گئی تھی۔ ہم سڑکوں پر چلنے والی بے شمار سواریوں میں مل مل گئے تھے۔ بازاروں میں ابھی خوب چہل پہل تھی۔ مجھے بار بار پیچھے دیکھنے کی بے کلی ہوتی تھی لیکن میں پہلو بدل کے رہ جاتا تھا۔ ویسے معاملہ اگر صرف آکا کا تھا تو اتنی تشویش کی بات نہیں تھی، چاہے اُس کے ساتھی اب بھی ہمارا پیچھا کر رہے ہوں۔

پیرو نے رکشا والے کو منزل کا پتہ نہیں بتایا تھا۔ وہ صرف چوراہوں پر اُسے ہدایت دیتا تھا۔ براہِ راست نہ سہی مگر ہم ہر پل عابد شاپ روڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ابھی رکشا عابد شاپ روڈ سے دُور تھا اور ہم ایک گنجان بازار سے گزر رہے تھے کہ [illegible]

بھر آگے چوراہے پر بھیڑ دیکھ کے مجھ سے رکشا میں سیدھا نہ بیٹھا جا سکا۔ میں نے پیرو کو اور پیرو نے مجھے بیک وقت کہنی ماری۔

وہاں پولیس ہی موجود تھی۔ رکشا واپس کرنے کا وقت گزر گیا تھا۔ کئی رکشا رکے ہوئے تھے اس لیے آمد و رفت میں خلل پیدا ہو گیا تھا۔ پولیس غالباً کرائے کی ہر سواری کو چیک کر کے آگے جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ کوئی اور بات بھی ہو سکتی تھی، کوئی حادثہ۔ پیرو نے رکشا رکنے کے لیے رکشا والے کو آواز دی مگر وہ اپنی جھونک میں کچھ اور آگے بڑھ گیا اور چوراہے سے ہمارا فاصلہ مزید کم ہو گیا۔ چند گز بعد بائیں طرف ایک گلی نظر آ رہی تھی۔ پیرو نے آگے جانے کے بجائے اُسے رکشا وہیں لے چلنے کا حکم دیا۔ گلی نہ ہوتی تو ہمیں رکشا سے اُترنے کا فیصلہ کرنا پڑتا۔ جلدی میں پیرو کو یہی صورت سمجھ میں آئی تھی۔ گلی میں راستہ تنگ تھا اور بازار کی طرح اُجالا بھی نہیں تھا۔ پیرو نے نسبتاً ایک تاریک جگہ رکشا رکوا کے مجھ سے سرگوشی میں کہا کہ میں اُتر کے جلد سے جلد ہوٹل پہنچنے کی کوشش کروں اور اُس کا انتظار کیے بغیر آپا جان، زہرا اور مارتی کو لے کے فوراً اسٹیشن چلا جاؤں۔

"تم کیا کہہ رہے ہو دادا؟" میں نے وحشت سے کہا۔

"اپن ٹھیک ہی بول رہا ہے راجا! سمجھا کر جانی!" وہ آنکھ میچتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے اپن بھی ابھی ہوٹل پہنچ جائے۔"

میرے انکار پہ وہ ناراض ہونے لگا۔ "دیر مت کر راجا! ایدر تو گلی سے نکل کے پیدل ہوٹل پہنچنے کا کوشش کر۔ جتنا دیر میں اپن پولیس کے سامنے ہو گا، تو ہوٹل جا کے اُن لوگ کو نکال سکتا ہے۔ اُن کو جا کے بول کہ ابھی ایدر سے ٹکٹ کٹا لے، اپن پیچھے آتا ہے۔ ایسا ہی ہے تو تو اُن لوگ کو بھیج کے اپن کا اُودر ہی انتظار کرنا۔ ابھی اپن کیا بول سکتا ہے کہ آگے پیچھے ہی اُودر پہنچ جائے۔ سمجھا؟"

"نہیں دادا! میں تمھیں اکیلا چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔"

"مان لے راجا!" وہ میری ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کے بولا۔

"جو تم مجھ سے کہہ رہے ہو، وہ خود کیوں نہیں کرتے؟"

"ابھی سمجھ راجا!" وہ ضدی سے بولا۔

"فضول باتیں کیوں کر رہے ہو؟" میں نے بیزاری سے کہا۔ پیرو کا مطلب میں خوب سمجھ گیا تھا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ اگر پولیس حرکت میں آ گئی ہے تو وہ خود اُن کے سامنے جا کے تھوڑی دیر کے لیے اُن کی توجہ میری طرف سے ہٹائے گا۔ پولیس سر دست ایک آدمی کا ہاتھ آ جانا غنیمت سمجھے گی۔ میں اس دوران چھپتا چھپاتا ہوٹل پہنچ سکتا ہوں۔ سڑکوں پر اتنے لوگوں کے ہجوم میں مجھ اکیلے راہ گیر پہ کسی کی نظر مشکل سے جائے گی۔ ہم دونوں کو سب نے ساتھ ساتھ ہی دیکھا تھا۔ راستے بھی میرے لیے اتنے اجنبی نہیں ہیں۔ وہ بالکل اُلٹی بات کہہ رہا تھا۔ اُس کے مقابلے میں مجھے یہاں زیادہ لوگ پہچانتے تھے۔ میں نے اُس سے کہا کہ ہم سیدھے اُسی چوراہے سے گزر کے جاتے ہیں، جہاں پولیس سواریاں چیک کر رہی ہے۔ پیرو کے ذہن میں ہو گا کہ مجھے یہاں اُتار کے وہ گلی سے کسی اور طرف نکل جائے گا اور اگر آسانی سے ہوٹل پہنچ سکا تو ٹھیک ہے ورنہ پولیس کے سامنے آ جائے گا۔

پولیس کو ہمی مطلوب ہیں تو وہ دوسرے چوراہوں پر بھی آ گئی ہو گی۔ اِدھر اُدھر بھٹکنے، ٹھوکریں کھانے کی بہ نسبت یہی درست معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں کسی تاخیر اور ردّ و قدح کے بغیر اُن کے سامنے سے گزر کے جائیں۔ یہاں سے بچ نکلنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم ہوٹل چھوڑنے سے گاڑی میں بیٹھنے تک بھی اُن کی نظروں سے روپوش رہنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہاں نہیں تو کہیں اور کسی جگہ، کسی لمحے وہ ہمیں شناخت کر سکتے تھے اور اگر اُس وقت آپا جان، زہرا اور مارتی بھی ہمارے ساتھ ہوئے! ہم نے کوئی ایسا بڑا جرم نہیں کیا تھا۔ اُن لوگوں نے ہمیں خود اس اقدام پر مجبور کیا تھا۔ وہ چار تھے، ہم دو۔ ہمارے بارے میں ملنے والی اطلاعات سے پولیس شک میں پڑ گئی تھی تو اُن چاروں کے رنگ ڈھنگ سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہو گی اور وہ چاروں بھی اب ذرا احتیا[ط] ہی سے بیان دیں گے۔ انھیں یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمارا تعلق کسی اڈے سے ہونا چاہیے۔ اڈے کے لوگ تنہا نہیں ہوتے۔ بجھل کا بھی انھیں خیال ہو گا کہ وہ میرے ساتھ نہیں تھا۔ چوہے بلی کا کھیل کرنے کے بجائے ہمیں خود کو پولیس کے سامنے ہی پیش کر دینا چاہیے تھا۔ انھوں نے ہمیں بھاگنے چھپنے کی کسی حالت میں لیا تو اُن پر اور بُرا اثر پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟ میں نے پیرو سے یہی کچھ کہا۔ اُسے میری بات ماننے میں تامّل تھا۔ میں نے اُس سے پوچھے بغیر رکشا والے کو رکشا لوٹانے کی ہدایت کی۔ ہم دونوں یہیں رکشا سے اُتر کے پیدل الگ الگ ہوٹل کی جانب جانے کی تگ و دو کر سکتے تھے لیکن اگر دونوں میں سے کوئی بھی ہوٹل واپس نہ پہنچتا تو بات تو وہی ہوتی۔ آپا جان، زہرا اور مارتی کو سب تک روانہ کیا جا سکتا تھا مگر نہ تو میں نہ پیرو، دونوں ایک دوسرے کے بغیر اس طرح بمبئی جانے کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔

رکشا پھر اُسی سڑک پر آ گیا تھا۔ اس اثنا میں چوراہے پر بھیڑ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ پیرو خاموش بیٹھا رہا۔ ہمارا رکشا آ[گے] کے دور سے ایک سپاہی نے سیٹی بجائی۔ رکشا کی رفتار پہلے ہی کم پڑ گئی تھی۔ انھیں ہماری ہی تلاش تھی۔ ہمیں وہیں اُتار[لیا]

*

"دوناں مگ حاضر ہیں حضرت!" حوالدار نے تھانے کے اند[ر] گندمی رنگ اور فربہ جسم سب انسپکٹر کی میز پر ہمیں لے جا کے ک[ہا]۔

سب انسپکٹر کسی فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھا، اُس کے کلے میں پان دبا ہوا تھا۔ وہ حوالدار کی آواز پہ چونک پڑا اور چشمہ بدل کے تیکھی نگاہوں سے ہمیں گھورنے لگا۔ "اچھا! اچھا! یہ ہیں وہ رستم، سہراب۔ تھا جن کا انتظار وہ شہ کار آ گئے۔" وہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "آئیے، آئیے۔"

میں اور پیرو ساکت کھڑے رہے۔

"کیا بولتے ہیں دونوں بہادراں؟"

"بولتے کیا حضرت! وہی جو سارے لوگاں وردی والا لوگاں کو دیکھ کے بولتے ہیں۔" حوالدار ہنس کے بولا۔

سب انسپکٹر معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔ "پہلی ملاقات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" وہ چلبلے پن سے بولا۔ "اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔"

"اُدھر محلے والا لوگاں سے پہچان کرا لیا ہے۔ بولتے تھے، یہ دوناں اُن کو بھی چاقو دکھاتا تھا۔"

"ایسا! لیکن اُدھر محلے والے ننگے پیر تھے کیا؟"

"جی، جی فیروز صاحب آپ کیا؟..." حوالدار گھبرا گیا۔

"خیر خیر۔" سب انسپکٹر حوالدار کی بات کاٹ کے مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہاں یہ کام زیادہ سلیقے سے کیا جاتا ہے۔" پھر وہ تیکھی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "ذرا پانی وانی پلاؤ مہمانوں کو، تھکے ہوئے ہوں گے۔ پھر کچھ کام کی بات بھی ہو جائے۔"

حوالدار کے زرد دانت کھل اُٹھے۔ "جو مانگیں گے، ملے گا حضرت! سرکاری مہمان ہیں، اِدھر سب چیز کا انتظام ہے۔"

"ریاست میں بھی مہمان لگتے ہیں؟ کیوں؟"

میں نے اور پیرو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سب انسپکٹر کے گول چہرے پر سُرخی چھانے لگی۔ "بلاؤ ذرا فضل صاحب کو، بھی کھانا اِدھر ہی لے کے آ جائیں۔" اُس نے حوالدار کو حکم دیا اور فائل سامنے سے ہٹا کے پان کی ڈبیا کھول کے ایک اور بیڑا منہ میں دبا کے بولا۔ "چاقو، خون، ہاتھا پائی، دھونس، دھاندلی، دہشت گردی، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۵۰۶ سُن رہے ہو؟" ہم سے مخاطب تھا۔

"سُن لیا ہے۔" پیرو نے بھاری آواز میں جواب دیا۔

سب انسپکٹر کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی۔ "سُن لیا ہے، اچھا کیا ہے، پھر یہ بھی جانتے ہو گے کہ ان باتوں کے لیے موٹی موٹی کتابوں میں کیا کچھ لکھا ہوتا ہے۔"

"یہ بھی جانتا ہے۔" پیرو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بہت اچھا ہے، ویری گڈ، ویری گڈ۔" وہ پلکیں پٹپٹاتے ہوئے بولا۔ "تجربہ کار معلوم ہوتے ہو۔"

"آپ ہی لوگ سے سب سیکھا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے، کچھ زیادہ ہی سیکھ لیا ہے۔"

"ابھی یہ آپ سمجھو۔" پیرو تنک کے بولا۔

اتنے میں عمر رسیدہ محرر دوسرے کمرے سے روزنامچہ لے کے آ گیا۔ اُس کا نام سب انسپکٹر نے فضل لیا تھا۔ فضل تھکا تھکا، بگڑا ہوا منہ لے کے اندر آیا تھا لیکن ہم پر نظر پڑتے ہی اُس کا جسم اکڑ سا گیا۔ سب انسپکٹر نے اُس کے ساتھ حوالدار کو بھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، دو سپاہی ہمارے دائیں بائیں کھڑے رہے۔ "دیکھ رہے ہو؟" سب انسپکٹر نے ہماری طرف نگاہیں جماتے ہوئے محرر فضل سے کہا۔

"دیکھ رہا ہوں جناب!" محرر مستعدی سے بولا۔ "نامور لوگ جان پڑتے ہیں۔"

"آہنی کاٹنے کے بعد ہی یہ نظر پیدا ہوتی ہے۔ یہی بول رہا ہوں۔" سب انسپکٹر نے اُچک کے کہا۔ "ذرا احتیاط سے قلم چلانا۔ یہ اور تو سب کچھ لکھ لو گے، یہ تیور کیسے لکھو گے۔ سینہ چار انگل آگے نکلا ہوا ہے۔"

"یہ بھی لکھوا دو صاحب!" پیرو نے اُونچی آواز میں کہا۔ "پہلی بار کسی کو دیکھا ہے کیا؟"

"یہ تو ابھی معلوم ہو جائے گا، کس نے کس کو پہلی بار دیکھا ہے۔" سب انسپکٹر کے بجائے محرر فضل نے تیوری چڑھا کے کہا۔ "سوچ سمجھ کے زبان چلاؤ۔"

"یہ ہنر آتا تو ہم کو یہاں دیدار کیسے نصیب ہوتا۔" میری توقع کے خلاف سب انسپکٹر نے تھمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پہلے شجرہ لکھ لو فضل میاں! باقی باتیں اطمینان سے ہوں گی۔"

"بہتر ہے جناب!" محرر نے ناگواری سے کہا اور بہ عجلت روزنامچہ کھولنے لگا۔ قلم روشنائی میں ڈبو کے تلملاتے ہوئے اُس نے پھر ہم سے پوچھا۔ "نام؟ نام بولو۔"

"ابھی پہلے اپن کا بات سُن لو۔" پیرو نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"میں نے کیا پوچھا ہے؟" وہ غصے سے بولا۔ "نام بولو۔"

"اِس کو بھرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو اپن ابھی ایدر تمھارے ہی پاس ہیں۔"

"ساتھ ساتھ یہ شوق بھی جاری رہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔" سب انسپکٹر اِٹھلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اپنے فضل میاں کا قلم گرمی میں ہی کچھ روانی دکھاتا ہے، نرت بھاؤ کے چڑھاؤ میں۔ ٹھنڈا کھانے کی عادت نہیں ہے اِن کو۔"

"اپن بولتا ہے، اس کو لکھنے کا ابھی ایسا ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا خیال ہے فضل میاں! ہم کرسی چھوڑ کے چلیں؟"

"آپ ابھی اپن کی جگہ آ جاؤ تو زیادہ سمجھ میں آ جائے گا۔" پیرو نے ترشی سے کہا۔ "اپن ایدر ایک دم اجنبی ہے، تمھارے شہر کا یہی ریت ہے

توٹھیک ہے۔ ابھی اپن ایدر آ ہی گیا ہے پر کاغذ کالا کرنے سے پہلے اچھا ہے اپن کا بلت دھیان سے سُن لو۔ اس کے بعد جو مرضی ہو، کرنا۔ کرسی پر تم بیٹھا ہے اپن نئیں جس سُر میں چاہو، بولو، جواب میں اپن ٹھیکا لگائے گا۔ تم کو اچھا نئیں لگے گا، بات بھی اولمبا ہو جائے گا۔ ایدر اگر مہمان چٹک کرنا پولیس کو نئیں آتا تو اپن سکھانے کو بولا۔ یہ بال اپن نے بھی دھوپ میں سپید نئیں کیا ہے۔ ابھی تم سے بڑا بھی کرسیاں دیکھا ہے اور تم سے بڑا ....“ پیرو نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور دبی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ابھی اجازت ہو تو کچھ بولے۔“

سب انسپکٹر متجسس نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا اور کچھ نہیں بولا۔ پیرو نے اُس کی باقاعدہ اجازت ضروری نہیں سمجھی اور مختصراً اُسے بتانے کی کوشش کی کہ موسیٰ ندی کے گھاٹ پر ہم ایک شناسا کو ڈھونڈنے گئے تھے کہ چار آدمیوں نے ایک سنسان سی جگہ ہمیں گھیر لیا اور چاقو تان کے رقم کا مطالبہ کرنے لگے۔ ہمیں ناچار انھیں سنبھالنا پڑا۔ بھاگ جاتے تو بات آتی آگے نہ بڑھتی لیکن وہ اَڑے رہے اور ہم نے وہی کیا جو اس صورتِ حال میں کوئی بھی کر سکتا تھا۔

بات بہت سیدھی تھی، پیرو یہی کہہ سکتا تھا کہ سب کچھ حادثتہً پیش آیا تھا، بالکل اچانک۔ یہ بتانا بے معنی تھا کہ وہ مسلسل ہمارا پیچھا کر رہے تھے اور ہم عمداً انھیں ایک ایسے مقام پر لے آئے تھے جہاں اُن کا مقصد آسانی سے جانا جا سکے۔ اس بات پر کسی کو یقین نہ آتا۔ وہ ہزار سوال کرتے کہ پھر ہم نے تھانے میں آ کے اُن کی شکایت کیوں نہیں کی، سڑکوں پر تعینات کسی سپاہی سے مدد کیوں نہیں لی۔ وہ لوٹ کے پوچھتے کہ آخر پھر ان چاروں کے تعاقب کا کون سا اہم مقصد ہم پر منکشف ہوا۔ بات آکا اور کالے تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ البتہ پیرو نے شک ظاہر کیا کہ شاید وہ بہت پہلے سے ہماری تاک میں تھے۔ شام کے وقت عابد شاپ روڈ سے ہم نے ساڑیاں خریدی تھیں۔ وہاں کہیں کسی نے ہمارے پاس موجود رقم کی جھلک دیکھ لی ہوگی۔ سب انسپکٹر، حوالدار، محرر اور سپاہی خاموشی سے پیرو کی روداد سنتے رہے، بیچ میں نہیں بولے۔ پیرو نے انھیں اِس کا موقع بھی نہیں دیا تھا لیکن محلے والے پہلے ہی اُن کے کان بھر چکے تھے۔ خود اُن چاروں آدمیوں نے بھی اُن سے کچھ کہا ہی ہوگا۔ گو ہمارے وہاں گلی سے نکلنے اور یہاں تھانے تک آنے میں اتنا وقت نہیں لگا تھا۔ اِس اثنا میں انھیں اُلٹی سیدھی، بے ربط شہادتیں ہی سننے کو ملی ہوں گی لیکن لوگوں نے کتنے مبالغے سے کام لیا تھا، ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال کچھ کہنا خاموشی سے بہتر تھا، پیرو نے اختصار پر اکتفا کیا۔ اِس طرح اُن پر یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ وہ ایک نہایت معمولی بات پر حجت کر رہے ہیں۔“ پیرو کے چپ ہوتے ہی سب انسپکٹر ٹھمکتی سی آواز میں بولا ”کیسا سادہ اور معصوم سا واقعہ ہے۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ کیوں فضل میاں! وہ کیا کہا ہے، کسی شاعر نے ع اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔“

”کارگزاری کرو صاحب، اپنے کو ابھی اور کچھ نئیں بولنا۔“

”تم اور بول بھی کیا سکتے ہو۔“ یک لخت وہ بھڑک کے بولا ”تم نے سمجھا ہے کہ یہاں سب اُلو کے پٹھے بیٹھے ہیں۔ تمھارے بہ قول اُن کی خطا اتنی تھی کہ اُنھوں نے رقم کے لیے تم پر چاقو نکالا تھا اور تم نے اُن پر قابو پا لیا تھا۔ اس دوران اُن کا ایک ساتھی زخمی ہو گیا۔ خون سے نہ صرف اُس کے کپڑے تربتر ہوئے بلکہ زمین بھی لال ہو گئی۔ پھر وہ سسکتے، بلکتے تم سے معافیاں مانگتے رہے، تم نے انھیں نہیں چھوڑا۔ محلے والے بیچ بچاؤ کرانے کے لیے آگے بڑھے تو تم نے انھیں بھی جھڑک دیا۔ اُلٹی انھیں دھمکی دی کہ اُن کی مداخلت کا نتیجہ بُرا ہوگا۔ اُن کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے بجائے تم نے انھیں مشتعل کر دیا، انھیں چاقو دکھایا۔ سارے محلے میں غنڈہ گردی... پھر تم وہاں سے سر اٹھائے ہوئے چل دیے۔ تمھارا خیال ہے، ہم تمھاری کہانی پر یقین کر لیں گے اور آگے جا کے بھی تم یہی رَٹ لگاؤ گے۔ یہاں سے وہاں تک سب اندھے اور بہرے بیٹھے ہیں۔“

وہ کسی حد تک ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، پیرو کے بیان میں بہت سے سقم تھے مگر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا۔ ہم اُسے اور کس طرح باور کراتے کہ ہمارا کوئی قصور نہیں تھا، ہمارے تو سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں بھی کوئی ہمارا منتظر ہوگا۔ ہم تو اپنے ہوٹل جا رہے تھے کہ وہ راستے کا پتھر بن گئے۔ سب انسپکٹر آنکھیں لال پیلی کیے گرجتا رہا، اُس نے جیسے پہلے ہی ہمارے ... اپنے ذہن میں کچھ طے کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود پیرو نے ... مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی۔ اُس نے اُسے بتایا کہ سب کچھ اتنی تیزی سے پیش آیا کہ کسی کے بھی اوسان ٹھکانے نہ رہ سکتے تھے۔ اُن کے پاس چاقو تھے اور اُن کی تعداد ہم سے دگنی تھی۔ قابو پا کے انھیں فوراً چھوڑ دینے میں اندیشہ تھا کہ وہ پلٹ نہ پڑیں۔ اُن سے دست برداری تبھی ممکن تھی جب اُن کی طرف سے دوبارہ ایسی جرأت نہ کرنے کا اعتبار ہو جائے۔ ذرا سی چوک ہو جاتی تو وہ چاقو جو اُن کے ساتھی کو لگا تھا، ہمیں نشانہ بنا سکتا ... ہمارے پاس معقول رقم کا جو اثاثہ تھا، اُس کے چھن جانے کا ... خدشہ تھا۔ اِس پردیس میں پھر ہم کہیں کے بھی نہ رہتے۔ کیا انھیں سبق نہیں ملنا چاہیے تھا کہ آئندہ وہ کسی اجنبی پر ہاتھ ڈالنے ... یہ تجربہ نہ بھولیں۔ ایسے لوگوں کا تعلق عموماً شہر کے کسی نہ کسی دادا ... سے ہوتا ہے۔ ہماری کوشش یہ تھی کہ احتیاطاً ہم اُن کے سرغنہ ...

ہم بھی جان لیں کہیں دُور ذہن کے کسی گوشے میں ایک یہ احساس بھی چھپا ہوا تھا کہ انھیں ہمارے کسی دشمن نے تو تعینات نہیں کیا ہے۔ ہمارے شہر کا کوئی دشمن کرائے پر یہاں اُن کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔ اُن سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ اپنے رنگ ڈھنگ سے وہ منجھے ہوئے ہی معلوم ہوتے تھے اور کسی رعایت کے لائق نہیں تھے۔

پیرو نے اعتراف کیا کہ لوگ بے شک درمیان میں آئے تھے لیکن انھیں پورا واقعہ ہی معلوم نہیں تھا۔ وہ آتے ہی کچھ جانے بُوجھے بغیر انھیں ہم سے اوندھے سوندھے جھگڑنے لگے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اُن لوگوں کی شہ پا کے وہ ہمارے لیے اور خطرہ بن سکتے تھے۔ زخمی شخص کی طرح کہ انھیں شیر کرنا شر کی توہین ہے۔ ہمیں یہ بھی بھروسا نہیں تھا کہ آنے والے محلے کے لوگوں میں کتنے اُن کے ساتھی، شناسا، اُن کے بہی خواہ ہیں۔ ان کا تعلق بھی کہیں اس محلے اور اس کے مکینوں سے تو نہیں ہے۔ اسی لیے ہم نے انھیں اپنے قریب پھٹکنے کی اجازت نہیں دی۔ اپنی جان اور اثاثے کی حفاظت کے لیے لازم تھا کہ ہم مشتعل محلے والوں کو دُور ہی رکھیں۔ ہم نے یہی کیا، یہی ہمیں اپنے لیے بہتر نظر آتا تھا۔ محلے والوں سے ہمیں کسی سلوک کی اُمید نہیں رہی تھی۔ وہ ایک پورا ہجوم تھا، ہم صرف دو تھے اسی لیے ہم اُن چاروں میں سے ایک کو ڈھال بنائے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پیچھے پھر بھی وہ شور مچاتے رہے۔ انھیں روکے رکھنے کے لیے آخری چارۂ کار کے طور پر ہمیں اُس آدمی کو بے بس کرنا اور چاقو دکھانا پڑا لیکن ہم نے اُسے چاقو مارا نہیں۔

”تم نے بڑا احسان کیا۔“ سب انسپکٹر کی آواز میں زہر بھرا ہوا تھا۔ ”اور تم، تم نے اُس کے بعد پولیس میں آنا بھی ضروری نہیں سمجھا کیونکہ سارا فیصلہ تو تم نے خود کر دیا تھا۔“

”اپنا ارادہ پہلے ایدر ہی آنے کو تھا پر راستے میں بدل گیا۔ اپن اُلجھن میں پڑ گیا تھا کہ ابھی پہلے ایدر آئے یا اپنا ٹھور ٹھکانا کرے۔ رات ختم ہو گیا تھا۔ اپن بعد کو بھی ایدر آ سکتا تھا، ساتھ اور بھی بہت سا بات اپن کے مغز میں بھرا تھا، اُس کو بولنے کا ضرورت نہیں۔ تم ابھی خوب سمجھتا، جانتا ہوگا۔“

پیرو نے وہ عام سی کہانی یوں ہی نہیں دُہرائی تھی۔ اُسے احساس تھا کہ بعد میں اُسے کیسے کیسے سوالوں سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔ وہ کسی جھجک کے بغیر ہر سوال کا جواب دیتا رہا اور پورے شد و مد کے ساتھ اور وہ سب کچھ ایسا بے جواز، بے دلیل بھی نہیں تھا جیسا مجھے پہلے نظر آتا تھا۔ سب انسپکٹر کسی وکیل کی طرح اُس سے ضد بحث کرتا رہا۔ اُس نے آکا اور کالے کا نام نہیں لیا تھا، اُس کا مطلب تھا کہ محلے والوں اور اُن چاروں نے آکا اور کالے کے بارے میں پولیس کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ محلے والے دیر سے درمیان میں آئے تھے۔ اس سے پہلے وہ تینوں آکا اور کالے کے متعلق ہمیں خاصا کچھ بتا چکے تھے۔ آنے کے بعد محلے والوں نے باقی کچھ اُن تینوں کی زبانی سُنا تھا۔ پتہ نہیں وہ اُن کے کس قدر پلے پڑا۔ وہاں اُس وقت بہت ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ اذیت میں وہ تینوں بھی ٹوٹے پھوٹے بے ربط سے فقرے بول رہے تھے۔ بہرصورت سننے والوں سے آکا اور کالے کے سلسلے میں پولیس کو کچھ پتہ بھی چلا تھا تو وہ کوئی رائے قائم نہیں کر سکی تھی ورنہ سب انسپکٹر اس کا ذکر کرنا نہ بھولتا۔ خود اُن چاروں نے بھی اپنے آقا اور اُستاد کا نام لینے میں احتیاط کی ہوگی اور کوئی اور ہی کہانی بتائی ہوگی۔ پیرو کو جیسے یقین تھا کہ اُنھوں نے آکا اور کالے کا نام نہیں لیا ہوگا اس لیے وہ اپنی رُوداد پر اصرار کرتا رہا اور اُس نے اپنے بیان میں سرِ مو تبدیلی نہیں کی۔ یہ بھی ایک تدبیر ہوتی ہے کہ ابتدا میں جو منہ سے نکل جائے اُس پہ آخر تک جما رہا جائے اور پیرو کے منہ سے یہ سب کچھ یوں ہی نہیں نکل گیا تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ سب انسپکٹر کو ہم سے کوئی پُرانی عداوت ہے، ہماری صورتوں سے چڑ ہے یا بہت دنوں بعد تھانے میں کوئی ایسا معاملہ اُس کے سامنے آیا ہے۔ اُسے شاید بہت سی باتوں پہ حیرت تھی، اُن چاروں پر ہمارا قابو پانا جن کا ریکارڈ پولیس کے پاس موجود ہوگا۔ بیچ میں پڑنے والوں کو ہمارا پھٹکار دینا اور اُن کی بھیڑ چھانٹتے ہوئے آسانی سے نکل جانا۔ ایک نہیں کئی حیرتیں اُس کے دماغ میں کلبلا رہی ہوں گی۔ بعد میں جائے وقوع پر پہنچنے والے سپاہیوں سے محلے والوں نے خوب حاشیہ آرائی کی ہوگی۔ انھیں بتایا ہوگا کہ کس طرح ہم نے اُن کی گردنیں دبوچ رکھی تھیں۔ سب انسپکٹر کی وحشت سے ظاہر ہوتا کہ اُسے حیرت ہمارے بیان پر نہیں، خود ہم پر ہے۔ ہم کون ہیں، ہمارے بارے میں جاننے کے لیے وہ بُری طرح بے چین نظر آتا تھا۔ کرید کرید کے متعلق اور غیر متعلق سوال کرتا تھا مگر وہ پیرو سے کچھ اور حاصل نہ کر سکا۔

ہم نے اُسے اپنے نام بھی مختلف بتائے تھے، ولدیت بھی مختلف، پتے بھی خود ساختہ۔ پیشہ کاروبار بتایا تھا اور کہا تھا کہ بمبئی کے بھنڈی بازار میں ہمارا ایک ٹھیا ہے۔ اس کے علاوہ سارے ہندوستان سے مختلف قسم کی چیزیں ہم بمبئی سپلائی کرتے ہیں۔ حیدرآباد کاروبار ہی کی غرض سے آج پہلی بار آنا ہوا ہے، آج سہ پہر ہی آئے تھے۔ ہمارا مختصر سامان موسیٰ ندی کے گھاٹ کے ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ کپڑوں کے علاوہ ہم نے جو ساڑیاں خریدی تھیں، وہ بھی وہیں رہ گئیں۔ پیرو یہ بتانے سے بھی نہیں چُوکا کہ سامان میں کچھ رقم اور جیولری کے نمونے تھے۔ رقم معمولی تھی لیکن وہ سب کچھ ہم سے چھن گیا۔ دیکا جی ہوٹل، زورا، مارتی اور آکا جان کی ہوا بھی اُسے ہم نے نہیں لگنے دی۔ نام اور ولدیت کے سوا ہمیں

ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ سب کچھ پیرو ہی بولتا رہا، میرے اور پیرو کے لہجے کا فرق سب انسپکٹر کو فوراً محسوس ہو گیا تھا اسی لیے کہنا پڑا کہ میں دلی میں پیدا ہوا تھا، عرصے سے بمبئی میں ہوں اسماعیل (پیرو) کے ساتھ ہی کام کرتا ہوں۔ پیرو نے سب انسپکٹر کو اچھی طرح جتا دیا تھا کہ وہ آگے جا کے یہی سب کچھ دہراتا رہے گا۔ اُس کے عزم، اُمید اور بے باکی سے سب انسپکٹر تلملا رہا تھا۔ پیرو چاہتا یہی تھا کہ وہ اُسے اپنے اعتماد سے متزلزل کر سکے ہمیں یہاں سے کسی طور اسی وقت نجات مل جائے۔ اُدھر ہوٹل میں اباجان راہ تک رہے ہوں گے۔ ہم اُن سے واپسی میں دیر ہو جانے کا کہہ کے آئے تھے لیکن دیر سے مراد یہ نہیں تھی کہ رات واپس ہی نہ پہنچیں۔ وہ نہ کسی سے پوچھ سکتے تھے، نہ اُنھیں کوئی ایسا نشان معلوم تھا جہاں ہمارا سُراغ لگا سکیں۔ اباجان کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ سے ہمارا اسی وقت یہاں سے نکل جانا سُود مند تھا۔ ایک رات گزر جانے کے بعد ضروری نہیں تھا کہ صبح ہی وہ ہمیں متعلقہ حاکم کے سامنے پیش کرے۔ وہ ہمیں کئی روز تھانے میں اور معلومات اکٹھی کرنے کے لیے ہمیں روک سکتا تھا، اُس سے اور پیچیدگی ہی پیدا ہوتی۔ چھان بین کرنے پر اُسے یہ بھی معلوم ہو سکتا تھا کہ میں نے کچھ عرصے پہلے محبوب کی مہندی میں شاہ کبیر کو بے دخل کر دیا تھا اور پیرو نہیں تو میں پہلی بار حیدرآباد میں آیا ہوں اور جانے کیا کیا۔ پیرو نے اپنے پاس موجود رقم کا تذکرہ اسی وجہ سے بار بار کیا تھا کہ لے دے کے کام بن سکے تو بھی بُرا نہیں ہے۔ سب انسپکٹر کے پتھر میں جنبش نہیں ہوئی۔ اُس کا انداز، لب و لہجہ پہلے کی نسبت یکسر بدلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ شدتِ غضب میں اُس کی زبان ہکلانے لگتی تھی۔ پیرو نے خود کو بہت روکا لیکن سب انسپکٹر کی اوٹ پٹانگ باتوں پر اُس کی آواز بھی تمتمانے لگتی تھی۔ مجھے کرشنا جی بہت یاد آ رہے تھے، وہ بھی ایک پولیس افسر تھے۔ ہمیشہ نرمی اور اخلاق سے بات کرتے اور بڑے بڑے معاملات منٹوں میں حل کر دیتے۔ ایک یہ شخص تھا، ہمیں کوئی جانور سمجھ رہا تھا جیسے ہم کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھ کے آئے ہوں۔

"بس صاحب! ابھی اپنے سے زیادہ چک چک مت کرو۔" دیر بہت ہو گئی تو پیرو نے بیزاری سے کہا۔ "ابھی آپ کو جو کرنا ہو فیصلہ کر دو۔ اپن کو جو منہ ماری کرنا تھا، کر دیا۔ ہو سکے تو اپنے پر بھروسا کرو، نہیں کرتا تو ادھر اپنا حکم نہیں چلتا۔ اپن اُدھر جا کے ہی ابھی کچھ بولے گا جدھر کوئی سُنے گا۔ ابھی ایدھر ایک اکیلا تمھی ہے۔ آگے تم سے بڑا بھی کوئی حاکم بیٹھتا ہے، سالا اتنا سا بات آسمان پر چڑھا رہا ہے۔ ابھی کون سا دُنیا اُوپر نیچا ہو گیا ہے۔ اپن کی سمجھ میں ایک دم تمھارا کیڑا نہیں آیا۔ تم کوئی ایدھر کا بادشاہ ہے! کیا ہے تم؟ کیا مانگتا ہے؟ اپنے کو تم یا تو چریلا یا پھر کوئی بہت اُونچا آدمی لگتا ہے۔ لگتا ہے پولیس میں نوا نوا آیا ہے۔ پہلے کسی نوٹنکی میں کام کرتا تھا کیا؟"

"اوقات سے مت بڑھو۔" حوالدار نے کھڑے ہو کے کہا۔ وہ اُٹھا اسی طرح تھا کہ بڑھ کے پیرو کو طمانچہ مارے گا لیکن پیرو کا چہرہ دیکھ کے ٹھٹک گیا اور آتشیں لہجے میں بولا۔ "یہ ...... تھانا ہے۔"

"اپن بھی کوٹھا نہیں سمجھ رہا ہے۔"

"یہ اندر کے کمرے کے لوگ ہیں جناب!" محرر فضل نے لقمہ دیا۔

"پھندا بھی ایدھر منگوالو۔" پیرو نے تلخی سے کہا۔

"تم اپنے لیے بہت بُرا کر رہے ہو۔"

"تم ابھی اپنے ساتھ کون سا اچھا کر رہا ہے۔"

"ٹھیک ٹھیک بول دو تو تمھارے حق میں اچھا ہو گا۔" حوالدار نے سب انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا تعلق تھا اُن لوگوں سے تمھارا؟ کتنی رقم کا معاملہ تھا؟"

"ابھی تم اپن سے مخول کرتا ہے حوالدار!"

"دیکھو، صاحب کا غصہ مول مت لو۔"

"صاحب کے پاس اور کوئی چیز ہو تو سودا بھی کرے۔ تو ایک ہی چیز رکھتا ہے۔"

"ہم بولتے ہیں ایسی ویسی کوئی بات ہے تو بالکل مت چھپاؤ، جھوٹوں اور دھوکا دینے والوں کے لیے صاحب کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"ابھی تم بار بار کیا ٹنگی مارتا ہے۔" پیرو نے بگڑتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اپنے کو حوالات کا رستہ دکھاؤ، ابھی ویری کس بات کا۔"

"حرام زادے!" سب انسپکٹر دہاڑنے لگا۔ "اب حوالات جانے کی جلدی ہے، پہلے سیدھے اِدھر آتے ہوئے میا مرتی تھی۔"

"اپن کا منہ میں بھی زبان ہے اور چلانا بھی تم سے اچھا آتا، اتنا ہی بولو جتنا اپن سن سکے۔" پیرو کی آواز بھرا گئی تھی۔ میں نے فوراً اُس کا شانہ تھام لیا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ جھپٹ کر سب انسپکٹر کی زبان نہ کھینچ لے۔ سب انسپکٹر کو بھی شاید کچھ احساس ہو گیا تھا۔ پسینے سے اُس کی پیشانی تر بتر ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد کمرے میں پھر پیرو کی آواز گونجی۔ "ابھی اپن آخری بات بولتا ہے۔" اُس کا لہجہ حیرت انگیز حد تک تھما ہوا تھا۔ "اپن کو عدالت پیشی سے ایک دم کرامت سمجھو۔ جانتا آگے کیا ہونا ہے، کیا ہو سکتا ہے۔ تم کیا، اپن کیا کر سکتا تم کتنا، اپن کتنا دُور جا سکتا ہے۔ اپن بولتا ہے کہ ایدر تمھارا شہر میں ہی رہے گا۔ جب بولو گے، چلا آئے گا۔ ابھی یقین نہیں آتا تو ساتھ ہوٹل میں سپاہی رکھ دو۔ جب تک تم خلاصی کی گھنٹی نہیں بجائے گا، اپن ایدر سے بھاگے گا نہیں۔ اپنے پاس بڑا رقم ہے۔ ضمانت میں اس کو اپن ابھی ایدر چھوڑ سکتا ہے۔ اپنا تمھارا کوئی دشمنائی نہیں ہے۔ ہے تو بولو، پھر اپن تم سے کسی دوسرا طرح میں بات کرے۔"

سب انسپکٹر خشونت آمیز نظروں سے ہمیں دیکھا کیا اور اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پہلی بار مجھے اُس کے چہرے پر کسی قدر نرمی کے آثار نظر آئے تھے۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ اے کاش، خدا اس کے دل میں کچھ رحم ڈال دے۔ میرا نفس نفس اُس لمحے یہی دُعا کر رہا تھا۔ پیرو نے ہر جتن کر کے دیکھ لیا تھا۔ اب سب کچھ انسپکٹر پر منحصر تھا۔ دیر تک وہ گومگو کی حالت سے دوچار رہا مگر رفتہ رفتہ اُس کے چہرے پر وہی کھنچاؤ پیدا ہو گیا اور اُس نے یکایک مشتعل آواز میں حوالدار کو حکم دیا۔ "ان کی تلاشی لو۔"

پیرو نے پھر کچھ نہیں کہا، نہ میں نے۔ حوالدار تلاشی کے لیے اُٹھا تو ہم نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ مزاحمت کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ میری جیبوں کا سارا سامان ناگ پور اسٹیشن کے تھانے ہی میں رہ گیا تھا۔ اُنھوں نے جیبوں اور نیفے کی تلاشی پر اکتفا کی۔ گریبان تک اُن کے ہاتھ نہیں گئے اور میری مالا میرے پاس ہی محفوظ رہ گئی۔ پیرو نے بھی اپنا چاقو اُسی گلی میں پھینک دیا تھا جہاں ہم نے پولیس دیکھ کے رکشا مُڑوا دیا تھا، البتہ پیرو کی جیب سے نوٹوں کی کئی گڈیاں برآمد ہوئیں۔ ہزاروں روپے کے۔ بے قدر سونیا کے بے سُدھ ہو جانے کے بعد ناگ پور اسٹیشن پر جب پیرو، زہرا اور طارق مجھ سے اور اباجان سے الگ ہو گئے تھے تو زر و جواہر کی پوٹلی اور لکھنؤ میں بیچے جانے والے پتھروں کی ڈھائی لاکھ کے قریب رقم بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہی سب سے بڑی وجہ اُن کے الگ ہونے کی بھی تھی۔ اُنھوں نے طے کیا تھا کہ وہ اسٹیشن پر اُتر جائیں اور جیسے ہی گاڑی پلیٹ فارم سے کچھ آگے نکلے، اباجان زنجیر کھینچ کر اور پولیس کو طلب کر کے سونیا کی لاش اُس کے حوالے کر دیں۔ وہ تینوں ساتھ ہوتے تو زرد طوالت پیش آ سکتی تھی خصوصاً نایاب پتھروں اور اتنی بڑی رقم کی موجودگی میں۔ حیدرآباد آ کے اُنھوں نے وہ تمام چیزیں یقیناً اباجان کو واپس کر دی ہوں گی لیکن پیرو کی جیب سے گڈیاں نکلنے سے ظاہر تھا کہ اباجان نے کچھ رقم احتیاطاً اُس کے پاس ہی رہنے دی ہے یا ممکن ہے، پہلے ہی سے پیرو کے پاس اتنے روپے ہوں، تجمل نے اُسے دیے ہوں۔ بہرحال مجھے ٹھیک طرح کچھ علم نہیں تھا کہ کتنی رقم اباجان کے پاس ہے کتنی دوسروں کے پاس۔

گڈیاں دیکھ کے اُن کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ وہ گم صم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور سب انسپکٹر کوئی فیصلہ نہ سُنا سکا مگر یہ محض چند لمحوں کا تذبذب و تردد تھا کہ اُس نے حقارت آمیز انداز میں حوالدار کو اشارہ کیا۔

حوالدار نے زیرِ لب اُس سے کچھ کہنے کی کوشش کی تو سب انسپکٹر آنکھیں نکال کے اُس پر گرجنے لگا۔ "۳۰۲ بن گئی تو تمھارا باپ آ کے سنبھالے گا؟"

"۳۰۲ ابھی ایک دم نہیں بنتا ہے صاحب!" پیرو نے دبی زبان سے کہا۔

سب انسپکٹر نے جیسے سُنا ہی نہیں۔ اُس نے سرگوشی میں حوالدار سے کچھ کہا۔ حوالدار نے درباریوں کے انداز میں سر جھکایا اور ہمارے دائیں بائیں کھڑے ہوئے سپاہیوں نے ہمارے گرد محاصرہ تنگ کر لیا۔

وہ ایک تنگ و تاریک کمرہ تھا۔ تین اطراف مٹیالی دیواریں اور ایک طرف سلاخیں تھیں، سلاخوں سے باہر ٹمٹماتے ہوئے قمقمے نے اندر کسی قدر اُجالا کر رکھا تھا۔ شروع میں ہم اندھوں کی طرح داخل ہوئے تھے لیکن کچھ دیر میں آنکھیں مانوس ہو گئیں۔ فرش پختہ اور ٹھنڈا تھا، کمرے میں کوئی بُو سی پھیلی ہوئی تھی۔ دن بھر چلتے رہنے سے ویسے ہی سارا جسم ٹوٹ رہا تھا، پیرو اندر آتے ہی دیوار سے ٹیک لگا کے خاموش بیٹھ گیا تھا۔ اب اُسے خیال آ رہا ہو گا کہ صبح میری بات مان لیتا تو یہ نوبت نہ آتی مگر اس کا کیا قصور تھا۔ قصور تو سارا نصیب کا تھا۔ نصیب جس کے سامنے زر و جواہر بھی کچھ نہیں کر پاتے، آدمی دیکھتا رہ جاتا ہے۔ جب میں پیرو کو منع کر رہا تھا تو مجھے کون سا الہام ہوا تھا۔ میں نے تو اُن ہی کے خیال سے کہا تھا کہ اگر پھر کہیں مولوی صاحب کا کوئی غلط سلط پتہ ملا تو اُنھیں اور دیر ہو جائے گی۔ یہ سب تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ رات ابھی زیادہ نہیں ہوئی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اباجان کی بے کلی بھی بڑھ رہی ہو گی۔ زہرا اور طارق نیچے ہوٹل کی راہ داری اور دروازے تک جا جا کے دیکھتے ہوں گے۔ ممکن ہے تلاش میں اب تک نکل کھڑے ہوئے ہوں مگر وہ کہاں تک جائیں گے اور کس سے کیا پوچھیں گے۔ کوئی بھی نہیں تھا جو اُن سے اتنی سی بات جا کے کہہ دیتا کہ وہ سیدھے بمبئی چلے جائیں، اب ہمارا انتظار نہ کریں، ہمارا کچھ طے نہیں ہے، جانے کتنی دیر لگ جائے۔ جب تک ہم سب انسپکٹر کے سامنے تھے، ایک اُمید سی بندھی ہوئی تھی مگر اب کچھ نہیں رہا تھا۔ پولیس زخمی شخص کی ڈاکٹری رپورٹ کا انتظار کرے گی اور مزید تفتیش بھی۔ وہ ہمیں حوالات میں کئی دن روک سکتے تھے۔ بعد میں منصف کے سامنے پیش ہونے پر بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر میں اور کیا فیصلہ کرے۔ ایک رات

کیا، بہت سی راتیں لگ سکتی تھیں۔ اُدھر آکا کی بھی یہی خواہش ہوگی کہ ہم یہاں سے کبھی نہ نکلیں۔

سلاخوں سے باہر پہرے پر ایک ہی مسلح سپاہی تھا۔ وہ گاہے گاہے ہماری طرف گشت لگاتا اور کمرے سے کچھ دور رکھی ہوئی کرسی پر جا کے بیٹھ جاتا تھا۔ حوالات میں ہمارے سوا کوئی نہیں تھا ورنہ تھوڑی بہت آواز چہکار مزید ہوتی۔ ہمارے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں نے اور پیرو نے برسوں جیل میں گزارے تھے ابھی ایک روز پہلے تین دن ناگ پور کی حوالات میں رہنا پڑا تھا اس سے پہلے تبت سے کلکتے آنے کے فوراً بعد بھی ہم نے تھانے ہی کا منہ دیکھا تھا۔ تبت میں منڈ کے تہہ خانے بھی حوالات سے کم نہیں تھے لیکن یہاں ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہو رہا تھا پیرو کی خاموشی سے مجھے اور گھٹن ہو رہی تھی۔ کئی بار میں نے اُسے ٹوکنے، اس سے بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن اُس کا پھولا ہوا چہرہ دیکھ کے میری ہمت نہیں پڑی اور مجھے اُس سے کہنا بھی کیا تھا۔ کون سی ایسی بات تھی جس کا جواب مجھے دینا تھا یا اُس سے کچھ جاننا تھا میری طرح اُس کی نگاہوں میں بھی اُن تینوں کے چہرے گھوم رہے ہوں گے رات بھر انھیں ایک لمحے نیند نہیں آئے گی۔ کوئی اور ہوتا تو انھیں اتنی بے تابی نہ ہوتی۔ وہ ہم تھے جو ہتھیار کے بغیر نہیں چلتے اور جن کے پاس ہتھیار ہوتا ہے نشانے بھی کچھ انھی کی طرف لپکتے ہیں۔ ہمارے نہ پہنچنے سے طرح طرح کے وسوسے اُن کے ذہن میں اُٹھ رہے ہوں گے۔

ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حوالات عمارت کے اندرونی حصے میں تھی مگر اتنی دور بھی نہیں کہ باہر کی کوئی سن گن نہ مل سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے ہمیں یہاں بھیج کے تھانے کا دروازہ بند کر دیا ہے یا تھانے کے اوقات مقرر ہیں۔ گشت لگانے والا سپاہی بھی دیر سے اِدھر نہیں آیا تھا۔ پیرو نے ٹانگیں زمین پر پھیلائی ہوئی تھیں۔ خاصا وقت گزرنے کے بعد کہیں جا کے سپاہیوں کی چاپوں سے کمرے کا سناٹا ٹوٹا۔ وہ چار پانچ سپاہی تھے۔ جو قدرے لمبے سلاخوں پر نمودار ہوئے۔ میں نے بے چینی سے پیرو کی طرف دیکھا لیکن اُس کے جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی، یوں ہی دم بخود سا بیٹھا رہا جیسے اسے معلوم تھا کہ سپاہی محض ہمارا نظارہ کرنے آئے ہیں۔ وہ چند لمحے کھڑے کانا پھوسی کرتے رہے اور جیسے آئے تھے، واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد پھر وہی قبرستان جیسی خاموشی چھا گئی۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو میں نے پیرو کو ٹہوکا دیا۔ "کیا ہے دلوا!" میں نے تند لہجے میں کہا۔ "کیا سوچ رہے ہو تم؟"

وہ اچھل پڑا اور میرے گلے میں بازو ڈال کے مجھے دبوچنے لگا۔ "کیا راجا!" وہ زہرخند سے بولا۔ "ابھی کیا سوچے گا سالا۔ جو ہونا تھا، اُسے تم اور میں کیسے روک سکتے تھے؟"

"وہ تو ہو ہی گیا ہے راجا!" وہ سانس بھر کے بولا۔

"پھر کیا ہے، تم ایسے کیوں بیٹھے ہو، ہم اور کیا کر سکتے تھے یہاں مت بیٹھو، مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

"ارے راجا!" اُس نے مجھے زور سے بھینچ لیا اور اُس کی آواز کپکپانے لگی۔ "ایسا بولا نا اب تجھل بھائی کا لاڈلے مافق۔ اپن بولے راجا! اپن کچھ تیرے ہی بارے سوچ رہا تھا۔"

"میرے بارے میں کیا؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "میں کوئی اندھا ہوں، سب دیکھ نہیں رہا ہوں۔ پر تمھارے منہ پر یہ چپ اچھی نہیں لگتی۔"

وہ ہنسنے لگا۔ یہاں تک کہ اُس کی آواز ہمارے نگراں سپاہی تک جا پہنچی کہ وہ دوڑتا ہوا سلاخوں تک آیا اور بے تابانہ ہمیں گھورنے لگا۔ "کیا، کیا بات ہے؟" اُس نے متردد لہجے میں ہم سے پوچھا۔

"ابھی کچھ نہیں ہے حوالدار۔" پیرو نے اُونچی آواز میں جواب دیا۔

وہ ہٹا نہیں، وہیں کھڑا ہمیں تکتا رہا، پھر ادھر اُدھر دیکھ کے سرگوشی میں بولا۔ "اِدھر آؤ۔"

پیرو ایک ثانیے کے توقف کے بعد اُٹھ کھڑا ہوا اور سلاخوں کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا۔

"تم کو۔" سپاہی نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "تم کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اپنا مطلب ہے، بیڑی ویڑی، سگریٹ پان، ایسا ہو تو اپنے کو اشارہ کر دینا۔"

"اپن کو ابھی ایک ہی آدمی ٹھیک دکھائی دیا ہے۔" نوٹوں کی ساری گڈیاں انھوں نے اپنی تحویل میں لے لی تھیں مگر پیرو نے روپے جانے کہاں چھپا رکھے تھے کہ ان کی نظروں میں نہیں آ سکے جیل، حوالات اور پاڑے کے لوگوں کے لیے دوسرا گھر ہوتی ہیں۔ پیرو ایسے موقعوں کے لیے احتیاطاً کچھ بچا کے، چھپا کے ہی رکھتا تھا کہ اس نے جھٹ گریبان میں ہاتھ ڈال کے چند نوٹ نکالے اور مٹھی میں دبا کے اس کی طرف بڑھا دیے۔ "نکو بابا! نکو۔" سپاہی خالص حیدرآبادی لہجے میں بولا اور اُس نے روپے لینے سے انکار کر دیا مگر جب پیرو نے نوٹ اُس کی جیب میں ٹھونس دیے تو اُس نے زیادہ پس و پیش بھی نہیں کیا۔ بدبداتے ہوئے کہنے لگا۔ "وہ سالا ایسا ایک نمبر کا حرامی ہے۔ پر تم اِدھر کائے کو پھنس گیا بابا۔ یہ ایسا الٹ پلٹ اپن کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔"

وہ سب انسپکٹر کو گالیاں دینے اور ہم سے ہمدردی کا اظہار کرنے لگا اور بولا۔ "ہم سمجھتا ہے تم لوگاں ایسا نہیں ہے۔ کار خاص آدمی جان پڑتا ہے۔ ابھی فکر نکو کرو، سالا گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ کبھی تولا، کبھی ماشہ، کوئی پتہ نہیں، ابھی فیصلہ بدل ہو۔ ایک رات اِدھر کاٹ دیو، سویرے تک وہ بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا۔"

"ابھی اِیدر کوئی بڑا افسر نہیں بیٹھا؟"

"بیٹھا ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "انسپکٹر رکنی صاحب، نام اُن کا رکن الدین ہے۔ یہاں سب رکنی رکنی صاحب بولتے ہیں۔ ابھی تھانے میں آیا ہے۔ آدمی فرسٹ کلاس ہے۔"

"اُس سے بولو کہ اپن اُس سے ملنا مانگتا ہے۔"

"ایسا نکو۔" وہ آنکھ مار کے بولا۔ "جلدی مت کرو، موقع دیکھ کے بات کرے گا۔ میڈیکل رپورٹ بھی آ جائے تو اچھا ہے، سالے کی ہوا اس نکل جاوے گی۔ زیادہ زخم تو نہیں لگا تھا اُس کو؟"

"نہیں۔" پیرو نے ترشی سے کہا۔ "بھیجے کا جنا تھا۔"

"ٹھیک ہے، تم یہی بیان بولنا، اُدھر محلے والاں کو تم کیوں ناراض کر دیو بابا! اُن لوگاں نے ہی سالا زہر بھرا ہے۔"

"تم اندر جا کے افسر تک اپنا بات پہنچانے کا کوشش کرو ورنہ بولو تو اپن اِیدر شور مچانا چالو کرتا ہے۔"

"نکو، ابھی اپنے کو کیوں مروانے کی فکر میں ہے۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ابھی صبر کرو۔ تم کو چائے پانی بھیجے کھانا دانا...."

پیرو نے چائے کے لیے کہہ دیا اور چند منٹ بعد ہی ہمیں چائے پہنچا دی گئی۔ پیرو کے ساتھ میں نے بھی زہر مار کی۔ سپاہی دیر تک نہیں پلٹا تو پیرو نے کھنکار کے اُسے اشارہ کیا اور قریب آنے پر اس سے انسپکٹر سے ملنے کی بابت پوچھا۔

"رکنی صاحب بولتے ہیں، ابھی سویرے دیکھیں گے۔" وہ خفگی سے بولا۔

"اُس سے بولو کہ ابھی اپن کو ضروری بات بولنا ہے۔"

"ایسا کیسے بولے، افسر آدمی ہے بابا! مرضی کا مالک، ابھی ایک رات گزار ہی دیو۔" اُس نے پچکارتے ہوئے کہا۔ "سویرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"سویرا کس نے دیکھا ہے، جیسا اپن بولتا ہے، ابھی ویسا ہی جا کے اُس کو بولو، بولو کہ اپن تھانے کے بارے میں بات کرنا مانگتا ہے۔ اُدھار واپس کرنے کو نہیں بولے گا۔ نا اُس کا چھوکری کے لیے اپنے چھوکرے کا کوئی بات کرے گا، سمجھا!"

"نکو بابا!" وہ کان پکڑتے ہوئے بولا۔ "ایسا کائے کو بولتے ہو۔ دیواراں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"ابھی تم جا کے اُس کو ایسا ہی بولو۔"

"ابھی بھجا کرو بابا! کام کی بات بول رہا ہوں۔ غصہ دھیما ہی رکھو۔ اِدھر زیادہ تیزی ٹھیک نہیں ہوتا۔ ہم خود جا کے اُس کو بولے تھے، دوسراں سے بھی کہلوایا تھا۔ بار بار اس کو...." پیرو کے اصرار پر وہ جھنجلا گیا۔ کہنے لگا کہ جتنا اُس کے بس میں ہے، وہ اتنا ہی کر سکتا ہے۔ اُس کے اختیار میں ہوتا تو ابھی دروازہ کھول کے ہمیں باہر کر دیتا۔ پیرو نے اُسے شور مچانے کی دھمکی دی تو وہ یہ کہتا ہوا سلاخوں سے ہٹ گیا کہ ٹھیک ہے، وہ ایک اور کوشش کر کے دیکھتا ہے لیکن ہمیں زیادہ اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔

سپاہی کے انتظار میں پیرو دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا پھر تھک کے بیٹھ گیا۔ سب انسپکٹر فیروز کی موجودگی میں انسپکٹر رکن الدین پر ہماری درخواست یا معاملے کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ اُس نے پہلے سب انسپکٹر کو طلب کر کے ساری صورتِ حال سمجھنی چاہی ہوگی۔ سپاہی کے بقول وہ کتنا ہی معقول آدمی ہو لیکن اپنے ماتحت افسر کا کہا ہی اُس کے لیے مقدم ہونا چاہیے۔ خاصا وقت گزرنے کے بعد بھی سپاہی نے آ کے کوئی جواب نہیں دیا تو پیرو نے مجھ سے کہا۔ "ابھی قبل مچا کے دیکھے راجا؟"

"کوئی فائدہ نہیں، بات اور خراب ہو سکتی ہے۔"

"ابھی اور کتنا اُلٹا ہو گا۔"

"پھر بھی ہمیں احتیاط ہی لازم ہے۔"

"ابھی سب گرمی پہ ہے راجا! ٹھنڈا ہونے پر اور دیری لگ سکتا ہے۔" اُس کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ اسی وقت کچھ ہو سکتا تھا، رات گزرنے کے بعد اور بل پڑ سکتے تھے مگر کیا ہمیں اس خدشے کا پہلے احساس نہیں تھا جو ہم نے کوئی کسر چھوڑ دی تھی۔ میں نے اس کی تائید نہیں کی۔ جھگڑا ٹنٹا کرنے میں اُن سے کسی نرمی کی اُمید کم، سختی کے امکان زیادہ تھے۔ وہ ہم دونوں کو الگ بھی کر سکتے تھے۔ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ پہلے ہمیں تھانے کے افسرِ اور یہاں کے قاعدے دستور کے متعلق کوئی اندازہ قائم کر لینا چاہیے تھا۔ پیرو نے میرے مشورے پر نہ تو شور مچایا، نہ نگراں سپاہی کو دوبارہ متوجہ کیا مگر اُسے کسی کل چین نہیں تھا۔ میں نے اُسے جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کی کہ وہ ابا جان کی اتنی فکر نہ کرے۔ وہ کچھ سمجھ ہی جائیں گے اس کے سوا وہ کیا کر سکتے ہیں۔ زورا اور مارتی بھی اُن کے پاس موجود ہیں۔ اگر ایک رات کی بات ہے تو ایک رات میں کیا فرق پڑتا ہے۔ صبح اُن تک پیغام پہنچانے کی شاید کوئی شکل نکل آئے۔

ہمیں چائے پیے آدھ پون گھنٹے کے قریب ہی ہوا ہو گا کہ ہمیں اپنی طرف آتے ہوئے سپاہیوں کی آہٹیں پھر سنائی دیں۔ وہ ہمارے دروازے ہی پر آ کے رُک گئے تھے۔ میری رگوں میں خون دھڑکنے لگا تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نگراں سپاہی نے دروازہ کھولا اور تلخ و ترش لہجے میں ہمیں باہر آنے کا حکم دیا۔

حوالات سے کوئی پچاس گز دور سب انسپکٹر فیروز کے کمرے سے ملحق وہ ایک کشادہ، صاف ستھرا اور روشن کمرہ تھا، جہاں ہم سپاہیوں کے ساتھ نپے تلے قدموں سے داخل ہوئے۔ کمرے کے دائیں کونے

کی میز کے بیچ میں ایک بڑی کرسی پر بھاری جسم، لمبے قد، سانولی رنگت کا پچاس سالہ باوردی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہی انسپکٹر رکن الدین ہوگا۔ ہمیں لانے والے سپاہیوں کے علاوہ وہاں پہلے سے ایک سپاہی موجود تھا۔ میز کے بائیں طرف کرسی پر سیاہ شیروانی، ترکی ٹوپی میں ملبوس ادھیڑ عمر کا ایک اور شخص بھی بیٹھا ہوا تھا جو انسپکٹر کا کوئی ملاقاتی ہو سکتا تھا۔ سلام کے بعد ہم خاموش کھڑے رہے۔ لمحوں تک انسپکٹر ہمیں گہری نظروں سے گھورتا رہا، پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی لرزاں ہوئی۔ "کیا چکر ہے؟" اس کی آواز میں اتنی بے اعتنائی نہیں تھی۔

"کچھ نہیں صاحب! ابھی کیا بولے۔" پیرو نے نرم لہجے میں کہا۔ "اپن ادھر تمھارے شہر میں ایک دم نوا ہے۔ سر سے پاؤں تک پھنس گیا ہے۔ ابھی اپنا کچھ خیال کرو صاحب!"

"تمھارے خلاف یہاں بہت سی شکایتیں ہیں۔"

"اپنے کو پتہ ہے پر اپن شکایت لے کے ابھی کیدر جائے صاحب! ادھر تو لوگوں کا کوئی نہیں سنتا کیا؟"

"بے کار کی باتیں مت کرو۔" انسپکٹر نے ناگواری سے کہا۔

"بے کار کا کیسا صاحب؟ اپن ادھر حوالات میں پڑا ہے۔" پیرو نے جھلاہٹ سے کہا۔ "آپ بولتا ہے بے کار کا بات ہے۔ ایسا ہے تو اپن کو واپس حوالات بھیج دو۔"

"تم نے وہاں چاقو بازی کی، جانتے ہو ایک آدمی زخمی ہو گیا ہے۔"

"زخمی تو ایک کو ہونا تھا صاحب! وہ نہیں ہوتا تو اپن لوگ ہوتے۔ چاقو اس کے پاس تھا، اپن کے پاس نہیں۔"

"معاملہ کیا تھا؟" انسپکٹر نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ وہ بھی وہی کچھ دہرا رہا تھا جس کا جواب ہم دے چکے تھے۔

"معاملہ کیا ہوتا صاحب! اپن کے پاس مال تھا اور وہ سالا اٹھائی گیرا۔ اپن ایک دم بے قصور ہے۔ اپنا تو سارا کپڑا لتّا، مال نمونہ بھی اُدھر رہ گیا۔ ادھر آتا اپنے کو لٹکایا جا رہا ہے۔" پیرو نے اس سے اجازت لیے بغیر شروع سے آخر تک اسے وہی روداد سنائی جو سب انسپکٹر فیروز سے کہہ چکا تھا لیکن اس بار اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ انسپکٹر پورے انہماک سے سنتا رہا۔ اس کے برابر بیٹھے ہوئے ملاقاتی کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو بار بار کن انکھیوں سے دیکھتے تھے۔ "ابھی اپن اُدھر آتا آدمی میں ایک دم خوار..."

پیرو کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ انسپکٹر رکن الدین بیچ میں بولا۔ "یہ سب باتیں ہم سن چکے ہیں۔"

"اپن کے پاس پھر کوئی نوا بات نہیں ہے۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" انسپکٹر نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"ابھی آپ بھی اپن سے دل لگی کرتا ہے صاحب!"

"ٹھیک ہے۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "صبح بات کریں گے۔"

"صبح کیا صاحب! آپ چاہے تو ابھی فیصلہ کر سکتا ہے۔"

"کیسے کیسے۔" انسپکٹر رکھائی سے بولا۔ "فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں، اطمینان رکھو اس طرف سے رپورٹ مناسب ملی تو معاملہ جلد ہی طے ہو جائے گا۔ یہاں حوالات میں بھی تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی، اس وقت میں تمھارے لیے یہی کر سکتا ہوں۔"

"آپ بہت کچھ کر سکتا ہے، آپ بھی حاکم ہو۔ اگر اپنا بات آپ کے دل کو لگتا ہے تو آپ ہی انصاف کرو۔ نہیں لگتا تو اپنا کوئی زور نہیں ہے۔" پیرو نے اسے بھی شہر میں موجود رہنے اور طلبی پر بروقت حاضر ہونے کا یقین دلانا چاہا۔ انسپکٹر نے اس کی ہر بات سکون سے سنی لیکن اس کا جواب کچھ مختلف نہیں تھا۔ اس کے باوجود پیرو جانے کس آسرے میں وہاں کھڑا اپنا گلا خشک کرتا رہا۔ انسپکٹر نے صاف انکار کر دیا تھا۔ نتیجہ اس حجت و تکرار کا وہی تھا۔ انسپکٹر کی صرف شکل و صورت، صرف لب و لہجہ بدلا ہوا تھا۔ باقی اس میں اور سب انسپکٹر میں کیا فرق تھا۔ میں نے حوالات میں واپس چلنے کے لیے پیرو کو کہنی ماری۔ وہ واپس چلنے کے لیے پلٹ گیا تھا کہ انسپکٹر کے برابر بیٹھے ہوئے ملاقاتی کی آواز سن کے ٹھہر گیا۔ ملاقاتی نے پہلی بار بیچ میں دخل دیا تھا۔ وہ شائستگی سے کہہ رہا تھا۔ "جانے دیجیے رکنی میاں یہاں نو وارد ہیں۔"

انسپکٹر نے چبھتی نظروں سے اسے دیکھا اور اس کی پیشانی پر لکیریں کھنچ گئیں۔ یقیناً اسے یہ دخل اندازی اچھی نہیں لگی تھی لیکن وہ شگفتگی سے بولا۔ "خاں صاحب! آپ ان لوگوں سے واقف نہیں، یہاں ایک سے ایک مداری، ٹھگ باز آتا ہے۔"

"مگر مجھے یہ کچھ سچے لوگ نظر آتے ہیں۔" وہ متانت سے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے ان کے ساتھ واقعی کوئی زیادتی ہوئی ہے۔"

"آپ نے دوسری جانب کی روداد نہیں سنی۔ آج شام خوب تماشا کیا تھا انھوں نے۔"

"مجھے ان معاملات اور ایسے لوگوں کا کچھ زیادہ تجربہ تو نہیں ہے، ظاہر ہے آپ ہی کی پرکھ مسلم ہے لیکن میں نے جو کچھ دیکھا سنا ہے، اسی سے قیاس کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے جس صورت حال سے یہ لوگ دوچار ہوئے، اس پر تو انھیں بہادری کا کوئی انعام دینا چاہیے۔"

انسپکٹر ہنسنے لگا۔ "یہ ثابت ہوا تو یقیناً کوتاہی نہیں کی جائے گی۔"

"رکنی میاں!" وہ شخص دل سوزی سے بولا۔ "کیا آپ انھیں چھوڑ نہیں سکتے؟"

"زخمی شخص کی وجہ سے سردست ایسا ممکن نہیں ہے۔" انسپکٹر

نے دبے لہجے میں کہا۔

"اپن بولتا ہے صاحب! اپن ابھی ادھر ہی رہے گا۔" پیرو نے مضطرب آواز میں مداخلت کی۔

"ہو سکے تو کوئی رعایت کر دیجیے۔" اس شخص کے نازبردارانہ لہجے میں ایک تحکم بھی تھا۔

"خاں صاحب! آپ...؟" انسپکٹر پلکیں پٹ پٹانے کے سوا آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"ہاں ہاں رکنی میاں!" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر، اصل میں معاملے کی تہہ تک پہنچنے اور خود ان کی بھلائی کے لیے ان کا ابھی یہاں رہنا بہتر ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں بات اتنی بڑی نہیں ہے۔"

انسپکٹر رکن الدین اس شخص سے بہت متاثر معلوم ہوتا تھا۔ وہ نہایت تعظیم و ادب کے ساتھ اس سے مخاطب تھا۔ شاید وہ اس کی بات رد نہ کرے۔ اے خدا ایسا ہی ہو۔ میرے کان ان کے درمیان ہونے والی گفتگو پر لگے ہوئے تھے اور میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔ پیرو بھی ساکت و جامد کھڑا تھا۔ خاں صاحب کے عزم سے انسپکٹر خاصا مخمصے میں پڑ گیا تھا۔ "میری درخواست ہے کہ آپ ان اجنبیوں پر اتنے مہربان نہ ہوں۔" انسپکٹر تیکھی آواز میں بولا۔ "اطمینان رکھیے، ان کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دی جائے گی۔"

"انھیں اب خاصا سبق مل چکا ہے، ریاست میں آئے ہیں، اچھا نہیں لگتا کہ..."

"پولیس میں آپ جیسے نرم خو صاحبِ دل آ جائیں تو ایک دن بھی کام نہ چلے۔" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ فرما رہے ہیں تو ٹھیک ہے مگر..."

"میں، میری ضمانت کی بات ہے نا؟" خاں صاحب تیزی سے بولے۔

"ہاں کچھ یہی خانہ پری وغیرہ..." انسپکٹر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"چلیے یوں ہی سہی۔"

"ابھی آپ اپن پر بھروسا رکھو۔" پیرو نے جلدی سے کہا۔

"ایک تجربہ اور سہی۔"

"تجربہ تکلیف دہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"شاید ایسا نہ ہو۔" خاں صاحب پُر امید نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "اور ہوگا بھی تو کوئی ایسا رنج نہیں ہوگا۔"

ہم وہیں کھڑے رہے اور اس وقت میری آنکھیں امڈ نے لگیں جب انسپکٹر کی ہدایت پر محرر فضل نے خاں صاحب کے سامنے ایک کاغذ لا کے رکھا اور خاں صاحب نے کسی چون و چرا

کے بغیر اس پر دستخط کر دیے۔ اسی لمحے انسپکٹر رکن الدین نے ہمیں متنبہ کیا کہ اس نے خاں صاحب فیض علی خاں کے حکم کی تعمیل کی ہے اس لیے کہ وہ انھیں ایک محترم، معتبر شخص سمجھتا ہے، بہتر ہے کہ ہم ان کے اعتبار کو زک نہ پہنچائیں ورنہ پھر اس سے برا کوئی نہیں ہوگا۔

ساتھ ہی اس نے فیض علی خاں کو سرگوشی میں کوئی مشورہ دیا، وہ مشورہ ہی ہو سکتا تھا۔ خاں صاحب خوش خلقی سے سنتے، مسکراتے رہے۔ ان کے چہرے پر اپنے فیصلے کا کوئی پچھتاوا نہیں تھا بلکہ وہ خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ پیرو نے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ پکڑ لیے اور سینے سے لگائے۔ میں نے بھی پُر نم آنکھوں سے ممنونیت کے چند ٹوٹے پھوٹے لفظ کہنے چاہے۔

میری طرح پیرو کو بھی حیرت ہوئی ہوگی، انسپکٹر نے چلتے وقت ہم سے یہ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ہم کہاں ٹھہریں گے اور کسی وقت ہماری طلبی کی ضرورت پڑی تو سپاہی کس ٹھکانے پر ہمیں اطلاع دیں گے۔ چونکہ اب ساری ذمے داری خاں صاحب کی تھی شاید اس لیے وہ مزید کسی تردد کی زحمت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا، وہ ہمارے پیچھے سپاہی روانہ کر دینے کا ارادہ رکھتا ہو کہ وہ ہمارا ٹھکانا دیکھ کے آئیں اور حفظِ ماتقدم کے طور پر ہوٹل والے کو ہم پر نگرانی کرنے کی ہدایت بھی دیتے
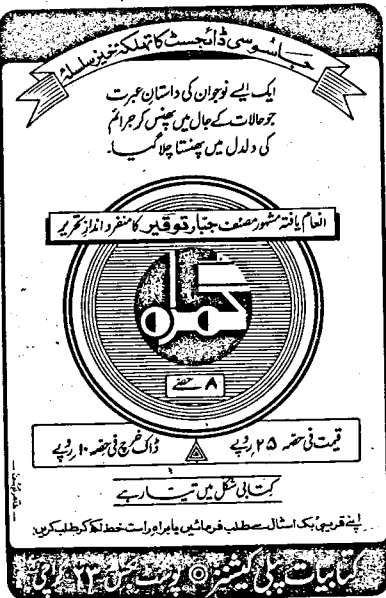
آئیں۔ ہم نے سلام کیا، دونوں کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا اور تھانے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ کوئی سپاہی ہمارے پیچھے نہیں تھا۔ عمارت سے سڑک تک ایک بڑا میدان پھیلا ہوا تھا، میدان تھانے کے احاطے میں تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ قدم زمین پر نہیں رکھے جا رہے تھے۔ سارا جسم سُن سا ہو گیا تھا۔ ہم بالکل آزاد تھے۔ سب کچھ ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا۔ ابھی ہم احاطے کے اندر تھے، عمارت سے دُور، دروازے سے قریب کہ پیچھے سے کسی نے پکارا، وہ خاں صاحب تھے۔ انھیں لپکتے قدموں سے آتا دیکھ کے ہم ٹھیر گئے اور فاصلہ کم کرنے کے لیے عمارت کی طرف پلٹ گئے۔

"اب اس وقت کہاں ٹھیریے گا؟" انھوں نے تیز تیز سانسوں سے کہا۔

"ابھی کوئی ہوٹل شوٹل دیکھے گا بڑے صاحب!"

"آئیے، میں آپ کو چھوڑ دوں۔" وہ خوش اطواری سے بولے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہم نے اخلاقاً انھیں اس زحمت دہی سے منع بھی کیا مگر ہمیں معلوم تھا کہ خاں صاحب اپنی تسلی کے لیے ہمیں ہوٹل چھوڑنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک جائز بات تھی۔ انسپکٹر رکن الدین نے انھیں احتیاط کی تلقین کی ہو گی۔ کسی ردوقدح کا محل نہیں تھا۔ ہمیں فی الوقت کسی بھی ہوٹل میں ٹھیر جانا چاہیے تھا، جو قریب ہو یا جہاں خاں صاحب لے جائیں۔ ہوٹل میں کچھ دیر ٹھیر کے اسی وقت یا پھر صبح ہم ابا جان سے مل سکتے تھے۔ کم از کم سلاخوں اور پہرے داروں سے تو ہمیں نجات مل گئی تھی۔ ویسے بھی خاں صاحب نے جس انداز سے کہا تھا، اسے کوئی بھی رد نہیں کر سکتا تھا۔ احاطے کے اندر ہی اُن کی موٹر کھڑی تھی۔ ایک باوردی ڈرائیور بھی ساتھ تھا جس نے انھیں دیکھتے ہی دروازہ کھولا۔ میں آگے بیٹھ گیا، پیرو اُن کے ساتھ پچھلی نشست پر۔ اندر گدیاں نرم اور مخملی تھیں اور خس کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ موٹر، ڈرائیور، خاں صاحب کے لباس اور نپی تلی پُراعتماد اور پُرشکوہ گفتگو سے اُن کی امارت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ غالباً وہ حیدرآباد کے کوئی بڑے رئیس تھے، دل کے بھی رئیس تھے۔

موٹر تھانے کے احاطے سے نکل کے تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ سڑکیں روشن مگر خالی پڑی تھیں۔ ساری دُکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔ موٹر نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ خاں صاحب نے تذبذب سے کہا۔ "اب اتنی رات کو آپ کہاں ٹھیریں گے۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ آپ کے پاس ضروری سامان وغیرہ بھی نہیں ہے۔"

"اپن کے پاس ابھی کچھ پیسہ ہے بڑے صاحب! ایک رات کسی طرح کاٹ دے گا، سویرا ہونے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہوٹل والے بے سامان اور بے وقت مسافروں کو دیکھ کے متعجب نہیں ہوں گے؟" وہ تشویش سے بولے۔

"ہوٹل والا پہلے پیسہ دیکھے گا بعد میں کچھ اور۔ ہوٹل میں آنے کا کوئی وقت تھوڑی ہوتا ہے بڑے صاحب!" پیرو نے مسکرا کے کہا۔

خاں صاحب نے شیروانی کی جیب سے گھڑی نکالی اور بدبداتے ہوئے بولے "دس سے اُوپر ہو چکے ہیں۔ میری رائے ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو غریب خانہ حاضر ہے۔ ادھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے آج رات میرے ہی یہاں قیام فرمائیں۔ صبح کسی ہوٹل میں جائیں تو بہتر رہے گا۔"

"نئیں بڑے صاحب! اپن نے پہلے ہی آپ کو بہت تکلیف دیا ہے۔"

"تکلیف کی آپ نے خوب کہی، آدمی آدمی کے کام آتا ہے۔ اتفاق کہیے کہ قریب ہی ایک تقریب میں شرکت کے لیے آنا ہوا تھا، اِدھر سے گزرا تو سوچا، بہت دن ہو گئے ہیں زکی میاں سے بھی مل لوں، حالانکہ یہ کوئی وقت نہیں تھا مگر کچھ یہی طے تھا کہ میں وہاں جاؤں اور آپ لوگوں سے ملاقات ہو۔ شاید میں صحیح وقت پر پہنچ گیا۔ یہ پولیس والے کسی کی نہیں سنتے۔ صبح شام اتنے بہروپیوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ شک آنکھوں میں رچ بس جانا ہی چاہیے۔ زکی میاں بہرحال ایک معقول آدمی ہیں۔ ابھی پچھلے وقتوں کی پاس داری ہے اُن میں۔ غالباً یہی ایک وجہ اُن سے میرے تعلق کی بھی ہے۔"

"آپ نئیں ہوتے تو اپن اُدھر ہی خوار ہو رہا ہوتا۔"

"بھول جائیے اب بیتی بات کو۔ زندگی ہے تو یہ حادثے ہوتے رہیں گے۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ میری مانیں تو غریب خانے ہی چلیں، وہاں کچھ سکون ملے گا اور شاید کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایک مہمان خانہ موجود ہے، ویسے جب تک آپ کا جی چاہے، اپنا گھر سمجھ کے رہیے لیکن کم از کم آج کی رات تو...."

"بڑے صاحب!" پیرو نے لجاجت سے کہا۔ "ابھی آپ نے بہت کر دیا ہے، اپنے کو اور شرمندہ مت کرو۔"

"ارے رے۔" خاں صاحب نے پیرو کے زانو پر تھپکی دی۔ "کیا بات کرتے ہیں آپ۔ آپ کی میزبانی سے میری عزت افزائی ہو گی۔ سچ پوچھیے تو میرا جی خوش ہو گا۔"

"ہم پھر آ جائیں گے۔" میں نے لفظ چباتے ہوئے کہا۔

"برخوردار، تکلف کیسا، یہ لکھنؤ نہیں ہے میاں، دکن ہے۔ یہاں اتنے تکلفات نہیں کیے جاتے۔ مہمانوں کو یہاں باعثِ زحمت نہیں، باعثِ عزت سمجھا جاتا ہے۔ اب کچھ اور نہ کہیے۔ میری کوتاہی ہے۔ اس بے سروسامانی کی حالت میں مجھے پہلے ہی آپ سے کہیں اور جانے کو نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ آپ کے لیے یہ شہر اجنبی ہے۔ ایک حادثہ پیش آ چکا ہے، یقین کیجیے غریب خانے پر کوئی زحمت نہیں ہو گی۔ جس کام سے آئے ہیں اُس میں بھی رخنہ نہیں پڑے گا۔"

پیرو عجب کش مکش سے دوچار تھا۔ انکار کی مجال بھی نہیں تھی اور اقرار سے چین بھی نہیں مل رہا تھا۔ خاں صاحب نے انکار کا کوئی گوشہ رکھا ہی نہیں تھا، ہمارے پاس تکلف کے سوا کوئی اور عذر نہیں تھا۔ نہ یہ ممکن تھا کہ ہم گاڑی سے کود جائیں یا ڈرائیور کو گاڑی ٹھیرانے کا حکم دیں اور ایک طرف چلتے بنیں۔ تھانے سے نکلنے کے بعد خاں صاحب کو مزید کوئی تشویش لاحق ہو گئی تھی اور وہ معاملہ ختم ہونے یا ہمیں اچھی طرح جان بوجھ لینے تک اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی باتوں سے اس تکدر کا اظہار نہیں ہوتا تھا، حلم، مروّت اور انکسار ہی جھلکتا تھا لیکن اندر کوئی اندیشہ پلتا ہو گا جبھی وہ اس قدر اصرار کر رہے تھے۔ ہمارے زیادہ انکار سے اُن کے خدشات اور سوا ہو سکتے تھے، وہ اسے اپنی سبکی بھی سمجھتے۔ اُن کے پاس عاقبت اندیشی کے علاوہ ہماری میزبانی کے کئی جواز موجود تھے۔ ہمارا اجنبی ہونا، ہماری بے سروسامانی، رات کا وقت۔ وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ اتنی سی بات تھی کہ ایک شخص ہمیں ہوٹل میں ٹھیرنے کے بجائے اپنے گھر لے جانے کا آرزومند تھا۔ کاش ہم اُن سے کہہ سکتے کہ اتنی سی بات ہمارے لیے کتنا بڑا عذاب ہے۔ ہمارے انتظار میں اُن تینوں کی آنکھیں جل رہی ہوں گی۔ پیرو جزبز بیٹھا رہا، میری عقل بھی خبط ہو گئی تھی۔

"غریب خانہ شہر سے کچھ الگ ہے، یوں سمجھیے کہ ایک سرے پر، مگر سواری موجود ہے، سویرے آپ لوگ جہاں کہیں گے، پہنچا دے گی۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"ابھی بس کرو بڑے صاحب!" پیرو کی آواز بھرّا رہی تھی۔

گاڑی مختلف سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ خاں صاحب نے ڈرائیور سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اب تک کئی ہوٹل گزر گئے ہوں گے۔ وہ کہیں نہیں رُکا۔ اس کے کہیں نہ ٹھیرنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ اپنے مالک کی خواہش کے مطابق گھر ہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ موٹر بازاروں کی سڑکوں سے گزر کے اقامتی علاقوں میں داخل ہو گئی تھی۔ ہمیں فوراً کچھ کرنا چاہیے تھا۔ پیرو نے ایک بار پھر خاں صاحب ملائمت کی سے انھیں سمجھانا چاہا۔ خاں صاحب آزردہ سے ہونے لگے۔ ہمارے لیے اُن کی دل شکنی کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی دوسری باتوں کی۔ اقامتی علاقہ آگے جا کے اور گنجان ہو گیا تھا۔ بس یہی ہو سکتا تھا کہ ہم کسی تاخیر کے بغیر ڈرائیور اور خاں صاحب کو بے بس کر دیں لیکن ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے اور ہوٹل سے اسٹیشن تک جاتے جاتے ہر بات ممکن تھی۔ مجھے موٹر چلانی نہیں آتی تھی البتہ پیرو خوب جانتا تھا مگر نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ ہم دونوں خاں صاحب کی موجودی میں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں بار بار نگاہیں اُٹھا کے اُس کی طرف دیکھتا تھا کہ خاں صاحب درمیان میں آ جاتے تھے۔ موٹر بھاگتے بھاگتے ایک ایسے علاقے میں آ گئی تھی جہاں دُور تک بڑے بڑے رقبوں پر حویلی نما مکانات بنے ہوئے تھے اور ساتھ ہی ویرانی بھی بڑھ گئی تھی۔ یہی موقع پیرو کے فیصلہ کرنے کا تھا۔ اُس کی خاموشی سے بے چینی ہو رہی تھی۔ سڑکیں کشادہ اور صاف تھیں اس لیے موٹر کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ خاں صاحب اپنے بمبئی کے سفر کے واقعات نہایت اشتیاق سے سنا رہے تھے۔ یکایک موٹر اونچائی پر چلتی ہوئی ایک بڑے دروازے پر جا کے رُک گئی، وہ دروازہ اتنا بڑا تھا کہ ہاتھی گزر سکتا تھا۔ موٹر دیکھتے ہی باہر بیٹھا مسلح دربان اُچھل کے کھڑا ہو گیا اور چھوٹے دروازے سے اندر کی طرف لپکا۔ دُوسرے ہی پل بڑا دروازہ کھل گیا۔

اندر سامنے ہر طرف چمن زار پھیلا ہوا تھا اور اُونچے گھنے درختوں کی قطاریں۔ بیچ میں ہماری نگاہوں کے سامنے سہ منزلہ عمارت تھی، وہ کسی محل سے کم نہیں تھی۔ کوئی بہت بڑی حویلی۔ برج، جھروکے، محرابیں، بارہ دری، پچی کاری، سنگِ مرمر اور لال پتھر سے بنی ہوئی کئی حصّوں پر مشتمل دیوہیکل عمارت۔ خاں صاحب کی وضع قطع، انداز و اطوار سے اُن کے متموّل ہونے کا ہمیں بہت کچھ اندازہ ہو گیا تھا لیکن اتنا بھی نہیں۔ دروازے کے اندرونی حصّے میں بھی کئی چاق و چوبند ملازم موجود تھے۔ ایک اُونچی قلعے کی فصیلوں جیسی دیوار عمارت کا احاطہ کرتی تھی۔ سب کچھ نو تعمیر شدہ معلوم ہوتا تھا۔ موٹر حویلی کے خاص دروازے کے سامنے جانے کے بجائے دائیں طرف مڑتی ہوئی ایک پورٹیکو میں آ کے رُک گئی۔ ڈرائیور نے پھرتی سے دروازہ کھولا۔ پہلے خاں صاحب اُترے۔ پیرو کی نگاہیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں "ابھی اپنے کو آپ کیدھر تاج محل میں لے آیا بڑے صاحب!" وہ

حیرت سے بولا۔

خاں صاحب کچھ جھینپ گئے، کوئی جواب نہیں دیا اور پُرتپاک انداز میں آگے بڑھنے کے لیے ہمیں ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ہمارے قدم رُک رہے تھے۔ فرشی منزل کی کُرسی خاصی اونچی تھی۔ چند سیڑھیوں کا زینہ طے کرنے کے بعد محرابوں کا سائبان تھا اور اس کے پار کھڑکیوں اور کمروں کے متعدد دروازے نظر آرہے تھے۔ سائبان میں آکے ہی اندر عمارت کی زیبائش و آرائش کا تخمینہ لگایا جاسکتا تھا۔ کسی ملازم نے آکے ایک طرف کا منقش دروازہ جلدی سے کھول دیا اور خاں صاحب کے ساتھ ساتھ ہم ایک وسیع کمرے میں آگئے۔ کمرے کے فرش پر دھنس جانے والا غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ دریچوں پر ریشمی پردے اور دروازے کے مقابل دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی چوکی پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ اطراف کی تمام دیواروں کے ساتھ مخملی گدے لگی نشست فرشی تھی۔ معلوم نہیں، خاں صاحب ہمیں یہاں کیوں لائے تھے کہ گزرتے ہوئے ڈیوڑھی کے دروازے سے نکل گئے پھر جس کھلے حصے میں آئے، وہ الگ ایک مکان تھا، حویلی سے ملحق بھی حویلی سے الگ بھی یہ مہمان خانہ ہی ہوسکتا تھا جہاں بہت سے مہمان ایک ساتھ ٹھہر سکتے ہوں۔ یہاں آتے ہوئے جہاں جہاں سے ہم گزرے ساری راہ داریاں، صحن اور دالانوں میں رنگ برنگی روشنیاں کھلی ہوئی تھیں، کہیں خوابیدہ سی کہیں دن کا سا سماں تھا۔ سب کچھ ایک پُراسرار سی فضا۔ لگتا تھا، ہم قصے کہانیوں کے کسی گھر میں آگئے ہیں۔ سونے کے کمرے کی سجاوٹ بھی قابلِ دید تھی۔ خاں صاحب نے ہم سے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ دن بھر ہم نے چائے اور بسکٹوں کے سوا کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک اب بھی نہیں لگ رہی تھی لیکن خاں صاحب نے ہماری خدمت پر مامور ایک چاق و چوبند ملازم کو مشروبات اور پھل وغیرہ لانے کے لیے کہہ دیا تھا اور پیرو سے رازدارانہ انداز میں پوچھا کہ اگر کسی خاص مشروب سے شغف ہو تو ہم تکلف نہ کریں۔ پیرو نے ہنس کے ٹال دیا۔ "ابھی آپ آرام کرو بڑے صاحب! رات بہت ہوگیا ہے، اپن لیے اتنا مت جاگو۔"

"کیا آپ لوگوں کو نیند آرہی ہے؟" خاں صاحب نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" پیرو سر اُٹھا کے بولا۔ "اپن تو آپ کے لیے بول رہا ہے۔"

"میری چھوڑیے۔ رات یوں ہی آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔"

"ادھر تو رات کو بہت ہلا گُلا ہوتا ہوگا بڑے صاحب؟"

"ہاں۔" خاں صاحب نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "کبھی ہوتا تھا، اب زمانے سے کچھ نہیں ہوتا، اُداسی چھائی رہتی ہے۔"

"ایسا کیا بڑے صاحب؟"

"کچھ ایسا ہی ہے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولے۔

پیرو نے مناسب نہیں سمجھا کہ وہ اس کا سبب پوچھے۔ حیدرآباد شہر کے موسم اور خوب صورتی کی تعریف کرنے لگا۔ اتنے میں پھل اور مشروبات آگئے تھے۔ تلا ہوا گوشت بھی رکھا تھا۔ خاں صاحب نے بھی رسماً ہمارا ساتھ دیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے، حیدرآباد کے بارے میں بتاتے رہے لیکن شاید یہ میرا خیال ہو، یہ توجہ نہ دی ہو کہ خاں صاحب باتیں کرتے کرتے گم سے ہوجاتے تھے، وہ کچھ بے چین معلوم ہوتے تھے۔ لوٹ پھیر کے بات پھر پر آگئی بلکہ پیرو نے از خود ہی یہ ذکر چھیڑا تھا، اپنے ذہن کا غبار دور کرنے کے لیے اُس نے ممنونیت کے انداز میں کہا۔ "ابھی اودھر سالا کھولی پار بیٹھا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ادھر مل آجائے گا۔"

"ہاں۔" خاں صاحب کسی قدر کتراتے ہوئے بولے۔ "اتفاق اسی کو کہتے ہیں۔" پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہنے لگے۔ "ویسے آپ لوگ اچھی خاصی مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ رُکنی میاں نے چلتے وقت مجھ سے کیا کہا تھا!"

"کیا بولا تھا بڑے صاحب!" پیرو نے تجسس سے پوچھا۔

"رُکنی میاں کو شبہ تھا۔" انھوں نے میری طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کہ صاحب زادے پہلے بھی حیدرآباد آچکے ہیں۔"

مجھے اپنے کانوں پر دھوکا ہوا، پیرو بھی اچھل سا گیا۔ "اور کیا بولا تھا اُس نے؟" پیرو نے منتشر آواز میں پوچھا۔

"کچھ یہی کہ بازارِ حسن میں برخوردار نے کبھی شاہ کبیرے، ایک مرکھنے دادا کو ایک ہی جلّے میں چاروں شانے چت کر دیا۔ یہ واقعہ میرے لیے نیا نہیں تھا اور میں عرض کروں کہ مجھے انھیں دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ یہاں بہت دھوم مچی تھی اُس سکتر خاں۔ دست و بازو کی چاقو بازی میں تو وہ نامی گرامی دور دور تک اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ جس راستے سے گزرتا تھا، شرفا وہ راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ جس کی چاہے، پل میں آبی اتار دے۔ سارے شہر میں ستاتا پھرتا تھا۔ پھر سُنا کہ ایک دن کسی نوجوان نے ایک خلقت کے سامنے اُسے بے جامہ کر دیا۔ بہت دنوں تک یہاں اس کا چرچا ہوتا رہا۔ ہم نے تو خیر صرف سُنا ہے، جو لوگ موجود تھے، کہتے ہیں کہ ایک بجلی چمکی تھی۔ نوجوان نے اس چابک دستی سے سُوت سے ہاتھ چلایا تھا کہ ازار بند ہی کٹا، جسم پر خراش تک نہیں آئی۔ شخص شاہ کبیرا، پھر نہ جانے کون سے کنویں میں جا ڈوبا کہ آج تک شہر میں دکھائی نہیں دیا۔" خاں صاحب کی چمکتی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

میرے حواس منتشر ہوگئے تھے۔ پیرو کے جسم کا بھی سارا خون جیسے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ خاں صاحب کو اگر یہ سب

معلوم تھا تو انھوں نے اب تک ہم سے کیوں چھپایا۔ "آپ کیا، کیا بول رہا ہے بڑے صاحب؟" پیرو نے ہیجانی آواز میں کہا۔

وہ سر ہلانے لگے اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے۔ "مگر آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو یہاں لایا ہوں اور میرے خیال میں اگر مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تو اتنا ہی کافی ہے، رُکنی میاں اچھی طرح جانتے ہیں کہ انھوں نے کس پہ اعتبار کیا، کس کی بات مانی ہے۔ اس لیے جو گزر گیا ہے سمجھیے، اب وہ دفن ہی ہوگیا۔ رُکنی میاں نے جب برخوردار کے متعلق اپنا شبہ ظاہر کیا تو میں نے ٹوٹ کے نہیں کہا کہ شاہ کبیرے والے واقعے سے مجھے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ پہلے تو میں اسے اُن کا مبالغہ سمجھا تھا، کوئی بڑی غلط فہمی جو پولیس والوں کو عموماً ہوجاتی ہے۔ میرے سامنے جو نوجوان تھا، وہ میرے تصور سے قطعی مختلف تھا۔ شاہ کبیرے جیسے گینڈے سے نمٹنے کے لیے کچھ اسی کے قماش کا آدمی میرے ذہن میں اُبھرتا تھا، غالباً یہی بات رُکنی میاں کے دماغ میں کھٹک رہی ہوگی جو وہ شبہے کی بات کر رہے تھے۔ دونوں واقعے بے شک مختلف تھے لیکن انھوں نے غور نہیں کیا، دونوں میں بہت سی باتیں ملتی جلتی تھیں۔ چار تربیت یافتہ، منھ پھٹ، چاقو باز اور [illegible] والوں کا ہجوم۔ میں آپ کو سچ بتاؤں کہ رُکنی میاں سے یہ جان کے خوشی ہوئی کہ میں نے جی داروں کے لیے کچھ کیا ہے، ان لوگوں کے لیے جنھیں دیکھنے کی مجھے تمنا تھی۔"

خاں صاحب ہی بولتے رہے۔ ہم دونوں گُنگ نظروں سے انھیں دیکھا کیے۔ کہنے لگے۔ "رُکنی میاں ایک پولیس والے ہیں، لیکن تو پولیس ہی کی اُن کے پاس ہے۔ شاہ کبیرے کی بات دن گزر گئے ہیں مگر اُوپر حاکموں میں اپنی سرخ روئی کے لیے وہ قصۂ پارینہ اُچھال سکتے تھے۔ بات آگے بڑھانے کے لیے کوئی بھی رنگ دینا اُن کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اتنا کہاں احساس کہ جرأت اور بہادری بھی کوئی چیز ہے۔ میں جانتا ہوں پہلے بھی شاہ کبیرے سے بھڑنے میں پہل آپ نے نہیں کی تھی، وہی آپ کے منہ لگا تھا۔ اُس گیدڑ کی موت آئی تھی جو اُس نے آپ لوگوں کی طرف رُخ کیا۔ جہاں تک مجھے پتہ چلا ہے، آپ نے پہلوتہی کی تھی۔ مغنیہ خانم نے آپ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اسے اس کا اختیار تھا لیکن کبیرے نے پروانۂ راہ داری دینے سے پہلے اپنے ٹھکانے پر خانم کو بزم آرائی کے لیے مجبور کیا۔ خانم انکار کے سنگین نتائج سے آگاہ تھی، وہ تیار ہوگئی لیکن آپ اس معاملے پر آمادہ نہیں ہوئے چنانچہ آپ نے وہی کیا جو کوئی بھی غیرت مند کرسکتا تھا۔ یہی کچھ تھا نا؟" خاں صاحب رُک کے بولے

پیرو کے لبوں پر سکوت طاری رہا۔ خاں صاحب نے اُس کے جواب کا انتظار ہی نہیں کیا، خوابیدہ لہجے میں بولے۔ "خانم! وہ یہاں دکن کا موتی تھی۔ مجھے کئی بار اُس کی بزم میں بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔ سُر کی ملکہ! عادات و اطوار میں شہزادیوں جیسی۔ میں نے اتنی باوقار عورت زندگی میں نہیں دیکھی۔ بازار میں نہ بیٹھتی تو یقیناً کسی محل کی نور جہاں ہوتی۔ فن کو فن کی طرح برتتی تھی۔ بازار کی ہوا نہیں لگنے دی۔ کتنے رئیسوں، نوابوں نے آرزو کی لیکن اُسے فن سے عشق تھا۔" خاں صاحب خانم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہے۔ "آخر میں تو وہ بالکل محدود ہوگئی تھی۔ پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی اور پیسے کی اُسے ہوس بھی نہیں تھی۔ آخر ایک دن وہ چلی گئی۔ خانم کو شاید اسی دن کا انتظار تھا۔ کبھی تو پلٹ کے نہیں دیکھا کہ پیچھے کتنے لوگ اُداس ہو جائیں گے۔ کہاں لے گئے آپ اُسے؟" وہ شکستگی آمیز یاسیت سے بولے۔ "کیسی ہے وہ؟"

پیرو کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ "ابھی ابھی آپ اور کیا اِن کے بارے جانتا ہے بڑے صاحب؟" وہ دھمکتی آواز میں بولا۔

"اور کیا!" خاں صاحب سنبھل کے بولے اور ہنسنے لگے۔ "اتنا کچھ بھی یوں یاد رہ گیا کہ خانم کو شاید یہاں کوئی بھی فراموش نہیں کرسکا ہے اور شاہ کبیرے کا واقعہ بھی لوگ ابھی تک حیرت سے دُہراتے ہیں۔ ایک اور بات بھی تھی۔ یہاں کے ایک رئیس نواب عالم تاب، جن سے اپنی بھی اچھی خاصی یاد اللہ ہے، خانم سے بہت متاثر تھے۔ اُن کی شیفتگی اور قدر افزائی دیکھ کے آخری دنوں میں خانم نے نغمہ سرائی اُنھی کے لیے محدود کر دی تھی۔ سُنا ہے، نواب عالم تاب نے اُسے روکنا چاہا لیکن خانم جانے کا فیصلہ کر چکی تھی، ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نواب اسٹیشن تک اُسے منانے گئے تھے، وہاں اُن کی گردن پر چاقو رکھ دیا گیا اور خانم نے اُن کے حق میں فیصلہ نہیں دیا۔ کچھ نواب صاحب کے معاملے کی وجہ سے بھی مجھے واقعہ یاد رہا۔ پتہ نہیں، خانم کو اب نواب کی یاد آتی ہے یا نہیں، یہ تو آپ لوگ ہی بہتر بتاسکتے ہیں، بہرحال وہ جہاں بھی ہو، خدا کرے خوش ہو۔ خوب عورت تھی، پاک باز، متین، وضع دار۔ کہاں ہے آج کل وہ؟ ضرور کسی اچھے گھر میں ہوگی۔"

"ہوسکتا ہے پر اپن کو اُس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" پیرو نے اُلجھی ہوئی آواز میں کہا۔

خاں صاحب کچھ بے قرار سے ہوگئے، تیزی سے بولے۔ "مگر وہ تو، جہاں تک میں نے سُنا ہے، صاحب زادے کے ساتھ ہی گئی تھی اور ایک صاحب بھی اِن کے ہمراہ تھے۔"

"وہی اُس کو کہیں لے گیا۔" پیرو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟ یعنی خانم سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں؟ آپ کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے اور کیسی ہے؟"

"ایسا ہی ہے کچھ۔" پیرو نے ہونٹ سکوڑ کے جواب دیا۔
خاں صاحب کے چہرے پر دھند سی چھا گئی۔ انھوں نے ایسی نظروں سے ہمیں دیکھا جیسے ہماری بات کا انھیں یقین نہ آیا ہو۔ پھر کہنے لگے "رات بہت ہو گئی ہے، اب آپ آرام کریں، صبح ان شاء اللہ گفتگو کریں گے۔" یہ کہتے ہی وہ اٹھ گئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولے "تمھیں دیکھ کے مجھے خوشی ہوئی ہے۔ شہزادوں کی طرح نرم و نازک لگتے ہو، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم نے شاہ کبیرے کو زیر کیا ہوگا۔"
خاں صاحب کے جانے کے بعد ہم دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے اور پیرو میری، میں پیرو کی صورت دیکھتا رہا۔ "اپنے کو کچھ لفڑا لگتا ہے راجا!" بہت دیر بعد وہ جلی ہوئی سی آواز میں بولا۔
"یہاں سے کسی طرح نکل چلو راجا!"
"ابھی تیرا مغز پھر گیا ہے جانی! کیسے ایسے جا سکتا ہے"
"مجھے لگتا ہے، خاں صاحب ہمیں جان بوجھ کے لائے ہیں۔"
"ہنھ!" وہ غبار آلود لہجے میں بولا "پر ابھی کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لے، سویرا ہوتے دیکھے گا، ابھی اپن کچھ بول نہیں سکتا۔"
میرا سارا جسم ترخ رہا تھا۔ ہم دونوں بستروں پر لیٹ گئے اور کروٹیں بدلتے رہے۔ رات رینگ رینگ کے گزر رہی تھی۔ جانے کس وقت پیرو اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ وہ بستر سے اٹھا تو میں بھی اس کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ ہم دروازہ کھول کے دالان میں آ گئے۔ ساری حویلی پر سکوت طاری تھا۔ تمام دروازے بند تھے۔ جھروکوں سے باہر باغ کا منظر نظر آتا تھا لیکن پگھلتی روشنی میں درختوں کے سایوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ صحن میں لگے ہوئے سفید فوارے سے پانی رس رہا تھا اور اسی کی آواز اطراف میں گونج رہی تھی۔ ہم نے چند قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک بندوق بردار ملازم چوکنا ہو گیا لیکن اس نے ہم سے کچھ کہا نہیں۔ ہم ٹہلتے ہوئے چپ چاپ کمرے میں واپس آ گئے اور سورج نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ علی الصباح پیرو نے غسل کیا، گرم پانی موجود تھا، ادھر پیرو غسل سے فارغ ہوا ادھر ملازم قہوہ لے کے آ گیا۔ خاں صاحب کے انتظار میں آٹھ بج گئے۔ آٹھ بجے کے قریب کہیں وہ نمودار ہوئے اور ہم لوگوں کو کھانے کے کمرے میں لے آئے جہاں فرشی نشست پر خوان سجا ہوا تھا۔ باقاعدہ کھانے کا اہتمام تھا۔ خاں صاحب کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا انھوں نے بھی ہماری طرح رات جاگ کے گزاری ہے۔ پوچھنے لگے کہ رات کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ناشتہ بس رسمی طور پر کیا گیا۔ "ابھی اپنے کو چلنا کو بڑے صاحب!" جیسے ہی موقع ملا پیرو نے بے تابی سے کہا۔
"ایسی بھی کیا جلدی، یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہے تو اب یہیں ٹھہریے۔" ہم نے پھر جھڑکی تو وہ اور مچل گئے، بولے "تم اپنا کام کر کے شہر چلے جائیں مگر واپس یہیں آئیں۔" اتنا ہی بہت، ہم نے ان سے وعدہ کر لیا مگر دس بج گئے اور انھوں نے ظہر کے لیے کچھ نہیں کیا تو ہم نے انھیں پھر ٹوکا، پہلو بدلتے ہوئے کہنے لگے "آپ سے ایک بات کہنی ہے۔"
"جو حکم دینا ہے، بولو بڑے صاحب!"
"حکم نہیں، درخواست سمجھیے۔"
"آپ ہمارے محسن ہیں بڑے صاحب! فرمائیے کیا کام" میں نے کہا۔ معاً میرے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ خاں صاحب ہم سے شاہ کبیرے جیسے کسی شخص کے متعلق کوئی بات کرنا چاہتے
"دیکھیے! ایسا ہے کہ" وہ لفظ چباتے ہوئے بولے "مناسب ہو تو مجھے خانم کا اتا پتہ بتا دیجیے۔"
"خانم کا! پر اپن بول چکا ہے کہ اپنے کو کچھ نہیں پتہ۔"
"لیکن آپ چاہیں تو پتہ چلا سکتے ہیں۔"
"ابھی ایسا کیا بات ہے بڑے صاحب! اصل کے بولو تو سیدھا بات ٹھیک لگتا ہے۔"
"ہاں! میں آپ کو سب صاف صاف بتائے دیتا ہوں" بڑبڑاتے ہوئے بولے۔
"جب سے خانم گئی ہے نواب نہیں سنبھلے، خانم ان کی لے گئی ہے۔ حالت یہ ہے کہ بعض روز گزرتی چلی جاتی ہے دنیا سے بے خبر، نہ کہیں آنا نہ جانا، نہ کسی سے ملنا جلنا، منہ کو چپ لگی ہے۔ بس دیواریں تکتے رہتے ہیں۔ بہت سے ڈاکٹروں کو آپ جانیں، یہ ڈاکٹر حکیم کے بس کا روگ بھی نہیں ہے۔ شاید کو بھی علم نہیں تھا کہ خانم سے وہ اس قدر بندھ چکے ہیں، ایک ہی کا نام دردِ لادواں ہے۔"
"ایسا؟" پیرو نے متعجب ہو کے کہا۔
"میں آپ کو کیا بتاؤں، نواب کا کیا حال ہے۔ ان کے چیز کی کمی ہے اور ان کے متعلقین، احباب نے کون سا جتن کیا ہوگا۔ ہم نے ادھر ادھر خانم کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔ پھر آپ نظر آ گئے، اب اتنے دنوں پھر امید کی کوئی کرن پھوٹی ہے۔"
"ہا! ابھی اتنا سا بات تھا تو آپ نے اپنے کو پہلے کیوں بولا۔ اپن ابھی حیدرآباد سے جا کے پہلا کام خانم کو ڈھونڈنے گا اور جیسے ہی اس کا ٹھکانا پتہ چلا، آپ کو بولے گا۔"
"یہ ایک شخص کی زندگی کا سوال ہے۔"
"اپن سمجھتا ہے، ایسا کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ آپ ایک دم فکر کرو بڑے صاحب! اپن سے جو بن سکا کرے گا۔ نواب سے جلد

دو، ابھی کچھ دن اور کاٹ لے۔"
"ان پر تو ایک ایک لمحہ عذاب کی طرح گزر رہا ہے۔"
"اپن بولتا ہے، ابھی اپن جیسا کوشش کرے گا۔"
"دیکھیے، اگر آپ کو کوئی بھی اتا پتہ معلوم ہو تو..."
"آپ کیسا بولتے ہو بڑے صاحب!"
"آپ کو نہیں معلوم تو صاحب زادے کو معلوم ہوگا۔ مجھے معلوم ہے، آپ نہیں تھے۔ صاحب زادے کے ہمراہ کوئی اور صاحب تھے اور وہ کوئی دُور کے آدمی بھی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ آئے تھے، ساتھ ساتھ واپس گئے تھے، سب نے یہی جانا تھا کہ صاحب زادے ان کے بیٹے، بھائی یا شاگرد ہی ہو سکتے ہیں، ایسا بھی کیا ہے کہ اب ان کو ان کی منزل نشان کچھ معلوم نہ ہو۔ ہم خانم سے بس درخواست ہی کر سکتے ہیں لیکن ایک شخص کے لیے، ایک شخص کی زندگی کے لیے خانم تک پہنچنا ضروری ہے۔"
خاں صاحب کا لہجہ دردمندانہ اور التجا آمیز تھا۔ میں ان سے کیا عذر کرتا کہ ان کے بقول کتنوں نے اس وقت مجھے سنبھل کے ساتھ یہاں دیکھا تھا، ہم کئی دن خانم کے ہاں رہے تھے، میں نے خاں صاحب سے کہا کہ حیدرآباد سے نکلتے ہی ہم جدا ہو گئے تھے، میں بمبئی چلا گیا تھا لیکن وہ بمبئی نہیں آئے، اس کے بعد کچھ نہیں معلوم۔ سنبھل کا میں نے نام نہیں لیا، صرف اتنا کہا کہ اس آدمی سے میرا تعلق گہرا نہیں تھا، اتفاقی تھا، سفر کے دوران ایک ناروا واقعہ ہو گیا تھا، چاقو تک نکل آئے تھے۔ وہ یہ سب دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے مشکل وقت میں میری مدد کی۔ لازماً ہم دونوں میں ربط ضبط بڑھ گیا اس قدر کہ انھوں نے جب مجھ سے چند دنوں کے لیے اپنے ساتھ حیدرآباد چلنے کی درخواست کی تو میں منع نہ کر سکا، انھوں نے مجھے ایک بڑی رقم دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو خاں صاحب سے کہنا تھا۔ میں یہی بے سروپا باتیں کرتا رہا۔ میں نے ان سے کہا، باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ حیدرآباد کے رہنے والے ہیں، بمبئی میں مستقل قیام کا ارادہ بھی ظاہر کر رہے تھے، میں نے انھیں بمبئی کا پتہ دیا تھا لیکن وہ وہاں آئے نہیں۔
خاں صاحب کو میری ان فضول باتوں کا کچھ یقین آیا کچھ نہیں، وہ متذبذب انداز میں پلکیں جھپکاتے رہے اور کچھ توقف کے بعد بولے "صاحب زادے! زمانہ ہم نے بھی دیکھا ہے۔ میں آپ سے حجت نہیں کروں گا لیکن آپ خود سوچیے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"
"میں سب کچھ ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔" میں نے ناگواری سے کہا۔
وہ اصرار کرنے لگے کہ اب ہمی ان کی آخری امید ہیں، انھوں نے اور نواب کے دیگر بہی خواہوں نے ہندوستان میں شاید کوئی ایسی قابلِ ذکر جگہ نہیں چھوڑی ہے جہاں خانم کی تلاش نہ کی ہو، آگرہ، لکھنؤ، کان پور، بمبئی، کلکتہ، بھوپال، جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی ہے۔ اب بالکل ناامیدی کے عالم میں آخر ہماری صورت دکھائی دی ہے۔ ہم اپنی بات پر جمے رہے۔ بالآخر خاں صاحب کے دل میں جو بات تھی، ان کی زبان پر آ گئی۔ ہٹیلے لہجے میں کہنے لگے۔
"دیکھیے صاحب! جب تک آپ میری درخواست قبول نہیں کریں گے، میں آپ کو یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔"
"اپن کیا بولے بڑے صاحب! آپ کے اپنے لیے کچھ بھی..."
"سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔"
"ہم نے آپ سے سب بول دیا ہے...."
"ذرا صبر و سکون سے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے غور کر لیجیے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ نواب ایک بہت اچھے آدمی ہیں، دھن دولت کی یہاں کوئی کمی نہیں ہے۔ نواب کی زندگی ہی سے یہ سب کچھ ہے، ان کی زندگی کے لیے...."
"بڑے صاحب!" پیرو نے ان کی بات کاٹ کے کہا۔
"ابھی بس کرو۔"
"آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو میں نواب کی صورت آپ کو دکھلائے دیتا ہوں، انھیں دیکھ کے شاید آپ کو ترس آ جائے۔"
"اپنے کو ایک دم بھروسا ہے، آپ جو بول رہے ہو، ٹھیک ہے پر یہ ایسا کوئی بڑا بات نہیں ہے۔ اپن نے آپ سے بولا تھا کہ ابھی باہر جاتے ہی سب کچھ کرے گا۔"
خاں صاحب نے جیسے سنا ہی نہیں، تنک کے بولے "مجھے شبہ ہے کہ آپ کو خانم کا ٹھکانا معلوم ہے، معلوم ہونا بھی چاہیے، آپ چھپا رہے ہیں، ایسی ویسی کوئی بات ہے تو آپ اطمینان رکھیں، میں زبان دیتا ہوں۔"
"اپنے کو آپ کیوں آدھا کر رہا ہے بڑے صاحب؟"
"پھر میں یہی سمجھوں کہ آپ بتانا نہیں چاہتے۔"
"یہی آپ کو ٹھیک لگتا ہے تو ابھی آپ ایسا ہی سمجھو۔"
"مگر ہمیں ہر صورت میں یہ معلوم کرنا ضروری ہے۔" خاں صاحب کے لہجے میں اچانک تندی آ گئی تھی۔
"ایسا! اپن کو شک تھا، ابھی کچھ دیر بعد آپ ایسا ہی نہ بولے۔"
"اپن بولتا ہے، آپ غلطی پر ہے۔"
"بہتر ہے کہ آپ میری مدد کریں" خاں صاحب نے سرد آواز میں کہا "ورنہ...." وہ جھجکتے ہوئے بولے "ورنہ میں آپ سے کہوں گا کہ پھر آپ بھی غلطی پر ہیں۔"
"اگر اپن ابھی کچھ بتا دے تو آپ کو یقین آ جائے گا؟"
"ضرور! لیکن، لیکن پہلے ہم تصدیق ضرور کریں گے۔"
"اپن ابھی سب سمجھ گیا۔" پیرو نے تمتماتی آواز میں کہا "اپن

کو نہیں معلوم بڑے صاحب!"

"نہیں معلوم!" خاں صاحب نے سر اُٹھا کے حتمی لہجے میں کہا۔ "تو، تو اس کے معنی ہیں آپ لوگ یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔"

"آپ کیا بولتے ہو؟"

"ہاں! جو آپ لوگوں نے سُنا ہے، وہی۔"

"ابھی کون اپن کو روک سکتا ہے۔"

"کوشش کر لیجیے، پشیمانی ہوگی۔ یہ حویلی تھوڑی بہت نظر میں آ ہی گئی ہوگی۔ یہاں اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مارتا اور یہ شہر حیدرآباد ہے۔ اس حویلی کے مکینوں کے اثر و رسوخ کا اندازہ تمھیں یہاں اپنی موجودگی سے ہو جانا چاہیے۔" خاں صاحب آپ سے تم پر آ گئے تھے، تحکمانہ لہجے میں بولے۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ تھانے سے تم یہاں اس آسانی سے آ سکتے تھے؟"

"سب سمجھتا ہے اور ابھی سب سمجھ رہا ہے، وہ چار بھی تمھارا آدمی تھا جو دوپہر سے اپن کا پیچھا کر رہا تھا۔"

"تم نے ٹھیک جانا، وہ تم سے مڈبھیڑ نہیں چاہتے تھے، انھیں صرف تمھارا پتہ جاننا تھا، اس سے زیادہ انھیں کوئی اور ہدایت نہیں دی گئی تھی اور اس سے زیادہ انھیں کچھ اور معلوم بھی نہیں تھا۔"

"اور وہ سب آکا جانتا ہے۔"

"ہاں! آکا کو ہم نے حکم دیا تھا کہ دوبارہ جب کبھی تم حیدرآباد میں نظر آؤ، تمھارا تعاقب کیا جائے، آخر تم لوگ آ ہی گئے۔ ہمیں اندازہ تھا کہ تم سیدھے سبھاؤ کچھ نہیں بتاؤ گے، جو لوگ سرِ بازار نواب عالم تاب کی گردن پر چاقو رکھ سکتے ہیں، شاہ کبیر سے مجھیٹا کر سکتے ہوں، چاقو جن کے اشارے پہچانتا ہو، اُن کا تعلق کس قبیل کے لوگوں سے ہو سکتا ہے، ہم تمھیں کوئی زحمت دینا اور تمھارے راستے میں کوئی رکاوٹ بننا نہیں چاہتے تھے تم خود اپنے راستے کی دیوار بن گئے۔ تمھارے تعاقب سے ہمارا مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ ہمیں تم سے کوئی غرض نہیں، خانم سے ہے لیکن وہ صورت نہیں بنی تو دوسری صورتیں موجود ہیں۔ ایک یہی ہے کہ تم حالات کا اچھی طرح تخمینہ لگا کے ہمیں بھی اُلجھن سے بچاؤ اور خود کو بھی۔ اب تم سب کچھ جان گئے ہو تو تمھارا تعاقب فضول ہے۔ تھانے سے تم یہاں آ گئے ہو، تمھیں لمبی سزا دلوانے کے لیے اُس آدمی کو ختم کیا جا سکتا تھا جو ابھی تک زخمی ہے اور وہ کسی بھی وقت مارا جا سکتا ہے۔ تھانے اور جیل سے نجات آسان تھی مگر اس حویلی سے مشکل ہے، اس کی فصیلیں اونچی ہیں اور یہاں مسلح پہرے داروں کی ایک فوج موجود ہے اور یہاں یہاں کے مکینوں کا قانون چلتا ہے، تم یہاں سسک سسک کر مر جاؤ گے اور کسی کو خبر نہیں ہوگی۔ خانم ہمیں مطلوب ہے، تم سے بس اتنا کہنا تھا۔ سمجھ دار آدمی ہو۔ تمھاری نجات بہرحال اب بھی تمھاری دسترس میں ہے، کوئی مطالبہ ہو تو کہہ سکتے ہو۔"

ابھی خاں صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ ادرگرد کھڑے ہ ملازموں میں ہلچل سی مچی اور ایک بھاری بھرکم شخص چکن کی شیر میں ملبوس اندر داخل ہوا۔ تمام ملازمین سر جھکا کے کھڑے ہو سرخ و سفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، مونچھیں تلوار کے مانند، اُس کی چال شاہانہ تھی، وضع قطع سے کوئی نواب معلوم ہوتا تھا۔ خاں صاحب بھی اُسے دیکھ کے یک لخت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم د بھی بے اختیار اُٹھ گئے۔ خاں صاحب نے جھک کے اُسے سلام اُس نے سر کی جنبش سے جواب دیا اور خشمگیں نظروں سے ہ دیکھتا ہوا گونج دار آواز میں بولا۔ "ان کو سب بتا دیا ہے تم نے؟"

"سرکار!" خاں صاحب نے گردن خم کر کے کہا۔ "میں نے ہر بات تفصیل سے کہہ دینے کی کوشش کی ہے۔"

"ان سے کہہ دو کہ انھیں جتنی رقم کی ضرورت ہو، دے دی جائ"

"میں نے اشارہ کر دیا ہے۔" خاں صاحب نے زیرِ لبی سے ک

"اشارہ نہیں، کھل کے بات کرو۔" نواب نے گرجتے ہوئے

خاں صاحب اُس کے آتے ہی حواس باختہ سے ہو گ بدحواسی میں انھوں نے ہمیں بتایا کہ نواب عالم تاب کے بڑ نواب عالم گیر ہم سے مخاطب ہیں۔ یہ حویلی بھی اُنھی کی معلو تھی۔ خاں صاحب اُس کے سامنے محض ایک کارندے نظ آ رہے تھے۔

"اپن کو روپے پیسے کا ایک دم ضرورت نہیں ہے نواب۔" پیرو نے تلخی سے کہا۔ "ابھی آپ بڑا آدمی ہے تو اپن بھی بھک نہیں ہے، جو خاں صاحب نے بولا ہے، اپن نے اچھی طرح لیا ہے، پر ابھی آپ بھی سن لو، کوئی اپن سے اِس طرح کچھ نہیں سکتا، اپنا روپیہ پیسا اپنے پاس رکھو۔ اپن خانم سے بات کر اور سب جا کے بول دے گا۔ وہ ایسا دل کا پتھر نہیں ہے۔"

"انھیں بتا دو خاں کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔" نواب نے ہم سے مخاطب ہونے کے بجائے خاں صاحب سے کہا۔

"ابھی سیدھا اپن سے بات کرو نواب صاحب! اپن کو دو، ابھی تم کو چور چماروں سے ناتا پڑا ہے، اپن بولتا ہے، ایسا تم سے کچھ نہیں جان سکتا، چاہے اپن اندر سے کبھی نہیں نکلے۔"

"ہم کو خانم کا پتہ ابھی چاہیے۔" وہ دھمکتے لہجے میں بولا۔

"اپن نہیں جانتا۔" پیرو نے بھی اُسی لہجے میں جواب دیا۔

"پھر تم لوگ یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

"پھر تم بھی اپنے لیے اچھا نہیں کرے گا۔"

"انھیں یہیں رکھو۔" نواب نے خاں صاحب کو حکم دیا۔ "نہیں تو کچھ دیر بعد، کچھ دنوں بعد ان کی سمجھ میں آ جائے گا کہ کہاں ہیں۔"

"اپن کو پتہ ہے، اپن بہت بڑا محل میں ہے۔ اِدھر تمھارا راج چلتا ہے، تم اِدھر کا نظام بادشاہ ہے پر اپن تمھارا چاکری میں نہیں ہے، اپن اس زبان میں بات سننے کا عادی نہیں ہے جس میں ابھی تم بولتا ہے۔"

"سرکار! یہ گستاخ لوگ ہیں، آپ ان کے منہ نہ لگیں۔ میں ان سے نپٹ لوں گا۔" خاں صاحب تیزی سے بولے۔

"تم کیا نمٹے گا، تم ایک دم چلا آدمی ہے، اُلو کا پٹھا!"

"ان کو تہہ خانے میں بند کر دو۔" نواب نے اشتعال سے کہا۔

"تم نہیں جانتا نواب! نہیں جانتا کہ تمھارے آگے اِدھر کون لوگ ہے، تم اِدھر اپنے کو تہہ خانے میں بند کر دے گا، اپن سالا مر جائے گا اور بھی تم کو کچھ نہیں بولے گا۔ تم کو کچھ جاننا ہے تو اپن کو چھوڑنا پڑے گا، ویسے تم کچھ نہیں جان سکتا۔"

"خاں! ہم کو شک ہے کہ تم نے انھیں پوری بات نہیں بتائی۔"

"خان نے اپن کو سب بول دیا ہے۔"

"ہم اپنے بھائی کی زندگی کے لیے ہر ممکن تدبیر پہ عمل کریں گے۔"

"تم اپنے اور بھائی کے ساتھ بُرا کر رہا ہے۔ اپن کو ابھی جانے دو۔ تمھارا سر میں ابھی کچھ گودا ہے تو سمجھنے کا کوشش کرو، خانم کوئی کھلونا نہیں ہے، اُس کا مرضی ہوئے گا تو اِدھر آئے گا، تم دھن دولت میں ابھی سمجھتا ہے کہ سب خرید لے گا۔ آدمی خرید لے گا؟ تم بھول گیا ہے کہ خانم نے چلتے وقت نواب کو انکار بول دیا تھا۔"

"آپ اندر تشریف لے جائیں سرکار!" خاں صاحب نے بیچ میں عاجزی سے کہا۔ "میں یہاں موجود ہوں۔"

"ان سے کہو خاں، ہم انھیں ایک لاکھ روپے تک دے سکتے ہیں۔"

"ایک لاکھ!" پیرو نے زہرخند سے کہا۔

"دو لاکھ، تین لاکھ، پانچ لاکھ۔"

"بیس لاکھ!" پیرو نے زمین پر تھوک کے کہا۔ "تم بار بار روپے کی بات کیا کرتا ہے نواب! ابھی کتنا روپیہ ہے تمھارے پاس! ایسا ابھی کتنا حویلی ہے۔ اپن سے سودا کرو، اپن یہ سب خرید لے گا۔ تم کو، تمھارا سارا خاندان کو۔ تم سالا بیچتا کیا ہے۔"

نواب کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ "یہ، یہ لوگ پاگل معلوم ہوتے ہیں۔"

"خادم نے پہلے ہی عرض کیا تھا، ان کے منہ نہ لگیں۔" خاں صاحب نے نواب کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"ابھی اِدھر تمھارا کوئی مائی بہن ہے تو اپنے کو دکھاؤ، اپن اُس کا بولی دے گا، سمجھا۔"

"اوہ، اوہ۔" نواب نے اضطراری انداز میں پیرو پر جھپٹنے کے لیے قدم بڑھائے لیکن خاں صاحب آڑے آ گئے۔ "ہم اِس کا خون پی جائیں گے۔" نواب کے منہ سے کف جاری تھا۔

"ابھی بُرا لگا نواب! خانم بھی اپنا مائی بہن ہے۔"

"وہ ایک بازاری عورت ہے۔"

"اور اُس بازاری عورت میں تمھارے بھائی کا جان اٹکا ہوا ہے، تم اُس کو رانی بنا کے اِدھر لانا مانگتا ہے، ابھی بس کرو نواب! اپن اُس کو سر پہ بٹھا کے اِدھر سے لے گیا تھا، آخری دم تک اُس کا رکھوالی کرے گا، سمجھا! ابھی اُس کا کوئی گھر بھی ہو سکتا ہے، وہ شادی بھی بنا سکتا ہے۔ تمھارے سا نہ کسی عزت والا گھر سے اُس کا ناتا جُڑ سکتا ہے، ابھی تم کو کیسے بول دیوے کہ وہ کدھر ہے۔"

"تمھیں بتانا ہی پڑے گا، ہم ہر قیمت پہ اُسے حاصل کریں گے۔" نواب کے بولنے سے پہلے خاں صاحب نے برہمی سے کہا۔

"تم سب گھاس کھا گیا ہے سالا۔"

نواب کے اشارے پر مسلح پہرے دار ہماری طرف جھپٹ پڑے۔ میں نے اور پیرو نے سامنے آنے والے دو آدمیوں کو فوراً بے دم کر دیا تھا لیکن اُن کے پیچھے والوں نے بندوقیں ہمارے سینوں پر ٹکا دیں۔ پیرو نے نال پکڑ بھی لی تھی مگر دوسرے نے بندوق کی بٹ پوری طاقت سے پیرو کے سینے میں ماری۔ پیرو اگر پیچھے نہ ہو جاتا تو اُس کی پسلیاں ضرور ٹوٹ جاتیں۔ کمرے میں اچانک کئی پہرے دار آ گئے، وہ سب کے سب چاؤش تھے، سیاہ فام، تنومند اور تمنچے، بندوقیں ہاتھ میں لیے ہوئے۔ ہاتھ پیر چلانا بے سود تھا، نواب ابھی موجود تھا، پیرو نے قہر آلود آواز میں اُس سے کہا۔ "نواب! تم نہیں جانتا، ایک دم نہیں جانتا کہ اپن کون لوگ ہے، تم اپنے لیے بُرا کر رہا ہے، ابھی اپن اِدھر اکیلا نہیں ہے۔ تمھارا حویلی خاک ہو جائے گا، اِدھر پھر کوئی بھی نظر نہیں آئے گا۔ اپن کے آدمی کو اِدھر پہنچنے میں کوئی دیر نہیں لگے گا، تم سالا بہت خوار ہوگا۔" پیرو جانے کیا کیا کہتا، چیختا، دہاڑتا رہا۔ وہ ہمیں دھکیلتے ہوئے حویلی سے باہر لے آئے۔

وہ اصطبل سے ملحق ایک کوٹھری تھی جہاں گھوڑوں کا چارہ رکھا جاتا تھا۔ کوٹھری میں اوپر چھت کے ساتھ روشن دانوں کے سوا ایک ہی سلاخوں والی کھڑکی تھی اور آمد و رفت کے لیے لکڑی کا دروازہ۔ قریب ہی تھان سے بندھے ہوئے گھوڑے ہنہنا رہے تھے، کوٹھری میں سیلن کے علاوہ غلاظت کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ صبح سے شام ہو گئی۔ میں نے پیرو سے کہنے کی کوشش کی کہ انھوں نے نواب عالم تاب کے متعلق جو کچھ کہا ہے، ممکن ہے، غلط نہ ہو، میں نے خود دیکھا تھا، اسٹیشن پر جب خانم نے اُس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا تو اُس کا کیا حال ہوا تھا۔ وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہی سب ہو، ہمیں کسی اور طرح بھی سوچنا چاہیے ورنہ جیسا وہ

کب بُرے ہیں، اُنھوں نے ہمارے ساتھ یہی سلوک روا رکھا تو ہم یہیں گھٹ گھٹ کے مر جائیں گے اور کسی کو بھی ہمارا سُراغ نہیں ملے گا۔ پیرو اُلٹا مجھ پہ بگڑنے لگا: "تیرا مطلب ہے، ابھی ہم اُس کو فیض آباد کا پتہ بول دے گیا!" میں چُپ ہو گیا، وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

دو دن گزر گئے، خاں صاحب سلاخوں کی کھڑکی کے پاس آ کے صبح و شام ہمیں سمجھاتے، دھمکاتے رہے تھے۔ پیرو جواب میں انھیں گالیاں بکتا رہا۔ ہم نے کوٹھری سے نکلنے کی ہر ممکن صورت پر غور کر کے دیکھ لیا تھا لیکن باہر ایک نہیں کئی پہرے دار ہر وقت تعینات رہتے تھے اور تینوں وقت کھانا دے جاتے تھے۔ تیسرے دن جیسے ہی رات کے وقت دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی، پیرو لپک کے دروازے کی آڑ میں چھپ گیا، دوسری طرف میں چھپا۔ ابھی کھانا لانے والے نے سامان ڈال کے جھانکا ہی تھا کہ پیرو نے اُس کی آنکھوں پہ مٹی ڈال دی اور منہ پر ہاتھ رکھ کے اندر گھسیٹ لیا۔ یہ دیکھ کے اُس کے پیچھے موجود پہرے دار سٹ پٹاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اِس طرف سے میں اُس پر جھپٹا اور میں نے اُس کی بندوق چھین لی۔ اِدھر پیرو نے جھٹ اُس کی کمر سے کارتوس کی پیٹی اُتار لی۔ ہم نشانہ لیے ہوئے باہر نکلے۔ ہم نے باہر ایک پہرے دار پر گولی بھی چلا دی تھی لیکن ہم دروازے تک نہیں جا سکے۔ ہر طرف گولیاں چلنے لگی تھیں، نتیجتہً ہمیں بندوق پھینک دینی پڑی اور سزا کے طور پر انھوں نے ہمیں اصطبل کے بجائے حویلی کے تہہ خانے میں بند کر دیا جہاں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، سر پھوڑنے کے لیے چاروں طرف پتھریلی دیواروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اصطبل کی کوٹھری اس اندھیرے غار سے بسا غنیمت تھی۔ خاں صاحب پہرے داروں کی معیت میں روزانہ نت نئی دھمکیاں لے کے تہہ خانے کی سیڑھیاں طے کرتے تھے۔ پیرو نے اُن سے بات کرنا ہی بند کر دیا تھا۔ نواب جہاں گیر پھر نہیں آیا۔

تہہ خانے میں آئے ہمیں چوتھا دن ہو گا کہ خاں صاحب کئی پہرے داروں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اُن کے حکم پر پہرے داروں نے ہمیں بے بس کر کے رسیوں سے باندھ دیا اور بیدوں سے مسلسل ضربیں لگاتے رہے مگر ہم نے زبان نہیں کھولی۔ میرے اور پیرو کے جسم پر جگہ جگہ نیل پڑ گئے تھے۔ تہہ خانے میں مچھروں کی بہتات تھی۔ سورج کی روشنی آتی ہی نہیں تھی۔ سیلن اور مچھروں کی وجہ سے مجھے سخت بخار آ گیا، پیرو کی طبیعت بھی گری گری رہنے لگی۔

حویلی میں آئے نواں اور تہہ خانے میں بند ہوئے چھٹا دن تھا کہ انھوں نے ہمیں باہر نکال لیا اور حویلی ہی کے ایک حصے میں لے جا کے پھر بند کر دیا۔ وہ ملازموں ہی کا حصہ ہو سکتا تھا۔ وہاں روشنی تھی اور ہوا بھی خوب آتی تھی لیکن ساتھ ہی اِرد گرد پہرے داروں کی تعداد بھی بڑھا دی گئی تھی۔ ہماری ایک ذرا سی آہٹ پہ

پہرے دار فوراً مستعد ہو جاتے تھے۔ خاں صاحب نے بھی اب ... کر دیا تھا۔ صرف ایک ملازم دروازے پہ کھانا رکھ کے چلا جاتا ... کے کسی اور شخص نے پھر کوئی رابطہ ہم سے قائم نہیں کیا تھا۔ ... آ کے میری طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی لیکن ہم دونوں شب ... ایک دوسرے کا چہرہ ہی دیکھتے رہتے تھے۔ پتہ نہیں نا ... اور ملائی کا کیا حال ہو گا۔ کہاں کہاں مارے پھر رہے ہوں گے ... نے متعدد بار پہرے داروں سے بات کرنے کی کوشش کی ... خاموشی کے سوا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

گیارہویں دن بعد رات کا وقت تھا، خاصی رات ہو گ... کمرے میں زرد بلب کی مدھم روشنی ٹمٹما رہی تھی اور ہر سُو خاموشی ... تھی کہ اچانک دروازہ کھلا۔ میں اور پیرو ہڑبڑا کے اُٹھ گئے ... پہرے دار بندوقیں تانے تیزی سے اندر آئے۔ اُن کے پیچھے ... سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی دو عورتیں بھی موجود تھیں۔ چہروں پر ... پڑی ہوئی تھی، صرف آنکھیں اور سُرخ و سفید پیشانی کھلی ہو... سیاہ نقاب میں اُن کے شہابی رنگ دمک رہے تھے۔ دونو... قد نکلتے ہوئے تھے، ایک نسبتہً فربہ، دوسری دبلی پتلی۔ اُن ... پر پہرے دار کمرے کے کونوں میں سمٹ گئے۔ دونوں عورتیں ... انداز سے چلتی ہوئی ہم سے کچھ فاصلے پر آ کے رک گئیں۔ انھو... چلمن کے ہاتھ کے اشارے سے پہرے داروں کو کمرے سے ... کا حکم دیا۔ پہرے داروں نے تعمیل میں تامّل کیا لیکن دوسر... وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔

ہم دونوں گُنگ کھڑے تھے۔

اُن کا ہمارا فاصلہ دو تین گز سے زیادہ نہیں ہو گا، میری ... بھری نظریں انھی پر مرکوز تھیں۔ رات خاصی ہو گئی تھی۔ ایسے وقت ... دو عورتوں کا اچانک ہمارے پاس آنے سے کیا مقصد ہو سکتا ہے ... کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ دونوں کی شہابی پیشانیاں اور بڑ... سیاہ آنکھیں ہی کھلی ہوئی تھیں، اِس کے سوا اُن کی ظاہری و... سے ان کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ وہ ... قدموں سے اندر آئی تھیں، پہرے داروں کو کمرے سے نکل جانے کا ... وقت اُن کے لہجے میں لرزیدگی کے باوجود تمکنت تھی۔ ایک عور... بدن فربہ تھا، اُس کی عمر دوسری عورت سے یقیناً زیادہ تھی ... نے پہرے داروں کو چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد ... گم صُم کھڑی رہیں جیسے کہیں کھو گئی ہوں یا یہاں آ کے سب کچھ ... ہوں۔ وہ سراپا چادروں میں چھپی ہوئی تھیں تاہم اُن کے سراپا ... صاف نمایاں تھا۔ اِدھر میرا جو حال تھا، وہی پیرو کا تھا۔ چند دن ... خاں صاحب نے بھی آنا بند کر دیا تھا، نواب ایک ہی بار آیا ...

... دنوں بعد رات کے وقت کسی کا آنا اور وہ بھی دو عورتوں کا، کسی خاص ہی مقصد کی غمازی کرتا تھا لیکن وہ مقصد سمجھ لینے تک ہماری طرف سے خاموشی ہی مناسب تھی۔ کوئی بھی بات ہو سکتی تھی، وہ نواب کا کوئی نیا حکم سنانے آئی ہوں مگر نواب کو بھلا اُن کے توسط کی کیا ضرورت؟ ویسے نواب کی اجازت کے بغیر تو اس طرح کسی کا ہمارے پاس آنا ممکن ہی نہیں تھا، اب تک ہم نے یہی دیکھا تھا، خاں صاحب نے بھی ہمیں بتایا تھا کہ حویلی میں نواب کی اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مارتا۔ میرا سر گھوم رہا تھا، کیا نواب کو ہماری کوئی اور آزمائش مقصود ہے؟ کسی لمحے مجھے یہ گمان بھی ہوا تھا کہ کہیں یہ سب کچھ میرے منتشر حواس کا فریب تو نہیں ہے؟ شاید میں کوئی بے ہنگم سا خواب دیکھ رہا ہوں؟ مگر وہ سامنے کھڑی تھیں اور میرے برابر ہی پیرو موجود تھا۔ لمحوں تک سناٹا رہا، نہ ہم نے کچھ کہا، نہ اُن کے لبوں میں جنبش ہوئی البتہ اُن کی نظروں کو قرار نہیں تھا، کبھی فرش پر گڑ جاتیں، کبھی ہمارے گرد منڈلانے لگتیں۔ ایسا لگتا تھا، دونوں کے پاؤں زمین سے اُکھڑے ہوئے ہیں اور وہ اب بھاگا ہی چاہتی ہیں، غالباً انھیں کہیں اور جانا تھا، بھٹک کے ... دھر آ گئی ہیں۔ اِس سے پہلے کہ ہم زبان کھولتے اور اُن سے کچھ ... جاننے کی کوشش کرتے، میرے بائیں طرف کھڑی ہوئی بڑی عمر کی عورت ... کو خیال آیا، اُس نے جھرجھراتی آواز میں ہمیں آداب کیا، دوسری نے ... سراسیمگی پٹاتے ہوئے اُس کی پیروی کی۔

میں نے سراسیمگی سے پیرو کی طرف دیکھا۔ ہم نے جھجکتے ہوئے سر کے ... اشارے سے اُن کے سلام کا جواب دیا۔

"ہم، ہم ..." اُس نے ہانپتے ہوئے کہنا چاہا: "ہم آپ کے ..." ... اُس کی آواز حلق میں گھٹ رہی تھی، وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"ہاں ہاں بولو مائی!" پیرو نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

چند لمحے خاموشی طاری رہی پھر وہی عورت لڑکھڑاتی زبان ... سے بولی: "ہم آپ سے کچھ کہنے ..." اُس کا سر پائل سا کھا گیا۔

"ابھی کچھ بولے گا نیئں تو اپن کیا جواب دے گا۔" پیرو نے تنک ... کے کہا۔

"ہم آپ کے پاس بہت اُمید لے کے آئے ہیں۔" وہ تیز سانسوں سے بولی۔

"کیسا اُمید؟" پیرو نے سنسناتے لہجے میں پوچھا: "ابھی آرام سے ... کُھل کے بولو۔"

"آپ سے ایک التجا کرنی ہے۔"

"اپن سے؟" پیرو تذبذب سے بولا: "تم کسی غلط جگہ آ گیا ہے۔ ... ن تو اِدھر قیدی ہے مائی!"

وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے چپ رہی، اُس کا سینہ دھڑک ... رہا تھا۔ ایک تھکا دینے کے سکوت کے بعد اُس کی کسمساتی آواز ابھر کے ...

میں گونجی: "ہمیں اِس کا احساس ہے لیکن ..."

"تم ... تم کون ہے؟" پیرو نے اُس کی بات کاٹ کے تیزی سے پوچھا۔

"ہم بہت بدنصیب ہیں۔" اُس نے دبی زبان سے کہا۔

"اپن سے سیدھا بات کرو۔"

"ہم چھوٹے نواب کی بیگم ہیں اور یہ ... یہ اُن کی بہن ..." وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم چھوٹے نواب کا بیگم ہے؟"

وہ اضطراری انداز میں سر ہلا کے رہ گئی۔

"ابھی تم لوگ بھی اپن سے مخول کرتا ہے۔" پیرو نے تلخی سے کہا۔ "لگتا ہے نواب کے پاس سارا ہتھیار، آدمی خلاص ہو گیا ہے جو اُس نے ابھی اِدھر تم کو ٹھمکا لگانے کو بھیجا ہے۔"

"خدا کے لیے اپنی زبان قابو میں رکھیے۔" وہ ہیجانی لہجے میں بولی: "کوئی بدگمانی کرنے سے پہلے ہماری بات سُن لیجیے۔ چھوٹے نواب صاحب کو کسی بات کا ہوش نہیں ہے اور بڑے نواب کو علم نہیں ہے کہ ہم یہاں آپ کے پاس دامن پھیلانے آئے ہیں۔"

"ابھی تم پتہ نہیں کیسا بولتا ہے۔" پیرو نے وحشت سے کہا: "تمھارا مطلب ہے، تم نواب کا بیگم ہے؟"

"ہمیں اندازہ ہے آپ کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو گا۔" وہ پژمردگی سے بولی: "مگر ہم نے یہی کہا ہے۔"

"اپن نے بھی سُن لیا ہے۔" پیرو نے تندی سے کہا: "جاؤ مائی! اپن بولتا ہے، ابھی اِدھر سے لوٹ جاؤ۔ ابھی اپن کا زبان بھی کھلا ہے، ہاتھ بھی اور بھی سب بند نہیں ہے، سمجھا۔ اِدھر رہتے رہتے اپن کو سالا زنگ نہیں ..."

"نہیں نہیں۔" اُس کی سیاہ آنکھوں میں شعلے سے لپکنے لگے اور وہ ہذیانی انداز میں بولی: "بہتر ہے، سوچ سمجھ کے مُنہ سے کچھ نکالیے، ہم نے یہاں آ کے کوئی گناہ، کوئی جُرم نہیں کیا ہے۔" اُس کی لرزتی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

میں نے سوچا، پیرو کو مزید ایسی ویسی باتوں سے باز رکھنے کے لیے درمیان میں دخل دوں، اُسے کم سے کم اتنا خیال رکھنا چاہیے کہ سامنے عورتیں ہیں مگر اپنی دخل اندازی سے مجھے اُس کی ناراضی کا خدشہ تھا اور اُس نے مجھے اِس کا موقع بھی نہیں دیا۔ حویلی میں بیتنے والا وقت شاید اُس پہ مجھ سے زیادہ گراں گزرا تھا۔ آج کئی دن بعد کسی نے آ کے ہماری خبر لی تھی اس لیے پیرو کے ترشتے جسم میں آگ سی بھڑک اُٹھی تھی، وہ زہر خند سے بولا: "تم اپن کو کیا سمجھ کے اِدھر آیا ہے، اِدھر ابھی بہت سا بال دھوپ کھا کے نہیں پلٹا ہے، اتنا بہت سمجھو کہ اپن نے

اتنا دیر ی تمھارا بات سن لیا اور ٹھیرا رہا ہے جس راستے سے آیا ہے، ابھی ٹھیک ہے اُسی سے لوٹ جاؤ۔ آ دو رجا کے نواب کو بولنا، یہ تو تُشکی اپن بہت دیکھتا رہا ہے۔ اپن ابھی ادھر ہی ہے، گھر کا اصلی زنانیوں کو بھیجے گا تو اپن ضرور کچھ سوچے گا۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔" وہ بلکتے ہوئے بولی۔ "خدا کے لیے پہلے ہماری التجا سن لیجیے، اُس کے بعد جو مرضی ہو کہہ لیجیے گا۔ آپ کے قول اور ارادے کے بارے میں سُنا تھا جو اتنی جرأت بھی کر سکے۔ آپ ہمیں اس حویلی کی عزت نہیں سمجھتے تو اپنی ماں بہن ضرور سمجھ سکتے ہیں، کیا اتنا بھی آپ کے بس میں نہیں ہے؟ آپ کا ان رشتوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا؟ کیا ہم کسی ایسے رشتے کا بھرم لے کے آپ کے پاس نہیں آسکتے تھے؟" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی اور یکایک اُس کے سراپا میں ایک لہر سی اُٹھی۔ اُس نے بے تابانہ اپنے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب کھینچ لی اور اُسی وحشت و اضطراب میں اپنے ساتھ والی عورت کی نقاب بھی کھسوٹ لی۔ "آپ نے ضرور زمانہ دیکھا ہوگا۔" وہ زخمی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہم بدبختوں کو بھی دیکھ لیجیے، اگر کچھ نظر آتا ہے تو۔۔۔ ورنہ ہم سمجھیں گے خدا ہم سے روٹھ گیا ہے۔ ہمارے نصیب بے ہمارے ساتھ۔۔۔" اُس کے سینے نے اُس کی آواز کا ساتھ نہیں دیا اور اُس کے نازک ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔

پیرو کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا، وہ دم بخود کھڑا رہا۔ یہ سارا منظر بھی سُن ہو گیا تھا۔ اُن کے بے نقاب چہرے ہمارے سامنے تھے۔ انھوں نے غلط نہیں کہا تھا، اُن کا رنگ روپ شہزادیوں ہی کی طرح تھا۔ اُن کی کھلی پیشانی، آنکھوں، آواز کی کھنک اور لب و لہجہ کی نفاست اور فصاحت سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایسی نازک اندام اور مہ جمال ہوں گی، اُن کا شمار اُنھی لوگوں میں ہوتا تھا جن کا ذکر قصوں کہانیوں میں ہوتا ہے، جنھیں پھولوں اور پریوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ کمرے میں چاندنی سی چھٹک گئی تھی۔ جو عورت ہم سے مخاطب تھی اُس کی عمر تیئیس چوبیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی، دوسری اُس سے کم عمر تھی۔ بڑی کے نقش و نگار اُس کے بدن سے مختلف تھے، تیکھے تیکھے الگ الگ، کٹے اور ترشے ہوئے سے۔ چہرے سے اُس کے بدن کی فربہی کا گمان معدوم ہو جاتا تھا۔ دوسری لڑکی جیسا کہ اُس نے بتایا تھا، نواب کی بہن ہی ہو سکتی تھی۔ کتابی چہرہ، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ اور لمبی لمبی پلکیں، دُبلی پتلی ہونے کی وجہ سے وہ قد میں ذرا بڑی نظر آتی تھی، اُس کی ناک میں سونے کی لونگ دمک رہی تھی۔ دونوں کی کلائیوں میں سنہری چوڑیاں، کانوں میں ہیروں کے آویزے جگمگا رہے تھے۔ اُن سے نگاہیں ملانا مشکل تھا۔ دونوں کا رنگ سرخ و سفید تھا، بلور کی طرح صاف و شفاف چہرے، پاکیزگی، تمکنت اور

یاسیت اُن پر چھائی ہوئی تھی، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، خدا نے فرصت ہی میں انھیں تراشا تھا، کوئی بھی ایک نظر دیکھ کے کہ کان کا واسطہ مخمل و اطلس ہی سے رہا ہے۔

"ہم بہت مجبوری کی حالت میں آئے ہیں مگر کسی اور ہمیں گُنگ دیکھ کے اُس نے زیرِ لب کہا۔

"پر آپ آپ ادھر کیوں آیا ہے؟" پیرو تھکی ہوئی آواز

"ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس منہ سے کہیں۔" وہ اُس سے بولی۔ "ایک اپنے بھائی کی، دوسری اپنے شوہر کی زندگی مانگنے آئی ہے۔"

"ابھی آپ کیسا بولتا ہے؟" پیرو نے بوجھل لہجے میں موت کا دھندا اوپر والا ہی کرتا ہے۔ ادھر اپنا زندگی ہی بس ہے تو دوسرے کو کیا دے گا۔"

"بخدا اِس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ یقین کیجیے یہاں آپ کو اِس حالت میں دیکھ کے بہت دُکھ ہوا ہے۔ اختیار میں ہوتا تو ہم کبھی یہ ستم روا نہ رکھنے دیتے۔ ہم آپ کو بتا آپ کو اندازہ ہو گا ہی کہ حویلی میں ہماری حیثیت ایک تماشہ سی ہے۔ منہ میں زبان رکھتے ہوئے بھی ہم بے زبان ہیں، ہاتھ ہوتے ہوئے بھی بہت بے دست و پا ہیں۔ ہمیں معلوم ہو چکا یہاں کس طرح آئے تھے اور آپ کے ساتھ کیا کچھ ہوتا رہا۔

"ابھی آپ کام کا بات بولو۔ ادھر آپ کا زیادہ دیر ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے۔" پیرو نے آہستگی سے کہا۔

"ہم کیا کہیں، یہاں آنے کو آگئے ہیں لیکن آپ کے منت کرتے ہوئے ہماری آواز ساتھ نہیں دیتی، ہمیں آپ سے مانگنے کا حق نہیں پہنچتا، ہم اپنا یہ حق جتانے کے لیے کسی ناز رشتے ہی کا سہارا لے سکتے تھے۔ اسے آپ خود غرضی کہہ لیں اگر آپ کا دل ہمیں کسی معتبر رشتے کی عزت دینا گوارا نہیں اور رشتہ تو ہمارے آپ کے درمیان موجود ہے، انسان کا رشتہ کو اُسی کا واسطہ دیتے ہیں۔ کاش ہم کسی قابل ہوتے۔ اس ستم ظر احساس ہے کہ آپ کی کوئی مدد کرنے کے بجائے اُلٹا ہم آپ سے کچھ طلب کرنے آئے ہیں۔ جس رشتے کے حوالے پر ہمیں امید اُس کی پاس داری کے ہم خود متحمل نہیں، کاش ہمارا حوصلہ اتنا ہوتا کہ ہم آپ کے لیے اِس بند حویلی کے دروازے کھول سکتے۔ ہم شرمسار ہیں۔"

"ابھی اس کو جانے دو، آپ نے اپنے بولنے کو کچھ نہیں چھوڑا۔" پیرو کی آواز ڈھلک گئی تھی۔ "آپ اپنا بات کرو۔ اپن آپ کا ابھی کیا کر سکتا ہے؟"

"آپ چاہیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "ہم آپ سے کہنے آئے ہیں کہ جو کچھ آپ نے سُنا ہے غلط نہیں ہے۔ چھوٹے نواب صاحب کا یہی حال ہے۔ روز بہ روز اُن کا ہوش اُن سے چھنتا جا رہا ہے۔ انھیں کسی کی فکر نہیں جیسے سب کو بھول گئے ہوں، تنہا اپنے آپ کو بھی۔ نہ کھانے کا ہوش ہے، نہ پہننے کا۔ لباس تبدیل کیے ہوئے دن ہو جاتے ہیں۔ صبح و شام بس خیالوں، خوابوں کی دُنیا میں گم دیواریں تکتے رہتے ہیں۔ جسم میں خون ہی نہیں رہا ہے۔ اگر آپ نے پہلے انھیں دیکھا ہے تو اب شاید مشکل سے پہچان پائیں۔ شروع میں کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں چلا کہ انھیں کون سا دُکھ کھائے جا رہا ہے۔ اُن کی نظر لگ گئی ہے لیکن پھر کچھ چھپا نہ رہ سکا۔" میرے کان سنسنا رہے تھے۔ اُس کا ایک ایک لفظ حسرت و شکایت سے لبریز تھا۔ جلی جلی سی آواز، آدمی بس سُنتا اور دیکھتا رہ جائے۔

"آپ اُس کے لیے اپن کے پاس آیا ہے؟" پیرو نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ بولتا ہے وہ آپ کا۔۔۔ آپ کا شوہر ہے۔"

اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ کپکپاتے ہونٹوں سے بولی۔ "جی، ہم اُنھی کی بات کر رہے ہیں۔"

"ابھی اپن سمجھا۔" پیرو نے گہری سانس لے کے کہا اور بدحواسی سے بولا۔ "پر۔۔۔ پر آپ جانتا ہے آپ کیا بول رہا ہے؟"

"ہم اپنے ہوش و حواس ہی میں یہاں آئے ہیں، جانتے ہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ اُن کی خوشی ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم اپنی جانب سے اگر اُن کی کوئی چارہ گری کر سکتے ہیں، انھیں کوئی سُکھ دے سکتے ہیں تو وہ یہی ہے۔ اُن کی حالت ہم سے دیکھی نہیں جاتی۔ ہم نے کیا، کسی سے بھی نہیں دیکھی جاتی۔ آپ کا اُن سے واسطہ نہیں پڑا، یہاں کسی سے بھی پوچھ لیجیے کہ وہ دل کے کتنے اچھے ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی کو دُکھ نہیں دیا، کبھی کسی سے سر اُٹھا کے، اونچے لہجے میں بات نہیں کی۔ بڑی سے بڑی ناروا بات مسکرا کے ٹال دینا اُن کی عادت رہی ہے۔ ہم آپ کو کیا بتائیں، اُن کے مزاج میں کیسی فقیری، قلندری سی ہے۔ دوسروں کے کام آنا، حویلی کے معمولی سے معمولی ملازم کا دُکھ بانٹنا، اُن کی خیر خبر رکھنا ہی اُن کا شیوہ رہا ہے۔ ہم اگر کہیں کہ شرافت اور رواداری اُن پر ختم ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ یہ ہم اُن سے اپنی خاص نسبت کی طرف داری میں نہیں کہہ رہے ہیں، حقیقت یہی ہے لیکن جب سے انھیں چپ لگی ہے، گزرا ہوا سب خواب ہو گیا ہے۔ اب وہ کسی کی طرف پلٹ کے بھی نہیں دیکھتے، کون مر رہا ہے، کون جی رہا ہے۔ کسی سے نہیں پوچھتے کہ اُس پر کیا گزرتی ہے۔ سبھی کو بھول گئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں، وہ کتنے خود دار اور غیرت مند ہیں۔ اپنی خُو کے مطابق وہ یہی کر سکتے تھے کہ اپنی آگ اپنے ہی سینے تک محدود رکھیں مگر انھیں خیال نہیں رہا کہ یہ آگ اُن کی زنجیروں سے بندھے ہوئے لوگوں تک کیسے نہیں پہنچے گی، یہ زنجیریں تو انھوں نے خود پہنائی تھیں۔ یہاں حویلی سے خوشی روٹھ گئی ہے، دن ہو گئے، روز بروز یہ ویرانی بڑھتی ہی جاتی ہے، کوئی خوش نہیں، وہ چپ ہیں تو سبھی کو چپ لگ گئی ہے، حویلی کا ہر شخص اُن کے لیے دعا کرتا ہے، کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے، کہاں جائے، کون سے در پر جا کے دستک دے، کون سی کھوہ میں اُن کی روح جا چھپی ہے۔ یہاں کتنے ایسے ہیں جو اُن کے لیے اپنی جان لُٹانے کے منتظر ہیں پر انھیں معلوم تو ہو، کہیں سے کوئی اشارہ تو ملے کہ مراد کی منزل کون سی ہے۔"

وہی بولتی رہی تھیں اور پیرو دزدیدہ نظروں سے اُسے تکتے رہے۔ اُس کے رخساروں پر آنسو لرز رہے تھے، کمرے میں ہر سو اُس کی آواز بکھری ہوئی تھی۔ دوسری لڑکی کی آنکھیں بھی بھری ہوئی تھیں، اُس کے ہونٹوں کی لرزش سب کچھ کہہ رہی تھی۔ نواب کی بیگم نے ایک لمحے توقف کیا اور اُمید بھری نگاہوں سے مجھے اور پیرو کو دیکھنے لگی۔ پیرو بُت کی طرح ساکت کھڑا رہا۔ "یہاں آپ کے پاس ایک دل شکستہ بہن اور ایک تیرہ نصیب سہاگن ہی نہیں آئی ہے۔" وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ "چھوٹے نواب صاحب ہمارے نہیں سبھی کے۔۔۔"

"ابھی بس کرو۔" پیرو نے سر جھٹک کے کہا۔ "ابھی آپ کو اور کچھ بولنے کا ضرورت نہیں ہے، اپن ابھی سب سمجھتا ہے۔ پہلے بھی جانتا تھا پر اپن۔۔۔ اپن کیا بولے۔"

"ہم آپ سے ہاتھ جوڑ کے درخواست کرتے ہیں۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "خدا کے لیے۔۔۔"

"نئیں، نئیں، ابھی ایسا مت کرو۔" پیرو نے کسی قدر ترشی سے کہا۔ "ابھی آپ ہی سوچو، اپن ادھر پنجرے میں بند اپنا خون کیوں پی رہا ہے۔"

"ہم سمجھتے ہیں، یقیناً کوئی ایسی نزاکت ہوگی جو آپ کو یہ سب کچھ سہنے پر مجبور کر رہی ہے، کوئی ایسی ہی بات، بڑی بات ہو سکتی ہے لیکن آپ یقین کیجیے، ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں، ہم آپ کی پاس داری پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ آپ سے مشورہ کیے بغیر، آپ کی اجازت لیے بغیر ہم کوئی قدم نہیں اُٹھائیں گے۔ ہم قسم کھاتے ہیں کہ یہاں کسی اور سے اِس کا تذکرہ بھی نہیں کریں گے۔ ہم خود جا کے اپنے طور پر، خانم سے درخواست کریں گے، چاہے ہمیں دُنیا کے آخری کنارے تک جانا پڑے۔ ہم خانم سے گزارش ہی کر سکتے ہیں، باقی سب کچھ اُن کی مرضی و منشا پر منحصر ہے۔ ہم پر اعتماد کیجیے، ہم انھیں کسی ناروا صورتِ حال سے دوچار کرنے کی لغزش نہیں کریں گے۔ ہمارا مقصد اُن کی زندگی میں زہر بونا نہیں ہے، ہم بھی عورت ہیں، اچھی طرح جانتے ہیں کہ گھر میں بیٹھی ہوئی ایک عورت کی عزت و آبرو کیا چیز ہوتی ہے، ہم ایک کوشش ہی کر سکتے ہیں، ہمیں اُن کے پاس جا کے

سب کچھ بیان کر دینے کا ایک موقع ضرور دیا جائے۔ ہمیں یقین ہے، خانم کا دل اتنا سخت نہیں ہوگا۔ اُن کے دل میں چھوٹے نواب کے لیے ضرور کوئی گوشہ ہوگا، کوئی دبی ہوئی چنگاری۔ وہ چاہے ہمیں دھتکار دیں یا نامراد لوٹا دیں، مگر ہمیں ایک یہ جتن بھی کر لینے دیجیے۔ آپ ہم پہ اتنا رحم نہیں کریں گے؟" وہ بَین کرتی ہوئی آواز میں بولی۔

"ابھی کم بولو بیگم صاحب!" پیرو نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "جو آپ بولتا ہے، سب ٹھیک ہے، اپنے کو اس میں کوئی کھوٹ دکھائی نہیں دیتا، اپنے کو اُس پہ پورا بھروسا ہے، پر اپن کے پاس ابھی کچھ بھی نیا نئیں ہے، وہی سب ہے جو اپن پہلے ہی اِدھر بڑے نواب اور اُس گرگٹ کا اولاد خان کو بول چکا ہے۔"

"نہیں!" وہ تقریباً چیختے ہوئے بولی۔ "ہم تو بہت اُمید، بہت آرزو لے کے۔۔۔" اُس کا چہرہ جل رہا تھا، خفقانی انداز میں کہنے لگی۔ "خدا کے لیے ہمیں مایوس مت کیجیے۔"

"آپ زیادہ بولے گا تو اپن کو دُکھ ہوگا۔" پیرو کے لہجے میں افسردگی کے ساتھ بے چارگی بھی شامل تھی۔ "اپنے کو سنبھالو بیگم صاحب!"

"ہم یہاں سے یوں نہیں جائیں گے۔" وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ کو ہم پہ، ہماری باتوں پہ اعتبار نہیں آیا؟ یا تو آپ نے توجہ سے نہیں سُنا یا پھر ہماری زبان نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ ہم آپ سے کس طرح کہیں، اپنی زبان میں کہاں سے اثر لائیں جو آپ کا پتھر پگھلا سکے۔"

"اِدھر ایسا پتھر نہیں ہے بیگم صاحب!" پیرو نے رُک رُک کے کہا۔ "اپن نے سب دھیان سے سُنا ہے، جو آپ نے نئیں بولا، اُس کو بھی سُنا ہے اور ابھی اپن بولے، اپن نے ایسا کم ہی دیکھا، کم ہی سُنا ہے، پر ابھی بچا کرو بیگم صاحب! اپن کے پاس بولنے کو کچھ اور ہوتا تو اپن اِدھر خوار نئیں ہو رہا ہوتا۔ ابھی کوئی اور حکم کرو۔"

"حکم دینے کے ہم کہاں لائق ہیں، حکم تو ہمیں دیجیے۔ بتلائیے ہم اب کیا کریں؟ ہم کہاں جائیں؟ کس در پہ جا کے فریادی ہوں؟ کس کے آگے جھولی پھیلائیں؟ خان صاحب اور بڑے نواب کی بات الگ ہے۔ بِللہ ہمیں آپ اُن کے پیمانے سے مت پرکھیے، ہم پہ احسان کیجیے، اگر آپ خانم کے پاس ہمارا جانا مناسب نہیں سمجھتے تو کوئی اور تدبیر کیجیے تاکہ ہمارا جلتا ہوا گھر بچ سکے۔ ہم خانم کے بارے میں بالکل اندھیرے میں ہیں۔ آپ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے لیے کون سی راہ موزوں ہو سکتی ہے مگر ہمیں کوئی آسرا ضرور دیجیے۔ ہم آپ سے خدا کو درمیان میں لا کے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ہر ممکن احتیاط کریں گے۔ اگر ایک بار ہمیں خانم کے پاس حاضری کی اجازت مل جائے تو ہمیں یقین ہے، ہم اُن کے در سے خالی نہیں لوٹیں گے۔ اُن کے بغیر وہ جی نہیں سکیں گے۔ انھوں نے یوں ہی گھٹ گھٹ کے اپنے آپ کو خاک کر دینے کی ٹھان لی ہے۔ خانم کا ایک اشارہ اُن کے لیے بہت ہوگا، وہی اُن کی منزل، وہی اُن کی مسیحا ہیں۔ خانم چاہیں گی تو زندگی بھر اُن کی خدمت کریں گے یا وہ ہمارے لیے جو بھی فیصلہ کریں، زبان سے ایک لفظ کہیں تو گناہ گار۔ ہمارے دل میں اُن کے لیے عزت ہے، جب وہ انھیں عزیز ہیں تو بھلا ہمیں کیوں نہ ہوں گی؟ یقیناً کچھ خوبیاں ہوں گی جو وہ انھیں یاد کرتے ہیں۔ ہماری مدد کیجیے۔" ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ کو اپنی ماں، اپنی اولاد کا واسطہ، انھیں طرح بچا لیجیے۔ ہم ایسے نہیں جائیں گے، آپ کی طرف سے کوئی تو بغیر ہم یہاں سے نہیں جائیں گے، یہیں دیواروں سے سر پھوڑ کے دیں گے۔ اِس کے سوا ہمارے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔" اُس کا لہجہ ہوگیا تھا، اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے بال نوچ لے۔ اُس کے میں ایسی شدت تھی کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے، اُسے کر گزرنے کا عزم ہے۔ اُس کی چادر سر سے ڈھلک کے شانے پر گر گئی تھی، اُسے کچھ نہیں تھا۔ پیرو کی پیشانی پہ بے شمار لکیریں کھنچ گئی تھیں۔ میرا دل بھی بھ تھا۔ پیرو کو چپ دیکھ کے اُس پر دیوانگی سی طاری ہوگئی۔ اچانک نے چادر سے اپنا دوپٹا کھینچا اور مضطربانہ آگے بڑھ کے پیرو کے پر ڈال دیا۔

پیرو دست پٹاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ "یہ۔۔۔۔۔ یہ آپ کیا" وہ بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

قریب کھڑی ہوئی لڑکی کے بُت میں پہلی مرتبہ جنبش ہو نے لپک کے اپنی بھابی کا شانہ تھام لیا مگر اُسے تو خود سہارے تھی، وہ بہت گری گری، ٹوٹی ٹوٹی سی نظر آتی تھی۔ اپنی بھابی کو لرز ہونٹوں سے سمجھاتے ہوئے وہ خود بھی سسکیاں بھرنے لگی۔ میرا دم تھا، جی کرتا تھا، یہاں سے بھاگ کے اندر کمرے میں چلا جاؤں یا خ کے بارے میں سب کچھ بتادوں۔ میں کچھ کہنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ تھمی ہوئی آواز گونجی۔ "ابھی حوصلہ رکھو بیگم صاحب!" دوسرے لمحے پیرو پلٹ کے سائبان میں پڑے ہوئے مونڈھوں کی طرف کی دیکھا دیکھی میں نے بھی جلدی سے ایک مونڈھا اُٹھایا۔ ہم نے قریب مونڈھے رکھ دیے۔ "ابھی سنبھل کے آرام سے بیٹھو۔" پیرو نے نرمی سے کہا۔ "تسلی رکھو بیگم صاحب!"

پیرو کو اُن سے بیٹھنے کے لیے دوبارہ کہنا پڑا مگر جب ہم خود نہیں بیٹھ گئے، وہ کھڑی رہیں۔ بیگم کی سانس اُکھڑی ہوئی دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری تھا۔ انھیں کھڑے اتنی دیر ہوگئی تھی، ہمیں پہلے ہی اُن سے بیٹھنے کو کہنا تھا۔ مونڈھے پر کمر ٹکا کے مجھے کسی قدر سکون ملا تھا۔ اُن کے چہر چھائے ہوئے ہیجان میں بھی کچھ کمی ہوئی تھی مگر ہیجان کی جگہ یاسیت لی تھی۔ دونوں کا جھکا ہوا سر اُس وقت اُٹھا جب پیرو نے کہا۔

"اپن کا بات سنو۔" اُس کی آواز ڈوبی ہوئی تھی۔ "آپ کو دیکھ اپنے کو ابھی ایک آدمی کا یاد آتا ہے، اُس کا دل بھی ایک دم شیشہ نازک تھا، سمندر کے ماف سارا دُنیا اُس میں ڈوب جائے اور پتہ نہ وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ایسا ہی کانچ کا بنا ہوا۔ اپن کو ابھی خیال ہے، پیچھے اپن نے آپ کو الٹا سیدھا بول دیا تھا۔ ابھی ہو سکے تو کو بھلا دو، اپنے کو سپنے میں بھی ایسا خیال نئیں آسکتا تھا کہ آپ قیدین کے پاس آجائے گا۔ اِدھر آپ کا آنا ہی اپنے لیے سب ک رہا ہے، نواب کا حالت ایسا ہی ہوگا جو آپ کو پہلے سے لے آیا۔ اپنے من سے یہ شبہ ابھی نکال دو کہ اپن نے ایک کان سے کے دوسرے کان سے اُڑا دیا ہے۔ اپن نے سب بات سینہ ہی سے ہے کیونکہ آپ نے بھی اُسی سے سب بولا ہے۔ اپنے کو ایک دم انکار ہے، نواب سے اپنا کوئی دشمنائی نئیں ہے، اُس نے اپنا کچھ مار کے نئیں رکھ لیا ہے۔ ابھی ایسا کچھ ہو جاتا ہے۔ آدمی کو کوئی آدمی ایسا تماشا بنا دیتا ہے، کتنا لوگ ہے جو ایک دوسرے سے دُور ہو گیا ہے۔ ایک دوسرے کو کھوجتا پھرتا ہے۔ آدھا آدھا آدمی، کوئی اِدھر، کوئی پار، پر دیوار ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے، دونوں ادھورا رہتا ہے، یہ چکر ابھی تھوڑا بہت سمجھتا ہے۔" پیرو نے اچٹتی نظر سے میری دیکھا اور گہری سانس لے کے بولا۔ "وہ لوگ اُن لوگوں سے ابھی اچھا ہے جن کو کسی کا ملنے کا کوئی اُمید بندھا ہے، پر جن سے جو کے لیے روٹھ گیا ہے، واپس کبھی نئیں آنے کا، ابھی اُن کے بارے کیا بولے گا؟" پیرو کی آواز جھنجھنانے لگی تھی۔ "اپن کا مطلب ہے۔" چونک سا گیا اور سیدھا ہو کے بولا۔ "اپن ابھی اتنا خوب جانتا ہے ن سے جو ہو سکا ضرور کرے گا، آپ نے جس رشتے کا بول کے اپن کو دیا ہے، اپن اُس کا بھرم رکھنے کا کوشش کرے گا، پر پہلے اپن سے نکلنا ضروری ہے تبھی کوئی بات بن سکتا ہے۔"

"مگر یہ۔۔۔ یہ ہمارے بس میں۔۔۔" وہ منتشر لہجے میں بولی۔

"جس اعتبار کی بات آپ کرتا ہے، اِس ٹیم اپن کو اُس کا آپ زیادہ ضرورت ہے۔" پیرو نے تیزی سے کہا۔

"اگر یہ ہمارے لیے ممکن ہوتا تو آپ سے منت کرنے سے پہلے ہم کرتے، بخدا ہمیں ایسا کوئی شبہ نہیں ہے کہ باہر جا کے آپ زبان پھر جائیں گے، ہمیں آپ کے قول پر مکمل بھروسا ہے، یہ اندیشہ اُن کو ہو سکتا ہے جنھوں نے آپ کو یہاں محصور کر رکھا ہے۔ ہم کھلے سے یہاں آئے ہیں، نہ کسی شرط کے اہل ہیں، نہ اسے مناسب سمجھتے کسی سے کچھ طلب کرنے کے یہ انداز نہیں ہوتے۔ ہماری معذوری شرط وغیرہ سے وابستہ مت سمجھیے۔ ہم تو اتنے بے بس ہیں کہ لوگوں ل بھی نہیں کر سکتے، بجائے یہ کہ اُن سے یہ دروازے کھولنے اور پہرے ہٹانے کے لیے کہہ سکیں۔"

"تو آپ اُس وقت کا انتظار کرو بیگم صاحب جب بڑے نواب کا آنکھ کھل جائے اور اُس کا ماتھا ٹھکانے پر آجائے۔ اُس کو جا کے بولو، اپن اِدھر ہی مر جائے گا، اپن کا سر بہت پہلے سے گروی رکھا ہوا ہے، ہم اِس طرح کچھ نئیں بتائے گا، وہ اپن کو نئیں جانتا، خود اپنے لیے کانٹے بو رہا ہے۔ کبھی نہ کبھی اپنا آدمی اِدھر اپنا بو سونگھتا ہوا ضرور آجائے گا اور اپن بولتا ہے، پھر بہت بُرا ہوگا، وہ لوگ حساب ہمیشہ صاف رکھتا ہے۔"

"یہ سب کچھ ہمیں جتانے سے کیا حاصل؟ یہ حویلی جل رہی ہے، اِس کے بعد اور کیا ہو سکتا ہے۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "ہمارے لیے تو ہم سے سب کچھ دُور ہی ہوتا جا رہا ہے۔ نہ معلوم کیوں ہمیں کچھ ایسا گمان ہوتا ہے کہ آپ کو کوئی ضد سی ہوگئی ہے۔ اگر واقعی ہمارا قیاس درست ہے تو ایک شخص کی زندگی کی خاطر آپ کو یہ ضد ترک کر دینی چاہیے۔ کچھ لوگ پاگل ہوگئے ہیں تو اُن کی سزا ایک آدمی کی زندگی نہیں ہو سکتی، ہم یہی سوچ کے آئے تھے کہ آپ کو سارا حال بتا دیں، کہیں بڑے نواب صاحب کے یہ باتیں آپ تک منتقل کرنے میں کوئی چوک ہوگئی ہو۔ یہاں آنے کے لیے ہمیں کیسی کیسی دیواریں عبور کرنی پڑی ہیں، ہمی جانتے ہیں۔ کئی دن سے لالچے باندھے ہوئے تھے۔ بڑے نواب صاحب آج دربار کی کسی تقریب میں گئے ہوئے ہیں، اسی باعث یہاں تک رسائی حاصل کرنا ممکن ہو سکا۔"

"ضد کا بات نئیں بیگم صاحب! ضد کس بات کا؟ اِدھر مار کھانے، اپنا خون جلانے اور کتا بننے کا ضد؟" پیرو نے درشتی سے کہا۔ "بڑے نواب کیا سمجھ کے۔۔۔"

اِس سے پہلے کہ پیرو کچھ کہتا، وہ گڑگڑا کے بولی۔ "اُن کی بات جانے دیجیے۔ نہ جانے انھیں کیا ہو گیا ہے، اِس ظلم کا اُن کے پاس کیا جواز ہے، کیا سوچ کے انھوں نے یہ غیر انسانی، غیر اخلاقی رویّہ اختیار کیا ہے، یہ انھی کی سوچ کی بات ہے۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ چھوٹے بھائی کی محبت نے اُن کے قلب و ذہن بُری طرح متاثر کیے ہیں، خانم کی تلاش میں انھوں نے اور اُن کے فرستادوں نے کوچے کوچے کی خاک چھانی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب اتنے عرصے بعد کہیں سے انھیں آپ کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ اپنے حواس میں نہیں رہے۔ ہم آپ سے کہتے ہیں کہ اُن کی دیوانگی، بھائی کی طرف سے مسلسل مایوسی کے سبب ہی سے ہے۔ ضد اُن کے مزاج میں شروع سے ہے، وراثت میں ملی ہے۔ دوسرے بھائی کی بھی یہ ضد ہی ہے جو انھوں نے خود پر طاری کر رکھی ہے۔ بڑے نواب صاحب نے آپ کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ لوگ اتنے بڑے حوصلے اور بات کے دھنی ہو سکتے ہیں۔ اب وہ ایک غلطی کے بعد اُس پہ اصرار کر کے دوسری

بڑی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ممکن ہے کل انھیں اِس کا احساس ہو جائے اور کل وہ آپ سے معذرت کر کے عزت کے ساتھ آپ کو رخصت کر دیں لیکن سرِدست یہ ہماری خوش اندیشی ہی ہے تا وقتیکہ خدا انھیں کسی ایسی نیکی کی توفیق عطا فرمادے۔ وہ کل نہ جانے کب آئے، دس گیارہ دن گزر چکے ہیں، ادھر ہم سے ایک پل نہیں کاٹا جاتا، جو وقت گزر رہا ہے، وہ ہمیں اندھیروں کی طرف لیے جا رہا ہے، ہم اِس بھروسے میں مزید انتظار کے متحمل نہیں ہو سکتے کہ کل بڑے نواب صاحب کا جنون دھیما پڑ جائے گا۔ بس یہی کچھ آپ کے گوش گزار کرنا تھا، ہر طرف سے مایوسی کے بعد اب ایک آپ ہی ہمارا آسرا رہ گئے ہیں۔ معلوم نہیں خدا کی کیا مصلحت ہے کہ اُس نے ایسے وقت میں جب سب کچھ بکھرا جا رہا ہے، خانم کے متعلق کچھ جاننے والوں کو ہماری طرف بھیج دیا ہے۔ شاید اُسے ہم عاجزوں کی کوئی اور آزمائش مقصود ہے۔" وہ سسکتے ہوئے بولی۔ "ہمیں ہر قیمت پر اُن کی سلامتی چاہیے، جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے، اُس کی قیمت پر، اپنی قیمت پر۔ خانم ہی نہیں، ہم خود کو ہر اُس شخص کی غلامی میں دینے کے لیے آمادہ ہیں جو انھیں قرار دے سکے، اُن کے سوا ہماری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ ہمیں بس... بس اتنا ہی کہنا تھا۔"

"ابھی آپ اور کیا بولے گا؟" پیرو نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابھی تو ہی اِن کو کچھ سمجھا رہا! یہ کیا دوسرے کا سوچے بنا بولتا ہے، کیسا کیسا پتھر پھینکتا ہے، تیرا زبان شاید اُن کی سمجھ میں آجائے کہ اپن کو ابھی کس بات کا خوف، کس کا پاس ہے۔ اِن کو بول، اپن بھی گھر گرہستی والا آدمی ہے اور باہر بولے جھنے والا ابھی کچھ کم نہیں ہے۔ ماؤدر کون گلی گلی اپن کے لیے سر پھوڑتا ہوگا، اپن کو کیدر جانا تھا، کیدر آگیا ہے، گھر سے کتنے دور ہے، ابھی کون رنڈا، کون شور مچاتا ہوگا۔ کس کو چمڑی بچانا اچھا لگتا ہے، ابھی تو ہی اِن کو کچھ بول۔"

"میں کیا کہوں واحا!" میں نے بدحواسی سے کہا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ تم نے سب کچھ تو کہہ دیا ہے۔"

"اِن کو بول دے، ابھی اپن کو ایدر سے نکالنے کا کوئی کوشش کرے۔" پیرو بھن بھناتی آواز میں بولا۔ "اپن سیدھا خانم کے پاس جائے گا۔"

"ہم مجبور ہیں۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "یہاں آنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ پہرے دار ہمارے ساتھ کوئی اور سلوک بھی کر دیں گے۔ جانے کتنی منتیں کر کے ہم نے اُن سے یہاں تک آنے کی اجازت حاصل کی ہے۔ ہمیں اُن سے آگے کسی رعایت کی اُمید نہیں ہے۔ یہاں بڑے نواب کا حکم اوّل و آخر ہے، سب کچھ انھی کے حکم سے ہوتا ہے۔ اُن کے نمک خوار اپنے آقا کے ساتھ اپنی دانست میں اتنی بڑی دغا نہیں کریں گے۔"

"پیسا تو اُن کا چھوٹا نواب بھی ہے۔"

"لیکن ہم کس کس کو یہ سمجھاتے پھریں گے کہ اُن کی اس ز[illegible] اس حویلی کا مفاد ہی وابستہ ہے۔ یہاں سے بڑے دروازے تک میں طرح طرح کے لوگ موجود ہیں، ہم کس کس کو قائل کریں وہ اپنے سر ہمیں دے دیں؟ ہمیں معلوم ہے، بڑے نواب آ[illegible] کو گولی مار دیں گے۔"

"پھر کچھ اور سوچو بیگم صاحب! اپن کو ایدر سے نکالنے کی ترکیب کرو، بس یہی ایک راستہ ہے۔"

"یہ مطالبہ کر کے آپ ہمیں ہماری ناتوانی کا احساس کر[illegible] ہیں، ہم نے پہلے ہی اس سلسلے میں بہت سوچا ہے لیکن [illegible] کچھ کام نہیں کرتا، یہ ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ یقین کیجیے سچ کہہ رہے ہیں۔ ہماری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔"

"اپن جانتا ہے، آپ ایک دم سچ بول رہا ہے پر یہ[illegible] صورت ہے کہ اپن جلد سے جلد ایدر سے نکل جائے۔"

"آپ کے کہنے پر ہم پھر کوشش کریں گے۔" وہ شکن[illegible] بولی۔ "لیکن اپنی سرخ روئی کا کوئی امکان ہمیں نظر نہیں [illegible] اگر ہم واقعی ناکام رہے تو کیا، کیا....."

"ہاں بیگم صاحب!" پیرو نے نظریں چراتے اور لفظ چ[illegible] کہا۔ "اپن کو بھی مجبور سمجھو، اتنا سب جان کے اپن کے دل کے لیے بڑا مان ہے۔ ابھی اپن کا بات مانو، گھر لوٹ جاؤ، را[illegible] ہو گیا ہے، بڑے نواب کے آنے سے پہلے آپ کو چلا جانا۔ ابھی اُس کے پاس جا کے اور یہ دوپٹا اُس کے پیروں پر ڈال کہ وہ تمھارا بات دھیان سے سُن لے، اُس سے بولو، اپ[illegible] سے کچھ نہیں بولے گا، سیدھا ایدر سے چلا جائے گا، جو ہو گیا اتنا ہی ٹھیک ہے، ایدر ابھی اپنا بہن بیٹی رہتا ہے۔ اُس [illegible] موئے ایدر کیا لفڑا کرے گا؟"

"وہ اپنے سوا کسی کی نہیں سنتے، ہم وہاں گئے تو اُ[illegible] اور جوا دیں گے۔"

"پھر اُوپر والے سے دعا کرو، ابھی وہی کچھ اُلٹ پھیر کر[illegible]"

"مگر آپ..... آپ ہمیں خانم کے پاس کیوں نہیں [illegible] ہم زبان دے رہے ہیں، ہم یہاں کسی سے نہیں کہیں گے [illegible]"

"آپ کیسا بولتا ہے۔" پیرو نے ترشی سے کہا۔ "ابھی [illegible] خانم کے پاس اکیلا کیسے جائے گا؟"

"کسی طرح بھی جائیں، کسی کو خبر نہیں ہونے دیں گے"

"اور اگر اُدر خانم نے منع بول دیا تو؟"

"ہمیں یقین ہے، ہم انھیں منا کے ہی لوٹیں گے"

"اگر خانم تیار نہیں ہوا؟"

"تو، تو.... مگر ایسا نہیں ہوگا۔" وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولی۔

"پھر ہم اپنے مقدر پر صبر و شکر کر لیں گے۔"

"اور ایدر، پھر ایدر اپن کا کیا بنے گا"

"آپ، آپ!" چند لمحوں کے لیے وہ تذبذب میں پڑ گئی پھر بے تابی سے بولی۔ "آپ تو ویسے بھی یہاں ہیں، خانم کے انکار سے آپ پر کیا فرق پڑے گا کیونکہ یہ سب کچھ تو ہمی تک محدود رہے گا۔ آپ کی آزادی کا دار و مدار بڑے نواب صاحب کی مرضی و منشا پر ہے اور اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، جیسا کہ ہمارا دل کہتا ہے تو بڑے نواب صاحب پھر کیا حجت کریں گے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟" اُس کی آواز یکایک چمکنے لگی جیسے کسی ڈوبتے ہوئے کو کنارہ نظر آجائے یا گھپ اندھیرے میں کہیں سے روشنی کی کرن پھوٹ پڑے۔ "ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی اجازت سے ہم اپنے طور پر ایک کوشش کرتے ہیں، خانم کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں، انھوں نے ہماری التجا سن لی اور وہ آگئیں تو سب خود بخود ٹھیک ہو جائے گا اور خدانخواستہ ہم، ہم ناکام ہو گئے تو اس سے آپ کی قید و بندکی مدت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، وہ تو اُتنی ہی رہے گی جتنا بڑے نواب کا حوصلہ ہے۔"

"آپ ٹھیک ہی بولتا ہے۔" پیرو نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "پر اپن کیسے خانم کا پتہ دے سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں، بشرطیکہ آپ کو ہم پر....."

"اپن بول دیا ہے، ابھی ایسا کوئی بَل اپنے من میں نئیں ہے۔" پیرو کے لہجے میں آزردگی کے ساتھ تندی بھی تھی۔ "اپن ایسے کچھ نئیں بول سکتا۔"

"یقیناً وہی بات ہو سکتی ہے۔ خانم کی موجودہ زندگی میں کوئی رخنہ پڑنے کا اندیشہ ہی آپ کے لیے رکاوٹ بنا ہوا ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لو۔"

"مگر... مگر ہم آپ سے کوئی وعدہ کر رہے ہیں۔"

"اِس سے زیادہ تکرار مت کرو بیگم صاحب!" پیرو نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ "لگتا ہے یا تو ایدر اپنا ہی ماتھا گھوم گیا ہے یا، یا آپ ابھی سوچنا سمجھنا بھول گیا ہے۔"

اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اُس نے پھر کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے لیکن پیرو کا چہرہ دیکھ کے اُس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ انھیں اب اُٹھ جانا چاہیے تھا، دونوں وہیں بیٹھی رہیں اور کچھ بولیں بھی نہیں، اِس سکوت سے تو اُن کا بولتے رہنا ہی بہتر تھا، کمرے میں جیسے ہوا بند ہو گئی تھی اور دھواں سا اُمڈنے لگا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن اُن کی وحشت اور ویرانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ہم انھیں یوں چھوڑ کے کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے۔ انھیں یہ احساس تک نہیں رہا تھا کہ رات گزرتی جا رہی ہے۔ نواب رات بھر کے لیے نہیں گیا ہوگا، یہاں آنے کے بعد اگر اُسے کسی طرح خبر ہو گئی تو وہ سب کو ختم کر دے گا، دیر ہو جانے پر پہرے دار بھی اندر آ سکتے تھے۔ وہ دروازے پر مستعد کھڑے ہوں گے۔ میرا خیال تھا کہ نواب کی بہن اپنی حرماں نصیب بھابی کو سمجھا لے گی کہ انھیں اب اُٹھ جانا چاہیے، پتھروں کے سامنے داد و فریاد سے کیا حاصل مگر وہ بھی اُسی کے مانند بے حس و حرکت بیٹھی رہی، ضرور انھوں نے یہی ٹھان لی تھی کہ وہ یوں واپس نہیں جائیں گی۔

پیرو کے کندھے جھکے ہوئے تھے، وہ کچھ بیمار بیمار نظر آ رہا تھا، اُس کی پوری زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا ہوگا کہ دو اجنبی عورتیں کسی حویلی کی پردہ نشیں عورتیں یوں اچانک سامنے آ کے کھڑی ہو جائیں اور آہ و بکا کرنے لگیں، میری طرح اُس کا جی بھی یہی چاہ رہا ہوگا کہ وہ انھیں سب کچھ بتا دے، کسی طور تو اُن کا گریہ تھمے۔ انھیں کس طرح یقین دلایا جائے کہ اُن کے کہے ہوئے پر شبہ نہیں ہے، وہ سچ ہی کہہ رہی ہیں، ایسی جلن اور کاٹ سچ ہی میں ہوتی ہے، وہ جھوٹ بول بھی نہیں سکتیں، وہ اپنے قماش و خدّ و خال، رنگ اور وضع قطع میں پھولوں کی طرح نرم و نازک ہیں، انھیں جھوٹ بولنا آتا تو اُن کے چہروں پہ شاید یہ پاکیزگی اور اُن کی آواز میں ایسی معصومیت، سادگی اور بے باکی نہ ہوتی۔ وہ کسی سے یوں بھی کچھ مانگیں تو انکار کرتے نہ بنے، اُن سے تو اُونچی آواز میں بات کرتے ہوئے لوگ ڈرتے ہوں گے کہ انھیں گراں نہ گزرے، اُن کی ایک جھلک دیکھنے، اُن کی زبان سے کوئی حکم سننے اور اُن کی نگاہ کے ایک اشارے کے لوگ منتظر رہتے ہوں گے اور وہ یہاں بھکارنوں کی طرح جھولی پھیلائے بیٹھی تھیں۔ نواب عالم تاب میں کوئی ایسی ہی بات ہو گی جو اُس کی دل وہی انھیں اتنی عزیز تھی۔

میں نے اسٹیشن پر اُسے دیکھا تھا، وہ ایک وجیہہ اور خوش پوش آدمی تھا۔ خوش طبع اور حسّاس بھی معلوم ہوتا تھا مگر وہ چند لمحوں کی ملاقات تھی، اُس میں کسی کے بارے میں کیا جانا جا سکتا تھا، آدمی کے اَن گنت پرت ہوتے ہیں، ظاہر میں تو صرف ایک ہی پرت نظر آتا ہے، میں نے دیکھا تھا کہ خانم کا انکار سن کے اُس کے چہرے پر ربت سی اُڑنے لگی تھی، میں سمجھا تھا، پیٹرسن بھی یہی سمجھا ہوگا کہ چند دنوں میں دیگر نوابوں کی طرح وہ بھی سب کچھ بھول جائے گا، یہ تو خانم ہی جان سکتی تھی کہ نواب کی نظروں میں اُس کا درجہ کیا تھا مگر خانم کو بھی اتنا اندازہ نہیں ہوگا جبھی وہ اُسے چھوڑ کے چلی گئی یا پھر جہاں گیر کی وجہ سے اُس نے ایسا ستم کیا، جہاں گیر کے بغیر وہ کہیں بھی نہیں رہ

سکتی تھی، نواب سے اقرار کرنے کی صورت میں جہاں گیر اُس سے جُدا ہو جاتا تھا، اپنے رتبے کے لیے نواب کیا، وہ دُنیا ترک کر سکتی تھی۔ خانم کے طور طریق سے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ حیدرآباد سے آنے پر ملول گزرتی ہے، اُس نے ستار کو بھی ہاتھ لگانا چھوڑ دیا تھا۔ حویلی میں وہ اتنی جلدی گھل مل گئی تھی جیسے ہمیشہ سے وہیں رہتی ہو۔ جہاں گیر کے ساتھ اُسے زریں بھی مل گئی تھی، دونوں ذرا کہیں اوجھل ہو جاتے تو وہ بے تاب ہو جاتی۔ خانم کے دل میں کوئی غبار چھپا ہوا ہوتا تو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی پر ضرور ظاہر ہوتا۔ نواب عالم تاب کو سمجھنے میں یا تو اُسے دھوکا ہوا تھا یا پھر خانم کے جانے کے بعد نواب کو اُس کے کھو دینے کا احساس ہوا ہو گیا تھا، بچھڑنے کے بعد ہی کسی کا پتہ چلتا ہے، پھر جو کچھ بھی تھا کسی سبب کے بغیر نہیں تھا۔ یہ ایک نواب کی محض ضد نہیں ہو گی کہ دولت و حشمت کے باوجود وہ ایک شخص سے محروم ہو چکا ہے، یہ کچھ اور بھی ہو گا۔ یہ بس کوئی آندھی ہے، ایک آگ سی ہے جو خود بخود جل اُٹھتی ہے اور آدمی کا سارا وجود لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ نواب کی بہن اور بیگم کو کیا معلوم تھا کہ جو کچھ اُنھوں نے کہا ہے، اُس کے معانی سے وہ خود اتنی آشنا نہیں ہیں جتنا سُننے والے ہیں، وہ کن لوگوں کو یہ سب کچھ بتا رہی ہیں جنھیں خاک چھانتے ہوئے برسوں گزر گئے ہیں۔ خانم کو حیدرآباد سے گئے دن ہی کتنے ہوئے تھے اور وہ نواب سے اُس طرح جُدا نہیں ہوئی تھی جس طرح دوسروں سے کوئی بچھڑ گیا تھا۔

وہ وہاں سے نہیں اُٹھیں، اُن کے رخساروں پہ زردی کھنڈی ہوئی تھی، پھول جیسے چہرے کمھلا گئے تھے۔ پرویز سر جھکائے بیٹھا شاید خود سے نبرد آزما تھا، کمرے پر بظاہر سکوت چھایا ہوا تھا مگر گر جتا، بین کرتا ہوا سکوت، دیر ہو گئی، وہ وہیں نیم جاں، ناتواں بیٹھی رہیں۔ آخر پرویز نے اُنھیں سمجھانے کے لیے جھجکتے ہوئے دوبارہ زبان کھولی۔ چھیڑنے کی دیر تھی، بیگم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی، پرویز نے ہونٹ بھینچ لیے اور بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ دوسری کی آنکھیں بھی پھر آنے لگی تھیں، آنسوؤں کے سوا اُن کے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اُن کی آہ وزاری سے میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا، سارا جسم جیسے رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ مجھ سے چپ نہ رہا گیا، میں نے کہا۔ "بیگم صاحبہ! آپ کچھ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔" میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ "آپ ہمیں اتنا پشیمان نہ کیجیے۔" میں پہلی مرتبہ اُن سے مخاطب ہوا تھا، میری آواز پر اُن کی مضطرب نظریں مجھی پر مرکوز ہو گئیں، اُنھیں میرے لہجے پر حیرت سی ہوئی تھی اور ایک لمحے کے لیے اُن کے سراپا متزلزل ہو گئے تھے۔ میں نے تیز سانسوں سے کہا۔ "خانم اب کسی گھر میں رہتی ہیں، کسی چار دیواری میں۔ یہاں سے بہت دُور، ایسی ہی کسی حویلی میں، بازار کی آزادی سے گھر کے کسی زنداں میں مقید ہونے کا فیصلہ اُن کا اپنا تھا، کوئی اُنھیں

فریب دے یا ورغلا کے نہیں لے گیا۔ وہ بازار کی زندگی ترک کرنے کے لیے نہ جانے کب سے کسی سہارے کی منتظر تھیں کہ ہم لوگ اُن کے سامنے آ گئے۔ ہم اُن کی محفل میں نہیں گئے تھے، کوئی اور ہی بات ہمیں اُن کے قریب لے گئی تھی اور اُنھوں نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ ہمارے ساتھ چلی جائیں۔ اب وہ ایک بھرے پُرے گھر میں رہتی ہیں جہاں سب اُن کی عزت کرتے ہیں کیونکہ اُنھوں نے خود کو اس عزت اور محبت کا مستحق ثابت کیا ہے۔ جس وقت وہ ہمارے ساتھ اس شہر کو خیرباد کہہ کے جا رہی تھیں، نواب صاحب اسٹیشن آئے تھے۔ میں وہاں موجود تھا، اُس وقت مجھے تھوڑا بہت اندازہ ہوا تھا کہ نواب صاحب کو خانم سے کس قدر وابستگی ہو سکتی ہے حالانکہ نواب صاحب کے آنے کا انداز نوابوں جیسا ہی تھا، لاؤ لشکر کے ساتھ آئے تھے، صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ طے کر کے آئے ہیں لیکن خانم نے بھی کوئی عزم کر رکھا تھا اور وہ جن لوگوں کے ساتھ جا رہی تھیں، وہ بھی کسی کا ہاتھ تھام کے چھوڑنا نہیں جانتے تھے۔ فیصلہ خانم پر آ کے ٹھیرا تھا اور خانم نے نواب صاحب سے معذرت کر لی تھی۔ نواب صاحب نے ظرف کا ثبوت دیا اور ہوش مندی کا بھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ راستے سے ہٹ گئے۔ اُن کا یہ وہم دُور ہو گیا تھا کہ ہم خانم کو بہ جبر کہیں لے جا رہے ہیں۔ اتنی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے مگر یہ ہے کہ آپ کو پوری بات معلوم ہو جائے۔ شاید آپ کو احساس ہو، بازار اور گھر میں کیا فرق ہوتا ہے۔ خانم کسی گھر سے بازار میں نہیں گئی تھیں، اب وہ بہت پُرسکون اور مطمئن نظر آتی ہیں۔ ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی یہ نئی دُنیا دل و جان سے قبول کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ برسوں سے اُس حویلی میں آباد ہوں، وہیں پیدا ہوئی ہوں۔ جو لوگ اُنھیں لے گئے تھے، وہ ایک طرح سے اُن کے ضامن بھی ہیں اور سرپرست بھی۔ اُن پر اُن کی پاسبانی کا فرض عائد ہوتا ہے، جب تک وہ بازار میں تھیں، کوئی اُن کی عزت کا نگہ دار نہیں تھا اور وہاں اِس کی ضرورت بھی نہیں تھی لیکن اب وہ ایک گھر میں ہیں، کسی گھر کی آبرو ہیں۔"

"ہم.... ہم اِس سے منکر نہیں ہیں، ہم تو...." وہ جھجکتی آواز میں بولی۔ "ہم تو...."

"پہلے مجھے کہنے دیجیے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "آپ وہی کہنا چاہتی ہوں گی جس کا اظہار آپ نے پہلے بھی کیا ہے، یہی کہ خانم بازار میں واپس نہیں آ رہی ہیں، یہاں بزم آرائی کے لیے نہیں۔ اس مرتبہ اُن کا درجہ دوسرا ہو گا، پہلے وہ نواب صاحب کی خاص محفلوں تک محدود تھیں، اب وہ اِس معزز خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے گھر میں قدم رکھیں گی۔ اُنھیں وہ رتبہ دیا جائے گا جس پر کوئی بھی عورت فخر کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ضروری ہوا تو نواب صاحب اور...

کی دل جوئی، خوشنودی اور یکسوئی کے لیے آپ بھی درمیان سے ہٹ جائیں گی، یہی کچھ آپ کی مراد ہے نا؟"

"ہاں ہاں۔" وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "یہی ہم نے...."

"ہمیں یقین ہے کہ آپ نے سب کچھ عقل و ہوش ہی میں کیا ہے، یہی کچھ آپ کے بس میں ہے، کسی کے لیے یہی کیا جا سکتا ہے اور جب آپ ہم اجنبیوں کے پاس آ سکتی ہیں تو نواب صاحب کے سُکھ چین کے لیے بہت دُور تک بھی جا سکتی ہیں۔ آپ کی نیت اور ارادے پر ہمیں نہ کوئی شبہ ہے، نہ اعتراض۔ نہ یہ دیوانگی ہے نہ مبالغہ۔ نواب صاحب کو آپ ہم سے بہتر جانتی ہیں، اس حویلی کے دوسرے نگہبان اور نواب ہونے کے علاوہ بھی اُن کی ذات میں یقیناً کچھ غیر معمولی صفات ہوں گی جو یہاں سبھی اُن کے لیے بے چین ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ صرف شوہر بیوی کا تعلق نہیں، اُن سے آپ کا رشتہ اِس سے سوا ہے اور اُن کی حالت اتنی ہی پریشان کُن ہو گی کہ آپ کے پاس اور کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں، آپ کے ذہن میں یہی بے اطمینانی ہے کہ ہم نے یہ اذیت ناک حقیقت پوری طرح محسوس نہیں کی ہے جس سے آپ دوچار ہیں یا دوسرے لفظوں میں ہم نے نواب صاحب کی موجودہ حالت اعتنا کے لائق نہیں سمجھی ہے، اُسے اُس توجہ اور ہمدردی سے نہیں دیکھا ہے جو اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو انسان ہونے کے ناتے ہم پر واجب ہے۔ ایسی بات نہیں ہے، بے شک کسی کو کسی کی جُدائی اور محرومی کا اتنا ہی شدید قلق ہو سکتا ہے جو نواب صاحب کو ہے جس سے اُن کا یہ حال ہو گیا ہے۔ آپ تو گیارہ دن بعد آئی ہیں، ہم گیارہ دن سے اس جہنم میں جانے کس گناہ کا عذاب بھگت رہے ہیں۔ نواب صاحب کی یہ کیفیت ہم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے، نہ ہم نے اس حویلی کے مکینوں کا کبھی کچھ بگاڑا ہے، نہ اُنھوں نے ہمارا۔ پھر کوئی اتنی ہی بڑی بات ہو سکتی ہے کہ بڑے نواب ہمیں یہاں مجرموں کی طرح زنداں میں ڈال دینے پر مجبور ہو گئے۔ اُن کے پاس اُن کی دانست میں یہ ناخوش گوار قدم اُٹھانے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ یہ حقیقت ایسی نہیں ہے جو آسانی سے نہ سمجھی جا سکے، جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ وہ اپنے بھائی کے صدمے سے اپنے حواس کھو چکے ہیں مگر اُن کے اِس جنون کا ہدف آپ نہیں، ہم ہیں۔ بیدوں کے نیل ہمارے جسم پر پڑے ہیں، اصطبل کی کوٹھری اور اندھیرے تہہ خانے میں ہمیں رکھا گیا تھا، ہر طرف سے بندوقیں ہم پر تنی ہوئی ہیں۔ ہم سے زیادہ اور کسے نواب عالم تاب کے حال سے آگہی ہو گی۔ بڑے نواب نے ہمیں جانوروں کی طرح برتا ہے جیسے ہم اُن کے زرخرید غلام ہوں، اُنھیں کسی قانون، اخلاق کا پاس نہیں رہا ہے، کوئی احساس نہیں کہ ہمارے اس طرح روپوش ہو جانے سے اور کتنے لوگ متاثر ہوں گے۔ ہم آپ کو بتائیں کہ یہاں ہم اکیلے

نہیں آئے تھے، کوئی اور بھی ہمارے ساتھ تھا، کچھ اور لوگ۔ یہ شہر ہمارے لیے بھی اجنبی ہے، اُن کے لیے بھی، اُن سے ہم بس رات کو دیر سے آنے کا کہہ کے نکلے تھے، اب پورے گیارہ دن گزر چکے ہیں۔ دوسروں کی وابستگیاں بھی اتنی شدید ہو سکتی ہیں، راہ تکتے تکتے اُن کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں گی۔ وہ بھی ایسے بدحواس اور دیوانے ہو سکتے ہیں کہ کچھ کر گزریں۔ ہم آپ کو کیا کیا بتائیں کہ کن حالات میں ہم یہاں آئے تھے۔ ہمیں کہاں جانا تھا، کن لوگوں کے پاس، جنھیں کھوئے ہوئے برس ہو چکے ہیں، ایک زمانے بعد اب کہیں اُن کے چہرے دیکھنے کی اُمید بندھی تھی۔ ایک بوڑھا کن کن منزلوں سے گزر کے ایک مدت بعد اپنے گھر واپس جا رہا تھا، یہ حادثہ اُسے...." میری آواز بھرّانے لگی، ابّا جان کا اشک بار چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ "بڑے نواب نے ہمیں کو قید نہیں کیا، ہمارے رونے والوں کو بھی کہیں کا نہ رکھا۔ یہ کیسا زنداں ہے جس کی کوئی تاریخ، کوئی مدت مقرر نہیں ہے۔ زندانِ نگر لوحِ اتنی اجازت بھی نہیں کہ بلبر بھٹکتے ہوئے اپنے عزیزوں کو مطلع کر سکیں۔ آدمی مر جائے تو چین آ جاتا ہے لیکن اِس طرح اچانک گم ہو جائے اور کوئی سراغ نہ ملتا ہو تو...."

میرا گلا بیٹھنے لگا تھا، میں نے سانس لینے کے لیے توقف کیا۔ اُن دونوں کی نظریں مجھی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ پہلی بار نواب کی بہن نے کچھ کہنا چاہا مگر اپنی بھابی کو دیکھ کے وہ بے تابی سے پہلو بدل کے رہ گئی۔

"میں آپ سے یہی کہنا چاہتا ہوں، کیا اتنا کافی نہیں ہے۔" میں نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اِس کے باوجود آپ کو شکوہ ہے کہ ہم نے آپ کی باتوں پر غور نہیں کیا یا ہمیں چھوٹے نواب پر گزرنے والے وقت کی شدت کا احساس نہیں۔ آپ کے آنے سے پہلے بھی ہم خوب جانتے تھے۔ بڑے نواب نے اچھی طرح یہ سب کچھ ہمیں باور کرا دیا تھا مگر ہمارے پاس کرنے اور کہنے کو کچھ ہوتا تو اب تک صورتِ حال مختلف ہوتی۔ آپ کا اصرار نمک چھڑکنے کے مترادف ہے، اس کا جواب تو ہم خود ہیں۔ یہ قید خانہ، یہ ہتھیار بند پہرے دار، ہمارے جسموں پر پڑے ہوئے داغ۔ بڑے نواب نے پہلے ہی دن ہمیں یہ حکم دیا تھا کہ اگر ہم خانم کا پتہ بتا دیں تو یہ دروازے ہمارے لیے کھل جائیں گے۔ گویا وہ خانم کو کسی طور یہاں لے آئیں گے اور ہمیں رہائی نصیب ہو جائے گی ورنہ پھر ہمارا مقدر۔ ایک لامحدود قید اور اُس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ جنون کی بات ہے تو کسی دن غلاموں کو ہم پر ہتھیار اُٹھانے کا حکم بھی صادر کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہمارے یہاں موجود رہنے سے بڑے نواب پر جو اعصابی دباؤ ہے، وہ مزید کم ہو جائے گا اور اپنے چھوٹے بھائی کی ناگفتہ بہ حالت کے انتشار میں اُن کی آسودگی کا کوئی پہلو نکل آئے گا کہ اُنھوں نے کچھ نہ کچھ تو کیا۔ ہمیں معلوم ہے، ہم سراسر اُن کے رحم و کرم پر ہیں۔ کل کچھ بھی ہو سکتا ہے اس لیے کہ ہوتا رہا ہے۔ بڑے نواب سے

کچھ بھی بعید نہیں۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود ہماری زبان بند ہے۔ آخر کیوں؟"

"ہم اندھے نہیں ہیں سب کچھ ہمارے سامنے ہے کسی دلیل یا تاویل کا محل ہی کہاں ہے۔ ہمارا دل یہ سب جان کے دیکھ کے بہت دُکھتا ہے۔" پہلی مرتبہ نواب کی بہن نے تپیدہ لہجے میں کہا۔ اُس کی آواز میں شکستگی اور کنک کے ساتھ کوئی چمک سی تھی اور اپنی بھابی سے زیادہ اعتماد بھی۔ "ہم نے بڑے نواب کی وکالت نہیں کی ہے، نہ ہمارے یہاں آنے کا یہ مقصد تھا۔ ایک شخص دیوانہ ہو گیا ہے تو سزاوار ہم کہاں ٹھیرتے ہیں۔ ہم نے تو آپ سے کچھ اور گزارش کی ہے کہ آپ کے لیے اس محبس سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا ہو اور ہم، ہمارا گھر بھی بڑھتی ہوئی بلاؤں سے محفوظ رہے مگر شاید..... شاید یہ ممکن نہیں ہے ورنہ آپ ضرور...." اُس کی آواز بجھتی گئی۔

"ہاں! یہ..... یہ ایسا آسان نہیں ہے جیسا آپ کہہ رہی ہیں اس حویلی سے نکل کے آپ میں سے کون خانم کے پاس جائے گا؟ یہاں سے وہ بہت دُور ہیں آپ نے سا ہے....."

"وہ کتنی ہی دُور ہوں" میری بات پوری ہونے سے پہلے نواب کی بیگم لپکتی آواز میں بولی۔ "ہم کسی طرح چلے جائیں گے، یہ ہم پر چھوڑ دیجیے۔"

"کیسے؟ آپ یوں کیسے چلی جائیں گی؟"

"ہم کسی کو بتائے بغیر یہاں سے نکل جائیں گے اور دیکھیے گا، سُرخرو ہی واپس آئیں گے۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ اپنی ہی دُنیا میں رہی ہیں، دھوپ سے آپ کا واسطہ پہلی بار پڑا ہے۔ ہمارے لیے زبان ہلا دینا کیا مشکل ہے، ہم آپ کو خانم کے بارے میں سب کچھ بتائے دیتے ہیں، یقیناً اس طرح آپ کی مراد بر آئے گی، ساتھ ہی ہمیں بھی نجات مل جائے گی مگر آپ نے بہت سے نشیب و فراز پر غور نہیں کیا۔ آپ ایک خاتون، کس طرح کسی کو بتائے بغیر زمانے کی نظروں سے خود کو چھپاتے، بچاتے ہوئے وہاں تک پہنچ سکیں گی اور آپ کامیاب بھی ہو گئیں تو خانم کیا اس طرح کوئی صحیح فیصلہ کر سکیں گی۔ وہ فوراً ہامی بھر لیں گی اس لیے کہ ہم دونوں کی گم شدگی کی خبر اُن تک پہنچ گئی ہو گی اور اُن کے لیے سلسلہ جوڑنا کچھ ایسا دشوار نہیں ہو گا۔ وہ ہماری خاطر سب کچھ کر سکتی ہیں لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں، وہاں اور بھی لوگ ہم سے غرض رکھنے والے موجود ہیں، وہ زمانہ دیکھے ہوئے ہیں، انھیں آدمی کی آہٹ سننے کی دیر بھی نہیں لگتی اور اُن کے سر بڑے نواب کے سر سے زیادہ کشیدہ ہیں۔ وہ آپ کو وہاں سے واپس نہیں آنے دیں گے اور اس حویلی میں پھر شاید کوئی بھی باقی نہ رہے۔ آپ اُن سے واقف نہیں ہیں اور اگر یہ سب کچھ اُن سے روپوش بھی رہا، انھیں کوئی بھنک مل سکی کہ آپ کی آمد سے ہماری قید و بند کا کوئی تعلق نہیں ہے، خانم کو بھی آپ نے اس کا احساس نہ ہونے دیا تو بھی خانم اس عالم میں گھر سے نکلنے پر کیسے تیار ہو جائیں گی جب خود اُن کے گھر میں ماتم بھی ہوئی ہو، اُن کے گھر کے دو افراد لاپتہ ہوں اور اگر آپ نے ہمارے متعلق سب کچھ بتا کے خاموش رہنے پر آمادہ کر لیا یا خانم مصلحتاً خود ہی زبان بند رکھنا مناسب سمجھیں اور وہ گھر کے تمام لوگ ایک دوسرا صدمہ دے کے چپ چپاتے آپ کے ساتھ نکل بھی آئیں بے شک ہمارے نام پر وہ چلی آئیں گی لیکن کیا ہمیں یہ گوارا ہو گا؟ گوارا کر لینا چاہیے کہ وہ یہاں اس انداز سے اور اس بنیاد پر چلی آئیں ہماری آزادی کی قیمت پر؟ ہم اپنے گھر کی حرمت یوں ارزاں کر زندگی اور موت کا کھیل ہمارے لیے نیا نہیں ہے، بڑے نواب کا خیال ہے کسی دن ہم ضرور تھک جائیں گے، وہ ہمارا آخری دن ہو گا، آپ ضد سمجھتی ہیں تو غلط نہ ہو گا مگر یہ ضد بے جواز نہیں ہے، ہم لوگوں سے مزید کیا توقع رکھ سکتے ہیں جن کے لیے اپنی غرض سب سے بڑی ہے، ہمیں یاد ہے، بڑے نواب نے پہلے ہی دن خانم کے بازار کا طعنہ دیا تھا۔ وہ گالی اُنھوں نے خانم ہی کو نہیں، ہمیں بھی دی تھی۔ انھوں نے ہمیں لاکھوں رُوپے کی پیش کش کی تھی اس لیے کہ اُن کے پاس یہی پیمانہ ہے مگر کچھ چیزیں بے مول بھی ہوتی ہیں جسے دوسروں کے کا احساس نہیں، جو دل کی حد تک شقی القلب ہو، ہم اُسے خانم کا پتا بتا دیں! اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ خانم کے آنے کے بعد بڑے نواب ہم سے دست بردار ہو جائیں گے؟ وہ ہمارے چہرے محفوظ کیے رکھیں گے تا کہ خانم کو اُن کے کسی حکم سے سرتابی کی مجال نہ ہو۔ جب خانم میں مبتلا تھیں، اُس وقت سب کچھ ممکن تھا لیکن اب ایسا نہیں جہاں خانم رہتی ہیں، اُس گھر کی عزت بھی آپ کی حویلی سے کم نہیں ہے۔ وہاں فرشتے رہتے ہیں، آپ کا اصرار ہے کہ سب کچھ ہی تک محدود رہے گا مگر ہم اس مفروضے پر اتنی بڑی غلطی، اتنا بڑا گناہ نہیں کر سکتے۔ ہاں ہم نے وعدہ کیا ہے کہ ہم جا کے خانم سے بعینہٖ یہ سب کچھ گوش گزار کر دیں گے، یہی ایک شریفانہ طریقہ ہے۔ خانم آ جائیں گی، ہم اُن سے کہیں گے تو وہ کبھی منع نہیں کریں گی۔ وہ یہ نیکی ضرور کریں گی لیکن پورے وقار کے ساتھ۔ وہ اس حویلی میں اپنی مرضی سے قدم رکھیں گی، جبر سے نہیں، ہم بڑے نواب یا کسی اور کو اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ خانم کھلی اور ناآلودہ فضا ہی میں اپنے لیے بہتر فیصلہ کر سکیں گی، اس طرح اور ان حالات میں نہیں۔ اگر آپ منہ میں زبان رکھتی ہیں اور جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، درست سمجھتی ہیں تو ذرا سا حوصلہ کیجیے، بڑے نواب کے پاس جا کے کہیے کہ وہ اپنا دماغ درست کریں، وہ آگ سے کھیل رہے ہیں، بڑے نواب کی لگام کھینچنا آپ کے بس میں نہیں ہے تو کسی طور ہمیں یہاں سے نکالنے کی سبیل کیجیے، ہم ہر حال میں اُس رشتے کا احترام کریں گے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔"

رگوں میں خون کی گردش کے ساتھ میری آواز بھی تیز ہو گئی تھی، اس سے پہلے کہ میرے منہ سے کچھ اور نکل جاتا، میں نے اپنی زبان روک لی۔ وہ ہمہ تن گوش سنتی اور میری صورت دیکھتی رہیں، میری خاموشی پر چونک سی گئیں، میں نے پھر کچھ اور نہیں کہا۔ پیرو بھی چپ رہا، نواب کی بہن پٹ پٹاتی پلکوں سے کبھی مجھے، کبھی اپنی بھابی کو دیکھتی تھی، اُن کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور ہونٹوں کے گوشے بار بار کپکپانے لگتے تھے، بیگم سر جھکائے گہری سانسیں بھرتی رہی۔ آنسوؤں سے مجھے بہت وحشت ہوتی ہے۔ مجھے یہ جان کے کچھ تسلی ہوئی کہ اُن کی آنکھیں پہلے کی طرح لبریز نہیں ہیں اور نہ اُن میں پہلی جیسی دہشت اور ویرانی ہے، دونوں کے چہروں پر اضطراب کے بجائے یاسیت آمیز سکون چھایا ہوا تھا جو ہر دلیل ختم ہو جانے اور سارے جتن کر لینے کے بعد ہی نظر آتا ہے۔ اُنھوں نے کچھ نہیں کہا، ہمارے سامنے بیٹھی رہیں۔

"ابھی آپ کیا سوچتا ہے؟" پیرو نے یہ سکوت توڑا اور تذبذب سے بولا۔ "ابھی اپنا نہیں تو اِس کا کوئی بات تمھارا دل میں اُترتا ہے؟"

بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا مگر نواب کی بہن اضطراب سے بولی۔ "ہمارے پاس اظہارِ ندامت کے سوا کچھ نہیں ہے، ہمیں معاف کر دیجیے کہ ہم نے آپ کو....."

"نئیں، نئیں" پیرو نے نرمی سے کہا۔ "ابھی آپ کا اِس میں کیا دوش ہے، اپن کے لیے یہ ایسا کوئی نوا بات نئیں ہے۔ دیکھے گا، ابھی آگے کیا ہوتا ہے، ابھی آپ گھر واپس جاؤ۔"

"ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔" نواب کی بہن بے تابانہ تشنگی سے بولی۔

"ابھی آپ اپنے اور ہمارے لیے بس دعا کرو۔"

"دعا کے علاوہ بھی اگر ہم سے کچھ ہو سکا تو یقین کیجیے، کوئی کوتاہی نہیں ہو گی۔" نواب کی بہن نے جھلملاتی آواز میں کہا۔ وہ بولتی تھی تو کمرے میں چھناکا سا ہوتا تھا، جیسے شیشہ ٹوٹ جائے اور کرچیاں بکھر جائیں۔ کہنے لگی۔ "خانم واقعی خوش قسمت ہیں کہ انھیں آپ جیسے پاسبان ملے ہیں، ہم سے سمجھنے میں چوک ہوئی تھی۔ ہمیں اس قدر تکرار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ خانم کی نئی زندگی کتنی پُر مسرت ہو گی، بے شک انھیں ایسے نہیں آنا چاہیے۔ شبّی بھائی کو اللہ اپنی امان میں رکھے، شبّی بھائی سے سوا نواب عالم تاب ہی ہو سکتا تھا۔"

"ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پیرو نے بدلتے ہوئے کہا۔ "اپن لوگ امید ہے، ادر زیادہ دیری نئیں لگے گا، ادر سے چھوٹ کے اپن خانم کے پاس ہی جائے گا۔" پیرو نے اُسے پھر دلاسا دیا۔ "اپن آپ لوگ کو بھول نئیں جائے گا۔"

"ہمیں آپ کے ہر قول پر اعتبار ہے۔" وہ یاسیت سے بولی، "موقت

نے آپ کے ساتھ کوئی سلوک کیا اور ساتھ ہی شبّی بھائی کو کچھ مہلت دے دی تو ضرور ایسا ہو گا۔ خدا کرے یہی ہو۔"

"وقت ملے گا گڑیا رانی! ضرور ملے گا۔" پیرو نے بے قراری سے کہا۔ "ابھی تم دل اتنا چھوٹا مت کرو، پھر تم نے یہ کیسا بات شروع کر دیا ہے، ایسا مت بولو۔"

"سب کچھ وقت کی مہربانی ہی پر منحصر ہے۔" وہ گرفتہ لہجے میں بولی پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہاں موجود اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کا پتہ دے دیجیے۔ ہم ہر ممکن احتیاط سے کسی طور بھی انھیں آپ کے بارے میں اطلاع پہنچانے کی کوشش کریں گے۔"

"آپ بہت بھولا ہے بٹیا لوگ! اپن ایسا کیسے کر سکتا ہے، وہ اگر اُلٹا سیدھا ادر آ گیا تو اپن کے ساتھ جال میں پھنس جائے گا، سمجھا!"

"ہم انھیں یہاں کا پتہ بتائیں گے ہی نہیں، کوئی رقعہ تحریر کر دیجیے۔"

پیرو ہنس کے بولا۔ "وہ اَور پریشان ہو جائے گا بی بی! ابھی اِس کو جانے دو۔"

"کاش ہم آپ کی کسی خدمت کے اہل ہوتے، آپ کے کام آ کے ہمیں بہت خوشی ہوتی۔" اُس کے لہجے میں وارفتگی تھی۔

"آپ کا اتنا بولنا بہت ہے۔"

"ہم یہاں بڑے ڈرتے ڈرتے آئے تھے۔ لوگ آپ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کہتے تھے، بہت عجیب باتیں سن سن کے دل ہولتا تھا مگر شبّی بھائی کی حالت ایسی تھی کہ آئے بغیر چین نہ ملتا اور جیسا کہ بابی جان نے کہا تھا، یہی سوچ کے کچھ تقویت ہوتی تھی کہ جو لوگ اتنے عذاب کے باوجود اپنے عزم کے اتنے پختہ ہو سکتے ہیں، وہ ایسے بُرے نہیں ہو سکتے۔ وہ سب بہتان تراشتے تھے۔"

"ابھی آپ نے کوئی غلط نہیں سنا تھا۔" پیرو نے مسکرا کے کہا۔ "اپن ایسا ہی کچھ عجیب لوگ ہے، کبھی خود اپنے پلّے بھی نہیں پڑتا۔"

"کاش ہم کسی اور طرح ملتے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

پیرو کوئی جواب دے سکا تھا کہ بیگم یکایک اٹھ گئی۔ بیگم کو دیکھ کے نواب کی بہن بھی کھڑی ہو گئی۔ دونوں کے چہروں پر نقاب نہیں تھی، نقاب باندھنے کے بجائے اُنھوں نے چادر سرکا کے ناک تک چہرے چھپا لیے۔ سیاہ چادر میں صرف اُن کی بڑی بڑی آنکھیں نظر آ رہی تھیں، ہم دونوں بھی مونڈھوں سے اٹھ گئے تھے۔ چند لمحوں تک وہ ان جھلکاتی آنکھوں سے ہمیں دیکھتی ہوئی چپ چاپ ہمارے سامنے کھڑی رہیں۔ ابھی وہ جانے کے لیے دروازے کی طرف نہیں پلٹی تھیں کہ پیرو نے اچٹتی نظر سے میری طرف دیکھا، میں یہی سمجھا کہ وہ مجھے کوئی اشارہ کر رہا ہے، ایک لحظے کے لیے میں سرتاپا لرز کے رہ گیا پھر جیسے ہی پیرو نے اپنی

جگہ سے حرکت کی اور آگے قدم بڑھایا تو میرا ماتھا ٹھنکا، جانے کیوں مجھے شبہ ہوا کہ کہیں پیرو کے دل میں کوئی اور بات نہ آگئی ہو، ہم اُن دونوں پر قابو پا کے اُن کی آڑ لے کے فرار ہو سکتے تھے۔ اُن پر قابو پانا کچھ دشوار نہیں تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرا سارا جسم دہل سا گیا تھا مگر عین وقت پر میرے بازو اینٹھ کے رہ گئے، پیرو بیگم کے پاس جا کے ٹھہر گیا اور اُس نے بیگم کا دوپٹا ماتھے سے چھو کے اُس کی طرف بڑھا دیا۔ میں پسینے میں شرابور ہو گیا تھا، میں نے خود پر لعن طعن کی کہ مجھے ایسا گمان ہی کیوں ہوا، یقیناً یہ ایک بہترین موقع تھا لیکن پیرو کے ذہن میں ایسی کوئی بات آ ہی نہیں سکتی تھی، انھیں یرغمال بنا کے فرار ہونے سے موت بہتر تھی، پھر اُن سے اتنا کچھ کہنے کی کیا ضرورت تھی، میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ میرے جھپٹتے ہوئے بازو اٹھے نہیں ورنہ نواب کی بہن اب تک میری گرفت میں ہوتی۔

دوپٹا واپس کرتے ہوئے پیرو نے بیگم کے سر پہ ہاتھ رکھا تو اُس نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں اور منہ چھپا کے پھڑکنے لگی، پیرو اُس کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے فوراً نواب کی بہن کی طرف متوجہ ہو گیا جو جھلملاتی نگاہوں اور جھپکتی پلکوں سے اپنے پاس کھڑے ہوئے پیرو کو دیکھ رہی تھی، پیرو نے اُس کا شانہ تھام کے سرگوشیانہ لہجے میں کچھ کہا مگر وہ تھا میں نہیں سن سکا مگر پیرو نے کوئی ایسی ہی بات کہی تھی کہ لڑکی کی آنکھوں کی چمک اور گہری ہو گئی تھی اور اُس کے گالوں پر سرخی پھوٹ آئی تھی، پیرو نے بے اختیار اُس کی پیشانی چوم لی۔

اُس کے وجود پر یک لخت ایک ہیجان سا طاری ہوا اور وہ کھڑے کھڑے لہرا سی گئی، ایسا محسوس ہوا جیسے ایک پل میں اُس کا سراپا ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ اچھا ہوا کہ پیرو نے اُس کا بازو چھوڑ دیا اور وہ خود سنبھل گئی، پھر وہ وہاں نہیں ٹھیری تیزی سے مڑ کے دروازے کی طرف لپک پڑی۔

دروازے پر جا کے اُس نے پلٹ کے ایک نظر مجھے اور پیرو کو دیکھا اور اپنی بھابی کے ساتھ کمرے سے اوجھل ہو گئی۔

کمرے پر رات کا سناٹا مسلط ہو گیا تھا۔ اُن کے جاتے ہی پہرے دار اندر آ گئے تھے اور دروازے کے پاس انھوں نے اپنی پرانی جگہیں سنبھال لی تھیں، میں اور پیرو دہیں مونڈھوں پر خاموش بیٹھے رہے پھر کچھ دیر بعد اندر کے کمرے میں چلے آئے۔ یہاں دو چارپائیوں، میز، جگ اور گلاس کے سوا کوئی چیز نہیں تھی، پھر بھی یہ کمرہ اصطبل کی کوٹھری اور تہہ خانے سے بدرجہا بہتر تھا۔ کمرے کی کھڑکی مقفل کر دی گئی تھی لیکن ہم ہوا کے لیے دروازہ کھلا رکھتے تھے، اوپر چھت سے ملحق سلاخوں کا روشن دان تھا، دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے ہوا کمرے میں گردش کرتی رہتی تھی، پانی

پی کر پیرو پاؤں پھیلا کے چارپائی پر ڈھیر ہو گیا اور لمبی لمبی سانس کھینچنے لگا۔ میں نے روشنی بجھا کے آنکھیں موندنے کی کوشش کی۔ اُن کی آوازیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی تھیں، آنکھوں میں اُن کے چہرے کھبے ہوئے تھے۔ پیرو بھی اُنھی کے بارے میں سوچ رہا، اُسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

رات کا آخری پہر ہو گا۔ پیرو کسمساتا ہوا اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "کیا ہے دادا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"کچھ نئیں جانی!" وہ غنودہ آواز میں بولا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے، کیا سوچ رہے ہو؟"

"کیا بولے راجا!"

"اب سو جاؤ، دماغ پر کوئی زور مت ڈالو۔"

"یہی اپن ابھی تجھ سے بھی بولنا چاہتا تھا۔" وہ ہنس کے بولا۔

"میں کیا کروں دادا! مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی ہے۔"

"نیند کیسے آئے گا سالا۔"

"مگر آ ہی جائے گی۔ نیند تو پھانسی پر بھی آ جاتی ہے۔ صبح کون سا پل جو تمھے جانا ہے، اب نہیں تو صبح آ جائے گی۔"

وہ سر ہلانے لگا اور اپنے گال کھجاتا رہا۔ وہ بہت سرگرم آتا تھا۔ میں نے جان بوجھ کے اُسے نہیں کریدا۔ اس سے حاصل ہی کیا۔ وہ خود گھٹے ہوئے لہجے میں مجھے ٹوکنے لگا۔ "چپ کیوں ہو گیا؟ باتیں کر راجا!"

"کیا بات کروں۔"

"ابھی اُو دو تو کیسا طوطے کا مافق بولتا تھا، ایک دم بکنے کا مافق۔ اپن کو یاد نئیں پڑتا، ابھی تو کبھی اپنے سامنے اتنا بات لگتا تھا، کسی نے چابی بھر دیا ہے۔"

"میں نے وہی سب کچھ کہا تھا جو تم کہہ چکے تھے، کوئی نئی تو نہیں کہی تھی۔ وہ کچھ سمجھتی ہی نہیں تھیں۔"

"اپن تو کبھی تجھ کو دیکھتا تھا، کبھی اُن لوگ کو۔ وہ ایک دم ہو گیا تھا کہ ابھی یہ کون شہزادہ اندر آگیا ہے۔"

"شہزادہ!" میں نے تنک کے کہا۔

"قسم سے اپن مخول نئیں کر رہا ہے، اپن اُن لوگ کو غور رہا تھا۔ اُن کا دیدہ کھلا ہوا تھا، اپن سوچ رہا تھا کہیں تجھ کو نظر لگ جائے۔ اپنا بھی اُن کا بھی۔ نظر کا کاٹ چاقو سے تیز ہوتا ہے۔"

"معلوم نہیں، قیدی کو نظر لگ جانے سے کیا اثر ہوتا ہے۔" زہرخند سے کہا۔

"نظر تو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔"

"تم... تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟" میں نے تلخی سے کہا۔

وہ میرے بال پکڑ کے سر کو جھٹکے دینے لگا۔ پھر اُس نے مجھے دونوں بازوؤں میں بھر لیا اور جھپکتی آواز میں کہنے لگا۔ "راجا! ذرا سا ہی رکھ۔ ابھی اتنا سن کے اپن کو پتہ چلا کہ تیرے اندر کیسا کھل بل ہو رہا ہے۔ اندر زیادہ شور ہو تو باہر کا کھٹکا سنائی نئیں دیتا ہے۔ ایسا بیچ بیچ ابھی ہوتا رہتا ہے، آگے بھی ہوتا رہے گا۔ اپن باہر تھا تو بھی سالا من سا فرق پڑتا تھا۔ اُدر راستے میں وہ سونیا سامنے آگیا، پتھر مارنے کے لیے زندہ تھا، مار کے مجبور ہو گیا۔ اُوپر والا یہ کھیل تماشا کرتا رہتا ہے۔"

وہ مجھے ڈوبتے لہجے میں سمجھا رہا تھا کہ مجھے ہمت رکھنی چاہیے جو ہو گیا ہے، اُس میں ہمارا کیا قصور۔ اگر کوئی قصور تھا تو اتنا کہ ہم حیدرآباد سے کیوں آئے، سیدھے بمبئی کیوں نہ چلے گئے۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں کچھ جانتا ہی نہیں ہوں، میں پاگل ہو گیا ہوں۔ کیا میں نے تم سے کبھی کوئی شکایت کی ہے اور تم جو کہہ رہے ہو تو کیا تمھیں یہاں بہت آرام ہے، تمھیں جیسے کوئی دکھ نہیں ہے۔"

"تُو نے کچھ بولا نئیں تو اپن نے کیا سنا بھی نئیں اور اپن کا بات کر، اپن کبھی کالا گورا رات اُوپر سے چلا کر دیتا ہے، ابھی اتنا بھالا دے کے اپنے کو اور آدھا کرے گا کیا۔"

"تمھارا مطلب کیا ہے؟"

"ابھی جانے دے۔" وہ کسمساتا ہوا بولا۔

"دادا!" میں نے دبی آواز میں کہا۔ "مجھے احساس ہے کہ تم خواہ مخواہ سب کچھ میری وجہ سے......"

"پھر وہی۔" اُس کی آنکھوں میں آگ سی جلنے لگی۔ "ابھی آگے سنبھل کے بولنا، اپن سیدھا اُلٹے ہاتھ کا دکھائے گا۔" وہ برہمی سے بولا۔

"تم ہی تو ایسی باتیں کر رہے ہو۔ مارنا ہے تو تمھارا ہاتھ کس نے روکا ہے، مارو۔ میں خود ہی ایسا کہ مجھے مارا جائے، ہو سکے تو میرا گلا گھونٹ دو۔"

"یہ.... یہ ایک دم کیسا۔" وہ بوکھلا کے بولا۔ "جیت بھی میرا، ہار بھی میرا۔ سالا کبھی روتا، کبھی رلاتا ہے۔ آدمی کو اُلٹا کر کے رکھ دیتا ہے۔ کچھ دھیان رکھ کے بولا کر۔"

"سچ سچ بتاؤ، تمھیں میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہے؟" میری آواز رندھ گئی۔ "ایسا ہے تو میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"ارے نئیں راجا! نئیں جانی!" اُس نے مجھے دبوچ لیا اور وحشت سے بولا۔ "اپن کا مطلب یہ نئیں تھا، اپن کا مطلب.... جو بولا ہے، ناہی تھا۔ پر لگتا ہے ابھی اپن ہی کچھ الٹا سمجھ گیا ہے۔" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

"دادا! میری کسی بات کا اثر مت لیا کرو۔" اُس کے خفت آمیز لہجے سے مجھے خود خجالت ہونے لگی تھی، میں نے اُسے اور آزردہ کر دیا تھا۔ میں نے اُس کے پیر پکڑتے ہوئے کہا۔ "میرا کچھ یہی ہے۔ معلوم نہیں، اچانک مجھے کیا ہو جاتا ہے، مجھے کچھ خیال ہی نہیں رہتا۔"

"تو نے کچھ بھی نئیں بولا تھا راجا!" وہ نرمی سے بولا۔

"میں سمجھتا ہوں، میں نے کچھ کہا نہیں تو سب کچھ منہ سے کہنے ہی سے تھوڑی ہوتا ہے۔ تمھیں میرا چہرہ دیکھ دیکھ کے وحشت ہوتی ہو گی، تم سمجھتے ہو گے کہ میں بہت گھبرا رہا ہوں جتنا تم سمجھ رہے ہو، ایسا نہیں ہے، میں نے پورے سات سال جیل میں کاٹے ہیں اور ویسے بھی باہر کون سی جیل نہیں تھی۔ جب سے میں گھر سے نکلا ہوں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہا ہے۔ میری طرف سے تم اتنے پریشان مت ہوا کرو۔ مجھے کیا معلوم نہیں ہے، میری آنکھیں بند نہیں ہیں۔ بس یہاں مجھے ایک ہی بات رہ رہ کے ستاتی ہے کہ اُدھر ابا جان کا کیا حال ہوا ہو گا۔ وہ بالکل ہی ٹوٹ گئے ہوں گے۔"

"اپنے کو بھی اُن کا بہت خیال ہے پر کیا کرے، وہ سوجھ بوجھ کا آدمی ہے، ابھی اتنے دن اپن لوگ کے ساتھ رہ کے سمجھ گیا ہو گا کہ کوئی بڑا آفت ہی پڑ گیا ہے جو نئیں لوٹا۔ وہ دل کا ایسا چھوٹا نئیں ہے راجا!"

"لیکن عین وقت پر جب برسوں کی دوڑ دھوپ کے بعد کہیں اُن کی تمام خواہشیں پوری ہونے کی گھڑی آئی تھی، میں ل گیا، جہاں گیر مل گیا۔ جس کام کے لیے انھوں نے سارا گھر اُجاڑ دیا تھا، اُس کا ثمر انھیں ملنے والا تھا۔ اتنے دنوں بعد وہ اپنے گھر جا رہے تھے، بیٹے بیٹیوں کو دیکھنے اور اُن کے دکھ درد کرنے کے لیے۔ وہ کیسے بے تاب ہوں گے، ایسے وقت میں یہ صدمہ انھوں نے کس طرح سہا ہو گا۔"

"پر جتنا سوچے گا، اتنا ہی خون جلے گا۔ یہی تو اپن بول رہا تھا تو اُکھڑنے لگا۔ ابھی اندر جو اپنے قابو میں ہو سکتا ہے، وہی تو کر سکتا ہے، وہ سالا نواب اپنے کو کسی بھیڑیے کا اولاد معلوم ہوتا ہے۔"

"دادا! میں نے اُن سے اسی لیے اتنی باتیں کی تھیں کہ وہ ہمارے بارے میں بھی کچھ جان سکیں۔ اگر کہیں کوئی گنجائش ہو تو وہ کچھ ہمت کر سکیں لیکن شاید.... شاید کیا، وہ واقعی کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔"

"اپن نے بھی اتنا دیر اسی واسطے لگایا تھا کہ ابھی وہ کچھ سمجھے۔ وہ اندر حویلی کے اندر باہر کے راستے، ایک ایک کونے سے پورا جان کاری رکھتا ہو گا، جب اندر آنے کے لیے پہرے دار کو رام کر سکتا ہے تو اپنے لیے بھی اُن کو کچھ بول سکتا ہے۔"

"وہ ایسی نہیں تھیں، اُن کے امکان میں ہوتا تو وہ پہلے ہمیں یہاں سے نکالنے کی کوئی تدبیر کرتیں، پھر کوئی التجا کرتیں۔ اندر عمارت کی بات اور ہے، عمارت سے باہر بھی پہرے داروں کی ایک قطار ہے۔"

"وہ بہت الگ لوگ تھا راجا!"

"وہ اس گھر کی معلوم ہی نہیں ہوتی تھیں۔"

"ہاں جانی! لگتا تھا، ابھی زمین پہ اُترا ہے، نوا نوا ہی دُنیا میں آیا ہے۔ دُنیا کا راگ گھاٹ ابھی اُس کو ایک دم پتہ نہیں تھا، وہ چھوٹا والا تو بالکل چینی کا مورتی تھا، پھول کے مانک کھِل جاتا، مُرجھا جاتا۔ اُس کو دیکھ کے اپن کو اُودر حویلی کا زری بیٹا بہت یاد آیا تھا۔ ابھی سامنے ہوں تو دونوں جڑواں لگیں، بیگم کو بھی بنانے والا جیسے پر لگانا ہی بھول گیا۔ راجا! اپن سوچتا ہے، ابھی اُن کو ادر کسی چیز کا کمی نہیں ہے، یہ قلعے کی طرح پھیلا ہوا حویلی، نوکر چاکر، سونا، چاندی۔ ادر سبھی کچھ ہے پر تُو نے دھیان دیا۔ اُن لوگ میں ابھی کون سا چیز کا کمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ صرف چھوٹے نواب کا بات ہی نہیں تھا اور بھی کچھ تھا۔"

"تمھارا اندازہ درست ہو سکتا ہے لیکن اس وقت تو انھیں چھوٹے نواب کی طرف سے بہت فکر تھی، نواب کی حالت کچھ زیادہ ہی خراب معلوم ہوتی ہے۔"

"پر اپن ابھی کیا کر سکتا ہے۔" وہ پژمردگی سے بولا۔

میں جواب میں کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ بھی منہ لٹکا کے رہ گیا اور کچھ توقف کے بعد بوجھل آواز میں بولا "راجا! ابھی اپن کو ادر زیادہ دیری نہیں لگنا چاہیے۔"

"کیا ہونا چاہیے، کیا نہیں، یہ فیصلہ ہمیں کب کرنا ہے۔"

"ابھی تُو اُن سے بات کرتے ہوئے بول رہا تھا، کل نواب کا ماتھا پھر جائے اور وہ سالا کوئی اور پھڈا کھڑا کر دے، کوئی اور حکم دے دے تو اپن کیا کرے گا۔ تُو نے کوئی غلط نہیں بولا تھا۔ ادر سالا ابھی کچھ بھی ہو سکتا ہے، اپن گلے گلے پھنسا ہوا ہے، جتنا دیری ہوئے گا، اُتنا ہی اپن اندر دھنستا جائے گا، شروع کا بات اور تھا، اب اپنے کو وہ ایسے چھوڑنے میں دس مرتبہ آزو بازو دیکھے گا، اُس حرام کے جنے کو پتہ ہے کہ اپن لوگ کون ہے۔ وقت نکلنے کے ساتھ وہ ڈھیلا پڑنے کے بجائے اور کھنچ بھی سکتا ہے، سالے کو ضد چڑھ گیا تو اپن ادر ہی کتا بنا رہے گا۔ وہ ابھی ایک دم پُتلے جیسا حالت میں ہے، زیادہ دیری ہو جانے سے بات اور بگڑ سکتا ہے اور اُودر، اُود چھوٹے نواب کے لیے بھی ابھی یہی ٹھیک ہو گا کہ اپن ادر سے جلدی نکل جائے۔"

"لیکن بڑے نواب کو جا کے یہ کون سمجھائے، ہم اپنی جیسی تمام کوششیں کر کے دیکھ چکے ہیں، بظاہر ایک ہی راستہ کھلا ہے کہ ہم اُسے سب کچھ بتا دیں، کیا تم، تم اب اسی نتیجے پہ پہنچے ہو؟"

"نہیں رے۔" وہ جھڑکتی آواز میں بولا "پر اپن کو کچھ اور سوچنا پڑے گا اور جلدی۔"

مجھے ہنسی آ گئی "دادا! کون سا لمحہ ایسا گزرا ہے جب ہم نے اس طرف سے غفلت برتی ہو، ہاں سُرنگ کھودنے کی ایک کوشش نہیں کی"

اُس نے ہنکاری بھری اور تھکے تھکے لہجے میں بولا "اپن کو دم اندازہ نہیں تھا کہ ادر سالا اتنا وقت لگ جائے گا۔"

"تم کیا سمجھ رہے تھے؟" میں نے ترشی سے پوچھا۔

"اپن سمجھتا تھا، ابھی دو چار روز کا بات ہے" وہ خود فیصلہ دے گا، ایسا نہیں ہوا تو اپن ہی ادر سے نکلنے کا کوئی راستہ کھوج اگر یہ بھی نہیں بن سکا تو کوئی اپنے کو ڈھونڈتا ہوا ضرور ادر آ نکلے گا"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

"ابھی ادر کسی کو آنا چاہیے تھا۔"

"تمھارا مطلب زورا، مارتی اور ابا جان سے ہے؟"

"ہاں۔" وہ ہچکچاہٹ سے بولا "وہ بھی آ سکتا تھا۔"

"تم اپنے ہوش میں تو ہو۔"

"اپن ٹھیک ہی بول رہا ہے راجا!"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"سمجھنے کا کوشش کرو، کبھی نہ کبھی تو اُن کو ادر آنا ہی تھا اُن کو جلدی ہی کرنا چاہیے تھا۔"

"تھانے میں ہم نے اپنے نام غلط لکھوائے تھے، یہ حویلی شہر کے مضافات میں ہے۔ ابا جان، زورا اور مارتی کہاں کہاں پوچھتے رہے ہوں گے اور کون انھیں بتا سکا ہو گا، اتنے بڑے شہر میں کون ہماری نشان دہی کر سکتا تھا۔ تینوں اس شہر یہاں کے گلی کوچوں یہاں کے لوگوں سے بالکل ناواقف ہیں، پہلے تو انھیں اپنے آپ کو سنبھالنے ہی میں تامل ہو گا، ہمارے ساتھ پیش آنے والے حادثے سے لاعلم باعث انھیں ہم سے اپنا کوئی تعلق جتاتے ہوئے لازماً جھجک نقدی کے علاوہ ابا جان کے پاس لاکھوں روپے کے پتھر موجود کی وجہ سے بھی اُن کا اپنے آپ کو چھپانا اور محدود رکھنا ضروری پتھروں کو وہ ہماری خاطر قربان بھی کر سکتے تھے مگر ہمارا کوئی نشان ملتا بھی تو!... تم کس بنیاد پہ اتنے وثوق سے کسی کے آنے تھے دادا؟" میں نے منتشر آواز میں اس سے پوچھا۔

وہ آنکھیں میچ کے رہ گیا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مجھے حیرت تھی کہ پیرو جیسے شخص نے سب کچھ جانتے ہوئے ایسی توقع کیوں باندھ رکھی تھی، غالباً وہ یقین کی حد تک پُر اُمید جبھی اب اُس کی پیشانی پہ بل آئے ہوئے تھے۔ شروع شروع ذہن میں بھی یہ بات آئی تھی۔ اُن تینوں کو کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا، انتظار ہی نہیں کرتے رہے ہوں گے۔ ایک رات، دوسری رات۔ کتنے دن وہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے رہے ہوں گے، پہلے شہر کے تمام گلی کوچوں کی خاک چھانی ہو گی اور ناکامی سے بولا

اُن کے پاس مجمل کو اطلاع دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہو گا۔ تار پہنچنے میں ایک پہر کی دیر ہو سکتی ہے، مجمل ایک لمحے کے لیے بھی خود کو نہیں روک سکا ہو گا، چاہے اُس کے پیر کے زخم کی کیسی ہی حالت فرض نہ ہو۔ اطلاع ملنے اور مجمل کے آنے کے لیے گیارہ دن بہت ہیں۔ ریل کے ذریعے فیض آباد سے حیدر آباد آنے میں دو دن سے زیادہ نہیں لگتے۔ لیکن یہاں آ کے اُس کی حالت اُن تینوں سے کیا مختلف ہو سکتی ہے، مجمل کوئی جادوگر نہیں ہے کہ بس یہاں آنے کی دیر ہو گی اور حویلی کا راستہ خود بہ خود اُس کے سامنے بچھ جائے گا۔ تھانے تک پہنچنے میں وہ کامیاب بھی ہو گیا تو وہاں روزنامچے پہ ہمارے اصل نام کہاں درج تھے اور تھانے دار رکن الدین سے نہیں تو کسی سپاہی سے اُسے پتہ بھی چل گیا کہ کوئی خاں صاحب چند دن پہلے دو آدمیوں کو ازراہِ ہمدردی ضمانت پر لے گئے تھے اور مجمل نے خاں صاحب تک بھی رسائی حاصل کر لی تو اُسے اُن سے بھلا کیا سراغ مل سکے گا، خاں صاحب صاف مُکر جائیں گے کہ ہم لوگ تو اُسی وقت اُن سے جُدا ہو گئے تھے، خاں صاحب نے بعد میں تھانے دار رکنی میاں کو بھی یہی تاثر دیا ہو گا۔ ہماری طرح مجمل کے ذہن میں دور دور تک خانم اور نواب عالم تاب کا خیال نہیں آ سکتا تھا کہ ہماری گم شدگی اُس سلسلے کی کوئی کڑی ہو سکتی ہے۔ مجمل آغا کے اڈّے مزید پہنچا ہو گا مگر وہاں جانے سے اُسے تبھی کچھ حاصل ہو سکتا ہے جب آغا نے اُسے اصل بات بتائی ہو۔ آغا کہہ سکتا ہے کہ اُس نے ہماری واپسی کے اندیشے کے سبب اپنے آدمیوں کو چھوڑ رکھا تھا۔ اُن لوگوں سے ہر وقت چوکنا رہنا چاہیے تھا جنھوں نے شاہ کبیر جیسے دادا کو پلک جھپکتے میں اغوا کر دیا تھا۔ وہ لوگ کسی وقت بھی حیدر آباد آ کے اُس کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ آغا کا یہ عذر ایسا غیر فطری نہیں ہو گا کہ مجمل کی سمجھ میں نہ آئے۔ شاہ کبیر کی بے دخلی کے واقعے کے بعد ہماری طرف سے اُس کی احتیاط، دُور اندیشی ہی کہی جا سکتی ہے۔ اڈّے تک پہنچنے سے پہلے وہ ہمیں کسی اور معاملے میں اُلجھا کے حیدر آباد سے بھاگنے پر مجبور کر دینا چاہتا تھا۔ اُسے ہمیں دُور رکھنے اور ہماری دسترس سے دُور رہنے کی اپنی جیسی کوشش کرنی ہی چاہیے تھی۔ وہ ہزار بہانے کر سکتا ہے۔ مجمل کو اُن آدمیوں سے بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا جو ہمارا تعاقب کر رہے تھے اور راستے میں ہم اُن سے جھگڑ پڑے تھے۔ وہ اِس حقیقت سے قطعی لاعلم تھے کہ انھیں ہمارے تعاقب کا حکم آغا نے، خاں صاحب یا بڑے نواب کے اشارے پہ دیا تھا، سو وہ مجمل کو کیا بتا سکتے تھے۔ یہ تو صرف آغا ہی جانتا تھا، اُس کے علاوہ خود مجمل کو بھی یہاں آ کے کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے پھونک پھونک کو قدم اُٹھانا چاہیے تھا۔

میں نے اشارۃً پیرو کو یہی کچھ جتانا چاہا، تھانے میں اچانک خاں صاحب کی آمد، حویلی کا سارا محلِ وقوع، بڑے نواب کا اثر و رسوخ، پیرو کو ہر طرف دیکھنے کے بعد ہی اس طرح کی کوئی اُمید باندھنی چاہیے تھی۔ ممکن ہے مجمل حیدر آباد ہی میں ہو مگر حویلی تک اُس کے آنے کا امکان سو میں دس بھی نہیں تھا اور آ گیا تو اُس کی آمد کی بھنک ملتے ہی کہیں فرار ہو گیا تو مجمل کس کس کے گریبان پہ ہاتھ ڈالے گا۔ بہرحال پیرو کو ایسی کوئی خوش فہمی تھی تو اتنا وقت گزرنے کے بعد اُس کے ذہن سے نکل چکی تھی، جبھی وہ یہاں سے جلد سے جلد نکلنے کے سلسلے میں فکر مند تھا۔ میں نے اُس سے زیادہ جرح نہیں کی۔ اُس کی خاموشی کے بعد میرے مزید کچھ کہنے کا محل بھی نہیں تھا۔

اندھیرا ابھی باقی تھا۔ ہم دونوں پھر چار پائی پہ لیٹ گئے تھے لیکن نیند ابھی تک آنکھوں سے دُور تھی۔ پیرو کا پھیلا ہوا ہاتھ میری انگلیوں میں پھنسا تھا، بار بار وہ میری انگلیاں جکڑ لیتا تھا۔ صبح ہونے میں کچھ ہی وقت رہ گیا ہو گا، ایک دن اور گزر گیا تھا۔ جیل میں کم از کم آدمی دن تو گن سکتا ہے۔ ہر دن کے بعد ایک دن کم ہو جاتا ہے، میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ پیرو کا بھی یہی حال ہو گا، یہ سوچ سوچ کے میرے حواس اور منتشر ہوئے جاتے تھے۔ مجھے نہیں تو اُسی کو نیند آ جائے۔ میرے لیے یہ بھی کوئی کم سکون نہ ہوتا۔ کم سے کم میں یہی کر سکتا تھا کہ اِدھر اُدھر کا کوئی ذکر چھیڑ کے اُس کا دھیان بٹاؤں یا اُس سے ماضی بائی جیسا کوئی واقعہ سُنانے کی فرمائش کروں، کسی طور تو یہ وقت کٹے۔ جو ہونا ہے اُسے کون روک سکتا ہے۔ میں اُسے پکارنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ رُک گیا۔ اچانک ایک بات میرے ذہن میں گونجی "دادا!" میں نے بے تابی سے اُسے آواز دی۔

"کیا، کیا ہے راجا!" وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کے بیٹھ گیا۔

میں نے کچھ کہنے سے پہلے توقف کیا کہ کہیں میں کوئی بے سر و پا بات تو نہیں کہہ رہا ہوں لیکن مجھ سے ضبط نہ ہوا، میں نے سرگوشی میں کہا "دادا! ہم ایک بار بڑے نواب کو بُلا کے کیوں نہ دیکھیں؟"

"بڑا نواب کو!" وہ بڑبڑاتا ہوا بولا۔

"ہاں، دادا!"

"اب اُس کو ادر کیا بولنا ہے رے!"

"کچھ نہیں، لیکن ایک کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔"

"کیسا کوشش؟" وہ کشمکش و پیچ سے بولا۔

"کوئی اور بات نہیں دادا! ہم اُس سے کہیں گے کہ ہم اُس سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں، ضروری بات۔"

"پر کیا بات جانی؟"

میں نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "رات جب تم دوپٹا واپس کرنے کے لیے بیگم کی طرف بڑھے تھے تو پتہ نہیں، مجھے کیوں شبہ ہوا کہ کہیں تم میری طرف کوئی اشارہ تو نہیں کر رہے ہو، تمھارا ارادہ

کچھ اور تو نہیں ہے پھر فوراً یہ خیال میں نے اپنے سر سے جھٹک دیا تھا کہ تم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے مگر دادا! جانے کیوں مجھے ایسا شک ہوا تھا کہ تم نے ان کی لوٹ لے کر باہر نکلنے کا ارادہ تو نہیں کر لیا ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔

"میں تمھیں بتاؤں کہ میں بس رُکا رہ گیا۔"

"ابھی ان لوگ سے ایسا کیسے کر سکتا تھا۔"

"ہاں دادا! یہ کسی طور مناسب نہیں تھا مگر دادا! وہ نہیں تو نواب.... نواب میرا مطلب ہے۔" میں نے سنسناتے لہجے میں کہا۔

اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ لمحوں تک وہ گم صم مجھے گھورتا رہا اور سر ہلا کے بولا۔ "تیرا بات ابھی اپن کا سمجھ میں کچھ کچھ آتا ہے پر...."

مگر اس نے آگے کچھ نہیں کہا۔

"سمجھ رہے ہو نا!" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" وہ تذبذب سے بولا۔

میں نے پھر وضاحت کرنی چاہی لیکن اس کے چہرے پر چھایا ہوا تکدر دیکھ کے میری آواز بجھ کے رہ گئی۔ اس کے لیے اشارہ ہی کافی تھا۔ اتنا میں تذبذب میں پڑ گیا کہ میں نے کوئی مہمل ہی بات کہہ دی ہے، واقعی پہرے داروں کی اتنی بڑی تعداد ہوتے ہوئے شاید ایسا ممکن نہ ہو۔

صبح آٹھ بجے کے قریب پہرے والے نے معمول کے مطابق ناشتہ لا کے رکھ دیا تھا۔ پیرو نے بعد میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی میں نے بھی اسے نہیں کریدا۔ اندر کمرے میں پڑے پڑے جی گھبرانے لگا تھا، صبح ہوتے ہی ہم صحن میں آ گئے تھے۔ یہاں دھوپ دوپہر کو بس چند منٹ کے لیے آتی تھی لیکن دن میں روشنی خوب پھیل جاتی تھی۔ دو کمرے ایک بڑا دالان اور چھوٹا سا صحن۔ یہی ہماری دنیا تھی۔ ہم کبھی اٹھ کے ٹہلنے لگتے، کبھی دالان میں آ کے مونڈھوں پر بیٹھ جاتے۔ یہ کوارٹر نما مکان مہمان خانے سے ملحق تھا اور خدمت گاروں ہی کے لیے بنایا گیا ہوگا کہ وہ مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں سے قریب رہیں لیکن معلوم ہوتا تھا، عرصے سے یہاں کوئی آباد نہیں تھا۔ اندر کمروں اور دالان کی دیواروں پر جا بجا مکڑی کے جالے تنے ہوئے تھے اور چڑیوں نے کونے کھدروں میں گھونسلے بنا رکھے تھے۔ مکان سے ایک راستہ مہمان خانے کی طرف جاتا تھا، دوسرا حویلی کی طرف۔ تین اطراف مہمان خانے اور حویلی کی عمارتوں کی اونچی دیواریں کھنچی ہوئی تھیں، صرف ایک طرف کسی قدر نچلی دیوار تھی۔ صحن اسی مقصد سے مختصر رکھا گیا ہوگا کہ اطراف کی عمارتوں پر واقع بالائی منزل کے کمروں سے یہ حصہ نظر نہ آ سکے۔ ہم نے صحن کی نچلی دیوار کے اس پار سُن گُن لینے کی کوشش کی تھی اور یہی اندازہ لگایا کہ اس طرف بھی اسی طرز کا کوئی مکان بنا ہوا ہے۔ کبھی کبھی وہاں سے

چلنے پھرنے کی آوازیں آتی تھیں ظاہر ہے پہرے داروں کے کون ہو سکتا تھا، دیوار پر چڑھ کر جھانکنا بھی ممکن نہیں تھا اگر یہاں بھی شب و روز ہمارے نگہبان بندوقیں لیے کھڑے رہتے۔ اصطبل کی کوٹھری سے فرار کی کوشش کے بعد انھیں ہماری طرف سے اتنا ہی محتاط ہو جانا چاہیے تھا۔ اگر ہم وہاں کچھ تحمل کر لیتے تو ہماری طرف سے اتنے چوکنے نہ ہوتے۔

اس وقت گیارہ بجے ہوں گے۔ وہ دوپہر کا کھانا ہمیں دو کے قریب پہنچاتے تھے لیکن اس روز معمول کے خلاف ایک سفید کپڑے میں بندھا توشہ بغل میں دبائے لٹکا ہوا ہمارے پاس آیا۔ کی ساخت سے وہ توشہ ہی دکھائی دیتا تھا۔

"کیا ہے جمعدار؟" پیرو نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"یہ تمھارے لیے ہے۔" وہ رازدارانہ لہجے میں توشہ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہاں ما تم؟ ابھی تو سالا دھوپ چڑھا ہوا ہے۔"

"یہ اندر سے بھیجا گیا ہے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

"اندر سے!" پیرو نے متعجب ہو کے پوچھا۔ "ابھی کیا؟ نے وقت بدل دیا ہے؟"

"نکو بابا! ادھر.... اُدھر زنان خانے سے بی بی صاحب نے ہے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "تمھارے لیے۔"

"اپنے لیے؟ کون بی بی صاحب؟" پیرو کھڑا ہو گیا۔

"بی بی صاحب۔" وہ تیزی سے بولا۔ "رات جو اس طرف تھیں، نواب حضور کی بہن بانو بی بی!"

"بی بی نے بھیجا ہے۔" پیرو نے اشتیاق سے کہا پھر اس کو تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سمیٹ لیا۔ "بی بی کو بولنا پہلوان تمھارا شکریہ بھی ابھی اس کو واپس لے جاؤ۔" وہ آہستگی سے۔

"بی بی نے بولا ہے واپس مت لانا۔" پہرے دار نے لہجے میں کہا۔

پیرو کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے توشہ پہرے دار سے لے لیا۔ ادھر پہرے دار گیا، اِدھر ہم نے اندر کے کمرے میں آ کھولا۔ خوان کی گرہ کھلتے ہی گلاب کے پھول بکھر گئے۔ گلابوں کے بیچ میں چینی کا ایک پیالہ رکھا تھا، پیالے پر اوپر نیچے پلیٹیں جمی تھیں۔ کمرے میں ہر سو خوشبو پھیل گئی۔ پیالہ کسی قدر گرم تھا مزعفر، زعفرانی، مغز، لیت اور چاندی کے ورق کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ ترشے ہوئے پستے، بادام اور ناریل۔ پیرو نے دمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھا کے ساتھ چمچے سے چاندی کے ورق کی تہہ ہٹائی۔ "بی بی نے بھیجا ہے دادا!" اس کی آواز لہک رہی تھی۔

ہم ناشتہ کر چکے تھے اور کچھ کھانے کو بالکل طبیعت نہیں چاہ رہی تھی لیکن پیرو نے پلیٹ میری طرف بڑھائی تو مجھ سے منع نہیں کیا جا سکا۔ چمچا منہ میں رکھتے ہی محسوس ہوا جیسے منہ میں خوشبو گھل گئی ہو۔ وہ کسی قسم کا حلوہ تھا، شیرینی نہایت کم تھی۔ کئی چمچے کھانے کے بعد بھی ہم پہچان نہیں سکے کہ کون سے مرکبات سے بنایا گیا ہے جو کچھ بھی تھا بے حد نفیس اور لذیذ تھا۔ یقیناً نواب کی بہن نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہوگا۔ مجھے میٹھے چاولوں کے سوا کوئی میٹھا مرغوب نہیں تھا لیکن میں نے ایسے ذائقے کا حلوہ کبھی نہیں چکھا تھا۔ ہم نے اسی وقت سارا پیالہ خالی کر دیا۔ پیرو کی آنکھوں میں بھی یہ رات کی طرح ان کے چہرے گھوم رہے ہوں گے۔ اب خیال آ رہا تھا کہ رات ہم ان دونوں کے نام بھی نہیں پوچھ سکے۔ پہرے دار نے نواب کی بہن کو بانو بی بی کے نام سے پکارا تھا مگر اس کا صرف اتنا نام نہیں ہوگا۔ بہرحال انھوں نے ہمیں یاد رکھا، ہمارا اتنا خیال کیا۔ ان کا دل بھی ان کے چہرے کی طرح صاف و شفاف تھا۔ ممکن ہے اب وہی کوئی تدبیر کریں۔ رات جس طرح وہ آئی تھیں اور جس طرح انھوں نے یہ توشہ بھیجا تھا، اسی طرح وہ ہماری رہائی کی جستجو میں بھی لگی ہوئی ہوں گی، کوئی عجب نہیں کہ کسی وقت بھی پہرے دار ہمیں اشارہ کر دیں۔ آج پہلی بار ایسا لگ رہا تھا کہ ہم یہاں کے لیے نہیں ہیں۔ شاید یہی کچھ یاد دلانے کے لیے انھوں نے ہمیں توشہ بھیجا تھا۔

دوپہر کا کھانا ہم سے نہیں کھایا گیا۔ ہم شام تک اندر کمرے میں پڑے سوتے رہے۔ اٹھے تو دھوپ اتر چکی تھی۔ باہر آ کے ہم نے منہ دھویا اور کچھ دیر چہل قدمی کی، اتنے میں اندھیرا چھانے لگا۔ آج بھی دن بھر حویلی سے نواب کے کسی فرستادے نے ہم سے کوئی سلسلہ جنبانی نہیں کی تھی، اب انھوں نے سب کچھ ہمی پر چھوڑ دیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کے ہم دالان میں بیٹھے رہے۔ جیل کی طرح وہ ہمیں کچھ کام سونپ دیتے تو وقت اتنا بھاری نہ گزرتا۔

اندھیرا خاصا گہرا ہو گیا تھا، پیرو مونڈھے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ لڑکھڑا کے رہ گیا جیسے کوئی خواب دیکھتے ہوئے بیدار ہو گیا ہو۔ مجھ سے وقت پوچھنے لگا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ یکایک اسے وقت کی فکر کیوں ہوئی ہے، بدلیں کو وقت سے کیا واسطہ۔ گھڑی میرے پاس نہیں تھی لیکن اندھیرے رنگ سے پتہ چلتا تھا کہ نو بجے ہوں گے یا اس سے کچھ کم زیادہ۔

پیرو اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے تھمے ہوئے لہجے میں دور تعینات پہرے دار کو آواز دی۔

"کیا بات ہے؟" پہرے دار نے وہیں کھڑے کھڑے درشتی سے پوچھا۔

"اُدھر جا کے بولو اپن ابھی بڑے نواب کو ملنا مانگتا ہے۔"

"بڑے نواب" کا نام سن کے پہرے دار آگے آ گیا۔ "کیا کہتے ہو؟"

"اونچا سنتا ہے کیا؟" پیرو نے ناگواری سے کہا۔ "اپن بولتا ہے ابھی جا کے بڑے نواب کو بولو، وہ اپن سے بات کرے۔"

پہرے دار نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر لوٹ گیا اور جا کے اپنے ساتھی پہرے دار سے کانا پھوسی کرنے لگا۔

"دادا!" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ "اسے کیوں بلا رہے ہو؟" میری آواز کپکپا رہی تھی۔

"ابھی ٹھیک سے رہنا راجا!" وہ منمناتے ہوئے بولا۔

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ دوسرا پہرے دار چند لمحوں کے لیے باہر گیا تھا اور واپس آ گیا، اس نے ہمیں کوئی جواب نہیں دیا۔ دس منٹ گزر گئے، پندرہ منٹ گزر گئے۔ دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ابھری۔ ممکن ہے نواب حویلی میں موجود ہی نہ ہو یا مصروف ہو، انکار کر دے یا اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دے۔ میرے سر میں طرح طرح کے وسوسے بھنبھنا رہے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہاں آنے کے بجائے وہ ہمی کو حویلی میں طلب کرے۔ حویلی میں ہماری طلبی ہمارے لیے اس سے بہتر جگہ ثابت ہو سکتی تھی مگر وہ چاہے ہمیں بلائے یا خود آ جائے، ہمیں اس سے اتنا سروکار نہیں تھا جتنا وقت سے تھا۔ وہ کتنا ہی مصروف ہو، ہمارا پیغام سن کے اسے ذرا سی بھی دیر نہیں لگانی چاہیے اس لیے کہ وہ ہماری طرف سے ایسے کسی پیغام کا شدت سے منتظر ہوگا۔

کوئی آدھ گھنٹہ گزر گیا پھر چند ثانیوں بعد دروازے سے تیز چاپیں سنائی دیں اور اپنی جگہوں پر جمے ہوئے پہرے دار ست پٹا کے کھڑے

ہوگئے۔ اُس لمحے میری آنکھوں میں دھندسی اُتر آئی، میں نے دروازے پر نواب کو نمودار ہوتے دیکھا۔ سُرمئی شیروانی میں ملبوس، سَر پر تُرکی ٹوپی، بھاری بھرکم جسم، اوسط قد۔ وہ بڑا نواب ہی تھا۔ خاں صاحب کے علاوہ ایک پہرے دار بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ بڑے نواب نے دھمکتے قدموں سے صحن عبور کیا۔ پیرو مونڈھے پر بیٹھا رہا، میں بھی نہیں اُٹھا۔ وہ دونوں ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ٹھیر گئے۔ اُن کے ساتھ آنے والے پہرے دار کے کندھے سے بندوق لٹک رہی تھی، اُس کا ڈیل ڈول متناسب تھا۔ وہ دالان کے پار کچھ دُور رہ گیا۔ دروازے کے دونوں پہرے دار بھی کچھ آگے آ گئے تھے۔

پیرو نے بیٹھے بیٹھے نواب سے کہا "اپن کو ابھی تم سے کچھ بولنا ہے۔" نواب کو پیرو کا یہ لہجہ پسند نہیں آیا ہوگا، اُس کا چہرہ کچھ اور کھنچ گیا لیکن اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا، خاں صاحب نے اُس سے مونڈھے پر بیٹھنے کی درخواست کی۔

"آ، ہاں، بیٹھ جاؤ، بات زیادہ لمبا نئیں ہے پر دھیان سے سُننے کا ہے۔" پیرو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

نواب مجھے اور پیرو کو تُند نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا "تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمھاری رہائی اُسی وقت ممکن ہے جب ... "

"اپن جانتا ہے۔" نواب کی بات ادھوری رہ گئی۔ پیرو نے خاں صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "پر اِس سُوَر کا جنے کو تم اِیدر کیوں لے آیا، اپن کو ابھی اکیلے میں تم سے کچھ بولنا ہے۔"

"زبان کو لگام دے کے بات کرو۔" نواب گرجتی آواز میں بولا۔

"جو کہنا ہے اِن کے سامنے ہی کہو۔"

"میں، میں ہٹ جاتا ہوں حضور۔" خاں صاحب نے لجاجت سے کہا۔

"نہیں۔" نواب نے اُسے جھڑک دیا۔

"اِس کو اپن سے دُور رکھو نواب!" پیرو نے سرد لہجے میں کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا "ابھی تم بھی اِیدر سے ہٹ جاؤ راجا!"

میں ابھی تک مونڈھے پر بیٹھا تھا، میری نظریں آمنے سامنے ہر سُو بھٹک رہی تھیں، پیرو کے اِس اشارے کا میں منتظر ہی تھا، میں نے بظاہر کراہت سے اُس کی ہدایت پر عمل کیا اور دالان کے پار چند قدم کی دُوری پر جا کے کھڑا ہوگیا۔ خاں صاحب ابھی تک وہیں موجود تھے لیکن اُن کے قریب بیٹھنے سے پیرو پر زیادہ اثر نہیں پڑتا تھا، اُن کے لیے اچھا تھا کہ وہ بھی دُور ہو جائیں۔

"ابھی اِس چڑی مار کو بیچ میں مت لاؤ۔" مجھے پیرو کی آواز سُنائی دی، اُس نے خاں صاحب کی موجودگی میں کوئی بات کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں پہلے ہی اُن کے درمیان سے ہٹ گیا تھا۔ پیرو نے نواب سے کمرے کی خلوت میں چلنے کو نہیں کہا تھا، پیرو کی یہ ضِد دانستہ تھی اور جیسا

کہ پیرو چاہتا تھا نواب نے اِسے پیرو کی پسپائی، کسی ہزیمت
شخص کی آخری مزاحمت ہی پر محمول کیا ہوگا، نواب کو یہ وقت
سمجھنا چاہیے تھا۔ یہ گھڑی کتنے دِنوں کے اذیت ناک انتظار
آئی تھی، اِس مدت میں اُسے ہمارے بارے میں بہت کچھ اندازہ
اور اُسے یہ بجا اندیشہ لاحق ہوگا کہ کہیں ہم اپنا ارادہ نہ بدل د
ہمارا سَر نہ پھر جائے سو اُس نے معاملہ فہمی ہی مناسب سمجھ
تکرار نہیں کی۔ اُس نے خاں صاحب کو اشارہ کر دیا۔ خاں ص
قدموں سے میری طرف بڑھے لیکن مجھے سامنے دیکھ کے مجھ
پر جا کے کھڑے ہو گئے۔ نواب کے ساتھ آنے والے پہرے دار
کندھے سے اُتار کے ہاتھ میں تھام لی تھی مگر نشانہ لینے والے
نہیں، اُدھر سامنے حویلی کی طرف جانے والے دروازے پر بھ
تھے، باہر بھی کمی نہیں تھی۔ احتیاط اپنی جگہ لیکن اِن حالات
موقع پر کسی کے بھی دماغ میں ہماری جانب سے کوئی خطرہ
رہا ہوگا، انھیں اچھی طرح علم تھا کہ ہمارے پاس ہتھیار نہیں
پہلے ہی اپنے پاگل پن کی سزا خوب بھگت چکے ہیں۔

میں نے دیکھا، پیرو نے اپنا مونڈھا کھسکا کے نواب
کیا اور سرگوشی میں اُس سے کچھ کہنے لگا۔ جہاں میں کھڑا تھا،
اُس کی آواز بالکل نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اپنے حواس مجتمع
پیرو کی طرف نگاہیں جمائے رکھیں، ساتھ ہی پہرے داروں
سے ایک تو میرے قریب ہی تھا۔ مجھے احساس تھا کہ پیرو کو
نہیں کرے گا چنانچہ خاں صاحب کو اُن کے درمیان سے ہٹے
ہوئے ہوں گے کہ پیرو نے آناً فاناً مونڈھے سے اچھل کے نوا
پر ہاتھ ڈال دیا۔ اِدھر میں نے صرف اتنا توقف کیا کہ مجھ
دُور کھڑا ہوا پہرے دار نشانہ لینے کے لیے بوکھلائے، نواب کو
میں دیکھ کے اُس کی توجہ لازماً میری جانب سے منتشر ہو جا
میں میں اُس پر جھپٹ پڑتا۔ نواب کی چیخ سُن کے وہ سخت
ہو گیا تھا اس لیے بندوق تاننے کے بجائے نواب کی مدد کے
اُسی کی طرف بھاگا، پھر اُسے اپنے ہاتھ میں لٹکی ہوئی بندوق
وہ نشانہ لینے کے لیے بندوق اوپر کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے
بائیں طرف سے اُس کی پسلی پر پوری طاقت سے ضرب لگا
مجھے دُور دروازے کے دونوں پہرے داروں کو بھی ز
تھا سب کچھ لمحوں میں ہو جانا چاہیے تھا، اس کے بعد میں کو
ملنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اُن میں سے کوئی گولی چلانے کی غلط
گا۔ پیرو پشت سے نواب کے دونوں ہاتھ جکڑے ہوئے اُس
میں تھا۔ اُس نے نواب کے بازو پیچھے سے اِس طرح گرفت
کہ دونوں کے جسم گتھے ہوئے نہیں تھے۔ اِس سے زیادہ مؤثر ط

لاً ایک ہاتھ سے گردن جکڑنے اور دوسرا ہاتھ خالی رکھنے کا طریقہ نس
ند کر دینے اور نرخرے کی چٹکی بھرنے کا طریقہ لیکن نواب اُچکے کا کوئی
ی نہیں تھا، نہ اُن میں سے اور کوئی۔ اس طرح پیرو کو رُخ بدلنے، پینترے
لنے کی زیادہ آسانی ہو جاتی تھی۔ اِدھر نواب کو ہوش میں رکھنا بھی ضروری
۔ دروازے کے پہرے داروں نے ایک پَل کی چُوک نہیں کی، اُنھوں
بے اختیار بندوق تانی مگر سامنے نشانے پر نواب کو دیکھ کے پاگلوں
طرح اپنی جگہوں سے دوڑ پڑے۔ صحن بڑا نہیں تھا، اُسے پھلانگنے
انھیں کچھ وقت نہ لگتا۔ گو پیرو نواب کو دالان میں بالکل اندر کی
ف دیوار کے ساتھ قابو میں کیے کھڑا تھا مگر کسی بھی لمحے پہرے دار
تک پہنچ سکتے تھے، اس سے پہلے مجھے نواب کے ساتھ آنے والے
دار کی بندوق پر قبضہ کر لینا تھا۔ پسلی پر میرا ہاتھ پڑتے ہی اُس کا
م زمین سے اُکھڑ گیا، پھر مجھ پر دیوانگی سی طاری ہوئی۔ میں نے اُسے
لنے کی بھی مہلت نہیں دی، بندوق پر جھپٹا مارنے کے ساتھ ساتھ
کی ریڑھ کی ہڈی پر بھی ضرب لگائی، وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ اب
دق میرے ہاتھ میں تھی۔ اِدھر سے خاں صاحب چیختے ہوئے پیرو کی
ف دوڑ پڑے تھے اور اُدھر سے دروازے کے دونوں پہرے دار۔
ں صاحب کی مجھے اتنی فکر نہیں تھی، وہ شور مچانے کے سِوا کیا کر سکتے
ے مگر پہرے داروں کے پاس ہتھیار بھی تھے اور وہ اسی کام کے لیے نواب
نمک کھاتے تھے حالانکہ مجھے اُن کی طرف سے بھی اتنا مضطرب
ں ہونا چاہیے تھا، اُن کے سامنے کوئی اور نہیں، پیرو تھا پھر بھی احتیاط
ری تھی۔ گولی چلانا ممکن نہیں تھا تو وہ یہی کر سکتے تھے کہ پیچھے
یر کی طرف جائیں اور بندوق کی بٹ کے ذریعے یا خود اپنی طاقت
بل پر نواب کو پیرو کی گرفت سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کریں،
ں صورت میں بھی پیرو اُن سے خوب نمٹ سکتا تھا۔ وہ نواب کو
ڑے جکڑے متعدد پینترے بدل سکتا تھا، میرے آنے تک وہ آسانی
انھیں اُلجھائے رکھتا، اُس کے ہاتھ اگر گھرے ہوئے تھے تو پیر آزاد
۔ اگر پیر بھی گھرے ہوئے ہوتے تو سَر تو کھلا تھا۔ جگل کہتا تھا کہ سارا جسم
جھائے پر سَر نہیں بندھنا چاہیے۔ پیرو کے قریب جانا پہرے داروں
لیے خود موت کو دعوت دینا تھا۔ یہ ساری باتیں پیرو کے ذہن
ں بھی ہوں گی۔

مجھے توقع تھی کہ اُن کی تمام تر توجہ نواب ہی پر مرکوز رہنی چاہیے
ب کو اس حال میں دیکھ کے وہ مجھے خاطر میں نہیں لائیں گے اوّل
انھیں اپنے حواس برقرار رکھنا دشوار ہوگا کیونکہ یہ اُفتاد اُن کے لیے
ہمّاتی، سو عام حالات کی نسبت اُن کا بوکھلا جانا لازم تھا۔ یہی
سوچ کے پیرو نے پہلے سے مجھ سے کوئی بات کرنا، کوئی ہدایت دینا
ری نہیں سمجھا تھا۔ ویسے ہدایت سے آدمی پر اُلٹا اثر بھی ہو سکتا ہے،

اُس کا ذہن پابند ہو جاتا ہے اور ہاتھ پیر اکڑنے بھی لگ سکتے ہیں۔ جگل کہتا تھا کہ دوسرے کے محض دست و بازو ہی نہیں، اُس کا ارادہ قابو میں کرنا چاہیے۔ کوئی ایسا وار کرو کہ سامنے والے کا ردِ عمل تقینی ہو جائے مگر یہ امکان ذہن سے یکسر نکالنا نہیں چاہیے کہ سامنے دوسرا آدمی ہے، اُس کے سَر میں کچھ بھی سما جائے، وہ اچانک پاگل ہو جائے۔ بعض مرتبہ ہر لمحے ایک نیا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

جتنی دیر میں مَیں اپنے قریب کے پہرے دار سے نمٹ کے اُس کی بندوق ہاتھ میں اُٹھائے اُن کی طرف متوجہ ہوا، دروازے کے پہرے دار صحن عبور کر کے دالان میں پہنچ گئے۔ اُسی دم پیرو نے نواب کے بازوؤں پر اپنی گرفت سخت کر دی۔ نواب کی کراہوں اور چیخوں کے درمیان پیرو نے اُنھیں بیچ میں نہ پڑنے اور دُور رہنے کا حکم دیا۔ اُنھوں نے پیرو کا حکم جیسے سُنا ہی نہیں اور نواب کو اُس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے پَر تولنے لگے۔ وہ بُری طرح پیرو کے گرد منڈلا رہے تھے مگر اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ خیال الگ اُنھیں بدحواس کر رہا ہوگا کہ اُن کی کسی غلطی سے نواب کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ نواب کراہ رہا تھا اور پیرو کی کسی جنبش سے وہ اچانک اُچھلنے، چیخنے لگتا تھا لیکن پہرے داروں کو اُسے اِس اذیت سے نجات دلانے اور پیرو کو ہاتھ لگانے کی فرصت نہیں ملی۔ پیچھے سے میں نے ایک کے سَر پہ بندوق کی بٹ ماری، میرے قیاس کے مطابق دوسرا یہ دیکھ کے بندوق کی نال آگے کیے بے تابانہ مجھ پر حملہ آور ہوا، میں نے اُس کے ساتھی کو اُس کے سامنے کر دیا، نال اُس کے ساتھی ہی کے سینے میں پیوست ہوئی۔ پھر وہ اکیلا میرے مقابل رہ گیا۔ میں اُس کے ساتھی کو وہیں چھوڑ کے سیدھا اُس کی طرف بڑھا مگر بندوق ہاتھ میں ہونے کے باوجود وہ اُلٹے قدموں پیچھے کی جانب بھاگا اور ٹھیر گیا، ٹھیر کے اُس نے بندوق سنبھالی۔ پہلی مرتبہ اُن میں سے کسی نے اتنے ہوش کا ثبوت دیا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ دُور نہیں رہا تھا۔ اُس کے نشانے سے بچنے کے لیے میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ یا تو میں اپنا رُخ بدل دوں یا زمین پر گر جاؤں۔ میں اپنی جھونک ہی میں بڑھتا ہوا عین اُس کے مقابل زمین پر گر گیا۔ گولی سامنے مہمان خانے کی دیوار پہ لگی ہوگی، دوسری گولی چلانے کے لیے اُسے چند لمحوں کا وقت درکار تھا، میرے پاس بھی اُسے اِس اقدام سے باز رکھنے کے لیے اتنا ہی وقت تھا۔ یہ امکان بھی تھا کہ وہ نشانے کے لیے بندوق سنبھالنے کے بجائے مجھ پر کھینچ مارے۔ میں اُس کی ٹانگوں کے پاس تھا۔ میں نے اپنی بندوق چھوڑ دی اور اُس لمحے کچھ یہی میری سمجھ آیا، میں نے ہاتھ بڑھا کے اُس کی ٹانگیں جکڑ لیں اور اُنھیں زور سے اپنی طرف جھٹکا دیا۔ وہ زمین پر چِت گرا، میں نے اُسے دوبارہ نہیں اُٹھنے دیا۔

گولی کی آواز برابر کے مکان تک یا باہر حویلی میں کہیں اور بھی

ٹھنی گئی ہوگی، میں نے جلدی سے تینوں پہرے داروں کے کارتوس اور بندوقیں سمیٹیں، اُن کے تہمد الالان میں اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے، اُن کی تلاشی میں اور وقت صَرف ہوتا۔ خاں صاحب ایک کونے میں دبکے ہوئے تھے، اُن کے جسم پر لرزہ طاری تھا، آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے بندوق کا رُخ پیرو کی طرف کر دیا مگر اس سے پہلے ہی اُس نے ہانپتے ہوئے نواب کو چھوڑ دیا تھا۔ اپنے سامنے مجھے بندوق تانے دیکھ کے نواب ٹھٹک کے رہ گیا۔ پیرو نے بہ عجلت اُس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ شیروانی کی نچلی جیب میں تمنچا موجود تھا۔ پیرو نے اُس کے دونوں ہاتھ شروع ہی سے باندھ رکھے تھے، اُسے تمنچا چھونے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ وہ گُنگ کھڑا تھا کہ پیرو نے اُسے آگے کی طرف دھکیل دیا۔

دروازے میں داخل ہوتے وقت پیرو نے پھر اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ "ابھی اپن کا ایک ایک بات دھیان سے سنو۔" پیرو نے درشتی سے کہا۔ "دوبارہ اپن کچھ نئیں بولے گا۔"

اُس نے نواب کو کسی تاخیر کے بغیر گاڑی منگوانے کی ہدایت کی اور کہا کہ اگر اُس نے ذرا بھی حیل و حجت کی تو اُسے دوسرا موقع نہیں دیا جائے گا۔ اسی دوران خاں صاحب نے یکایک پیرو کے پیر پکڑ لیے اور گڑگڑانے لگے۔ پیرو کے چہرے پر آگ برسنے لگی تھی۔ اُس نے انھیں گدی سے پکڑ کے اوپر اُٹھا لیا۔ خاں صاحب کا سارا جسم پھڑپھڑانے لگا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پیرو اُن کے منہ پر تھوکے گا مگر وہ لیکن دہشت سے خاں صاحب کی آنکھیں ہی پھر گئی تھیں۔ پیرو نے دو تین جھٹکے دے کے انھیں چھوڑ دیا۔ خاں صاحب وہیں لڑکھڑا کے رہ گئے۔

ہم نے دروازہ عبور نہیں کیا تھا کہ دوسری جانب سے بیک وقت کئی آدمیوں کی منڈلاتی چاپیں اور آوازیں سُنائی دیں۔ پیرو نے نواب کو روک لیا۔ "ابھی سنو نواب!" وہ دبی آواز میں بولا۔ "اندر اپن تم کو نچاتا ہوا بھی لے جا سکتا ہے۔ پر اِدھر حویلی کے لوگوں میں تمھارا بہت خواری ہوگا۔ جیسا اپن بولتا ہے، ابھی ویسا ہی کرو۔ آگے تم نے کوئی بھی غلطی کیا تو اکیلا تمھی نئیں جائے گا، اپن کو پتہ ہے، ایدر نانیاں بھی بیٹھا ہے، سمجھا۔"

دروازے کے پار گلی جیسی ایک مختصر راہ داری تھی۔ پہرے دار اندر گھس آئے تھے لیکن سامنے نواب کا چہرہ دیکھ کے وہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے اُلٹے قدموں پیچھے لوٹ پڑے۔ راہ داری فوراً صاف ہو گئی تھی۔ آگے اونچی چھت اور متعدد ستونوں کا ایک بڑا ہال تھا۔ ہال میں ارد گرد کمرے اور گزرگاہیں بنی ہوئی تھیں۔ حویلی اور مہمان خانے کی عمارتوں کے درمیان یہ جگہ سنگم کا درجہ رکھتی ہوگی۔ جیسے ہی ہم وہاں داخل ہوئے، ہم نے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے چار پانچ پہرے داروں کو اپنا منتظر پایا، بندوقیں اُن کے پاس تھیں۔ نواب ہم سے آگے تھا، اُس کے پیچھے پیرو، پھر میں۔ "یہ اِن کو بولو، ابھی یہ سارا ہتھیار پھینک دیں اور گاڑی کا بولو۔" پیرو نے سرگوشی میں نواب کو مخاطب کیا۔ نواب نے سر اُٹھا پہرے داروں کی طرف دیکھا اور ایک لمحے تامّل کیا، اُسی لمحے پیرو نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ "اپن کے پاس ابھی ٹائم تھوڑا ہے نواب!"

ہال سے گاڑی کی جگہ تک آنے کا راستہ اتنا طویل نہیں مگر نواب کسی بھی وجہ سے اُسے طول دے سکتا تھا۔ ہمیں کچھ ... ہوتی تو ہم کسی خاص راستے کے لیے اُس پر زور دیتے۔ ہال سے وہ ... طرف مڑ گیا تھا۔ حویلی کی عمارت میں اُس کا اور پیرو کا فاصلہ ... قدم سے زیادہ نہیں ہوگا۔ پیرو نے اُس کی کمر پر تمنچا تان نہیں رکھا لیکن تمنچا تھا اُس کے ہاتھ ہی میں۔ میری بندوق اٹھی ہوئی تھی۔ میں احتیاطاً بار بار مڑ کے پیچھے دیکھ لیتا تھا۔ حویلی میں اند... روشنی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ نواب کسی موڑ پر نظروں سے اوجھ... جائے، کسی کھلے دروازے میں بھاگ جائے یا ہمیں کسی ایسی ... کے کھڑا کر دے جہاں سے ہم پھر کسی طرف نہ جا سکیں۔ یہ سب ... تھا مگر نواب کی کوئی رگ پھڑک جانے کا امکان ہر لحظے موجو... پہرے داروں میں کسی کے ہاتھ بہک سکتے تھے۔ ہال کے پانچوں پہ... نے اپنی بندوقیں پھینک دی تھیں اور اُن میں سے ایک نواب ... اشارے پر موٹر تیار رکھنے کے لیے دوڑ گیا تھا۔ وہ ڈرائیور کو ... کرنے کے ساتھ ساتھ حویلی کے دربانوں، دوسرے پہرے داروں اور ... کی فوج جمع کرنے کا فریضہ بھی انجام دے سکتا تھا۔ آگے جہاں جہاں ہم گزرے، درمیان میں متعدد ملازموں سے ہمارا سامنا ہوا۔ ہمیں وہ جہاں کھڑے تھے، وہیں سمٹ کے رہ جاتے۔ سارے راستے ... سر اُٹھائے متوازن رفتار سے چلتا رہا، اُس کے ہاتھ پیر کھلے ہوئے ... پیرو کا تمنچا بھی کسی کو نظر نہیں آ رہا ہوگا لیکن اُن دونوں کے پیچھے ... بندوق اُٹھی ہوئی تھی اور میرے سارے حواس میری نگاہ سے بندھے ... تھے۔ حویلی کے ملازموں میں سے اکثر نے ہمیں پہلی بار دیکھا ہوگا۔ اُن کے علم میں نہ ہوگا کہ اسی چار دیواری میں کئی دن سے ہم ... ٹھیرے ہوئے ہیں۔ دالانوں اور مختلف راہ داریوں سے گزرتے ہم دو تین منٹ سے زیادہ نہیں چلے تھے کہ سامنے پورچ تھا۔ حویلی کی عمارت کے پورچ میں موٹر کھڑی تھی۔ وہی سیاہ موٹر ... خاں صاحب ہمیں تھانے سے یہاں لائے تھے۔ دُور سے ... صرف ایک آدمی بے تابی کے ساتھ اِدھر سے اُدھر ٹہلتا دکھائی دیا۔ ڈرائیور معلوم نہیں ہوتا تھا بلکہ حویلی کے دربانوں کی مخصوص وردی ... ہوئے تھا۔ میرا سارا جسم دھڑک رہا تھا۔ کسی اندھے کا روشنی کی ... نظر آنے پر جو حال ہو سکتا ہے، وہی کچھ میرا تھا۔ پیرو کا بھی ... اُسے بھی کسی نہ کسی طرح موٹر میں بیٹھ جانے کی جلدی ہوگی ... موجود معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اُس کے آنے میں کوئی دیر لگتی ...

...ہوتا خود موٹر چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ موٹر تک ہمارے پہنچتے پہنچتے ...طرف سے ایک دُبلا پتلا لمبا سا شخص پگڑی باندھتا، لپکتا ...ا آیا۔ اُس نے بدحواسی سے سر جھکا کے نواب کو تعظیم دی اور ...ٹر کی پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ اِس دوران اطراف میں ...گے ہوئے لوگوں کی سرگوشیاں اور چاپیں گونجنے لگیں تھیں۔ دیکھتے ...ھتے کئی آدمیوں نے ایک طرح سے پورچ گھیرے میں لے لیا تھا ...گر وہ قریب نہیں آئے، نہ انھیں نواب نے کوئی اشارہ کیا۔ نواب ... آنکھیں اُبلی ہوئی تھیں، ہونٹ آگے نکلے ہوئے تھے اور سارا ...رہ سُوجا ہوا سا تھا۔

پیرو نے ہاتھ بڑھا کے اُسے گاڑی میں بیٹھنے کی ہدایت ... وہ بے حس سا کھڑا رہا۔ اُس کے نتھنے کچھ اور پھول گئے تھے۔ پہلی ... اُس نے سر گھما کے اطراف میں فاصلے پر کھڑے ہوئے اپنے آدمیوں ...ر کے دیکھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اشارہ کرتا، پیرو نے اُسے ...وکا دیا۔ "اپن تم کو اندر سے کپڑے اُتار کے نئیں لایا ہے۔" پیرو نے ...نکارتے لہجے میں سرگوشی کی۔ "ابھی تم کو تھوڑا بہت گنتا تولتا آتا ...گا، جو اپن بول رہا ہے، اُس کو تھوڑا سمجھو۔ تم ادھر واپس آ جائے گا، ...چھے ایدر کے لوگ باگ کو بول جاؤ کہ وہ تم کو زندہ دیکھنا مانگتا ہے تو ...ب تک تم ایدر لوٹ کے نہ آ جائے، سالا ہاتھ پیر تھامے بیٹھا رہے۔" کہتے ہی پیرو نے اُس کی کمر پر ہلکی سی تھپکی دی اور قدم آگے بڑھا دیے۔

پورچ میں دربان ہیبت زدہ کھڑا تھا، موٹر میں بیٹھ کے ...رو نے اُسے بلایا اور نواب سے کہا کہ وہ اُس کی کہی ہوئی ہر بات ...ی پس و پیش کے بغیر دربان تک منتقل کر دے۔ دربان لڑکھڑاتا ہوا ...ا تھا۔ نواب نے بوجھل آواز میں چند ہی لفظ کہے، اتنا کافی تھا۔ ...رو خود بڑھ کے ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا چنانچہ ...ھے نواب کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھنا پڑا۔ نواب موٹر ...یں بیٹھا ہوا تھا، اِس کے باوجود ڈرائیور نے اُس کی اجازت ...اہی، جواب میں نواب کو مہر بہ لب دیکھ کے پیرو نے ڈرائیور ...ور سے کہنی ماری۔ موٹر حرکت میں آ گئی۔ سڑک کے دونوں طرف ...ونچے اونچے درختوں اور پھولوں کے تختوں کا سلسلہ تا حدِ نظر ...یلا ہوا تھا۔ باہر روشنی اتنی نہیں تھی جتنی اندر تھی تاہم موٹر کی تیز ...نی میں سڑک کے ساتھ اور درختوں کے آس پاس کھڑے ہوئے آدمی ...ی صاف نظر آ رہے تھے۔ میں ایک طرف نواب پر نظر رکھے ہوئے تھا، ...سری طرف بندوق کی نال کھڑکی سے باہر نکلے ہوئے تھا۔ پیرو کے ...ھ میں بھی تمنچا اُٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے شاید دانستہ موٹر کی رفتار تیز ...یں ہونے دی مگر پیرو نے اُسے ٹوکا بھی نہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ...ڑے بڑے دروازے کے پاس آ کے کھڑی ہو گئی۔ دروازہ بند تھا۔ یہاں پہرے داروں کی کثرت کا اندازہ ہمیں آتے وقت ہی ہو چکا تھا۔ موٹر دیکھتے ہی دروازہ کھل جانا چاہیے تھا۔ تاخیر کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ ہمیں اِس طرح نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے جی میں مزید کچھ ٹھان لی تھی مگر وہ ایسی صورت میں کیا کر سکتے ہیں؟ ہمیری سانسیں سینے میں اٹک گئیں۔

بڑا دروازہ اونچی فصیل نما چار دیواری سے ملحق ایک دو منزلہ عمارت پر مشتمل تھا، اُس کی لمبائی چوڑائی کسی قلعے کے دروازے سے مشابہ تھی۔ نیچے اوپر کھلی محرابوں کے کمرے بنے ہوئے تھے، بارہ دریوں جیسے۔ پہرے دار ہر جگہ ہو سکتے تھے، ایسی جگہوں پر بھی جہاں ہماری نظر نہ پہنچ سکتی ہو۔ موٹر میں پیرو اور میں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں بیٹھے تھے۔ پیرو آگے بائیں طرف تھا، میں پیچھے دائیں طرف۔ لبلبی میری انگلی کی گرفت میں تھی۔ چند لمحے سکوت رہا، نہ دروازہ کھلا نہ پہرے داروں نے اپنی جگہ سے حرکت کی حالانکہ ہمیں مہمان خانے کے زنداں سے یہاں تک آنے میں کوئی وقت نہیں لگا تھا مگر اتنی ہی دیر میں اُن تک اطلاع پہنچ گئی تھی۔ جو پہرے دار موٹر تیار رکھنے کا حکم سن کے ہال سے چلا تھا، اُسی نے کسی طرح انھیں خبردار کیا ہوگا۔

لمحے گزر گئے، دروازہ نہیں کھلا۔ پیرو نے گردن موڑے بغیر دھیمی آواز میں نواب سے کہا۔ "اپن پہلے پاس ہی کا نشانہ لے گا نواب!" نواب کے جواب کا انتظار کیے بغیر اُس نے ڈرائیور کو ایک طرف دھکیل کے خود ہارن بجایا۔ ہارن کی آواز نے دروازے پر چھایا ہوا سناٹا درہم برہم کر دیا۔ پہرے دار بھی بیسے نہ کھڑے رہ سکے۔ انھوں نے دروازہ بند رکھ کے موٹر روک لی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی وہ کوئی بھی ارادہ نہیں کر پائے ہیں۔ انھیں اطلاع ملے دیر ہی کتنی ہوئی ہوگی، اس اثنا میں اُن کے لیے کوئی متفقہ فیصلہ کرنا دشوار تھا۔ دروازہ بند رکھ کے انھیں صورتِ حال سمجھنے کی کچھ مہلت درکار تھی۔ اُن کی پُراسرار خاموشی کا یہی سبب ہو سکتا تھا۔ کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے وہ ہماری ہی جانب سے کسی اشارے یا پہل کے منتظر ہوں گے۔ اطلاع دینے والا انھیں ساری بات سے باخبر نہیں کر سکا ہوگا کیونکہ وہ خود بھی زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میری رگوں میں خون کبھی جمنے کبھی کھولنے لگتا۔ اگر واقعی انھوں نے دروازہ نہ کھولا اور بندوقیں اُٹھائے یوں ہی ساکت و جامد کھڑے رہے تو کیا ہم بھی یوں ہی موٹر میں بیٹھے انتظار کرتے رہیں گے! لیکن وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں! کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ موٹر میں نواب بھی موجود ہے! کیا وہ واقعی پاگل ہو گئے ہیں یا انھیں اپنے آقا کی کوئی فکر نہیں یا انھوں نے جان لیا ہے کہ ہمیں بھی تو اپنی زندگی اتنی ہی عزیز ہوگی، نواب کو کچھ ہو گیا تو موٹر کبھی باہر نہ جا سکے گی۔ اُن کے پاس بندوقوں اور آدمیوں کی کمی نہیں ہے۔ وہ ہمارے جسم ایک پل میں چھلنی

کر سکتے ہیں مگر وہ یہ کیوں نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ہمارے پاس بھی کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ ہم نواب کو ساتھ لیے تا دیر موٹر میں بیٹھے رہیں گے۔ اگر ہم نواب سے دست بردار ہو گئے تو ہماری سزائیں بھی کچھ کم نہیں ہوں گی۔ انھیں اپنے آقا کو ایسی کسی طویل اذیت سے دوچار نہیں کرنا چاہیے جس کا کچھ حاصل نہ ہو اور جس میں ہر لمحے اُس کے لیے خطرہ ہی خطرہ ہو۔ کئی پہرے دار میری بندوق کی زد پر تھے مگر مجھے یا پیرو کو ایسی کوئی غلطی نہیں کرنی تھی، دیکھتے ہیں انھیں کب تک دروازہ نہیں کھولنا پڑتا۔ جب تک نواب ہمارے پاس زندہ موجود تھا، ہمارے لیے کچھ تحمل ہی مناسب تھا۔ ہمیں یہاں روک کے وہ باہر سے کوئی مدد طلب کرنے یا پولیس کو بلانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے ہوں گے۔ ہمارے لیے ہر راستہ بند کر دینے کے سنگین نتائج سے وہ خوب آگاہ ہوں گے۔ ہم نواب کو یہاں تک لے آئے تھے تو کوئی عزم ہی کر کے آئے ہوں گے اور نواب یہاں تک آ گیا تھا تو عافیت کا یہی آخری امکان اُسے نظر آیا ہو گا۔ یہ امکان اب بھی جوں کا توں تھا۔ اگر وہ یہ سب کچھ نہیں سوچ رہے تھے تو نواب ہی کو کوئی حکم دینا چاہیے تھا لیکن وہ گم صم بیٹھا رہا۔ یا تو اُسے اِس حالت میں اپنے غلاموں کو بلا کے دروازہ کھولنے کا حکم دیتے ہوئے کوئی سبکی محسوس ہو رہی تھی یا اُس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا یا پھر اُس نے اپنے نمک خواروں سے کسی معجزے کی خوش گمانی میں چپ سادھ رکھی تھی۔

پیرو نے کچھ توقف کیا۔ اُسے دوبارہ ہارن بجانے یا نواب سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ انھیں جلد ہی احساس ہو گیا تھا کہ تاخیر سے مزید پیچیدگی ہی کا احتمال ہے اور تاخیر انھی کی کشمکش کے سبب ہو گی۔ گو موٹر ٹھیرے ہوئے ابھی دیر نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو منٹ ہی گزرے ہوں گے مگر ہمارے لیے یہ وقفہ کسی پُل صراط کے مانند تھا۔ وہ کسی پل بھی کوئی اندھا فیصلہ کر سکتے تھے اور حویلی میں گولیاں گونج سکتی تھیں، گولیوں کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلتا۔ لگتا تھا، شاید ہم سے کوئی چوک ہو گئی ہے، ہم نے دروازے کے پہرے داروں کی کثیر نفری کو کہیں اہمیت نہیں دی تھی مگر اُن کی تعداد کتنی بھی ہوتی، ہمارے لیے نواب کی موجودگی سب سے بڑی ضمانت تھی، کسی کے لیے بھی اس سے بڑی ضمانت اور کیا ہوتی۔ ہماری نظریں سامنے کے پہرے داروں پر ٹکی ہوئی تھیں لیکن یکایک دو پہرے دار دائیں طرف کے اندھیرے سے نکل کے ہمارے سامنے آ گئے۔ وہ ہمیں روشنی میں آنے کے بعد ہی نظر آ سکے۔ دونوں کی بندوقیں موٹر کا نشانہ لیے ہوئے تھیں۔ مجھے اپنی بندوق کا اور پیرو کو اپنے تمنچے کا رُخ بے اختیار انھی کی طرف کر دینا پڑا۔ وہ زمین پر ٹھیر ٹھیر کے قدم رکھتے ہوئے آئے تھے، موٹر کے پاس آ کے ایک اِس جانب دوسرا اُس جانب ہو گیا۔ تنے ہوئے تھے انھوں نے بندوق پر نظر جمائے جمائے چھلتی نگاہ سے اندر دیکھا، نشست میں دھنسا دیکھ کے اُن کے اکڑے ہوئے جسم ڈگر ہی لمحے انھوں نے ہیجانی انداز میں سر جھکا کے نواب کو بند نواب نے ایک ثانیے کے تذبذب کے بعد اپنا بھاری سر مسلح پہرے دار ٹھٹکے رہے۔ لمحے گزر گئے، نواب کے ہونٹوں جنبش نہیں ہوئی۔ آخر پہرے داروں کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔

اُن کے جاتے ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

موٹر پہرے داروں کے درمیان سے گزرتی حویلی کی سے باہر آ گئی۔

میرے روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا، موٹر جانے والی سڑک پر آ گئی تھی مگر یقین نہیں آتا تھا۔ سڑک کے دُور تک کھمبوں کی روشنیاں لشکار رہی تھیں۔ پیرو نے ڈرائیور چلنے کی ہدایت کی تھی جدھر سے خاں صاحب ہمیں یہاں بلند و بالا محل نما مکانات کا سلسلہ دائیں بائیں پھیلا ہوا تھا چند فرلانگ آگے سڑک کے پہلے چوراہے پر پیرو نے سامنے بجائے راستہ بدل دیا اور موٹر آبادی سے نکل کے نسبتہً سنسان دوڑنے لگی۔ میرا سر گھوم رہا تھا، بندوق بغل میں دبا کے میں موندلی تھیں تاکہ اپنی اُکھڑی سانسیں ہموار کر سکوں۔ موٹر چل دیر بعد میں نے آنکھ کھولی۔ سڑک پر بجلی کے کھمبوں کی قطار بجھی تھیں، ہر سو گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سڑک صرف موٹر سے روشن تھی۔ حویلی شہر کے مضافات میں تھی اس لیے غیر آباد علاقے کی طرف آ نکلے تھے، دُور و نزدیک آبادی نظر نہیں آتا تھا۔ معلوم نہیں پیرو کے دل میں کیا تھا مگر جانے کی ایسی بے تابی بھی نہیں تھی۔ موٹر نے حویلی سے فاصلہ طے کیا ہو گا کہ ایک ویران مقام پر پیرو نے ڈرائیور کے لیے کہا۔ اُس کے اشارے پر موٹر پکی سڑک سے بچکولے سیدھے ہاتھ کو ایک کچے راستے پر آ گئی۔ یہ چھوٹی پہاڑیوں گھرا ہوا کوئی علاقہ تھا، سارا کا سارا سرسبز۔ ٹھنڈی ٹھنڈی تھی۔ پیرو خود رَو جھاڑیوں کی اوٹ میں موٹر ٹھیرا کے نیچے اُترا اور پچھلا دروازہ کھول کے اُس نے نواب سے نیچے اُتر کہا۔ نواب پھیلی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا مگر کو دوبارہ کچھ کہنے کی تکلیف نہیں دی، چپ چاپ اُٹھ کے باہر آ گیا ڈرائیور بھی باہر آ گیا تھا۔ پیرو نے اُسے پھر اُس کی نشست پر موٹر کی چابی اپنے قبضے میں کر کے گرج دار آواز میں ایدر ہی بیٹھا رہے گا، ہلے گا بھی نہیں، سمجھا!"

ڈرائیور کے جسم پر دہشت طاری تھا۔ پیرو اُسے وہیں چھوڑ کے آگے چل پڑا۔ زمین نم اور ناہموار تھی، جگہ جگہ جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں جھینگروں اور مینڈکوں کے شور کے باوجود ہر طرف رات کا سناٹا مسلط تھا۔ موٹر سے کوئی سو قدم دُور ایک نشیب میں آ کے پیرو رک گیا۔ نواب ہمارے ساتھ تھا، میرے اور اُس کے درمیان۔ اِرد گرد کسی ذی روح یا کسی آبادی کے آثار نہیں تھے۔ "ابھی تمھارا کیا فیصلہ کرے نواب؟" پیرو نے کسی تمہید کے بغیر تمتماتے لہجے میں نواب کو مخاطب کیا۔

اندھیرے میں نواب کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ پیرو کی آواز میں اور تلخی آ گئی "اچھا ہے، ابھی تم اپنا فیصلہ خود ہی کرو، تم نواب کا جنا ہے، ابھی تم کو اتنا چھوٹ ضرور ملنا چاہیے۔"

"ہم نہ تم سے معذرت خواہ ہیں، نہ کسی رعایت کے طلب گار۔"

نواب نے سرسراتی آواز میں کہا "تم جو چاہتے ہو، اُس میں دیر مت کرو۔"

"ابھی تم اور کیا بولے گا۔" پیرو بھڑک کے بولا "اپن جو چاہتا ہے وہ تو اپن کرے گا ہی۔ تم کو اور کس لیے ایدر لایا ہے، ایدر گدھ اور کتے کی کمی نہیں ہو گا۔"

نواب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ابھی تم بھولا نہیں ہو گا کہ تم نے اپن کے ساتھ کیا مستی کیا تھا۔ بھلا بھی اپن تھی پر چھوڑتا ہے۔ جو تم کو اچھا لگتا ہے اپن کو بول دو، نادان تمھارا نمک کھایا ہے، ابھی کچھ تو اُس کا حق پورا کرے گا۔ بولو اپن کیا کرے؟ تمھارا کپڑا اتار کے اور منہ کالا کر کے اُودر شہر میں چھوڑ دے؟ تم کو پولیس میں لے جائے؟ پولیس پر تمھارا زور اور پیسہ چلتا ہے۔ سیدھا لنگ کو بھی جا کے کنڈی کھٹ کھٹائے اور نظام کے پاس لے جا کے تم کو کھڑا کر دے؟ ایدر ہر طرف تو اندھیر نہیں چلتا ہو گا یا پھر... پھر تم کو ایدر ہی زندہ دفن کر دے؟" پیرو کی زبان سے چنگاریاں سی لپک رہی تھیں۔

نواب کی طرف سے خاموشی رہی۔

"ابھی تمھارا بولتی کیوں بند ہو گیا، تم اپنا باپ سمجھ کے اُودر اپنے کو اندر کیا تھا، اپن پوچھتا ہے تم تم سالا اپن کو کیا سمجھتا تھا۔ اُلّو؟ بے پتے کا؟ تمھارا بات نہیں ماننے گا تو تم اندھا بہرا ہو جائے گا؟"

"ہم مجبور تھے، ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔" نواب نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ایک تم ہی مجبور ہے دُنیا میں، دوسرا کوئی مجبور نہیں ہو سکتا، تم مجبور ہوتا ہے تو آدمی کو جانور سمجھ لیتا ہے۔ اپن تم سے شروع میں کیا بولا تھا، اپن اُودر جا کے خانم سے بات کرے گا، اپن بالکل سیدھا بولا تھا، تم اُلٹا کیوں سُنا؟ ابھی تم کون سا بولی سمجھتا ہے؟"

"تم سے ہماری کوئی رنجش نہیں ہے، ہمارا مقصد تم خوب جانتے ہو، ہر طرف سے مایوس ہو کے ہم نے یہ آخری قدم اُٹھایا تھا۔"

"اور آخری قدم اُٹھا کے لَوٹ کے دیکھے گا بھی نہیں۔" پیرو کی آواز تڑخ رہی تھی۔ "کچھ نہیں سوچے گا کہ دوسرا بھی آدمی ہے۔ آخری قدم میں تم اپنے کو ابھی ٹانگ دیتا۔ بارہ دن کیا، بارہ سال بھی تم اپنے کو نیئں چھوڑتا۔ اپن تم کو کئی بار بولا تھا کہ ابھی بس کرو، تم اپن کا ایک بات نیئں سُنا۔"

"ہم تمھارے سامنے کوئی صفائی پیش نہیں کر رہے ہیں، شاید تم ٹھیک کہتے ہو کہ ہم تمھیں یوں کبھی نہیں چھوڑتے۔" نواب نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اپن بھی تم کو ایسے نیئں چھوڑے گا، تم ایدر کا نواب لگتا ہے تو اپن بھی تمھارا غلام نیئں ہے، اپن بولتا ہے، تمھارا کسی سے واسطہ نہیں پڑا ہے، بُرا ہی بُرا تم نے دیکھا ہے۔ پر اپن تم کو ابھی کچھ اور رنگ بھی ضرور دکھائے گا۔ ابھی تم جانتا تو ہو گا کہ اپن تمھارے ساتھ کیا کر سکتا ہے۔"

"ہم تمھارے سامنے ہیں۔" نواب نے سُلگتے لہجے میں کہا "لیکن کسی مجرم کی حیثیت سے نہیں۔"

"مجرم تو چھوٹا بات ہے، مجرم تو کوئی آدمی ہوتا ہے۔ تم سالا آدمی ہی نیئں ہے، جانور بھی ابھی تم کو بول کے اپن اُس کا اوقات گھٹانا نیئں چاہتا۔"

نواب بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

اندھیرا کچھ کچھ مانوس ہونے لگا تھا۔ نواب کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں لیکن پیرو کی باتیں مجھے بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھیں، بھپھولے پھوڑنے کا یہ کون سا موقع تھا۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے دفعہ ہو جانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ میں نے یہی جتلانے کے لیے آہستگی سے پیرو کا بازو تھپتھپایا، وہ اور اُکھڑ گیا، اُس نے مجھے جھڑک دیا۔ کچھ دیر وہ خاموشی کے ساتھ قہر زدہ نظروں سے نواب کو گھورتا رہا پھر بیزاری سے کہنے لگا "اپنے کو ابھی دُور جانا ہے نواب! ابھی جلدی بولو، تمھارے ساتھ کیا کرے، تم اپن کی جگہ ہوتا تو ابھی کیا کرتا۔ اپن کا جی کرتا ہے، ابھی تم کو اُٹھا کے سیدھا اپنے ٹھکانے لے جائے اور اُودر ایسا ہی کسی پنجرے میں چھوڑے جیسا تم نے اپنے لیے بنایا تھا، اُودر پھر تم کو ٹھیک پتہ چلے گا کہ تم کون ہے، کتنا بڑا حویلی، سونا چاندی، ہتھیار، غلاموں کا فوج رکھتا ہے، کتنا بڑا فتنی ہے۔ اپن سمجھتا ہے تمھارا نشہ ابھی اتنا جلدی نیئں اُترے گا۔ تمھارا گاڑی اپن لوگ کو رات میں شہر سے بہت دُور لے جا سکتا ہے۔ ابھی تمھارا آدمی لوگ رات ضرور ڈھونڈے گا، اُس کو ابھی ایسا کوئی غلطی نیئں کرنا چاہیے کہ وہ باز

تمھاری صورت بھی نہ دیکھ سکے۔ تم بھی اُس کو تک کے کابل کے آئے ہو۔
پولیس میں جاتے ہوئے وہ آگے پیچھے دس مرتبہ ضرور سوچے گا اور پولیس
جب اپنی کھوج میں نکلے گا اپن اُس سے دُور جا چکا ہوگا۔ تھانے میں
اپنا نام پتہ سب غلط لکھا ہے۔ پولیس ایدر ہی سر پھوڑتا رہے گا اور
اگر راستے میں پکڑ بھی گیا تو تم کو اپن کے ہاتھ سے زندہ کبھی مِل نہیں
کرے گا۔ ابھی تم کو یہ پسند نہیں تو دفعہ کا بات کرے؟ اور سیدھا
حاکم کے پاس چلے؟"

نواب نے اُس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا، اچھا ہی کیا۔ پیرو
کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بڑھ کے اُس کی گردن دبوچ لے۔ نواب سکتے میں
اُس کے سامنے کھڑا رہا، اُس کا کچھ کہنا ہی پیرو کی آگ کو ہوا دینے کے
مترادف ہوتا۔ اسے گنگ دیکھ کے پیرو ہی کو چپ ہو جانا پڑا۔ چاند
شاید بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا، ہر طرف چاندنا ہو گیا تھا۔ نواب
کا چہرہ مجھے اچھی طرح نظر آ رہا تھا، شکنوں سے بھرا، غبار آلود، دھواں دھواں سا۔
دیر تک ہمارے درمیان دہشت ناک سکوت چھایا رہا۔ سرد ہوا چل رہی
تھی اور میری رگوں میں کھولن سی ہو رہی تھی۔ پیرو کی زبان سے اگلے لمحے
کوئی بھی بات نکل سکتی تھی، اُس کے ہاتھ میں تمنچا بھی تھا۔ میری دخل
اندازی کا کوئی محل نہیں تھا۔ میں پیرو سے کیا کہتا، کوئی بات ہی دماغ میں
نہیں آ رہی تھی۔ اگر کوئی بات تھی تو یہی کہ جو ہونا ہے جلد سے جلد ہو جائے۔
پیرو تیز تیز سانسیں کھینچتا رہا، پھر اُس کی بھنبھناتی آواز نے خاموشی
توڑی۔ وہ نواب سے کہنے لگا: "اپن کا سمجھ میں نہیں آتا، ابھی تمھارا کیا
بنائے؟ اُس کا لوگ کسی حد تک ٹھیک تھا۔ تم نے اپن سے جو مخول کیا ہے،
جیل میں اپنے کو بہت برا تھوڑا لگتا ہے۔ اپن ابھی تمھیں ٹھکانے لگا سکتا
ہے، سویرے تمہارا ثبوت نہیں ملے گا۔ اپن تم کو بولے، ادھر اندر ابھی اپنا
خون اپنے کو بہت کاٹتا ہے۔ اپن تمھارے ساتھ ابھی بہت کچھ کر سکتا ہے
پر.... پر...." پیرو ہونٹ چبا کے رہ گیا۔ کچھ توقف کے بعد اُس نے نواب
کو حکم دیا: "چلو، ابھی گاڑی میں بیٹھو۔"

میرے کانوں میں چھناکا سا ہوا مگر پیرو نے یہی کہا تھا۔ نواب
کا بُت بھی اپنی جگہ جما نہیں رہ سکا۔ اُس کا جسم ایک جھٹکے کے لیے ہل
کھا گیا۔ اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے تھے لیکن آواز اُس کے حلق ہی میں
پھنس کے رہ گئی۔ پیرو فوراً واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ نواب بھی کسی
معمول کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ پیرو چند قدم ہی آگے بڑھا
ہوگا کہ پھر ٹھہر گیا اور نواب سے بولا: "اپن کو یہی ٹھیک لگتا ہے کہ تم کو
حویلی واپس بھیج دے۔ ساری زندگی تم اپنی قسمت دیکھتے رہنا اور زندگی کو
اپنا ادھار سمجھنا۔"

مجھے ایسا لگا جیسے میرے شانوں سے کوئی بوجھ اتر گیا ہے۔ نواب
کا سر جھک گیا تھا۔ پیرو نے پھر اُس کی طرف نہیں دیکھا۔ تیزی سے موٹر
کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائیور اپنی نشست پر موجود تھا، پچھلی نشست
پر میرے اور نواب کے بیٹھتے ہی موٹر چل پڑی۔

راستے میں خاموشی رہی۔

موٹر کی رفتار تیز تھی اور وہ واپس حویلی کی طرف جا رہی تھی۔
حویلی ابھی دُور تھی کہ پیرو نے ڈرائیور کو چار مینار کی طرف چلنے
کو کہا۔ موٹر ابھی حویلی کے سامنے سے نہیں گزری تھی۔ پندرہ بیس منٹ
کی مسافت کے بعد ہم شہر میں داخل ہو گئے۔ چائے خانوں اور
اکا دکا دکانوں کے سوا ساری دکانیں بند ہو چکی تھیں مگر سڑکوں پر
ابھی خوب چہل پہل تھی۔ ہر طرف قمقمے روشن تھے۔ چار مینار کے گھڑیال
میں دس بج کے چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ پیرو نے مکہ مسجد کے قریب
ایک جگہ موٹر رکوا دی اور ڈرائیور کو اُتر کے دُور کھڑے ہو جانے کو کہہ
دیا۔ ڈرائیور جیسے ہی اترا، پیرو نے سرد لہجے میں نواب سے کہا:
"تمھارا یہ سارا تحیار ایدر چھوڑ کے جا رہا ہے۔ تمنچا ابھی اپن پاس
ہی رکھے گا، تمھارا یاد کے واسطے۔ ایک آخری بات تم سے ابھی
دینا ہے۔ حویلی جا کے پھر کوئی مسخری مت کرنا۔ اپن اب باہر ہے،
تمھارا آدمی حویلی میں لگا ہے، اُس کا کئی گنا اپن کے پاس ہے۔
ایک دس کے برابر ہے۔ اپن کا دل ابھی اتنا بڑا نہیں کہ بار بار
دے گا۔ دوبارہ حویلی کا جگہ راکھ نظر آئے گا۔ تم کو اپن کیا بولے،
کچھ نہیں سمجھے گا کہ اپن کن لوگوں کے دھیان میں تم کو حویلی واپس
... ہے۔ اُن لوگ نے بیچ میں آ کے سالا اپن کا ہاتھ روک دیا ہے۔
نواب کا حالت اپن کو خوب پتہ ہے۔ جیسا ... نے پہلے تم
ابھی خفم سے جا کے بات کرے گا پر کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ سب
مرضی پر منحصر ہے۔ اتنا سا بات اگر تم سمجھ لیا تو اپنا سر بھی ...
اور ابھی تم کو ایسا وقت بھی نہیں دیکھنا پڑتا۔" یہ کہتے ہی پیرو
اُتر پڑا۔

میں نے بھی پھر جلدی کی اور اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی بند...
میں چھوڑ کے باہر آ گیا۔ نواب موٹر میں رہ گیا تھا۔

* ہم چار مینار کے قریب تھے۔ زمین پر پیر نہیں ٹکتے تھے۔
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پنکھ لگ گئے ہوں، جیسے ہوائیں کہیں
لیے جا رہی ہوں، اور جیسے آنکھوں میں اچانک روشنی بڑھ گئی ...
مینار کے چبوترے پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ سامنے ہی چا...
تھا۔ میں اس راستے سے کئی بار گزر چکا تھا لیکن آج سب کچھ
نیا لگ رہا تھا۔ پہلی کمان کے پاس بہت سے رکشے خالی کھڑے ...
ہم اُسی کی طرف بڑھا لیکن رکشا والے سے بات کرنے سے پہلے اُس ...
کی چائے کی دکان سے ایک گلاس پانی پیا، انگیٹھی پر کھولتی ہوئی ...

... بازار بہی تھی اور رکشا والے دکان کے گرد تپائیوں پر بیٹھا
...نے بیٹھے تھے۔ وہاں بڑی بڑی پگڑی باندھے ہوئے ایک ادھیڑ پان والا
... لگا کے پان بنا رہا تھا۔ اُس کے گلے میں موتیا کے پھولوں کا
...تھا۔ اُس نے خود چاندی کے ورق میں لپٹا ہوا بیڑا پیرو کی طرف
...بڑھایا۔ پیرو منع نہیں کر سکا۔ ایک بیڑا میں نے بھی کھایا۔ کیوڑے
...بسا ہوا پان تھا، سارا منہ معطر ہو گیا۔ پیرو کی جیب میں روپے
...ظ تھے، انھوں نے حویلی میں ہماری جامہ تلاشی لی تھی لیکن اُن کا مقصد
...تحیار وغیرہ کی طرف سے اطمینان کرنا تھا۔ ایسی کوئی چیز ہمارے
...تھی ہی نہیں جو وہ ہم سے دُور کر دیتے۔ تلاشی لینے والے پہرے دار
...ہاتھ میری گردن میں پڑی ہوئی مالا پر بھی آئے تھے لیکن مالا اُلٹ پلٹ
...دیکھنے اور بے ضرر ہونے کا یقین کر کے انھوں نے مجھے واپس کر دی
...پیرو نے پانچ روپے کا پورا نوٹ پان والے کو دینا چاہا لیکن اُس
...سلام کر کے کھلے نوٹ اور ریزگاری واپس کر دی۔ پیرو نے بھی
...نہیں کی، پان چباتا ہوا رکشوں کی طرف چلا آیا۔ "چلے گا؟" اُس
...ایک فربہ رکشا والے سے پوچھا، وہ اندر بیٹھا اونگھ رہا تھا، جواب
...کے بجائے سرتاپا ہمارا جائزہ لینے لگا۔ اُس کے بنے ہوئے منہ سے
...اپنے کپڑوں کی بوسیدگی کا احساس ہوا، ہم دونوں کے کپڑے میلے
...ہو چکے تھے، سلوٹوں سے کچھ سکڑ بھی گئے تھے۔ بکھرے بالوں
...صورت شکل سے، ہم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی نظر آ رہے ہوں گے۔
...کیا دیدے پھاڑتا ہے؟" پیرو نے ڈپٹ کے کہا: "اپن کیا بولتا
...سالا!"

رکشا والا کسی طرح چونک گیا، پلکیں پٹ پٹاتا ہوا بولا: "کہاں
...نے کا ہے؟"

"بازار کو!" پیرو نے دھمکتی آواز میں کہا۔

"بازار کو! کون سا بازار؟"

بازار کے نام پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں پیرو سے پوچھنے
...والا تھا مگر اُس نے رکشا والے سے کہا: "اپن کو گانا سنانے کو لے چلو۔"

"محبوب کی مہندی!" رکشا والے نے آنکھ مار کے کہا: "ایسا
...نا، بیٹھو بیٹھو سیٹھ۔" وہ اچھل کے ایک دم نیچے اتر آیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو دادا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"ابھی پہلے بازار کو دیکھ لے راجا!" وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔

"مگر کیوں؟ بس سیدھے۔" رکشا والا سن رہا تھا، میں نے لفظ چبا
...کے کہا: "دادا پہلے ہمیں اُدھر ملنا چاہیے، اُدھر ہوٹل میں۔"

"بیٹھو چلو راجا!" وہ مجھے دھکیلتا ہوا بے پروائی سے بولا: "ابھی
...اسے بیٹھ جا۔"

"دادا مگر.... مگر تم...!" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا: "پہلے ہمیں ہوٹل
چل کے پوچھنا چاہیے۔"

"وہ ابھی اُودر نہیں ہوگا۔"

"مگر ہو سکتا ہے وہ کوئی پیغام چھوڑ گئے ہوں یا اُن میں سے
کوئی احتیاطاً وہیں رُکا ہوا ہو۔"

"بعد کو اُودر بھی دیکھ لے گا۔"

"لیکن ہمیں بازار میں ایسے نہیں جانا چاہیے۔"

"بازار جانے کا یہی وقت ہے راجا!" وہ مسکرا کے بولا۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں مت جاؤ۔" میں نے ناگواری سے کہا۔
"خواہ مخواہ پھر کوئی...."

"ابھی پہلے سے شگون خراب کیوں کرتا ہے۔" وہ تیکھے لہجے
میں بولا: "اُودر جا کے ابھی اپن آقا کو دیکھے گا، دیکھتا ہے ابھی اُس میں
کتنا دانت ہے، ابھی بھنبھوڑتا ہے یا گھاس کھاتا ہے۔"

"مگر آقا ہی کی بات ہے تو وہاں ہم پھر بھی جا سکتے ہیں، وہ بھاگ
کے کہاں جائے گا۔"

"ایسے چلا گیا تو آقا کو شکایت ہوگا، پھر وقت ملے نہ ملے، اُس کا
حساب چکتا کر کے آگے جائے تو نیند ٹھیک سے آئے گا۔"

میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی: "دادا! اِس وقت ہمارا
وہاں جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ ہوٹل میں ہمیں مزید کچھ معلوم
ہو جائے گا۔"

"پہلے اپن اُودر ہی چلے گا راجا۔" وہ حتمی لہجے میں بولا۔

"دادا! سمجھا کرو، ضد مت کرو، تمھیں کیا ہو گیا ہے۔"

"آقا نہیں تو اپن ابھی اُودر گانا شانا سنتا ہے۔ اتنا دن ہو گیا ہے،
ابھی چین سے چلے گا۔"

"دادا! ضرور تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔
"اب تمھیں گانا سننے کی سوجھ گئی، ابھی تم آقا کو دیکھنے کا کہہ رہے تھے۔
تمھارے دماغ میں یقیناً کچھ اور ہے، مجھے بتاتے کیوں نہیں؟"

"چل کے ذرا بازار کا رنگت بھی تو پوچھنا ہے، کیا پتہ اُودر ہی
اُن لوگ کا پتہ لگ جائے۔" وہ ہنس کے بولا۔ رکشا والے سے اُس نے
کہا کہ وہ کچھ تیز چال چلے۔ رکشا والا پہلے ہی رکشا تیز بھگا رہا تھا، اُس
کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

"کیا تمھارا مطلب ہے...." ہم آدھے راستے پر
آئے ہوں گے کہ میں نے حیرت سے پوچھا: "کیا تمھارا مطلب ہے کہ
وہ وہاں تمھارے....؟"

"ہاں ہاں ابھی سمجھا کر راجا!" وہ میری بات کاٹ کے
اور میرے گلے میں بانہیں ڈال کے مجھے دبوچنے لگا۔

میرا سر چل رہا تھا۔ یا تو میں ہی پاگل ہو گیا تھا یا وہ اپنے حواس

کھو چکا تھا۔ اُس کی کوئی بات میری عقل میں نہیں آتی تھی۔ اگر اُسے اپنے کسی مفروضے پر اتنا ہی یقین تھا تو بھی ہمیں ہوٹل جا کے صورتِ حال سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ اُس کا اندازہ درست ہونے کا امکان کم نہیں تھا لیکن ایک امکان اندازہ غلط ہونے کا بھی تھا۔ ہوٹل کے بعد بھی ہم یہاں آ سکتے تھے مگر پیرو سے اس وقت کچھ کہنا سننا بے نتیجہ تھا اس لیے میں نے اپنی زبان بند کر لی تاہم میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے منڈلاتے رہے۔ جی چاہ رہا تھا کہ رکشے سے چھلانگ لگا دوں، شاید اسی طرح پیرو اپنے ارادے سے باز آ جائے مگر اُس کی ناراضی کے خیال سے میں یہ بھی نہ کر سکا۔ اُس کے بازو کے حصار میں سمٹا ہوا بیٹھا رہا۔ رکشا والا تیز رفتاری کی وجہ سے ہانپنے لگا تھا، نتیجۃً اُس کی رفتار بھی سست ہو گئی تھی۔ محبوب کی مہندی کا علاقہ اب قریب ہی تھا، یہاں سے میں اور جہاں گیر روز صبح سیر کے لیے جایا کرتے تھے۔
چند لمحوں بعد ہی ہم بازار کے سرے پر تھے۔ رکشا والا اندر گلی میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر پیرو گلی کے دہانے ہی پر اُتر گیا۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے پان والے سے بچی ہوئی ساری ریزگاری اور کھلے نوٹ رکشا والے کے ہاتھ پر رکھ دیے اور اُسے متحیر چھوڑ کے گلی میں داخل ہو گیا۔ رکشا والا ہمارے پیچھے بھاگتا ہوا آیا اور اکھڑی سانسوں سے پوچھنے لگا کہ کیا وہ ہماری واپسی تک کھڑا رہے؟ پیرو نے منع کر دیا۔
بازار میں جیسے دن ابھی نکلا ہی تھا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں، تماش بین مختلف ٹکڑیوں میں ہر جانب بکھرے ہوئے تھے۔ بالا خانوں کے در، بچوں، دروازوں سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں، دور تک جہاں جہاں نظر جاتی تھی، ایک میلا سا نظر آتا تھا۔ چھجوں، کھڑکیوں اور نچلی منزل پر کمروں میں لڑکیاں اور عورتیں طرح طرح کے سنگھار کیے، قسم قسم کے رنگ برنگے کپڑے پہنے اپنے مخصوص انداز میں بیٹھی تھیں، وہ بنی ٹھنی، ہر ایک کی سجاوٹ دیکھنے کے لائق تھی، ایک سے بڑھ کے ایک، کوئی خاموش سر جھکائے، کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ، کسی کی نگاہیں بھٹکتی ہوئی، کوئی اپنے آپ میں گم اور کوئی ناراض ناراض سی۔ سب کے الگ الگ انداز تھے۔ دکانوں پر جنس ایک ہی قسم کی تھی مگر بیچنے والے جیسے مختلف تھے۔ میں خانم کے گھر قیام کے دوران ان گلی کوچوں سے بڑی حد تک واقف ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دور خانم کا مکان تھا اور اُس سے ایک دو گلی آگے وہ بالا خانہ تھا جہاں سے میں نے نیساں کو مانگا تھا۔ جہاں گیر نے تو یہاں خاصا وقت گزارا تھا۔ یہاں آ کے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دُنیا بس رات ہو، جگمگاتی، ناچتی، گاتی رات، جیسے کسی کو کسی کا ہوش نہ ہو اور سب کسی نہ کسی دھن میں کھوئے ہوئے ہوں۔ ہر طرف شور اٹھا ہوا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ہم چھوڑ کے گئے تھے۔ وہی جگہ جگہ بکھری ہوئی پھولوں کی پتیاں، تیز روشنیوں میں چمکتے دمکتے چہرے، سازوں کی گونج،

گھنگروؤں کی جھنکار، گانے کی تانوں اور راہ گیروں کے نعروں نے فضا کو بوجھل اور منتشر کر رکھا تھا۔ پیرو اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ یہاں آ کے ہمیشہ میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ سامنے آ کے کھڑی ہو جاتی تھی۔ چلتے چلتے ہم خانم کے اندر رستے خانم کے مکان جانے والی گلی بھی نکل گئی تھی۔ سرِ راستے
معمول بالا خانے کے آدمیوں نے ہمیں متوجہ کرنے کی کوشش پیرو نے ان سُنی کر دی، سر اٹھائے چلتا ہی رہا۔ گلی میں داخل ہوتے ہر لمحے اپنے پہچانے جانے کا خدشہ تھا۔ اس دن سارا علاقہ اکٹھا ہو گیا تھا جب شاہ کبیرا اور میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ میرا چہرہ وہ اتنی آسانی سے نہیں بھول سکتے تھے۔ کے آدمیوں نے مجھے اتنی جلدی پہچان لیا تھا تو یہاں اور بھی گے۔ خانم کے ملازم، ہوٹل والے، جہاں گیر سے اڑنے والا امراؤ داد کے آدمیوں نے تو مجھے بارہا دیکھا تھا۔ ہم اُس ہوٹل کے سامنے گئے جہاں تجمل نے شاہ کبیرا اور اُس کے ساتھیوں کے سامنے کر دیا تھا۔ اُس سے کچھ آگے کی گلی اڈے کی طرف نکلتی تھی۔ گزرتے وقت مجھے کئی آدمیوں پر بازار کے اڈے سے وابستہ شبہ ہوا تھا۔ میرا حلیہ خاصا بدلا ہوا تھا۔ داڑھی بھی بڑھی ہوئی ہو گی کہ اُن کی نگاہ مجھ پر نہ آ سکی مگر جیسے ہی ہم ہوٹل کے تپائیوں پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے چونک کے ایک دو… کیا پھر وہ دونوں چائے چھوڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں… سال کی عمروں کے ہوں گے۔ اُن کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ انھیں بالکل نہیں پہچانتا تھا۔ پیرو نے بھی انھیں اٹھتے ہو… ہو گا لیکن ہم آگے چلے آئے۔ ہم نے مڑ کے نہیں دیکھا کہ وہ ہما… رہے ہیں یا نہیں۔ گلی کا وہ نکڑ بھی آ گیا جہاں سے اڈے کے لیے مڑا جاتا تھا۔ علاقے میں سپاہیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ کی ایک ٹولی کھڑی تھی۔ کسی سبب کے بغیر وہ ہمیں پوچھ گچھ… روک سکتے تھے۔ علاقے کا کوئی بھی آدمی ہماری طرف اُن کی… کرا سکتا تھا۔ ہمارے کپڑوں اور وضع قطع سے انھیں یوں بھی… ہو سکتا تھا۔ نواب کی جانب سے بظاہر کسی اقدام کا امکا… مگر یہ علاقہ دوسرا تھا۔ کوئی عام علاقہ نہیں تھا۔ اب بھی ہم… پر جانے کے بجائے علاقے سے باہر نکل سکتے تھے، اب ہم… گیا تھا۔ گلی کے نکڑ پہ پیرو نے گردن موڑ کے سوالیہ نظروں… دیکھا مگر میں نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے روک نہیں سکا۔ میں… نگاہوں میں بائیں ہاتھ کی نسبتاً چوڑی گلی کی طرف اشارہ کر… قدم بہک رہے تھے، سارے جسم میں کانٹے سے چبھتے ہوئے… نے خود کو سمجھایا، آگے جو کچھ بھی ہو، اڈا اب زیادہ دور نہیں…

…محل کے اور ہر جانب سے چوکنا رہ کے چلنا چاہیے۔ میرے پاس… تو نہیں تھا، چاقو کی بڑی کمی محسوس ہو رہی تھی۔
…اڈے کی گلی اتنی روشن نہیں تھی لیکن اندھیرا بھی نہیں تھا۔ …ادھر بیشتر بالا خانوں کے دروازے بند تھے اور اندر سے ناچنے …نے کی آوازیں آ رہی تھیں، یہاں تمام بالا خانے خانم کے مکان کی …طرح بلند و بالا تھے۔ یہاں عورتیں اور لڑکیاں چھجوں، کھڑکیوں اور کھلے …میں بیٹھی نمائش نہیں کرتی تھیں اس لیے عام تماش بینوں کی بھیڑ …یہاں زیادہ نہیں ہوتی تھی تاہم گلی سنسان نہیں تھی۔ ہم نے کوئی …ڈیڑھ دو سو قدم کا فاصلہ عبور کیا ہو گا کہ پیچھے سے بہت سی آہٹیں …سنائی دیں۔ میں نے پیرو کو بتانا چاہا۔ اسی لمحے اُس نے خود مڑ کے پیچھے …تھا۔ وہ اڈے ہی کے آدمی تھے جو چند گز کے فاصلے پر لپکتے ہوئے …ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ ہمیں مڑتے دیکھ کے وہ تتر بتر ہو گئے …بکھر گئے۔ وہ چھ سات آدمی تھے۔ اُن میں وہ دو بھی تھے جنھیں …میں نے ہوٹل کے باہر پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے دیکھا تھا۔ پیرو نے پلٹ …کر اُن پر صرف ایک نگاہ ڈالی اور چل پڑا۔ اُس کے پاس تمنچا تھا۔ جنھوں نے …ہماری طرف کوئی پتھر نہیں پھینکا تھا تو ہمیں بھی اپنی جانب سے …کوئی گرہ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بات طے تھی کہ مجھے انھوں نے …پہچان لیا ہے۔ پہچاننے کے بعد ہوٹل میں بیٹھے رہنا اُن کے لیے ممکن …نہیں رہا ہو گا۔ ہمارا رُخ اڈے کی طرف تھا۔ ہمیں اڈے کی گلی میں …دیکھ کے انھیں اور تشویش ہوئی ہو گی۔ وہ کسی طرح ہمارے پہنچنے …سے پہلے خود اڈے پہنچ جانے کی تگ و دو میں ہوں گے۔ اُن میں سے …کسی کو یہ کوشش کرنی چاہیے تھی مگر کوئی ہم سے آگے نہیں نکلا۔ اڈے …کا بھی ایک راستہ نہیں ہوتا، کوئی دوسرا راستہ کسی اور گلی سے نکلتا ہو گا۔ …ممکن ہے اُن کے کچھ اور ساتھی بھاگتے ہوئے ہم سے پہلے اڈے پر پہنچنے …میں کامیاب ہو گئے ہوں یا پہنچنے والے ہوں مگر ایسی صورت میں ہمیں …راستے میں اُلجھانے کے لیے پیچھے آنے والوں کو کوئی نہ کوئی پہل ضرور کرنی …چاہیے تھی۔ عموماً یہی ہوتا ہے۔ ہمیں پہچاننے کے بعد اُن کا تعاقب قرینِ …قیاس تھا۔ پہل میں جھجک کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے شاہ کبیر کے …سامنے دیکھ چکے تھے اور انھوں نے آکا کے آدمیوں، اپنے ساتھیوں …سے بھی سن لیا ہو گا کہ ہم اُن سب سے کس طرح نمٹے تھے۔
وہ ہم سے دور دور ہی رہے، انھوں نے ہمارے راستے میں رکاوٹ …کی کوشش نہیں کی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ہم سے اچھی طرح واقف …اڈے کے آدمی عام آدمیوں کی طرح یوں ہی نہیں جھگڑنے لگتے، …ہاتھی کر دیتے ہیں، کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کے ہی ہاتھ اٹھاتے …یا پھر انھوں نے کچھ ٹھان ہی نہ لی ہو۔ اُن کی خاموشی سے یہ قیاس …کیا جا سکتا تھا کہ اڈے پر کوئی تبدیلی ضرور ہوئی ہے یا وہ کسی موقع کے

منتظر تھے اور ہماری نیت کے بارے میں کوئی تعین کر لینا چاہتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آکا ہی نے انھیں حکم دیا ہو کہ ہمیں اڈے تک آنے دیا جائے اور ہماری واپسی کے تمام راستے مسدود کر دیے جائیں۔ بہر حال واضح طور پر کچھ بھی نہیں سمجھا جا سکتا تھا، جب تک ہم اڈے نہ پہنچ جاتے۔ درمیان میں وہ کہیں بھی رخنہ ڈال سکتے تھے۔ میں اُن کی چاپیں سونگھتا ہوا چل رہا تھا۔ اُن کی تعداد پہلے سے کچھ بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پیرو بھی اُن کی طرف سے ہوشیار ہو گا۔ اُس نے تمنچا اب تک نہیں نکالا تھا۔ آگے گلی کچھ تنگ ہو گئی تھی۔ اڈا بس کچھ ہی دور رہ گیا تھا بلکہ اڈے کی عمارت ہمارے سامنے تھی۔
عمارت پُرانے طرز کی تھی، دو منزلہ۔ باہر دیوار اور دروازے کے ساتھ چوکی پر چند آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے مگر انھوں نے دور ہی سے ہماری آہٹیں سُن لی تھیں۔ ہمیں اور ہمارے پیچھے اڈے کے آدمیوں کو بڑھتے دیکھ کے وہ بوکھلا کے کھڑے ہو گئے جیسے انھیں سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ ایک سیدھا اندر دروازے کی طرف بھاگا۔ باقی چار دروازے کے سامنے دیوار بن کے کھڑے ہو گئے۔ میری رگیں چٹخ سی رہی تھیں اور میں نے اپنی سانس روک رکھی تھی۔ پیرو خاموش کھڑا رہا۔ ہمارے سامنے ہی ایک آدمی اندر گیا تھا، سو اب ہمارا چھپنا لاحاصل تھا۔ ہمارے پیچھے اور سامنے اڈے کے سارے آدمی تکے کھڑے تھے، ہم بھی اُن سے غافل نہیں تھے۔ چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ اندر سے شور سنائی دیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ مجھے اُس کی آواز صاف سنائی دی تھی اور دوسرے ہی لمحے وہ ہمارے سامنے تھا۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں،
وہ تجمل ہی تھا۔
وہ کسی پاگل کی طرح میری جانب بڑھا تھا، سمندر کی کسی وحشی لہر کے مانند۔ اُسے اپنے سامنے دیکھ کے میری نس نس میں درد بلبلانے لگا تھا۔ سینے میں ایسی گرج اٹھی کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ کبھی مجھے جھنجوڑتا، کبھی میرے گالوں، میرے ہاتھوں کو چومتا۔ میرے شانے اُس کے شانوں پر ڈھلک گئے تھے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کے بکھر جائے گا۔ میں بلک بلک کے روتا رہا اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب اندر آئے۔ میرے حواس کچھ دیکھنے اور سُننے کے قابل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ وہاں بھیڑ لگی ہے، وہ سب میرے گرد جمع ہیں اور میں نے سُنا کہ تجمل مضطرب لہجے میں مجھے آوازیں دے رہا ہے "لاڈلے! لاڈلے! اپنا نہیں تو کچھ دوسروں ہی کا دھیان کر جانی!"
مجھے یہ سب کچھ اپنی نظروں کا فریب لگ رہا تھا اور مجھ پر کوئی خوف سا طاری تھا کہ کہیں یہ سب کچھ دوبارہ اوجھل نہ ہو جائے۔ اسی

لمحے میری نظر کانتے پر پڑی۔ ہاں وہاں کانتے بھی موجود تھا۔ اُس کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے اور بے قرار نظریں مجھ پر منڈلا رہی تھیں۔ بجّھل مجھے اپنے پہلو میں جکڑے ہوئے تھا۔ کانتے کو دیکھ کے میرا جسم پھڑکنے لگا۔ وہ اکیلا نہیں تھا، دوسرے ہی لمحے اُس کے ساتھ کھڑا ہوا جامو کا بھائی جمرو بھی مجھے دکھائی دیا اور میں نے زورا کو بھی دیکھا، شامو بھی وہیں تھا۔ وہ چاروں بس میری توجہ کے منتظر تھے، جھپٹتے ہوئے میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھے بجّھل کے بازوؤں سے چھین لیا۔ بار بار مجھے کسی سراب کا گماں ہوتا تھا، اپنی آنکھوں اور کانوں کے خواب سراب میں حویلی میں نہیں تھا، یہ کالے دادا کا اڈا ہی تھا۔ جہاں گیر اور خانم کو حیدرآباد سے لے جاتے وقت میں یہاں آچکا تھا۔ وہی پانچ محرابوں والا دالان اور دونوں طرف سرائے کی طرح بنے ہوئے کمرے، بجّھل کے سامنے وہی حقّہ تھا جو کالے دادا نے پچھلی دفعہ بطورِ خاص اُس کے لیے منگوایا تھا۔ کانتے، زورا، شامو اور جمرو مجھے کھسوٹ رہے تھے، گدگدا رہے تھے اور جیسے مجھے یاد کرا رہے تھے کہ میں اُنھی کے درمیان ہوں۔ پھر کالے دادا اُمڈتا ہوا میرے سامنے آگیا۔ اُس نے زورا اور جمرو کو سرکا کے ہٹا دیا اور وارفتگی سے میرے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ "قسم سے اُستاد ایک پل کو بھی آنکھ نہیں لگایا، کیا۔" بجّھل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بے چینی سے بولا۔

وہ سب اڈے ہی کے آدمی ہوں گے جو صحن میں اِدھر اُدھر منتشر کھڑے تھے، کالے دادا کو میرے پاس بیٹھا دیکھ کے وہ سب چوکی پر چلے آئے اور انھوں نے میرے اطراف گھیرا ڈال لیا۔ چوکی پر تِل دھرنے کی جگہ نہیں رہی تھی۔ کانتے مجھے دبوچے ہوئے تھا، اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے اپنے اندر سمو لے۔ اُسی نے مجھے اُن کے بیچ سے اُٹھایا اور چوکی سے اُتار کے زمین پر کھڑا کر دیا۔ صحن میں شور مچنے لگا تھا۔ کالے دادا نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے اور چلا چلا کے انھیں خاموش کرنا چاہا۔ چیخ پکار کسی قدر کم ہوئی تو وہ مچلتی آواز میں بجّھل سے بولا۔ "استاد ابھی میٹھا آئے گا۔" اُس کے کہنے کی دیر تھی، سبھی تندہی سے اُس کی تائید کرنے لگے۔

"آئے گا رے، ضرور آئے گا۔ فیل کیوں مچاتے ہو۔" بجّھل نے کھنکتے لہجے میں کہا۔ "آدمی بھیجو کالے! جتنا ملے سب اِدھر ہی کھینچ لاؤ۔"

بجّھل کی آواز اُن کے شور میں دب گئی۔ پیرو بجّھل کے کولھے سے کولھا ملائے، گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا چندھی آنکھوں سے اُن سب کو دیکھ رہا تھا، مٹھائی کا ذکر سُن کے اُس نے کالے دادا کو مخاطب کر کے ہانک لگائی۔ "او کالا بھائی! اپنے لیے تو ابھی چلنے کا بولو باپ!"

"ایک دم دادا! ابھی چٹکیوں میں تیار ہوتا ہے۔" کالے دادا چھاتی پر ہاتھ مار کے بولا۔ "اور کچھ بولو بادشا!"

"کھانا کھا لیا ہے تم نے دادا؟" بجّھل نے چونک کے پ[...]

"کھانا تو او دو ڈال کے ہی چلا تھا۔ وہاں سے نکلے زیادہ دیری نہیں ہوا ہے۔ چار مینار سے ابھی سیدھا ادھر پہنچا"

"پہلے ذرا نہا دھو لو۔" بجّھل نے بھاری آواز میں کہا طرف سر اُٹھا کے کانتے سے بولا۔ "اس کو ایسے ہی پچھلا مار[...] کے ذرا اِسے شیشہ تو دکھا۔"

کالے دادا اڈے کے آدمیوں کو چیخ چیخ کر اور اپن[...] کے مطابق حسبِ منشا کے مختلف حکم دے رہا تھا۔ عمارت اُن کی چاپوں اور آوازوں سے دھمکنے لگے تھے۔ انھوں نے بھی تیز کر دی تھیں۔ چوکی سے اُتر کے میں کانتے اور جمرو فرش پر کھڑا تھا۔ بجّھل کا اشارہ ملتے ہی کانتے نے میری کمر ڈال کے مجھے جکڑ لیا اور میرے جسم کو زور سے جھٹکا دیا۔ وہ لوگوں کی بھیڑ سے اندر لے جانا چاہتا تھا۔ اُسی پل بے اختیار نگاہ بجّھل کے پیر پر گئی۔ میرے قدم زمین پر جم کے رہ گئے۔ پلٹتے پھر گیا۔ بجّھل کے پیر پہ ابھی تک پٹی بندھی تھی مگر پہلے نظر نہیں آ رہی تھی۔ "تمھارا، تمھارا پیر اب کیسا ہے؟" میں بھرّائی آواز میں اُس سے پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے وہ مجھے گھور کے دیکھتا رہا اور گ[...] بھر کے پیرو سے بولا۔ "ابھی کچھ بولنا جانتا ہے دادا!"

"مایا!" پیرو پہلے تو چونک پڑا پھر قہقہہ لگاتے ہوئے ایک دم طوطے کے مانک رٹا لگاتا تھا۔ پنجرے کے پنچھی کے ماف[...]

"اُس کے پاس ایک آواز ہی تو اپنی رہ جاتی ہے دادا"

"ہاں بجّھل بھائی!" پیرو کی آواز بوجھل ہو گئی۔ "اپن! اپن نے ایسا پنجرا سالا کبھی نہیں دیکھا۔"

بجّھل نے اُس کے زانو پر آہستہ سے تھپکی دی اور [...] کچھ نہیں کہنے دیا پھر حقّہ گڑگڑاتے اور بڑبڑاتے ہوئے وہ [...] لگا۔ "سب ٹھیک ہے رے! اپنا ماس تو مٹی بھی مشکل سے [...]"

"تم یہاں کب کب ...؟"

"پہلے دِتیاں تو کچھ دھیلی کر لے۔ آگے ساری رات پڑی لگتا ہے۔ اُدھر بس دیواریں چاٹتا رہا ہے۔"

"ابھی اپن نے بہت باندھ کے رکھا تھا۔" پیرو بیچ [...] سے بولا۔ "کبھی ایک دم رسّی تُڑانے لگتا تھا، پر سنبھلا ہی رہا۔ ابھی ابھی کچھ ڈھیر ہوا ہے۔"

"تھکا نے پہ آ کے شیر بھی ڈھیر ہو جاتا ہے۔"

"ابھی تم ٹھیک ہی بولتا ہے بجّھل بھائی!" پیرو نے ش[...]

[...] کہا۔ ابھی سالا شیر تو اپنے کو نئیں بولتا پر ادِھر آ کے اپن کا جوڑ جوڑ [...] ابھی کچھ لوٹ پلٹ ہو گیا ہے۔"

"تم بھی تھوڑا آرام کر لو دادا!"

"تم کو ابھی پورا کید دیکھا ہے۔" پیرو نے بے تابانہ اُس کا ہاتھ [...] سینے میں بھینچ لیا۔ "اپنا آرام تو ابھی تم کو دیکھنے سے ہو جائے گا۔"

کانتے مجھے کھینچتا، دھکیلتا ہوا اندر دالان میں لے آیا۔ مجھے [...] کے درمیان ابھی تک اباجان اور ماروتی نظر نہیں آئے تھے۔ میری [...] نگاہیں اُنھی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ کانتے سے کچھ پوچھتے ہوئے میری [...] ہچکچاہٹ ہونے لگی تھی، جانے وہ کیا بتائے لیکن مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ کانتے [...] اندر کمرے میں آ کے مجھے اپنا جوڑا پہننے کو دیا تو میں نے سب سے [...] پہلے انھی کے بارے میں اُس سے پوچھا۔

"تھوڑا چھری تلے دم لے۔" وہ آنکھیں میچ کے بولا۔ "سب [...] ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔"

"مگر وہ ہیں کہاں؟"

"اِدھری ہیں لاڈلے!"

"یہیں!" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"یہاں کیسے ہوتے، اِدھر اڈے پر سکتے ان کو؟" وہ تنک کے [...] بولا۔ "بالکل بولا ہو کے آیا ہے۔"

"پھر کیا وہ ابھی ہوٹل ہی میں ہیں؟"

"نہیں ہوٹل میں بھی نہیں اِدھر شہر میں ہیں۔" اُس نے مجھے اُس [...] وقت تک کچھ بتانے سے انکار کر دیا جب تک میں نہا دھو کے، لباس [...] تبدیل کر کے اپنا حلیہ ٹھیک نہ کر لوں۔ نہانے کو میرا جی بالکل نہیں چاہ [...] رہا تھا، نہانے کا یہ کوئی وقت بھی نہیں تھا مگر ناچار مجھے اُس کی بات [...] ماننی پڑی۔ دالان ہی میں غسل خانہ تھا، نل کھلا ہوا تھا، کانتے نے مجھے [...] اندر دھکا دے کے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

کانتے کے چہرے اور لب و لہجے سے کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ [...] کہہ رہا تھا کہ اباجان شہر میں ہیں مگر ہوٹل میں نہیں ہیں۔ پھر وہ [...] کہاں ہو سکتے تھے؟ ماروتی بھی یہاں نہیں تھا۔ وہ یقیناً انھی کے ساتھ [...] ہوگا۔ پہلے میں نے اپنے طور پر یہی سمجھا تھا کہ انھوں نے اباجان کو [...] میرے بمبئی چلے جانے پر آمادہ کر لیا ہوگا مگر میرے بارے میں [...] کی کوئی خبر سُنے بغیر اباجان یہاں سے کیسے جا سکتے تھے۔ میری [...] سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بجّھل کی یہاں موجودگی سے اباجان کی وحشت کا [...] اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے ہر طرف سے مایوس ہو کے ہی اُسے [...] طلب کیا ہوگا۔ پانی خاصا ٹھنڈا تھا۔ مجھے جھرجھری سی آگئی لیکن ایک دو [...] منٹ کے بعد زیادہ محسوس نہیں ہوا۔ میں نے جیسے تیسے جلدی جلدی [...] غسل کیا اور تولیے سے جسم خشک کر کے کانتے کے کپڑے پہن لیے۔

اُس کے اور میرے کپڑوں کی پیمائش میں کوئی خاص فرق نہیں تھا، بمبئی اور کلکتے میں اکثر ہم ایک دوسرے کے کپڑے پہن لیتے تھے۔ لباس کی تراش خراش بتا رہی تھی کہ یہ کپڑے سندیں کے بنائے ہوئے ہیں۔ گریبان سے ایسا ہی کڑھا ہوا کرتا اُس نے مجھے ترپ کے دیا تھا، پاجامے کی مہری بھی اتنی ہی چوڑی تھی جتنی میرے پاجامے کی تھی۔ زریں کو گلاب کا عطر پسند تھا۔ اُسی کی ہلکی ہلکی خوشبو کرتے میں بسی ہوئی تھی۔ نہانے سے میری رگوں میں جیسے ٹھنڈک سی گھل گئی۔ کانتے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔ جمرو اور زورا بھی باہر موجود تھے میرے نکلتے ہی کانتے نے بازو پھیلا کے مجھے گلے سے لگا لیا، کنگھی دی، میرے کرتے کی آستینیں درست کیں اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے تندی سے کہا۔

"تجھی کو دیکھتا ہوں۔" اُس کی آواز ڈھول رہی تھی۔ "معلوم پڑتا ہے جُگ بیت گئے ہیں، کدھر کھو گیا تھا لاڈلے؟"

"کانتے بھائی! سمجھو دوبارہ زندگی ملی ہے۔"

"اپنے دن بھی بجھ کر راکھ ہو گئے۔" وہ بے قراری سے بولا۔ "تجھ کو کیا بتاؤں، یہ پانچ چھ دن کا وقت کتنے جوکھم سے کٹا ہے۔"

"اُدھر ہم بھی بالکل جکڑے ہوئے تھے۔"

"وہ تو تم دونوں کو دیکھتے ہی پتہ چل گیا تھا، ویسے بھی اپنے کو کوئی اچھے کی اُمید نہیں تھی۔"

"تمھیں معلوم تھا کہ ہم کہاں تھے؟"

"معلوم تھا بھی اور نہیں بھی۔" وہ بھڑ کتے لہجے میں بولا۔" اُستاد نے بیڑی ڈال رکھی تھی سالی! ماں قسم اُستاد آڑے نہیں ہوتا تو تیرا بھائی دس بیس کو ٹھکانے لگا کے ہی کوٹتا پر اُستاد!" وہ جز بز ہو کے بولا۔ "اُستاد کو تو تُو جانتا ہے کبھی بالکل مٹی کا بن جاتا ہے۔"

"گویا تم جان گئے تھے کہ ہم کہاں...."

میری بات منہ میں ہی رہ گئی۔ کالے دادا اڈّے کے چند آدمیوں کے ساتھ دوڑتا ہوا میرے پاس آ گیا تھا۔ کانتے بھی ہونٹ چبا کے رہ گیا۔ اس دوران صحن میں اور بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ہم کالے دادا کی معیت میں اندر دالان سے ابھی باہر آئے تھے کہ دروازے سے کچھ اور لوگ مٹھائی کے ٹوکرے اُٹھائے، شور مچاتے اندر داخل ہوئے وہ ہار پھول بھی ساتھ لائے تھے۔ جیسے ہی میں چوکی کے پاس پہنچا، مجھے دیکھ کے پیرو اچھل گیا اور پٹر پٹر پلکیں جھپکانے لگا۔" اُستاد! ابھی کچھ دیکھتا ہے۔" اُس نے تجّمل کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

تجّمل کی آنکھیں بھی چمکنے لگی تھیں۔" ہاں دادا!" وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔" ابھی کچھ وہی لگتا ہے۔"

پیرو نے لمبی سانس کھینچی اور دونوں ہاتھ سے کان پکڑ کے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔" اپن کو آخری ٹیم ابھی ضرور کچھ آسانی ہو جائے گا۔"

"ہم کو معلوم تھا دادا، یہ کس کے ساتھ ہے۔" تجّمل نے نسبتہً اُونچی آواز میں کہا۔

"پر اپن کا مغز بھی اُودر جا کے ایک دم پھر گیا تھا تجّمل بھائی! آنکھ کھلا تو اپن قید خانے میں پڑا تھا، شروع میں تو اپن سب مخول جانا پر جلدی اُلٹا سیدھا سمجھ میں آ گیا۔ اُودر کا کچھ ٹھیک نئیں تھا۔ پل میں رُت بدل جاتا تھا۔ اپن ماتھا تھامے سوچتا تھا، ابھی تجّمل بھائی کے سامنے آنے کا رہے گا بھی کہ نہیں۔ وہ اُودر سالا نواب کا اولاد...."

"جانے دو دادا!" تجّمل نے پیرو کا شانہ دبا کے بھن بھناتے لہجے میں اُسے روک دیا۔ کالے دادا نے مٹھائی اور ہار پھولوں کے ٹوکرے تجّمل کے آگے رکھ دیے تھے۔ میں، کانتے، جمرو، شامرا اور زورا بھی چوکی پر تجّمل اور پیرو کے پاس آ کے بیٹھ گئے تھے۔ کالے دادا نے تجّمل کے گلے میں ہار ڈال کے مٹھائی کا پہلا دانہ اُس کے منہ میں رکھا۔ ہر طرف نعروں جیسی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ وہ سب تجّمل کو مبارک باد دے رہے تھے۔ عمارت میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ابھی کالے دادا ہمارے سامنے سے نہیں ہٹا تھا کہ ایک دراز قد، تنومند، عمر رسیدہ شخص تیزی سے چوکی کی طرف بڑھا اور تجّمل کے مقابل آ کے بیٹھ گیا۔ اُس نے سر جھکا کے پہلے تجّمل کے گلے میں گوٹے کا ہار ڈالا اور اُس کے پیر پکڑ کے زیرِ لب کچھ کہنے لگا۔ تجّمل نے اُس کا جھکا ہوا سر اپنے سینے

میں بھینچ لیا اور اُس کے لمبے کھچڑی بالوں میں انگلیاں پھیر کے بولا۔" اپنے لیے تو تمھارے یہ پھول ہی بہت ہیں سردار، تم کو بالکل ضرورت نہیں ہے۔" تجّمل کا اشارہ اُس تھیلی کی طرف تھا جو اُس والے شخص نے چپکے سے اُس کے قدموں میں رکھ دی تھی۔

وہ شخص ہاتھ جوڑے تجّمل کے سامنے بیٹھا رہا۔" منع ... ئی باپ!" اُس نے لجاجت سے کہا۔" اپن پھر کیا جانے کر ... اپنے کو کسی قابل نہیں سمجھا، اُستاد اپن سے خفا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" تجّمل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر انکار کاہے کو ہے اُستاد؟" وہ آزردگی سے بولا۔" اُس کو خوشی سے لایا ہے اور یہ تمھارا، تمھارا...."

"جانتے ہیں سردار! اپنا حق ہم خوب جانتے ہیں پر ... تم پاس ہی رکھو، ضرورت پڑی تو آدمی بھیج دیں گے۔"

کانتے نے مجھے ٹھوکا دیا اور سرگوشی میں بتایا۔" یہ دل ... اِدھر سارے بازار کا ٹھیکے دار ہے سالا، بازار کا سارا بھتا پہلے جاتا ہے پھر اڈّے پر آتا ہے۔"

شکل و صورت سے وہ کسی اڈّے کا اُستاد نظر آتا تھا ... طرح چوڑا سر، بڑی بڑی پھٹی پھٹی آنکھیں، اُبھرا ہوا سا نرا ... با دلِ ناخواستہ اُس نے تھیلی اُٹھائی اور اُلٹے قدموں چوکی سے ... وہ اُترا ہی تھا کہ اڈّے کا ایک اور آدمی لپک کے چوکی پر ... تجّمل کے پیروں پر سر رگڑنے لگا۔" نمبر ایک کا نقشے باز ہے ... کانتے نے بدبدلاتے ہوئے مجھ سے کہا۔" آگے بہت پچھاڑی تھا سالا!"

میں نے اِسے پہلے بھی دیکھا تھا، شاہ کبیر کے ساتھ ... بالاخانے پر آنے والے آدمیوں میں یہ بھی شامل تھا اور اُس وقت ... شاہ کبیر کے پہلو میں کھڑا تھا جب میں اور وہ بازار کے چوک ... ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تھے۔ بعد میں اس شخص نے اڈّے پر ... رہنے کے لیے تجّمل سے درخواست کی تھی اور تجّمل نے اِسے کا ... کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ مجھے یاد ہے، اِس کا چہرہ کچھ بجھ گیا ... اِس نے تجّمل سے تکرار نہیں کی۔ اُس زمانے میں یہ چاقو ہمیشہ ... جیب میں رکھتا تھا اِس طرح کہ صاف نظر آئے۔ یہیں اڈّے ... نے اِس کا چاقو اُوپر کی جیب سے نکال کے نیچے بغلی جیب میں ڈ ... تھا۔ پھر جب تک ہم حیدرآباد میں رہے، ہم نے دوبارہ اسے اُو ... جیب میں چاقو رکھتے نہیں دیکھا اب بھی نہیں تھا۔ چلتے وقت ... نواب عالم تاب اسٹیشن پر آیا تھا تو بھی یہ ہمیں رخصت کر ... وہاں موجود تھا۔ میں کانتے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اِس نے ...

راستے میں آخر کون سی رکاوٹ کھڑی کی تھی لیکن مجھے کانتے سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ تجّمل اور پیرو کے پاس سے ہٹ کے وہ شخص سیدھا میرے پاس آیا، میرے پیر پکڑ کے اُس نے میرے گالوں کو بوسہ دیا اور پھولی ہوئی سانسوں سے بولا۔" تمھارے بنا اُستاد بالکل آدھا لگتا تھا۔" پھر خود چونک پڑا اور سنبھل کے بولا۔" اپن کا مطلب ہے، ایسے اُستاد سَو، ہزار سے بڑا ہے پر تمھارے بنا کوئی کتائی لگتا تھا اس میں، صرف اپنے کو نہیں یہاں سبھی کو۔ اپن بول نہیں سکتا کہ تم کو یہاں دوبارہ دیکھ کے کتنی خوشی ہوئی ہے، ناتھو کو اپنا نوکر سمجھو دادا اور اپنے کو حکم کرو۔"

میں نے اپنے پیروں سے اُس کے ہاتھ ہٹائے اور اُس سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کہہ نہ سکا۔ اچھا ہوا کہ کانتے نے اُسے اپنی جانب گھسیٹ لیا اور یوں میری مشکل حل کر دی۔

.. دل برا اور ناتھو کے نیچے اُترنے کی دیر تھی، لوگ ہر طرف سے چوکی کی طرف اُمڈ پڑے، بظاہر اُن کا ارادہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب ایک دم اُوپر آ جائیں گے مگر کالے دادا اور اڈّے کے دوسرے آدمیوں نے اُنھیں روک لیا اور سختی سے تاکید کی کہ وہ تحمل سے کام لیں۔ اُس وقت میری سمجھ میں آیا کہ اُن کا کیا مقصد ہے۔ وہ تجّمل کو ناتھو اور دلبرا کی طرح بالمشافہ مبارک باد دینے کے لیے بے قرار نظر آتے تھے۔ اچھا خاصا ہجوم تھا اور لوگ مسلسل اندر آ رہے تھے۔ گویا اگر یہی سلسلہ چلا تو ساری رات گزر جائے گی اور ہم یوں ہی بیٹھے رہیں گے۔ میں نے وحشت سے تجّمل کی طرف دیکھا لیکن وہ پیرو سے باتوں میں مصروف تھا۔ وہ چاہتا تو اُنھیں روک دیتا لیکن اُسے جیسے کچھ خبر نہیں تھی۔ مٹھائی اور پھلوں، کے ٹوکرے تجّمل کے سامنے سے ہٹا کے ایک طرف رکھ دیے گئے تھے۔ اُن میں سے ہر شخص چوکی پر پہلے آنے کی جستجو میں لگا ہوا تھا۔ بہر حال دیکھتے دیکھتے اُن کی ایک قطار سی بندھ گئی، ایک جاتا نہیں تھا کہ دوسرا اُچک کے چوکی پر چڑھ جاتا، اُوپر آ کے پہلے وہ تجّمل کے گلے میں ہار ڈالتا، کوئی چیز ساتھ ہوتی تو پیش کرتا، اُس کے پیر چھوتا اور مبارک باد دیتا ہوا یا تو پیرو کی طرف جاتا یا پہلے میرا رُخ کرتا۔

میرا اندازہ کسی قدر غلط تھا۔ اُن کا مقصد میری اور پیرو کی اچانک آمد کے سلسلے میں اپنی مسرت کا اظہار کرنا ہی نہیں تھا، اڈّے کے نئے اُستاد کو سلامی پیش کرنا بھی تھا۔ گویا تجّمل کے اڈّا سنبھالنے کے بعد اُنھیں یہ رسم ادا کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ حیدرآباد میں نئے اُستاد کی تبدیلی پر یہ رسم باقاعدہ انجام پاتی تھی۔ پہلے بھی یہی ہوا تھا جب تجّمل نے کالے دادا کو یہاں کا اُستاد مقرر کیا تھا، بمبئی اور کلکتے میں بھی اڈّے سے باہر کسی نئے اُستاد کے آنے پر یہ رسم ادا کی جاتی ہے مگر کوئی لازم نہیں ہے اور اتنی باقاعدگی کے ساتھ نہیں ہوتی۔ وہ اپنے چاقو تجّمل

کے پیروں میں رکھ رہے تھے۔ اُن میں صرف اڈّے سے وابستہ لوگ نہیں تھے، بازار کے لوگ بھی تھے۔ جن کے پاس چاقو نہیں تھے۔ وہ اپنی توفیق کے مطابق مختلف نذریں پیش کر رہے تھے۔ بعض کے پاس مٹھائی کے دونوں اور ہار پھولوں کے سوا کچھ نہیں تھا، بعض کے پاس صرف پھول تھے۔ سلامی کے لیے نذر ضروری نہیں تھی، اُستاد کے سامنے ایک مرتبہ آ کے سلام کرنا کافی سمجھا جاتا تھا۔ وہ لپکتے ہوئے قدموں سے تجّمل کے پاس آتے اور آ کے بے اختیار سے ہو جاتے۔ یوں کہنا چاہیے کہ سٹ پٹا جاتے، میرے سامنے آ کے بھی اُن کا یہی حال ہوتا، کسی کے مُنہ سے کچھ نکلتا اور کسی کے ہونٹ لرز کے رہ جاتے، آنکھیں جل بجھ کے رہ جاتیں، میری حالت بھی اُن سے مختلف نہیں تھی۔ مجھ سے کوئی جواب نہ دیا جاتا، میں گنگ نظروں سے اُنھیں دیکھتا رہا، پھر یکایک ایک ایسا آدمی میرے سامنے آیا کہ میں سیدھا نہ بیٹھا رہ سکا۔ اُسے پہچاننے میں مجھے ایک لمحہ لگا ہوگا، وہ مَولا تھا۔ وہی مَولا جو جہاں گیر کو تنگ کرتا تھا اور کئی بار کی درگزری کے بعد بھی باز نہیں آیا تھا چنانچہ مجھے مجبوراً اُس سے اور اُس کے دو ساتھیوں سے نمٹنا پڑا تھا۔ اُنھی کے سبب سے شاہ کبیر میری طرف متوجہ ہوا تھا۔ مَولا بھی مجھے زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا۔ اُس کے چہرے پر چاقو کی کئی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ بھُوری بھُوری مونچھیں بھی خاصی اُبھری ہوئی تھیں، پہلے سے بڑا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اچانک میرے سامنے آ کے ہاتھ جوڑ کے بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے پہچانا تو میری رگوں میں چمک سی اُٹھنے لگی۔ ایک بار تو میرے جی میں آیا کہ اُسے یہیں طمانچے مارنا شروع کر دوں۔ میرا ہاتھ اُٹھ جاتا لیکن یکایک مَولا نے سر اُٹھا کے مجھے وزدیدہ نگاہوں سے دیکھا، اُس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں، وہ میرے پیر تھام کے گڑگڑانے لگا۔" مَولا کو معاف کر دو دادا! تم کو خدا رسول کا واسطہ، اپن آپ کو بالکل نہیں پہچانتے تھے۔ اپن کا دماغ یک دم خراب ہو گیا تھا۔" میں سنتا رہا۔" مَولا بالکل بدل گیا ہے۔ اِدھر پوچھ لو کسی سے، اپن اب کسی کو...." اُس کی آواز لرز رہی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ جھکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "رجّو بھائی کیسا ہے؟" رجّو سے اُس کی مراد جہاں گیر تھا۔ خانم یہاں اُسے اِسی نام سے پکارتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

اُسے باتیں بنانا بھی خوب آ گیا تھا۔ زبان اب کسی قدر صاف تھی، بچپن اُس کا خانم کے بالاخانے ہی پر گزرا تھا۔ لمحوں تک وہ میرے سامنے بیٹھا میری زبان سے کچھ سُننے کا منتظر رہا پھر میرے ہاتھ چُوم کے جھجکتا ہوا اُٹھ گیا۔

طرح طرح کے لوگ تھے۔ ہر عمر اور ہر چہرے کے لوگ، اڈّے کے نئے اور پُرانے آدمی، بڑے بالاخانوں کے نگراں اور بازار کے بڑے دکان دار۔ بہت کم لوگ میرے دیکھے ہوئے تھے، مَولا

کے بعد اُن پانچ آدمیوں میں سے وہ دو بھی میرے سامنے آئے جنھوں نے میرا اور پیرو کا پیچھا کیا تھا اور موسیٰ ندی کے قریب ہمیں اُن سے بات کرنے کے لیے ٹھیر جانا پڑا تھا۔ دونوں یکے بعد دیگرے میرے سامنے آکے بیٹھ گئے۔ اُن کے کترائے ہوئے جسموں پر کپکپی طاری تھی جیسے پکڑ کے لائے گئے ہوں۔ بجّل اور پیرو سے اُنھوں نے کچھ کہا ہو تو کہا ہو، میرے پاس آکے یوں ہی ٹھٹکے بیٹھے رہے۔ میری، پیرو اور بجّل کی گود میں پھولوں سے چھپ گئی تھیں اُدھر بجّل کے پہلو میں سلامی کے طور پر آنے والی چیزوں کا ڈھیر لگ گیا تھا جب کہ چاقو تو اُنھیں اُسی وقت واپس کیے جاتے رہے تھے۔

یہ سلسلہ سویرے تک جاری رہتا اگر کالے دادا نئے آنے والوں پر پابندی نہ لگا دیتا۔ عمارت میں جو لوگ پہلے سے موجود تھے، وہی اُوپر آسکے، اُنھی کی تعداد کم نہیں تھی پھر بھی جتنا میرا خیال تھا، اُتنی دیر نہیں لگی۔ ایک تو بجّل نے چند لوگوں کے سوا کسی سے بات نہیں کی، سر ہلاتا اور ہُوں ہاں کرتا رہا۔ دوسرے کالے دادا نے الگ شور مچا رکھا تھا۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ کالے دادا نے نئے آنے والوں کو منت سماجت کے باوجود قطعی انکار کر دیا تھا۔ اس سے پیشتر کہ کوئی اُوپر آنے کی کوشش کرتا، وہ چوکی پر چلا آیا لیکن اُس کے اُوپر آتے ہی عمارت میں ایک لمحے کے لیے سکوت چھا گیا۔ کالے دادا نے پلٹ کے دیکھا اور مضطرب سا ہوگیا۔ ہمارے مقابل لوگوں کے بیچ میں ایک بوڑھا شخص دونوں ہاتھ اُٹھائے کھڑا تھا۔ بھولا لنگ، بڑھی ہوئی داڑھی، چوڑا ماتھا، جھکے ہوئے کندھے، درمیانہ قد اور دھنسی ہوئی آنکھیں، چہرے کی ہڈیاں نمایاں تھیں اور ٹھوڑی کا گوشت لٹک رہا تھا۔ قلموں کے سفید بال دُور سے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے ہوئے تھا، کسی زمانے میں چوڑا چکلا آدمی ہوگا۔ اُس کی عمر ستر سے کم نہیں تھی۔ کالے دادا نے ایک نظر بجّل کی طرف دیکھا پھر تیزی سے چوکی سے اُتر گیا۔ کورنش کے انداز میں اُس نے بوڑھے آدمی کا دامن پکڑا اور سلام کیا اور اُسے ہاتھ پکڑے ہوئے چوکی پر لے آیا، اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے لوگوں نے اُس کے لیے راستہ چھوڑ دیا تھا۔ چوکی پر آکے بوڑھا دوسرے آدمیوں کی طرح بجّل کے پیر چھونا چاہتا تھا مگر بجّل نے کھڑے ہوکے اُسے گلے سے لگا لیا۔ بوڑھا آدمی دیر تک اُس سے لپٹا رہا، جُدا ہوا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، پیرو بھی کھڑا ہوگیا تھا۔ اُن دونوں سے گلے مل کے وہ میری طرف پلٹا اور میرا سینہ ٹھونکنے لگا پھر میرے گال تھپتھپاتے ہوئے اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا، اُس کے بازوؤں میں ابھی تک زور تھا۔ "اپن سب سنا ہے۔" وہ بھربھراتی آواز میں بولا۔ "اپن ایک ایک بات سنا ہے، دو تین گھماواں میں وہ کتے کا پلا شاہ کبیراں بول دیا تھا۔ اُن دناں میں اپن اِدھر شہر میں نئیں، گیسو والے پیر کے پاس گلبرگے گئے تھے ورنہ شہزادوں کو کیسے نہ آتے۔"

اُس کی آواز میں ایک گونج تھی۔ میں نے تذبذب کرکے، بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس اثنا میں بجّل نے شانہ تھام کے اُسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ میں نے اُسے پہ... دیکھا تھا، وہ خود بھی یہی کہہ رہا تھا لیکن وہ اڈّے ہی سے ... شخص ہوسکتا تھا۔ اب نہیں تو کبھی کسی وقت اڈّے سے واسطہ ضرور رہا ہوگا۔ چہرے مہرے سے بھی یہی ظاہر تھا سبھی اُس کے واقف معلوم ہوتے تھے، ایسے واقف کہ اُس پر بے چین ہو گئے تھے اور اب اُس کے چوکی پر بیٹھ جا... وہ بہت خوش اور جوشیلے نظر آرہے تھے۔ بجّل سے بھی اُ... نئی نہیں لگ رہی تھی، مجھے جستجو تھی کہ وہ کون ہوسکتا ہے ... سے اِس قدر قریب تھا کہ اُس کے بارے میں کالے یا زو... پوچھنا مناسب نہیں تھا۔ اُس کے بیٹھتے ہی کالے دادا کا ٹوکرا اُس کے آگے رکھ دیا۔ بوڑھا ہنسنے لگا، بھیگی ہوئی ... کی آنکھیں رو رہی تھیں، عمارت میں خاموشی چھانے لگی، پیا... سی ہوئی پھر قبرستان جیسی کیفیت طاری ہوگئی، آخر یہ خا... وقت ٹوٹی جب بجّل نے اپنا چاقو جیب سے نکالا اور اپنے ... اُٹھ کے بوڑھے کے قدموں میں ڈال دیا۔ ایک کہرام سا مچ گ... بے تاب صداؤں سے عمارت کے در و بام لرزنے لگے۔ ... ساتھ بھولے دادا کے نام کا نعرہ بھی لگا رہے تھے۔ بھولے د... کا نام ہوگا۔ وہ منہ چھپائے بری طرح پھڑک رہا تھا۔ میری طر... جمرو اور زورا کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں، کا... سے بجّل کے ساتھ تھا مگر ایسا منظر اُس نے زندگی میں پہ... ہوگا، پیرو بھی دم بخود بیٹھا تھا۔ بجّل کا چاقو بھولے داد... میں پڑا تھا اور بجّل کے چہرے پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ ... دادا کی حالت اضطراری ہوگئی تھی، دیکھتے دیکھتے وہ فرش ... رگڑنے لگا۔ بجّل نے اُس کے شانے پکڑ کے اُسے اُٹھایا اور ... سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اُس کی طرف بڑھایا۔ بھولے د... چہرہ آنسوؤں سے تر بتر ہوگیا۔ اُس نے ڈبڈبائی نظروں سے ... جانب دیکھا اور اُس کے ہاتھ تھام کے مٹھائی اُسی کی طرف ... بجّل نے ٹکڑا اپنے منہ سے لگایا، بھولے دادا نے ایک ... ہاتھ دوبارہ اپنی طرف کھینچ کے بچی ہوئی مٹھائی منہ میں ... معاً اُسے اپنے پیروں میں پڑے ہوئے چاقو کا خیال آیا۔ ... اُسے ہیجانی انداز میں اُٹھا کے سینے اور آنکھوں سے لگایا۔ ...

... دا آسمان کی طرف منہ کیے کچھ سوچتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ چاقو بجّل کو واپس کر دے گا لیکن اُس نے اُسے بوسہ دے کے جیب میں رکھ لیا۔ لوگ پاگل سے ہوگئے۔ اُن کی بے ہنگم آوازوں نے ہذیانی انداز اختیار کر لیا۔ گرد و نواح میں دُور دُور تک شور گونج رہا ہوگا۔

کالے دادا اور اُس کے ساتھ اڈّے کے دوسرے آدمیوں نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے لوگوں کو خاموش ہوجانے کی تلقین کی۔ یقیناً اُنھیں کسی حد تک کامیابی ہوئی لیکن اڈّے کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ پیرو نے کالے دادا کو اشارہ کیا کہ وہ ہجوم میں مٹھائی تقسیم کرنا شروع کر دے، اُسی کی ہدایت پر ٹوکرے کھلے رکھے گئے تھے۔ لوگ اُن پر بے تحاشا ٹوٹ پڑے حالانکہ اُنھیں معلوم تھا کہ مٹھائی افراط سے موجود ہے مگر چھینا جھپٹی میں جو لطف تھا، وہ اطمینان سے کھانے میں نہیں تھا۔ پیرو نے دانستہ کالے دادا کو یہ مشورہ دیا ہوگا، لوگوں کا دھیان بٹانے اور فضا بدلنے کی خاطر۔ کالے دادا چوکی کے اِس سرے سے اُس سرے تک ٹوکرا کندھے پر رکھے جھومتا مٹکتا گھوم رہا تھا کسی پھیری والے کی طرح۔ کسی کے منہ میں وہ گلاب جامن رکھتا کسی کے منہ میں برفی۔ پیرو کے پاس پہنچا تو جانے پیرو کے جی میں کیا آئی کہ اُس نے اپنے سارے ہار اُتار کے کالے دادا کی گردن میں ڈال دیے۔ سبھی کو جیسے ایک شوشہ مل گیا، سب نے بڑھ بڑھ کے پیرو کی تقلید کی۔ چند لمحوں میں کالے دادا کا چہرہ اور سینہ پھولوں میں گم ہوگیا اور وہی سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اِدھر اُدھر سے اڈّے کے آدمیوں نے آوازے کسنے شروع کر دیے۔ کسی نے کالے دادا پر ریزگاری نچھاور کی تو ہر طرف سے سکّوں کی بارش ہونے لگی۔ اڈّے کا ایک معمّر شخص آکے کالے دادا کی باقاعدہ نظر اُتارنے لگا۔ سب نے اُسی کو نشانہ بنا لیا، کہنے لگے کہ دادا بس ایک ٹکلے کی کسر رہ گئی ہے، کوئی شخص کسی چنبیلی بائی کا نام لے کے چھاتی کوٹنے اور آہیں بھرنے لگا، کسی نے کہا کہ آج وہ دادا کی ایک جھلک دیکھ لے تو خنجر اُٹھا لے۔ کالے دادا پھولوں کے ڈھیر میں لپٹ کے عجیب لگ رہا تھا۔ ویسے بھی اُس کا رنگ روپ سب سے جُدا تھا۔ سیاہ کوئلے جیسے کھردرے چہرے پر تِلوں کی بھرمار اور چاقو کے نشانات، پیچھے لوٹے ہوئے لمبے لمبے بال، کان میں دُریا، آنکھوں میں سُرمہ پھیلا ہوا، گینڈے کے مانند کاٹھی۔ عمر چالیس سے زیادہ نہیں ہوگی لیکن پہلے کے مقابلے میں اُس نے ڈیل بہت پھیلا لیا تھا۔ لگتا تھا، درمیان کے عرصے میں اُسے چاقو چلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی، بس بیٹھا اینڈتا رہا۔ یہی وجہ ہوگی کہ اُکّا آکا کے پاس چلا گیا یا پھر اِتّی نکل جانے کی اصل وجہ چنبیلی بائی ہوگی اسی لیے اُس کا نام ہر ایک کے وردِ زباں تھا۔ اُن کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کالے دادا نے چنبیلی بائی کی خاطر کوئی قسم کھا رکھی ہے، وہ اُسے قسم توڑ دینے پر اُکسا رہے تھے۔ کالے دادا کا خاص آدمی چاندو پیش پیش تھا، کہہ رہا تھا: "ایمان سے ذرا باہر نکل کے دیکھو دادا، سارا بازار لُٹ جائے گا۔"

کالے دادا نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں، ہنستا رہا۔ لوگوں کی بدمستی میں کچھ کالے دادا کی ایما کا دخل بھی تھا۔ وہ اُن کی پھبتیوں، نعرے بازیوں سے اُلٹا لُطف لیتا رہا، اُس کے تیوروں سے لوگوں کو شہ ملتی رہی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہی کالے دادا اِس اڈّے کا کرتا دھرتا رہ چکا ہے، اب بھی بجّل کے بعد سب سے نمایاں آدمی وہی دکھائی دے رہا تھا مگر آج رات جیسے وہ خود کو بھول گیا تھا یا دانستہ بُھلا دینا چاہتا تھا۔ وہ سبھی جیسے خود کو یاد نہیں رہے تھے، بُھول گئے تھے کہ کہاں ہیں، بجّل نے بھی کچھ نہیں کہا۔ ذرا دیر میں رت جگے کا سماں ہوگیا جیسے کل عید ہو یا شادی کی کوئی تقریب، جیسے بہت دِنوں بعد اُن کی زندگی میں ایسی رات آئی ہو اور جیسے بہت دِنوں بعد کالے دادا اور وہ سب ایک بار پھر مل بیٹھے ہوں۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا مگر پھر تو کوئی ٹھکانا نہ رہا، عمارت میں کوئی بجلی سی چمکی، نہ جانے کس جانب سے چشم زدن میں ایک نوجوان نمودار ہوا، عمارت چیخوں سے گونج اٹھی، لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے، درمیان میں ایک کشادہ دائرہ بن گیا۔ نوجوان دائرے میں تتلی کے مانند پھڑکنے، تھرکنے اور ہاتھ پیر نچانے لگا۔ اُس کے جسم میں پارا بھرا تھا۔ کمر تیلی تھی اور ہاتھ پیروں میں غیر معمولی لچک تھی، لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ میرا دھیان کسی اور طرف تھا لیکن بعد میں مَیں نے غور سے دیکھا۔ مجھے بھی بہت ہنسی آئی، نوجوان کالے دادا کی نقل اُتار رہا تھا، ایسی صفائی اور مشّاقی سے کہ یقین نہیں آتا تھا۔ کالے دادا کا دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کے اور سینہ پھیلا کے بازار میں چلنا، تیلیاں چڑھا کے دیکھنا، نچلا ہونٹ دبا کے غصّہ کرنا اور بار بار کندھا جھٹکنا، بڑبڑاتے ہوئے گالیاں بکنا اور گنڈیری کے مانند گلوری چبانا، پھدک پھدک کے چاقو چلانا اور مجرے میں منہ پھُلا کے بیٹھنا۔ خود کالے دادا کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ اُس کے مقابل گویا آئینہ رکھا ہوا تھا۔ آئینے میں بھی اُس نے اپنے اتنے پہلو نہ دیکھے ہوں گے۔ تعجب یہ تھا کہ نوجوان کو بالکل ہنسی نہیں آرہی تھی۔ اُس نے مجنوں کے انداز میں ہائے چنبیلی، ہائے چنبیلی کی فلک شگاف صدا لگائی، لوگ اُچھل اُچھل پڑے۔ ضرور اُن کے پیٹ میں بل پڑ گئے ہوں گے۔ کالے دادا بھی پاگل ہوگیا۔ وہ گلے میں پڑے ہوئے ہار نوچ نوچ کے نوجوان پر دیوانہ وار نچھاور کرنے لگا۔

کالے دادا کے علاوہ اُس نے دوسروں کے بہروپ بھی بھرے، میں کسی کو جانتا نہیں تھا لیکن نوجوان کا انداز ایسا چٹکی بھرنے والا تھا کہ آدمی بے اختیار ہو جائے۔ تجھل بھی مسکرا رہا تھا۔ پیرو تو بے حال ہوا جا رہا تھا۔ نوجوان ہی کیا کم تھا کہ لوگوں نے اصرار کر کے ایک اور شخص کو درمیان میں دھکیل دیا۔ وہ بہت کترا رہا تھا، لوگ اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے سامنے لے آئے۔ پہلے والے کی نسبت اِس کا جسم کچھ بھدا تھا، عمر بھی زیادہ تھی۔ ایک اور ایک گیارہ کے مصداق دونوں نے مل کے حشر برپا کر دیا۔ دونوں یقیناً کسی نوٹنکی سے متعلق ہوں گے۔ انھیں ناچنا بھی آتا تھا، مختلف بولیوں اور لہجوں میں بولنا بھی۔ انھوں نے شاہ کبیرے کا بہروپ بھی بھرا۔ ایک اور بہروپ آکا کا ہوگا، آکا کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن بہروپ سے اُس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ تماشا کرتے کرتے وہ دونوں دفعتہً میرے سامنے آ کے ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو گئے۔ میں کچھ نہیں سمجھا لیکن وہ مجھ سے کسی بات کے طلب گار تھے۔ میں نے بدحواسی سے کانتے کی طرف دیکھا، میرے بجائے اُس نے انھیں کوئی اشارہ کر دیا۔ انھوں نے درمیان میں لوٹ کے چاقو ہاتھوں میں اُٹھائے اور ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا ہو گئے۔ میری رگیں سنسنانے لگیں کیوں کہ کسی اور کا نہیں، اِس مرتبہ وہ میرا سوانگ رچائے ہوئے تھے۔ میں اپنے سامنے خود تھا۔ ایک طرف میں تھا، دوسری طرف چاقو تولے ہوئے شخص کو پہچاننا بھی میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ شاہ کبیرا تھا۔ دوسرے نوجوان میں جیسے شاہ کبیرا کی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ بالکل اُسی کی طرح چاقو ہاتھ میں لہراتا بل کھاتا اُبلی اُبلی آنکھوں کے ساتھ جھپٹ رہا تھا۔ سب کچھ وہی تھا۔ بازار کے نکڑ کی طرح یہاں بھی کم و بیش وہی لوگ تھے، اِس وقت بھی سب کے ہونٹوں پر مہر لگی ہوئی تھی جیسے ابھی شاہ کبیرا کا فیصلہ ہونا باقی ہو۔ کئی بار خود مجھے دھوکا ہوا کہ میں کہاں ہوں۔ پہلے تو میں درمیانی جگہ کے کنارے کنارے گھومتا رہا اور اُس کے حملوں سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ اِدھر آتا تو میں اُدھر چلا جاتا، اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی انھیں ایک ایک بات یاد تھی۔ کس طرح میں دیر تک شاہ کبیرے کو بے سر و پا نچاتا رہا تھا۔ وہ کبھی دائیں طرف ہاتھ مارتا، کبھی بائیں طرف۔ اُس کا غصّے میں آگ بگولا ہو جانا، منہ سے کف نکلنا اور ڈکرانا، دونوں نوجوانوں سے لوگوں کے اصرار کا مطلب یہی تھا کہ وہ آج پہلی مرتبہ نہیں، یہ ناٹک پہلے بھی کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ نقالی میں اتنے ماہر، اتنے چابک دست ہیں، اپنے جسم پر انھیں کس قدر قدرت ہے، جدھر چاہیں مڑ سکتے ہیں اور پل بھر میں پینترا بدل سکتے ہیں۔ نقل میں یہ عالم ہے تو اصل میں دونوں کمال حاصل کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اصل کی طرف کوشش کیوں نہیں کی؟ سب کچھ کسی تصویر کے مانند تھا، وقت کی گردش جیسے پلٹنے لگی ہو۔ آخر وہ لمحہ بھی آ گیا جب شاہ کبیرا بالکل کنارے پر چلا گیا اور میں نے اپنا چاقو دبا دیا۔ وہ کچھ بدحواس ہو گیا اور چنگھاڑنے لگا۔ میں نے آناً فاناً پینترے بدلے ہوں گے کہ اُس کا چاقو میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ایسے کھنچے اور تنتے ہوئے انداز میں اُس کی طرف بڑھایا کہ زمین پر گر جانے کے سوا اُس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا، اُس کے بیٹھتے ہی عمارت کی دیواروں اور دروں سے شور کا سوتا پھوٹ پڑا۔ انھوں نے شاہ کبیرا والے نوجوان کو اُوپر اُٹھا لیا۔ اُس کا نچلا حصّہ برہنہ تھا، وہ اپنے کُرتے سے ستر پوشی کی کوشش کر رہا تھا، لوگ اُس کی حواس باختگی پر بُری طرح قہقہے لگا رہے تھے۔ اُسے چاقو لگنے کا سوال ہی نہیں تھا، بیٹھنے کے بعد ہی اُس نے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے خود کو اس بے شرمی پر تیار کیا ہوگا یا دوسروں نے اُسے مجبور کر دیا ہوگا۔

پورے صحن میں اگربتیوں اور پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی، ایک طرف کونے میں رکھے سماوار میں چائے کھول رہی تھی۔ لوگ ابھی آ رہے تھے۔ صحن میں پہلے سے بہت بڑا ہجوم ہو گیا تھا۔ یہ کلکتے اور بمبئی میں پیرو کے اڈے کے آدمی نہیں تھے مگر اُن کی آنکھوں اور چہروں سے اُبلتی خوشی دیکھ کے محسوس ہوتا تھا جیسے ہم اُسی اڈے سے وابستہ ہیں اور تجھل عرصۂ دراز سے یہاں بیٹھا ہوا ہے۔ اِس مرتبہ شاہ کبیرے کو بے دخل کر کے تجھل صرف چند دن یہاں رہا تھا، ایک مدت گزار کے اُس کا حیدرآباد آنا ہوا تھا۔ اِس مرتبہ بھی یہاں آئے کتنے دن ہوئے ہوں گے، زیادہ سے زیادہ چھ سات، لیکن وہ چوکی پر کلکتے کے اڈے کی طرح جما بیٹھا تھا۔ اڈے کے آدمی اُس کے شناسا معلوم ہوتے تھے۔ اِس مختصر عرصے میں یہی ہوا تھا کہ انھیں تجھل کو جاننے اور تجھل کو انھیں اچھی طرح خود سے متعارف کرا دینے کا کوئی غیر رسمی غیر معمولی موقع مل گیا ہو۔ اُن میں سے کسی نے وہاں آکا کا نام نہیں لیا۔ یہ آکا کو اڈے سے نکال لینے ہی کا کوئی صلہ ہوگا جب انھوں نے تجھل کو قریب سے دیکھا اور جانا بوجھا اور یہ اُن کے لیے نہایت مسرّت انگیز واقعہ ہوگا۔ مسرّت کا وہ اس سے پہلے کھل کے نہیں کر سکے تھے، ہماری آمد کے بعد ہی ممکن تھا، سو اب انھیں کوئی روک ٹوک نہ رہی۔ جانے وہ کب سے اڈے پر تبدیلی کے منتظر ہوں، اُن کے شور شرابے کی بے ساختگی سے اس کا تصوّر کیا جا سکتا تھا۔ آکا کوئی ایسا شخص تھا جس کے جانے پر اڈے کے کسی آدمی کی آنکھ بھیگی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ آدمی جنھوں نے حیدرآباد آنے پر ہمارا تعاقب کیا تھا، اُن کے انداز و اطوار سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ آکا کی ہیبت اُن کے دلوں پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اڈے کے اُستاد کا خوف ضروری چیز ہے لیکن ساتھ ہی اُس کی چھاؤں کا بھی کوئی احساس لازم ہے، منصفی اور دادرسی کا تقاضا تجھل کو اکثر میں نے کانتے سے کہتے سُنا تھا کہ اُستاد کو ہاتھ کا سخت، آنکھ کا نرم اور سینے کا کھلا ہونا چاہیے۔ آکا کو شاید ایک ہی زبان آتی تھی جو اڈے کے اُستاد کے لیے کبھی اچھی نہیں ہوتی۔

میری نگاہیں اُن کے کھیل تماشوں پر مرکوز تھیں اور کچھ دیر کے لیے سب کچھ مجھ سے اوجھل ہو گیا تھا لیکن یہ بس چند لمحوں کا پردہ تھا۔ ابا جان کا چہرہ میری آنکھوں میں منڈلانے لگا۔ کانتے، زورا، جمرو یا شامو سے کچھ پوچھنے کا محل نہیں تھا۔ میں نے کسی کو نہیں ٹوکا۔ کچھ دیر بعد یہ ہنگامہ ختم ہو جاتا تھا۔ رات آگے ہی بڑھ رہی تھی۔

لیکن انھیں گزرتے ہوئے وقت کا احساس نہیں تھا۔ وہ دونوں نوجوان ابھی گئے تھے، اور چائے تقسیم کی جا رہی تھی کہ نوجوانوں کی جگہ ایک شعبدے باز نے لے لی۔ پہلے اُس نے سکّوں سے بھرا ہوا ہاتھ سب کو دکھایا اور مٹھی بند کر کے اُچھالنے کے انداز میں کلائی کو جھٹکا دیا پھر مٹھی کھول دی۔ سکّے گرنے کی آواز نہیں آئی، ہاتھ بھی خالی تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر چکر لگانا شروع کیا اور کسی کے کان مروڑ کے، کسی کی بغل، کولھے اور سینے میں چٹکی بھر بھر کے سکّے برآمد کرنے لگا۔ ایک آدمی کا سر جھکا کے اُس نے کئی بار اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا، آدمی کے سر سے سکّے بیروں کی طرح ٹپاٹپ گرنے لگے۔ اُس نے اِس قسم کے اور کرتب بھی دکھائے۔

شعبدے باز کے بعد ایک سلسلہ بندھ گیا، ایک جاتا نہیں تھا کہ دوسرا آ جاتا تھا۔ شولی کی طرح ساز بجانے اور تان اُٹھانے والے۔ کوئی سامنے آتے ہوئے ہچکچاتا تو وہ اُس کے اوپر پیچھے پڑ جاتے۔ کوئی انھیں بے لطف کر دیتا یا زیادہ بھیڑ کے اکتاہٹ کا سبب بننے لگتا تو وہ فقرے کستے۔ وہ شخص اگر پھر بھی رُکا رہتا تو اُسے باقاعدہ گھسیٹ کے اپنی نگاہوں سے دُور کر دیتے۔

میں کن انکھیوں سے بار بار تجھل کی جانب دیکھتا تھا کہ شاید اُس کے چہرے پر کچھ نظر آ جائے، مجھے یقین تھا کہ کسی وقت بھی تجھل کالے دادا کو یہیں تک اکتفا کرنے اور باقی کسی دوسرے وقت پر اُٹھا رکھنے کا اشارہ کر دے گا۔ میری اور پیرو کی تھکن کے علاوہ اُسے یہ احساس بھی ہوگا کہ یہاں آنے کے بعد مجھے کتنی باتیں جاننے کی بے تابی ہوگی، خود اُسے بھی ہم سے باتیں کرنے اور حویلی میں پیش آنے والے شب و روز جاننے کی کچھ کم بے چینی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ سب کچھ تو پھر کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ تجھل نے کل ہی صبح حیدرآباد سے نکل جانے کا ارادہ نہیں کر رکھا ہوگا۔ ایسا ہوتا تو اس بزم آرائی کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ تجھل آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا رہا، مسکراتا رہا، بھولے دادا اور پیرو سے باتیں کرتا رہا۔ اُس کی دل جمعی دیکھ کے اُن کے حوصلے اور بڑھ گئے ورنہ اُس کے ماتھے کی ایک شکن ہی اُن کے لیے کافی ہوتی۔ کانتے، جمرو، زورا اور شامو بھی آنے جانے والے بازی گروں کی بازیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ کسی دلچسپ منظر پر وہ مجھے کہنیاں ملنے اور گدگدانے لگتے۔ پیرو نے غسل کیا تھا، نہ کپڑے بدلے تھے، اُنھی گندے کپڑوں میں بیٹھا ٹھٹھے مار رہا تھا۔ آٹھ دس آدمی اپنے جوہر آزما چکے تھے اور ابھی کچھ طے نہیں تھا کہ وہاں کتنے ہنرمند چھپے ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ صبح تک ختم ہونے والا نظر نہیں آتا تھا۔ بے تُک یہ سب کچھ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ جبھی تو اتنے لوگ اتنے چھلبلے لوگ ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی تو بازی گر آنکھیں خیرہ کر دیتے تھے، میرے لیے تو بہت کچھ نیا تھا۔ اِس سے پہلے میں نے ایسے کرتب کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بمبئی میں ایک مرتبہ کرشنا بی مجھے سرکس دکھانے لے گئے تھے، ایک دو مرتبہ نوٹنکی میں بھی، اِس کے سوا مجھے کبھی موقع نہیں ملا۔ ہاں جیل میں کبھی کبھار ایسے شعبدے باز آ جاتے تھے۔ میں نے بھی ہر طرف سے دھیان ہٹا کے اُنھی پر نگاہیں مرکوز رکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے بیٹھے بیٹھے جانے کیا ہو جاتا تھا، میرا سارا جسم دھڑکنے لگتا تھا۔ ایک بار تو میں نے اُٹھنے کا پکّا ارادہ کر لیا۔ میں نے سوچا، کوئی بھی بہانہ کر دوں۔ کہہ دوں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یقیناً کانتے بھی میری وجہ سے اُٹھ جائے گا لیکن میں یہ سوچ کے چپ بیٹھا رہا کہ میرے اس طرح چلے جانے سے کہیں سب کچھ درہم برہم نہ ہو جائے۔ ایک میری وجہ سے اتنے بہت سے آدمی کیوں متاثر ہوں۔ حویلی میں بھی تو اتنے دن گزارے ہیں مگر حویلی کی بات اور تھی۔ وہاں کسی طرح صبر آ جاتا تھا، یہاں تو سبھی پاس بیٹھے تھے۔ مجھے تجھل اور کانتے کے چہروں پر چھایا ہوا سکون سراب سا محسوس ہو رہا تھا۔ دیر ہو گئی۔ آخر مجھ سے ضبط نہ ہوا۔ کانتے کھسکتا ہوا مجھ سے اور قریب ہو گیا تھا۔ میں اُس سے کچھ کہنے کے لیے لفظ ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ ٹٹولتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا: "کیا ہے لاڈلے! کیا بات ہے؟"

"کانتے بھائی!" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "یہ... یہ لوگ کب جائیں گے؟"

"کیوں جانی؟" وہ پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا۔ "کیا نیند آ رہی ہے؟"

"نہیں۔"

"دیکھ نہیں رہا ہے، سالے ایک دم جنگلی ہو گئے ہیں، ایسی باتیں کب آتی ہیں۔ اُس کن کٹے کو دیکھا، اپنے شولی سے کچھ نیچی تان نہیں اُٹھاتا۔"

میں سر ہلا کے رہ گیا۔

"تجھ کو اچھا نہیں لگ رہا ہے کیا؟" وہ بے چینی سے بولا۔

"اچھا تو معلوم ہوتا ہے سب سے زیادہ تجھل بھائی کو لگ رہا ہے۔"

"ہاں!" جھل کی طرف نظریں گھماتے ہوئے وہ تیزی سے بولا اور چونک پڑا میرے لہجے کا احساس اُسے بعد میں ہوا۔ "پر اُستاد کی بات جانے دے۔" وہ جھک کے کہنے لگا۔ "اس کو کیا اُلٹا سیدھا، نیچے اُوپر لگتا ہے کسی کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

"لیکن میٹھے تو وہ ایسے جم کے ہیں جیسے..." میں تذبذب سے اُس کا چہرہ دیکھا کیا۔

"ہاں"۔ وہ آنکھ مار کے بولا۔ "ابھی آگا پیچھا بھی کچھ کانٹے پر رکھنا پڑتا ہے اِدھر سالا آمنے سامنے سب آن جانا ہے۔ سمجھا کر جانی!" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "اُستاد کی آنکھوں سے دیکھ۔"

"تم، تم کیا......"

اُس نے زور سے میرا پیر دبایا اور سامنے کھڑے ہوئے آدمی کی طرف توجہ دلانی چاہی۔ اُس آدمی نے اپنے کندھے، سر اور بازوؤں پر پورے پانچ آدمی بٹھا رکھے تھے اور اُن کا بوجھ اُٹھائے اُٹھائے دائرے میں گھوم رہا تھا۔ پانچوں آدمی ایک دوسرے سے چھیڑ خانیاں کر رہے تھے۔ کانتے کی باتوں نے مجھے اور مضطرب کر دیا تھا۔ "تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟" میں نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "کوئی ایسی ویسی بات تو..."

"نہیں رے"۔ وہ سر جھٹک کے بولا۔ "کوئی نہیں۔"

"پھر تم اس طرح کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

"ٹھیک ہی بول رہا ہوں لاڈلے!" اس نے نرمی سے کہا۔ "ہر جگہ کا رُت موسم ایک سا نہیں ہوتا۔"

"تمھاری کوئی بات میرے پلّے نہیں پڑ رہی ہے، معلوم ہوتا ہے تُم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔"

"کانتے تجھ سے کچھ چھپائے گا بلبل!" وہ ہنس کے بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کا جاننا تیرے لیے ایسا جلدی ہو۔ میں سمجھ رہا ہوں، تیرے کو بابا کی دھڑکن لگی ہوئی ہے، میں تجھ کو شروع میں بول دیا تھا، وہ ایک دم ٹھیک ہیں اور اِدھری شہر میں ہیں۔"

"مگر وہ ہیں کہاں؟"

"اپنے گھر میں۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

"اپنے گھر میں!"

"بابا نے اِدھر محل برابر اونچی حویلی خریدی ہے۔" وہ ہاتھ پھیلا کے بولا۔ "مارٹی ماسٹر اور ٹنگو اُدھری اُن کے ساتھ ہیں۔"

"حویلی خرید لی ہے؟"

"ہاں، لمبی کہانی ہے، تجھ کو ایک ایک بات بول دوں گا پر ذرا ٹھنڈا ہو کے بیٹھا رہ۔ پتہ نہیں، یہ چھلیا پھر کب دیکھنے کو ملیں، کچھ دیر کی بات اور ہے۔"

"ان کا کوئی بھروسا نہیں، ساری رات لگا دیں۔"

"لگا دیں سالے۔" وہ مچل کے بولا۔

"کیا تم تھوڑی دیر کے لیے اٹھ نہیں سکتے؟"

"ایسا کیسے؟" وہ تنک کے بولا اور مجھے سمجھانے لگا۔ "تیرے آنے پہ تو سو نیٹے ہوئے ہیں لَلوا! تو شہ ہی بیچ سے اٹھ گا تو براتی کدھر جائیں گے، کیا بولیں گے، استاد الگ منہ بنا۔ اُس نے اول دن ہی اِن لوگ کو بول دیا تھا کہ پہلے لاڈلے کو دو۔" کانتے وہی کچھ کہنے لگا جو میں نے خود سے کہا تھا، میری دھپ مارتے ہوئے بولا۔ "چلنے دے جانی! اب اکٹھا ہی اُٹھیں، تھوڑی دیر ان حرام خوروں کو اور ستانے دے۔ دیکھ نہیں رہا، اُستاد بھی آج کیسا بندھا بیٹھا ہے۔"

"سب دیکھ رہا ہوں۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"پر آنکھوں سے ہی دیکھ رہا ہے نا؟"

اِس لیے کہ صرف انھی سے نظر آ رہا ہے۔"

اُس نے مجھے چمٹا لیا۔ "رُوٹھ گیا سجناں!"

"روٹھنے کی اس میں کیا بات ہے کانتے بھائی!"

"تو بولتا ہے تو میں اُٹھ جاتا ہوں۔"

"نہیں، بیٹھے رہو۔ شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ وہ[illegible] بھائی کو برا لگ سکتا ہے۔ وہ چاہتے تو انھیں روک سکتے تھے کہ[illegible] پہ رکھیں، اُن کا اشارہ ہی کافی ہوتا مگر مگر..."

"مگر استاد ایسا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" میں نے تندی سے پوچھا۔ "آخر ایسی کیا با[illegible]"

"تو اُدھر بارہ دن حویلی میں لشکارہ کے بھی یہ پوچھتا[illegible] ہم کو آئے چھ دن ہو گئے۔ باہر تھے پر اِدھر ہم بھی جکڑے ہی رہے ہیں، کوئی اور جگہ ہوتی تو سالی کیا اتنی دیر لگتی؟ گھس کرنا پڑتا؟ ابھی ہم لوگ اِدھری ہیں اور جب تک دانہ پانی زور کرتا ہے تب تک..." وہ بھناتی آواز میں "سارا گودا نکال کے آیا ہے کیا، اتنی دیر سے کیا بول رہا[illegible]"

میں نے پھر اُس سے کوئی حجت نہیں کی۔

"اور ایک بات دھیان میں رکھ، اڈے کا مالک اب[illegible] نہیں، بھولے دادا ہے۔ تیرے سامنے ہی اُستاد نے ہتھیار اُس[illegible] ڈالا ہے، ساری رات کیا، ساری عمر گزر جائے گی، جب تک جو[illegible] اِدھر بیٹھا ہے، اُستاد منہ سے کچھ نہیں پھوٹے گا، تو اُس کی رگ رگ[illegible] واقف ہے پھر ایسا کیوں بولتا ہے۔"

میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا، یہ بھولے دادا کون[illegible] میں نے اپنی زبان بند رکھی۔

درمیان سے بیک وقت پانچ آدمیوں کا بوجھ سہارنے وا[illegible] ہٹ چکا تھا اور اُس کی جگہ کمر میں رنگین ٹپکے باندھے ہوئے تین[illegible]

نے لے لی تھی مگر ابھی وہ سامنے ہی آئے تھے، اُنھوں نے اپنا [illegible]انا شروع نہیں کیا تھا کہ عمارت پر ایک لحظے کے لیے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ عمارت کے باہر سے یکایک متعدد دھماکے سُنائی دیے تھے۔ سب پلٹ کے دروازے کی طرف دیکھنے لگے اور اُسی دم وہاں کوئی بھاکا سا ہوا۔ زرق برق لباس میں ملبوس تین عورتیں دروازے پر نمودار ہوئیں، اُن کے پیچھے سازندے اور ایک ساتھ بہت سے آدمی اندر داخل ہوئے۔ ساری عمارت میں سیٹیاں گونجنے لگی تھیں، اُس پہ [پٹ]اخوں کی آوازوں نے ایک تلاطم سا اُٹھا دیا تھا۔ لوگوں نے عورتوں کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ دروازے سے چوکی تک کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا [ت]اہم انھیں ہم تک پہنچنے میں دیر لگی۔ آن میں ایک ادھیڑ عمر عورت [آ]گے تھی، دو لڑکیاں اُس کے عقب میں۔ تینوں کے رخساروں پر سُرخ و سفید رنگ دمک رہا تھا، پلکوں پر تارے اور کانوں میں آویزے جگمگا رہے تھے۔ دونوں کے قد نہ زیادہ چھوٹے تھے نہ بڑے۔ بس درمیانے تھے۔ عورت بڑے قد کی تھی۔ تینوں نپے تُلے قدموں سے سَر اُٹھائے [نگ]اہیں جھکائے آئی تھیں۔ چوکی کے پاس آ کے وہ ٹھیر گئیں، اُنھوں نے [ش]ائستگی سے جھل کو تسلیمات کی۔ جھل نے کسمساتے ہوئے بھورے دادا [کی] طرف اشارہ کیا۔ وہ کچھ ٹھٹک سی گئیں مگر دوسرے ہی پل اُنھوں نے [اُ]سی انداز سے بیچ میں بیٹھے ہوئے بھورے دادا کو آداب کیا۔ اُن کے ساتھ سازندے بھی تھے۔ جھل نے متردد نگاہوں سے کالے دادا کی طرف دیکھا، اُسی وقت آگے کھڑی ہوئی عورت نے شرمیلے سے لہجے میں [اُ]سے مخاطب کیا۔ "بندی کو تارا کہتے ہیں، شاید اُستاد نے نام سنا ہو، [اس]ی بازار میں غریب خانہ ہے۔"

اُس کی آواز بکھر بکھر رہی تھی اور نہایت شستہ تھی۔ "بندی پہلے ہی دن خدمت میں حاضری دیتی لیکن بتایا گیا کہ سرِدست رسائی ممکن نہیں۔ پھر جانے کیوں یہ خوش فہمی رہی کہ شاید اُستاد ہی کسی دن راستہ بھول جائیں۔ یہاں بازار میں سب آپ کو دعائیں دیتے ہیں، [بہ]ت مشکل وقت گزارا ہے یہاں سبھی نے، کوئی آزمائش سمجھ کے۔ بندی کیا [ک]یا عرض کرے، یہ اِس کا موقع محل نہیں ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ برے دن آخر ٹل گئے، ایسے دن جو یہاں کبھی کسی نے دیکھے نہیں تھے، سُنے نہیں تھے۔ بازار کا ہر گھر اُستاد کے پاس آنے اور اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لیے بے تاب ہے۔"

جھل نے اپنا بھاری سَر ہلایا۔ "اِن کو کیوں تکلیف دیا ہے کالے؟" اُس نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کالے دادا سے کہا۔

"بخدا ہم اپنی خوشی سے آئے ہیں۔" وہ جھلملاتی آواز میں بولی۔ "[ا]بھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا کہ چھوٹے میاں تشریف لے آئے ہیں اور اب حاضری پر کوئی بندش نہیں ہے، بندی سے پل بھر نہ ٹھیرا گیا، ہم اجازت کے بغیر آ گئے، ہر ... آمد کی مبارک باد۔

خوشی کی اس گھڑی میں ہم کیوں کسی سے پیچھے رہتے۔"

"لیکن رات بہت ہو گئی ہے بیگم۔" جھل نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"رات تو اب شروع ہوئی ہے سرکار!" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "صرف آپ کی اجازت مطلوب ہے، اپنی اِن دو بچیوں کو میں نے کچھ سکھانے کی، جو کچھ بھی بندی کو آتا ہے، اِن کے سپرد کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ فیصلہ تو پرکھنے والی نگاہیں ہی کر سکیں گی کہ انھوں نے یہ میراث کتنی قبول کی ہے۔ کچھ کیا بھی ہے یا نہیں، ناچیز کی رائے میں اُستاد کو سُر تال نرت بھاؤ کی خوب پرکھ ہے، بڑا بول ہو تو خدا مجھے معاف کرے۔ بندی کو اُمید ہے، شاید یہ نو آموز اُستاد کو مایوس نہ کریں، کوئی کسر رہ گئی ہو تو ان کی عمروں کا لحاظ کر لیجیے گا۔"

"مگر، مگر۔" جھل نے اِدھر اُدھر نگاہیں گھماتے ہوئے کہا۔ "بھورے دادا کے ہوتے ہم کیا بول سکتے ہیں۔"

"اپن، اپن کیا۔" اپنے نام پہ بھورے دادا سٹ پٹا سا گیا اور لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ "رات بہت ہو گیا ہے تارا بائی!"

لوگوں نے بے تحاشا شور مچانا شروع کر دیا۔ بھورے دادا چند لمحوں تک پس و پیش میں پڑا رہا، کبھی جھل کو دیکھتا، کبھی تارا بائی کو اور کبھی اُدھم مچانے والوں کو۔ آخر اُس نے اجازت کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ تینوں نے سَر خم کر کے اُس کا اور جھل کا شکریہ ادا کیا پھر اُلٹے قدموں چوکی سے کچھ فاصلے پر چلی گئیں۔ کلکتے، فیض آباد یا بمبئی کا اڈا ہوتا اور محفل کیسی ہی گرم کیوں نہ ہوتی، جھل کی خواہش نہ ہوتی تو انھیں روکنے میں وہ ایک ثانیے کی دیر نہ کرتا، ایک آواز بھی نہ اُٹھتی۔ صرف بھورے دادا کی بات نہیں تھی۔ جھل کو اُس کا پاس مانع ہوتا تو وہ کسی طور بھورے دادا پر اپنی ناآمادگی کا اظہار کر سکتا تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، اُس کے چہرے سے بھی یہی بے دلی نمایاں تھی۔ اندر کچھ اور ہو تو نہیں کہہ سکتا۔ کانتے ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، کوئی ایسی ہی بات تھی جو جھل یوں اپنے آپ کو سمیٹے بیٹھا تھا۔ وہ لوگ اگر اڈے کے نئے اُستاد کے سامنے اپنی خوشی جتانے کے لیے بے تاب تھے تو جھل کو بھی اُن کی خوشنودی بہت مطلوب معلوم ہوتی تھی، ایسا بھی ہو سکتا ہے جب اڈے کا نیا اُستاد اڈا حاصل کرنے کے بعد کسی چیز کی کمی محسوس کرتا ہو۔ اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہی جو کانتے بتا رہا تھا اور جو میں نے یہاں آ کے خود دیکھا تھا لیکن جیسے جیسے سرے ملتے جا رہے تھے، گرہیں اور بڑھتی جا رہی تھیں۔ معلوم نہیں، یہاں آنے کے بعد جھل کو کن دیواروں کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ ایک سامنے کی بات میرے ذہن سے بار بار اوجھل ہو جاتی تھی کہ جھل کو حیدر آباد آئے چھ دن ہو گئے تھے پھر بھی وہ نواب عالم تاب کی حویلی تک نہیں آ سکا تھا۔

لوگ اور پیچھے ہٹ گئے۔ درمیان کی جگہ کچھ اور چوڑی ہو گئی۔ اُنھوں نے آناً فاناً کھلی زمین پر دریاں بچھا دیں اور چاندنیاں یہاں

سے وہاں تک پھیلا دیں۔ سازندے چوکی کی طرف پُشت کر کے بیٹھ گئے۔ تارا بائی نے دیر نہیں لگائی، لَے اُٹھانے لگی.... پہلی ہی تان سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اُس کی آواز کتنی اچھی ہو سکتی ہے، مضطرب سی آواز تھی۔ شروع میں وہ بس سُر الاپتی رہی اور گم سُم سی ہو گئی۔ مجمع کو بھی جیسے سانپ سونگھ گیا۔ عمارت میں ہر طرف اُسی کی آواز گونج رہی تھی۔ چوکی سے کچھ دُور وہ عین ہمارے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں لڑکیاں اُس کے دائیں بائیں تھیں۔ وہ شرمائی شرمائی، کسی قدر حیران حیران اور کچھ سہمی ہوئی بھی نظر آ رہی تھیں، ممکن ہے اتنے بڑے ہجوم اور ایسے لوگوں کے سامنے آنے کا پہلا اتفاق ہو، ویسے بھی وہ نئی نئی لگ رہی تھیں جیسے کسی گھر سے اُٹھ کے آ گئی ہوں، ایسے گھر سے جہاں لڑکیاں چار دیواری میں بند رہتی ہوں۔ کوئی بھی انھیں کسی اور جگہ دیکھے تو یہی سمجھے کہ ان کا تعلق کسی اچھے اور بڑے گھرانے سے ہو گا، یہ حقیقت تصور میں بھی نہ آئے کہ ان کا تعلق بازار سے ہو سکتا ہے مگر بازار کے چہرے الگ کب بنائے جاتے ہیں، بھلا فمی کو دیکھ کے کون کہہ سکتا تھا اُس کا تعلق بھی تو بازار سے تھا، شہ پارہ بھی انھی کی طرح تھی، نیساں بھی، تارا بائی انھیں اپنی بیٹیاں بتا رہی تھی، چمپا بھی فمی سے اپنا یہی رشتہ ظاہر کرتی تھی اور اپنی بیٹی کو کھُلے عام گواتی نچواتی تھی۔ ہو سکتا ہے، تارا بائی بھی اُن کی ایسی ہی ماں ہو۔ ہو سکتا ہے لڑکیاں اُسے پلی پلائی مل گئی ہوں جیسے چمپا بائی کو فمی مل گئی تھی، انھیں بھی کسی نے کسی ایسے گھر سے لے جا کے تارا بائی کے ہاں پہنچا دیا ہو گا جس کے مرد مر گئے ہوں یا اندھے ہو گئے ہوں، جس گھر کا کوئی بھائی سب کو چھوڑ کے چلتا بنا ہو اور کوئی باپ پاگل ہو گیا ہو۔ اُسی گھر کے لوگ مارے مارے پھرتے ہیں جہاں پاسبان ٹھیک نہیں ہوتے۔ میں نے گھر سے چلتے وقت سب کچھ ابا جان پر چھوڑ دیا تھا کہ ابا جان تو موجود ہی ہیں، مجھے اُس وقت یہ خیال کیوں نہ آیا کہ میرے پیچھے ابا جان کو خدانخواستہ کچھ ہو جائے تو باقی گھر والوں کو کون پوچھے گا۔ بے شک گھر میں میرے رہتے ہوئے بھی مجھے کچھ ہو سکتا تھا، آدمی کسی وقت بھی معذور ہو جاتا ہے، مر جاتا ہے لیکن ایسے میں ایک قرار آ جاتا ہے کہ جو کچھ اپنے بس میں تھا اُس میں تو کوتاہی نہیں کی۔ میرے بس میں اتنا تو تھا کہ گھر میں رہ سکوں مگر یہ بھی کہاں تھا۔ گھر سے چلتے وقت میں اپنے ہوش میں کب تھا، میں تو اُسی وقت سب کے لیے مر گیا تھا۔ بے اختیار آدمی اور مُردہ آدمی میں کیا فرق ہے۔ پنجرے میں بند پرندے کے پر دکھاوا ہوتے ہیں، آدمی بھی تو پنجروں میں بند ہوتے ہیں، یہ پنجرے کسی کو نظر نہیں آتے، اپنے آپ کو بھی نہیں مگر ہوتے پنجرے ہی ہیں۔ میں گھر سے اپنا اختیار حاصل کرنے کے لیے نکلا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ آگے جا کے کیا ہو جائے گا۔

کچھ دیر تک تارا بائی خود گاتی رہی گویا اپنی آواز جانچ پھر لڑکیوں نے اُس کی لَے میں لَے ملانی شروع کی۔ لوگوں کی اور آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ تارا بائی کا گانا سننے کے ہیں۔ میں نے بجھل، بیرو، جامو اور کانتے وغیرہ کو اکثر گا بارے میں باتیں کرتے سُنا تھا، گانے کی جو خوبیاں وہ گنات آواز کا اُتار چڑھاؤ، گداز، رس، نشہ اور گونج وغیرہ تارا بائ میں اتنا کچھ تو نہیں تھا پھر بھی اُس کی آواز میں کوئی ایسی ضرور تھی کہ سب ہمہ تن گوش تھے۔ سویرا ہو جانے میں اب نہیں تھا مگر لوگ تارا بائی کی آواز سے بیدار اور تازہ دم نظر تھے۔ دیر تک وہ تینوں ایک دوسرے کی آواز میں آواز ملا رہیں پھر لڑکیاں اُٹھ گئیں۔ گھنگرو انھوں نے پہلے سے با تھے۔ تارا بائی نے ستار سنبھال لیا اور لڑکیاں اُس کی آواز ناچنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے تارا بائی کی آواز اُن کے ہاتھ گئی ہے، اُن کے بدن میں تحلیل ہو گئی ہے۔ وہ کٹھ پتلیا کی ڈوری تارا بائی کی تحویل میں ہے۔ تارا بائی جدھر چاہتی گھماتی رہتی ہے۔ تارا بائی گا رہی تھی ؎

بھویں تنی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہی
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہی

ساز بھی اُس کی آواز کے ساتھ رَل مل گئے۔ لوگ بُری طر پھڑکنے سے لگے۔ لڑکیاں کھُلے دائرے میں ہر طرف نا مگر اُن کی بیشتر توجہ چوکی پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی جانب ہی شعر پہ لوگ نوٹ اور چاندی کے روپے لُٹانے لگے نے ناچنے کے ساتھ تارا بائی کے سُر میں سُر ملا کے گانا ش ساری عمارت میں آگ سی لگ گئی۔ ہر جانب سے لوگ ا طرف متوجہ کرنے کے لیے نوٹوں اور سکّوں کی جھلک دکھ وہ تھرکتی ہوئی کبھی اِدھر جاتیں کبھی اُدھر۔ لڑکیاں جس کے پہنچتیں، وہ انگلیوں میں تھما ہوا نوٹ اُوپر نیچے دائیں رہتا۔ لڑکیاں اُس وقت تک اُس کے سامنے ناچتی ر تک وہ اپنے روپے سے دست بردار نہ ہو جاتا۔ پھر ابھی ہٹتی نہیں تھیں کہ پھر وہی شخص یا قریب کا کوئی اور شخص نکال کے جھٹ اُن کے آگے کر دیتا۔ انھیں دیکھ کے بار با فمی کا دھیان آ رہا تھا جیسے فمی روپ بدل کے میرے سا ہو۔ وہ بھی ایسے ہی لہک لہک کے اور ٹھمک ٹھمک کے سے روپے لیتی ہو گی، اُن کے نقروں اور طرح طرح کی حرکتو طرح مسکرا کے رہ جاتی ہو گی۔ وہ نواب جو فمی کو مستقل ا چاہتا تھا، اُس نے مجھے بتایا تھا کہ فمی سب سے الگ تھی۔ حسین اور کھوئی کھوئی سی، اپنے بالاخانے تک محدود رہتی

ے گلی کوچوں میں ایسے نہ ناچتی گاتی ہو مگر گھر تو اُس کا بالاخانہ تھا۔ گلی کوچوں کے لوگ جہاں جاتے ہیں، اُسی طرح کی باتیں تے ہیں۔ اُس کے بارے میں جامو کے کہے ہوئے لفظ بھی مجھے اچھی ح یاد تھے۔ جامو ہمیں زرّیں کی حویلی ملنے کا جشن منانے چمپا بائی بالاخانے لے گیا تھا۔ راستے میں اُس نے فمی کے لیے کیا کچھ کہا ا، ایک ایک لفظ میرے سینے میں پیوست تھا۔

لوگوں کا بس نہیں چلتا تھا کہ انھیں کھا جائیں، ویسی ہی نظروں سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ تارا بائی نے دوسری غزل چھیڑی۔ یک یک کالے وادا ایک طرف سے اُچھلتا، دہاڑتا میرے پاس آیا۔ ں نے جیب سے مٹھی بھر نوٹ نکال کے میرے سر پہ رکھ دیے۔ مجھے ل اچھا نہیں لگا، میرے جی میں آئی کہ اُسے اُٹھا کے چوکی سے نیچے پھینک دوں لیکن اُس کا چہرہ دیکھ کے میرا جسم اندر ہی اندر پھڑپھڑا کے رہ گیا۔ کالے وادا کھلا جا رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں سیدھی چوکی ر چلی آئیں۔ لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ چوکی پہ خاصی گنجائش نکل آئی۔ ونوں میرے سامنے آ کے بیٹھ گئیں۔ میں سر تا پا پسینے میں نہا گیا۔ وہ ھ سے کوئی ایک قدم کے فاصلے پر بیٹھی مسکرا مسکرا کے گانے لگیں۔ تنے قریب سے میں نے انھیں اب دیکھا تھا۔ دونوں کے چہروں پر سُرخ رنگ دہک رہا تھا، آنکھوں میں چنگاریاں سی لپک رہی تھیں۔ وہ سَر بہ سَر خوشبو میں بسی ہوئی تھیں۔ ان کے بدن پارا پارا سے تھے۔ گانے کے ساتھ وہ بیٹھے بیٹھے ناچ بھی رہی تھیں، اُن کے بازو جیسے ہوا میں بہے جا رہے تھے اور میری ہی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ میرے حواس منتشر ہو گئے۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن ہر لمحے گمان ہوتا تھا کہ فمی میرے سامنے آ کے بیٹھ گئی ہے، یہ لڑکیاں فمی کی ساری ات جانتی ہیں اور انھیں میرے پاس دانستہ بھیجا گیا ہے۔ مجھے اپنا چہرہ ن کی تیز، شعلہ بار نظروں سے چھپانے کے سوا کچھ سجھائی نہ دیا۔ جلد ہی مجھے اپنے سر پہ اُن کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ انھوں نے روپے ٹھا لیے تھے لیکن میرے پاس سے اُٹھی نہیں تھیں۔ کالے وادا کے بعد نہ معلوم کون شخص تھا جس نے اُس کے ہٹتے ہی روپے میرے کان پر رکھ دیے۔ پھر کیا تھا، کوئی میرے گالوں پر، کوئی ٹھوڑی پر، کوئی ہونٹوں پر اور کوئی سینے پر روپے رکھنے لگا۔ لڑکیاں پہلے تو اچکتے ہوئے انداز میں انگلیوں سے روپے کھینچتی رہیں پھر انھوں نے چٹکیاں بھرنی شروع کر دیں۔ لوگوں نے شور مچایا، وہ باقاعدہ مجھے نوچنے لگیں، جیسے ہی میرے چہرے سے روپے لینے کے لیے اُن کے ہاتھ دراز ہوتے، عمارت میں قہقہے گونجنے لگتے۔ گانے کی آواز شور میں دب جاتی۔ میرا سارا جسم اینٹھ گیا۔ ارادے کے باوجود مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ انھیں دھکے دے کے خود سے دُور کر سکوں اور یہاں سے بھاگ نکلوں، اپنا گریبان چاک کر لوں، اپنے آپ کو نوچنا کھسوٹنا شروع کر دوں۔ میں سر جھکائے ساکت جامد بیٹھا رہا اور میری رگوں میں خون سلگتا رہا۔ پھر انھی میں سے کوئی اور شخص آیا، اُس نے میرے سر پر سکّوں سے بھری ہوئی تھیلی اُلٹ دی۔ سکّے کھن کھناتے ہوئے میرے چاروں طرف بکھر گئے۔ میں نے وحشت سے بجھل کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے گُنگ بیٹھا تھا البتہ بیرو کی نظریں مجھی پر مرکوز تھیں اور اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُسی نے کالے وادا سے کچھ کہا ہو گا کہ پھر کوئی میرے پاس نہیں آیا۔ جس شخص نے سکّوں کی تھیلی اُلٹی تھی وہ بازار کا چودھری تھا جس کی نذر بجھل نے واپس کر دی تھی۔ دونوں لڑکیاں تھوڑی دیر تک بیٹھی گاتی رہیں پھر چوکی سے اُتر کے لوگوں کے درمیان چلی گئیں۔

چوکی پر سکوت چھا گیا لیکن مجمع اُن کی واپسی پر اُچھلنے کودنے لگا۔ دائیں طرف کھڑا ہوا ایک شخص کچھ اور بے کل ہو گیا، وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کے متانے لگا۔ اُس کے ہاتھوں میں گڈیاں تھیں۔ کچھ دیر پہلے بھی اُس نے لڑکیوں پہ بہت سے روپے نچھاور کیے تھے، اِس طرح لڑکیوں کو دیر دیر تک اپنے پاس روک کے رکھا تھا۔ اب بھی اُس کے مضطرب تیوروں میں یہی تڑپ چھپی معلوم ہوتی تھی کہ وہ کسی اور طرف نہ جائیں، اُسی کے سامنے ناچتی گاتی رہیں۔ دو ایک مرتبہ اُس نے لڑکیوں کے بڑھتے ہوئے ہاتھ پکڑنے کی کوشش بھی کی تھی اور انھیں طرح طرح کے اشارے کر رہا تھا۔ کبھی سینے پہ ہاتھ مارتا، کبھی ٹھنڈی آہیں بھرتا، کبھی دیوانوں کی طرح سر جھکا لیتا۔ اُس کی آنکھوں کے خمار اور اضطراب سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ کوئی نشہ کیے ہوئے ہے۔ شاید وہ تارا بائی کے پیچھے پیچھے آیا تھا اِس لیے کہ ابتدا میں اُسے میں نے کہیں نہیں دیکھا یا ممکن ہے، میری نظروں سے وہ اوجھل رہا ہو۔ اُس نے اچانک آگے آ کے روپے لٹانے شروع کیے تھے، تبھی میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اُس کے اِرد گرد کے لوگ اُس کا خیال کر رہے تھے۔ ڈیل ڈول میں وہ چوڑا چکلا تھا، ہاتھ پیر کا سجل، چہرہ بڑا اور کھُردرا سا، عمر تیس کے قریب۔ اڈّے سے متعلق معلوم بھی ہوتا تھا نہیں بھی۔ چوکی سے واپس جانے کے بعد لڑکیاں اُس کی طرف جانے کے بجائے کسی اور طرف چلی گئیں۔ وہاں کچھ اور لوگ روپے ہاتھ میں دبائے منتظر تھے۔ یہ بات اُسے ناگوار گزری، اُس نے تلملاتے ہوئے انھیں اپنی طرف آنے کا ایک طرح سے حکم دیا۔ لڑکیاں اُسے دیکھ کے مسکرائیں اور آنکھوں آنکھوں میں تحمل کا اشارہ کیا مگر اُس کی بے چینی کم نہیں ہوئی۔ وہ مچلتا، بڑبڑاتا رہا۔ لڑکیوں کو دوسری طرف روپے بٹورنے سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔ وہ شخص انتہائی بے تاب ہو گیا، خود اُن کے پاس جانے کے لیے رسّیاں تڑانے لگا، بہر حال اُس کے قریب کھڑے ہوئے لوگوں نے کسی نہ کسی طور اُسے روک کے رکھا۔

کچھ دیر بعد لڑکیاں پھر اُس کے پاس پہنچیں۔ اُس نے اضطراری انداز میں ایک کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لڑکی کے بال لمبے تھے، دراز گردن، غلافی آنکھیں اور گلے میں گلابی دوپٹا۔ لباس اور سجاوٹ سے وہ کوئی دلھن لگ رہی تھی جیسے کوئی دلھن ناچ گا رہی ہو۔ وہ بُری طرح گھبرا گئی لیکن اُس نے خود پر قابو رکھا اور مسکراتے ہوئے کلائی چھڑانے کی کوشش جاری رکھی۔ شاید اُس آدمی نے گرفت اور سخت کر دی۔ لڑکی کے رخساروں پر تکلیف کے آثار ہویدا ہونے لگے۔ گانے کے بول بھی لرزنے لگے۔ اُس کے ساتھیوں نے اُسے سرزنش کی اور دوسرے لوگوں کی موجودگی کا احساس دلایا۔ اُن کے ٹوکنے اور ٹھوکے دینے پر آخر اُس نے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ہاتھوں میں جکڑے ہوئے نوٹ وارفتگی سے دونوں لڑکیوں کے قدموں میں پھینک دیے۔ ممکن ہے میرے علاوہ دوسروں نے بھی محسوس کیا ہو، گلابی دوپٹے والی لڑکی سامنے آتی تو وہ بے اختیار ہو جاتا۔ وہ جدھر مڑتی اُس کی نگاہیں اُسی کے گرد منڈلاتیں۔ لڑکیاں روپے فرش سے سمیٹ کے تیزی کے ساتھ دوسری طرف نکل گئیں۔ اُس شخص نے فوراً جیب سے کچھ اور نوٹ نکال لیے تھے، لڑکیوں کو رسماً وہیں ٹھہر جانا چاہیے تھا مگر وہ دوسری طرف جا کے ناچنے گانے لگیں، کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھوں نے عمداً اُس آدمی کی طرف توجہ نہیں دی حالانکہ وہ انھیں مسلسل بُلا رہا تھا۔ کئی بار ناچ کے دوران گھومتے ہوئے انھوں نے اُس کی طرف دیکھا بھی لیکن اُس کے پاس نہیں گئیں، اُس کے قریب کے لوگوں کے پاس جاتی رہیں۔ اُس شخص نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اُسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اُس سے برداشت نہ ہو سکا۔ اُس نے سب کی موجودگی میں دہاڑتے ہوئے انھیں بُلایا۔

لڑکیوں نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ ویسے اُن کی بھی کوئی غلطی نہیں تھی، وہ کسی ایک شخص کے لیے یہاں نہیں آئی تھیں۔ مضطرب آدمی کے ساتھیوں نے اُسے سمجھانا چاہا لیکن وہ سخت مشتعل ہو گیا۔ لڑکیاں ایک بار اور اُس کی طرف چلی جاتیں تو شاید کچھ نہ ہوتا۔ وہ نہیں پلٹیں بلکہ گلابی دوپٹے والی لڑکی نے تند و ترش نظروں سے اُسے گھور کے دیکھا، دھتکارنے کے سے انداز میں۔ وہ آدمی اپنے ساتھیوں میں کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا، لوگ اُس کا بازو پکڑے اُسے تحمل کی تلقین کر رہے تھے لیکن اُس نے ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کرا لیا۔ گلابی دوپٹے والی اُس سے دُور نہیں تھی۔ لوگ کچھ نہیں سمجھ پائے۔ انھیں سمجھنے بوجھنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ وہ جتنی دیر میں دوبارہ اُسے سنبھالتے یا قابو میں کرتے، اتنی دیر میں اُس شخص نے جست لگائی اور دیوانہ وار لڑکی کی طرف جھپٹا اور ایک لمحے میں پیچھے سے بازو پھیلا کے لڑکی کو جکڑ لیا۔ لڑکی ہول ناک آواز میں چیخنے لگی، سازندوں کے ساز ایک دم تھم گئے۔ تارا بائی کی آواز ٹھٹھر گئی، دوسری لڑکی چیختی

ہوئی اُس سے جا چمٹی۔ چوکی پر ہم سب کھڑے ہو گئے۔ لوگ اُس طرف بڑھے مگر ٹھٹھک کے رہ گئے۔ اُسے ایک لمحے سے زیادہ نہیں ملی تھی پھر بھی اُس نے تمنچہ نکال لیا۔ جو جہاں تھا، وہیں ... عمارت چند لمحوں کے لیے سناٹے میں ڈوب گئی۔ خاموشی اُس شخص کو کوئی داد ملی۔ اُس کی وحشت بڑھ گئی۔ اُس نے ہذیانی ... چلانا شروع کر دیا کہ کوئی اُس کے قریب آنے کی کوشش نہ ... وہ گولی چلا دے گا، یہ کہتے ہی وہ لڑکی کی گردن، بالوں، شانوں ... رخساروں کے بوسے لینے لگا۔ اُس نے اُسے بُری طرح دبوچ ... لڑکی پہلے تڑپتی رہی پھر اُس کے سراپا پر دہشت چھا گئی ... منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں۔ یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع ... گنگ ہو گئے۔ ببّھل، پیرو، کالنتے، بھولے دادا، جمرو وغیرہ ... پیچھے سے قابو میں کرنے کا کوئی سوال نہیں تھا اور آگے سے ... سکتا تھا، اُس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ وحشیانہ انداز میں لڑکی ... کے جور و ستم یاد دلا رہا تھا اور کسی نواب نظیر کو ننگی گالیاں ... تھا۔ وہ لڑکی سے کہہ رہا تھا کہ اُس حرام زادے نواب کو اب کیو ... پکارتی۔ وہ قطعی اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ اُس نے لڑ... صاف صاف کہہ دیا کہ اب اُسے کوئی اُس سے جُدا نہیں کر سکتا ... وہ کہہ رہا تھا، اُسے کر گزرنے میں اب کسی کو شک نہیں ہونا ... کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

سب کی نگاہیں کبھی ببّھل کی جانب اُٹھ رہی تھیں، کبھی ... شخص کی جانب۔ ببّھل چوکی پر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ کسی ... کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ایسی محفلوں میں طرح طرح کے لوگ ہوتے ... ایسا کبھی نہیں ہوتا، کون سوچ سکتا تھا کہ وہاں کسی کے پاس تمنچہ ... وہ یُوں سُدھ بُدھ بھی کھو بیٹھے گا۔ ایک مرتبہ جب میں پہلی دفعہ ... کے اڈے پہنچا تھا، ببّھل نے علاقے کے سارے آدمیوں کا کھانا ... اور رات کو گانے کی محفل جمی تھی۔ تلسیا نامی ایک آدمی اِسی طرح ... ہو گیا تھا اور اپنی جگہ سے کچھ آگے بڑھ گیا تھا۔ اُس نے ناچتی ... کا ہاتھ کھینچ کے اُسے چوم لیا اور لڑکی کو گلے بھی لگا نا چاہا۔ ببّھل ... کے بغیر اپنی جگہ سے لپکتا ہوا اُس کے سر پہ پہنچ گیا۔ اس اثنا میں ... ہاتھ چھڑا چکی تھی اور ناچ رہی تھی۔ بات آئی گئی ہو گئی مگر ... تلسیا کو باہر نکال دیا۔ بعد میں لوگ تین دن تک اڈے کے ... مارتے رہے پھر تلسیا کبھی کلکتے میں نظر نہیں آیا مگر یہاں صورت ... مختلف تھی، سب کچھ اچانک سامنے آیا تھا، اُس شخص سے ببّھل کی ... کو کتنے دن ہوئے تھے اور ببّھل اُسے کتنا جانتا تھا۔ شاید اب ... احساس ہو رہا ہو کہ اُس نے کچھ زیادہ درگزری، زیادہ چشم پوشی ... تارا بائی کی آواز نہیں نکل رہی تھی، دوسری لڑکی کی آنکھیں ...

... بے چھٹی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تک لوگ گم سُم رہے کہ اس ناگہانی سے کس ... طرح نمٹیں، پھر عقب سے کسی کی آواز آئی "تمّے!" یہ اُسی کا نام ہو گا جو اُس ... وقت سب کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کسی نے اُسے ملائم لہجے میں سمجھایا: "تمّے! اب ہوش میں آ جا، بس کر۔ پری جان کو کوئی تجھ سے نہیں چھین سکتا۔ وہ تیری تھی اور سدا تیری رہے گی۔" دوسرے لوگوں نے دبے دبے لہجے اور اٹکتی سہمتی آواز میں تائید کی اور جس طرح کسی بچے کو پچکارتے، تھپکیاں دیتے ہیں، انھوں نے کہا کہ "ہاں ہاں، پری جان کو تمّے سے کون چھین سکتا ہے۔ نواب نظیر کیا بیچتا ہے، کل سے وہ بازار میں آ کے تو دیکھے۔" مگر تمّے بچّہ نہیں تھا کہ یہ باتیں اُس کی سمجھ میں آ جاتیں۔ وہ اُلٹا بپھرنے اور دہاڑنے لگا۔ اُس نے لوگوں کو حکم دیا کہ اُس کے راستے سے ہٹ جائیں۔

"جانے دے تمّے!" یکایک ہمارے درمیان کھڑے ہوئے بھولے دادا کی لڑکھڑاتی آواز گونجی "اب زیادہ شور شرابا مت کر۔"

"تمّے پری جان کو نہیں چھوڑے گا دادا!" وہ لڑکی کے بالوں کا بوسہ لیتے ہوئے دیوانگی سے بولا۔

"پری جان تیری ہے تمّے!" بھولے دادا نے نرمی سے کہا "اپن بولتے ہیں، اپن زبان دیتے ہیں۔"

"ہاں، زبان دیتا ہے۔" وہ زہرخند سے بولا "اپن جانتا ہے ابھی تم کیسے زبان دینے کو بولتا ہے۔ تم سب لوگ پہلے کدھر مر گیا تھا۔" اُس نے وحشیانہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا "سالا اب کھٹ کھٹا دیکھ کے بولتا ہے کہ پری جان تیرا ہے۔"

"پری جان کو چھوڑ دے تمّے!" بھولے دادا نے گرجتی آواز میں دوبارہ حکم دیا۔

تمّے نے بھولے دادا کے جواب میں زمین پر تھوک دیا اور لوگوں سے بولا کہ راستے سے ہٹ جائیں ورنہ وہ خود راستہ بنا لے گا۔ اُس سے کوئی حجت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دلیل اور درخواست، اصرار اور تکرار کا کوئی خراب نتیجہ بھی نکل سکتا تھا۔ ہر چند کہ اپنی باتوں سے وہ ایسا بے ہوش بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی نگاہ ہر طرف تھی اور اُس نے پری جان کو بالکل بے بس کر رکھا تھا۔ وہاں تقریباً سبھی چاقو چلانا جانتے تھے اور اُن کی تعداد بھی کم نہیں تھی لیکن سب کے ہاتھ پیر جیسے ٹوٹ گئے تھے، سب مفلوج کھڑے تھے۔ ببّھل نے تمّے سے کچھ نہیں کہا، مسلسل اُسے گھورتا رہا۔ میری نظریں بھی موقع کی تلاش میں تھیں۔ کالنتے الگ بے چین تھا۔ چوکی سے اُتر کے تمّے تک پہنچنے کا فاصلہ اِن حالات میں خاصا بڑا تھا، یہ تبھی ممکن تھا جب وہ کسی جانب سے ایک لمحے کے لیے غافل ہو جائے۔ مثبت نتیجے کا یقین کیے بغیر کوئی قدم اُٹھانا کسی طور مناسب نہیں تھا اور دیر کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔

لوگوں کے بار بار سمجھانے اور بھولے دادا کی تفہیم دہانی کے باوجود وہ نہیں مانا۔ ببّھل کے جسم میں پہلی بار جنبش ہوئی اور اُس نے آگے قدم بڑھا دیے۔ یہ دیکھ کے ہم سب چوکی پر کھڑے کھڑے اچھل گئے۔ پیرو نے غیر ارادی طور پر ببّھل کا شانہ پکڑ کے اُسے روکا لیکن پھر وہ بھی آگے بڑھ گیا، میں، کالنتے، زورا، جمرو اور شامو بھی۔ ہماری نقل و حرکت سے اُس کے پاگل پن میں اور شدت آ گئی۔ اُس نے پستول ہماری جانب کر دیا۔ اُس کی توجہ یک سر ہماری طرف مرکوز ہو گئی۔ اب اُس کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے لوگوں میں سے کوئی اُس پر حملہ آور ہو سکتا تھا لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ تمّے چیخ چیخ کے ہمیں ٹھہر جانے کا حکم دینے لگا اور بولا کہ اُسے گولی چلانے میں دیر نہیں لگے گی۔ پری جان پر اُس نے اپنی گرفت اور تنگ کر دی مگر وہ نڈھال ہو چکی تھی، سسکتی رہ گئی۔ میرے پیر جھن جھنا رہے تھے اور آنکھیں اُس کے تمنچے سے بندھی ہوئی تھیں۔ ہم سب اُس کی زد پر تھے لیکن ابھی ہم نے چوکی سے نیچے فرش پر قدم رکھا ہی تھا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے شعلہ سا کوندا۔ معاً تمّے کی دل دوز چیخ سنائی دی اور تمنچا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گرا۔ ہم نے اُسی لمحے پلٹ کے دیکھا۔ بوڑھا بھولے دادا چوکی پر اپنی جگہ کھڑا ہوا آنکھیں میچے بدبدا رہا تھا۔ ببّھل اُچھل کے چوکی پر چڑھ گیا، اُس نے جھپٹ کے بھولے دادا کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ یہ ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔ عمارت میں سکوت کے ایک اذیت ناک عرصے کے بعد ہر سُو طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ تمّے کا ہاتھ خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کی لرزتی چیخیں کچھ دیر سنائی دیتی رہیں پھر مجمع کا شور اُن پر غالب آ گیا۔

ہم سب بھولے دادا کے گرد جمع ہو گئے۔ ببّھل کے ساتھ پیرو نے بھی متعدد بار اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کتنی ہی بار اُسے گلے لگایا۔ بھولے دادا کی آنکھیں بھر آئیں، وہ اپنا چہرہ چھپائے سسکیاں بھرنے لگا۔ ہر شخص اُس کے قریب آنے، اُسے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا اور اُسی کے نام کا نعرہ لگا رہا تھا۔ میں نے بھی بے اختیار اُس کا ہاتھ چوما۔ بھولے دادا نے ایک لحظے کے لیے سب کی آنکھوں میں دُھند بھر دی تھی۔ اتنا صاف اور تیز نشانہ کوئی ایسا ہی شخص لے سکتا تھا جس کا چاقو سے بہت واسطہ رہا ہو، نشانہ ایسا باریک نہیں تھا لیکن ببّھل کے بہ قول سب سے بڑی باریکی تو وقت اور زاویے کی ہوتی ہے۔ تمّے کو قرار نہیں تھا۔ وہ لڑکی کو جکڑے ہوئے مسلسل اِدھر سے اُدھر پھڑک رہا تھا اور سامنے وہ نہیں، پری جان تھی، تمّے کا جسم اُس کی آڑ میں تھا۔ پری جان کے بدن کی ڈھال سے بچا ہوا تمّے کے بازو اور جسم کا کچھ ہی حصہ نظر آ رہا تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کب زاویہ

بدل دے۔

ہم چوکی سے اُترے تھے تو بھورے دادا ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا، وہیں کھڑا رہ گیا تھا، ہمیں خیال بھی نہیں تھا کہ کون ہمارے ساتھ آرہا ہے، کون رُک گیا ہے۔ ہمیں بڑھتا دیکھ کے تیمے کی نگاہ لازماً ہم پر مرکوز ہو جانی چاہیے تھی، بھورے دادا پر نہیں۔ بھورے دادا نے اسی لمحے کا انتظار کیا ہوگا، ہم نیچے اُتر جائیں اور اُس کے مقابل صرف تیمے رہ جائے۔ جتنی دیر میں ہم نے چوکی سے نیچے قدم رکھا، اتنی دیر میں بھورے دادا نے چاقو نکالا اور نشانہ لے لیا۔ وہ اس سے پہلے چاقو نکالنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے نیچے اُترنے میں اور بھورے دادا کے چاقو نکال کے نشانہ لینے میں لمحوں ہی کا فرق تھا۔ بھورے دادا نے اس اثنا میں اتنی پھرتی اور احتیاط سے کام لیا تھا کہ تیمے کو آہٹ نہ مل سکی۔ اگر اُسے اُوپر دیکھنے کی فرصت مل جاتی تو تمنچے کی پہلی گولی بھورے دادا ہی کو لگتی۔ چاقو سامنے سے جاتا تو تمنچے سے ٹکرا سکتا تھا۔ تیمے کی اُنگلیوں اور ہاتھ کا بڑا حصّہ تمنچے سے لپٹا ہوا گُتھا ہوا تھا، تمنچا آگے تھا، تیمے کا ہاتھ اُس کی اوٹ میں۔ بھورے دادا نے چاقو اُوپر اُٹھا کے اور کسی قدر ترچھا کر کے پھینکا تھا۔ وہ سیدھا تیمے کے ہاتھ پر جا کے گرا تھا، اُس کی رفتار بہت تیز تھی اور ترچھا ہونے کی وجہ سے نشانہ بڑی حد تک قطعی ہو جاتا تھا۔ تیمے گھبراہٹ میں اپنا ہاتھ دائیں طرف کرتا یا بائیں طرف، دونوں صورتوں میں مفر کم تھا۔ البتہ وہ ہاتھ لَٹ بھی سکتا تھا تب چاقو سیدھا پری جان کے سینے میں جا کے پیوست ہوتا لیکن بھورے دادا کو جیسے یقین تھا کہ چاقو بھی اُسی کے ساتھ رُخ بدل دے گا یا اُسے یقین تھا کہ تیمے کا ہاتھ اس لمحے نشانے سے نہیں ہٹے گا، جما رہے گا۔ اگر بھورے دادا سے ذرا بھی چُوک ہو جاتی تو تیمے کے غضب کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ امکان بظاہر ہر لمحے موجود تھا۔ بھورے دادا کے جسم میں جماؤ نظر نہیں آتا تھا، نگاہ بھی عمر کے ساتھ متاثر ہوئی ہوگی۔ بولتے ہوئے اُس کی آواز بھر بھرانے لگتی تھی مگر جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ عمر تو ارادے کی ہوتی ہے۔ جب تک ارادہ توانا رہتا ہے آدمی جوان رہتا ہے۔ بھورے دادا نے خاص طور پر تیمے کے تمنچے والے ہاتھ کا نشانہ لیا تھا۔ اُسے اُوپر سے اور ترچھا چاقو پھینکنے میں اتنی مہارت تھی تو وہ تیمے کے جسم کے سامنے نظر آنے والے کسی اور حصّے کا نشانہ بھی لے سکتا تھا۔ تیمے کا دوسرا ہاتھ پری جان کے بدن پر جما ہوا تھا۔ اُس کا نشانہ لینا نسبتاً آسان تھا مگر بات تبھی تھی جب تمنچے والے ہاتھ کا نشانہ لیا جائے، یہ ضروری بھی تھا، کسی اور جگہ کا نشانہ لینے پر تمنچا تیمے ہی کے قبضے میں رہتا۔ میں سرسری طور پر بس ایک نظر تیمے کو دیکھ سکا اِس لیے کہ ہم فوراً پلٹ کے بھورے دادا کے پاس چلے آئے تھے لیکن میرا اندازہ ہے کہ تیمے کا ہاتھ ہتھیار اُٹھانے کی صلاحیت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکا ہوگا، اُس کی چیخیں اور خون کی

چھوٹتی تیلیاں بتا رہی تھیں کہ ترچھا چاقو ہاتھ کا بڑا حصّہ کاٹتا تک گھُسا ہے۔

چوکی پر بہت سے لوگ آ گئے تھے، سب نے بھورے میں لے لیا تھا۔ بڑی مشکل سے کالے دادا نے انھیں واپس کیا۔ تمنچا اور چاقو بھورے دادا کو پیش کیا۔ چاقو جھّل کا تھا۔ بھو نے اُسے آنکھوں سے لگا کے جھّل کے آگے کر دیا۔ جھّل نے اُس سے لپٹ گیا۔ "بس دلوا بس۔" وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا ہے اور سدا تمھارے پاس رہے گا، قسم سے اپن کا دل پر لا سے کبھی کوئی نہیں چھین سکتا۔"

"یہ تم نے کیسا جادو کرا تھا دادا؟" پیرو نے حیرت او سے پوچھا۔ "اپن نے پہلے کبھی ایسا نہیں دیکھا۔"

"سب گیسو والے کا کیا ہے، اپن نے کچھ نہیں کیا، کچھ نہ بھورے دادا رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "لگتا ہے، اُس نے اپنے معاف کر دیا ہے۔"

"بیٹھو دادا! ابھی آرام بیٹھو۔" پیرو نے اُس کا ہاتھ والہانہ انداز میں کہا۔ "اپن کا سمجھ میں نہیں آتا، ابھی تم کو کس طرح بولے۔" پیرو کی آواز گلے میں پھنسنے لگی اور اُس سے کچھ نہ کہا جا اپنا سر بھورے دادا کے سینے سے رگڑنے لگا۔

پری جان پر سکتہ سا طاری تھا، تیمے اب وہاں موجود جھّل نے تارا بائی کو بُلا کے سکّوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی آہستگی سے بولا۔ "بالیاں ابھی ادھوری ہیں تارا بائی۔ ان کو ابھی نہیں لانا چاہیے۔"

"بندی کہاں لے جاتی ہے اُستاد!" تارا بائی ابھی تک تھی، کپکپاتی آواز میں بولی۔ "آج پہلی بار گھر سے قدم نکالا تھا محفل جاتی ہیں یا کبھی کبھی خاص محفلوں میں گئی ہیں۔ بخدا بند آپ کی وجہ سے ادھر لائی تھی۔ اتنی عمر دُنیا دیکھتے گزر گئی لیک اُس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹنے لگے۔

"اتنا سکھایا ہے تو کچھ آنکھ کی پہچان بھی کرائی ہوتی پہلے کی چیز ہے یہ۔ معلوم ہوتا ہے تم نے اپنا دودھ نہیں پلا

تارا بائی نے حیرت سے اُسے دیکھا اور سٹ پٹا گئی۔ "بندی کی کیا مجال ہے کہ اُستاد کے سامنے لب کشائی کرے۔" آواز میں یہی کہہ سکی۔

"پہلی بولی پر کسی کھرے گاہک سے ان کی بات کر لینا" جھّل نے بھن بھناتے لہجے میں کہا۔

تارا بائی اُسے دیکھتی رہ گئی۔

صبح ہونے میں اب کچھ ہی دیر رہ گئی ہوگی۔ تارا بائی

جانے پر خاصے لوگ چلے گئے لیکن جو رہ گئے تھے، وہ وہیں جم کے بیٹھے ہے جیسے انھیں کسی اور بات کا انتظار ہو۔ سب حیرت زدہ اور گم سے تھے۔ ان میں سے چند مختلف ٹولیوں میں اِدھر اُدھر بکھرے سرگوشیاں رہے تھے۔ کچھ دیر بعد عمارت میں سکون چھا گیا، وہ سکون جو بھونچال ں ہوتا ہے، بہت زلزلہ تھمنے کے بعد جو اُداسی ہوتی ہے۔ کسی کی آنکھوں ں نیند نہیں تھی۔ بھورے دادا، پیرو، کانتے اور کالے دادا سبھی جھّل کے س چوکی پر بیٹھے تھے۔ اڈّے کے آدمیوں نے جھّل کے لیے حقہ تازہ کر دیا ا اور چائے دوبارہ تقسیم کی جانے لگی تھی۔ جھّل کے جلد اُٹھنے کا امکان نظر نہیں رہا تھا، مجھے بھی وہاں سے اُٹھنے اور کانتے سے مزید کچھ جاننے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ تیمے کا چہرہ ابھی تک میری آنکھوں میں گھُسا ہوا تھا۔ معلوم نہیں اب اُس کا کیا حال ہو۔ بھورے دادا نے صرف اُس کے ہاتھ کا نشانہ لیا تھا، دل کا نہیں۔ تیمے مر نہیں سکتا تھا لیکن اب وہ واقعی زندہ رہے گا۔ ہ مجھے کوئی پاگل معلوم نہیں ہوتا تھا، شاید اپنے بس میں نہ رہا ہو۔ بے بسی پاگل پن تو نہیں ہوتی مگر پھر پاگل پن کیا ہوتا ہے! اپنے بس میں نہ رہنا۔ بھورے دادا بروقت چاقو نہ اُٹھاتا تو کون جانے کیا ہو جاتا۔ نہ معلوم ہم میں سے کون تیمے کا نشانہ بنتا، اُسے ایک یا دو بار تمنچا چلانے کا وقت مل سکتا تھا۔ اں دوسری یا تیسری بار گولی چلاتے وقت کسی بھی طرف سے کوئی اُس ک پہنچ جاتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ نہ ہوتا، جھّل چوکی سے اُس کی جانب بڑھا تھا تو اُس کے ذہن میں تیمے کو قابو میں کرنے کی کوئی تدبیر ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جھّل کے قریب پہنچ جانے پر تیمے کا جسم ٹھٹھر جاتا۔ کسی دسرے کو ختم کرنے سے اُسے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔

نہ جانے کیوں اتنی دیر بعد مجھے اب کوئی بات اوجھل ہو جانے، ئی کمی رہ جانے کا احساس ہو رہا تھا جیسے تیمے کی بات لوگوں نے غور سے نہیں سُنی۔ سب کی نظریں اُس کے تمنچے سے اُلجھی رہیں۔ اُس کی نظر بنتی تو لوگ کچھ اور دیکھ پاتے، سُن پاتے مگر سب کچھ تو خود میرے سامنے ہوا تھا، پھر مجھے کون سے نہ دیکھے ہوئے، کون سے نہ سُنے ہوئے کی کمی سوس ہو رہی تھی۔ تقریباً سبھی نے طرح طرح تیمے کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، شاید اُسے خود بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ بھورے دادا نے ہر مکان سے مایوس ہو کے یہ قدم اُٹھایا تھا۔ خود میں تیمے کی کسی غفلت کا منتظر تھا کیونکہ اُس کی دیوانگی میں کیا کسر رہ گئی تھی۔ یہ پاگل پن نہیں تو ور کیا ہے کہ اتنے لوگوں کو پریشان کیا جائے۔ ایسا کہاں ہوتا ہے! اُسے ر پری جان مطلوب تھی تو پری جان کو حاصل کرنا اُس کے لیے کیا مشکل تھا وہ کہیں کھو تو نہیں گئی تھی۔ اُس کے گھر والوں سب کا اُسے علم تھا، وہ چیزیں حاصل کرنا کیا مشکل ہے جن کی کوئی قیمت مقرر ہے۔ قیمت ہی ادا کرنے کے لیے تو تگ و دو کرنی پڑتی ہے مگر یہ کون سا طریقہ تھا۔ بھلا کوئی اس رح قتل مچاتا ہے۔ تیمے نے پری جان کا کچھ خیال بھی نہیں کیا جس کا وہ دعوے دار تھا۔ اُس نے اُسے کتنی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اتنے

بہت سے لوگوں میں اُس کا تماشا کیوں بنایا تھا اور پری جان اُس سے اتنی سہمی سہمی، دُور دُور کیوں نظر آتی تھی۔ تیمے نے اُس سے رویّہ ہی کچھ ایسا رکھا ہوگا ورنہ کبھی تو ایک شخص کسی کے لیے دُنیا بھر کے مال و متاع سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

میرے سر میں یہی بے سروپا باتیں گونج رہی تھیں۔ اِن کی بے سروپائی کی تائید اُن سب کے لب و لہجہ سے بھی ہوتی تھی۔ وہ تیمے کی باتیں نہیں کر رہے تھے، دُنیا جہان کے قصّے دُہرائے جا رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ اڈّے کے آدمی سماوار سے کیتلیاں بھر بھر کے چوکی پر لا رہے تھے۔ مٹھائی کے ٹوکرے بھی کھول دیے گئے۔ چائے پینے سے وہ اور بیدار ہو گئے تھے۔ اڈّے پر چھایا ہوا تکدر چھٹ چکا تھا۔ وقفے وقفے سے اُن کے قہقہے گونجنے لگتے۔ میں بھی انھی کے درمیان بیٹھا اُن سب کو دیکھ رہا تھا، اُن کی باتیں سُن رہا تھا لیکن میرا دماغ بہک بہک جاتا تھا اور اُن کی ہنسی پر میں چونک چونک پڑتا تھا۔ اندھیرا کب تک طاری رہتا، دھیرے دھیرے رنگ بدلنے لگا اور عمارت میں جلنے والی روشنیاں پھیکی پڑنے لگیں۔ بھورے دادا کو احساس ہوا۔ وہ حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "سالی پوری رات نکل گیا جاناں!"

اُس کے اُٹھنے پر سبھی اُٹھ گئے، جھّل بھی۔ گویا اُسے بھورے دادا کے اشارے کا انتظار تھا لیکن جھّل نے اُسے اڈّے سے نہیں جانے دیا بلکہ اُسے اور پیرو کو اپنے ساتھ لے کے نچلی منزل کے ایک کمرے میں چلا گیا۔ کانتے کا ارادہ باہر جانے کا تھا لیکن شامو، جمن اور زورا ہمارے پیچھے پیچھے آئے تو کانتے اُوپری منزل پر آ گیا۔ یہاں سائبان میں کئی چارپائیاں برابر برابر پڑی تھیں اور اُن پر سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ سب انھی پر بکھر گئے اور چُپ چاپ گہری گہری سانسیں کھینچتے رہے۔ اندھیرا تیزی سے دُور ہو رہا تھا۔ کانتے میرے ساتھ ہی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، خاصی دیر بعد کانتے نے زبان کھولی اور غنودہ آواز میں بولا۔ "کچھ دیر پلک لٹکا لے لاڈلے!"

"نیند بالکل نہیں آ رہی ہے کانتے بھائی!"

"نیند سالی کدھر سے آئے گی، اُس کُتیا کے پلّے نے سب اُلٹا کے رکھ دیا، سالا ایک دم کٹ کھنا ہو گیا تھا۔" وہ تیمے کو گالیاں بکنے لگا۔ میں چُپ رہا تو وہ مچلتے لہجے میں بولا۔ "تجھ کو تو یہ سب کچھ بہت بدلا ہوا، میرا مطلب ہے، بہت انوکھا لگ رہا ہوگا۔ اندھیرا شروع ہونے پر تو کدھر تھا اور اندھیرا...؟"

"ہاں کانتے بھائی! شروع میں تو سب کچھ مجھے اپنی آنکھوں کا جھوٹ لگ رہا تھا۔"

"پر تم لوگ اُدھر سے نکل کیسے آئے؟" وہ تجسّس سے بولا۔

"سمجھو کہ یہی وقت لکھا تھا۔ ایک دم دماغ میں بات آئی، میں نے پیرو دادا سے کہا، وہ چُپ ہو گیا۔ میں سمجھا، شاید میں نے کوئی اَن ہونی

بات کہہ دی ہے۔ دن بھر اس نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی لیکن رات ہونے پر اچانک دادا نے ہمارے اوپر کھڑے ہوئے پہرے دار سے کہا کہ وہ نواب سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ کوئی آدھے گھنٹے سے کم کے عرصے میں نواب اندر آ گیا۔ بس اس کے آنے کی دیر لگی" میں نے مختصر اُسے حویلی سے نکلنے کا سارا واقعہ سنایا۔

وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔" کانتے بھی تجھ کو کیا بولے"۔ وہ ڈولتی آواز میں کہنے لگا۔" اِدھر ہم آ کے بالکل چوپٹ ہو گئے تھے۔ تم لوگ کو گئے پورے چھ دن ہو چکے تھے، پورے چھ دن۔ سوچتے سوچتے دماغ پھرنے لگتا تھا، سالی ایسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ اتنے دن میں تم دونوں پلٹ کے نہیں دیے۔ نہ کوئی نام' نہ نشان۔ تو جان' کیسی کیسی باتیں دماغ میں آ سکتی ہیں' ہر طرف اندھیرا بھرا تھا، کچھ پتہ نہیں ملتا تھا کدھر کو جائیں' کہاں جا کے سر پھوڑیں' سالا کس کا گریبان پکڑیں' پھر کچھ دوڑ بھاگ کے بعد تھوڑی بہت سن گن ملی لیکن اُس سے بل نکلنے کے بجائے اور پڑ گئے' اُستاد کو دیکھ کے اور سالا جی اُلٹا ہوتا تھا، یقین مان' اُستاد کو کبھی ہم لوگ نے ایسا' ایسا..... اب تجھ سے کیا بولوں"۔ اُس نے تلخی سے کہا۔" اُس کو دیکھ کے ہاتھ پیر ادھ کڑ جاتے تھے۔ اِدھر ہم لوگ آپس میں جوڑ توڑ کرتے رہتے تھے' اتنا سمجھ میں آ گیا تھا کہ کوئی بڑا چکر ہے ورنہ پیرو دادا کے ہوتے اتنی دیر نہیں لگنی چاہیے"۔

"پیرو دادا بھی کیا کرتا، وہاں سے نکلنا ممکن ہی نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے تمھیں بتایا نا کہ کئی بار کوشش کی اور ناکام ہو گئے۔ اَب کے بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا مگر کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ ہم نے سوچا، زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے"۔

"تم لوگ ایک دن اور رُک جاتے تو شاید تمھیں اپنے آپ کو یُوں داؤ پر لگانے کی ضرورت نہ پڑتی"۔

"ایک دن"۔ میں نے حیرت سے کہا۔" کیا مطلب؟"

"ہو سکتا تھا کہ آج ہم کسی طرح تم تک پہنچ جاتے"۔

"آج!" میں نے تذبذب سے کہا۔" کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں لاڈلے! آج دوپہر کی گاڑی سے آپی اِدھر پہنچ جائیں گی۔ ہم نے سب کچھ اُن کے آنے پر اُٹھا رکھا تھا"۔

"آپی!" مجھ سے لیٹا نہیں گیا۔" خانم آ رہی ہیں؟"

"ہاں ہاں' ویسے اُن کو اب تک آ جانا چاہیے تھا مگر اُدھر کوئی بات ہو گئی ہو گی جبھی دیر ہو گئی۔ کل شام اپنے کو تار ملا ہے کہ وہ اُدھر سے چل پڑی ہیں"۔

"آپی! آپی کو کس نے بلایا؟"

"اُستاد نے تار بھیجا تھا"۔

"تو، تو اس کا مطلب ہے کہ تم سب کچھ جان گئے تھے؟" میں نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا۔" تفصیل سے بتاؤ"۔

"کیا بتاؤں' اُستاد کا تجھ کو پتہ ہے' آدھی بات منہ میں آدھی اُگلتا ہے"۔ وہ ترشی سے بولا۔" اب کے آدھی بھی کہاں اپنے کو زیادہ نہیں معلوم لیکن ایسے اندھے بہرے ہم بھی نہیں ہیں۔ خانم کے آنے کی خبر سن کے میرا سر گھومنے لگا تھا' اِ کیا معنی ہو سکتے ہیں' یہی کہ تجمل بڑے نواب سے مل چکا تھا یا یا کے بعد اُس نے بڑے نواب سے کوئی رابطہ قائم کیا تھا۔" میں گنگ سے کانتے کی صورت تکنے لگا۔

"تجھ کو کیا بتاؤں"۔ کانتے خود بولا۔" اِدھر آ کے کیسی خواری ہے، ہم کو فیض آباد میں تیسرے دن تار ملا تھا۔ دو دن تک باوا جان اور مارتی تم کو اِدھر پورے شہر میں ڈھونڈتے رہے"۔ زورا شام تینوں اُٹھ کے ہمارے ساتھ والی چارپائی پر چلے آئے تھے۔ زورا بول پڑا اور مجھے بتانے لگا کہ شام تک تو کچھ نہیں ہوا لیکن جب ہونے لگی تو سب کو تشویش شروع ہوئی۔ وہ اور مارتی بار بار ہوٹل جا جا کے دیکھتے تھے۔ دس بج گئے تو ابا جان بھی نکل کھڑے ہوئے تک سڑکوں پر اور ہوٹلوں میں ہمیں دیکھتے رہے۔ ساری رات گئی صبح بڑی مشکل سے زورا اور مارتی نے ابا جان کو ہوٹل میں خود دن بھر گلی کوچوں کے چکر کاٹتے رہے۔ وہ کسی سے کچھ پوچھ سکتے تھے، ایک تو ابا جان نے انھیں منع کر دیا تھا، دوسرے پر پہنچنے سے پہلے یہ مناسب بھی نہیں تھا مگر یہ کیسی تلاش تھی کسی سے پوچھ سکیں' نہ تھانے میں جا کے دو گم شدہ آدمیوں کی کر سکیں۔ پورا دن گزر گیا۔ زورا اور مارتی کو سارے شہر کی خاک چھان درمیان میں بار بار ہوٹل جا کے دیکھتے رہتے تھے اور ہر بار زورا کے انھیں ابا جان کی سوالی آنکھوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ زورا کہہ اُن سے نظریں نہیں ملائی جاتی تھیں۔ گو ابا جان نے اُن سے بھی نہیں کہا تھا بلکہ اُلٹا انھیں صبر و ضبط کی تلقین کرتے رہے کو زورا نے انھیں مشورہ دیا کہ تجمل کو مطلع کر دیا جائے مگر ابا کچھ اور توقف کر لینا بہتر سمجھا۔ تجمل کا زخمی پیر وہ خود دیکھ کے آ تھے۔ اِس حالت میں اُسے بلانا انھیں اچھا نہیں لگتا تھا لیکن صورت بھی سامنے نہیں تھی۔ دوسری رات ابھی پوری طرح نہیں تھی کہ انھوں نے مارتی سے تار گھر جانے کو کہا اور پھر خود بھی اُس ساتھ چل دیے۔ تار انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور صرف اتنا کسی تاخیر کے بغیر تجمل حیدر آباد آ جائے۔

اِس دوران اُن تینوں نے طرح طرح کی تدبیروں پر غور اور ہر پھر کے ایک ہی فیصلہ کر پاتے تھے کہ ابھی کچھ اور انتظار جائے۔ تار دینے کے بعد وہ اور پابند ہو گئے تھے، تجمل کے آ

[ک]وئی قدم نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ چلتے وقت میں اور پیرو ابا جان سے [ک]وئی خاص بات کہہ کے نہیں چلے تھے' پیرو نے صرف اتنا کہا تھا کہ [و]ہ جانے پر وہ ہمارا انتظار نہ کریں' یعنی ہمیں دیر بھی لگ سکتی ہے۔ زورا [بت]ا رہا تھا کہ ابا جان اُن سے اور مارتی سے کرید کرید کے پوچھتے تھے [ک]ہ ہم انھیں کچھ اور تو بتا کے نہیں گئے؟ زورا اور مارتی کو اُن سے زیادہ [ک]یا معلوم تھا جو ابا جان کو کسی ایک سمت سوچنے کا موقع ملتا۔ وہ خود [ا]دھوری ہوئی باتوں کے تانے بانے ملاتے رہے ہوں گے۔ نکتہ طرازی [ا]ن کی عادت ہے' آٹھ سال تک وہ کورا کے لائے ہوئے نقشوں اور [خ]اکوں میں نکتے کریدتے کھکوڑتے رہے تھے۔ سفر کے دوران اچانک [فیض] آباد میں ہمارا قیام اور بمبئی جانے کے بجائے حیدر آباد کا ارادہ بیان [کر]تے ہی فوراً نکل کھڑے ہونا' سوچنے کے لیے اُن کے پاس بہت [کچ]ھ تھا، نتیجا اخذ کرنے کے لیے کچھ نہیں۔ ظاہر ہے' پیرو نے انھیں سب [کچ]ھ بتانا ضروری نہیں سمجھا ہو گا کہ کسی مولوی محمد شفیق کی تلاش میں [ا]نھوں نے بمبئی جاتے جاتے حیدر آباد کا ارادہ کر لیا ہے۔ مولوی محمد شفیق [ک]ی تحویل میں وہی لڑکی ہے' وہ کورا جو کبھی اُن کے گھر رہی تھی اور جسے ایک رات اُن کا بیٹا گھر سے لے کے چلا گیا تھا۔ اتنی جزئیات شاید پیرو کے علم میں بھی نہ ہوں اور نہ ابا جان نے بوجوہ انھیں بتانا مناسب سمجھا ہو گا۔ بزرگی کی مروت وضاحت سے اجتناب کرتی ہے تا ایں کہ بتانے والا خود وضاحت نہ کرے مگر پیرو نے یکایک حیدر آباد جانے کا کوئی نہ کوئی عذر تو انھیں پیش کیا ہو گا۔ یہ معلوم نہیں وہ کیا تھا، بہر حال ابا جان سے اب کچھ اتنا ڈھکا چھپا نہیں رہا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اُن کے بیٹے کے ساتھی کون لوگ ہیں' کون لوگ تبت میں اُن کے ہم سفر تھے۔ فیض آباد میں زریں کی حویلی میں انھیں [ا]یسے بہت سے لوگ ملے تھے۔ انھوں نے تبت میں مجھے چاقو چلاتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور ابھی ناگ پور اسٹیشن پر سونیا کے سارے واقعے کے وہ شاہد تھے۔ وہاں انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اُن کا بیٹا سات سال جیل میں رہا ہے اور سونیا کون تھی، کلکتہ جیل کے سابق جیلر کی لڑکی۔

ایسے لوگوں کی گم شدگی کی رپورٹ کرنے میں انھیں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ حقیقت بھی اُن کے پیشِ نظر ہو گی کہ اگر واقعی پولیس نے ہمیں کہیں گھیر لیا ہے تو ہم نے پولیس کے سامنے اپنے باقی ساتھیوں کی نشان دہی نہیں کی ہے ورنہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے زورا، مارتی اور ابا جان تک پولیس کے پہنچنے میں کتنا وقت لگتا، پولیس کا نہ آنا اُن کے لیے ہماری طرف سے خاموشی کا اشارہ ہی ہو سکتا تھا۔ اِس طرح اُن کے پاس ہوٹل میں بیٹھے اینٹیں گنتے رہنے اور گنگبن کے سڑکوں پر تاک جھانک کرتے رہنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ ایک گلی سے دوسری گلی' ایک علاقے سے دوسرا علاقہ۔ زورا اور مارتی پہلی بار حیدر آباد آئے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک لمبا راستہ طے کرنے کے بعد وہ وہیں آ نکلتے جہاں سے چلے تھے۔ مارتی نے سرِ راہ ایسے لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جن پر اڈوں سے متعلق ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ وہ انھیں ایک حد تک ہی ٹٹول سکتا تھا۔ دو ایک پولیس والوں سے بھی اُس نے سن گن لینے کی کوشش کی لیکن اس طرح کیسے کوئی انھیں اُن کے مطلب کی بات بتا سکتا تھا۔ تار دینے کے بعد تو اُن کے لیے ایک ایک پل کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ انھوں نے ارجنٹ تار دیا تھا۔ فیض آباد سے حیدر آباد کے سفر میں زیادہ سے زیادہ تین' دو دن لگتے ہیں۔ اِس میں گاڑی لیٹ ہو جانے کا وقت بھی شامل ہے۔ انھیں یقین تھا کہ تار ملتے ہی تجمل پہلی گاڑی سے سوار ہو جائے گا۔

دو دن پہلے اُس کا آنا ممکن نہیں تھا لیکن تار گھر سے واپسی پر وہ اُس کی راہ اِس طرح تکنے لگے تھے جیسے تجمل ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کے آ جائے گا۔ اُمید کی یہ کرن بھی اُن کے دلوں میں ٹمٹماتی تھی کہ تجمل سے پہلے کہیں ہم بھولے بھٹکے ہوٹل نہ پہنچ جائیں۔ نہ ہم پہنچے' نہ دو دن گزرنے کے بعد تجمل آ سکا۔ اُن کے حواس منتشر ہونے لگے۔ مارتی اور زورا اسٹیشن جا جا کے مایوس لوٹتے رہے۔ زورا کے کہنے کے مطابق پہلی بار انھوں نے ابا جان کا چہرہ بدلتا ہوا محسوس کیا۔ تاہم ایک وہی تھے جو اُن کے لیے ڈھارس بنے ہوئے تھے۔ وہ اُن دونوں کو بہ اصرار کھانا کھلاتے تھے۔ دو دن بعد ابا جان نے دوسرا تار دیا، پھر احتیاطاً تیسرا تار گھر والوں سے اُن کی کسی قدر تلخی بھی ہو گئی۔ وہ تیسرا دن تھا، تار دیے ہوئے تیسرا دن۔ ابا جان نے زورا کے ساتھ عابد شاپ روڈ کی ایک دکان سے اعلا قسم کا کپڑا خریدا اور قریبی درزی کو بہ عجلت سینے کی ہدایت کی۔ اِس کے علاوہ وہ پوچھتے پوچھتے شہر کی نظامت کے دفتر گئے اور مختلف لوگوں سے وہاں کے اعلا عہدے داروں کے متعلق پوچھ گچھ کرتے رہے۔ کون کیا ہے' کیا کرتا ہے۔ وہ کسی عہدے دار سے نہیں ملے۔ تیسرے روز بھی فیض آباد کی طرف سے آنے والی گاڑی خالی گئی۔ ہمیں ہوٹل سے گئے پانچواں دن ہو گیا تھا۔ ابا جان نے مارتی کے ساتھ پہلی مرتبہ ہوٹل سے نزدیک عابد شاپ روڈ کے تھانے کا رُخ کیا اور اندر جاتے جاتے لوٹ آئے۔ اِس دوران زورا اور مارتی نے محبوب کی مہندی کے علاقے کا بھی چکر لگایا اور وہ مختلف بالا خانوں پر بھی گئے حالانکہ یہ ایک فضول سی بات تھی۔ کسی سے کچھ پوچھے بغیر ہماری تلاش کا کیا حاصل نکل سکتا تھا لیکن کوئی اور راہ بھی انھیں سجھائی نہیں دیتی تھی۔ ہوٹل میں رہ کے انھیں خفقان سا ہونے لگتا تو وہ سڑکوں پر نکل آتے اور راہ چلتے آدمیوں کے چہرے گھورتے رہتے۔ انھیں اپنا بھی خیال

دکھنا تھا کہ کہیں اُن کی نقل و حرکت سے ہوٹل والے یا ہوٹل کے باہر بازار والے مشکوک نہ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ انھیں یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ جو لوگ ہماری گم شدگی کا سبب بنے ہیں، وہ ہمارے ساتھیوں کی تلاش میں بھی ہو سکتے ہیں سو انھیں خود کو بھی محفوظ رکھنا تھا۔ زورا مجھے وہی کچھ بتا رہا تھا جو میرے لیے نیا نہیں تھا۔ حویلی کی جیل میں انھی باتوں کے تصور سے میرا دل ہولنے لگتا تھا۔ زورا کہنے لگا کہ چوتھے دن جب وہ اسٹیشن پہنچے تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ تجمل گاڑی میں موجود تھا۔

• دولھن کے منہ پر سالی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔" کانتے بیچ میں بولا۔ "لگتا تھا، ابھی چھوٹ کے آئے ہیں۔ تار میں ان لوگ نے کوئی خاص بات نہیں لکھی تھی، بس اتنی کہ جلدی پہنچو۔ قسم سے سارے راستے بچھو سوئیاں مارتے رہے۔ گاڑی بھی ٹہلتی ہوئی آئی۔ شروع میں ہی کینٹ ہو گئی تھی، آدھے دن کا بل ڈال دیا۔ پہلے متھرا اسٹیشن پر پہنچتے چوں چوں بولنے لگے، پھر ناگ پور سے اُدھر گڑبڑ ہو گئی۔ آگے بھی بیل گاڑی کے مانند گھسٹتی رہی۔ اُدھر جب تار پہنچا تو بڑے صاحب (منیر علی) استاد کو زمینوں کی طرف لے گئے تھے۔ تار پورے ایک دن بعد پہنچا تھا، رات کو ملا۔ زری بہن نے پڑھ کے فوراً آدمی گاؤں دوڑا دیا۔ استاد کو واپس آتے آتے صبح ہو گئی۔ گاڑی کا وقت نکل گیا تھا لیکن گیارہ بجے لکھنؤ کی طرف ایک گاڑی جاتی تھی۔ استاد نے اُسی سے سفر کا ارادہ کر لیا۔ وہاں سے پھر دلّی کی پہلی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اپنی طرف سے ہم نے وقت بچا لیا تھا مگر آگے نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ گاڑی بدلنے کا اب کوئی سوال نہیں تھا بس جیسے تیسے ادھری پہنچے۔" کانتے گہری سانس بھر کے بولا۔

• اور ٹیشن پر استاد اور کانتے بھائی کو دیکھ کے اپن کا نہ پوچھو، جیسے اپن کو اپنا کھویا آنکھ، ہاتھ، پیر مل گیا ہو۔" زورا امتحانی آواز میں بولا۔ "مپر ایدر زبان سالا بالکل اینٹھ کے رہ گیا تھا، سوچتا تھا، ابھی استاد کے آگے کیا بولے، کیدر سے بات شروع کرے۔"

میرے ذہن میں بے شمار سوال بھٹک رہے تھے لیکن میں چپ رہا۔ کانتے نے بیڑی سلگانے کے لیے چند لمحے توقف کیا۔ مجھے یہ جاننے کی بے چینی تھی کہ تجمل نے ہمارے بارے میں کوئی رائے کس طرح قائم کی۔ پہلے وہ کہاں گیا، کیا سیدھا اڈّے؟ مگر سیدھے اڈّے چلے جانے سے اُسے اتنی آسانی کے ساتھ کیسے کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ پانچ آدمی جنھوں نے ہمارا تعاقب کیا تھا، اڈّے کے آدمی تھے۔ کیا ضروری ہے کہ تجمل کی نظر پہلے انھی پر گئی ہو۔ تجمل کے استفسار پر آقا ہمارے بارے میں صاف انکار کر سکتا تھا۔ اُس نے اُن پانچ آدمیوں کو بھی زبان کھولنے میں محتاط کر دیا ہو گا لیکن اُن میں سے ایک شخص زخمی بھی ہو گیا تھا۔ اڈّے کے کسی آدمی کے زخمی ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ اصل بات انھی پانچ آدمیوں تک محدود رہی ہو، کسی اور کے

علم میں کچھ نہ آیا ہو۔ پھر یہ حقیقت بھی اُن سے روپوش نہیں کہ اُن کے ساتھی کو زخمی کرنے والوں میں سے ایک شخص وہ شاہ کبیرا کو محبوب کی مہندی کے اڈّے سے بے دخل کر دیا تھ بھی اُن دو آدمیوں کے بارے میں اُن کا تجسس فزوں جنھوں نے چار چار تو بدست آدمیوں کے سامنے حوصلہ نہیں ہا خود اُن کے زخمی ہو جانے کی کوئی اطلاع انھیں نہیں ملی تھی۔ اڈّ آدمیوں سے شہر میں پیش آنے والے ایسے واقعات چھپے نہ اس واقعے کی تو موسیٰ ندی کے علاقے کی ایک مخلوق گواہ تھ روز ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ خبر اڈّے کے آدمیوں کے سر والی نہیں تھی کہ شاہ کبیرا کو اڈّا بدر کرنے والا شخص پھر اُن کے دکھائی دیا ہے۔ دوسروں کی نسبت یہ اطلاع کالے دادا کو ملنا چاہیے تھی۔ آقا کی وجہ سے اُس نے زیادہ بے کلی ظاہر نہ کی یہ سُن کے کالے دادا کا قرار چھن گیا ہو گا۔ وہ آدمی دوبارہ آگ سبب وہ محبوب کی مہندی جیسے اڈّے کا مالک بنا تھا۔ کا کے وہ تمام زخم تازہ ہو گئے ہوں گے جو آقا نے اڈّا چھین کے لگائے تھے۔ ہو سکتا ہے، کسی ایسے ہی دن کے انتظار میں اُس پورا آقا کی بالادستی قبول کی ہو یا کسی اور موقع کے انتظار میں کر لی ہو ورنہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ اڈّے پر نئے استاد جمانے کے بعد پرانا استاد موجود رہے۔ بہرحال، اِس اندھیرے کو اڈّے کی سمت ہی روشنی کی کوئی کرن دکھائی دی ہو گی، اُسے کچھ مل سکتا تھا۔

کانتے بتا رہا تھا کہ باقی سب کو ہوٹل سے دُور رکھ صرف اُسے ساتھ لے کے تجمل ہوٹل میں داخل ہوا۔ ابا جان اُ ہی سینے سے لپٹ گئے۔ کانتے کہتا تھا کہ اُن کی آنکھیں تھیں، اُن کی طرف دیکھا نہیں جا رہا تھا کہ کہیں وہ بکھر نہ نہ جائیں۔ تجمل نے بھی انھیں سمیٹے ہی رکھا۔ خاموشی سے اُن سُنتا رہا، وہی کچھ جو راستے میں زورا اور مارتی اُسے بتا چکے تھے نے ابا جان سے نہ کوئی تبصرہ کیا، نہ دو لفظ تسلی کے کہے۔ تسلّ کے لیے اُس کے پاس تھا بھی کیا۔ ابا جان بچے نہیں تھے جو کی سیری ہو جاتی۔ خود تجمل کو بھی تسلّی کی ضرورت ہو گی اور ابا موقع پر اپنا منصب بھولے نہیں ہوں گے۔ کانتے کے مطا سکون سے سب کچھ بیان کرتے رہے، ان کے ہونٹوں پر کوئی اور اُن کی آنکھوں میں کوئی نمی دکھائی نہیں دی۔

تجمل وہاں سے فوراً نہیں اُٹھا۔ اُس نے چائے منگو کیا اور لباس تبدیل کرنے کے باوجود وہیں صوفے پر بیٹھا رہا کو اُس کی خاموشی سے بہت اُلجھن ہو رہی تھی لیکن تجمل ل

ع اُٹھ سکتا تھا۔ ابا جان کی بیان کی ہوئی رُوداد اِس کے سوا کیا ہو تی تھی کہ ہم صبح صبح ہوٹل سے نکلے تھے، پھر واپس نہیں آئے۔ تجمل وہ بھی قیاس کرنا تھا جو ابا جان نے نہیں سُنایا تھا۔ مزید کسی پیچیدگی بچنے کے لیے اُسے پہلے وجہ کا تعین کر لینا چاہیے تھا اور وجہیں دو ہو تی تھیں کہ ہم کسی خاص سبب، خدشے یا نفرت کے باعث کسی کو لوب تھے یا پھر ہمارے ساتھ خود اپنی کسی کوتاہی کے سبب کوئی پیش آگئی تھی، کوئی ارضی و سماوی قسم کی افتاد جس پر ہمارا بس نہ ا ہو۔ تجمل نے اِسے یک سر نظر انداز کر دیا ہو گا اور پہلی ہی وجہ پیش ر رکھی ہو گی اور اُس کی روشنی میں اپنے آیندہ اقدام کے لیے مختلف انات پر غور کیا ہو گا۔ پہلا امکان مولوی محمد شفیق کے کسی سلسلے تعلق ہو سکتا تھا۔ ابا جان نے سفر کرتے کرتے اچانک ہمارے مراد آباد جانے اور وہاں سے چلنے پر بمبئی جانے کے بجائے حیدرآباد کا ارادہ کر نے کا ذکر لازماً اُس سے کیا ہو گا۔ تجمل کے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار یں تھا کہ مراد آباد کے مسافر خانے سے مولوی صاحب کا کوئی نشان یں ضرور ملا تھا، حیدرآباد کے اُس نشان پر ہمیں پہلے دن شام کو ناکامی ہوئی جبھی ہم دوسری صبح ہوٹل سے پھر نکل گئے تھے۔ ممکن ہے، مولوی صاحب حوالے سے کئی بدگمانیوں نے تجمل کے ذہن میں سر اُٹھایا ہو۔ دوسرا کان حیدرآباد کے اڈّے سے متعلق ہو سکتا تھا، تجمل کی یاد داشت حیدرآباد میں گزشتہ سفر کے حادثے مٹ نہیں گئے ہوں گے۔ مولا جہاں گیر کا قصہ، شاہ کبیرے اور کالے دادا کا واقعہ۔ کیا شاہ کبیرا اڈّے واپس آگیا ہے یا اڈّے سے دُور رہ کے ابھی تک سینے پہ داغ لیے ر رہا ہے؟ حالانکہ یہ ایک نہایت حیران کن بات ہے، وہ کس منہ بازار واپس آیا ہو گا۔ بازار میں اُس کی واپسی ممکن معلوم نہیں ہوتی ن یہی بات تو اُس کے کینے کو ہوا دے سکتی ہے۔ تجمل نے اپنے پیچھے زار کے اڈّے پر ہونے والی غیر معمولی تبدیلیوں کا امکان رد نہیں کیا ہو ۔ اس عرصے میں اڈّے پر نیا استاد آ سکتا ہے۔ نئے استاد کو فطری طو ان اجنبیوں سے ہوشیار رہنا چاہیے جو اچانک شہر میں وارد ہو کے شاہ کبیرے کی رُسوائی کا سبب بن گئے تھے۔ وہ دوبارہ بھی کسی وقت کے اور اڈّے پر اپنے تعینات کیے ہوئے آدمی کالے دادا کے بجائے سی اور کو دیکھ کے برہم ہو سکتے ہیں اور نئے استاد کے لیے مسئلہ بن کتے ہیں اور خود کالے دادا، آدمی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ وئی عجب نہیں کہ کالے دادا ہی حیدرآباد میں اُن لوگوں کی واپسی سند نہ کرتا ہو جو اُسے اڈّا بخش گئے تھے۔ کوئی بھی بات ممکن تھی۔

مولوی صاحب اور اڈّے سے متعلق ان پہلوؤں کے علاوہ ایک امکان ہماری گرفتاری کا بھی ہو سکتا تھا۔ تجمل نے اس پر بھی غور کیا ہو گا کہ ہم کسی اَن جانے معاملے میں ملوث ہو کے جیل نہ چلے گئے ہوں۔ جیل میں یا تو ہمیں باہر سے رابطہ رکھنے کا موقع نہیں مل سکا یا ہم نے خود ابا جان، زورا اور مارتی پر زک آنے کے خیال سے پہلوتہی کی۔

حیدرآباد میں گزشتہ مرتبہ کے واقعات اور اُن سے متعلق لوگوں کے چہرے ذہن میں تازہ کرتے ہوئے تجمل کے سامنے نواب عالم تاب کا نام بھی آیا ہو گا۔ وہ شخص جو مسلح لوگوں کا ایک دستہ لے کے عین وقت پر اسٹیشن آ کے ہمارے راستے کی دیوار بن کے آگیا تھا، جب ہم خانم کو مستقل فیض آباد لے جا رہے تھے اور خانم نے ہمارے حق میں بلکہ اپنے حق میں فیصلہ دے دیا تھا، اُس وقت نواب چلا گیا تھا لیکن بعد میں خانم کے اس فیصلے سے کسی پشیمانی، غم اور غصے نے تو نواب پر غلبہ نہیں کر لیا۔ کالے دادا سمیت شہر میں کسی کو ہمارے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور خانم کو کہاں لے گئے۔ نواب عالم تاب کے نام پر، ہو سکتا ہے، تجمل نے اپنے خون کی گردش میں فرق محسوس کیا ہو۔ نواب کا چہرہ اُسے اچھی طرح یاد ہو گا، خانم کے انکار پر وہ کیسا حواس باختہ نظر آتا تھا۔ اُس کا چہرہ جلنے لگا تھا۔

کانتے کہہ رہا تھا کہ وہ سہ پہر کو ہوٹل میں آئے تھے۔ تجمل شام تک خاموش بیٹھا رہا۔ اُسے اُٹھ کے ناک کی سیدھ میں نہیں چل دینا تھا۔ تار ملنے کے بعد اُن کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے بیدار ہوئے تھے لیکن کہیں دُور دُور تک اُن کے سان و گمان میں نہیں تھا کہ یہاں پہنچ کے انھیں ایسی کسی خبر سے واسطہ پڑے گا۔ روشنیاں جل چکی تھیں، جب تجمل اپنی نشست سے اُٹھا، چند لمحے اُس نے ابا جان سے دھیمے لہجے میں کوئی بات کی جسے کانتے نہیں سُن سکا، پھر ابا جان کو سلام کر کے وہ ہوٹل سے رخصت ہو گیا۔ ہوٹل سے کچھ دور ایک مقام پہ شامو، جمرو اور ڈنگو اُن کے منتظر تھے۔ مارتی کو تجمل نے ہوٹل میں چھوڑ دیا اور زورا کو ساتھ لے لیا۔ اُن سب کو اپنا تعاقب کرتے رہنے کی ہدایت دے کے وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کا رخ شہر کے اندرونی علاقے کی طرف تھا۔ کانتے اُس کے ساتھ تھا۔ جلد ہی وہ تھانے کی عمارت کے نزدیک پہنچ گئے۔ تجمل نے اپنے پیچھے آنے والوں کو اشارے سے وہیں روک دیا اور تھانے میں داخل ہو گیا۔

تھانے کے ذکر پر مجھے حیرت ہوئی۔ کانتے کے بہ قول وہ بھی شش و پنج میں پڑ گیا تھا لیکن اُس نے تجمل سے کوئی استفسار نہیں کیا اور چپ چاپ اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ تجمل راہ داری میں بیٹھے ہوئے حوالدار محرّر کے پاس جا کے ٹھہر گیا اور اُس نے کہا کہ ہم لوگ دلّی سے آئے ہیں۔ کوئی بیس دن پہلے ہمارے دو آدمی یہاں شہر میں پہنچے تھے۔ گھر سے نکلنے کے بعد ان کی کوئی خیر خبر ہمیں معلوم نہیں ہو سکی۔ نام پلّی اسٹیشن پر پان سگریٹ کی ایک دُکان سے اُن کے یہاں آنے کی

تصدیق ہو چکی ہے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ دکھائی نہیں دیے۔ انھیں چھ سات دن میں واپس گھر پہنچ جانا تھا اور اتنے دن گزر جانے کے بعد اب تک وہ نہیں پہنچ سکے ہیں۔ حوالدار نے اس کی بات توجہ سے سنی اور کئی ایک سوال کیے۔ بجھل نے گم شدگان کے نام مختلف بتائے۔ عمریں بھی میری اور بیرو کی نہیں تھیں۔ وضع قطع بھی کسی قدر مختلف تھی۔ حوالدار کچھ سوچتا رہا اور اس نے سرسری طور پر روزنامچہ الٹ پلٹ کے دیکھا۔ اس دوران بجھل نے کہا کہ اس کے کھو جانے والے عزیز مزاج کے ذرا تیز واقع ہوئے ہیں، یہاں ریاست کے طور طریق سے ایسے واقف نہ تھے اِس لیے اُسے اندیشہ ہے کہ کہیں اُن سے کوئی انیس بیس حرکت تو سرزد نہیں ہو گئی ہے۔ حوالدار ایک دردمند آدمی تھا۔ اس نے اس سے ہمدردی ظاہر کی، پوچھا، کہاں ٹھیرے ہو۔ بجھل نے کہا۔ اسٹیشن سے اِدھر اُدھر پوچھتے ہوئے یہاں آ گئے ہیں۔ اب جا کے نام پلی کی کسی سرائے میں ٹھیر جائیں گے۔

وہ عابد شاپ روڈ کے تھانے کا علاقہ تھا۔ وہاں سے نکل کے بجھل اور آگے بڑھ گیا۔

کانتے کی زبانی یہ سب سن کے میری سمجھ میں کچھ آیا۔ میری پٹ پٹاتی نظریں دیکھ کے اُس کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ ابھری مگر تھکی ہوئی، بجھی ہوئی سی مسکراہٹ۔ اس نے بتایا کہ باقی فاصلہ انھوں نے رکشے کے ذریعے طے کیا اور اندھیرا گہرا ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا جب وہ ایک دوسرے تھانے پہنچے، مجھے فوراً اس تھانے کا گمان ہوا جہاں مجھے اور بیرو کو لے جایا گیا تھا لیکن وہ کوئی دوسرا تھانہ تھا اور اتنا بڑا نہیں تھا۔ بجھل نے وہاں بھی وہی کہانی دہرائی اور وہاں سے بھی اُسے وہی جواب ملا۔ اس وقت اُس کا شبہ کسی حد تک دور ہو گیا ہو گا کہ ہم شہر میں کسی بڑے حادثے سے دوچار نہیں ہوئے ہیں ورنہ تھانے میں اس کا چرچا ضرور ہوتا لیکن کوئی چھوٹا موٹا واقعہ بھی ہو سکتا ہے جو کسی ایک علاقے کے تھانے تک محدود رہا ہو۔ یقیناً یہی کچھ سوچ کے بجھل نے تیسرے تھانے کی چار دیواری میں قدم رکھا ہو گا۔ پہلے دو تھانوں میں جہاں اُس کی کوئی الجھن دور ہوئی تھی، وہیں بہت سی الجھنیں بڑھ بھی گئی ہوں گی۔ تیسرے تھانے میں اس نے اپنی روداد میں کسی قدر ترمیم کی اور متعلقہ حوالدار سے کہا کہ وہ اپنے دو آدمیوں کی گم شدگی کی رپورٹ کرانا چاہتا ہے۔ حوالدار نے اسے چونک کے دیکھا اور پہلی دفعہ کانتے کے بہ قول اُس کے کان کھڑے ہوئے۔

میں نے اپنی بے چینی خود تک محدود رکھی اور کانتے سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ موسیٰ ندی کے پاس والا تھانا تو نہیں تھا۔ میری مداخلت سے وہ اٹک سکتا تھا۔ کہنے لگا، حوالدار نے وضاحت چاہی۔

"کیسے آدمی؟"

بجھل نے کم و بیش ہمارا وہی حلیہ اُسے بتایا جو ... تھانوں میں بتا چکا تھا۔ حوالدار نے روزنامچے کی ورق گردا... بولا۔ ایسے ناموں کا کوئی اندراج گزشتہ بیس دن میں نہی... بجھل نے حجت کی اور کہا کہ ممکن ہے، پولیس کے خوف سے ... نے اپنے صحیح نام نہ بتلائے ہوں۔ اُس نے حوالدار سے اپنی پر... اظہار کیا اور کہا کہ صرف اُنھی کی تلاش میں اُس نے اتنی دُو... کیا ہے۔ بجھل نے اُس سے درخواست کی کہ اگر وہ اپنا کچھ و... کر کے گزشتہ دنوں کے روزنامچے پر تفصیل سے نظر ڈال ... پردیسی کے ساتھ احسان کرے گا۔ حوالدار جز بز ہوا، منہ بنا... بجھل نے کہا کہ وہ دو آدمی اُسے بے حد عزیز تھے، اُن کے لیے ... کے بڑے سے بڑے حاکم کے پاس فریاد کے لیے جا سکتا... روپے پیسے کے خرچ کی اُسے اتنی پروا نہیں ہے۔ اُسے ا... عزیزوں کا حال جاننے کی فکر ہے اور بس۔ روپے پیسے کا ... نے جان بوجھ کے کیا ہو گا۔ اس پر حوالدار نے سر تا پا اُن دو... لیا اور کسمسا کے بولا۔ "ہم کو یاد نہیں کہ اس درمیان ایسے آدمی ہوں جیسا حلیہ تم لوگ بولتے۔" تاہم بجھل کے گزارشانہ اصرا... دل پسیجا اور اُس نے ناگوارانہ توجہ سے دوبارہ روزنامچہ دیکھ... کیا، ابھی اُس نے تین چار ہی صفحے پلٹے ہوں گے کہ رک گیا ... ہوا بولا۔ "دو آدمی تھے؟"

بجھل نے جلدی سے گردن ہلائی۔ "ہاں ہاں صاحب ... اِدھر آئے تھے!"

حوالدار نے تذبذب سے جواب دیا۔ "دو آدمی تو ہم ... پڑتے ہیں لیکن..."

بجھل نے اس کی بات کاٹ کے تیزی سے پوچھا ... تھے کس معاملے میں آئے تھے صاحب؟"

"لیکن جو حلیہ تم بولتے ہو، ویسا کوئی آدمی نہیں تھا ... کو اتنے دن نہیں گزرے، جتنے تم بولتے ہو۔ یہ کوئی سات ... پہلے کی بات ہے، دو آدمی تھے، ایک نوجوان دوسرا بڑی عمر کا ... سپاہی پکڑ کے لائے تھے۔" اُس نے بجھل کو بتایا کہ یہ تقریباً ... کا واقعہ ہے۔ رات ہو گئی تھی۔ وہ بھی ڈیوٹی پہ تھا اور اُس ... لوگوں کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ پھر اُس نے فوراً صفحے پلٹے ... پہلے کی رپورٹ دیکھنے لگا، دیکھتا رہا اور سر ہلا کے بولا۔ " ... وہ لوگاں جیسا تم بولتا ہے ایسا سر سے نہیں تھا۔"

"کیا ہم اُن سے مل سکتے ہیں؟" بجھل نے اضطراب ...

"وہ اب ادھر کہاں ہیں۔" حوالدار نے بیزاری سے بتا... اسی رات چلے گئے تھے۔"

"اُسی رات چلے گئے تھے؟"

"قسمت کے اچھے تھے۔" حوالدار نے کہا۔ "جلدی خلاصی ہو گئی ... م بازوں کی، ہم تم سے بولیں، ہم کو ایسے لوگوں سے کم واسطہ پڑا ہے۔ ... جان دار آدمی تھے۔ بہت سے اپنی آنکھاں سے دیکھنے والے ... بھی یہی بولتے ہیں کہ دیکھتے دیکھتے پورے چار آدمیوں کو کھینچ کے رکھ ... تھے۔" کانتے نے مجھے اُسی کے لہجے میں بتانے کی کوشش کی ... کہنے لگا ہمیں اچنبھے اور تشویش میں پڑا دیکھ کے حوالدار کی آنکھوں ... چمک پیدا ہوئی اور وہ ہمیں یقین دلانے کے انداز میں بولا کہ موسیٰ ... ی کے کنارے چار آدمیوں نے انھیں گھیر لیا تھا۔ چاقو تک نکل آئے ... تھے۔ انھوں نے اُن چاروں کو قابو میں کر کے ایک کو زخمی بھی کر دیا اور ... ہم سے صاف نکل گئے، ادھر موسیٰ ندی پر ساری خلقت جمع ہو ... ی تھی۔ اُس نے بجھل سے کہا کہ کچھ دیر اور ہو جاتی تو وہ دونوں پولیس ... ے ہاتھ کبھی نہیں پڑتے لیکن اطلاع ملنے پر ہر طرف پولیس چوکنا ہو ... ی تھی، اُسے زیادہ دوڑ بھاگ نہیں کرنی پڑی۔ یہاں تھانے میں آ کے ... بھی وہ زور آزاری دکھاتے رہے مگر اِن گناہگار آنکھوں نے سالانوں ... بڑے بڑے رستم پگھلتے دیکھے ہیں۔ ایک شہری کو چاقو لگا تھا ... لیے تم انھیں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا اور پھر سب انسپکٹر فیروز کو اُن ... شک ہو گیا تھا کہ ایسی چاقو بازی اور زور کرنے والوں کا تعلق جیسا ... وہ کہہ رہے ہیں تجارت سے نہیں ہونا چاہیے۔ سب انسپکٹر کا شبہ ... رست معلوم ہوتا تھا لیکن اُن کی یہ بات بھی سب کے جی کو لگتی تھی کہ ... چار آدمیوں نے روپے کی وجہ سے اُن پر حملہ کیا تھا۔ اُن کے بیان کے ... طابق اُن کا سامان بھی وہیں موسیٰ ندی پر رہ گیا تھا۔ کہتے تھے کہ ... صندوق میں بہت سے روپے تھے۔ روپے اُن کی جیبوں میں بھی تھے ... ور خاصی معقول تعداد میں۔ حوالدار نے کانتے اور بجھل کو وہی بتایا ... جو ہمارے ساتھ تھانے میں پیش آ چکا تھا۔ بتاتے بتاتے وہ یک ... لخت ٹھیر گیا، شاید اُسے احساس ہو گیا تھا کہ اتنی تفصیلات کے ... ساتھ اُن سے یہ سب کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُس کے ماتھے پر ... ل پڑ گئے چنانچہ بجھل نے کریدا کہ پھر آخر وہ لوگ چھوٹ کیسے گئے ... تو حوالدار ناراض ہونے لگا۔

"ہم کو شبہ ہے صاحب کہ وہ اپنے ہی آدمی تھے۔" یکایک بجھل نے ڈوبے لہجے میں کہا۔

"کیا؟ کیا بولتے ہو تم لوگاں!" وہ ایک دم اکھڑ گیا اور درشتی سے بولا۔ "ہو گا تو پھر چلا گیا، اب وہ اِدھر نہیں ہے۔"

"ہم یہی پوچھتے ہیں صاحب کہ آخر وہ کیسے چلے گئے؟ آپ بولتے ہو کہ قسمت نے اُن کا ساتھ دیا، اُن کی جلدی خلاصی ہو گئی۔"

"دیکھو، ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے جو اب تمھارے ساتھ مغز کھپائے۔ کسی دوسرے تھانے میں جا کے دیکھو اور رپورٹ لکھوانی ہے تو ہم کو بولو۔"

بجھل نے اُس سے گزارش کی کہ وہ پہلے ہی دو تھانے جا کے پوچھ آیا ہے۔ جب اُس نے اتنی مہربانی کی ہے، اب تک اتنی ہمدردی سے پیش آیا ہے تو اب اچانک اُسے کیا ہو گیا ہے۔ کیا اُس کی شان میں اُن سے کوئی گستاخی ہو گئی ہے۔ باقی کچھ بتلانے میں کیا حرج ہے۔ کچھ اور نہیں تو اُن کی تسلی ہو جائے گی۔ ممکن ہے، وہی لوگ ہوں۔ حوالدار اس کٹھ حجتی پر اور بھڑک گیا۔ نہایت تند و تلخ لہجے میں اُس نے دوبارہ میرا اور بیرو کا حلیہ دہرایا، یہ بجھل کے بتائے ہوئے حلیے سے قطعی مختلف تھا۔ بس سفر کی ایک غرض تجارت مشترک تھی۔ وہ غصے میں بجھل سے پوچھنے لگا۔ "ایسا ہی تھا تمھارا کھویا ہوا آدمی؟"

بجھل نے انکار میں گردن ہلائی۔ وہ کسی قدر نرم پڑ گیا اور بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "اور ہم کیا بولتے ہیں، جب لوگاں ہی وہ نہیں تھے تو آگے جان کے تم کیا کرو گے۔" بجھل خاموش رہا لیکن اُٹھا نہیں۔ حوالدار کا پارا ٹھیر گیا۔ اُس نے از خود بتانا شروع کیا کہ "وہ ایک دم دوسرا لوگاں تھا بابا! نیچی آواز میں اُن سے بات کرنا نہیں آتا تھا۔" بجھل اور کانتے کی خاموشی پر اُس کا لہجہ زیادہ نرم ہو گیا۔ اُس نے کہا، رات کو جب بڑے انسپکٹر رکنی میاں تھانے آئے تو انھیں اُن کے سامنے پیش کیا گیا۔ اتفاق سے اُس وقت رکنی میاں کے کوئی معزز دوست بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ حوالدار نے انھیں دوسری یا تیسری ہی بار تھانے میں دیکھا تھا۔ اُن کا اصل نام بھی اُسے اُسی رات معلوم ہوا۔ خاں صاحب فیض علی خاں۔ دونوں ملزموں کا بیان انھوں نے بھی سنا اور بہت متاثر ہوئے۔ بولے، پردیسی ہیں، ان کی کہانی سچی لگتی ہے، ان کو تو بہادری کا کوئی تمغہ ملنا چاہیے، پھر انھوں نے ہچکچاتے ہوئے رکنی میاں سے کہا، جی چاہتا ہے کہ انھیں چھوڑ دیا جائے۔ رکنی میاں نے معذرت کر لی تھی لیکن خاں صاحب ضمانت لینے پر آمادہ ہو گئے۔ رکنی میاں اپنی مرضی کے آدمی ہیں۔ اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے لیکن خاں صاحب کی بات اور تھی۔ کچھ اُن سے اپنے تعلق کا پاس تھا اور کچھ خاں صاحب بڑے آدمی تھے۔ بڑی سی موٹر میں آئے تھے، لباس، گفتگو، رکھ رکھاؤ سے امارت ٹپکتی تھی۔ رکنی میاں خاموش ہو گئے۔ "دیکھا تم نے!" حوالدار نے سر اُٹھا کے کہا۔ "بڑے لوگاں کی بڑی باتاں! ابھی ایسا دل والاں بھی دنیا میں پڑا ہے۔ اجنبی کا ضمانت لے لیا۔" پھر وہ تنک کے کہنے لگا۔ "اب تم بولو گے، ہم کو خاں صاحب کا اتا پتہ بولو۔"

"نہیں صاحب! ہم آپ کو کچھ نہیں بولیں گے۔" بجھل نے ایک ثانیے کے سکوت کے بعد بوجھل لہجے میں کہا۔ "پھر آپ ٹھیک ہی بولتے ہو۔ اپنے آدمی ایسے نہیں تھے۔"

کانتے کا خیال تھا کہ ببجھل حوالدار کو انسپکٹر رُکنی میاں سے ملنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ اچانک اُٹھ گیا۔ اُس نے حوالدار کا شکریہ ادا کیا اور جیب سے رُپے نکال کے مٹھی بند کر کے حوالدار کو دینے چاہے۔ حوالدار نے بس پلک جھپکنے کا تامّل کیا پھر صاف انکار کر دیا۔

تھانے سے نکل کے وہ دونوں رکشا میں بیٹھ گئے۔ زورا، شامو، جمرو، ٹنگو دُور کھڑے تھانے کے دروازے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی وہ بھی رکشوں میں بیٹھ گئے۔

ببجھل کے لیے مختلف امکانات میں سے کوئی ایک متعیّن کرنا نہایت دشوار تھا۔ وہ یہی کر سکتا تھا کہ پہلے تمام امکانات الگ الگ کرے پھر سب سے بے ضرر اور سامنے کا امکان ٹٹول کے دیکھے۔ مولوی صاحب کے حوالے سے ہماری گم شدگی کا کوئی امکان اُس نے مسترد نہیں کیا ہو گا لیکن اس سمت کوئی قدم اُٹھانے کے لیے اُسے کوئی ایسا نام و نشان معلوم ہونا ضروری تھا جس کے باعث ہم نے یکایک حیدر آباد آنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ببجھل کو وہ نام و نشان مراد آباد کے مسافر خانے ہی سے مِل سکتا تھا۔ مراد آباد بہت دُور تھا۔ وہاں جانے اور واپس آنے کا وقت صرف کرنے سے پہلے ببجھل کو دوسرے امکانات کے سلسلے میں اپنا تردّد دُور کر لینا چاہیے تھا اور اس کی یہی صورتیں ہو سکتی تھیں کہ وہ یا تو سیدھا اڈّے کا رُخ کرے یا جا کے نواب عالم تاب کی حویلی کا دروازہ کھٹ کھٹائے، تھانے پہنچے یا اِدھر اُدھر گھوم کے ہمیں پیش آنے والے کسی ناقابلِ قیاس حادثے کی سُن گُن لینے کی کوشش کرے۔ ابّا جان سے ساری رُوداد سُننے کے بعد اُس کے ذہن سے یہ حقیقت چمٹی رہی ہو گی کہ ہمیں گم کر دینے والے ارادے کے پختہ اور حیثیت کے مضبوط لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ گم ہو جانے والوں کے ساتھیوں کے ردِّ عمل سے اچھی طرح باخبر اور اُس کا جواب دینے کے لیے ہر طرح مستعد۔ میرے متعلق تو ببجھل کو ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہو گی لیکن میرے ساتھ ممبئی کے اڈّے کا سب سے بڑا دادا بیرو بھی تھا۔ میرے ساتھ اُسے بھی یوں سرِ راہ اوجھل کر دینا کوئی آسان کام نہیں اور پھر اتنے دن گزر جانے کے بعد ہماری طرف سے مسلسل سکوت۔

ہوٹل سے چلتے وقت ببجھل کے سَر میں بے شمار جالے تَنے ہوں گے۔ کچھ شواہد اور نشانیوں کے اعتماد میں اُس کے لیے اڈّے جانا بہتر ہو سکتا تھا اور یہی احتیاط نواب عالم تاب کی حویلی کے لیے ضروری تھی۔ دونوں سے کچھ نہ حاصل ہو سکنے کی صورت میں اور گرہیں پڑ سکتی تھیں۔ وہ کانتے کو بھی اڈّے بھیج سکتا تھا۔ اُسے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا مگر کانتے کو اڈّے کے لوگوں سے شناسا ہونے اور

صحیح صورتِ حال تک پہنچنے میں وقت لگ سکتا تھا۔ وہ اُ[illegible] نظروں میں بھی آ سکتا تھا اور اُس کی ذرا سی غلطی کسی اور بڑے [illegible] کا سبب بن سکتی تھی۔ ببجھل نے اِدھر اُدھر گھومنے اور ہواؤں [illegible] چلانے کا ارادہ اِسی لیے موقوف کیا ہو گا کہ اُسے اپنی بھی [illegible] احتیاط رکھنی تھی۔ جن لوگوں نے مجھے پہچان لیا تھا، اُن کی نگا[ہوں] میں ببجھل کے خد و خال بھی محفوظ ہوں گے۔ جنھیں اپنے سَر کی [فکر] نہیں ہوتی، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اپنا سَر بچا کے نہ [رکھیں]۔ ہوٹل میں سہ پہر سے شام تک بیٹھے رہنے کا ایک سبب اندھیرے [کا انتظار] بھی ہو سکتا تھا۔

پھر تھانا ہی ایک راستہ رہ جاتا تھا۔ بازار یا آبادی [illegible] سے ہمیں کہیں لے جایا گیا ہو گا ورنہ ہم ایسے جانے والے نہیں۔ [بیرو] نے یقیناً کوئی مزاحمت بھی کی ہو گی اور اُس کا کسی تھانے [illegible] بھی ممکن تھا۔ ابّا جان نے اُسے بتایا ہو گا کہ شہر سے چھپنے وا[لے] اخبارات پر وہ مسلسل نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ کوئی ایسا ویسا وا[قعہ] ساتھ پیش آتا تو اخبار میں خبر ضرور آتی لیکن اخبار میں بہت [illegible] شائع بھی تو نہیں ہو پاتیں، تھانے کی چار دیواری اور روزنا[مچوں میں] محدود رہتی ہیں۔ بسا اوقات تو روزنامچوں سے بھی دُور [illegible] ہیں۔ ببجھل کی طرح ابّا جان، زورا اور ماٹی بھی تھانے جا [illegible] زورا کے کہنے کے مطابق ابّا جان تو جاتے جاتے لَوٹ آئے [تھے]۔ انھوں نے اچھا ہی کیا، اوّل تو انھیں وہاں جا کے ببجھل کے [illegible] کرنی چاہیے تھی، دوسرے تھانے سے حاصل ہونے والی معلو[مات کے] بعد بھی انھیں ببجھل کی ضرورت پڑتی۔

موسٰی ندی کا پُل عبور کرنے کے بعد پتھر گٹی، پھر چار کمان بازار اور اُس سے فرلانگ بھر آگے چار مینار کا علاقہ تھا۔ یہاں [ببجھل] رکشا سے اُتر گیا۔ چند قدم پیدل چلنے کے بعد وہ مکّہ مسجد کے [قریب] آ گئے۔ زورا، شامو، جمرو، ٹنگو بھی اُن کے پیچھے پیچھے آ رہے۔ مسجد کے عین سامنے ایک ہوٹل میں وہ سب یک جا ہو گئے۔ [کانتے کو] بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ہوٹل میں آ کے بیٹھ جائے گا۔ ہوٹل میں [illegible] کم تھی لیکن کسی طرح سکڑ سُکڑا کے انھوں نے تپائیوں پر نشست [illegible] تھی۔ ببجھل نے اُن کے لیے کھانا منگوا لیا۔ ہلکا سا کھانا، دال اور [illegible] حالانکہ ہوٹل والے نے اُسے مختلف کھانوں کی ایک بڑی فہرست [سنائی] تھی۔ ریل میں ناشتے اور دن میں ایک پیالی چائے کے سوا انھو[ں نے] صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ کھانے پینے کا ہوش کسے تھا۔ ببجھل کا منہ تک رہے تھے۔ کانتے نے کئی بار ارادہ کیا کہ کوئی [بات] چھیڑے مگر ببجھل کا سُوجا ہوا منہ دیکھ کے اُس کی زبان اَٹک [جاتی]۔ تھانے میں سب کچھ اُس نے اپنے کانوں سے سُنا تھا پھر بھی [اُسے] ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت کچھ سُننے سے رہ گیا ہو۔ وہ ببجھل [سے]

[بہت] کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ کھانا آ گیا، سب گم سم، گُنگ بیٹھے تھے۔ [بب]جھل کے اشارے پر انھوں نے جیسے تیسے کھانا شروع کیا۔ اُن کا کھانا اُن [سب] کی خوراک سے بہت کم تھا پھر بھی بچ گیا۔ کھانے کے بعد [ببجھ]ل نے چائے منگوائی اور بیڑی سُلگا کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ اُن [س]ب کو بہت گھٹن ہو رہی تھی۔ شامو درمیان میں کہنے لگا کہ اِس وقت [ش]اید کی آنکھوں میں جیسے خون بھرا ہوا تھا۔ اُس نے آدھی بیڑی پی ہو [گی] کہ پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

سامنے چار مینار کے گھڑیال میں دس بج رہے تھے۔ ہوا خشک [تھ]ی اور دکانیں بند ہو جانے کے باوجود سڑکوں پر آمد و رفت ایسی کم [نہ]یں ہوئی تھی۔ کانتے کہہ رہا تھا کہ اُسے ببجھل کی خاموشی زہر لگ [رہی تھ]ی، طرح طرح کے اندیشے اُس کے سینے میں چبھ رہے تھے۔ کانتے [ببجھل کی] بے تابی کا اندازہ بھی اچھی طرح کر سکتا تھا۔ کچھ اُس کے لہجے سے بھی [اُس] کا اظہار ہوتا تھا۔ خود مجھے یہ سوچ سوچ کے دھڑکا سا لگا ہوا تھا [کہ] تھانے سے نکل کے ببجھل نے آخر کس طرف جانے کا ارادہ کیا ہو گا۔ ببجھل چار مینار سے آگے نہیں گیا۔ وہیں رکشے خالی مل گئے تھے۔ کانتے بھی اُس کے ساتھ بیٹھ گیا، باقی چاروں دوسرے دو رکشوں پر بیٹھے۔ کانتے نے مجھے بتایا کہ رکشا میں بیٹھتے ہوئے ببجھل نے جب منزل بتائی تو اُس نے جگہ کا نام صاف طور پر سُنا لیکن اُسے خیال نہیں تھا کہ وہ بازار کا علاقہ ہو گا۔

"محبوب کی مہندی۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"ہاں! وہ اِدھر ہی آیا تھا۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

میری رگوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ کانتے کہنے لگا، رکشا سے اُترنے پر اُس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ پہلے وہ سمجھا تھا کہ کہیں وہ خاں صاحب یہاں نہ رہتے ہوں جن کا ذکر حوالدار نے ببجھل سے کیا تھا۔ [اُ]س کے خیال میں شاید اِسی لیے ببجھل نے اُن کا اتا پتا جاننے کی جستجو نہیں کی تھی کہ وہ پہلے سے اُن سے واقف ہو گا۔ اگر خاں صاحب [کی] بات غلط نکلی یا خاں صاحب نے انکار کر دیا یا انھوں نے [ک]وئی اور؟.... کانتے کہہ رہا تھا کہ اُس کا سر گھوم رہا تھا لیکن رکشا سے اُتر کے اُس نے جب بازار کا علاقہ دیکھا تو اُسے خود بخود کوئی [ت]سلی سوئی سی نصیب ہوئی۔ اُسے آنے والے لمحوں کی بُو محسوس ہو [رہ]ی تھی اور اُس نے ببجھل کا بایاں شانہ بار بار اُوپر اُٹھتا دیکھ لیا تھا۔ [اُس] نے کبھی غور نہیں کیا لیکن کانتے کے کہنے کے مطابق کسی خاص [وق]ت میں ببجھل کا بایاں شانہ پھڑکنے لگتا تھا۔ گلی میں داخل ہوتے [ہ]ی ببجھل نے پیچھے سے اُس کی گردن کی چٹکی بھری اور اُس کا سارا جسم جھنجھوڑ دیا۔ کانتے کے لیے یہ بھی ببجھل کی طرف سے آنکھیں کُھلی رکھنے [کا] اشارہ تھا تاہم اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور اُس کا جی چاہا کہ وہ

ببجھل سے لپٹ کے رونے لگے مگر ببجھل نے اُسے آگے دھکیل دیا۔

اُس نے باقی چاروں کو ساتھ آنے کی ہدایت نہیں دی تھی اس لیے وہ اُس کے پیچھے ہی چلتے رہے۔ گلیوں میں اُس وقت بہت ہجوم تھا۔ سارا علاقہ روشن تھا۔ بازار کی تیزی کا وقت تھا۔ ببجھل کہیں ٹھیرے بغیر بڑھتا گیا۔ راستے اُسے معلوم ہی تھے۔ بعض گلیوں سے فاصلہ کم ہو جاتا تھا لیکن وہ تنگ گلیوں میں گھومنے کے بجائے سیدھے راستے سے گزرا، اُسی طرف سے جہاں سے میں اور بیرو گزرے تھے۔ ایک چوک کی مختلف ہوٹلوں اور چائے خانوں کی تپائیوں پر اڈّے کے لوگ اور راہگیر بیٹھے رہتے تھے۔ ببجھل ابھی اُس چوک سے دُور تھا کہ یکایک ایک راہ گیر اُسے دیکھ کے چونک پڑا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک طرف بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ببجھل نے فوراً دو قدم آگے بڑھ کے اُس کے کندھے پر ترچھا ہاتھ مارا۔ وہ اڈّے ہی سے وابستہ کوئی آدمی تھا۔ بلبلاتا ہوا وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ ببجھل ہی نے بال پکڑ کے اُسے اُٹھایا اور کہا۔

"کدھر ہے تیرا دادا؟"

اُس کی آنکھیں باہر نکل آئیں، گھگھیاتے ہوئے بولا۔ "دادا، دادا وہ۔ وہ اُدھر....." اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"اُس حرام کے جنے کو جا کے بول کہ اب اِدھر ہم لوگ آ گئے ہیں، سمجھا؟" ببجھل نے اُسے گردن سے اُوپر اُٹھا کے زمین پر پٹخ دیا۔ وہ اُٹھ کے ایسی تیزی سے بھاگا کہ ذرا آگے ٹھوکر کھا کے گِر پڑا، پھر فی الفور اُٹھ کے دوڑنے لگا اور دیکھتے دیکھتے اوجھل ہو گیا۔ کئی راہگیر متوجّہ ہو گئے تھے لیکن انھیں آگے جاتے دیکھ کے خاموش رہے۔ انھوں نے اُن کی راہ میں رکاوٹ بننے کی غلطی نہیں کی۔ کچھ آگے چل کے کانتے نے دیکھا کہ دو آدمی لپکتے ہوئے اُن کی طرف آ رہے ہیں مگر جیسے ہی ببجھل اور کانتے پر اُن کی نظر پڑی، وہ سٹ پٹا سے گئے، جہاں تک آ سکے تھے، وہیں کھڑے ہو گئے۔ ببجھل اور کانتے لمحوں میں اُن تک پہنچ گئے تھے۔ دونوں آدمیوں کے ہاتھ میں بند چاقو چھپے ہوئے تھے۔ انھوں نے چاقو سامنے نہیں کیے۔ ببجھل کو ایک نظر گھور کے دیکھا پھر آنکھیں چُرانے لگے۔ ضرور انھوں نے ببجھل کو پہچان لیا تھا۔ ببجھل اُن کے سامنے ایک لمحے بے سُدھ کھڑا رہا پھر ایک دم اُس نے دونوں کے بال پکڑ کے اُن کے سَر ٹکرا دیے۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ گلی چیخوں سے گونج اُٹھی۔ چاقو بھی اُن کے ہاتھوں میں نہ ٹِک سکے۔ "جا کے اُس زنخے کو بولو ہم آ رہے ہیں۔"

"دادا!" دونوں کانپتے ہوئے ببجھل کے پیروں پر گرے اور اُس کی ٹانگوں سے چمٹ گئے۔ ببجھل کا پیر ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ کانتے نے انھیں الگ کرنا چاہا لیکن ببجھل نے اُن کی تھوڑیوں میں ہاتھ ڈال کے انھیں جھٹکا دے کے اُٹھایا اور اِدھر اُدھر دھکیل دیا۔ "مچلتے ہو کہ نہیں؟" اُس نے پھنکارتی آواز میں انھیں حکم دیا۔ "بولنا کہ

اپنی ماں کا جنا ہے تو اُدھر ہی بیٹھا رہ، ہم آ رہے ہیں۔"

اُنھوں نے ہڑبڑاتے ہوئے خود کو سنبھال کے بجھل کا حکم سنا اور سرپٹ اُسی طرف بھاگ کھڑے ہوئے جدھر کانتے اور بجھل کا رُخ تھا۔ وہ دونوں گلی میں بہت سے راہ گیروں کی نظروں میں آئے۔ بالاخانوں سے لوگ جھانکنے لگے تھے لیکن کانتے اور بجھل سب سے بے خبر راستہ طے کرتے رہے۔ اُن کی رفتار نہ زیادہ تیز تھی، نہ اتنی سُست۔ چوک میں اُن کے پہنچنے سے پہلے اُن کی اطلاع پہنچ گئی تھی۔ ہوٹل کے سامنے پڑی ہوئی تپائیاں خالی تھیں، اِردگرد افراتفری سی چھائی ہوئی تھی۔ بجھل کو دیکھ کے وہاں سناٹا چھا گیا۔ تپائیوں کے پاس اڈّے سے متعلق کئی آدمی مستعد تُلے ہوئے سے کھڑے تھے مگر وہ آگے نہیں بڑھے۔ بجھل خود اُن کے بیچ میں جا کے ٹھیرا اور کسی ایک کو قریب آنے کا اشارہ کیا، آدمی رُکا، جھجکا پھر آہستہ سے اُس کے پاس چلا آیا۔ "اِن سب کو بول رے، اپنے دادا کے کنے چلے جائیں۔ ابھی اِن کی اُس اٹھائی گیرے کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔" بجھل کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ رُکا اور تپائی پر بیٹھ کے اُس نے اُسی آدمی کو ایک گلاس پانی لانے کا حکم دیا۔

وہ اپنے ساکت و جامد ساتھیوں کی طرف دیکھتا ہوا ہوٹل والے کی طرف پہنچا۔ ہوٹل والے نے بھی سن لیا تھا اور شاید بجھل کو پہچان لیا تھا۔ وہ پانی خود لایا اور بجھل کو سلام کرنے لگا۔ "چائے دادا؟" اُس نے اٹکتی آواز میں پوچھا۔

"نہیں، ابھی پان کھلواؤ پہلوان، چائے پینے بعد میں آئیں گے۔"

تپائی پر بیٹھے بیٹھے اُس نے پانی پیا۔ دکان دار دوڑتا ہوا پان کی ملحقہ دکان پر گیا اور دو گلوریاں طشتری میں رکھ کے لے آیا۔ زورا، جمرو، شامو اور ٹنگو قریب ہی ایک دوسری پان کی دکان پر ٹھیرے ہوئے تھے۔ بجھل نے جیب سے نوٹ نکال کے ہوٹل والے کی طرف بڑھایا، اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ نوٹ واپس جیب میں ڈال کے بجھل اُٹھ گیا اور اِدھر اُدھر نگاہیں گھماتے ہوئے بولا: "تم اُدھر ہی کھڑے رہو گے کیا، اپنے دادا کا دیدن کرنے نہیں چلو گے۔"

بجھل نے پھر مڑ کے اُن کی طرف نہیں دیکھا، چوک سے کچھ آگے ہی اڈّے کی جانب جانے والی گلی تھی۔ وہ اور کانتے اُس میں مڑ گئے۔ کچھ دُور جانے کے بعد کانتے کو احساس ہوا کہ وہ اکیلے نہیں ہیں۔ زورا، جمرو، شامو اور ٹنگو کے علاوہ بھی کچھ آدمی اُن کے پیچھے آ رہے تھے۔ آگے گلی کے نکڑ پہ انھیں دو گشتی سپاہی بھی دکھائی دیے۔ کانتے کو ایک خدشہ یہ بھی لاحق تھا کہ اگر کہیں پولیس نے اُن کی راہ میں کسی طور مزاحم ہونے کی کوشش کی تو خواہ مخواہ دیر لگ جائے گی لیکن نہ تو گلی میں ایسا شور و شغب تھا، نہ دنگا فساد۔ ویسے بھی پولیس اڈّے کے لوگوں سے اُسی وقت اُلجھتی ہے جب کوئی چارہ نہ رہے یا نفری

اُن کا اندیشہ ہو۔ ایسے موقعوں پر بھی پولیس تب ہاتھ بڑھا
اچھی خاصی نفری ساتھ ہونے کا اعتماد ہو۔ اڈّے والوں میں
طرف سے پولیس کو متوجہ کرنے کا امکان بھی نہ ہونے کے
اڈّوں کے لوگ پولیس کو اپنے معاملات سے آخر وقت تک
ہیں۔ پولیس کو اُلجھانے کا مطلب خود بھی اُلجھنا ہے اور پھر
ضرورت ہے۔ پولیس کو بیچ میں ڈال کے آئی بلا ٹالی جا سکے تو
عارضی حل ہے۔ آڑ بار بار کام نہیں آتی۔ وہی لوگ جھوٹ
تو بڑی بلا بن کے سامنے آتے ہیں۔ زورا نے درمیان میں بتایا
دیکھ کے سپاہی چونکے تو ضرور تھے لیکن وہیں سے کسی دوسر
گئے۔ اِس کے علاوہ وہ خود بھی اِس اثنا میں آگے بڑھ کے ا
سے اوجھل ہو گئے۔ زورا کے بیان کے مطابق وہ اور جمرو وغیرہ
پڑنے پر پولیس کا دھیان بٹانے کے لیے پیچھے ہر طرح

لیکن کانتے کا خدشہ بھی بے سبب نہیں تھا۔ زو
وغیرہ وہ سب کچھ نہیں جانتے تھے جو کانتے نے تھانے میں
اڈّے اور اڈّے کے آدمیوں سے کچھ سوا تھا۔ کانتے کے خیال
بھی لمحے کسی بھی جانب سے رکاوٹ کھڑی ہو سکتی تھی۔

گلی میں کچھ اندر جا کے اڈا تھا، اُس طرف عام بالاخ
تھے لیکن یہ بازار ہی سے متعلق علاقہ تھا۔ یہاں گلیوں میں
بھی نہیں تھی۔ ابھی وہ اڈّے تک نہیں پہنچے تھے کہ انھیں
جانب سے بھاگتے ہوئے کئی آدمیوں کی چاپیں سنائی دیں۔
بجھل اور کانتے نے کچھ اور فاصلہ طے کیا، اُتنی
وہ بھی سامنے آ گئے۔ دونوں نے انھیں دیکھ لیا تھا مگر وہ
بڑھتے رہے۔ اُن کی تعداد پانچ تھی۔ پانچوں جسم کے مضبوط او
تیز دکھائی دیتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں کھلے چاقو تھے اور
بے قابو سے لگ رہے تھے۔ بجھل اور کانتے کو بڑھتا دیکھ
نے دُور ہی سے انھیں ٹھیر جانے کا حکم دیا تھا۔ بجھل نے جو
نہیں مگر آگے انھوں نے راستہ روک لیا تھا اس لیے بجھل
پڑا، وہ کانتے سے بولا: "دیکھ رہا ہے، ہرپالے آ گئے، کیا بو
اُس کو ہراول لے، اب اڈّوں پہ بھی ہراول ہونے لگے سالے۔"
نے اُن سے مخاطب ہو کے پوچھا: "کیا بات ہے رے؟"

"بات تو تم سے اپن کو پوچھنا ہے اُستاد!" اُن میں
بگڑی ہوئی آواز میں بولا۔

"اپنے کو تیرے دادا سے ملنا ہے۔"

"اڈّے پر اب کالے دادا نہیں ہے اُستاد!"

"تو جو کوئی بھی ہے، اپنے کو اُسی سے ملنا ہے۔"

"تم، تم کیا چاہتے ہو؟"

"او بچا سُنتا ہے، بولا نا، تیرے اُستاد کو ملنا چاہتے ہیں۔" بجھل
دھیمے لہجے میں کہا۔

"پہلے اِدھر ہمی سے مل لو اُستاد!" اُن میں ایک کسمساتے ہوئے بولا۔

"تو پھر تیرا دادا اِدھر سے چلا جاوے گا کیا؟"

"یہ دادا جانے۔" اُس نے ترشی سے جواب دیا۔

"ہٹ جا رے۔" بجھل نے تندی سے کہا: "اپنے کو نہیں پہچانتا
ہے کیا؟"

"پہچانتے ہیں اُستاد! پر تم بھی اپن کو..."

"ہاں، ہاں۔" کانتے نے اُن کی بات کاٹ کے تیزی سے
ا: "دیکھ رہے ہیں، تم کو اوپر سے نیچے تک اچھی طرح دیکھ رہے ہیں،
م بولتے ہیں، راستہ چھوڑ دو، اُدھر تمھارے دادا ہی سے کچھ بات کرنا
ہے۔ تمھارے من میں کچھ اور ہے تو وہ سب بھی پورا کر دیویں گے، قسم
ے کوئی شکایت نہیں ہوگی تم کو، لیکن دادا سے پہلے نہیں۔ ابھی وہ سالا
نہیں گیا ہے۔ اڈّے کا مالک بنا ہے تو صرف تمھارے ٹھیکے پہ نہیں
ا ہوگا۔ کچھ اپنا بل بھی رکھتا ہوگا۔ اپنے کو معلوم ہے، اُس نے تم کو
ہیں بھیجا ہوگا۔ کوئی اڈّے دار سالا ایسا اُلّو کا پٹھا نہیں ہوتا۔ اپنے
اس زیادہ وقت نہیں ہے اور ہم کو زیادہ بولنا بھی نہیں آتا۔"

"یہاں سے واپس چلے جاؤ اُستاد!" جواب میں اُن میں سے
سی نے برہمی سے کہا: "آکا، شاہ کبیر نہیں ہے۔ اُس کے پاس سے
ھڑکنے والا سالا اُس پانی بھی نہیں مانگتا، اپن بولتے ہیں، تمھارے لیے
ہی اچھا ہے کہ جدھر سے آئے ہو اُدھر ہی لوٹ جاؤ۔"

"آکا نام ہے اُس کا۔" بجھل کی آواز تھمی ہوئی تھی: "ٹھیک ہی
ولتے ہو بے پیندوں کے! اپنے کو وہ شاہ کبیر نہیں لگتا۔ شاہ کبیر تھوڑا
ہت آدمی کا تخم لگتا تھا۔ اپنے کو تمھارا دادا گیدڑ کا جنا لگتا ہے۔"

کانتے کہتا تھا کہ وہ دونوں بالکل تیار تھے اور اُن پانچوں کو
ھلے چاقوؤں کے باوجود آسانی سے سنبھال سکتے تھے۔ بجھل نے کانتے
و کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ اِس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اُس کے ساتھ
وئی اور نہیں، کانتے تھا۔ میں نے کانتے سے نہیں پوچھا لیکن پہلی
دبیر اُن کے ذہن میں یہی ہوگی کہ وہ اچانک کنارے کھڑے ہوئے دو
دمیوں پر جھپٹیں گے۔ اِس سے پہلے کہ اُن کے باقی تین ساتھی کچھ سمجھنے
کی کوشش کرتے، وہ اُن دونوں کو انھی کے سامنے کر کے منتشر کر دیتے۔
ہو سکتا ہے اور بھی کوئی صورت اُن کے ذہن میں ہو۔ زورا، جمرو،
شامو اور ٹنگو کی دخل اندازی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انھیں
اُن سے الگ ہی رہنا تھا لیکن نتیجے وہ چاروں بجھل کے اشارے کے
منتظر تھے۔ بجھل نے ایک بار پھر اُن پانچوں سے راستہ چھوڑ دینے
کے لیے کہا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کانتے سے برداشت کرنا مشکل

ہو رہا تھا۔ بجھل کی وجہ سے وہ ہاتھ پیر جکڑے کھڑا رہا۔ گو بجھل کی طرح اُس کا اندازہ بھی یہی تھا کہ اُن پانچوں کی آمد محض ایک رسمی حجت ہے۔ ظاہر ہے انھیں آکا نے نہیں بھیجا ہوگا۔ اڈّے کے آدمی کبھی کبھی اپنے اُستاد کی خوشنودی کے لیے یوں ہی سامنے آ جاتے ہیں۔ اُستاد بھی اس طرح ایسے ویسے لوگوں سے فضول اُلجھنے اور وقت ضائع کرنے سے بچ جاتا ہے۔ وہ بھی اسی خیال سے اڈّے سے نکلے ہوں گے کہ دیکھیں تو سہی، خبر پہنچانے والے نے کسی مبالغے سے تو کام نہیں لیا ہے۔ کوئی یوں ہی سر اُٹھائے تو نہیں چلا آ رہا ہے۔ عام طور پر اُن کا مقصد آنے والے کا تخمینہ کرنا، اُس کا دعوا پرکھنا ہوتا ہے۔ سامنے میں ہوتا تو شاید وہ اتنی دیر نہ کرتے لیکن میرے بجائے بجھل کے ہمراہ کانتے تھا۔ کانتے کو وہ بالکل نہیں جانتے تھے اور بجھل سے وہ اسی حد تک واقف تھے کہ شاہ کبیر والے دن وہ میرے ساتھ تھا۔ انھوں نے اُسے شاہ کبیر سے زور کرتے نہیں دیکھا تھا حالانکہ پھر حیدرآباد کے چند روزہ قیام میں اڈّے پر وہی اُن کے سامنے رہا تھا۔ بہرحال بجھل کے متعلق اُن کی رائے کسی غلط فہمی پر مبنی ہو سکتی تھی۔ کہیں میں نے اُسے اُس کے بڑے پن کی وجہ سے یوں ہی رتبہ نہ دے رکھا ہو۔ ہو سکتا ہے، مجھے اِس وقت اُس کے ساتھ نہ دیکھ کے انھیں گمان گزرا ہو کہ بجھل کو روکنا اُن کے لیے اتنا مشکل نہیں ہے مگر یہ گمان ہی ہوگا۔ اسے پرکھنے اور آزمانے کا خطرہ انھیں مول نہیں لینا چاہیے تھا اور اب تک اگر جیسا کہ کانتے اور بجھل کا اُن کے متعلق اندازہ تھا، انھیں اُن کے سامنے سے ہٹ جانا چاہیے تھا۔ بجھل نے بھی اتنی دیر اِسی لیے لگائی تھی کہ اڈّے جانے سے پہلے گلی میں خون خرابہ مناسب نہیں تھا، انھیں حجت تمام کرنے کا وقت ضرور دینا چاہیے تھا اور بجھل کی نظر میں شاید یہ وقت ختم ہو گیا تھا، اُس نے دوبارہ اُن سے راستے سے ہٹ جانے کے لیے نہیں کہا۔ وہ آہستہ روی سے ایک قدم آگے بڑھا اور اُس نے اپنے عین مقابل کھڑے ہوئے آدمی کی طرف ہاتھ اُٹھایا، اُس کے ہاتھ اُٹھانے پر وہ اُچھل گیا۔ نتیجتہً اُس کے باقی چار ساتھیوں کا بوکھلا جانا لازم تھا۔ کانتے کی سانسیں سینے میں رُک گئی تھیں۔ وہ تو پیچھے سے اُن پر بے تحاشا ٹوٹ پڑتا مگر بجھل نے آگے جاتے ہوئے اُسے خاموش کھڑے رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ کانتے بتا رہا تھا کہ اُس لمحے اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے اتنا دیکھا کہ اُس کے سامنے وہ چاروں کئی جانب سے چاقو بلند کیے بیک وقت بجھل کی طرف جھپٹے مگر بجھل کے جسم پر سکوت طاری رہا۔ دوسرے ہی لمحے اُن چاروں کے اُٹھے ہوئے چاقو بجھل کے جسم میں پیوست ہوتے ہوتے ٹھٹھک گئے۔ بجھل جیسے اُن سب سے بے خبر اُس آدمی کے مقابل کھڑا رہا جس کی جانب وہ بڑھا تھا۔ اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ

دکھ کے ہلکی سی تھپکی دی۔ وہ گم سُم لکڑی کے کسی بُت کے مانند اکڑا ہوا ایک طرف ہوگیا اور اُس کے ہاتھ میں جاقو دبا کا دبا رہ گیا۔ اُس وقت تجّل اُس کے چار ساتھیوں کے نرغے میں تھا۔ سامنے والے کے ہٹ جانے پر راستہ ہوگیا۔ تجّل نے سَر گھما کے کانتے کی طرف دیکھا' دونوں اُن کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔

بس لمحے صَرف ہوئے تھے۔ تجّل کے لیے اُن کے تیوروں میں غیر متوقع غضب تھا، کانتے بے اوسان ہوگیا کہ کہیں اِن پانچوں کو پہچاننے' اُن کا مقصد سمجھنے میں تو کوئی چُوک نہیں ہوگئی؟ اگر تجّل کے جسم میں جواباً غلطی سے کوئی اضطراری ردِ عمل ہوجاتا تو چاروں کے لیے خود کو روکنا مشکل تھا۔ کانتے کا خوف بے جا نہیں تھا۔ بے شک ثانیوں میں' لمحوں میں کچھ بھی ہوسکتا تھا مگر صرف۔ لمحے صَرف نہیں ہوئے تھے۔ اس سے پہلے وہ اتنی دیر اُن کے سامنے کھڑے کیا کرتے رہے تھے۔ انھیں کچھ جتلاتے ہی رہے تھے۔

کوئی ایک سبب نہیں تھا جو اُن کے اُٹھے ہوئے ہاتھ اینٹھ گئے تھے۔ تجّل اور کانتے نے ہتھیار نہیں نکالے تھے۔ یہ بات راستہ روکنے والوں کے لیے اگر ایک طرف اطمینان کا باعث تھی تو دوسری طرف اُن کی استقامت بھی متزلزل کرتی تھی۔ تجّل کے ساتھ کانتے بھی ساکت کھڑا رہا۔ وہ سب میرے واسطے سے سہی بہرحال تجّل کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے ضرور رکھتے تھے۔ چاہے وہ ایک مشکوک رائے ہو۔ اپنے ساتھی کی طرف تجّل کے بڑھنے پر اُن کا بوکھلا جانا غیر اختیاری تھا مگر رُک جانا بھی اختیاری نہیں تھا۔ وہ اُس لمحے کچھ بھول گئے تھے جو دوسرے لمحے انھیں یاد آگیا۔ آخر انھوں نے جان لیا کہ آنے والے واپس جانے کے ارادے سے نہیں آئے ہیں اور میرے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر اُن کا ارادہ کچھ اور ہوتا تو وہ بھی یقیناً اتنا وقت نہ لگاتے' کوئی بعید نہ تھا کہ اڈّے سے کچھ اور آدمی بھی شور مچاتے ہوئے اُن کے پیچھے آرہے ہوں۔ اُن کی دیوار راستے سے ہٹانے کی کسی اور تدبیر میں کوئی اور گرہ پڑنے اور وقت لگنے کا احتمال تھا۔ کانتے کو خاطر جمع رکھنی چاہیے تھی کہ تجّل کسی یقین کے بغیر ایسا قدم نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ میں نے اُس سے جرح نہیں کی۔ اُس کی بدحواسی کی وجہ صاف تھی' وہ اپنے دست و بازو جکڑے ہوئے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جو بات وہ تجّل کے لیے کہہ رہا تھا۔ اگر خود اُس سے وہی لغزش ہوجاتی یعنی کوئی اضطراری ردِ عمل تو تجّل سے شاید اُس کی تلافی کبھی ممکن نہ ہوتی مگر اُسے کانتے پر اعتبار تھا جبھی اُس نے اُسے صرف اشارہ کرنا کافی سمجھا۔

اڈّا قریب ہی تھا، ایک فرلانگ سے کم فاصلہ طے کر کے وہ اڈّے کے سامنے تھے۔ دروازے پر چند آدمی مضطربانہ گھومتے نظر آئے۔ عمارت کا دروازہ کھلا ہوا تھا، انھیں اندر جانے میں [illegible] پیش نہیں آئی۔

اندر صحن میں بظاہر خاموشی تھی، نفری بھی زیادہ نہیں [illegible] اِدھر اُدھر دو چار آدمی دیواروں کے ساتھ پہرے داروں کی [illegible] تھے' کچھ لوگ دروازے کے سامنے صحن کے ایک کونے میں [illegible] چوکی پر موجود تھے۔ روشنی باہر کی نسبت اندر تیز تھی۔ عمارت کے داخل ہونے پر ایسی کھلبلی نہیں مچی لیکن جمود اُن کے اضطرا[illegible] چغلی کھا رہا تھا۔ انھیں دیکھ کے جو شخص اپنی جگہ جما نہ رہ [illegible] کالے ولوا تھا۔ اُس کی نظریں دروازے ہی پر لگی ہوئی تھی[illegible] اُن کے نمودار ہوتے وقت اُس پر کوئی بجلی سی گری تھی۔ ایک [illegible] میں اُس نے کئی پہلو بدلے۔ وہ بڑبڑاتا ہوا چوکی سے اُٹھ[illegible] اُترتے اُترتے اُس نے پلٹ کے چوکی کے وسط میں اوند[illegible] ہوئے شخص کی طرف دیکھا اور دوبارہ اُوپر چڑھ گیا۔ تجّل اور کا[illegible] سے کچھ فاصلے پر آکے ٹھیر گئے تھے اسی اثنا میں کانتے کو [illegible] بہت سے آدمیوں کے اندر داخل ہونے کی آوازیں سنائی دیں [illegible] کا سکون اُن کے آنے سے منتشر ہوگیا تھا۔ اُن میں سے کو[illegible] اور کانتے کے آگے نہیں آیا، سب دروازے کے قریب ہی رہے اور اُن کے جسموں کی آہٹیں اور سرگوشیاں عمارت میں بھ[illegible] گئیں مگر پھر سناٹا چھا گیا، کانتے نے پیچھے ایک نظر ڈال کے [illegible] کرلیا تھا کہ جمرو، شامو، زورا اور ٹنگو بھی اندر آنے والوں میں شا[illegible]

اوندھے لیٹے ہوئے شخص نے اُٹھ کے دیکھنے کی ضر[illegible] نہیں سمجھی کہ عمارت میں اچانک یہ کیسی آوازیں گونج اُٹھی ہیں [illegible] آیا ہے۔ دو آدمی اُس کا بدن دبا رہے تھے مگر اُن کی بے[illegible] ہر سُو چھٹک رہی تھیں۔ وہ آکا کے سوا کون ہوسکتا تھا۔ [illegible] کی وجہ سے اُس کا چہرہ اُن کے سامنے نہیں تھا، جسم کا گٹھی[illegible] کا درمیانہ معلوم ہوتا تھا، ہاتھ پاؤں پھیلائے وہ بے سُدھ تھا۔ تجّل نے چند لمحے توقف کیا اور کالے دادا پر نگاہیں جما[illegible] کہا "تو کالے ہی ہے نا؟" اُس کی آواز تڑخ رہی تھی۔

کالے دادا پر سکتہ طاری تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں [illegible] اور کچھ کہا نہیں۔

"کیا ہوگیا ہے رے تجھے؟" تجّل نے تلخی سے کہا۔

کالے دادا نے سَر جھکا لیا، اُس کا سارا جسم دھڑک [illegible]

"بولتا کیوں نہیں؟" تجّل نے اُونچی آواز میں کہا "زبا[illegible] ساتھ کٹوا دی ہے کیا؟"

کالے دادا سے پھر نہیں رہا گیا۔ اتنی دیر بھی جانے کس [illegible] اُس نے برداشت کیا تھا، دیوانہ وار چوکی سے نیچے اُترا اور [illegible]

[illegible] پیر پکڑ کے سَر رگڑنے لگا۔

"ہم نے کیا سُنا ہے کالے!" تجّل نے اُسے اُٹھا کے کھڑا کیا۔ [illegible]لے دادا کی آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں اور لگتا تھا کہ ایک اشارے [illegible] بکھر جائے گا۔ وہ تجّل سے نگاہیں نہیں ملا رہا تھا۔ اڈّے پر آکا [illegible]وجودی کے باوجود اُسے دیکھ کے تجّل کو تعجب ضرور ہورہا ہوگا۔ "[illegible]سب کیا ہے رے؟" اُس نے کالے دادا کو جھنجوڑتے ہوئے [illegible]ھا۔ کالے دادا دم سادھے کھڑا رہا تو وہ برہمی سے بولا "ہوش [illegible] آجا کالے اور جلدی سے اِس بہروپیے کو بول کہ یہ ناٹک ختم کرے [illegible] اِدھر آگئے ہیں۔ یہ وہی کُتّے کی اولاد ہے کیا، آکا؟ نام اِس حرام [illegible]جم کا اِدھر کسی نے ہم کو بولا تھا۔"

تجّل کا اتنا کہنا تھا کہ دونوں آدمیوں کو اِدھر اُدھر دھکیل کے [illegible] تڑپتا ہوا اُٹھا اور تجّل کو مغلظات سناتے ہوئے گرجنے برسنے لگا۔ [illegible] کی عمر چالیس کے قریب ہوگی، جکڑا ہوا کھنچا ہوا جسم' لمبوترا چہرہ' [illegible]ی چھوٹی آنکھیں' ناک باہر اُٹھی ہوئی، انگریزی بال' چہرہ صاف [illegible] رنگ گندمی۔ وہ اُٹھ کے چوکی پہ پیر پٹخنے لگا۔ اُس کی آواز [illegible]ری تھی اور عمارت کی خاموشی سے اس میں کچھ گرج اور کھنک ہوگئی تھی۔ اُس نے غرّاتے لہجے میں تجّل سے کہا کہ وہ کسی اور کے [illegible] آکا کے اڈّے پہ ہے۔ بہتر ہے' اوقات میں رہ کے بات کرے [illegible] آکا دوسرا موقع نہیں دیتا۔

"کالے! اس چیڑی مار کو بول کہ ہم پہلا موقع بھی نہیں دیتے [illegible]ں سے آخری خواہش ضرور پوچھ لیں گے۔" تجّل کی آواز بڑی حد [illegible] سنبھلی ہوئی تھی۔ "اڈّا ہم نے اِس کی ماں کو منہ دکھائی میں [illegible]ں دیا تھا۔"

"زبان کو داب کے رکھ حرام زادے!" آکا دہاڑ کے بولا اور وحشت [illegible]ے کے انداز میں چوکی سے اُتر آیا۔ "تو، تو آکا کو نہیں جانتا۔" اُس [illegible] سے کف نکلنے لگا تھا اور غصّے میں اُس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی [illegible] وہ تجّل کو بُری طرح گالیاں بک رہا تھا۔

"لگتا ہے تُو نے اپنے بارے میں کچھ اِس کو نہیں بولا [illegible]الے!"

کالے دادا نے ہذیانی انداز میں سَر کو جھٹکے دیے اور ہونٹ [illegible]ا رہ گیا۔

"بولتا تو یہ بے پیندے کا کچھ سوچ سمجھ کے منہ ماری کرتا، سالا [illegible]ے کہیں بندھا ہوا دکھائی نہیں پڑتا ہے۔"

"اس بھڑوے سے کیا پوچھتا ہے' اس نے سب بولا تھا بولا تھا کہ [illegible]نے اپنا تیرے شیر ببر میں مار خاں نے اُدھر شاہ کبیرا کو پچھاڑ دیا اور تو پھر اس کاٹھ کے اُلّو کو بانس پہ چڑھا گیا تھا، اڈّے کا سودا بنا کے۔ پہلے شیشے میں اس کو شکل دکھا دی ہوتی۔"

"شکل تو تُو نے بھی اپنی نہیں دیکھی ہے پر آج تجھ کو ضرور دکھا دیں گے۔" تجّل بگڑے لہجے میں بولا "یہ کالے حرام ڈھیل کیا ہم اِدھر پیر کی جوتی رکھ کے جاتے تو بھی تجھ کو اِدھر کا دھیان سے رُخ کرنا چاہیے تھا۔ اڈّا کالے کی جاگیر نہیں ہے جس کو طشتری میں لوٹ کے یہ تجھ کو دے دے، ہمی سے کوئی مائی کا لال اِس کو لے سکتا ہے۔ تجھ کو اڈّا گیری کی ایسی ہی کھجلی ہوئی تھی تو تھوڑا اپنا انتظار کرلیا ہوتا بھُنگیا کے۔"

"ہنہہ۔" وہ زمین پر تھوک کے بولا "اپن کو تو کوئی کانجی ہاؤس سے دستی تُڑایا لگتا ہے' سالا نواب کا... آکا تیرا انتظار کرتا رہا۔" وہ پھنکارتے ہوئے کہنے لگا "اڈّے کا تجھ کو اتنا ہی خیال تھا تو اِدھر ہتھیلی لگا کے بیٹھا ہوتا، اِس مجنوں کے جھٹکے کو اِدھر کیوں چھوڑ گیا تھا یا اس کو اپنا کوئی اتا پتہ دے گیا ہوتا کہ تیرے کھونٹے ہی پہ جا کے آکا تجھ کو دیکھتا، تیرے سینگ کتنے آگے کو نکلے ہیں۔ اڈّا آکا نے اپنے بل پہ لیا ہے، اِن تیرے کلو امتانے سے اپنا آپ ہی نہیں سنبھل رہا تھا، اڈّا کیا سنبھالتا سالا۔ اِس سے پوچھا اپن نے آ کے پوچھا تھا، کدھر وہ رستم کا سگا رہتا ہے۔ یہ سر دا آئیں بائیں کرنے لگا۔"

"اور تُو اڈّے پر بیٹھ گیا۔" تجّل نے طنز سے کہا "بس اتنا ہی ٹھیک جانا تُو نے چھنال کے جنے!"

"اڈّا آکا نے اپنے بل پہ لیا ہے اور اور بل پہ ہی اِدھر بیٹھا ہے۔" وہ بھنّا کے بولا "ابھی تجھ کو سیدھی طرح دکھائی نہیں دیتا تو اپن کو بول، اپن ابھی تجھ کو آکا کا پچھا سارا دکھا دیں گے۔ آکا شاہ کبیرا نہیں ہے جس نے اِدھر منہ کالا کرالیا تھا۔ سالا بیچ بازار میں کھلوا بیٹھا۔ اپن کو اب تک یقین نہیں ہے۔ ضرور اِدھر کسی سُوّر کے بچّے نے حرامی پنا کیا ہوگا، وار اپن بھی خوب پہچانتا ہے پر اپن شاہ کبیرا نہیں ہے۔"

کانتے کا خون سُلگ رہا تھا کہ وہ بڑھ کے آکا کی زبان کیوں نہیں کھینچ لیتا۔ اُسے حیرت تھی کہ تجّل آخر اِس قسم کی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ آکا کی آواز بگڑتی، بھڑکتی جا رہی تھی' اُس کا سارا جسم پارے کے مانند تلملا رہا تھا اور تجّل کو بھی جانے کیا ہوگیا تھا، آج تک کانتے نے اُسے اتنی دیر کسی سے ایسی باتیں سُنتے نہیں دیکھا تھا۔ اِس دوران عمارت میں لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ سب دم سادھے کھڑے تھے۔ صرف آکا کی آواز دمک رہی تھی یا تجّل کی۔

"تو ٹھیک ہی بولتا ہے۔" تجّل نے تمتماتی آواز میں کہا "شاہ کبیرا تجھ سا نہیں تھا۔ اپنے کو تیرا ناڑا اُس سے بھی کچا لگتا ہے کبیرے

نے کچھ دیر بھی لگائی تھی۔ تجھ کو تو اتنا وقت بھی نہیں ملنے کا لے۔"

"ہا!" آکا ایک دم اکھڑ گیا اور دانت پیس کے بولا۔ تیری موت تجھ کو ادھر کھینچ لائی ہے۔" اُس کا گلا شدتِ غضب سے پھٹنے لگا تھا۔ وہ مسلسل گالیاں بکے جا رہا تھا۔ ایک لمحے میں اُس نے چاقو نکال لیا اور سانڈ کی طرح سر نیچے کر کے اُچھلنے، گھومنے لگا۔

"تجھل اپنی جگہ کھڑا رہا۔" تو بَل دکھائے بغیر نہیں مانے گا پر کچھ ہوگا تبھی تو دکھائے گا۔ اپنا خیال تھا کہ اتنی دیر میں ہوا کا کوئی جھونکا چل کے تیرے سر سے بڑی ڈھول ہٹا دے گا پر تیرے دن ہی ختم ہو گئے ہیں تو ہم...."

تجھل کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ آکا اچانک چاقو تول کے دیوانہ وار اُس کی طرف بڑھ گیا۔ تجھل کی آنکھیں کھلی تھیں۔ آکا اُس کے بہت قریب آ گیا تھا مگر تجھل بے حس و حرکت رہا۔ آکا کی وحشت دو چند ہو گئی، اپنے بڑھتے ہوئے قدم کھینچنے کے لیے اُسے خود پر بہت جبر کرنا پڑا ہوگا مگر وہ بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا اور ڈکراتی آواز میں بولا۔" زیادہ ٹر ٹر مت کر گتے کے پلے! چاقو نکال لے۔"

"تیرے پاس تو ہے لے۔" تجھل نے سرد لہجے میں کہا۔

کانتے نے تجھل کے لہجے کی سردی اپنے رگ و پے میں محسوس کی۔ آکا اُس کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر چاقو تولے تڑپ رہا تھا۔ وہ اپنے آپے ہیں بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا، کسی بھی پل وہ دونوں آپس میں دست بگریباں ہو سکتے تھے۔ اس اثنا میں کانتے اپنی دانست میں آکا کو اچھی طرح پرکھ چکا تھا۔ جسم کے نپے تلے ہونے کے علاوہ اُس کے ہاتھ پیروں میں غیر معمولی چمک تھی۔ کانتے کو اُس وقت وہاں اڈّے کا کوئی اور آدمی اُس کا ہم پلّا نظر نہیں آیا تھا۔ کالے دادا کا جسم پھیلا ہوا تھا لیکن اُسے یقین تھا کہ اڈّا سپرد کرتے وقت تجھل نے اس میں کوئی بات ضرور دیکھی ہوگی۔ کالے دادا اڈّے کا مالک ہونے کے بعد وہ بات برقرار نہیں رکھ سکا، کچھ متا گیا، آکا کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کالے دادا کو اڈّے سے زیادہ کسی اور بات سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ آکا کے کہنے کے سبب اُس نے کوئی مزاحمت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے اڈّا آکا کے حوالے کر دیا۔ اڈّے پر آکا کے ساتھ اُس کی موجودی کا بھی یہی سبب معلوم ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے، آکا ہی نے اُسے روک لیا ہو، نئے اڈّے پر اُسے اعتماد کے کسی آدمی کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ آکا حیدر آباد کا نظر نہیں آتا تھا۔ اُس کی زبان، طور طریق اور شکل و صورت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اُنھی کی طرح کسی دوسری جگہ سے آیا ہے اور اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ خوش فہمی ایسی بے وجہ بھی نہیں ہوگی۔ اڈّے پر اُس کے آنے کے بعد شاید کوئی شخص اڈّے کا دعوا کرنے نہیں آ[...] کے آدمیوں کے سامنے اُس نے اڈّے پر ضرور اپنی موجود[گی کا] ثبوت پیش کیا ہوگا، جبھی سب کے چہروں پر اُس کے [...] چھا جاتی تھی، عام طور پر کسی شہر میں سب سے بڑا اڈّا بازار [...] اور اس نسبت سے اس اڈّے سے متعلق آدمی بھی دوسر[...] مختلف ہوتے ہیں۔ آکا اپنی کسی خوبی کے بغیر اِن لوگوں [...] قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

مگر کانتے کے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا، ایسے آدمیوں سے تجھل کا اور اُس کا واسطہ پڑ چکا تھا۔ کا[نتے کے] تذبذب اور اضطراب کا سبب یہ نہیں تھا کہ آکا نا[...] اُس اڈّے پر موجود ہے جس پر تجھل کبھی اپنا آدمی چھوڑ [...] اُن کا مقصد اُس آدمی کو ہٹا دینا، اڈّا دوبارہ حاصل کر[...] دل کو تسلی دینا نہیں تھا۔ کانتے کے انتشار کی وجہ اُم[...] بے یقینی تھی۔ اُسے شبہ تھا کہ تھانے سے نکل کے تجھل [...] آیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس تگ و دو کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہ[و] اندازے کی کوئی غلطی مجھے اور پیرو کو اُن سے اور دور نہ [...] جانتا تھا کہ اب اُس کے سارے وسوسے بعد از وقت [ہیں۔ بار] بار اپنے آپ کو ٹوکتا، سمجھاتا اور اپنی نگاہیں ایک طر[ف] جو موجود ہے، اُسی کی طرف مرکوز رکھنے کی کوشش کرتا [...] میں اُس کے سامنے آ جاتا تھا، کبھی پیرو، کبھی ابا جان۔ اُ[ن] کی ویرانی اُس کے سینے میں کھب گئی تھی اور تجھل، تجھ[ل نے] کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا مگر کانتے کو معلوم تھا، اُس [کا] سمندر اُمڈ رہا ہے۔

اِدھر اُسے تجھل کے پیر کی فکر تھی۔ بڑی مشکل [سے] شروع ہوا تھا کہ دو دن کے مسلسل سفر سے اُس پیر اور زن[...] چاقو تول کے تجھل کے پاس آ کے پلٹ گیا تھا۔ کا[نتے نے] جھجکتے جھجکتے تجھل سے کہا تھا۔" اُستاد! میں دیکھتا ہوں اِس حرا[می کو۔]" تجھل نے اُسے جھڑک دیا اور اپنے ہاتھوں کو زو[ر] دیتے ہوئے آکا کی طرف بازو پھیلا دیے مگر آکا چاقو نکا[ل کر] چیخنے لگا۔" ہم نے کیا بولا تھا لکے، تیرے پاس کا فی نہ[یں]" [...] نے ترشی سے کہا۔

یہ سُن کے آکا نے اپنا چاقو بھی فرش پر پھینک دیا، [اور] تجھل نے چاقو نکال لیا۔ آکا نے چاقو خود اُچھالنے کے بجا[ئے] قریب کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا، اُس نے فرش سے [اُٹھا] کے اُس کی جانب اُچھال دیا۔ آکا نے مشاقی سے چاقو اُچک [لیا اور] پوری طاقت سے کسی فقیر کا نام لے کے نعرہ لگایا۔ اُس[...]

[...] گونج اُٹھی۔ تجھل نے پھر اُس سے کچھ نہیں کہا، سب خود بخود [...]ٹ گئے۔ کانتے بھی پیچھے چلا آیا۔ زورا اور جمرو وغیرہ اُس سے [...] تھے، انھوں نے ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھنے کے سوا [کوئی حرک]ت نہیں کی۔

[تج]ھل کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کے آکا کے رگ و پے میں جیسے بجلی [...]کر اُچھالنے کے انداز میں اُس نے دو چار مرتبہ چاقو اوپر [...] اور کئی مرتبہ آناً فاناً اِس ہاتھ سے اُس ہاتھ میں منتقل کیا۔ [...]زی سے کہ نظر ٹھہرتی ہی نہ تھی۔ گرفت میں خاصی لچک تھی اور [...] سے خوب تنا سا معلوم ہوتے تھے۔ تجھل بھی یہی کہتا تھا کہ دونوں [...]ک دوسرے سے بندھے ہونے چاہئیں جبھی چاقو روانی سے منتقل کیا [جا سکتا] ہے۔ وہ کہتا تھا کہ چاقو اُچھالنے والے کا ہاتھ دایاں بایاں نہیں [...] [ج]اننے کے مطابق آکا کے ہاتھ ایک دوسرے کا اشارہ سمجھتے تھے، چاقو [...]چلاتے اُن کی اپنی آنکھیں ہو گئی تھیں، تجھل نے آکا کی [...]ار نہیں بدلا اور نگاہوں نگاہوں میں اُسے تولتا ہوا آگے بڑھا۔ [...]ون سا طاری تھا، تجھل کی دو ایک جھپکیوں نے مہمیز کا کام کیا۔ [...]یں وہ اٹکنے کے بجائے وحشیانہ پن سے سیدھا تجھل کی طرف [...]س کی جھپٹ میں ایسی لپک جھپک تھی کہ تجھل کو اُچھل کے پیچھے [...] ایک طرف ہو جانا پڑا مگر آکا پل بھر میں رُخ بدل کے پھر اُسی [س]امنے سے چاقو بھونکنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ دوسری بار بھی تجھل کو [اُسی] طرح پہلو بچا لینا چاہیے تھا لیکن اُسے دیر ہو گئی۔ آکا اُس کے [...]ج گیا اور کانتے نے دیکھا کہ پیچھے ہٹنے یا اُسے روکنے کے بجائے [...]زی سے تجھل کچھ ہکا بکا نظر آیا۔ کانتے کے بہ قول اُس کے دل [نے دھڑ]کنا بند کر دیا تھا جب یک بارگی اُس نے تجھل کے ہاتھ سے [...]ونستا اور گھبراہٹ میں ڈگمگاتے اور ایک جانب گرتے دیکھا، پہلے [اُ]س کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ فرش پر چاقو گرنے کی آواز کانتے کے [کانو]ں دھماکے کی طرح گونجی۔

[اپ]نے زور میں آکا چند قدم آگے چلا گیا تھا، یک بیک وہ پلٹا، [...]اُس لمحے گرا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ کے بَل اُٹھنے کی کوشش [...] حد تک کامیاب ہو گیا تھا لیکن ابھی پوری طرح کھڑا نہیں ہوا تھا کہ [آکا] اُس کے سر پہ پہنچ گیا۔ کانتے کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ اُس نے [تج]ھل پر جھکتے اور چاقو والا ہاتھ دراز کرتے اور ساتھ میں تجھل کا [ہ]اتھ بلند ہوتے دیکھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے تجھل اس صورت [...]سا اوسان کھو بیٹھا ہے اور اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ آکا کو روکنے کے لیے [...]ہے مگر کانتے کو پلک جھپکنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی، جیسے ہی آکا [اُس] کی جانب جھکتے ہوئے چاقو والا ہاتھ دراز کیا، آدھے گرے اور

اُٹھے اُٹھے ہوئے تجھل کے جسم میں یکایک کوئی لہر سی اُمڈی پھر سب کچھ کانتے کی آنکھوں کی خیرگی میں منتشر ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں کی چندھیاہٹ دُور ہوئی تو اُس نے دیکھا کہ تجھل کا اُٹھا ہوا وہی ملتجی سا ہاتھ آکا کا پنجہ گرفت میں لیے ہوئے ہے۔

پنجا پکڑتے ہی تجھل نے کسی تاخیر کے بغیر آکا کا ہاتھ پیچھے کر کے اور ڈھیل دے کے کچھ اِس زور سے جھٹک کے کھینچا کہ آکا کے پاؤں زمین پر جمے نہیں رہ سکتے تھے، چاقو چھوٹنے کے ساتھ ساتھ وہ فرش پر گرا اور اس سے پہلے کہ دوبارہ سنبھلنے کی کوشش کرتا، تجھل نے جھٹ اپنا پیر اُس کی ٹھوڑی کا نشانہ لے کے مارا اور بڑی تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا اپنا چاقو اُس سے زیادہ نزدیک تھا۔ اُٹھتے ہوئے وہ اُسے فرش سے اُٹھانا نہیں بھولا تھا۔

صحن میں چاروں طرف کھڑے دم بخود لوگ اُس وقت اپنی سسکاریاں نہ روک سکے جب تجھل نے دوبارہ کھڑے ہو کے اپنا چاقو فرش سے اُٹھایا۔ اُن دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل ہوئے ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا۔ کسی کے سان گمان میں نہ ہوگا کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے یہ سب اتنی جلد گزر سکتا ہے۔ کانتے کی طرح اوروں کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہوگا کہ تجھل کے چاقو چھوٹنے اور فرش پر گرنے کا عمل ارادی تھا۔ سبھی نے تجھل کے پیر پر پٹی بندھی دیکھی تھی چنانچہ وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اُس کا پیر آکا کی تیزی کی ہڑبڑاہٹ میں رپٹ گیا ہے۔ ممکن ہے، وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے ہوں لیکن کانتے کے لیے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ تجھل کا چاقو اُس کی انگلیوں سے یوں چھوٹ سکتا ہے۔ تجھل کی انگلیوں میں آ کے چاقو کا اپنا کوئی زور نہیں رہتا تھا۔ اُسے یاد آ رہا تھا کہ پہلے چاقو گرا تھا، تجھل کے پیر بعد میں ڈگمگائے تھے۔ سب کچھ کسی ایک پل میں بکھرا ہوا تھا، ایک پل میں کانتے کیا کیا دیکھتا۔

اُس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں اور سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ جیسے جیسے اُس کے حواس یک جا ہو رہے تھے، گزرا ہوا سب کچھ ترتیب سے اُس کے ذہن میں اُجاگر ہو رہا تھا۔ سب کچھ نپا تُلا تھا۔ تجھل کے اچانک گرنے پر وحشت زدہ آکا کا موقع غنیمت جاننا اور اُس پر جھپٹنا لازم تھا۔ نیز دوسرے ہی لمحے فیصلے کی قوت کھو دینا بھی لازم تھا کیونکہ اُس کے مقابل کا چاقو اُس کے ہاتھ میں نہیں رہا تھا۔ یہ جان کے شاید وہ پیچھے ہٹ جاتا اور اڈّے کے کسی معقول دادا کی طرح تجھل کو سنبھلنے کا ایک موقع اور دیتا۔ بہت سے لوگوں کی موجودی میں اس فراخ دلی کا اظہار خود بہ خود ہو جاتا ہے۔ آکا ضرور پیچھے ہٹ جاتا لیکن تجھل کے بلند کیے ہوئے ہاتھ سے ایک قسم کی مزاحمت کا تاثر ملتا تھا۔ مزاحمت کرتے ہوئے مقابل کے سامنے رُکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آکا پھر بھی رُک جاتا مگر اُسے کچھ وقت نہیں ملا تھا۔ وہ اتنا مشتعل تھا کہ اپنے

آپ پر قابو پانے، اپنی نگاہیں سمیٹنے کے لیے اُسے کچھ وقت درکار تھا۔ دوسرے تجھل نے اپنا بلند کیا ہوا ہاتھ اچانک سمیٹ لیا تھا۔ اِس سے مراد یہی تھی کہ آکا کو اضطراری طور پر اپنا ہاتھ اور دراز کرنا پڑے۔ آکا نے یہی کیا، اُسے خیال نہیں رہا کہ تجھل کا پنجہ آکا کے مزید جھکنے اور اُس کا ہاتھ اور قریب آجانے کا منتظر ہے۔

کانتے نے بتایا مگر اِدھر تجھل کھڑا ہوا، اُدھر چند لمحوں کے تذبذب کے بعد فرش پر لوٹتا ہوا آکا کچھ دُور جا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ تجھل نے اس فرصت میں دو قدم گھوم کے آکا کا چاقو بھی فرش سے اُٹھا لیا تھا لیکن چاقو کے بغیر آکا پھر دیوانوں کی طرح بازو پھیلائے تُلا کھڑا تھا اور بس کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ اُس کی انگارا آنکھوں میں غضب کے ساتھ حیرانی بھی شامل ہوگئی تھی۔ تجھل نے اُس کا چاقو اُس کی طرف اُچھال دیا۔ آکا نے چاقو اُچکنے میں تساہل نہیں کیا۔ اُس کے جسم کے ہیجان سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس نے یہ سب کچھ اتفاق پر محمول کیا ہے۔ دوبارہ اُس میں پہلے سے زیادہ آگ بھری ہوئی تھی۔ اُس نے کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا، پہلے کی طرح آندھی کے مانند تجھل کی جانب اُمڈا۔ تجھل طرح دے کے اور گھوم کے دوسری جانب ہوگیا۔ آکا نے فوراً اپنا چاقو دوسرے ہاتھ میں جدھر تجھل کا رُخ ہوگیا تھا، منتقل کرلیا اور جیسے جیسے تجھل اُس سے پہلو بچاتا رہا، چاقو اُس کے رُخ پر رکھنے کے لیے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پھرتی سے تبدیل کرتا رہا۔ ایک لمحے اُس کا چاقو اِس ہاتھ میں ہوتا، دوسرے لمحے اُس ہاتھ میں۔ یہ اپنی مہارت کی نمائش کا وقت نہیں تھا۔ اُس کی منشا یہی ہوسکتی تھی کہ شاید تجھل کسی ایک جگہ گڑبڑا جانے کی کوئی چوک کر بیٹھے۔ تجھل نے اُس کے اور اپنے درمیان گھومتے رہنے کے باوجود ایک فاصلہ برقرار رکھا تھا اور کانتے کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جلد جلد رُخ بدل کے آکا کو بار بار چاقو بدلنے پر دانستہ اکسا رہا ہے۔ آکا کچھ اپنی مشاقی کے زعم میں آگیا تھا۔ پھر صحن میں یہاں سے وہاں، اِس جگہ سے اُس جگہ تھرکتے، پینترے بدلتے ہوئے تجھل ایک جگہ یکایک رُک گیا، آکا نے اپنی روش کے مطابق اُسی کے رُخ چاقو بدلنے کے لیے اپنے دوسرے ہاتھ کی طرف اُسے اُچھالا لیکن ابھی اُس نے چاقو پھینکنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ تجھل نے اُچھل کے اُس کے چاقو والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ تجھل کا پنجہ پڑنے کی مدت میں آکا چاقو اُچھال چکا تھا، اُس کی روانی اور چابک دستی دیکھتے ہوئے اُس کے دوسرے ہاتھ میں چاقو آجانا چاہیے تھا مگر درمیان میں یہ ناگہاں رخنہ پڑ جانے سے آکا کے دونوں ہاتھوں میں توازن قائم نہیں رہ سکا۔ چاقو پھینکنے والا ہاتھ درہم ہو جانے اور کھنچ جانے پر چاقو تھامنے والا ہاتھ لازماً متاثر ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بندھے نہ رہ سکے اور چاقو چھناکے کے ساتھ فرش پر گر

کانتے بتا رہا تھا کہ بس کوئی جھماکا سا ہوا تھا۔ لوگوں پر سکتہ سا طاری تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ وہ اُستاد کو یوں بار بار دیکھ کے پہلے ہی کھٹک گیا تھا کہ اُستاد کے ذہن میں کچھ نہ کچھ وہ جستجو میں تھا کہ آخر وہ کون سی بات ہوسکتی ہے کہ محض ایک میں سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ ساری بات وقت کے تعین کی تھی یہ تھی کہ تجھل اُسی وقت اپنا ہاتھ بڑھائے جب آکا چاقو اُچ ہو۔ اس سے پہلے تجھل نے خود کو یہ یقین دلایا ہوگا کہ اس بار بھی پینترا بدلنے پر آکا ایک سے دوسرے ہاتھ میں چاقو بدلنے کا رکھے گا۔ وہ سیمابی حالت میں تھا اور تجھل کے لیے یہ تعین کرنا نہیں تھا۔ وہ اُس کے اُس ہاتھ پر بھی پنجہ مار سکتا تھا جس آنے والا تھا لیکن محفوظ طریقہ یہی تھا کہ چاقو چھوڑنے والے نشانہ بنایا جائے کیونکہ چاقو چھوڑ دینے کے بعد اُس کی تن دہی میں یقیناً فرق آجاتا ہے، وہ ایک طرح سے بری الذمہ ہو جا اُس کے مقابلے میں دوسرا چاقو پکڑنے والا ہاتھ زیادہ فعال ہو ہو جاتا ہے۔ ذرا بھی دیر ہو جاتی تو چاقو آکا کے دوسرے ہاتھ اور صورتِ حال یکسر مختلف ہوتی۔ تجھل کو پھر اپنی مدافعت اور تدبیر سوچنی پڑتی جو ضرور اُس کے ذہن میں ہوگی۔

تجھل کے ہاتھ میں اپنا چاقو تھا اور وہ آکا کے جسم کے حصے میں اُسے اُتار سکتا تھا۔ چاقو گرنے پر آکا نے بدحواسی میں غلطی کی، اُس نے چاقو زمین سے اُٹھانے کے لیے جھکنا چاہا۔ تجھل اِس کی مہلت نہیں دی اور اُس کے کولھے کے قریب گھٹنا مارا لڑکھڑا کے سنبھل گیا تھا لیکن تجھل نے اس جانب اپنا ہاتھ لہرا کے اُسے متذبذب کیا تو دوسری طرف اپنے خالی ہا اُس کی گردن پر ضرب رسید کی اور کوئی وقفہ دیے بغیر پے بہ ضربیں لگا کے آکا کو پیروں پر نہیں کھڑے ہونے دیا مگر تجھل ہاتھ رکنے کی دیر تھی، آکا تیزی سے فرش پر کروٹ میں بدلتا ہوا اُس کا چاقو تجھل کے پیروں کے پاس پڑا تھا۔ اُسے دوبارہ اپ میں لیتے ہوئے تجھل کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ کسی کو تو ہوگی کہ آکا دُور جا کے پھر اُٹھ کھڑا ہوگا، تجھل ہاتھ نہ روکتا تو موقع کبھی نہ ملتا لیکن تجھل نے جیسے اُسے خود یہ موقع فراہم کیا سبھی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے جب تجھل نے آکا کا چاقو اُس ہو جانے پر دوبارہ اُس کی طرف اُچھال دیا، اِس بار آکا کی گرفت بے شک وہ پھرتی نہیں تھی لیکن چاقو ہاتھ میں آنے کے بعد جنونی ہوگیا۔ اُس نے دائیں بائیں کچھ نہیں دیکھا، پھر سامنے کی جست لگاتا تجھل پر وار کرنے کے لیے لپکا۔ اُس کی رفتار میں بجلی

تی تجھل کے لیے بھی شاید اُس کی یہ تیزی حیران کن ہو۔

سی کے یوں منہ اُٹھائے آنے کی صورت میں مقابل کو فوراً ئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے ورنہ ذرا سے تذبذب سے درمیانی فاصلہ تنگ ہو جاتا ہے۔ سیدھے عموماً اُسی وقت آیا جاتا ہے جب پیچھے نے کے لیے مقابل کے پاس جگہ تنگ ہو اور وہی شخص سیدھا آتا ہے اپنی رفتار تیز کرنے کے ساتھ ساتھ وقت پر اُسے قابو میں کر لینے اعتماد بھی ہو چونکہ مقابل کے پاس پہنچ کے اُسے بہرحال اپنی رفتار نی پڑتی ہے، مقابل کسی بھی حالت میں کسی کو اپنی جانب اس ح بڑھتا دیکھ کے ساکت کھڑا نہیں رہ سکتا، فاصلہ پینترا بدلنے طرف ہو جانے کی اجازت نہ دیتا ہو تو عام طور پر چاقو سیدھ کر دیا جاتا ہے، حملہ آور پھر خود ہی دوسری طرف ہو جاتا ہے ہر چند تجھل کے پاس وقت تھا اور وہ آکا کی سیدھ سے ہٹ کے اِدھر اُدھر سکتا تھا۔ جس وقت آکا صحن کے دوسرے سرے سے چلا تھا، اُس کے ر تجھل کے درمیان فاصلہ کم نہیں تھا، تقریباً پورے صحن کا فاصلہ تھا ر تجھل نے نہ تو اپنا رُخ بدلنے کی کوشش کی، نہ اپنا چاقو آکا کی ت باندھ کے رکھا، اِس کے برعکس وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس ح اُس کے لیے پیچھے رُخ بدلنے کی گنجائش اور کم ہوگئی۔ اُس کا یہ اقدام کا کے جنون کے لیے نہایت حوصلہ خیز ثابت ہونا چاہیے تھا، کوئی ی مقابل اِسے اپنے لیے ایک خوش آیند علامت تصور کرتا۔ تجھل کا صد بھی اپنے مقابل کے عزم کو اور تقویت دینا ہی تھا۔ اُسے آکا کو ک خاص دوری تک اُسی تیزی سے آنے دینا تھا۔ آکا جب صحن ے درمیان تک آگیا، یکایک تجھل نے آکا کی سمت، اُسی کی سیدھ میں بے تحاشا جست لگائی، تجھل کے بڑھتے وقت آکا درمیان میں تھا، دیکھ کے وہ خود کو یک لخت نہیں روک سکتا تھا۔ کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا، رکتے رکتے بھی چند قدم اُسے اپنی جھونک میں آگے بڑھ نا تھا اور اس صورت میں تجھل سے اُس کا ٹکرا جانا لازم تھا۔ اُس کے لیے یہی چارۂ کار رہ گیا تھا کہ اب جو بھی نتیجہ ہو، وہ تجھل سے پنجہ آزما ہو جائے اور اپنی رفتار قابو میں کرنے کی کوئی لغزش نہ کرے۔ اس موقع ر رُخ بدلنے کی کوئی کوشش بہت مہلک ہوسکتی تھی۔ تجھل نے اُسے س کوشش کی مہلت نہیں دی تھی۔ کانتے کی طرح سبھی کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ دوسرے لمحے دونوں کے متصادم ہو جانے کے بارے میں ی کو کوئی شک نہیں رہا تھا اور تصادم کے نتیجے میں کچھ بھی ممکن تھا۔ امکان دُور دُور تک کسی کے تصور میں نہ ہوگا کہ تجھل اس تیز رفتاری سے آنے کے باوجود ایک دم بیٹھ جائے گا۔

بس ایک آن کی کسر رہ گئی تھی، تجھل اچانک بیٹھ گیا۔ آکا واقعی اُس کے سر سے ٹکرایا تھا مگر کچھ مختلف طور سے۔ تجھل نے بیٹھے بیٹھے اپنا چاقو چھوڑ دیا تھا اور دونوں ہاتھ تیار رکھے تھے۔ اُس کے بڑھنے سے پیچھے جگہ ویسے ہی کشادہ ہوگئی تھی۔ آکا اُس کے سر سے گزر کے دوسری جانب کمر کے بل گرا۔ تجھل نے اُس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کے انھیں فرش سے اکھاڑ کے اپنے پیچھے پھینک دیا تھا۔ یوں خود اُس کے لیے آگے راستہ بن گیا تھا۔ وہ جھکتا ہوا اُٹھا اور کچھ دُور جا کے پلٹ کر کھڑا ہوگیا۔

آکا کا سر فرش سے ٹکرایا تھا اور بھی کئی جگہ چوٹ آئی ہوگی۔ چند لمحوں تک سکوت چھایا رہا مگر دیکھتے دیکھتے وہ سر جھٹکتا، پھڑپھڑاتا ہوا کھڑا ہوگیا اور بے محابا سامنے کی طرف دوڑا، سامنے اڈے کے آدمی کھڑے تھے۔ عجب تھا کہ وہ اُن میں سے کسی کے سینے میں چاقو اُتار دیتا۔ لوگوں کو کچھ یہی خوف محسوس ہوا تھا اسی لیے وہ ہڑبڑاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ اسی دوران آکا کو بھی کچھ ہوش آگیا تھا، اُس نے مڑ کے تجھل کو دیکھا اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ جتنی دیر میں وہ اُٹھ کے دوبارہ سامنے آیا، تجھل اُس کے قریب پہنچ سکتا تھا لیکن اپنی جگہ جما رہا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ شاید اب آکا اپنا چاقو پھینک دے گا۔ اُسے پھینک ہی دینا چاہیے تھا، پسینے سے اُس کا چہرہ شرابور تھا اور دائیں کنپٹی سے خون چھلک رہا تھا، سانس پھولی ہوئی تھی مگر وہ کسی اور مٹی کا بنا ہوا تھا، پہلے کی طرح چنگھاڑتا وہ پھر تجھل کی جانب بڑھا۔ اِس بار اُس کا چاقو اُس کے ہاتھ ہی میں رہا۔ لگتا تھا کہ اُس نے ساری توجہ چاقو گرفت میں رکھنے پر دی ہے۔

وہ دائیں بائیں، اُوپر نیچے تلوار کے مانند چاقو چلا رہا تھا جیسے ہواؤں کو کاٹ رہا ہو۔ تجھل اُس کے آڑے نہیں آیا، بچتا ہی رہا۔

اب بہت کچھ کانتے کی سمجھ میں آرہا تھا کہ تجھل کے اجتناب اور تاخیر کا کیا سبب ہوسکتا ہے۔ وہ آکا کی بچی کھچی چنگاریاں بھی ٹھنڈی کر دینا اور اُسے زندہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ کئی مرتبہ کی ناکامی سے آکا کے ہاتھ پیر بہکنے لگے تھے۔ کانتے کو تجھل کی دیر طلبی سے اُلجھن ہو رہی تھی۔ جتنی دیر تک آکا سامنے تھا، تجھل کے پیر پر دباؤ پڑ رہا تھا لیکن تجھل کو اپنے پیر کا خیال یقیناً کانتے سے زیادہ ہوگا۔

تجھل کے سامنے صرف آکا نہیں تھا۔ اڈے کے آدمی بھی تھے جن سے جلد ہی کسی وقت اُس کا واسطہ پڑنے والا تھا۔ تجھل نے تھانے میں کانتے سے زیادہ نہیں سُنا تھا، یہاں حیدر آباد میں اپنے پیچھے گزرنے والے صبح و شام سے وہ بھی اتنا ہی لاعلم تھا، جتنا کانتے۔ وہ اڈے پر خاموشی سے بھی آسکتا تھا لیکن گلی کے لوگوں کو ساتھ لے چلنے اور اڈے پر آکے اُن کی نفری بڑھ جانے کا انتظار کرنے سے اُس کی مراد اڈے کے آدمیوں کو اُن کے موجودہ دادا کا رتبہ بتانا اور زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو گواہ بنانا ہی نہیں تھا بلکہ آکا کو اُس کی حیثیت

کا احساس دلانا بھی مقصود تھا۔ اڈّے کے آدمیوں کی موجودی میں اُستاد، دادا بھی کی طرح اپنے مقابل کو برتتا ہے کیونکہ اگر آکا کی ہزیمت سے اڈّے کے آدمی کوئی لذّت محسوس کر رہے تھے تو انھیں یہ سامان دیر تک مہیا کرتے رہنا چاہیے تھا اور جن کی تحویل میں مَیں اور پیرو تھے، تجّل کو اُن لوگوں تک بھی کچھ منتقل کرنا تھا کہ یہ سب کچھ کسی حادثے، آکا کی کسی چُوک یا اتّفاق پر مبنی نہیں ہے۔ شاہ کبیر کے واقعے سے اُن پر کوئی تاثر قائم تھا تو ان حالات میں تجّل کو وہ تاثر رسوا ہی کرنا تھا۔

آکا کی کنپٹی سے بہتا ہوا خون اُس کے چہرے پر آگیا تھا۔ اُسے اندھا دُھند ہاتھ چلاتے اور تجّل کو اپنا جسم اُس کی پہنچ سے دُور رکھتے صحن میں اِدھر سے اُدھر گھومتے، اُچھلتے دیر ہو گئی تو اُس نے پہلی مرتبہ رُک کے سامنے سے آکا کی کلائی پر ہاتھ ڈالا اور نیچے کی جانب زور سے جھٹکا دیا، آکا کی کرب ناک چیخ عمارت کے باہر تک گونجی ہو گی۔ چاقو تو اُس کے ہاتھ سے چھوٹا ہی تھا، وہ خود بھی اپنے بس میں نہیں رہا اور لڑکھڑاتا ہوا فرش پر گر پڑا۔ وہ وحشت میں بار بار اپنا ہاتھ جھٹکتا تھا اور اُس کی کراہیں عمارت کے در و بام میں سسک رہی تھیں۔ کانتے نے پہلی بار تجّل کے ہاتھوں میں لرزش دیکھی، اُس کا چہرہ بھی سُلگ رہا تھا تاہم وہ لمحوں منجمد کھڑا آکا کو گھورتا رہا۔ آکا کے پنجے کی ہڈی یا تو ٹوٹ گئی تھی یا اپنی جگہ نہیں رہی تھی جبھی وہ اپنی کراہیں روکنے پر قادر نہیں تھا۔ وہ دوبارہ خود نہیں اُٹھا، تجّل نے اسے گُدّی سے پکڑ کے کھڑا کیا اور اُس کے شانے پر ترچھا ہاتھ مارا۔ آکا تڑپتا ہوا گر گیا تھا، تجّل نے اُسے پھر اُٹھا لیا اور اُس کے پیٹ میں گھٹنے سے ضرب لگائی۔ وہ دُہرا ہو کے فرش پر تڑپنے لگا، تجّل نے آگے بڑھ کے اُس کے بال پکڑ لیے اور سر جھنجوڑتے ہوئے بولا "شاہ کبیر کے وقت تُو اِدھر نہیں تھا نا؟"

آکا کو جواب کا یارا نہیں تھا۔ تجّل نے انتظار بھی نہیں کیا، چاقو ڈال کے اُس کا گریبان چاک کر دیا۔ "لگتا ہے اُس وقت جو اَدھورا رہ گیا تھا، وہ تیرے سے پورا کرنے کو لکھا تھا۔"

آکا کی پیشانی خون سے لال ہو گئی۔ خون اُتر کے اُس کی بھویں اور آنکھوں میں بھی بھر گیا۔ اُس کے ایک ہاتھ کو پہلے ہی قرار نہیں تھا، دوسرے سے وہ پیٹ پکڑے ہوئے تھا۔ تکلیف کی شدت ہی ہو گی کہ اُس کی آواز گھٹ کے رہ گئی لیکن اُس نے سُن لیا ہو گا کہ تجّل نے کیا کہا ہے، اُس کا مطلب بھی شاید اُس کی سمجھ میں آگیا تھا چنانچہ اُس کا پھڑ پھڑاتا جسم سمٹنے اور اکڑنے لگا۔ "وہ کنجر کا جنا شاہ کبیرا وقت پہ ہانڈ گیا تھا۔ سالے کو لگا آگئی تھی پر تیری کھال اس سے موٹی ہے، اچھل کود بھی تجھ کو اُس سے اچھی آتی ہے، ذرا اُتار کے نرت جمائے گا تو یہ تیرے ماں کے یار کچھ دیر تک یاد رکھیں گے کہ آیا تھا ایک

دادا، اُنھوں نے تیرا بہروپ دیکھا ہے۔ اب ذرا اصلی رو[پ]
اِن کو ٹھمکا لگا کے بتا۔"

تجّل کی سرد آواز اور اُس کے جلتے ہوئے لہجے سے [...]
ہو چلا تھا کہ کہیں اُس کے دماغ میں آکا کو برہنہ کرنے کا [...]
سما گیا ہے۔ پھٹے ہوئے گریبان سے آکا کا سینہ جھلک رہا تھا۔ [...]
لمحوں کی بات تھی کہ تجّل اُس کے لباس میں دوبارہ چاقو [...]
کھینچتا چلا جائے مگر تجّل نے چاقو پیچھے اُچھال دیا۔ اُس [...]
کا خیال کر کے چاقو پیچھے اُچھالا تھا، چاقو کانتے ہی کے پاس [...]
تھا، کانتے نے اُسے زمین پر نہیں گرنے نہیں دیا۔ آکا کے [...]
جھٹکے دے کے تجّل نے اُس کے بال چھوڑ دیے اور آہستہ [...]
چوکی کے سرے پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔

چند لمحوں تک اڈّے پر موت طاری رہی، پھر اُن [...]
میں اُس وقت حرکت سی نظر آئی جب تجّل نے کالے داد[ا کو]
پاس آنے کا اشارہ کیا، کالے دادا بُری طرح سٹ پٹا گیا [...]
پیروں سے وہ اُس کے پاس پہنچا اور سر جھکا کے کھڑا ہو گیا [...]
بدبداتے ہوئے اُسے کوئی ہدایت کی۔ کالے دادا کے سوا کو[ئی]
سکا۔ اُسی لمحے اڈّے کے تمام آدمی اپنی جگہوں سے اُمڈ آ[ئے]
کے گرد جمع ہو گئے۔ انھوں نے اُس کے قدموں میں چاقو ڈا[لے]
مگر تجّل نے اُنھیں منع کر دیا۔ "ابھی اپنا اور اُس کا تھوڑا احسا[ب]
ہے، چکتا کر کے ہی تم سے بات کریں گے۔" اُس نے گھن گھنا[تے]
کہا۔ "ابھی کالے ہی اِدھر سب دیکھے گا۔"

کانتے بتا رہا تھا کہ کالے دادا اور اڈّے کے دوسر[ے]
کرا اُٹھا کے اندر ایک کمرے میں لے گئے۔ کچھ دیر بعد تجّل بھی [...]
چھپکا مار کے وہیں چلا گیا۔ کانتے سے اُس نے ساتھ آنے کو [...]
تھا اِس لیے وہ باہر ہی ٹھہرا رہا۔ تجّل کے اندر جانے پر کال[ے]
اور اُس کے ساتھی فوراً واپس آگئے۔ صرف تجّل اور آکا [...]
رہ گئے تھے۔ بند دروازے سے صرف ایک مرتبہ آکا کی گھٹی ہو[ئی]
سُنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔ کانتے پر ایک ایک لمحہ بھاری [...]
تھا۔ گو تجّل کو باہر واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور اُ[س کے]
چہرے پر کوئی ایسی علامت نہیں تھی جو کانتے کی مضطرب نگا[ہ]
کے لیے کسی سکون کا سبب بنتی۔ باہر آکے تجّل نے کالے دادا [...]
وقت پوچھا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ اُس نے کالے دادا کو [...]
کی کہ اُس کی واپسی تک تمام لوگ اڈّے پر موجود رہیں پھر [...]
نظریں دوڑاتے ہوئے اُس نے ایک آدمی کی جانب اُنگلی اُٹھا[ئی]
چھریرے جسم کا نوجوان تھا۔ اُس کا نام مَولا تھا۔ مَولا سر تا پا لرز[تے]
تجّل کے پیر پکڑ کے فرش پر بیٹھ گیا۔ زودا، جمرو، شامو اور ڈنگو [...]

[...]ہ گئے۔ زودا بمبئی میں چھنگا اُستاد کے بے دخل ہو جانے کے بعد
[...] آداد بکھار رہا تھا اور لوگوں کو اچھی طرح قابو میں رکھ سکتا تھا۔ تجّل نے
اُس سے ہی کہا ہو گا لہٰذا وہ فوراً چوکی پہ جا کے بیٹھ گیا۔ اندر کمرے
سے آکے تجّل نے تین چار منٹ سے زیادہ نہیں لگائے ہوں گے کہ
کانتے اور مَولا کو ساتھ لے کے عمارت سے چلا آیا۔

وہ چوک کے عام راستے کے بجائے گلیوں میں گھومتے ہوئے جلد
[...]ی سڑک پر آگئے۔ مَولا نے بھاگم بھاگ آگے جا کے ایک رکشا والے
سے بات کی اور تینوں ایک ہی رکشا میں بیٹھ گئے۔ وہ ٹھُسے ہوئے
بیٹھے تھے۔ رکشا چلانے والا بھی اُن کے وزن سے ہانپ رہا تھا۔
[...]یار مینار کے قریب اُنھیں جھٹکا سواری بھی نظر آئی، "تانگا بھی تانگے
کا گھوڑا نسبتاً تگڑا تھا اِس لیے وہ رکشا سے اُتر کے تانگے میں سوار
ہو گئے۔ تانگے والے نے تکرار کی مگر مَولا کا چاقو دیکھ کے ٹھنڈا پڑ
گیا۔ تجّل نے بیٹھتے ہی پانچ روپے کا نوٹ اُس کے حوالے کر دیا، پھر
تو اُس کی رفتار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ راستہ بھی صاف تھا، اِکّا دُکّا
سواریاں چل رہی تھیں۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ اپنی منزل کے سامنے
تھے۔ اُس وقت پونے بارہ بجے ہوں گے۔ کانتے کو کچھ معلوم نہیں تھا
کہ وہ کہاں آئے ہیں، راستے میں مَولا کی وجہ سے اُس نے کچھ پوچھنے
کی کوشش نہیں کی تھی۔ ویسے بھی شاید وہ خاموش ہی رہتا کیونکہ تجّل
کی مرضی کے بغیر اُس سے کچھ جاننا ممکن نہیں تھا۔ کانتے کا دل جیسے
کسی نے مٹھی میں بند کر رکھا تھا۔ تانگا جس جگہ جا کے ٹھہرا، وہ کسی حویلی
کا دروازہ ہی ہو سکتا تھا۔

"حویلی کا دروازہ! تم، تم ...." میں نے جھرجھراتی آواز میں اُس
سے پوچھا۔ اتنی دیر تک میں اپنے آپ کو جبر سے بٹھا رہا تھا کہ میری
مداخلت سے کانتے کے تسلسل میں کوئی لکنت نہ آ جائے مگر کانتے
کی زبان پر حویلی پہنچنے کا ذکر میرے کانوں کے لیے عجوبہ تھا۔ میں چُپ
نہ رہ سکا۔

"ہاں لاڈلے!" وہ تھکی تھکی آواز میں بولا۔ "وہ حویلی کا دروازہ
ہی تھا۔ نواب کی حویلی کا۔"

"یعنی تم، تم وہاں تک گئے تھے؟" میری زبان اٹک رہی تھی۔
"یہی تو بول رہا ہوں، رات سالی بہت اُوپر ہو گئی تھی۔ میں نے
اُستاد کو ٹوکنا چاہا کہ ایک رات اور کاٹے دیتے ہیں، سویرا ہوتے ملیں
گے لیکن ہم وہاں پہنچ ہی گئے تھے تو میرا کچھ بولنا بالکل بے کار جاتا
سالا اُستاد مان کے نہیں دیتا۔" کانتے کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ شامو
نے اُٹھ کے چارپائی کے پاس رکھی ہوئی صُراحی سے ایک کٹورا پانی لا
کے اُسے دیا۔ کانتے نے ایک ہی سانس میں پورا کٹورا اُتار لیا۔
مجھے یقین نہیں آ رہا تھا مگر کانتے مذاق نہیں کر رہا تھا۔ اُس

کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ جس رات کی بات کر رہا تھا، اُس دن
ہمیں تہ خانے سے ملازموں کے حصّے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ گویا پیرو کا
اندازہ بالکل صحیح تھا۔ کسی یقین ہی کی بنیاد پر وہ اتنا پُر امید نظر آتا
تھا۔ کانتے کے وقفے سے مجھے بے چینی ہو رہی تھی، دل بُری طرح
دھڑک رہا تھا۔ مجھے لگنگ دیکھ کے اُس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ
نمودار ہوئی، کہنے لگا کہ حویلی خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دروازے کے
چوکی دار بندوقیں لیے ہوئے تھے۔ وہ اُنھیں دیکھ کے بہت حیران ہوئے۔
تجّل نے اُن سے کہا کہ وہ پردیسی ہیں اور بڑے نواب سے اِسی وقت
ملنا چاہتے ہیں۔ چوکی داروں نے ہچر مچر کی تو تجّل کو سختی اختیار کرنی
پڑی۔ اُس نے اُن سے کہا کہ نواب کی بھلائی اِسی میں ہے کہ جو کچھ
ہم کہہ رہے ہیں، تم اُتنا ہی اُس سے جا کے کہہ دو اور کہو کہ ہم چھوٹے
نواب کے متعلق کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ سویا ہوا ہو
تو اُسے جگا دیا جائے۔

چوکی دار نے دوسرے چوکی دار سے چپکے چپکے مشورہ کیا اور
اُنھیں وہیں ٹھہرا کے اندر چلا گیا۔ اُس کے چلتے وقت تجّل نے اُسے
تاکید کی تھی کہ وہ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے اور جیسا کہ تجّل نے
کہا تھا، اُنھیں اُتنا ہی انتظار کرنا پڑا جتنی دیر میں دروازے سے عمارت
کی طویل گزرگاہ عبور کر کے کوئی اندر جا کے واپس آ سکتا ہے، اُنھیں
اندر طلب کر لیا گیا تھا۔ دونوں جانب مسلح چوکی دار اُن کے ساتھ تھے۔
اُنھیں عمارت کے چبوترے پر سامنے کے ایک وسیع و عریض کمرے
میں بٹھا دیا گیا۔ تجّل نے مَولا کو باہر راہ داری میں چھوڑ دیا تھا۔ کانتے
کہہ رہا تھا، اُسے توقع نہیں تھی کہ نواب دو اجنبیوں سے اِس وقت
ملاقات پر آمادہ ہو جائے گا۔ حویلی کی شان و شوکت سے ظاہر ہو رہا
تھا کہ وہ کوئی بڑا نواب ہے۔ کانتے کو اصل بات کا کچھ اندازہ نہیں
تھا، طرح طرح کے وسوسوں سے اُس کا دماغ گھرا ہوا تھا۔ اُنھیں کمرے
میں بیٹھے چند منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے کہ اندرونی دروازے
سے آگے پیچھے دو بھاری بھرکم شخص آگے پیچھے برآمد ہوئے۔ وہ بظاہر
آہستہ آہستہ اندر آئے لیکن اُن کے چہروں سے اضطراب صاف ظاہر
تھا۔ تجّل کھڑا ہو گیا اور کسی تعارف و تمہید کے بغیر آگے آنے والے
شخص سے بولا۔ "کیا آپ ہی بڑے نواب ہو؟" اُس نے اضطراری
انداز میں سر ہلا کے اقرار کیا اور تجّل سے بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ وہ خود
بھی قریب کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ہم کو آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔ اِن کو بولو کہ ابھی کچھ دیر
کے لیے اِدھر سے چلے جائیں۔" تجّل نے اُس کے پیچھے آنے والے کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔" نواب گونجیلی آواز میں بولا۔

"پر ہم کو صرف آپ سے بات کرنا ہے۔"
نواب نے کچھ توقف کیا اور متجسس نگاہوں سے تجمل کو گھورتا رہا پھر اُس نے اپنے ساتھ آنے والے شخص کو اشارہ کر دیا۔ اُس کے جاتے ہی تجمل نے کہا "دیکھو نواب صاحب! ہم کو کئی زبان میں بات کرنا آتا ہے لیکن ہم سیدھی اور صاف زبان میں بات کر رہے ہیں، اس بھروسے پر کہ آپ بھی اُس کا ویسا ہی جواب دو گے۔"
"کیا بات ہے؟" نواب نے منتشر لہجے میں کہا۔
"بات آپ کے لیے اتنی بڑی نہیں جتنی اپنے لیے ہے لیکن آپ کے لیے بھی کسی وقت بہت بڑی ہو سکتی ہے۔ ہم اپنے دو آدمیوں کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔"
"کیسے آدمی؟" نواب نے تلخی سے کہا۔
"ہم کو معلوم تھا، آپ یہی جواب دو گے لیکن ہم یہ سننے کے لیے اِدھر نہیں آئے ہیں۔"
"آپ، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"
"ہم جو بول رہے ہیں، سوچ سمجھ کے بول رہے ہیں۔ اتنا بہت سمجھو کہ ہم حویلی میں سیدھے راستے سے آئے ہیں اور آپ سے اپنے دو آدمیوں کے سوا کچھ نہیں مانگ رہے۔ اُن آدمیوں کو چھوڑنے کا حکم کر دو نواب صاحب! آپ سمجھتے ہو کہ وہ خانم تک پہنچنے کا کوئی رستہ بن سکتے ہیں تو یہ آپ کی بھول ہے، وہ مر جائیں گے اور ایسے آپ کو خانم کے بارے میں کچھ نہیں بولیں گے۔ آپ نے اُن دو کو ادھر ڈال کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے۔ وہ ایک دو نہیں ہیں، آپ گنتی کرتے کرتے تھک جاؤ گے اور وہ سب ایسے ہیں کہ اُن کو لَوٹ کے پیچھے دیکھنا نہیں آتا۔"
"آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" نواب نے تمتماتی آواز میں کہا۔
"غلط فہمی آپ کو ہوئی ہے۔" تجمل نے تندی سے کہا۔ "دیکھو نواب! فضول کی بات مت کرو۔ چھوٹے نواب کے حال کا تھوڑا بہت پتہ اپنے کو چلا ہے پر اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کاٹ کھانے کو دوڑ چلو۔ اپنے آدمی کو آزاد کر دو نواب صاحب! خانم کے بارے میں آپ کو کوئی بات کرنی ہے تو ہم سے بولو۔"
"جہاں تک آپ کے آدمیوں کا تعلق ہے، ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو دھوکا ہوا ہے۔" نواب نے سخت لہجے میں کہا پھر پہلو بدل کے بولا "لیکن دوسری بات بے شک صحیح ہے، ہمیں خانم کی ضرورت ہے، کسی بھی قیمت پر۔"
"قیمت پر؟" تجمل بھڑک کے بولا "آپ کیا قیمت چکا سکتے ہو نواب؟ ذرا زبان سنبھال کے بولو خانم کا نام لیتے ہوئے تم کو دھیان

رکھنا چاہیے کہ اُس کے رکھوالے تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔ [illegible] مال نہیں ہے، وہ کسی گھر کی عزت ہے، ہمارے گھر کی۔ [illegible] آپ کے ہاں لگتی ہوگی، اپنے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔"
"ٹھیریے ٹھیریے، ہماری گزارش ذرا تحمل سے [illegible] لہجہ یکایک بدل گیا۔ "اگر آپ واقعی خانم سے تعلق رکھ[illegible] کیجیے، ہمیں آپ کا شدت سے انتظار تھا۔ ہو سکے تو [illegible] قیمت سے کچھ اور نہیں، محض اپنی طلب کا اظہار مقصو[illegible] سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اور کس طرح آپ کو اپنی مجبوری [illegible] سے تفصیل مت پوچھیے، بہتر ہے کہ ہمارے ساتھ چل کے [illegible] کو دیکھ لیجیے اور خود کوئی فیصلہ کر لیجیے۔" وہ بے چینی سے [illegible] آواز بھرا رہی تھی۔ "ہمیں بہرصورت خانم مطلوب ہیں [illegible] چھوٹے نواب کا مداوا بن سکتی ہیں۔"
"آپ کو اتنا بولنے کی ضرورت نہیں ہے، کچھ اپنے [illegible] دیتا ہے، اپنے آدمیوں کو گروی رکھنے کے پیچھے کوئی ایس[illegible] ہو سکتی ہے، رشتے داری تو چھوٹے نواب سے نہیں نکلتی کوئ[illegible] نواب کو ہم نے خانم کو اِدھر سے لے جاتے وقت دیکھا [illegible] وقت واپس چلے گئے تھے پر ہم اُسی وقت کھٹک گئے [illegible] آدھے ہو کے واپس گئے ہیں۔ ہم نے سب کچھ خانم کی مر[illegible] دیا تھا، اُس کو پورا اختیار تھا کہ اپنے ساتھ جانے کا فیصلہ [illegible] نواب کے ساتھ۔ اُدھر تبھی ساری بات طے ہو گئی تھی۔"
"ہمیں معلوم ہے کہ کچھ ایسا ہی ہوا تھا لیکن یہاں کچ[illegible] نواب گرفتہ لہجے میں بولا۔ "ہم آپ کو کیا بتائیں۔"
"نواب لوگ کی بات ہے، اپنی گدّی اوپر ہی چڑھ[illegible] آتا ہے اُن کو، مونچھ کچھ نیچے کھسک گئی تھی چھوٹے [illegible] کار[illegible] ہی سالی بہت منہ چڑاتی ہوگی۔ لگتا ہے تنکا کھٹکنے کے بجا[illegible] چھوڑ تا گیا۔ خانم کے جانے کے بعد بازار چوپٹ نہیں ہو گیا۔ لوگ سلامت رہیں، روز ایک سے ایک نئی نویلی پری جان او[illegible] چڑھائی جاتی ہے۔"
"ایسا نہیں ہے جس طرح آپ سوچ رہے ہیں، بخدا [illegible] ہے۔" نواب نے التجائی لہجے میں کہا۔ "خانم کی دوری کے [illegible] گزرتے گئے، چھوٹے نواب اُن کے اور قریب ہوتے گئے [illegible] حالت روز بہ روز ناقابلِ برداشت ہوتی گئی۔"
"پھر اتنے دِنوں کی رگڑ گھس کے بعد آپ کو لاٹری [illegible] خانم کے دو بھیدی آپ کو دکھائی دے گئے۔ بیچ میں ا[illegible] کا معاملہ تھا، سیدھی طرح کام نہیں بنا تو آپ نے اُن کو اُٹھوا لیا۔"
"ہم اس قسم کے طرزِ کلام کے عادی نہیں ہیں۔" نواب [illegible]

[illegible] بھڑک کے بولا "مناسب ہوگا کہ آپ احتیاط سے گفتگو کریں۔"
"ہم کو بھی عادت نہیں ہے نواب صاحب! اپنی بات کا یقین [illegible] آپ کے سر کی قسم، ہم بہت لگام دے کے ہی بول رہے ہیں۔ اِس [illegible] نہیں کہ آپ پونڈوں کے نواب ہو، یہاں کے بادشاہ لگتے ہو۔ اِس [illegible] کہ آپ کا سر ٹھیک طرح کام نہیں کر رہا ہے۔ کچھ دیر کے لیے اِس [illegible] ٹھکانے پر لے آؤ اور جو ہم بولتے ہیں، دھیان سے سن لو۔ ہم کو اپنے [illegible] چاہئیں، سیدھے اِس لیے آپ کے پاس آ گئے ہیں کہ آپ [illegible] کا سمجھا سمجھا دیں ورنہ پھر اپنے کو کُھلا سمجھنا۔"
"بخدا، ہم نے آپ سے بہت مروّت برتی ہے، محض اس وجہ سے [illegible] اپنے چھوٹے بھائی کی زندگی ہمیں خود سے زیادہ عزیز ہے، زبان درازی [illegible] ہمارے ہاں ایک ہی ہوتی ہے، شاید آپ نہیں جانتے کہ آپ [illegible] میں بیٹھے ہیں۔"
"جانتے ہیں، اچھی طرح جانتے ہیں پر جتنا ہم آپ کو جانتے ہیں، [illegible] آپ بھی ہم کو جان لیں تو کالا اُجلا آپ کی سمجھ میں جلدی آ [illegible] گا۔" تجمل نے تلخی سے کہا۔ "بات زیادہ لمبی کیوں کرتے ہو نواب [illegible] نے کچھ جان کے ہی اِدھر آپ کے دروازے پر دستک دی ہے، [illegible] ہیں اور بھی جا سکتے تھے، اسے آپ دھمکی سمجھو یا کچھ اور، ہمارے [illegible] واپس نہ کیے گئے تو آپ کے اور آپ کی حویلی کے لیے دن بھاری [illegible] جائیں گے۔ ہم سے دوبارہ مت کہنا کہ وہ تمھارے پاس نہیں ہیں۔ [illegible] کوئی اور بات ہو تو بولو۔"
نواب نے سر جھکا کے کچھ تحمل کیا اور کانپنے کی توقع کے خلاف [illegible] ہوئے لہجے میں بولا "ہم سمجھ رہے ہیں کہ اپنے اُن دو عزیزوں کی [illegible] ندگی سے آپ کس ذہنی کشمکش سے دوچار ہو سکتے ہیں لیکن [illegible] پاس افسوس اور ہمدردی کے سوا کچھ نہیں ہے، بے شک ہم کب [illegible] اُن لوگوں کی جستجو میں ہیں جو خانم کا کوئی اتا پتہ جانتے ہوں اور [illegible] ہمارے بھائی کے دکھ کا مداوا بن سکیں۔ ہم نے یہاں کسی طرح آپ تک [illegible] پہنچے اور آپ سے درخواست کرنے کے لیے مختلف لوگوں سے پوچھ گچھ [illegible] کی تھی، گو اس سلسلے میں نہایت احتیاط کی گئی تھی مگر معلوم ہوتا ہے [illegible] بات چھپی نہ رہی۔ ضرور ایسے ہی کسی واقف نے آپ کو اس حویلی [illegible] جانب اشارہ کر دیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں، اِس میں ہمارے لیے بہتری [illegible] کی کوئی صورت مضمر ہے۔ آپ تسلی رکھیں، ہم آپ کے عزیزوں [illegible] تلاش میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں گے، ساتھ ہی ہماری گزارش [illegible] ہے کہ ہماری زندگی، ہمارے بھائی کے سلسلے میں آپ کوئی نرمی ضرور [illegible] اختیار کیجیے، خانم کے بغیر جو ممکن تھا، ہم کر چکے ہیں، کچھ اور ہمارے [illegible] امکان میں ہوتا تو ہم آپ سے کبھی اصرار نہ کرتے۔"
"کیا یہ کوئی خطرہ ہے نواب صاحب؟"

"نہیں، قطعی نہیں، ہمیں یقین ہے، اگر آپ کے آدمیوں کو کوئی اور حادثہ پیش نہ آگیا اور وہ اِسی ریاست میں موجود ہیں تو ہم سے اتنی دُور نہیں ہیں۔ ہم اُن کی بازیافت کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ یہ آپ کی اُس عنایت کا نہایت حقیر اجر ہوگا جو آپ ہمارے بھائی کی سلامتی اور خوشی کے لیے ہمارے ساتھ روا رکھیں گے۔ ہماری درخواست ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چل کے، ایک نظر ہمارے بھائی کو دیکھ لیں، شاید اِسی طرح ہماری بات آپ تک کچھ رسا ہو سکے۔"
"آپ کی ہر بات اپنی سمجھ میں آ رہی ہے۔" تجمل نے اونچی آواز میں کہا "پر آپ شاید کچھ نہیں سمجھ رہے ہو۔"
"ہماری التجا ہے کہ آپ ہمارے بدنصیب بھائی کو دیکھیں تو۔" نواب کے لہجے میں عاجزی شامل تھی، اس نے جیسے تجمل کی بات سُنی ہی نہیں۔
"اُس کو کیا دیکھنا" تجمل نے کسمساتے ہوئے کہا "لگتا ہے، آپ سب ٹھیک ہی بول رہے ہو۔"
"نہیں، ہم پر اعتبار کریں اور جو ہم کہہ نہیں پا رہے ہیں، بہتر ہوگا کہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ ہم خانم کی قلب ماہیت سے انکاری نہیں ہیں، بے شک وہ بالاخانے کی زندگی ترک کر کے کسی نہایت شریف خاندان سے وابستہ ہو سکتی ہیں۔ ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ پرانی زندگی میں مراجعت کریں، ہم تو کچھ اور کہہ رہے ہیں۔ یوں کہیے کہ ہم خانم سے ایک اور نیکی، ایک اور ایثار کے لیے درخواست گزار ہیں۔ اُن کی ذرا سی توجہ کسی آشفتہ سر کی راحت و مسرت کا سبب بن سکتی ہے تو نیک نفس خانم کو ایسی بخیلی نہیں کرنی چاہیے نہ اُس خاندان کو جس کے قلب کی کشادگی خانم کی قبولیت سے ظاہر ہے۔ ہم عرض کریں کہ چھوٹے نواب کے متعلق شروع میں ہم بھی اُسی بدگمانی کے مرتکب ہوئے تھے جس کا شبہ آپ کر رہے ہیں، کوئی بھی یہ سب کچھ جان کے یہی تصور کرے گا مگر ایسا نہیں ہے۔ بات کچھ اور ہے اور ہمیں اعتراف ہے کہ اس احساس سے ہم پہلی بار آشنا ہوئے ہیں۔ شاید ہم نے خانم کو کبھی دیکھا ہو لیکن ہمیں اپنے بھائی کی نگاہ پر پورا اعتماد ہے۔ خانم کچھ ایسے ہی اوصاف کی حامل ہوں گی کہ اُن کے نقش اتنے گہرے ہیں اور کوئی خاندان اُن سے ایسی شدید وابستگی کا مدعی ہے۔ خود خانم کا سب کچھ ترک کر دینا اُن کی طہارتِ قلب کا آئینہ دار ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ نئی زندگی میں شامل ہونے کے بعد خانم کے متعلق اب کوئی گفتگو کرنا اور یوں اُن کا نام لینا بھی نازیبا ہے، ہمیں اس نازکی کا پورا احساس ہے مگر ہم، ہم..."
اُس کی آواز رُندھنے لگی، بات منہ میں رہ گئی، وہ بہت مضطرب سا ہو گیا تھا، یکایک اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا، تجمل کو اُس نے

کچھ کہنے نہیں دیا اور بے تابانہ آگے بڑھ کے اُس کا شانہ پکڑ لیا۔ تجمل نہ چاہتے ہوئے بھی اُٹھ گیا تھا، کانتے بھی اُس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ نواب نے اندر سے کسی شخص کو طلب کرنے اور ہدایت دینے کے لیے آواز بلند نہیں کی۔ جیسے ہی وہ کمرے سے نکلے، انھیں دروازے کے پاس کئی آدمی کھڑے نظر آئے۔ اُن میں مسلح چوکی دار بھی تھے اور وہ شخص بھی جو ابتدا میں نواب کے ساتھ آیا تھا۔ تجمل اور کانتے کو نواب کے ساتھ دیکھ کے وہ حواس باختہ سا ہو گیا تھا۔ نواب نے اُن کی جانب دیکھا بھی نہیں، وہ سب خود ہی سراسیمگی سے ایک طرف سمٹتے گئے۔ نواب تجمل کا شانہ تھامے تھامے تیز قدموں سے اندر بڑھتا رہا، کانتے کہہ رہا تھا کہ حویلی کسی راجا کے محل سے کم نہیں تھی۔ ہر طرف جھاڑ، فانوس، قالین اور آراستہ دیواریں، محرابیں۔ انھیں حویلی کے اندرونی حصے میں زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ جہاں وہ بیٹھے تھے، وہاں سے سو قدم ہی چلے ہوں گے کہ نواب کوئی دستک دیے بغیر تیزی سے ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ دوسرے لمحے ڈیوڑھی نما ایک مختصر راستے سے گزر کے وہ ایک وسیع کمرے میں موجود تھے۔ وہ باندیاں ہوں یا نواب عالم تاب کی بیگم یا کوئی اور، نواب کو اور انھیں اِس طرح سر اُٹھائے آتے دیکھ کے وہ پریشان ہو گئیں اور ابتری کی حالت میں اِدھر اُدھر کمرے کے تاریک گوشوں کی طرف لپکیں۔

تجمل آگے جاتے جاتے ٹھٹک کے رُک گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر کمرے کے وسط میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی مسہری پر ایک شخص لیٹا تھا۔ نحیف، نزار، بے سُدھ سا۔ کمرے میں ہلکی روشنی تھی لیکن اُس کے خط و خال انھیں اچھی طرح نظر آ رہے تھے۔ زرد چہرہ، آنکھوں کے گِرد حلقے، ٹوٹا اور بکھرا ہوا سا کوئی وجود۔ اُن تینوں کی آمد کی آہٹیں اُس کے کانوں تک ضرور پہنچی ہوں گی، اُس کی پلکوں پر ہلکا سا ارتعاش نمودار ہوا اور اُس کے سینے کا تموج کسی قدر زیر و زبر ہوا مگر اُس کی آنکھیں بند رہیں۔ کانتے اُسے پہلی بار دیکھ رہا تھا پھر بھی اُس کے لیے یہ قیاس کرنا مشکل نہیں تھا کہ اُس کے سامنے کوئی بدلا ہوا، اُجڑا ہوا آدمی ہے۔ بس کوئی ڈوری چل رہی تھی۔ تجمل لمحوں اُسے دیکھتا رہا اور ترحم آواز میں بولا۔

"یہ، یہ کیا کر لیا ہے انھوں نے؟"

"یہی ہے۔" نواب نے بھینچے ہوئے ہونٹوں سے جواب دیا۔

تجمل کی آنکھیں مسلسل چھوٹے نواب پر جمی ہوئی تھیں۔ کانتے کا خیال تھا کہ شاید وہ نواب کی مسہری پر جا کے اُسے قریب سے دیکھے گا مگر جلد ہی پلٹ کے وہ دروازے کی طرف چل پڑا۔ باہر آ کے اُس نے بڑے نواب کو آگے آنے کے لیے راستہ دیا اور تینوں واپس اُسی نشست گاہ میں آ کے بیٹھ گئے۔ "ایسا کب سے ہے؟" اُس نے بوجھل آواز میں نواب سے پوچھا۔

"تبھی سے۔ شروع میں البتہ سنبھلے سنبھلے رہے، چھل... اِدھر کچھ دنوں سے...." نواب کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

تجمل دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور آہستگی سے بولا۔ "کوشش کریں گے نواب صاحب! اپنے جیسی کوشش۔"

"ہو سکے تو ہمیں خانم کا پتہ بتا دیجیے، ہم خود جا کے اُن سے..."

"نہیں۔" تجمل نے صاف انکار کر دیا۔ "آپ کے اُدھر جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہم خود جا کے خانم سے بات کرتے ہیں۔ ہونا نہ ہونا اُس پر ہے۔ ہم کو بھروسا ہے کہ وہ اپنی بات لے کے ٹلنے کی۔ اِس وقت ہم آپ کو اتنا ہی بول سکتے ہیں۔ اِس... آپ بھی کچھ مت سمجھنا، آپ کی آنکھوں نے ایک ہی طرح سے سیکھا ہے۔ بولی بڑھانے کے خیال میں مت رہنا۔ اِس کا تھوڑا اندازہ آپ کو ہمارے آدمیوں سے بھی ہو گیا ہو گا۔ اپنے کو پتہ، اِدھر آپ کے پاس حویلی میں ڈھیر لگے پڑے ہیں، اُن کی اپنے کو ضرورت نہیں ہے جتنی آپ کو ہے، اِس کو سنبھال کے رکھو، اپنی طرف سے اپنے آگے آنے والوں کے لیے سوغات سمجھو۔" تجمل نے سانس روک لی اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ "اپنا مطلب ہے نواب صاحب خانم کے پاس آدمی بھیجتے ہیں، آگے اچھے کی ہی آس رکھو اور ہمارے آدمی ہم کو واپس کر دو، اُن سے آپ کو کچھ نہیں مل سکے گا۔"

نواب نے اضطراری انداز میں پھر وہی وضاحت کرنا... میرا اور ہیرے کے بارے میں پھر لاعلمی ظاہر کی۔ کانتے کو حیرت تھی کہ تجمل نے اُس سے کوئی بحث نہیں کی۔ وہ اُسی لمحے اُٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے وقت اُس نے نواب سے کہا۔ "ابھی نہیں تو سوچتے میں دھیان کرنا۔ ہم کو اپنے آدمی لوٹنے کا انتظار رہے گا۔ وہ لوٹ کے اپنے پاس آ گئے تو بھی جو ہم نے بولا ہے، اپنی جگہ ہے اور آپ چاہو، یہ بات آپ کے لیے اپنے من میں کوئی گھر ہی بنائے گی۔"

نواب اُسے روکتا اور اُس سے کچھ کہتا رہ گیا۔ تجمل چل پڑا تاہم دروازے سے نکلتے نکلتے وہ ٹھہر گیا۔ "ایک بات اور سُن لو۔" اُس نے تند لہجے میں کہا۔ "اُن کے ساتھ کوئی اُنیس بیس ہوا تو حویلی اپنی جگہ دکھائی نہیں دے گی۔ بہت بڑا گھاٹا ہو جائے گا... کے لیے کسی اور کے پاس نہیں جائیں گے، لوٹ کے اِدھر ہی آئیں گے۔ آپ کے پاس تاور خانم پر کچھ نہیں ہے، ہم نہیں سمجھتے کہ خانم کے... تک وہ آپ کے پاس بدلے میں رکھے ہوئے ہیں۔ ہو سکے تو ہوشیار رہنا، ہم نے پہلے ہی بول دیا ہے کہ آپ گنتے گنتے تھک جاؤ گے۔"

راہ داری میں مولا موجود تھا اور حویلی کے باہر تانگا بھی... تینوں تانگے میں بیٹھ کے اڈے آ گئے۔

کانتے نے رُک کے ایک گہری سانس کھینچی اور پلکیں جھپکائیں... لگا، "سالا پتہ ہی نہیں چلا۔" وہ انگڑائی لیتا ہوا بولا۔

واقعی کسی کو احساس نہیں ہوا تھا، دھوپ ابھی دیواروں سے دُور دُور تھی لیکن ہر طرف اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ شامو، جمرو، زورا اور منگو سب اِس طرح کانتے کے گرد ہمہ تن گوش بیٹھے تھے گویا میری طرح وہ بھی پہلی بار سب کچھ سُن رہے ہوں۔ بار بار اُن کی نگاہیں مجھ پر اُٹھتی رہی تھیں جیسے مجھ سے کہہ رہی ہوں، سُنا تم نے؟ میں نے کانتے سے خود اصرار کیا تھا اور مجھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کانتے جان جان کے مجھے یہ سب بتا رہا ہے، مجھے کوئی فردِ جرم سُنا رہا ہے۔ مجھ میں اُس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی مگر وہ خود ہی کہنے لگا۔ "وہ اڈے واپس اور پھر آئے تو رات بہت ہو گئی تھی اور آکا کے سوا بھی موجود تھے۔ تجمل کی ہدایت پر زورا اُسی وقت خاموشی کے ساتھ اڈے سے نکل گیا۔ اتنے دِنوں میں وہ شہر کے گلی کوچوں سے کسی حد تک واقف ہو گیا تھا۔ ابا جان کے پاس سے تجمل اندھیرا ہونے پر چلا تھا۔ وہ اُس کی واپسی کے بے چینی سے منتظر ہوں گے۔ رات گزرنے پر اُس کے نہ آنے سے اُن کے دل میں ہول اُٹھ رہے ہوں گے۔ زورا نے راستے میں بہت احتیاط کی کہ وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر منزل پر پہنچ جائے۔ جس وقت وہ ہوٹل میں داخل ہوا، تقریباً ڈھائی بج رہے تھے۔ کئی دن سے ابا جان کے ساتھ وہ اُسی ہوٹل میں مقیم تھا اِس لیے یہاں کسی غلط انداز نگاہ کی اُسے پروا نہیں تھی۔ ابا جان اور مارٹی آہٹیں گن رہے تھے۔ اُسے اکیلا دیکھ کے اُن کے چہرے زرد پڑ گئے اور زورا کو انھیں یہ یقین دلانے میں بہت مشکل پیش آئی کہ تجمل ہی نے اُسے بھیجا ہے۔ زورا انھیں زیادہ بتا بھی کیا سکتا تھا؟ اُسے خود ہی کتنا معلوم تھا۔ وہ نہ کانتے کی طرح تجمل کے ساتھ تھانوں میں گیا، نہ بڑے نواب کی حویلی میں، درمیان میں اُسے کانتے سے سُن گُن لینے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ تجمل نے جو کہا تھا، اُس نے وہی ابا جان کے سامنے دہرا دیا۔ تجمل نے ابا جان کو پیغام بھیجا تھا کہ میرا اور ہیرے کا سراغ بڑی حد تک مل گیا ہے اور اُمید ہے کہ تجمل جلد اُن کے پاس پہنچ بھی جائے گا۔ اُس کے نہ آنے سے ابا جان گھبرائیں نہیں، وہ کسی سبب سے رُک گیا ہے اور آئندہ بھی ممکن ہے وہ اُن سے بار بار نہ مل سکے، بہر حال کسی نہ کسی طرح ابا جان سے رابطہ ضرور رکھا جائے گا۔ اُس کی کوشش ہو گی کہ کل کسی وقت ابا جان کے پاس پہنچ کے انھیں تفصیل بتا سکے۔ وہ اطمینان سے ہوٹل میں ٹھہرے رہیں اور اپنی جانب سے کوئی قدم نہ اُٹھائیں۔

تجمل کو احساس ہو گا کہ صرف اتنی بات ابا جان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکے گی اِس لیے اُس نے زورا سے کہہ دیا تھا، اگر ابا جان نہ مانیں تو وہ انھیں بتا دے کہ بیچ میں ایک بڑے نواب کا معاملہ ہے مگر ابا جان کی یوں بھی کہاں سیری ہوتی۔ وہ اور بدحواس ہو گئے۔ زورا نے "سب ٹھیک ہے، سب خیریت ہے" بابا کہہ کے انھیں دلاسا دینے کی اپنے طور پر بہت کوشش کی لیکن وہ کرید کرید کے پوچھتے رہے۔ بتاؤ، تم کیا چھپا رہے ہو؟ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟ یہاں سے تم لوگ کہاں کہاں گئے؟ کون کون راستے میں ملا اور کیا بات ہوئی؟ زورا کی عجیب مشکل تھی، ایک طرف اُسے تجمل کا خیال تھا کہ جو اُس نے کہا ہے اُس سے زیادہ اُسے زبان نہیں کھولنی چاہیے تھی۔ دوسری طرف وہ ابا جان کی تشفی کے لیے کوئی بڑا جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا کہ بعد میں اُن کے سامنے آنے سے بھی جائے مگر وہ اُس کے پیچھے پڑ گئے تھے سو اُسے بتانا پڑا کہ ہوٹل سے نکل کے تجمل مختلف تھانوں میں گیا تھا، تیسرے تھانے میں وہ دیر تک رُکا رہا اور وہی آخری تھانا تھا جہاں سے چل کے چار مینار کے قریب واقع ایک ہوٹل میں انھوں نے کھانا کھایا تھا۔ اُس کے بعد وہ سیدھے بازار کے اڈے چلے گئے۔ آکا کا سارا واقعہ زورا نے ابا جان کو بتانا ضروری نہیں سمجھا، بس اتنا کہا کہ اڈے کے دادا سے الگ کمرے میں تجمل گھنٹے بھر کے قریب باتیں کرتا رہا، یہاں سے نکلتے ہی باقی چاروں کو روک کے وہ کانتے کے ساتھ کہیں چلا گیا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی وہ اڈے واپس آیا تھا۔

زورا مزید کچھ بتانے سے مسلسل انکار کرتا رہا تو ابا جان کو بھی خاموش ہو جانا پڑا۔ زورا کو صاف محسوس ہو گیا تھا کہ وہ اُس سے کچھ ناراض ہو گئے ہیں۔ بعد میں انھیں چُپ سی لگ گئی تھی۔ ابا جان نے اب تک خود کو باندھے رکھا تھا۔ جب تک کوئی دوسرا نہیں ہوتا، آدمی اپنا آسرا خود ہوتا ہے، سہارا ملنے پر آدمی سنبھلنے کے بجائے کبھی ٹوٹنے بکھرنے بھی لگتا ہے۔ تجمل اُن کے لیے اور دوسرا پیغام بھیج بھی کیا سکتا تھا۔ ہر صورت میں کم و بیش اُن کا یہی حال ہوتا۔ تجمل اگر یہ بھی کہلوا کے بھیج دیتا کہ ہم دونوں اُسے مل گئے ہیں تو بھی اُس وقت تک اُن کی بے کلی دُور نہ ہوتی جب تک وہ اپنی آنکھوں سے ہمیں دیکھ نہ لیتے۔ تجمل کے آنے کے بعد ابا جان کو شاید یہی توقع ہو گی کہ بس اُس کے آنے کی دیر ہے۔ آتے ہی وہ کوئی سحر پھونکے گا اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر ہی لوٹے گا۔ زورا کہہ رہا تھا کہ مارٹی بھی اُس سے کھنچا کھنچا تھا۔ اُس کے خیال میں ابا جان کو نہیں تو کم از کم اُسے زورا کو اصل بات بتا دینی چاہیے تھی حالانکہ زورا نے اڈے پر پیش آنے والے واقعے کی روداد کنایتہً اُسے سُنا دی تھی۔ وہ تینوں باقی رات جاگتے ہی رہے۔

مارٹی اور زورا کے کہنے پر ابا جان بستر پر لیٹ گئے تھے مگر پانچ منٹ بھی نہ بیتے ہوں گے کہ اُٹھ کے صبح سورج نکلنے تک مصلے پر بیٹھے رہے۔

تجمل نے زورا سے واپسی کے لیے کچھ نہیں کہا تھا اِس لیے

صبح ہونے کے باوجود وہ ہوٹل سے نہیں نکلا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر کوئی نو بجے ہوں گے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ زورا ہی نے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ شامو اُن کے سامنے موجود تھا۔ تینوں نے اُسے گھیر لیا لیکن شامو نے عجلت ظاہر کی اور اباجان سے کہا کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر فیض آباد میں بڑے صاحب منیر علی کے نام ارجنٹ تار بھیج دیں کہ خانم پہلی گاڑی سے حیدرآباد پہنچ جائے۔ بُجھل نے ایک تار کے بعد دوسرا تار بھیجنے کی ہدایت کی تھی۔ اباجان یہ سُن کے اور ناتواں ہو گئے ہوں گے۔ انھوں نے شامو سے اس کی وجہ پوچھنی چاہی۔ وہ بھی انھیں زورا سے زیادہ کچھ نہ بتا سکا اور چائے کی ایک پیالی پی کے فوراً روانہ ہو گیا۔ صبح صبح کا وقت تھا، ابھی بازار سنسان پڑے تھے۔ کسی کو اُس کا کہیں آنا جانا محسوس نہیں ہوا۔ شامو ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اڈے واپس پہنچ چکا تھا۔

بُجھل رات ہی کو یہ پیغام زورا کے ذریعے بھیج سکتا تھا مگر یا تو اُس کا ارادہ سویرے کسی وقت خود تار دینے کا تھا جس کا اُسے موقع نہ مل سکا یا پھر اباجان کو حقیقتِ حال سے بتدریج آگاہ کرنا اُس نے مناسب جانا تھا۔ اس نوعیت کی کوئی ہدایت اُن کے لیے مزید تکدر کا سبب بن سکتی تھی۔ وہ تو اُسی وقت تار گھر کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور یہی ہوا، اِدھر شامو واپس گیا، اُدھر اباجان نے شیروانی پہنی، مارٹی کو ساتھ لیا۔ تار گھر ہوٹل سے نزدیک تھا، پیدل کا راستہ۔ مارٹی اور اباجان چند منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ لوٹتے وقت وہ ایک اور فارم بھی ساتھ لیتے آئے تاکہ تھوڑے وقفے بعد دوسرا تار بھیجا جا سکے۔

اِدھر رات گئے، بُجھل کانتے اور مَولا حویلی سے واپس آئے تو اڈے پر سارے لوگ موجود تھے۔ وہ رات بھر بُجھل کے گرد بیٹھے رہے۔ شروع شروع میں وہ زبان کھولتے ہوئے جھجک رہے تھے مگر بُجھل کی توجہ دیکھ کے ساری رات آکا کے واقعات سُناتے رہے۔ تب کانتے کو معلوم ہوا کہ بازار کی ایک عورت کانتی بائی سے کالے دادا کچھ ایسا قریب ہوا کہ اڈے سے دُور ہوتا گیا۔ پھر بھی اڈے پر کسی بات کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی، سب کچھ معمول کے مطابق جاری تھا اور کالے دادا سے چند ایک شکایتوں کے سوا سبھی خوش تھے۔ اِسی دوران آکا نمودار ہوا، کالے دادا نے بھوپال سے آئے ہوئے ایک مہمان دادا کے طور پہ اُسے اڈے ہی پر ٹھیرا لیا۔ اُس نے کالے دادا کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کے اڈے کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کیا اور کئی بار اڈے کے آدمیوں کے سامنے اپنے زورکی نمائش بھی کی۔ پھر چند دن بعد اُس نے انکشاف کیا کہ وہ اور شاہ کبیرا ایک ہی اُستاد کے شاگرد ہیں، اُستاد بھومی کے۔ اُس کا یہ دعوا درست ہی سمجھا گیا کیونکہ شاہ کبیرا اڈے کے آدمیوں سے اُستاد بھومی کے بَل کا ذکر کیا کرتا تھا۔ شاہ کبیرا نو عمر کوئی جرم کرکے حیدرآباد سے فرار ہو گیا تھا، برسوں بعد وہ جوان ہو چکا تھا اور مرکھنا بیل۔ اُس وقت بازار کے اڈے کا دادا بشمبھا تھا۔ وہ اگرچہ بوڑھا ہو چکا تھا لیکن سبھی اُس کا احترام کرتے تھے اور مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کے مصداق اُس وقت سب میں اُس کا کوئی بدل نہیں تھا۔ حیدرآباد آکے شاہ کبیرا اُس کے پاس بیٹھنے لگا۔ اپنے کَس بَل، پُھرتی اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے وہ جلد ہی بھولے دادا کے قریب ہو گیا تھا۔ ابتدا میں ان دونوں کا رشتہ بڑے چھوٹے ہی کا تھا مگر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اُس نے بھولے دادا کو اڈے سے بے دخل کر دیا۔ پھر کوئی اٹھا اور جو بھی شاہ کبیرے کے آڑے آیا، اُسے ذلت ہی اُٹھانی پڑی۔

آکا کو اڈے پر مہمان ٹھیرے چند دن ہوئے تھے کہ اُس نے کالے دادا سے اڈّا حاصل کرنے کا باقاعدہ مطالبہ کر دیا۔ کالے دادا کا عالم ہی دوسرا تھا۔ کانتی نے اُسے پہلے ہی بہت نڈھال کر رکھا تھا۔ مہمان آکا کی اس حیرت انگیز خواہش نے اُس کے رہے سہے حواس بھی منتشر کر دیے، اُس نے اُس وقت آکا سے کوئی حجت کرنے کے بجائے خاموشی ہی مناسب سمجھی، اب نہیں تو پھر کسی وقت اُس سے نمٹا جا سکتا تھا، آکا کے مقابل آنے کے نتیجے میں دوسری صورت بھی ممکن تھی، سب سے زیادہ اُسے کانتی بائی کا خیال تھا، اگر واقعی اُسے اڈے سے بے دخل کر دیا تو کانتی بائی بھی اُس سے چھن جائے گی، اُس کے یہ تول جانے کیوں؟ اُسے یہ آس بھی بندھی تھی کہ اُس کے وہ اجنبی محسن ہی بھولے بھٹکے واپس نہ آ جائیں جو جھولی میں بازار کا اڈّا ڈال کے چلے گئے تھے۔ اُسے اُن کا پتا معلوم ہوتا تو وہ انھیں باخبر بھی کر دیتا، بُجھل نے اپنے بارے میں اڈے کے لوگوں کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا، نام بھی کوئی اور بتایا تھا۔ کالے دادا نے آکا کو آگاہ کر دیا تھا کہ اڈے کا اصل مالک کون ہے مگر آکا نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ بتدریج اڈے پر حاوی آتا گیا اور اُس نے وہاں وہ کچھ شروع کیا جو اڈے پر کبھی نہیں ہوا تھا، اُس کے حکم کی سرتابی، مزاج کے خلاف چھوٹی سی بات کی سزا میں کوئی رُو رعایت نہیں کی جاتی تھی، گھنٹوں اُلٹا لٹکانا، چاقو کی نوک سے کھال پر سدا قائم رہنے والے نشانات بنانا، دِنوں تک بھوکا پیاسا رکھنا، سر مُنڈوا دینا، برہنہ کرکے اُس سے مسلسل پٹائی کرانا، اڈے کے دالان اور صحن کے درمیان دیے بغیر دَوڑیں لگوانا، دونوں یا ایک ہاتھ اُٹھائے اور کھڑے رہنے کا حکم، اگر کوئی ذرا سی جنبش کرتا تو بیدوں سے اُس کی کھال اُدھیڑ دی جاتی، کچھ ہی دِنوں میں شہر اور نواح کے دُور دُور تک آکا کا نام پہنچ چکا تھا، اُس کے مزاج کا کچھ ٹھیک نہیں تھا کہ اُسے کب کون سی بات گراں گزر جائے، جب سے اُس نے اڈّا پوری طرح قابو میں کر لیا تھا، ہنستا تو شاید وہ بھول ہی گیا تھا۔ اڈے کی پُرانی روش کے خلاف علاقے کی ساری آمدنی کسی ایک شخص کے سپرد کرنے کے بجائے اُس نے مختلف علاقوں کے لیے مختلف آدمی متعین کیے تھے، بیشتر وہ انھی سے راہ و رسم رکھتا تھا، انھی کی سفارش اور شکایت پر وہ اڈے کے لوگوں کے بارے میں فیصلے صادر کرتا تھا، کوئی شخص ان چند مخصوص لوگوں کی دیوار عبور کیے بغیر براہِ راست آکا کے پاس نہیں جا سکتا تھا بشرطیکہ آکا اُسے خود طلب کرے اور کسی اہم معاملے میں اُس نے اُسے باریابی کا مجاز نہ ٹھیرایا ہو۔ اڈے پر اُس کے متعین کیے ہوئے لوگ ہمیشہ ایک دوسرے پر شک کرتے تھے کہ کہیں دوسرا آکا کے زیادہ قریب تو نہیں ہے اور اُسے میرے خلاف بھڑکا تو نہیں رہا ہے، اس صورت میں اُسے اڈے سے ہٹانے کے لیے کسی منظّم سرکشی کا امکان بھی کم ہو گیا تھا۔ کالے دادا کو اُس نے کوئی کام تفویض نہیں کیا تھا مگر کالے دادا کو وہ رکھتا اپنے پاس ہی تھا اور ایک وہی شخص تھا جس کا اُسے تھوڑا بہت خیال تھا۔

ساری رات وہ بُجھل سے آکا کا چرچا کرتے رہے اور دن بھر بھی یہی حال رہا۔ جانے کہاں سے لوگ کھنچے کھنچے آ رہے تھے اور یہیں جم کے بیٹھ جاتے تھے۔ کسی کو جیسے اس خبر پہ یقین نہیں تھا کہ اڈے پر اب آکا نہیں رہا ہے۔ بازار کے کئی ہوٹل والوں نے اپنی طرف سے تینوں وقت کے کھانے کا اہتمام کرنے کی درخواست بُجھل سے کی تھی۔ اُس روز اڈے پر لوگوں کی تعداد زیادہ تھی لیکن تینوں وقت اُنھوں نے اس قدر کھانا فراہم کیا تھا کہ بچ گیا۔ دن بھر میلا سا لگا رہا اور سماوار میں چائے کھولتی رہی۔ رات کو کئی بالاخانوں کی طرف سے اڈے پر مجرا کرنے کی پیش کش بھی کی گئی لیکن بُجھل نے منع کر دیا۔ اِس طرح بُجھل کا وہاں سے اُٹھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اُس نے خود ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ طویل سفر، کئی راتوں کی رتجگائی نے کانتے، شامو، جبرو اور ٹنگو کو ویسے ہی بوجھل کر رکھا تھا، اس پر اجنبی چہروں کے سامنے بندھے بیٹھے رہنے کی اُلجھن اور جیسا کہ کہا جاتا ہے، سب سے بڑا بوجھ تو دماغ کی دُھندکا ہوتا ہے، آنے والے لمحوں کی بے اعتباری کا آدھا دیکھنے اور آدھا سُننے کا اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا، جب تک بُجھل اُن لوگوں کے بیچ گھرا ہوا تھا، انھیں بھی وہیں موجود رہنا چاہیے تھا اور بُجھل کی نشست کے انداز سے اُس کے جلد اُٹھنے اور اُن سب کے منتشر ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بُجھل کو جیسے کوئی اور بات یاد ہی نہیں رہی تھی۔

رات کو کوئی بارہ بجے ہوں گے، بازار کا وقت کب کا شروع ہو چکا تھا کہ معاً زورا دکھائی دیا۔ سب کی بجھی بجھی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، بُجھل بھی چونک گیا تھا، اُس نے اشارے سے اُسے اپنے پاس چوکی ہی پر بُلا لیا۔ زورا کو کل رات تک اڈے کے لوگوں نے خوب دیکھا تھا۔ ممکن ہے کسی نے اُس کی دن بھر کی رُوپوشی محسوس کی ہو لیکن اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ زورا کو جیسے ہی موقع ملا، اُس نے بُجھل کو اباجان کی اضطرابی کیفیت سے آگاہ کیا اور بتایا کہ صبح تار دے کے وہ ہوٹل واپس آ گئے تھے۔ آئے ہوئے دیر نہیں گزری تھی کہ مارٹی کو ساتھ لے کے وہ پھر نکل کھڑے ہوئے۔ سہ پہر کو لوٹے، بہت گرے گرے نظر آتے تھے۔ مارٹی نے اُسے بتایا کہ بُجھل کے آنے سے پہلے وہ جن دفتروں کا چکر کاٹتے رہے تھے، وہیں ریاست کے کسی بڑے عہدے دار سے اُنھوں نے ملاقات کا وقت طلب کیا تھا، عہدے دار اپنے پہلے سے طے شدہ سرکاری کاموں میں مصروف تھا، اُس نے معذوری ظاہر کی مگر اباجان کے اصرار پہ اُس کے اہل کاروں نے عصر کے بعد گھر پہ ملنے کا وقت دے دیا تھا۔ اس دوران اباجان نے دوسرا تار اور احتیاطاً ایک خط بھی منیر علی کے نام فیض آباد ارسال کر دیا تھا۔ عصر کے قریب مارٹی کے ساتھ وہ پھر ہوٹل سے چلے گئے۔ ہوٹل میں قیام کے دوران اُنھوں نے وہاں کے خصوصی رسم و رواج کے لحاظ سے زورا اور مارٹی کے لیے چند جوڑی کپڑے جلد از جلد تیار کروا دیے تھے چنانچہ مارٹی عمدہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ ہوٹل سے نکل کے اُنھوں نے کرائے کی موٹر پکڑی اور دیے ہوئے پتے پر پہنچ کے موٹر ٹھیرا لی۔ وہ بڑی بڑی حویلیوں اور محلّات کا علاقہ تھا۔ مارٹی نے اباجان اور سرکاری اہل کاروں کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ نواب حشمت جنگ کو ریاستی حکومت میں کوئی بڑا مقام حاصل ہے، دربار میں براہِ راست اُن کا عمل دخل ہے۔ نواب کو یاد تھا، اُنھوں نے دروازے پر اپنی آمد کی اطلاع دی تو انھیں فوراً اندر بُلا لیا گیا۔ اندر نواب کے معتمد نے انھیں ہدایت کی کہ وہ مختصر گفتگو کریں کیونکہ نواب صاحب کے پاس وقت کم ہے، کچھ دیر بعد انھیں کنگ کوٹھی کی ایک دعوت میں شرکت کرنی ہے۔ پھر معتمد انھیں ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک چوڑا چکلا، بھاری بھرکم شخص اُن کا منتظر تھا۔ اباجان نے تعظیم دینے کے بعد کہا کہ اُن کے آنے کی کوئی خاص غرض نہیں ہے۔ اُنھوں نے ریاست اور بیرونِ ریاست میں شرفا سے نواب حشمت جنگ کی بہت تعریف سُنی ہے چنانچہ صرف نیاز حاصل کرنا اُن کی آمد کا مقصد ہے۔ نواب عجلت میں تھا،

کسی قدر حیرت بہ جبیں ہوا مگر رسماً اُس نے ابا جان کا شکریہ ادا کیا، اُس کے استفسار پر ابا جان نے بتایا کہ سرِدست وہ یوپی سے آ رہے ہیں لیکن سارے ہندوستان ہی کو انھیں اپنا گھر کہنا چاہیے۔ اُن کی زندگی کا بڑا حصہ جہاں نوردی میں گزرا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ حیدرآباد پہلی بار آنا ہوا ہے اور جیسا انھوں نے سنا تھا، ریاست کی وہی شان و شوکت انھوں نے دیکھی۔ اُن کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنی باقی زندگی یہیں گزار دیں۔ ابا جان کی شائستگی سے نواب کچھ متاثر ہوا اور کہنے لگا، ضرور، ریاست حیدرآباد نے ہمیشہ باہر سے آنے والے شرفا کے لیے اپنا سینہ کشادہ رکھا ہے، یقیناً یہاں حسبِ دل خواہ آپ کی پذیرائی ہوگی، ابا جان نے کہا بے شک انھیں یہی توقع ہے اور بولے کہ ویسے بھی حیدرآباد اُن کے نوادر جمع کرنے کے شوق کے لیے نہایت موزوں جگہ ہے، یہاں ہر طرف انھیں صاحبِ ذوق لوگ نظر آتے ہیں۔ نوادر کے ذکر پر نواب نے پہلی مرتبہ دلچسپی ظاہر کی اور تجسس سے پوچھا، کس قسم کے نوادر؟ ابا جان نے شیروانی کی جیب سے ایک ڈبیا نکالی اور نواب کے سامنے پیش کر دی۔ نواب نے جھجکتے ہوئے اُسے کھولا، اُس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ڈبیا کی سرخ مخمل میں ایک نہایت خوب صورت ہیرا دمک رہا تھا۔ نواب نے لپکتی انگلیوں سے اُسے اُٹھایا اور بے چین نظروں سے اُلٹ پلٹ کے دیکھتا رہا، ہیرے کی چمک دمک دیکھنے کے لائق تھی، مارتی کے بیان کے بموجب نواب حشمت جنگ پر حیرت کا عالم طاری تھا۔ وہ کبھی ابا جان کو دیکھتا، کبھی ہیرے کو، سنسناتی آواز میں بولا: "یہ واقعتاً ایک نادر چیز ہے کیا آپ ؟ ..." مگر ابا جان نے تیزی سے کہا: "آپ کو پسند آیا ؟"

"یقیناً!" نواب نے بے ساختگی سے کہا: "بلاشبہ ہم نے اپنی زندگی میں ایسے عمدہ پتھر کم دیکھے ہیں۔"

"آپ صاحبِ نظر ہیں۔" ابا جان نے کہا: "مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اسے پرکھ لیا۔"

نواب ہیرا بار بار ہتھیلی پر تولتا اور مچلتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا: "ہم اس کی قیمت جاننا پسند کریں گے۔"

ابا جان نے مسکرا کے کہا: "آپ کو پسند آ گیا، یہی اس کی قیمت ہے۔ کسی نایاب چیز کی اس سے بڑی عزت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اچھے ہاتھوں میں پہنچ جائے ورنہ ہے تو پتھر ہی۔" انھوں نے نواب سے کہا کہ یہ اُس کی نذر ہے۔

نواب کو یقین نہیں آیا، حیرانی سے بولا: "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

ابا جان نے متانت سے کہا کہ وہ ہیرا اسی ارادے سے یہاں لائے ہیں، ایک نیاز مند کی جانب سے اسے قبول کیا جائے۔

نواب کے لیے یہ سب کچھ نہایت عجیب تھا۔ وہ وحشت سے ابا جان کو تکنے لگا، ایک ایسا شخص جس سے پہلی بار ملاقات ہو، آخر یہ سخاوت کرنے پر کیوں مُصر ہے؟ اُس کے دل میں ہزاروں [illegible] رہے ہوں گے، ہیرے ہی سے متعلق مشہور روایتیں مگر دوسری [illegible] ابا جان کی وضع قطع، اُن کے سلجھے ہوئے طرزِ گفتگو، اُن کی شر[illegible] برخاست بھی اُس کے پیشِ نظر ہوگی۔ ابا جان بھی اُس کے [illegible] میں پھلنے والے فطری خدشات سے بے خبر نہیں تھے۔ انھوں [illegible] صاف گوئی سے کہا، بے شک یہ ذرا کچھ قبل از وقت ہے، کچھ [illegible] غیر متناسب سا معلوم ہوتا ہے، انھیں اندازہ ہے کہ کسی اجنبی [illegible] پیش کش پر نواب بھی دل میں بہت کچھ سوچ سکتا ہے تاہم [illegible] ہوگا، کسی بدگمانی سے پہلے نواب اُن کی عمر کا خیال ضرور کرے اور [illegible] ایک علامت ہی تصور کیا جائے اور علامت سے اُن کی غرض [illegible] اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ نواب حشمت جنگ جیسے شرفا سے [illegible] کے طالب ہیں، ایک ذی وقار دوست سے حیدرآباد میں اپنے [illegible] کی ابتدا کرنا چاہتے ہیں۔

ابا جان نے اپنے خزانے سے کوئی ایسا ہی ہیرا منتخب [illegible] جس کی ندرت اور وقعت میں کوئی کلام نہ ہو، میرے گھر سے [illegible] بعد انھیں ہیروں کی خوب پہچان ہو گئی ہو گی۔ کورا کی لائی ہو[illegible] جواہر کی تھیلی وہ آٹھ سال تک نیچ نیچ کے تبت میں [illegible] کے کاغذات کرید تے رہے تھے۔ اس دوران ہیرے جواہرات [illegible] رکھنے والے قسم قسم کے لوگوں کا بھی تجربہ ہوا ہو گا، انھیں کوئی [illegible] ہیرا ساتھ لانا چاہیے تھا کہ نواب حشمت جنگ بے کل ہو جا[illegible] نواب کی بے کلی اپنی جگہ تھی۔ وہ ایسے کس طرح اُن کے [illegible] ہیرا قبول کر سکتا تھا، اُس نے معذرت کی کہ وہ قیمتاً ہی [illegible] کرنا چاہتا ہے، ابا جان کی یہ کرم فرمائی اُسے ہمیشہ یاد رہے گی [illegible] نہیں کہ اُن سے رفاقت کے لیے یہی ایک معیار مستند سمجھا جائے [illegible] کے بتائیں کہ وہ اُن کی کیا خدمت کر سکتا ہے۔

مارتی نے زور دے کر بتایا تھا کہ نواب کی نظریں ہیرے [illegible] رہی تھیں، ابا جان نے اسے میز سے نہیں اُٹھایا اور نہ قیمت [illegible] انھوں نے کہا کہ نواب قیمت کا ذکر کر کے وہ لطافت مجروح کر[illegible] دو دوستوں کے درمیان لازم ہے، اِس میں نواب کی سُبکی کا بھی [illegible] مضمر نہیں ہے، انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ خدا نے نواب کو [illegible] حیثیت سے نوازا ہے اس کے باوجود نواب کو قیمت کی ادا[illegible] اصرار ہے تو اس کے لیے آئندہ بہت وقت پڑا ہے۔ انھوں [illegible] کیا کہ حسابِ دوستاں بھی صاحب دلوں کا ایک شیوہ سلوک [illegible] سکے پیمانہ نہیں ہوتے، ایسا ہی ہے تو وہ کسی اور طرح نواب [illegible] قیمت وصول کر لیں گے۔ فی الحال تو اُن کی یہی خواہش ہے [illegible]

[illegible] زین کے کسی علاقے میں بلکہ بہتر ہے کہ نواب کے قریب کہیں [illegible] چھوٹی موٹی حویلی میں آباد ہو جائیں، اُن کے پاس خدا کا دیا بہت [illegible] ہے، سو وہ اپنا باقی وقت عزت و سکون سے بسر کرنا چاہتے ہیں، [illegible] اِس سلسلے میں اُن سے کوئی اعانت کر سکتا ہے تو وہ یقیناً [illegible] سے درخواست گزار ہیں۔

نواب نے بے اختیار کہا: "ضرور ضرور۔ ہم کوشش کریں گے کہ جلد آپ کی یہ خواہش پوری کر دی جائے۔"

[illegible] چائے آ چکی تھی لیکن نواب نے ناظم کو طلب کر کے ہدایت کی کہ [illegible] دوسرے کمرے میں اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ چائے نوش کرے گا۔ [illegible] دوران اُس نے ابا جان سے اُن کے قیام کے بارے میں پوچھا۔ ابا [illegible] نے نہیں چھپایا کہ وہ کئی دن سے ویکاجی ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے [illegible] انھوں نے نواب کو بتایا کہ اُن کا خاندان تین لڑکوں اور تین [illegible] پر مشتمل ہے، گویا فہمیدہ کو انھوں نے مرا ہوا سمجھ لیا تھا) [illegible] جزئیات ابا جان نے دانستہ نواب کے گوش گزار کی ہوں گی، تا کہ [illegible] کے بارے میں نواب کے ذہن پر چھائے ہوئے اندیشے زیادہ سے [illegible] چھٹ سکیں۔ حیدرآباد کے سب سے بڑے ہوٹل ویکاجی میں قیام [illegible] اُن کی گفتگو اور لہجے کے اعتماد سے مطابقت رکھتا تھا۔

دوسرے کمرے میں جہاں نواب کی منشا پر انھیں لے جایا گیا [illegible] وہاں انگریزی طرز کے کھانے کی لمبی میز لگی تھی اور اس پر انواع [illegible] کی چیزیں سجی ہوئی تھیں پھل، مشروبات، بھنے گوشت کے پارچے [illegible] وغیرہ۔ درمیان میں ہیرے کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ دُنیا [illegible] کی باتیں کرتے رہے، بیشتر ابا جان ہی بولتے رہے۔ انھوں [illegible] حیدرآباد اور مختلف ریاستوں اور علاقوں کے بارے میں اپنے مشاہدات [illegible] تجربات کا محتاط انداز میں اظہار کیا۔ ابا جان کا مقصد اس عزیز روی [illegible] سے اپنے بارے میں کوئی رائے قائم کرانا ہی ہو گا، کوئی مثبت رائے۔ [illegible] سال تک وہ سفر ہی کرتے رہے تھے، انھوں نے تبت کا ذکر [illegible] کیا، نواب اشتیاق و انہماک سے سب کچھ سنتا رہا۔ ابا جان نے [illegible] کی جانب سے اپنے لیے کوئی اطمینان ہی محسوس کیا ہو گا جبھی رخصت [illegible] اجازت چاہی۔ نواب نے اُن سے کچھ دیر اور بیٹھنے کی گزارش [illegible] ابا جان نے کہا، یہ اُن کی عزت افزائی ہے مگر انھیں احساس [illegible] کہ نواب کو کنگ کوٹھی کی دعوت میں شرکت کرنی ہے، جواب [illegible] نواب بولا کہ وہ ایک معزز مہمان کے لیے وہاں تاخیر سے بھی جا سکتا [illegible] کہنے لگا، کیا ہی مناسب ہو کہ ابا جان رات کا کھانا کھا کے رخصت [illegible] سورج غروب ہوا چاہتا ہے اور رات کے کھانے میں اب دیر [illegible] کتنی رہ جاتی ہے، وہ کنگ کوٹھی کی دعوت میں اپنی شرکت سے [illegible] سکیلے قاصد بھیج سکتا ہے مگر ابا جان نے اُس سے معذرت کر لی اور کہا کہ اُن کی وجہ سے وہ یہ اہم دعوت منسوخ نہ کرے، وہ حیدرآباد ہی میں ہیں، کسی وقت بھی طلبی پر حاضر ہو جائیں گے۔

وہ اُٹھ کے پہلے والے کمرے میں آ گئے تھے اور ناشتے کی میز پر نہیں تو بعد میں کسی لمحے پھر اُن کے درمیان ہیرے کا ذکر آنا چاہیے تھا اور ابا جان کے جانے سے پہلے نواب کو اُس کی قبولیت کے سلسلے میں تامل کا بھی اعادہ کرنا چاہیے تھا، سو ابا جان نے کہا کہ وہ نواب کی طمانیت کے لیے رسید لکھ دیتے ہیں، کسی بھی ادائی کی لیکن وہ اس ارادے سے نہیں آئے تھے، اس ضمن میں نواب کا اصرار اُن کے لیے رنج کا باعث ہو رہا ہے۔

نواب نے خاموشی اختیار کر لی مگر اُس کی آنکھوں میں حیرت موج زن تھی۔ ایک سوال جو وہ بہت دیر سے کرنے کے لیے بے تاب ہو گا، ابا جان کے اُٹھنے سے پہلے آخر اُس نے کر ہی لیا کہ اُس کے مربی نے یہ ہیرا کہیں سے تو حاصل کیا ہو گا؟ اُس کی مراد اُس رقم سے تھی جو ابا جان نے ہیرے کے عوض صرف کی ہو گی۔

ابا جان کچھ سوچنے لگے، سوچتے ہوں گے کہ کیا بتائیں کس طرح حساب جوڑیں۔ وہ گھر تو انھیں بہت یاد آتا ہو گا جس کی دیواریں اور چھتیں انھوں نے اور اُن کے آبا نے اپنے ہاتھوں سے اٹھائی تھیں، وہ ایسا بڑا نہیں تھا مگر اُس کا سایہ بہت بڑا تھا۔ سوچتے ہوں گے کہ امی کی کیا قیمت لگائیں اور اپنی نوجوان بیٹی کی جو کسی سے کچھ کہے بغیر گھر سے چلی گئی تھی اور اُس نوعمر بیٹے کی جو راستے میں بچھڑ گیا تھا۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ فمی کے پیروں میں گھنگرو بندھے تھے اور اُن کا بیٹا جہاں گیر بازار میں پلپا رہا تھا۔ ابا جان کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا مگر دونوں کے اس طرح جُدا ہونے کے بعد وہ اُن کے متعلق کسی خوش گمانی میں بھی نہیں رہے ہوں گے۔ نواب نے انھیں ٹوکا تو وہ کچھ چونک سے گئے اور کھوئے ہوئے لہجے میں بولے کہ یہ ہیرا انھوں نے خود تلاش کیا ہے اور انھیں یقین ہے کہ دنیا کی نظروں سے یہ صدیوں رُوپوش رہا ہے ورنہ وہ کبھی کہیں نہ کہیں اس کا تذکرہ ضرور سنتے۔ اس کی نازک تراش خراش، دمک اور بے داغی کی نمایاں خوبیوں کے علاوہ جس محتاط اور محفوظ حالت میں یہ انھیں دست یاب ہوا، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گئے وقت میں لوگوں کو اس کی قدر و مالیت کا خوب احساس تھا، کوئی عجب نہیں کہ یہ کسی بادشاہ کے تاج میں جڑا ہو یا کسی ملکہ کے ہار میں، وہ اتنا ہی بتا سکتے ہیں کہ کسی حکومت کے زوال کے وقت اسے چھپا دیا گیا تھا اور اب انھوں نے دریافت کیا ہے اور اتفاقاً نہیں۔ انھوں نے نواب کے شوق کا پارا تیز کرنے کے لیے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مناسب سمجھا کہ اُن کے پاس ایسے اور بھی نوادر ہیں۔ وہ اشارہ ہی کر سکتے

تھے۔ نہ نواب کو یقین آ رہا تھا، نہ اُسے یقین دلانا کسی طور ممکن تھا کہ
ان کے پاس تو صندوق بھرے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے نواب سے کہا، اُن
کی خواہش ہے اگر باریابی کا کوئی وسیلہ پیدا ہو جائے تو وہ چند نوادر
حضور نظام کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کریں۔ اُنھیں
فوراً کچھ خیال آیا ہو گا۔ احتیاط کا خیال، اس لیے دوسرے ہی لمحے
انھوں نے نواب سے کہا، باریابی کا امکان نظر آتے ہی وہ جلد از جلد
یہ نوادر یہاں لے آئیں گے۔ یوں حیدرآباد میں مستقل قیام کی صورت
میں کبھی نہ کبھی تو انھیں یہاں لانا ہی ہے۔

رخصت ہوتے وقت مارٹی کے بموجب نواب کی آنکھیں چمک
رہی تھیں اور وہ بہت بے قرار سا نظر آتا تھا، اباجان کو حویلی کے
خاص دروازے تک چھوڑنے آیا اور ان سے بغل گیر ہو کے بولا کہ وہ
انھیں جلد ہی زحمت دے گا۔

اباجان کوئی آٹھ بجے کے قریب ہوٹل واپس پہنچے تھے اور
رات کے تقریباً ساڑھے دس بجے ہوں گے، ہوٹل کے ایک ملازم
نے آ کے اطلاع دی کہ نواب حشمت جنگ ہوٹل میں موجود ہے اور
اباجان سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ مارٹی اور زورا اباجان کا منہ
دیکھنے لگے مگر اباجان کا چہرہ پُرسکون رہا، یہ سنتے ہی وہ کمرے سے
چلے گئے اور نواب کو لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ پانچ
آدمیوں کے لیے لیا گیا تھا، پورا ایک گھر سا تھا، نشست گاہ کے
علیحدہ حصے میں اباجان نے اُسے بٹھایا اور اس کی بے تکلفانہ آمد
پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ نواب نے اس بے وقت کی زحمت پر معذرت
چاہی اور کہنے لگا کہ وہ کنگ کوٹھی کی دعوت سے واپس آ رہا تھا، سوچا،
یہ ہوٹل نہایت نزدیک ہے، اپنے محسن سے ملاقات کرتا چلوں۔

اباجان نے کہا، اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ اپنے معزز
مہمان کا کس طرح شکریہ ادا کریں۔

نواب نے خوش اطواری سے جواب دیا کہ مہمان تو اباجان ہیں،
ان کے جانے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ اس نے ہوٹل سے اپنے
غریب خانے پر منتقل ہونے کی درخواست بھی ان سے نہیں کی، اصل
میں یہی پشیمانی اُسے یہاں کھینچ لائی ہے۔ وہ اباجان سے التماس
کرنے آیا ہے کہ اُسے اپنی مہمانی کے شرف سے نوازیں، ازراہِ کرم
انکار نہ کریں۔

اباجان نے کہا کہ وہ نواب کی اس نوازش کے بے حد ممنون
ہیں، جس خوش نظری و خوش دلی کا انھوں نے اظہار کیا تھا، نواب
کی یہ خواہش اس کے عین مطابق ہے اور ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتی
ہے۔ انکار کی کسے مجال، وہ ابھی چلے چلتے ہیں مگر انھیں اجازت
دی جائے تو وہ لب کشائی کی جرأت کریں کہ ابھی بہ وجوہ ان کا یہاں
مجبوری ناگزیر ضروری ہے، انھیں یہاں کوئی بے آرامی نہیں ہے،
اُمور سے فراغت پاتے ہی وہ کسی دن خود آ جائیں گے۔
نواب اصرار کر کے انھیں آزمائش میں نہ ڈالے۔

نواب نے بھی اُن کا عذر تحمل سے سنا اور کہنے لگا، ہمارا
اپنے والا مرتبت بزرگ کی خوشنودی بہر صورت مقدم
جانب سے وہ خاطر جمع رکھیں، ہم نے محض درخواست کی
سوچیے، یہ کیسی عجیب بات ہے، کوئی شخص ہم پر ایسی عنایت
کرے، ہماری رفاقت کا ایسا بڑا آدمی ہو اور اس شہر میں
ہوتے وہ ہوٹل میں قیام کرے، پھر خود ہی بولا، اگر یہاں قیام
مقصود مشاغل اور ارادے کی آزادی ہے تو وہ یقین دلاتا
حویلی میں بھی انھیں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ وہ چاہیں تو
اقامت گاہ کے نزدیک پہاڑی کے اُس طرف، دوسری حویلی
کریں، جہاں اُس نے زندگی کے بیس سال گزارے ہیں، اور
بتایا کہ نئی حویلی میں وہ کوئی تین سال ہوئے منتقل ہوا ہے،
حویلی میں اب اُس کے وہی مہمان قیام کرتے ہیں جو گھر کے
رکھ رکھاؤ سے گھبراتے ہیں، اُس نے پیش کش کی کہ اگر
کریں تو مستقل وہیں قیام کریں، جیسا کہ وہ اباجان کی گفتگو
ہے، حویلی میں وہ تمام لوازم مہیا ہیں جن کی اباجان کو کسی
تلاش ہو سکتی ہے۔ گزشتہ دنوں یہاں کے ایک نواب نے
سلسلے میں بات کی تھی مگر اُس کا جی آمادہ نہ ہوا کہ وہ اپنے
باپ کی نشانی فروخت کر دے، بہت توجہ سے اسے والد مرحوم
تعمیر کرایا تھا البتہ اباجان کی بات دوسری ہے، فروخت کر
بجائے وہ حویلی اپنے کسی شخص کے حوالے کرنا پسند کرے گا
ذوق مستند ہو اور وہ اُس کی نگہبانی اسی طرح کر سکے جس طرح
مکیں کرتے رہے ہیں۔ کوئی جگہ ترک کرنے کے بعد اس سے
کی یہ خواہش بھی عجیب ہے لیکن ہے ایسا ہی، شاید وہ ذہنی
ابھی تک پرانی حویلی میں مقیم ہے۔

اباجان نے قطع کلام کی معذرت چاہتے ہوئے کہا کہ
کو اپنا مستقل مسکن بنانا پسند نہیں کریں گے کیونکہ نواب اُن
اُس کی قیمت لینا پسند نہیں کرے گا اور یہ ایک طرح اُن کے
ایک ناخوش گوار صورت ہو گی، کیا وہاں اُن کے سینے میں
خلش گردش نہیں کرتی رہے گی کہ انھوں نے اسے کسی بدلے
چیز کے تبادلے میں حاصل کیا ہے۔ نواب کے لیے یہ صورت حال
ہے، کسی آسودگی کا سبب بن سکے، ان کے لیے نہیں۔ للہ
ذکر ہی چھوڑ دیا جائے اور کسی ایسے مکان کی بات کی جائے
نواب سے کوئی تعلق نہ ہو۔

نواب نے کہا، اُسے معلوم تھا کہ ابا جان سے اُسے یہی کچھ سُننے کو ملے گا۔ اُن کی یہ صاف گوئی اُسے اچھی لگی ہے لیکن عارضی طور پر وہاں منتقل ہو جانے میں کیا حرج ہے؟ اُس نے دوبارہ ابا جان کو یقین دلایا کہ وہاں اُن کے مشاغل میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔ اُس نے مسکرا کے کہا، وہ ضمانت دے سکتا ہے کہ انھیں یہاں سے زیادہ سکون میسر ہوگا۔ انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی تاہم ابا جان نے جواب میں وہی عذر کیا جو پہلے کر چکے تھے۔ انھوں نے کہا، نواب حشمت جنگ کا مہمان ہونا اُن کے لیے سعادت ہے۔ وہ تو نہایت کم حیثیت آدمی ہیں اور یہ کسی صاحبِ حیثیت کے لیے بھی ایک بڑا اعزاز ہے۔ وہ ضرور حویلی میں آ کے ٹھیریں گے لیکن چند دن بعد۔ چند دنوں کے لیے انھیں معذور سمجھا جائے۔

نواب نے پھر کچھ نہیں کہا۔ ابا جان نے جائے کے لیے کہا تھا لیکن اُس نے لیموں کا شربت نوش کیا اور تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا۔ باتوں باتوں میں بولا، ابا جان کے جانے کے بعد اُس نے اپنے معتمد کو ہدایت کی تھی کہ وہ اُن کے لیے کوئی حویلی نظر میں رکھے۔ "ہمارے ذہن سے اُتر گیا تھا، معتمد کی نشان دہی پر ہمیں یاد آیا، چند مہینے ہوئے ہمارے حضور کے ایک عزیز کی حویلی کی بات چل رہی تھی، صاحبِ خانہ کو بڑھاپے میں پے در پے حادثات پیش آئے۔ بھرا پُرا گھر اُجڑ گیا۔ نتیجتاً وہ دماغی طور پر ایسے متاثر ہوئے کہ ترکِ دنیا کی ٹھان لی۔ سب کچھ بیچ باچ کے بیٹیوں مسکینوں میں تقسیم کر دیا، کچھ جائداد رہ گئی تھی، اُس کا معاملہ نمٹا کے مستقلاً بیت اللہ جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کہا نہیں جا سکتا کہ اُس جائداد میں وہ حویلی ابھی تک باقی ہے یا نہیں جس میں وہ خود رہتے تھے، ہمیں خریدنے کی پیش کش کی گئی تھی مگر ہم اِن دنوں ریاستی امور میں بے پناہ مصروف ہیں، کسی اور جانب توجہ نہ دے سکے۔ وہ حویلی غریب خانے سے کچھ دُور ہے، گو اتنی بڑی نہیں مگر نہایت نفاست اور شوق سے تعمیر کی گئی ہے، کاری کے لیے کاری گر دلّی سے بلوائے گئے تھے۔ تین چار بار ہمارا وہاں جانا ہوا ہے۔ اگر واقعی اب تک اُس کا سودا نہیں ہوا ہے اور ہمارے عزیز کا ارادہ اُس کی فروخت کے سلسلے میں مستحکم ہے تو رہنے کے لیے جگہ عمدہ ہے۔ بیش قیمت سامان سے بھی مزیّن ہے، جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے ساز و سامان سمیت ہی اُن کا ارادہ ہے۔ آئندہ دو ایک دن میں۔" اُس نے ابا جان سے کہا، "اُس کے متعلق ہم کوئی صحیح بات بتا سکنے کے موقف میں ہوں گے۔"

وہ کوئی پون گھنٹے تک رہا۔ ابا جان، زورا اور مارٹی اُسے نیچے موٹر تک رخصت کرنے آئے، ہوٹل کا منیجر اور عملے کے کئی لوگ اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔

اُس کے جاتے ہی زورا کو ابا جان نے تجمل کی خیریت معلوم کرنے بھیج دیا تھا۔ زورا اُن سے کہہ کے آیا تھا، اگر اُسے دیر ہو گئی اور رات کو آنا مناسب نہ ہوا تو وہ صبح اوّل وقت واپس آ جائے گا۔

کالے نتھے، شامو، جمرو اور منگو کی نگاہیں تجمل کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ درمیان میں اُس کی پیشانی پر چند لمحوں کے لیے شکنیں پیدا ہوئی تھیں مگر زورا کے خاموش ہو جانے پر وہ اِرد گرد دالانوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ زورا کو اُس نے روک لیا تھا۔ اُسے آئے ہوئے وقت گزر گیا تھا۔ دالانوں کے دو بجے ہوں گے، کچھ لوگ چلے گئے تھے مگر بڑی تعداد ابھی موجود تھی۔ صحن اور دالان میں وہ اُدھر اُدھر ہر جانب اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ تجمل چوکی سے اُٹھ گیا، پھر تو سبھی بیدار ہو گئے۔ تجمل نے کالے دادا سے کہا، وہاں سب کے لیے کچھ دیر کمر سیدھی کر لیں۔ کالے دادا خود کئی بار تجمل کو ٹوک چکا تھا اور تجمل کے اشارے ہی کا منتظر تھا۔ صحن میں حویلیاں بچھی تھیں، اکثر لوگ وہیں دراز ہو گئے۔ صرف چند باہر گئے ہوں گے جن کے ٹھکانے نزدیک تھے۔ زورا، کالے نتھے، شامو، جمرو اور منگو بھی تجمل کے ساتھ اوپر چھت پر چلے آئے تھے۔ سب کے جسم ٹوٹ رہے تھے، شامو اور منگو تو بستر پر لیٹتے ہی غافل ہو گئے لیکن باقی سب جاگتے رہے۔ صبح کے وقت کالے نتھے کی آنکھ لگی ہی تھی کہ تجمل نے اُسے اُٹھا لیا۔ زورا جاگ ہی رہا تھا۔ اُوپرے پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا اندھیرا ابھی تک ہر سو طاری تھا۔ تینوں نے جلدی جلدی غسل کیا اور لباس تبدیل کر کے عمارت سے نکل آئے۔ اُن کی آہٹ پر دو تین آدمی ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھے جنھیں کالے دادا نے چوکسی پر لگایا تھا۔ تجمل اُن سے یہ کہہ کے آگے چل پڑا کہ وہ ہوا خوری کے لیے جا رہا ہے، کچھ دیر میں آ جائے گا۔ اُن کے سڑک پر آنے تک اندھیرے کا گہرا پن پھیکا پڑنے لگا تھا۔ دُور دُور تک کوئی سواری نہیں تھی، وہ پیدل ہی چلتے رہے، کوئی میل بھر بعد انھیں ایک تانگا نظر آ گیا۔

ہوٹل میں کمرے کے دروازے پر انھیں صرف ایک بار دستک دینی پڑی۔ دروازہ کھل گیا۔ نشست گاہ میں مصلا بچھا ہوا تھا، شاید ابا جان نماز پڑھ رہے تھے، تجمل کو دیکھتے ہی گلے سے لپٹ گئے۔ تجمل بھی دیر تک انھیں سینے سے چمٹائے بے سُدھ کھڑا رہا، پھر اُسی نے انھیں صوفے پر بٹھایا اور بولا، وہ انھیں اپنی صورت دکھانے اور اتنا کہنے آیا ہے کہ ابھی شاید کچھ دن اور لگیں، اُسے اچھی طرح احساس ہے کہ ابا جان کے ذہن میں کیسے کیسے سوال اُمڈ رہے ہوں گے لیکن اُس کے پاس وقت کم ہے، اچھا ہوگا کہ وہ سویرے سویرے چلا جائے۔ آتے ہی واپسی کی جلدی پر ابا جان کچھ کبیدہ سے ہو گئے، کہنے لگے، "اگر یہی مناسب ہے تو وہ کیا کہہ سکتے ہیں۔" وہ اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کریں گے۔

تجمل نے انھیں سمجھایا۔ "ابھی آپ سے کیا بولیں بابا! بس یہ سمجھ

کہ گھڑی نہیں آئی ہے، اپنے کو خانم کا انتظار ہے۔"

"یقین کیجیے، اِس اندھیرے سے مجھے اور گھٹن ہوتی ہے۔ میری عقل حیران ہے، مجھ سے سب کچھ مخفی رکھا جا رہا ہے۔ خدا کے لیے مجھے کچھ بتائیے۔" ابا جان نے فریادی لہجے میں کہا۔ "مجھ پر بھروسا کیا جائے، میں جاننا چاہتا ہوں کہ خانم کا اس میں کیا دخل ہے؟"

"ابھی ٹھیک سے ایک دم کچھ نہیں بولا جا سکتا پر لگتا ہے، خانم کا اس میں کوئی سرا ملتا ہے، اُس کے آنے پر ہی کوئی صاف بات سامنے آ سکتی ہے۔" تجمل نے آہستگی سے کہا۔

"مجھے کھل کے بتائیے، باہمی مشورے سے بھی کبھی کوئی اچھی راہ نکل آتی ہے۔" ابا جان نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اتنا سمجھ سکتا ہوں کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے جس کا جاننا میرے لیے ضروری نہ ہو یا مناسب معلوم نہ ہوتا ہو، اس طرح مجھے کسی مزید اُلجھن سے دُور رکھنا مقصود ہو، کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے مگر یہ صورت میرے لیے بڑی ناقابلِ برداشت ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھاؤں گا۔ نواب حشمت جنگ کی بات زورا نے آپ کو بتائی ہوگی، میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا ہے اور میں اُسے بتاتا بھی کیا۔"

"وہ آپ نے ٹھیک کیا۔ وہ حویلی میں جانے کو بولے تو آپ چلے جانا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے مگر مجھے بار بار گمان ہوتا ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہو گئی ہے۔" وہ بے چینی سے بولے۔ "آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟"

"غلطی کے بعد اُس پہ دھیان دینا بیکار ہے بابا! آگے کی بات بولو اور ایسے آپ نے کوئی غلطی بھی نہیں کی ہے پر آگے آپ اُس کو ابھی کچھ نہ بولیں، اُدھر بھی ایک اصیل نواب ہے، گوتوی اُس کی باہر کو چڑھی ہوئی ہے۔"

"زورا نے مجھے بتایا ہے کہ بیچ میں کسی نواب کا معاملہ ہے۔" ابا جان نے اضطراری انداز میں پوچھا۔ "کون ہے وہ؟"

"ہے ایک نواب کی اولاد نواب!" تجمل نے تلخی سے کہا۔

"مگر وہ چاہتا کیا ہے؟"

"کیا بولیں آپ کو بابا!"

"نواب حشمت جنگ سے آئندہ روابط کے لیے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ میرا دماغ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے کسی ایک طرف مرکوز رہے۔" تجمل کا چہرہ دیکھ کے رُک گئے اور جھجکتے ہوئے بولے۔ "ویسے آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔"

تجمل نے کوئی جواب نہیں دیا، سر جھکائے سوچتا رہا۔ ابا جان کوئی غلط بات نہیں کہہ رہے تھے۔ حیدرآباد میں میرا اور پیرو کا یکایک اُتالدین روپوش ہو جانا، یہاں آ کے تجمل کا اُن سے دُور رہنا کسی نواب کا ذکر اور خانم کا نام۔ ابا جان تجمل کے بنے ہوئے تو نہیں تھے، شاید تجمل کا خیال تھا کہ دو ایک دن کی بات ہے، جب تک خانم آ ہی جائے گی۔ سوا ابا جان پر وہ سب آشکار کیوں کیا جائے جس سے تشکوں میں اضافہ ہی ہوگا مگر آج نہیں تو کل، پھر کسی وقت ابا جان کو یہ سب معلوم ہونا ہی تھا۔ اُسے چپ دیکھ کے ابا جان نرمی سے بولے۔ "کیا سوچنے لگے، بخدا میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا، مجھے کچھ مت بتائیے۔"

"نہیں بابا! مجبوری کی بات نہیں ہے۔" تجمل نے سر اُٹھا کے کہا۔ "آپ سب ٹھیک بولتے ہو، اب کون سا پردہ رہ گیا ہے جو آپ سے کچھ چھپایا جائے۔" کسی تمہید کے بغیر وہ کہنے لگا۔ "پچھلی مرتبہ جب لاڈلے کے ساتھ اِدھر آنا ہوا تھا تو راستے میں ایک جگہ جہاں گیر دکھائی دے گیا۔ بیچ میں آٹھ سال کا چکر تھا، پر لاڈلا چھوٹے کو جلدی پہچان گیا۔ اُسی کا پیچھا کرتے کرتے ہم دونوں خانم کے گھر تک پہنچ گئے جو بازار میں رہتی تھی۔"

بازار کے نام پر ابا جان کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ کالے نتھے نے مجھے نہیں بتایا لیکن یہ دیکھ کے تجمل کے ہونٹوں پر زہر بھری مسکراہٹ اُبھر آئی ہوگی۔ ایک بار ضرور جی میں آیا ہوگا کہ ساتھ ہی فہمی کی کہانی بھی دُہرا دے۔ وہ ہونٹ کاٹ کے رہ گیا اور اُس نے ابا جان سے کہا کہ جہاں گیر میرٹھ میں اُن سے بچھڑ کے جگہ جگہ کی ٹھوکریں کھاتا ہوا بھوپال چلا آیا تھا اور وہاں ایک گھریلو ملازم کی حیثیت سے اُسے سر چھپانے کی جگہ مل گئی تھی۔ خانم اُس زمانے میں نواب کے ہاں مجرا کرنے گئی تھی۔ وہیں اُس نے کس مپرسی کے عالم میں جہاں گیر کو دیکھا اور نواب سے اُس کو مانگ لیا۔ خانم نے بے شمار پیاموں کے باوجود شادی نہیں کی تھی۔ تجمل نے کہا، اُسے یقین ہے کہ خانم نے بازار کی زندگی کی ابتدا سے خود کو گانے تک پابند کر رکھا تھا، بازار میں رہتے ہوئے بھی وہ بازار سے بیگانہ تھی۔ اُسے قدرت نے صورت و حُسن کے ساتھ بہت اچھی آواز سے بھی نوازا تھا، آواز ہی اُس کی زندگی تھی، اُسی کو جِلا دینے کے لیے وہ شب و روز مستغرق رہتی تھی۔ بہت عرصے سے اُس نے خود کو چند مخصوص لوگوں اور خاص مجروں تک محدود کر لیا تھا۔ جہاں گیر کے آنے کے بعد گانے کی طرف سے اُس کی توجہ کم ہو گئی، صرف نواب عالم تاب کے لیے وہ مجرا کرتی تھی اور نواب کی تمام مہربانیوں کے باوجود کسی اور زندگی کی آرزو مند تھی، نجات کے کسی ایک موقع کی تلاش میں۔ سب سے زیادہ اُسے جہاں گیر کا خیال تھا۔ وہ اُسے اعلا تعلیم دلانا چاہتی تھی جو اُس ماحول میں کسی طور ممکن نہیں تھا۔ بازار میں آنا آسان، بازار سے نکلنا مشکل ہوتا ہے، بے شمار لوگ اُسے خانہ نشین بنانے کے لیے آگے بڑھے لیکن کسی ایسے ہی سہارے پر بھروسا کیا جا سکتا تھا جس کی ایمان داری میں کوئی شبہ نہ ہو۔ بازار سے جانے والی بیشتر عورتوں کے لیے

والسی پر بازار کی پناہ بھی تنگ ہو جاتی ہے...... یہی کچھ تھا کہ اُس کے دروازے پر وہ دونوں نمودار ہوئے۔ جہاں گیر کے لیے اپنا گم شدہ بھائی مل جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا اور خانم تو اُسے ہر حال میں خوش دیکھنے کی خواہش مند تھی مگر اس حقیقت کا دوسرا پہلو خانم کے لیے بڑا سانحہ تھا کہ اُس کا رشتہ اُس سے بچھڑ جائے گا۔ اب بِجّھل کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ وہ خانم سے بھی ساتھ چلنے کو کہے، جہاں گیر کے بغیر اُس کی زندگی خالی خالی ہو جاتی، کوئی اور عورت سامنے ہوتی تو بِجّھل کبھی ایسی پیش کش نہ کرتا، کوئی اور عورت بھی اس طرح اجنبیوں کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوتی۔ بِجّھل نے اُسے سمجھایا تھا کہ وہ جائداد وغیرہ چھوڑ کے یوں ہی چپکے سے نکل جائے لیکن جائداد معقول تھی، اُسے ایسے لٹانا بھی نہیں چاہیے تھا۔ خانم نے راز داری کی پوری کوشش کی تھی مگر یہ خانم کی بات تھی، بازار کی سب سے ممتاز عورت کی لہٰذا چھپی کیسے رہ سکتی تھی، نواب عالم تاب کو بھی علم ہو گیا، اُس نے قاصد بھیج کے خانم کو حویلی میں طلب کیا مگر خانم بھی کوئی فیصلہ کر چکی تھی، نہ گئی۔ قاصد دوبارہ بھی آیا، زر و جواہر اور ملبوسات سے بھرے ہوئے خوان کے ساتھ۔ نواب کا اشارہ واضح تھا، خانم نے اُسے پھر واپس کر دیا۔

بِجّھل نے شاہ کبیر کا واقعہ ابا جان کو نہیں سُنایا اور کہا، تمام تر احتیاط کے باوجود آخری لمحوں میں جب وہ اسٹیشن پہ تھے، نواب عالم تاب اپنے ساتھ مسلح آدمیوں کا قافلہ لیے سامنے آ گیا، اُس نے خانم سے اصرار کیا کہ وہ واپس چلی چلے۔ بِجّھل کو درمیان میں بولنا پڑا۔ اُس نے دُور کھڑے ہوئے نواب کے ساتھ آنے والے آدمی اور اُن کے تیور دیکھ لیے تھے۔ نواب کو شبہ تھا کہ خانم کے ارادے میں اُس کی مرضی کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا مجبوری کو۔ اسٹیشن پر کسی ہنگامہ آرائی سے بچنے اور نواب کا وہم دُور کرنے کے لیے بِجّھل نے تجویز پیش کی کہ وہ اُن کے درمیان سے ہٹا جاتا ہے، خانم اپنی زبانی اپنے فیصلے سے نواب کو مطلع کر دے یعنی اب بھی موقع ہے، وہ چاہے تو نواب عالم تاب کے ساتھ واپس جا سکتی ہے۔ خانم سے اپنے دیرینہ مراسم کی وجہ سے نواب کو آس بندھی ہوئی تھی کہ خانم اُس کے حق میں فیصلہ دے گی مگر خانم نے معذرت کر لی۔ پھر نواب نے بھی کوئی حجت نہیں کی، وہ بہت آزردہ ہو گیا تھا، خانم کی زبان سے انکار سُن کے گُنگ کھڑا رہا اور واپس چلا گیا۔ اس کے بعد خانم سے نواب کا رابطہ ممکن نہ رہا۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ خانم کے ہاں چار پانچ روزہ قیام میں بازار کے لوگوں نے بِجّھل اور بابر کے چہرے اچھی طرح دیکھے تھے لیکن وہ اور کچھ نہیں جانتے تھے۔

مارٹی نے چائے منگوالی تھی اور پیالیاں بنا کے اُن کے سامنے رکھ دی تھیں، بِجّھل رُک کے چائے پینے لگا۔ ابا جان کا منہ کھلا ہوا تھا، جتنی دیر تک بِجّھل چائے پیتا رہا، وہ گُم بیٹھے اُسے گھ...
بیڑی سُلگاتے ہوئے بِجّھل نے یک بارگی اپنی بوجھل پلکیں...
اُن کی جانب دیکھا۔ وہ سٹ پٹاتے ہوئے بولے "اور یہ...
بِجّھل نے اُن کی بات کاٹ کے کہا "پرسوں رات...
نواب کی حویلی کی طرف گئے تھے۔"

"آپ وہاں گئے تھے؟"

"ہاں، ایک بار جا کے اُس کو دیکھنا تو تھا ہی۔"

"تو کیا اُس نے قبول کر لیا؟"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہو؟" بِجّھل نے ترشی...

"پھر کیا اُس نے خانم کی شرط عائد کی ہے مگر اس...
کو چارہ بنانا کیسے.... کیسے، کم از کم میں...."

"آپ جو سمجھ رہے ہو ویسا نہیں ہے۔" بِجّھل نے...
آواز میں کہا۔ "مجھ کو پتہ تھا، آپ ایسا ہی بولو گے۔ آپ کا...
بڑا ہے بابا! خانم کی شرط وہ تب رکھتا جب اُس نے اپنے...
فرمے داری لی ہوتی۔"

"پھر آپ! آپ نے کیوں خانم کو؟...." ابا جان...
خاموش ہو گئے۔

"اُدھر نواب کا بڑا بھائی سامنے آیا تھا، بڑا نواب...
اونچی حویلی ہے اُس کی، ہم اپنی طرف سے جتنا بول سکتے...
تھا پر وہ کچھ اور بولتا رہا۔"

"کیا، کیا؟" ابا جان ہذیانی انداز میں بولے۔

"وہ اپنے کو اندر لے گیا تھا، اندر چھوٹا نواب تھا...
وہ جب ہم نے پہلے دیکھا تھا، اُس سے آدھا بھی نہیں ر...
ابا جان کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں، بِجّھل نے جبر...
نواب عالم تاب کو دیکھا تھا، انھیں بتایا اور چپ ہو گیا...
ابا جان کے ہونٹوں کو بھی مہر لگ گئی تھی، دیر تک...
کی طرح بیٹھے رہے پھر بد حواسی سے بولے "آپ کے خیال...
خانم کے آنے کے بعد وہ اُن دونوں کو آزاد کر دے گا؟...
ہمارے پاس اِس کی کیا ضمانت ہے، انھیں رہا کرتے ہوئے...
اندیشے اُس کے پیشِ نظر نہ ہوں گے؟"

"کوئی ضمانت نہیں پر ایسا ہونا تو نہیں چاہیے۔ اُس...
سے اور کیا بیر ہو سکتا ہے، جو لوگ راستہ چلتے لوگوں کو اس طرح...
ہیں، اُن کو آزاد کر دینے کے بعد انھیں کون سی پروا ہو گی۔"

"لیکن نواب لوگوں کا دماغ انھی کی طرح سوچتا ہے۔...
متوحش لہجے میں بولے۔ "بعد میں بھی وہ اپنے منہ سے نکلا...
ثابت کرنے کے لیے انکار کر سکتا ہے۔ نوابوں کی ضد اُن...

...بھی مشہور ہے۔"

"بعد میں بات دوسری ہے، تھوڑی بہت اُس کو بھی اپنے
...ے میں جانکاری ہے۔ معلوم ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اُس نے چھپا
...رکھے ہیں، کون اُن کے لیے اُس کے پاس آئے تھے، کچھ اُن دونوں نے
...بھی اُس کو بولا ہو گا، کچھ ہم بھی بول کے آئے ہیں۔ جو باقی رہ گیا ہے،
...وہ اُس کو دوست سمجھا دیں گے۔ ہم ہتھیار ساتھ رکھ کے ہی حویلی
...گئے تھے، اُن کا وقت نہیں آیا لیکن وقت تو کبھی بعد میں بھی آ
...سکتا ہے۔"

"مگر یہ کوئی اچھی صورت تو نہ ہو گی۔"

"یہ تو اُس کے سوچنے کا کام ہے۔"

"اگر اُسے کسی طرح خانم کی آمد کا یقین دلایا جائے تو شاید...."

بِجّھل کو ہنسی آ گئی۔ "نواب حشمت جنگ کو بول کے؟"

"نہیں، میرا مطلب ہے۔" ابا جان گھبرا کے بولے۔ "مگر ذریعہ اُس
...بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔"

"اُس کو ابھی سنبھال کے رکھو، وقت پہ شاید کام آ جائے، آپ
...نے دھیان نہیں دیا۔ زیادہ اُس بڑے نواب کو چھیڑنے سے اُس کا مغز
...اور پھر سکتا ہے۔ اپنے آدمی اُس کے پاس ہیں اور حویلی اُس کی
...تنی اونچی اور بڑی ہے کہ دو آدمی اُس کے لیے کوئی بات نہیں رکھتے۔
...دھر قانون بھی اپنا ولایتی والا نہیں ہے۔"

"مگر یہ تو بہت ظلم ہے، یہاں ایسا اندھیر بھی نہیں ہوتا ہو گا۔
...مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگ رہی ہے کہ خانم پہلے وہاں جائے، یہ
...تو کوئی بات نہ ہوئی، اس سے پہلے ہمارے آدمیوں کو اُسے چھوڑنا چاہیے۔"

"پھر آپ ہم کو بولو، ہم کدھر جائیں؟"

بِجّھل کے اس سوال پر ابا جان اُس کی صورت دیکھتے رہ گئے۔
بِجّھل نے بھی اُن کے جواب کا انتظار نہیں کیا، صوفے سے اُٹھ گیا۔
...جانا خوب ہو چکا تھا، ابا جان بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ بِجّھل نے
...اُن کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو وہ حواس باختگی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔
بِجّھل نے انھیں گلے سے لگا لیا اور آہستگی سے بولا "مستی میں آدمی
...کے سیدھے ہی ہاتھ چلاتا ہے اور نواب تو اِن دنوں ویسے بھی دیوانہ
...ہوا ہے، دیوانوں کے ساتھ بات کرنے میں چوکسی کی ضرورت
...زیادہ پڑتی ہے۔"

سڑکوں پہ دن کی چہل پہل ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ تمام
...دکانیں بند تھیں، سواری سامنے موجود تھی لیکن وہ کچھ دُور تک پیدل
...چلتے رہے اور ہوٹل سے کئی فرلانگ آگے آ کے انھوں نے تانگے کو
...اشارہ کیا۔ زوراور ہوٹل میں رہ گیا تھا، صرف کانتے اُس کے ساتھ
...تھا۔ بازار پہنچتے پہنچتے دھوپ اور پھیل گئی تھی، جس وقت وہ اڈے

کی عمارت میں داخل ہوئے، کالے دادا اور چند آدمیوں کے سوا باقی سب سو رہے تھے مگر اُن کے آتے ہی سب کو بیدار کر دیا گیا۔

اُس روز ناشتے کا انتظام بازار کے ایک ہوٹل والے نے کیا تھا۔ دوپہر اور رات کے لیے بِجّھل نے کالے دادا کو ہدایت کی تھی کہ کسی اور جگہ سے انتظام نہ ہونے کی صورت میں وہ دیگیں چڑھوا دے۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے وہ کالے دادا اور اڈے کے دس پندرہ آدمیوں کے ساتھ اڈے سے نکلا۔ سب بازار کے علاقے سے دُور ایک جگہ جا کے ٹھیرے۔ تنگ و تاریک گلی میں ایک شکستہ سا مکان تھا۔ کالے دادا کو مکان کے باہر کھڑے ہوئے ایک شخص نے پہچان لیا۔ وہی بھاگا بھاگا اندر گیا اور واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی تھا، بھولے دادا۔

اُسے یقین نہیں آیا کہ آکا کو اڈے سے نکالنے والا دادا اُس کے دروازے پر آیا ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اُس کے گھر کی حالت نہایت خستہ تھی اور وہ بِجّھل کو اندر لے جانے سے کترا رہا تھا مگر بِجّھل خود پیش قدمی کر کے اندر داخل ہو گیا۔ مکان مختصر تھا اور باہر کی نسبت اندر کچھ بہتر حالت میں تھا۔ شکستہ دیواروں اور دروازوں کے باوجود ایک سلیقہ ٹپکتا تھا۔ دالان میں پڑی ہوئی چوکی ننگی نہیں تھی، اُس پر گاؤ تکیے کے ساتھ میلی سی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں زور کرنے والی چیزیں اوپر تلے رکھی تھیں۔ اندر لپسینے میں شرابور، جانگیے اور بنیان میں ملبوس دو نو عمر لڑکے بھی تھے۔ بھولے دادا شاید انھی کو زور کرا رہا تھا۔ وہاں جا کے کانتے کو معلوم ہوا کہ بھولے دادا نے اڈے سے نکلنے کے بعد کیسے دن گزارے ہیں۔ گزشتہ دن وہ اڈے کے کئی آدمیوں کی زبانی بھولے دادا کا نام سُن چکا تھا۔ کانتے نے جی میں طے کیا تھا، اگر وقت مِلا تو وہ ایک بار بھولے دادا کو دیکھنے ضرور جائے گا۔ کانتے نے یہ بتا کے مجھے حیران کر دیا کہ بھولے دادا کے سیدھے ہاتھ کی دو اُنگلیاں کٹی ہوئی ہیں۔ میں نے غور نہیں کیا تھا مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ رات جو چاقو اُس نے ناچنے والی لڑکی پر قبضہ کرنے والے پر پھینکا تھا، وہ ان کٹی ہوئی اُنگلیوں کا کرشمہ تھا۔ بھولے دادا کی لڑکپن ہی میں شادی ہو گئی تھی مگر شادی کے پہلے سال اُس کی بیوی اچانک اُس سے جدا ہو گئی۔ کہتے ہیں رات کو سوتے وقت وہ بالکل ٹھیک تھی، صبح بستر پر مُردہ پائی گئی۔ پھر برس گزر گئے، دادا نے دوسری شادی نہیں کی اور نہ کسی عورت کی طرف نگاہ اُٹھا کے دیکھا مگر پھر بازار کی ایک عورت اس قدر پسند آئی کہ اُسے دوبارہ شادی نہ کرنے کا عہد توڑ دینا پڑا۔

اُس زمانے میں دُور دُور تک بھولے دادا کا طوطی بولتا تھا۔ اُس کے بازوؤں میں ڈھلتی عمر کے باوجود ایسی لپک تھی کہ کوئی سامنے نہیں ٹکتا تھا۔ وہ عورت بھولے دادا سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں

تھی، بہلانے کرتی رہی۔ بھولے دادا چاہتا تو اُسے کسی اور طرح بھی حاصل کر سکتا تھا مگر وہ اُسے کسی پھول کی طرح سمجھتا تھا۔ کہتے ہیں پھول تھی بھی وہ۔ نام اُس کا الماس تھا۔ بھولے دادا کا تقاضا شدید ہو گیا تو الماس نے اُس سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا۔ بھولے دادا کے لیے اتنی بڑی رقم کی فراہمی مشکل تھی مگر اُس نے کسی نہ کسی طرح رقم حاصل کر کے اُس کے قدموں پر لے جا کے رکھ دی۔ پھر الماس نے اڈّا چھوڑنے کو کہا۔ بھولے دادا اس پر بھی تیار ہو گیا، تب بھی وہ طرح طرح کے حیلے تراشتی رہی۔ اصل میں اڈّے کے کسی آدمی پر اُسے اعتبار نہیں آتا تھا یا وہ اڈّے کے آدمیوں سے بہت خوف زدہ تھی۔ بھولے دادا تو بازار بلکہ شہر کا سب سے بڑا دادا تھا۔ پھر ایک دن الماس نے عجیب مطالبہ کیا۔ اُس نے کہا، میں یقین کرنا چاہتی ہوں کہ تم کبھی چاقو کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے اس لیے اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں کاٹ کے میرے حوالے کر دو۔ نہ جانے الماس نے بھولے دادا سے کوئی مذاق کیا تھا یا واقعی سنجیدہ تھی مگر بھولے دادا نے دیر نہیں کی، اُسی وقت چاقو نکالا اور پوچھا، کون سی انگلیاں؟ الماس سکتے میں رہ گئی۔ بھولے دادا نے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے کے برابر والی دونوں انگلیاں اُسی وقت کاٹ دیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ الماس یہ دیکھ کے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اَب کوئی عذر اُس کے پاس نہیں رہا تھا۔ بھولے دادا اُسے ساتھ لے آیا اور اڈّے سے نزدیک ایک گھر میں ایک بوڑھی عورت کے حوالے کر دیا۔ پھر اُس نے اعلان کیا کہ آئندہ جمعرات کو اُس کی الماس سے باقاعدہ شادی ہو گی۔ جمعرات میں تین دن باقی تھے مگر اس کا موقع نہیں آیا۔ بدھ کی رات جب بھولے دادا کی طرف سے عورتیں مہندی لگانے پہنچیں تو الماس وہاں نہیں تھی۔ بوڑھی عورت فرش پر بے سُدھ پڑی تھی۔

اڈّے کے آدمیوں نے سارا بازار چھان مارا، الماس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بازار میں اُس کا گانا سننے والے کسی شخص کے ہاں اُس نے خود کو چھپایا ہو گا اور اُسی شخص کی مدد سے وہ حیدرآباد سے نکل گئی ہو گی۔ بھولے دادا نے کسی کو اُس کی تلاش کے لیے متعین نہیں کیا تھا، اڈّے کے آدمی خود ہی اپنے دادا کو خوش دیکھنے کے لیے جگہ جگہ مارے مارے پھرتے رہے۔ حیدرآباد سے نزدیک کئی شہروں میں گئے، یہاں تک کہ بمبئی بھی پہنچے۔ الماس کسی بازار میں نظر نہیں آئی۔ بھولے دادا نے لوگوں کی توقع کے خلاف خاموشی سے یہ صدمہ سہا تھا مگر اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بجھ چکی تھی گو وہ ہمیشہ کی طرح جم کے اڈّے پر بیٹھتا تھا اور ہمیشہ ہی کی طرح اڈّے کے آدمیوں کا خیال رکھتا تھا، یہ لوگ بھی اُسے پہلے سے زیادہ عزت دیتے تھے۔ اس دوران شاہ کبیر نے اچھی طرح اندازہ لگا لیا تھا کہ انگلیاں کٹ جانے سے ا کے چاقو کی گرفت ختم ہو گئی ہے اور اُس کے جسم کی بجلی بھی کچھ تاہم لوگ بھولے دادا کو ایک زمانے سے دیکھ رہے تھے، کس کوئی شکایت نہیں تھی۔ اڈّے کا کام ٹھیک طرح چل رہا تھا روز بھولے دادا اڈّے کے آدمیوں کو زور کراتا اور انھیں چا سکھاتا تھا۔ شہر اور اطراف کا کوئی دادا بھولے دادا کرا کے لیے آگے نہیں آیا۔ کسی کے گمان میں بھی نہ ہو گا کہ بازار پر بھولے دادا کی جگہ کوئی دوسرا شخص بھی ہو سکتا ہے۔ صرف تھا جو شروع میں اُس کے شاگرد کی حیثیت سے رہا، بعد میں چاقو تان کے اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جواب میں بھولے د نہیں اُٹھایا۔ خاموشی کے ساتھ اڈّے سے نکل گیا۔ اُسے اڈّ کر دینے کے بعد بھی شاہ کبیر کو چین نہیں آیا۔ اُس نے اڈ کیا، اڈّے کے ہر آدمی پر اس سے ملنے کی پابندی عائد کی۔ جن آدمیوں نے احتجاج کیا یا جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ بھولے دادا سے رابطہ رکھے ہوئے ہیں، انھیں شاہ کبیر کا پڑا۔ بھولے دادا تنہا رہ گیا تھا۔ وہ کچھ ہی دنوں تک شہر پھر لوگوں سے خبر ملی کہ وہ گلبرگے میں خواجہ گیسو دراز کے مز گیا ہے۔ اُس کے غیاب میں اڈّے کے اکثر آدمیوں کو جانے کیو فہمی رہی کہ وہ ایک دن پھر لوٹ کے آئے گا اور شاہ کبیر سے نکال پھینکے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا یہ دھندلاتا گیا اور اڈّے پر شاہ کبیر کی گرفت روز بہ روز

بہت عرصے بعد جب لوگوں کی یادوں پر گرد پڑ اچانک بھولے دادا پھر حیدرآباد میں دکھائی دیا۔ لوگوں کو تو اب شاہ کبیر کے دل میں اُس کے لیے پہلے جیسا عناد نہیں ر دادا اور بوڑھا ہو کے آیا ہے مگر شاہ کبیر کے ہاں کوئی تھی حالانکہ از خود بھولے دادا نے اڈّے کے کسی آدمی سے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ قصہ مختصر اُسے دوبارہ واپس جب وہ پھر اُسی وقت حیدرآباد آیا جب اڈّے پر شاہ کبیر نہ ر کالے دادا بھی نہیں رہا تھا۔ اُس وقت اڈّے پر آکا بیٹھ لوگ اس اُمید پر جوق در جوق بھولے دادا سے ملنے گئے کو اُس سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے لیکن آکا بھو کے معاملے میں شاہ کبیر سے زیادہ حساس ثابت ہوا۔ جو لوگ اُس سے ملنے کا گناہ کر چکے تھے، انھیں آکا کے سامنے جواب اُٹھانی پڑی۔

بھولے دادا کو بازار کے علاقے سے دُور ایک ٹھکانا مل گیا ا، گزر اوقات کے لیے وہ کوئی چھوٹا موٹا کام کرنا چاہتا تھا مگر کام ے لیے پیسے درکار تھے۔ تن دہی کے کسی کام کے وہ لائق بھی نہیں رہا قا، اڈّے کے پرانے آدمیوں نے ڈھکے چھپے طور پر اُس کی مدد کرنی پاہی مگر اُس کے انکار پر خاموش ہو گئے۔ پھر انھوں نے ایک اور ہیر نکالی، علاقے سے دُور دُور کے چند نوعمر لڑکوں کو بھولے دادا ے پاس بھیج دیا کہ وہ انھیں زور کرائے۔ لڑکوں کی تعداد نہایت محدود ھی اور اُن کا تعلق کسی اڈّے سے نہیں تھا۔ بات پھیلی نہیں، لڑکے بھولے دادا کی خدمت کرتے تھے اور اُس کے لیے روزی کا وسیلہ بن ئے تھے۔ بھولے دادا کی بھی دلی خواہش یہی ہو گی کہ وہ اپنی زندگی میں ھ ایسے لوگ تیار کر جائے جو کسی وقت آکا اور شاہ کبیر جیسے آدمیوں کا امنا کر سکیں۔

اندر بھولے دادا نے تجمّل کو چوکی کے بیچ میں بٹھایا۔ اُس پر ضطراری عالم طاری تھا، وہ تجمّل کے ہاتھ سینے سے لگائے آنکھیں ند کیے بیٹھا رہا۔ اُس نے سب کو مغزیات ملا ہوا دودھ پلایا۔ وہ جمّل کو بازار کے دادا کی حیثیت سے مخاطب کر رہا تھا لیکن تجمّل نے رار ترمیم کی کہ بازار کا دادا اب سرِدست کالے دادا ہی ہے، اس پر کالے دادا اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا اور عاجزی سے بولا کہ مّل کی موجودگی میں وہ اڈّے کی نگرانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بھولے دادا نے بھی دبے لہجے میں خواہش ظاہر کی کہ اڈّے کی ذمّے داری بول کرنا تجمّل ہی کو زیب دیتا ہے۔ وہ دوبارہ اڈّے کے آدمیوں کی بات کا سبب بنا ہے۔ تجمّل نے نرمی سے جواب دیا کہ بھولے دادا کا حکم سر آنکھوں پر مگر اپنی چند مجبوریوں کے سبب وہ اڈّے پر رہنے دادا کی رسم ادائی سے معذور ہے۔ تجمّل کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے وہاں بیٹھا اور اُس نے وعدہ کیا کہ جلد ہی بھولے دادا کے پاس پھر آئے گا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ تجمّل اُسے اپنے ساتھ اڈّے لے جائے گا۔ اڈّے ے جانے کے بعد بھولے دادا نے بازار کے علاقے میں قدم نہیں رکھا تھا اور اس واقعے کو زمانہ گزر چکا تھا۔ تجمّل کو اس کا احساس تھا چنانچہ ملتے وقت اُس نے بھولے دادا سے کہا، وہ اس وقت کچھ الجھنوں میں گھرا ہوا ہے ورنہ اُسے بھولے دادا کو ساتھ لے جانے میں خوشی ہوتی؛ عالم میں وہ اڈّے پر اُس کی پذیرائی نہیں کر سکے گا۔ یہ سن کے ریب کھڑے ہوئے لوگوں نے بے ساختہ کہا کہ وہ انھیں کوئی حکم دے ان کا حکم دے، تجمّل مسکرانے لگا اور بولا "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔"

دوپہر کے کھانے کے وقت اور بعد میں گزشتہ دن کی طرح ے پر بھیڑ لگی رہی۔ سو وہ اجنبیت جو کانتے، شامو، جمرو اور ٹنگو کو حسوس ہو رہی تھی اب اُتنی نہیں رہی تھی۔ اُسی رات تجمّل کی ہدایت کے بموجب علاقے کے تمام گشتی پولیس والوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ بازار سے بھی مختلف عورتیں آتی رہیں۔ شام کو تجمّل نام پلی کے دادا ساجن کے پاس گیا۔ یہ ایک چھوٹا مگر شہر کے دوسرے اڈّوں سے بڑا اڈّا تھا۔ ساجن کے آکا سے اچھے مراسم تھے یا یوں کہا جائے کہ اُسے آکا سے اچھے مراسم رکھنے پڑتے تھے۔ تجمّل کو دیکھ کے وہ بوکھلا سا گیا تھا مگر تجمّل کی آمد کا مقصد جان کے اُس کے حواس کچھ درست ہوئے۔ اُس نے ندامت کا اظہار کیا کہ اپنی طبیعت خراب ہونے کے سبب وہ آکا کے جانے کے بعد تجمّل سے ملنے نہیں آ سکا لیکن اُسے تجمّل کو دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ اُس کے آدمی تجمّل اور اُس کے ساتھ آنے والوں کے لیے آناً فاناً اتنی چیزیں سمیٹ لائے تھے کہ رات کے کھانے کی گنجائش ختم ہو جاتی تھی۔ آکا کے لیے ساجن کے سینے میں بہت کینہ بھرا ہوا تھا۔ تجمّل کے تیور دیکھ کے وہ پھٹ پڑا۔ اُس نے انکشاف کیا کہ نام پلی سے ہونے والی آمدنی کا دسواں حصہ آکا کو جاتا رہا ہے۔ یہ روایت چند مہینے پہلے آکا ہی نے ڈالی تھی، شکایت پر اُس نے ساجن کو دھمکی دی تھی کہ وہ نام پلی پر اپنا آدمی بٹھا دے گا۔ ساجن کہہ رہا تھا کہ وہ کسی مناسب موقع کی تاک میں تھا۔ کچھ نوابوں کی امداد پر اوپر کے لوگوں سے آکا نے بنا رکھی تھی چنانچہ سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اُٹھایا جا سکتا تھا۔

یہ جان کے تجمّل کو جو کہنا چاہیے تھا، وہی اُس نے کہا۔ اُس نے کالے دادا کی طرف دیکھتے ہوئے اعلان کیا کہ آج سے اڈّے کی ساری آمدنی اِسی علاقے کے آدمیوں میں تقسیم کر دی جائے۔

ساجن ساتھ ہی اڈّے پر آیا، اُس کے علاوہ نام پلی کے اور بہت سے آدمی۔ رات کے کھانے کے بعد بھی وہ کہیں رات گئے واپس گئے۔

اڈّے کے بعض لوگ کانتے سے کسی قدر قریب ہو گئے تھے۔ اُن کی زبانی کانتے کو خانم کا نام سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ لوگ کانتے سے تصدیق چاہتے تھے کہ آیا خانم واقعی حیدرآباد واپس آ گئی ہے؟ پہلے تو کانتے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ خانم کی آمد کی خبر اُس سمیت تجمّل اور زورا کے سوا کسی کو نہیں تھی؛ زورا موجود نہیں تھا اور وہ ایسی غیر ذمّے داری کر بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر انھیں کہاں سے سُن گُن ملی؟ ایک تجمّل ہی رہ جاتا تھا۔ غور کرنے پر اس کا جواب ایسا مشکل نہیں تھا۔ کانتے کے دماغ میں پڑی ہوئی بہت سی گرہیں خود بخود کھلتی گئیں۔ تجمّل نے ضروری سمجھا ہو گا کہ یہ خبر اڈّے کے لوگوں سے نہ چھپائی جائے گویا اُسے یقین ہے کہ اڈّے کے آدمیوں میں یا باہر اُن سے متعلق لوگوں میں کچھ ایسے لوگ ضرور ہوں گے جو یہ اطلاع دُور تک منتقل کر سکیں گے۔ بڑے نواب کے لیے جہاں یہ اطلاع تشویش کا سبب ہو گی کہ اُس کے محبوسوں کے پُرسانِ حال شہر

ہیں آ گئے ہیں، وہاں اُن کی آمد اُس کے لیے سکون کا باعث بھی ہوگی کہ اِن لوگوں کا تعلق خانم کے کوائف جاننے والوں سے ہے۔ اب دو نہیں، کئی آدمی سامنے ہیں اور لازم نہیں کہ سبھی بابر اور پیرو کی طرح موٹی کھال کے ہوں، اور کچھ نہیں تو پولیس کی توجہ ہی ان سب کی جانب مبذول کرائی جا سکتی ہے۔ پولیس کے لیے ایک اشارے کا جواز بہت ہوتا ہے اور وہ لوگ جن کا تعلق اڈّے سے ہو، اُن کے لیے جواز تراشنے میں پولیس کو کتنی دیر لگتی ہے۔ سب سے بڑا جواز تو اُن کا اس شہر میں اجنبی ہونا تھا۔ شاید اجنبیت کا یہی احساس مٹانے کے لیے تجّل نے اپنے گردِ مجمع لگا رکھا تھا، اُس کی اُسے اپنے لیے اتنی ضرورت نہیں تھی جتنی دوسروں کے لیے تھی۔ دوسروں کو یہ جتانا لازم تھا کہ یہ اجنبی کسی ایسے احساس کے شکار نہیں ہیں، اس سے پہلے کہ بڑے نواب کے دماغ میں کچھ اور سما جائے، اُسے خانم کی آمد کے سلسلے میں مطمئن کر دینا مناسب تھا۔ گو اور بھی بہت سی باتیں اور اڈّے سے ملنے والی خبریں نواب کو کسی ہیجانی اقدام سے باز رکھنے کے لیے کافی ہونی چاہیے تھیں۔

تجّل اور کانتے کے لیے نواب کی رائیں تھامنا ایسا دشوار نہیں تھا۔ وہ حویلی میں پہرے داروں کا بڑا ہجوم دیکھ کے آئے تھے جو بعد میں اور بڑھا دیا گیا ہوگا مگر تجّل اور کانتے طے کر لیتے تو حویلی میں داخل ہو کر ہی دم لیتے۔ اس طرح کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ہوتا تو وہ ایک پل کی تاخیر نہ کرتے ورنہ اُن کی ذرا سی چوک اُنھیں بہت پیچھے دھکیل سکتی تھی۔ وقت کی طوالت اُنھیں کبھی راس نہ آتی۔ تجّل نے دبے لفظوں میں ابا جان سے کہنا چاہا تھا کہ اُن کے دو آدمی اُن کے پاس نہیں ہیں اور وہ اُن سے مزید دعوے کیے جا سکتے ہیں، دعوے کی وسعت سے ابا جان خوب آشنا ہوں گے۔ بڑے نواب کو بھی یقیناً حویلی سے چلتے وقت تجّل کے کہے ہوئے لفظ یاد ہوں گے۔ مزید کسی پیچیدگی کا خیال تجّل سے زیادہ اُسے ہونا چاہیے تھا۔ اُسے جگ ہنسائی کا خیال بھی تو ہوگا لیکن آدمی کا کچھ ٹھیک نہیں ہے، پل بھر میں بکھر جاتا ہے، کسی بھی وقت کوئی ایسا لمحہ آ جاتا ہے کہ آدمی اپنا ہی آشیانہ پھونک دے، اپنے آپ کو جھنجھوڑ ڈالے۔ نواب خود نہیں تو اُس کے مصاحب اُسے ایسے کسی سرکش، دشمن لمحے سے دوچار کر سکتے تھے۔

کانتے کی آنکھوں میں جیسے اُس کی بینائی واپس آ رہی تھی لیکن جتنا اُس کے سامنے واضح ہوتا جا رہا تھا، اتنا ہی اُس کی رگوں میں اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ بار بار اُسے ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پیچھے سے اُس کی جانب بڑھ رہا ہو۔ وہ اپنی ہی آہٹ پر چونکنے لگا تھا۔ بار بار اُس کے دماغ میں سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا تھا۔ پولیس کسی وقت بھی دستک دے سکتی ہے، کسی وقت بھی کسی بھی طرف سے انہیں گھیرے میں لیا جا سکتا ہے۔ خانم کی آمد سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو؟ اِس کے باوجود نواب انکاری رہا؟ اگر خانم ہی نہیں آئی یا اُس کے آنے میں دیر ہو گئی اور اس درمیان چھوٹے نواب کو کہیں کچھ ہو گیا تو اُس کا بھائی نواب تو... اور وہ دونوں لاڈلے اور پیرو دادا معلوم نہیں [illegible] حال میں ہوں گے۔ کانتے جتنا سوچتا تھا، اُس کے جسم میں [illegible] جمنے لگتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وقت ہاتھ سے نکلا [illegible]

رات کو کھانے کے بعد ابھی سا جن نہیں گیا تھا، گنتی [illegible] والے چلے گئے تھے کہ کالے دادا نے تجّل سے کہا، آکا کے [illegible] آدمی آیا تھا، وہ اُستاد سے ملنے کے لیے ضد کر رہا ہے۔ کالے دادا [illegible] بلند آواز میں تجّل کو بتایا تھا، سبھی نے سُنا تھا۔ تجّل کا جواب [illegible] کے لیے عمارت میں یک دم سناٹا چھا گیا۔ تجّل نے فوراً جواب نہیں [illegible] کچھ توقف کے بعد تنک کے بولا "اُس کو ایسی کیا تکلیف ہے"

"آدمی بولتا ہے اُدھر دوپہر سے ہی رتاں لگائے ہوئے۔" کالے دادا نے تمتمائی آواز میں کہا۔

"بول دو کہ لے آ" ایک ثانیے کے تذبذب کے بعد تجّل [illegible] سے بولا۔ پھر عمارت میں سکوت ہی طاری رہا جیسے سب چلے گئے سب سہمے ہو کے بیٹھ گئے تھے۔ کانتے کو معلوم تھا کہ آکا [illegible] سے قریب کسی مکان میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ [illegible] جاننے کی بے چینی بھی نہیں تھی۔ جس حال میں کانتے نے آخر [illegible] آکا کو دیکھا تھا، اُس کے لحاظ سے اُسے سنبھلنے کے لیے بہت وقت درکار تھا اور اُس کے بعد اُس کا شہر میں دکھائی دینے یا لوٹ [illegible] کوئی امکان نہیں تھا۔ کانتے کو گزشتہ رات آکا کے بارے میں معلوم ہوا تھا اور یہ جان کے تردد ہوا تھا کہ وہ ابھی تک شہر میں [illegible] پھر کانتے خود کو یہ تسلی دے کے چپ ہو رہا کہ تجّل نے اس حال [illegible] آکا کا باہر نکلنا بہتر نہ سمجھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے آکا کی موجودگی میں [illegible] مجبوری سے زیادہ تجّل ہی کی مرضی کو دخل ہو۔ تجّل نے بعض [illegible] وجوہ سے بھی اُسے روک کے رکھا ہوگا۔ کسی ثبوت وبوت کے لیے [illegible] ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اڈّے کا وہ واحد آدمی ہوگا جس سے بڑے [illegible] یا اُس کے اہل کار خاں صاحب نے رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ اُن پانچ [illegible] نے بھی اُسی کی ہدایت پر میرا اور پیرو کا تعاقب کیا تھا۔ اڈّے [illegible] آدمیوں کا خون گرم رکھنے کے لیے بھی اُس کی موجودگی ضروری تھی [illegible] کے عتاب کی خبر سن کے اُن کی آگ ایسی فروزاں نہ رہتی جیسی [illegible] کے ہونے پر تھی۔ نواب کے سلسلے میں مزید معلومات کے لیے بھی [illegible] قریب ہی رہنا چاہیے تھا۔

مگر اب آکا تجّل سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ کانتے کی [illegible] سبھی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ تجّل اور کالے دادا نے [illegible]

کے آدمی کی واپسی کے بعد عمارت میں چھائی ہوئی اضطراب آمیز خاموشی ٹوٹنے کی کوشش کی لیکن اب سب بہت بے کل ہو گئے تھے۔ نام لی کا دادا ساجن بھی گم سُم سا تھا اور بجّل کے سوالات کے جواب کھوئے کھوئے انداز میں دے رہا تھا۔ سب کی نگاہیں بار بار دروازے کی طرف جا رہی تھیں۔ دس منٹ گزرے ہوں گے کہ دروازے سے آہٹیں گونجیں اور ایک ساتھ کئی آدمی اندر داخل ہوئے۔ اُن کے بیچ میں آکا تھا۔ موٹی چادر میں لپٹا ہوا، سر پہ پٹی بندھی ہوئی، ناک اور کنپٹی اور ٹھوڑی پر پھاہے جمے ہوئے۔ وہ عمارت میں سب کی موجودگی سے گویا بے خبر سیدھا چوکی کی طرف بڑھا۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ لوگ اُسے راستہ دینے کے لیے اِدھر اُدھر سمٹ گئے تھے۔ بجّل اُسے آتے دیکھتا رہا۔ چوکی کے پاس آ کے آکا رُک گیا، پھر ایک دم سامنے بیٹھے ہوئے بہت سے لوگ اچھل گئے جب آکا نے چوکی پر چڑھنے کے لیے قدم بڑھائے۔ جانے اُنھوں نے کیا سمجھا ہو، ایک لمحے کے تذبذب کے بعد آکا نے اُوپر چڑھ کے تیزی سے بجّل کے پیر پکڑ لیے۔ کانتے چوکی پر بجّل کے نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ آکا بجّل کے پیر پکڑ کے ڈولتی آواز میں گڑگڑا رہا تھا کہ اُسے معاف کر دیا جائے۔ زندگی میں کبھی اُس سے اتنا بڑا دھوکا نہیں ہوا تھا۔ اب اُسے اُس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک بجّل اُسے معاف نہ کر دے۔

"اپنے کو تجھ سے کوئی بیر نہیں ہے رے!" بجّل نے دھیمی آواز میں کہا اور پہلو بدلنے لگا۔

عمارت میں سوئی بھی گرتی تو آواز آتی، سب بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ اُن کی نظریں بجّل اور آکا پر جمی ہوئی تھیں۔ آکا کہنے لگا کہ وہ ایک بنتی کرنے آیا ہے جس کا اُسے کوئی حق نہیں پہنچتا مگر بجّل نے جہاں اُس کا اتنا خیال کیا ہے، ایک احسان اور کر دے۔ اُسے جدا نہ کیا جائے۔

"کیا بولتا ہے تو؟" بجّل نے ترشی سے کہا۔

"اپن کو اپنے سے الگ مت کرو۔" وہ دبکتی آواز میں بولا۔ اُس نے کہا کہ وہ اب کہیں نہیں جائے گا، زندگی بھر بجّل کی خدمت میں رہنا چاہتا ہے۔

"دھیان کر کے پھر کبھی اپنے سے بات کرنا۔" بجّل نے نرمی سے کہا۔ "کیا اتنا ہی بولنے کو آیا تھا؟"

"اور اپنے پاس بولنے کو کیا رہ گیا ہے دادا!" وہ تڑپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ کہنے لگا، اُسے یقین دلایا جائے کہ بجّل نے اُس کی درخواست قبول کر لی ہے۔ یہ دوسری زندگی اُسے بجّل کی وجہ سے ملی ہے اور اِسے وہ اُسی کی چھاؤں میں گزار دینا چاہتا ہے۔ اب اُسے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ کیسے سراب میں دن گزار رہا تھا۔

آکا کا لہجہ عاجزانہ تھا، اُس میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتا تھا۔ کانتے کو اپنا سینہ پگھلتا محسوس ہوا، اُس نے کبھی کسی دادا کو اپنے [illegible] کے درمیان لوٹ کے اس طرح آتے نہیں دیکھا تھا۔ "جانے دو، جس طرح ہونا تھا، ہو گیا سالا۔" بجّل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اپنے کو سچ پوچھو تو دادا! کوئی دُکھ نہیں ہے۔ قسم سے، خوشی ہے کہ اپنے کو ایک آدمی مل گیا۔" وہ بلکتی آواز میں بولا۔ [اُس] کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ "تم کو پتہ نہیں دادا، تمھاری تلاش میں کدھر کدھر گھوم گھام کے اِدھر آ کے ٹکا تھا پر تم ملا تھا۔"

"جا کے آرام کر، زیادہ مت بول۔"

"تم جب تک کچھ بول نہیں دو گے، آرام اپنے کو نہیں [illegible]"

"اپنے ساتھ تو نہیں چلنے کا رے!"

"تم کوئی حکم کر کے دیکھو دادا! سمجھو کہ پہلا آکا مر چکا ہے۔ سُور کی اولاد بہت چھوٹا تھا، وہ کتا تھا دادا! اُس کو ایک ہی جانا تھا، اُس کو بھول جاؤ۔ یہ سب کچھ تم سے نیا آکا بولتا ہے۔" اُس نے ملتجی نظروں سے کانتے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو بجّل سے سفارش کر دے۔

"کیا چاہتا ہے تو؟" بجّل نے تلخی سے کہا۔

"تمھارا پٹّا مانگتا ہے۔ گلے میں اپنا پٹّا ڈال دو۔ جب تک سانس رہے گی، قسم سے تمھاری چوکھٹ سے ہل کے دے جائے تو اپنی ماں کا جنا نہیں۔ اپن اور کچھ نہیں مانگتا۔"

"دیکھیں گے پھر۔" بجّل نے سر ہلا کے کہا۔

"نہیں دادا! اپن ایسے بالکل نہیں جائے گا۔ قسم سے اِن کر کے آیا ہے۔ جب تک تم ہاں نہیں کرو گے، اِدھری تمھارے پیر پڑا رہے گا۔ کچھ اور تمھارے پاس اپنے لیے نہیں ہے تو اپن کی بات تم ضرور پوری کر سکتے ہو۔ اپن کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر دو۔ تمھاری دی ہوئی موت کے بِنا اپن کو آدھر بھی...."

"جا، جا کے آرام کر۔" بجّل نے بیزاری سے کہا مگر وہ پیروں سے لپٹ گیا۔ بجّل نے اُس کی گردن پکڑ کے اُس کا چہرہ اُٹھایا اور پہلے اُسے خشمگیں نظروں سے گھورتا رہا، پھر کہیں اُس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی، وہ بُدبُداتی آواز میں بولا۔ "ابھی جا کے حال تو تھوڑا ٹھیک کر۔"

آکا کو بجّل کی آنکھوں میں کچھ نظر ہی آ گیا تھا، وہ بے تحاشا سسکنے لگا۔ بجّل نے اُس کا سر اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

اُس کے جانے کے بعد عمارت پر سوگ سا طاری رہا۔ سب کہیں گم ہو گئے تھے۔ ساجن بھی دیر تک بے سُدھ بیٹھا رہا۔

بارہ بجے کے قریب جب ساجن اور اُس کے ساتھی چلے گئے تھے، شامو نے زور سے کانتے کے چٹکی بھری۔ آگے دروازے پہ زورا کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ کل بھی زورا تقریباً اِسی وقت آیا تھا۔ ممکن ہے کسی آدمی نے اُس کا رات کو آنا اور دن بھر غائب رہنا محسوس کیا ہو مگر زورا کو جیسے اِس امر کی فکر نہیں تھی۔ وہ کسی تذبذب کے بغیر اُن کے درمیان آ کے بیٹھ گیا۔ کانتے کو جستجو تھی کہ وہ خانم کے جوابی پیغام سے مطلع کرنے آیا ہو گا مگر زورا کے پاس خانم کی آمد کے متعلق کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ بجّل کو یہ بتلانے آیا تھا کہ نواب حشمت جنگ کا معتمد دوپہر کے وقت اباجان سے ملا تھا۔ اُس نے اُن سے کہا کہ نواب کے حکم کے مطابق وہ اُنھیں ایک حویلی دکھانا چاہتا ہے، وہی حویلی جس کا تذکرہ کل رات نواب نے اُن سے کیا تھا۔ اباجان نے اُسے شام کا وقت دیا۔ شام کو مقررہ وقت پر ٹھیک ۴ بجے وہ آ گیا، اُس کے پاس نواب کی موٹر تھی۔ مارتی، زورا اور اباجان تینوں اُس میں بیٹھ کے حویلی گئے۔ زورا کے بیان کے بموجب وہ صاف ستھرے پُرفضا علاقے میں واقع ایک خاصی بڑی حویلی تھی، دو منزلوں پر مشتمل۔ تیسری منزل پر بھی چند کمرے بنے ہوئے تھے اور باغیچہ لگا ہوا تھا۔ باہر سے اُس کا رنگ روپ گو اُجڑا اُجڑا تھا لیکن اندر ہر کمرے کی سجاوٹ دیکھنے کے لائق تھی۔ ایک نواب اور چند ملازموں کے سوا وہاں کوئی مقیم نہیں تھا۔

ابھی وہ پہنچے ہی تھے کہ نواب حشمت جنگ کی سواری بھی آ گئی۔ اباجان باہر ہی سے حویلی دیکھ کے پسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے۔ اندر جا کے وہ اور متاثر ہوئے۔ اُنھوں نے نواب حشمت جنگ سے کہا کہ یہ بہت نفیس عمارت ہے مگر اُن کی ضرورت سے بہت بڑی ہے۔ نواب نے اِسے اباجان کے انکسار پر محمول کیا اور اس سے پہلے کہ اباجان کوئی رائے دیتے یا رد و قدح کرتے، اُس نے حویلی کے مالک، اپنے عزیز سن رسیدہ نواب سے معاملے کی بات شروع کر دی۔ زورا کو حویلی کی قیمت سُن کے حیرت ہوئی تھی۔ حویلی کے مالک نے صرف اسّی ہزار روپے طلب کیے تھے۔ فرنیچر اور دیگر ساز و سامان کے پانچ ہزار الگ۔ نواب حشمت جنگ کو کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا مگر اُس نے اباجان کی خاطر حویلی کے مالک سے قیمت پر نظرِ ثانی کی درخواست کی مگر اباجان نے بیچ میں دخل دے کے ساری بات ہی ختم کر دی۔ اُنھوں نے کہا جس ذوق و شوق سے یہ عمارت تعمیر کی گئی ہے، اُس کے مقابلے میں مطلوبہ رقم کچھ بھی نہیں ہے۔ دوسرے اُنھیں یوں بھی کوئی اعتراض نہیں کہ حویلی کے مالک محترم نواب یہ رقم کارِ خیر میں صَرف کرنا چاہتے ہیں۔ مستحقین کے حق میں کوئی کمی نہیں کرنی چاہیے۔

اباجان نے لکھنؤ میں ہیروں کی فروخت سے ڈھائی لاکھ روپے کے قریب حاصل کیے تھے۔ اُس میں سے بچی ہوئی بڑی رقم اُن کے پاس محفوظ ہو گی۔ کوئی اور ہیرا فروخت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی ہو گی۔ اُس وقت اُن کی جیب میں چند ہزار روپے تھے۔ کچھ زورا اور مارتی کی تحویل میں تھے۔ دس ہزار روپے بیعانے کے طور پر اُنھوں نے حویلی کے مالک بوڑھے نواب کے سامنے رکھ دیے۔ نواب نے کہا، اِس کی ضرورت نہیں، شرفا کی زبان ہی بیعانہ ہوتی ہے مگر اباجان نے نوٹ واپس نہیں اُٹھائے۔ بعد میں نواب نے اُنھیں بتایا، معاملے سے پہلے وہ مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ حویلی کے بارے میں کوئی بات کرے۔ اصل میں اُسے یہ حویلی کسی صاحبِ ذوق کے حوالے کرنے کی خواہش تھی اسی لیے اتنے دن بھی لگ گئے۔ حال ہی میں ریزیڈنسی سے متعلق ایک بڑے انگریز عہدے دار نے دلچسپی ظاہر کی تھی مگر بڑے ہال میں حافظ و سعدی کے اشعار کندہ ہیں اور آیاتِ کلام اللہ کی نقاشی کی گئی ہے لہٰذا گریز رہا۔ انگریز نے مختلف ذرائع سے سفارش کروائی مگر حویلی کسی غیر مسلم کے حوالے کرتے ہوئے نواب کا دل نہ مانا۔ ویسے اُس انگریز کے اعلا ذوق میں کلام نہیں تھا۔

اُس نے اباجان سے کہا کہ وہ کسی بھی وقت منتقل ہو سکتے ہیں۔ ابھی چاہیں تو ابھی۔ رسمی کارروائی بعد میں ہوتی رہے گی کیونکہ نواب حشمت جنگ درمیان میں ہے۔ حویلی کا مالک یہاں سے چند جوڑی کپڑے اور بعض خاندانی یادگاروں کے سوا کچھ لے کے نہیں جائے گا۔ حویلی میں آنے والے کسی بھی خاندان کو لباس کے سوا غالباً کسی چیز کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اباجان نے پیش کش کی کہ حویلی کا مالک جب تک چاہے وہاں قیام کرے۔ نواب نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا کہ وہ تو کب سے پا بہ رکاب ہے۔ اب جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتا ہے۔ اباجان اگر آج آنا پسند کریں تو آج ہی آ جائیں۔ دو ایک روز کے لیے وہ اپنے ایک دوست کے ہاں منتقل ہو جائے گا۔ پھر اُس نے کہا، حویلی میں باغ، باورچی خانے، صفائی اور دیکھ بھال کے لیے گیارہ ملازم ہیں۔ اُن کے ساتھ اُن کے مختصر کنبے بھی ہیں۔ یہ لوگ برسوں سے اُس کے خاندان کی خدمت کر رہے ہیں۔ اباجان چاہیں تو اُنھیں برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اُن کی شرافت، مستعدی اور دیانت کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اباجان نے کہا، وہ اُنھیں جوں کا توں رکھیں گے۔ ہر چند کہ اُنھیں اتنے ملازموں کی ضرورت شاید نہ پڑے۔ پھر نواب حشمت جنگ اُن تینوں کو اپنی حویلی لے گیا۔ رات کا

کھانا کھلائے بغیر اُس نے اُنھیں نہیں آنے دیا۔

اباجان نے تجمل سے رائے پوچھی تھی۔ جواب میں تجمل نے زورا سے کہا، مزید بحث وبحث کیے بغیر وہ کل ہی ہوٹل چھوڑ کے حویلی منتقل ہو جائیں۔ خانم کہیں گئی تو اُسی حویلی سے جائے گی۔ رات بہت ہو گئی تھی اس لیے زورا اڈے ہی پر ٹھیر گیا۔ وہ کانتے، جمرو، شامو اور ٹنگو کے ساتھ اوپری منزل پر چلا آیا۔ پھر باتیں کرتے کرتے اُن سب کی آنکھیں جھپک گئیں۔ صبح اُنھیں معلوم نہ ہو سکا کہ زورا منہ اندھیرے کس وقت نکل گیا۔

گزشتہ راتوں کی طرح بہت سے لوگ وہیں سو گئے مگر جو چلے گئے تھے، صبح ہوتے ہی اُن کی آمد پھر شروع ہو گئی۔ اُن کا آنا لازمی تھا، تجمل ہی نے گزشتہ شام اُن سے کہا تھا کہ کل صبح وہ اڈے پر روزانہ کی باقاعدہ مشقیں جاری رکھنے کے لیے کچھ آدمیوں کی پرکھ کرے گا یہ تکلف تو محض بہرِ ملاقات تھا۔ تجمل کی منشا یہی معلوم ہوتی تھی کہ ان دِنوں اڈے کے آدمی شہر میں بھٹکنے کے بجائے بیشتر وقت اڈے ہی پر رہیں۔ بہتر ہے کہ اِس دوران شہر کے کسی تھانے میں اُن کی کوئی رپورٹ درج نہ ہو اور پولیس بازار کے علاقے سے دُور ہی دُور رہے۔ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی موجودگی میں زیادہ سے زیادہ آشنائی کے علاوہ ایک اور بھی رمز تھا۔ ممکن ہے تجمل کے ذہن میں یہ ہو کہ زورا اباجان کے ہمراہ آزادی سے شہر میں گھوم پھر سکے اور ہوٹل سے اُس کے کسی رابطے کا لوگوں کو علم نہ ہونے پائے۔ زورا کو اُنھوں نے اتنی باریاں دیکھا تھا کہ اب اُس کا چہرہ سب کی نظروں میں کھب چکا ہو گا۔

اڈے پر آئے اُنھیں چوتھا دن تھا۔ خانم کو تار دیے پورے دو دن گزر چکے تھے، تیسرا دن شروع ہو گیا تھا۔ کانتے کے خیال میں اب تک خانم کا جواب آ جانا چاہیے تھا، اگر کسی وجہ سے اُس کی آمد میں تاخیر ہو رہی ہے تو بھی اطلاع اُسے فوراً دینی چاہیے تھی۔ اُس نے صبح ہی سے انتظار شروع کر دیا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ زورا آج دن میں کسی وقت تجمل کو خانم کے متعلق کوئی خبر سنانے ضرور آئے گا مگر صبح سے دوپہر ہو گئی، دھوپ اُترنے کا وقت آ گیا' زورا نہیں آیا۔

شام کو چار بجے چائے تقسیم کی جا رہی تھی۔ عمارت میں آدمیوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ معاً دروازے سے ایک شخص لپکتا جھپکتا سیدھا تجمل کے پاس پہنچا، اُس نے سرگوشیانہ اُسے بتایا۔ "دادا! باہر علاقے کا انچارج آیا ہے۔" کانتے کا ماتھا ٹھنکا۔ تجمل بھی چند لمحوں کے لیے چپ ہوا پھر اُس نے اطلاع دینے والے سے پوچھا۔ "کیا مقصد ہے؟"

"بولتا ہے نئے دادا سے ملنا ہے۔"

"لے آ پھر اُس کو ادھر!" تجمل کی آواز اُبھری ہوئی تھی۔

ابھی دروازے تک نہیں پہنچا تھا کہ تجمل نے اُسے روک دیا اور سے اُٹھ کے دروازے کی طرف جانے لگا۔ کالے دادا، کانتے، شامو بھی بیٹھے نہ رہ سکے۔ تھانے کے آدمی اڈے میں داخل ہونے سے عموماً اُس وقت تک اجتناب کرتے ہیں جب تک کسی خا میں اُن کا آنا ضروری نہ ہو جائے یا پھر اُنھیں اڈے پر باقاعد نہ کیا جائے۔ اُن کی اچانک آمد کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اڈے آدمی پچھلے دروازے سے فرار نہ ہو سکے۔ انچارج اندر نہیں آیا مگر باہر بھی اُس کی موجودگی کسی سبب ہی سے ہو سکتی تھی۔

وہ درمیانے قد، بھرے ہوئے جسم، چوڑی آنکھوں اور جیسے رنگ کا کوئی پچاس سالہ آدمی تھا، ریاستی پولیس کی میں ملبوس۔ اُس کے ساتھ دو سپاہی بھی تھے۔ دونوں کے پہ بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ کالے دادا نے جلدی سے آگے سیلوٹ کے انداز میں انچارج کو سلام کیا۔ جواب میں اُس نے خفیف سی جنبش دی اور چمکتی آنکھوں سے کالے دادا کے پا کھڑے ہوئے تجمل کو گھورتا رہا۔

"کیسے آنا ہوا سرکار!" کالے دادا نے کسی قدر بے چینی

انچارج کی نظریں تجمل پر جمی ہوئی تھیں، اُسی کو دیکھتے وہ بولا۔ "سنا ہے، کسی نئے چڑی مار کو گھیر کے لائے ہو کالے! کو دیکھنے آئے ہیں، کتنے دانت کا ہے۔"

اِس سے پہلے کہ کالے دادا کوئی جواب دیتا، تجمل سامنے آ دھیمی آواز میں بولا۔ "لگتا ہے، نام آپ کچھ بھول رہے ہو۔ ادھر کوئی پالتو نہیں ہے۔ اِدھر ہم ہیں اور ہم کو آپ دیکھنے آئے دانت کیا، جو آپ بولو، دکھانے کو تیار ہیں۔"

انچارج کے جسم میں کوئی لہر سی اُٹھی۔ وہ ہنکاری بھر کے لہجے میں کہنے لگا۔ "تو، تو وہ تم ہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے، سب ٹھیک سنا ہے۔ بڑے چرچے ہو رہے ہیں شہر بھر میں۔"

"کاہے کے چرچے صاحب! ضرور کسی نے صاحب کے کا ہوں گے۔" تجمل نے مسکرا کے کہا۔

"آدمی پرانے معلوم ہوتے ہو۔"

"آپ بھی اپنے کو نئے نہیں لگتے۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

تجمل ہنس پڑا۔ "پرانے آدمی ہو کے آپ ایسا پوچھتے ہو! باتوں کا جواب ہم گھر پر نہیں دیتے اور بعد میں بھی آدمی دیکھ کے بولنے

"تم ہم ایک پولیس افسر سے مخاطب ہو۔" اُس نے نخوت سے کہا۔

"آپ بھی کسی سے بات کر رہے ہو، اپنے کو خوب جانکاری ہے اپنی کوئی رشتے داری نہیں نکلتی۔"

"کالے!" وہ برہمی سے بولا۔ "اپنے دادا کو بولو، شاید تم نے ہمارے یں کچھ نہیں بتایا کہ ہمیں کون سی زبان پسند ہے، کون سی...."

کالے دادا بدحواس سا ہو گیا۔ تجمل نے اونچی آواز میں کہا۔ "لے کیا بولتے ہو صاحب! اپنے سے بات کرو، ہم کو اچھی پتہ ہے، آپ کون سا سُر پسند کرتے ہو پر اپنے کو بھی ایک ہی ہے۔"

"لیکن بے سُرا ہونا ہمیں بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"تسلی رکھو صاحب! اپنی کوشش یہی ہوتی ہے کہ آپ لوگ ئی شکایت نہ ہو، کبھی ہو جاتی ہے تو اپنے کو تو تکار کی عادت بالکل ہے۔"

"کالے جانتا ہے کہ ہم ایک ہی بار رعایت دیتے ہیں۔"

"دوسری بار میں اپنے کو بھی شرم آتی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے، تم سے واسطہ کچھ زیادہ ہی پڑے گا۔"

"اگر یہ حسرت ہے تو بات دوسری ہے، ابھی صاحب کے ساتھ چلتے ہیں، ویسے ہم شگون لے کے ہی گھر سے نکلتے ہیں۔"

کانتے کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ تجمل اُس سے کس قسم کی ں کر رہا ہے۔ آخر اتنی طول کلامی کی کیا ضرورت ہے۔ اگر پولیس افسر قصد محض نئے دادا کو دیکھنا اور اڈے کی تبدیلی کے بارے میں اندازہ لگانا ہے تو تجمل کو اِسی حد تک بات کرنی چاہیے تھی مگر زالٹ کر رہا تھا۔ کانتے کو شبہ تھا کہ اُستاد اِس وقت ہوش میں بھی یا نہیں۔ کالے دادا کا بھی بس نہیں چل رہا تھا کہ تجمل کے منہ پر کھ دے یا اُس کا ہاتھ پکڑ کے روک دے۔ انچارج کے چہرے نگ کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ تجمل سے کہنے لگا۔ "ضرور کالے نے تمھیں بیکر میں رکھا ہے۔"

"ابھی آپ سامنے موجود ہو، جو اِس نے نہیں بولا وہ اپنے کو۔" ل نے سانس لے کے کہا۔ "اپنے کو آپ اُوپر سے نیچے تک اچھی ا دکھائی دے رہے ہو۔"

"دکھائی دے رہے ہیں تو اچھا ہے ورنہ...."

"آگے کیوں بولتے ہو صاحب!" تجمل نے تیزی سے کہا۔ "اپنی ایک بنتی ہے، پہلی اور آخری۔ اِس کو کچھ اور مت سمجھنا، اپنی ہاتھ بڑھانے سے پہلے چھان پھٹک کرنا مت بھولنا۔ اِس میں آپ کا بھی بھلا ہے، اپنا بھی۔ پہلے کچھ دوسروں کو بہت وقت خراب کرنا پڑا ہے اس لیے ایسا بول رہے ہیں۔ یوں آپ حاکم ہو اور ہم کو پتہ ہے کہ بازار کے اڈے پر آپ کو کچھ جان کے ہی جایا گیا ہے۔"

پولیس افسر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "ہمیں یہاں دکن میں خاص طور پر بُلایا گیا ہے۔" وہ سر اُٹھا کے بولا۔

"وہ تو ہم کو پہلے دکھائی دے گیا تھا، آپ ادھر کھٹائی گھاٹ کے ایک دم نہیں ہو۔"

"تم نے کیسے جانا؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"بہت دن دنیا چھانتے ہو گئے صاحب! اور ساری آپ ہی لوگوں میں گزری ہے پر معاف کرنا آپ ادھر پولیس میں کیسے آ گئے؟"

"کیوں کیوں؟ تمھارا کیا مطلب ہے؟" اُس نے چونک کے کہا۔

"آپ کو تو صاحب کچھ اور ہونا چاہیے تھا، اپنے کو تو آپ کوئی شکاری جان پڑتے ہو۔ اُدھر جاگیر سے کیوں چلے آئے؟"

انچارج پلکیں پٹ پٹانے لگا۔ "نگاہ تمھاری خاصی بہتر ہے۔"

"دل بھی ایسا کھوٹا نہیں ہے صاحب!"

"ہوں!" وہ سر ہلانے لگا۔ "پر یہ، یہ سب...."

وہ کہتے کہتے رہ گیا۔ تجمل بیچ میں بولا۔ "سب کھیل تماشا ہے صاحب۔"

وہ جز بز سا ہو کے کہنے لگا۔ "مگر تم نے ہمیں ٹھیک پہچانا۔ اِس شکار نے ہمیں بہت رسوا کیا ہے۔ معلوم نہیں، تم نے کبھی شکار کھیلا ہے یا نہیں۔" تجمل کے کچھ کہنے سے پہلے وہ خود بولا۔ "پولیس میں تو ہم اتفاقاً بلکہ حادثتاً آ گئے۔ اُس طرف ترائی میں شکار کھوجتے کھوجتے ایک سینگا گینڈا نظر آ گیا، نام شاید تم نے سنا ہو، گلا باکا۔ اُدھر رام نگر کے سارے علاقے میں آگ لگا رکھی تھی، دیکھتے ہی ہم کو شک ہو گیا تھا کہ بن میں اکیلا ایک اسی کا خون نہیں ہے۔ گھیر کے سُسرے کو شہر تک لے آئے اور جب تک پولیس کے ہاتھ میں نہ تھما دیا، سانس لینے کو بھی کہیں نہ ٹھیرے۔ بہت پھڑپھڑاتا رہا تھا۔ اس کے بعد کمشنر نے پیر میں بیڑی ڈال دی۔ پہلے خاص خاص موقعوں پر بلاتے تھے پھر ایک دن ساری بریلی کمشنری کی فہرست رکھ دی۔ کام البتہ ہمارا وہی ہے جو تم نے ابھی بتایا ہے۔ اُدھر دُور دُور تک کوئی پولیس کے قریب نہیں پھٹکا تھا۔ ویسے پولیس میں بھی اپنا ریکارڈ بڑے بڑے پشتینیوں سے لمبا ہے۔" وہ زبان پر جو آیا، کہتا رہا۔ اُس نے تجمل کو یہ جتانا بھی ضروری سمجھا کہ کوئی دس جگہ کے گورے کمشنروں نے اُسے اپنے ہاتھ سے سرٹیفکیٹ لکھ کے عطا کیے ہیں۔ یہاں بھی ریزی ڈنٹ بہادر کی سفارش پر اُسے بھیجا گیا ہے، پھر اُسے خود خیال آیا، اُس کا لہجہ بدل گیا۔ "تم بھی ہمیں اس

جنگل کے نہیں معلوم ہوتے نگاہ ہماری بھی ایسی اُتری ہوئی نہیں ہے اور کمو تو کچھ اور بھی تمھارے متعلق...."

"اندر ہی رہنے دیں صاحب!" جُھل نے جلدی سے کہا۔ "کیوں جگ ہنسائی کراتے ہو۔ آپ بولو اپنے لیے کیا حکم ہے؟ ادھر صرف ہم کو دیکھنے آئے ہو تو اندر آ کے بیٹھو۔"

"نہیں نہیں۔" وہ جھجک کے بولا۔ "ہم یہاں ٹھیک ہیں۔"

"کچھ اور نہیں ہے تو صاحب اندر ہی چلو۔"

"تم سے کچھ باتیں کرنا تھیں، بہرحال پھر سہی۔"

"وہ تو صاحب ہوتی رہیں گی لیکن اس وقت تو آپ تھوڑی دیر...." جُھل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ایسے دروازے سے لوٹ جانے کو اپنے ہاں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"

وہ کچھ مذبذب میں پڑ گیا۔ جُھل نے بڑھ کے اُس کی کمر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ انچارج کا چہرہ ایک لمحے کے لیے تمتما اُٹھا پھر دوسرے ہی لمحے کانتے، شامو، جبرو اور کالے دادا دیکھتے رہ گئے انچارج نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

کالے دادا اُس سے پہلے بھاگ کے اندر چلا گیا تھا۔ دروازے کے قریب بیٹھک نما کمرہ کھول دیا گیا۔ اڈے کے کئی آدمیوں نے جلدی جلدی وہاں چوکی پہ چاندنی ڈال دی اور گاؤ تکیہ لگا دیا اور ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ جتنی دیر میں اُنھوں نے یہ انتظام کیا، انچارج باہر کھڑا صحن اور دالان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ "جگہ تو بڑی ہے۔" وہ اندر تخت پر بیٹھتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولا۔

"بس وقت گزر جاتا ہے۔"

"سُنا ہے تین دروازے ہیں؟"

"چوتھا بھی ہے ایک۔ پر اُسے ہم نے بھی ابھی نہیں دیکھا اور شاید دیکھنے کی ضرورت بھی نہ پڑے۔"

"مگر تم نے ایک مقولہ سُنا ہوگا، تمام راستے روم کی طرف جاتے ہیں۔ ہمارا بھی کچھ یہی ہے جب تک ہم علاقے میں ہیں یہاں سے نکلنے والے تمام راستے ہم تک پہنچتے ہیں۔"

جُھل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کالے دادا اور اڈے کے دوسرے آدمیوں نے بہ عجلت مٹھائی اور چائے وغیرہ کا اہتمام شروع کر دیا تھا۔ منٹوں میں اُنھوں نے چوکی کے وسط میں چینی کی پلیٹوں کا انبار لگا دیا۔ گو انچارج اندر آ کے بیٹھ گیا تھا اور پہلے کی نسبت کچھ تھما اور ٹھہرا ہوا نظر آتا تھا لیکن اُس کی آنکھوں کی چمک اور گہری ہو گئی تھی کانتے کو وہ پہلے سے زیادہ پُراسرار لگ رہا تھا۔ چوکی پر وہ اس طرح جسم پھیلا کے بیٹھا تھا جیسے یہاں پہلے بھی کئی بار آ چکا ہو اور جیسے یہ اڈا اُس کی ملکیت ہو اور اڈے کے سب لوگ رعیت۔ بظا[ہر] رویے سے کوئی بناوٹ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اُس کے سا[تھ کے] دونوں سپاہی دروازے کے پاس مستعد کھڑے تھے باہر سے اڈے کے آدمیوں کی بلبلاتی سرگوشیوں کی گونج آ رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ انچارج کی آمد اُن کے لیے کتنی [بڑی] بنی ہوئی ہے اور علاقے پر اُس کا غلبہ کس قدر ہے۔ انچار[ج نے] چائے پر اکتفا کی۔ کالے دادا کے اصرار پر نمک پارے کی [طرف ہاتھ] بڑھاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ "کالے! نمک بخش دینا۔"

کالے دادا نے بے اختیار جُھل کی طرف دیکھا۔ جُ[ھل نے] کچھ نہیں کہنے دیا، خود بولا۔ "آپ کے اِدھر آنے کو ہم بڑ[ی بات] ہی سمجھتے ہیں صاحب! دوسری کے بارے میں ہم پہلے آپ [...] یہ سُن کے انچارج کے نتھنے پھول گئے، وہ چہکتی [...]

"ایک سال ہمیں یہاں آئے ہو رہا ہے لیکن اب تک کچھ [...] سے واسطہ پڑتا رہا۔ البتہ پہلی بار کوئی...." پھر وہ خود [...] کے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے اب کے جلسے میں شاید ہمارے [...] ہمیں اتنی تعداد بلوانے کا مقصد پورا ہو جائے۔"

"ہم کیا بول سکتے ہیں صاحب! دعا کریں تو اپنا [...] ویسے آپ آدمی اپنے کو کھرے لگتے ہو۔ ایک کا غذ ادھر بھی آپ کے پلّے ہونا چاہیے۔"

کانتے کے خیال میں ہر بات کا جواب دینے سے [...] رہنا ہی بہتر تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو تین دن کی بات [...] یہاں کون سا مستقل رہنا تھا بس خانم کے آنے تک اُنھ[یں] کسی طرح خود سے دُور رکھنا تھا۔ درمیان میں جُھل کے [...] سے کانتے کو کچھ سکون ہوا تھا مگر اندر آ کے جُھل پھر اس [...] کر رہا تھا جیسے انچارج کی مُرکیاں لے رہا ہو۔ انچارج کا [چہرہ] سُرخ ہو جاتا تھا۔ سب کچھ جُھل کے سامنے تھا کہ اُن سے [...] کے آدمیوں سے انچارج کے روابط کیسے رہے ہوں گے او[ر] کیسی باتیں سُننے کا عادی رہا ہے۔ انچارج کو بھی قرار نہیں [...] کی پیالی ختم کر کے اُس نے تجسس اور طنز کے ملے جلے [لہجے] سے کہا۔ "یہاں تمھارے نشانے اور دل کی بڑی دھوم مچی ہے۔"

"کھل کے بات کرو صاحب!" جُھل نے کچھ توقف [کے بعد] کہا۔ "اپنے کو تنگ ہے آپ اپنی تعریف کر رہے ہو یا [...] بُرا لگا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" انچارج کا لہجہ مدافعانہ ہو گیا۔ "ہم اچھے [...] کی دل سے قدر کرتے ہیں کیا۔ کیا بندوق میں بھی تمھارا نشانہ [...]

[...] ہے؟"

"نشانہ تو صاحب دیدے کا ہوتا ہے۔"

"[تم] نے بڑی مناسب بات کہی۔" وہ بے اختیار بولا۔

"ہم اپنے جانے ہیں سب ٹھیک ہی بول رہے ہیں پر سمجھنے [وال]ی کوئی آپ جیسا ہو۔" جُھل نے ہنس کے کہا۔

مگر انچارج نے یہ جملہ خوش دلی سے نہیں سُنا تھا، اُس کی پیشانی [پر بل] پڑ گئیں۔ جواب میں وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رُک گیا اور سر [ہلاتے] ہوئے معنی خیز انداز میں بولا۔ "ہم خوب سمجھ رہے ہیں اور تمھیں [یاد رکھنا چاہیے] کہ نشانہ اپنا بھی کم ہی چوکتا ہے۔"

"کانٹے میں بل پڑ جانے پر چوکتا ہوگا، تولنے میں تیزی سے [کب]ھی لوٹ کے بھی آ جاتا ہے صاحب!"

"ہاں ہاں۔" وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ "ہمیں اندازہ ہے۔" اُس کی آواز [...]ے کی لرزش تھی مگر اُس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا اور کہنے لگا۔ "[...] ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ تم ہمارے لیے ایک [...] ہو۔"

"ہم زبان کھولیں گے تو آپ کہو گے آپ کا بولا لوٹا دیا پر [...] صاحب! اپنے کو بھی آپ جیسا نہیں ملا۔"

"یہ، یہ تم بڑی حد تک درست کہہ رہے ہو۔" اُس نے تحمل سے [کہا۔ "]بہتر ہے تم سے ایک بات کی وضاحت کر دیں۔ ہمارے اختیارات [...] وردی اور عہدے سے مت جانچنا، وہ اس سے کہیں سوا ہیں [...] ہیں تو تمھیں کوئی وجہ بتائے بغیر اسی لمحے یہاں سے لے جا [سکتے] ہیں۔"

"آپ ایسا کر سکتے ہو پر آپ کرو گے نہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ آپ اپنے آپ سے پوچھو۔"

"نہیں ہم تم سے پوچھنا چاہیں گے؟"

"اپنے کو پتہ ہے آپ دھوپ دکھا کے سر کا زنگ نہیں [اتار رہے] ہو۔" جُھل نے کہا۔ "آپ کو صرف ہمی کو اپنا تماشا نہیں دکھانا، [...] بھرم رکھنا ہے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی۔"

"ہونہہ۔" اُس نے لمبی سانس کھینچی اور جیسے کہیں کھو گیا۔ [...] یکایک تمتماتی آواز میں بولا۔ "آقا کہاں ہے؟" جُھل کو جواب [...] دیر لگی۔ انچارج پہلے سے زیادہ اُونچی آواز میں بولا۔ "تم نے سُنا [...] ہم کیا پوچھتے ہیں؟"

"سُن لیا صاحب! سوچتے ہیں کیا جواب دیں۔ ادھر ہم کو سامنے [بٹھا] کے آپ بولتے ہو کہ آقا کدھر ہے۔"

"یہ ہمارے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"تو ہم کیا کریں صاحب!" جُھل کی آواز جھلانے لگی تھی۔

"تم، تم نہیں جانتے!"

"ایسا وہ آپ کا سگا لگتا ہے تو تھانے میں رپٹ کرو صاحب!"

"تم نہیں جانتے۔" انچارج نے دوبارہ بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔

"جانتے بھی ہیں تو سمجھو ابھی بتانا ضروری نہیں سمجھتے۔"

"تمھارا یہ طور تمھارے لیے بہت مہلک ہو سکتا ہے۔"

"بہت دنوں سے اڈے پر بیٹھتے ہیں صاحب! آپ کی شاید پولیس کی عمر بھی اتنی نہ ہو۔"

"تم کیا جتانا چاہتے ہو؟" وہ تلخی سے بولا۔

"آئے تو اِدھر آپ ہو، اپنے کو کیا جتانا۔"

"تمھاری آواز تمھارے قد سے بہت اُونچی ہے اس میں ہمیں دھمکی کی آمیزش محسوس ہو رہی ہے یا تم ہمارے اعصاب کی کوئی آزمائش کر رہے ہو مگر یہ اچھا نہیں ہے۔"

"سیدھی بولی آپ کو کڑوی لگتی ہے تو یہی ہو سکتا ہے، ہم زبان بند کر لیں، اپنا اچھا بُرا ہم آپ سے زیادہ سمجھتے ہوں گے صاحب! آپ کی اپنی کوئی خاندانی دشمنی نہیں ہے جس کو فلیتہ دکھا کے ہم چھاتی ٹھنڈی کریں، آپ کو کچھ بُرا لگا ہے تو سر سے جھٹک دو۔ ہم نے آگے والوں سے یہی سُنا ہے کہ حاکم کو بولیں کی اُونچ نیچ پر نہیں بولے ہوئے پر دھیان دینا چاہیے، کالے اُجلے کھرے کھوٹے کو کھوجنا چاہیے، حاکم تو ترازو ہوتا ہے صاحب! اُس کو دکان دار اور گاہک کی تکرار سے فرق نہیں پڑتا، چیز اُنیس بیس ہونے سے ہی پڑتا ہے۔ آپ اِدھر صرف علاقے کے انچارج کے روپ میں آتے تو ہم آپ کو باہر سے سلام کر کے لوٹا دیتے۔ آپ کو کچھ جان کے ہی ہم نے زبان کھولی تھی۔ قاعدے قانون کا چکر آپ لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے بُرا بھلا اپنی سمجھ میں آ گیا ہے اور آپ اختیار کی بات کرتے ہو تو ہم کو یقین ہے آٹھواں خون آپ کو معاف نہیں ہوگا۔"

کانتے سر جھکائے ہونٹ کاٹ رہا تھا، درمیان میں وہ جُھل کے پاس جاتے جاتے اُسے رُکتے رُکتے رہ گیا تھا۔ اُس کی توقع کے خلاف انچارج اُٹھ جانے اور سپاہیوں کو کوئی اشارہ کرنے کے بجائے سکڑی ہوئی آنکھوں سے جُھل کو گھورتا رہا۔ بہت دیر بعد کانتے نے سر اُٹھایا۔ انچارج کا مضطرب اور منتشر چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ اُسی لمحے کانتے کے اندھیرے دل و دماغ میں روشنی سی پھوٹ پڑی۔ اتنی دیر میں پہلی بار اُس کی سمجھ میں آیا کہ یہ سب کچھ بے وجہ نہیں ہے۔ جُھل کی لگام اُس کے ہاتھ ہی میں ہے۔ کانتے کے جی میں آیا کہ وہ بڑھ کے اُستاد

کا منہ چوم لے، اُسے سینے میں بھینچ لے۔ پھر اس سے پہلے کہ انچارج کچھ کہتا، تجمل نے اکھڑے لہجے میں کہا: "چکنی بولی ہم کو اتنی اچھی نہیں آتی پہ جانتے ضرور ہیں۔ بولیں تو آپ کا گھاٹا زیادہ، اپنا کم ہے۔ آپ سوچو، ایسے آپ کو آگے کی راڑ، رگڑ گھس کی کتنی بچت ہے۔ پردہ کرنے پہ آئیں تو قسم سے صاحب! اپنے رنگ بھاؤ کی جانکاری میں یہ آدھا بھی سفید ہو جائے گا پر اپنا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ اڈّے پہ بیٹھنے والے پہلے لوگوں کے چوکھٹے میں اپنے کو مت رکھو اور... " تجمل نے منہ بنا کے کہا: "اور اُس حرام کے جنے آکا کو بھول جاؤ، اب وہ اِدھر سے چلا گیا ہے۔ اڈّے سے جانے والا پلٹ کے نہیں آتا، آتا ہے تو بچا کھچا داؤ پر لگانے کے خیال سے ہی آتا ہے اور اُس کو یہ سمیٹنے میں ابھی بہت دیر لگے گی۔ اڈّوں کی یہی ریت ہے، کوئی اُس کا رونے والا آپ کے پاس آئے تو تھانے کے کھاتے میں درج کروا دینا اور زیادہ فیل مچائے تو ہم کو بلا کے تسلی کر لینا پر جیسا ہم نے بولا ہے، کوئی حکم کرنے سے پہلے اچھی طرح مچل سے مچل ملا کے دیکھ لینا۔" تجمل خاموش ہو گیا۔

خاصی دیر بعد انچارج کے بھاری جسم میں جنبش ہوئی، وہ بوجھل آواز میں بولا: "چپ کیوں ہو گئے؟"

"اپنے کو اتنا ہی بولنا تھا۔ آپ بتاؤ، آتے متت آپ کہہ رہے تھے، ہم سے کچھ بات کرنا ہے؟"

"اب شاید اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

"آپ کی مرضی صاحب!" تجمل نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"نہ جانے کیوں کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" انچارج متجسس لہجے میں بولا۔

"اپنے کو بھی کچھ لگتا ہے پر شاید ایسا نہیں ہے، اِدھر سپنے دیکھے بھی اپنے کو دن ہو گئے۔"

"ہونہہ"۔ اُس نے ہنکاری بھری: "بہرحال تم سے مل کے خوشی ہوئی۔" اُس کی آواز میں طنز صاف نمایاں تھا: "ہم نے سب کچھ ایک تجربے کے طور پر سنا ہے اور ہم اسے اسی طرح برتنے کی کوشش کریں گے۔ ہر تجربے سے ہمیں کسی مہم کی لذت ملتی ہے۔ یقیناً تم نے ہمیں اپنے آپ سے شناسا کرانے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے جس کا شکریہ ہم پر واجب ہے، اتنا کچھ سمجھنے بوجھنے میں بے شک ہمیں دیر لگتی۔ آیندہ ہمیں اِس سے بہت مدد ملے گی۔ تمھاری خواہش کے بموجب ہماری کوشش ہو گی کہ تم سے تمھارے مراتب کے تناسب سے تعلق قائم رہے۔ اُمید ہے تمھیں اس سلسلے میں ہم سے کوئی شکایت نہ ہو گی۔"

"آپ کا شکریہ صاحب!" تجمل نے جیسے اُس کا طنز محسوس ہی نہیں کیا۔

انچارج اچانک چوکی سے اُٹھ گیا۔ کالے داوانے کو ہوئے انداز میں اُس سے کچھ دیر اور بیٹھنے کی درخواست کرنا مگر تجمل کی جانب دیکھ کے ٹھٹھر گیا۔ انچارج کا چہرہ تمتما تجمل اُس کے ساتھ دروازے تک گیا۔ ابھی انچارج نے عبور نہیں کیا تھا کہ رُک گیا اور تجمل کی طرف رُخ کر کے بولا: جلد ملاقات ہو۔"

"سب آپ پر ہے۔" تجمل نے کہا: "پر شاید جلدی"

"ہاں صرف ہمی پر نہیں، یہ تم پر بھی منحصر ہے۔"

"آپ نے مناسب سمجھا تو ویسے سلام کرنے اُدھر ضرور صاحب! آتے رہا کریں گے۔"

"بشرطیکہ ارادہ بھی اسی خیر کا ہو۔"

"ایسا ہی ہو گا صاحب!"

"ہمیں خوشی ہو گی۔" وہ تجمل کے عین مقابل کھڑا تھا کے درمیان ایک فٹ سے زیادہ کی دوری نہیں ہو گی: "کم صورتِ حال سے ہمیں یقیناً زیادہ خوشی ہو گی اور روادار ہمیں بھی پیچھے نہیں پاؤ گے مگر فاصلوں کا بُعد ہے۔ کبھی نہیں ہے اور جس طرح ہوتا رہا ہے یا ہوتا ہے، اُس کے نہیں ہیں۔"

"اتنا اندازہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔"

"بہرحال" وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا: "خود کو میں رکھنا۔ اور یہ تلقین ہماری طرف سے اپنے لیے مثبت کی پہل سمجھنا۔ پہلی رعایت یوں بھی ہمارا اصول ہے۔ ہم اور اپنے ارادے کا اظہار کیے بغیر کبھی ہتھیار نہیں اُٹھاتے۔ ایک مرتبہ ہم سے ایک بے خبر جانور پر گولی چل گئی تھی، بے خبر بھی کیا تھی، بس نگاہ چوک گئی مگر کیا بتائیں، ندامت میں راتیں نیند نہیں آئی۔ خیر وہ قصہ دوسرا ہے۔" وہ جیسے خود کو ہوئے بولا: "تم سے کہنا ہے کہ یہاں اڈّے کی تبدیلی کی خبر علاقے تک محدود نہیں رہی ہے۔ حیدرآباد آنے کے بعد انچارج نادر علی کو پہلی بار اُوپر سے بازار کے اڈّے کی نگرانی کی گئی ہے۔ نادر علی کے لیے ایسی کوئی ہدایت ذہن کے منافی حکامِ بالا کو غور کرنا چاہیے تھا کہ اُنھوں نے کس مقصد ریاست میں ہمیں بلایا ہے اور کس غرض سے بطورِ خاص میں تعینات کیا ہے۔ ہم سے علاقے کی صورتِ حال پر کوئی گفتگو کیے بغیر یہ ہدایت بھیجنے سے مراد یہی ہو سکتی ہے کہ کہیں ہم غفلت کے مرتکب تو نہیں ہو رہے ہیں، ہماری بینائی اور سماعت پر چربی تو نہیں چڑھ گئی ہے۔ حکامِ بالا کا یہ رویّہ ہمارے لیے نہایت بیزار کا سبب ہے، ہم پر اُن کے اعتماد کی کمی کا مظہر ہے مگر ڈسپلن اپنی جگہ ہے۔ حکامِ بالا کو کوئی بھی ہدایت بھیجنے کا اختیار ہے۔ شکر ہے کہ یہ ہدایت ہے، حکم نہیں۔ تجویز ہے، فیصلہ نہیں ورنہ ہمارے لیے یہاں ریاست میں ٹھہرنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ہم سمجھتے ہیں کہ حکام کی تشویش و اضطراب کا کوئی اور محرک بھی ہو سکتا ہے، کچھ لوگوں نے جو بازار کے علاقے میں آکا کو برقرار دیکھنے کے خواہش مند تھے، اُنھوں نے اُن کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہو گی۔ بہرصورت اس سے تمھیں حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق ریاست کے کئی بااثر اور مقتدر لوگوں سے آکا کے مراسم تھے۔" انچارج کی آواز میں تنبیہ کے ساتھ ساتھ سنجیدگی اور متانت بھی تھی: "سمجھ رہے ہو؟" اُس نے تجمل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"ہاں صاحب!" تجمل چونک کے بولا: "سمجھ رہے ہیں پر آپ نے اتنا بولا ہے تو ہم بھی کچھ....."

اُس نے تجمل کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا: "ہم نے اپنے متعلق تمھیں سب کچھ بتا دیا ہے اور تمھاری طرف سے ہمیں مزید کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ چاروں طرف دیکھ کے کوئی قدم اُٹھانا اور خیال رکھنا کہ علاقے کا انچارج نادر علی خاں ہے، نادر علی اپنے لیے کوئی....."

"آپ چین سے اُدھر جا کے بیٹھو"، تجمل نے تیزی سے کہا: "کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو آکا کو اِدھر دیکھنا نہیں چاہتے، کرسی اور رتبے میں وہ آکا کے رکھوالوں سے اونچے بھی ہو سکتے ہیں پر ہم بھی کسی واسطے پر یہاں آ کے بیٹھے ہوں گے۔ اپنے کو پتہ ہے، یہ جگہ کون سی ہے۔ رہی ہدایت کی بات، تو کل آپ کو اس کے اُلٹ بھی آ سکتی ہے۔"

انچارج کا جسم ایک تانیے کے لیے بل کھا گیا۔

کلنتے بتا رہا تھا کہ چلتے وقت انچارج کا چہرہ دھواں دھواں تھا، اُس کی نگاہوں کی کاٹ کلنتے نے اپنے رگ و پے میں محسوس کی تھی مگر اس اذیت میں کیسا سکھ چھپا تھا، یہ کلنتے ہی جانتا تھا۔ اُسے اطمینان ہو چلا تھا کہ دو تین دن ہی کی نہیں، کوئی اور جادو نہ چل گیا تو آیندہ کئی دن کی مہلت بھی اُنھیں مل سکتی ہے۔ سرِ دست یہی ایک بہتر صورت تھی کہ انچارج کے سر میں گرہیں ڈال دی جائیں تاکہ کوئی فیصلہ کرتے ہوئے امکانات و نتائج اُس کے پیشِ نظر رہیں۔ نتائج کے کسی تعین کے لیے اُسے کشمکش و تردد کے ایک مرحلے سے نمٹنا لازم تھا اور اُنھیں بہت زیادہ وقت درکار نہیں تھا، صرف اتنا کہ خانم شہر میں آ جائے۔ اُس کی آمد کی اطلاع آ یا ہی چاہتی تھی۔ نادر علی کے بجائے کوئی اور شخص ہوتا تو شاید تجمل کو خود پر اتنا جبر نہ کرنا پڑتا۔

کلنتے، شامو، جمرا اور سنگو کے لیے وہ ایک سبک اور نرم شام تھی، سبھی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بوجھ سر سے اُتر گیا ہو، جیسے اچانک ہوا بدل گئی ہو۔ انچارج کے جاتے ہی اڈّے کے آدمی تجمل کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے نہ تجمل سے کچھ پوچھا، نہ تجمل نے اُن سے کچھ کہا مگر تجمل کا کھلا کھلا جسم دیکھ کے اُن کے اضطرار کو خود قرار آ گیا۔

رات کا کھانا کھاتے کھاتے گیارہ بج گئے۔ زورا نہیں آیا۔ وقت کی طرف سے کچھ رعایت مل جانے کی یقین دہانی کے باوجود کلنتے کی بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ زورا کے انتظار میں بار بار اُس کی نگاہیں دروازے کی طرف اُٹھ رہی تھیں، رہ رہ کے ایک اندیشہ اُسے ستا رہا تھا اور وہ یہ کہ اگر خانم حیدرآباد آنے پر آمادہ نہ ہوئی تو کیا ہو گا، اُسے انکار تو نہیں کرنا چاہیے کیونکہ تار تجمل کے نام سے گیا ہے مگر وہ تو حیدرآباد کا نام ہی سن کے لرز گئی ہو گی، اس شہر میں واپسی پر آمادہ ہو جانا اُس کے لیے ایسا آسان نہیں ہے۔ تار دیکھ کے اُس کے دل میں کیسے کیسے ہول اُٹھے ہوں گے۔ زرّیں کی حویلی اُس کے لیے کسی جنت سے کم نہیں تھی۔ کلنتے نے جب اُسے پہلی بار دیکھا تھا، یہی سمجھا تھا کہ وہ زرّیں کی کوئی عزیزہ ہے۔ وہ زرّیں کی بڑی بہن ہی معلوم ہوتی تھی۔ کلنتے نے اُسے کسی ملکہ کے مانند حویلی میں راج کرتے دیکھا تھا۔ اُس کے آنے کے بعد کلنتے کو محسوس ہوا تھا کہ حویلی میں اُس کی کتنی کمی تھی۔ کلنتے کے لیے یہ انکشاف بہت حیران کن تھا کہ اُس ملکہ کا تعلق بازار سے تھا۔

خانم کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا بھی تو کوئی حق ہے۔ وہ یہاں واپسی پر خودکشی کو ترجیح دے گی۔ تار میں اُسے پوری تفصیل نہیں لکھی جا سکتی تھی کہ اُس کا آنا کس قدر ضروری ہے۔ کلنتے کو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا مگر رات کے بارہ بجے زورا اڈّے پر نمودار ہو گیا۔ کلنتے نے اُسے تجمل کے قریب جانے سے پہلے بیچ میں روک لیا۔ زورا کے پاس خانم کی کوئی اطلاع نہیں تھی البتہ اُس نے بتایا کہ آج وہ ہوٹل کے بجائے حویلی سے آ رہا ہے، دوپہر کو نواب حشمت

جنگ کی موٹر انھیں لینے آئی تھی۔ اُن کے حویلی پہنچ جانے کے تھوڑی دیر بعد نواب حشمت جنگ بھی آ گیا۔ اُس کے ساتھ کوئی عہدے دار بھی تھا، دونوں کی موجودگی میں ابا جان اور حویلی کے بوڑھے مالک نے کاغذات پر دستخط کیے۔ ابا جان نے ساری رقم اُسی وقت ادا کر دی۔ انھوں نے بوڑھے نواب کو کچھ دن وہیں ٹھیرے رہنے کی پیش کش کی لیکن وہ نہ مانا، حویلی کی تمام چابیاں اُن کی تحویل میں دے کے رخصت ہو گیا۔ نواب حشمت جنگ کے ہاں سے اُن تینوں کے لیے رات کا کھانا آیا تھا۔

شام سے اب تک زورا اور مارتی حویلی کے مختلف کمروں کا بلکہ وہاں کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیتے رہے، حویلی کے ملازمین اشارے کے منتظر، اُن کے آگے پیچھے گھومتے رہے۔ زورا کے کہنے کے مطابق ابا جان نے حویلی کے لیے ایک خطیر رقم ادا کی تھی مگر حویلی کی شان و شوکت اور اُس کی آرائش و زیبائش کے مقابلے میں یہ رقم کچھ بھی نہیں تھی۔ ابا جان کو احساس تھا کہ نواب کی گاڑی کسی وقت بھی انھیں لینے آ سکتی ہے، اُن سب کے پاس نہایت مختصر سامان تھا، ابا جان نے صبح بازار کھلنے پر سوٹ کیس اور دوسری چیزیں خرید لی تھیں تاکہ نواب کے ذہن میں اُن کی متعین حیثیت قائم رہے۔ وہ ہوٹل میں کہہ کے آئے تھے کہ اُن کا کوئی خط یا تار آنے کی صورت میں محفوظ کر لیا جائے یا ہو سکے تو حویلی کے پتے پر پہنچا دیا جائے۔ نواب حشمت جنگ کی آمد و رفت کی وجہ سے ہوٹل کا مینیجر اور عملہ اُن کے ساتھ نہایت حسنِ سلوک سے پیش آنے لگا تھا۔ مینیجر نے وعدہ کیا کہ وہ فی الفور ابا جان کو مطلع کر دے گا۔ اس کے باوجود زورا رات کو اوّل وقت ہوٹل جا کے خود تصدیق کر آیا تھا، خانم کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔

بجھل کو بھی کانتے کی طرح یہی اُمید تھی کہ زورا اب کے کوئی خبر لے کے ہی لوٹے گا۔ زورا کے لٹکے ہوئے ہونٹ دیکھ کے بجھل کے چہرے پر لکیریں پڑ گئی تھیں تاہم اُس نے زورا کو ہدایت کی کہ وہ صبح منہ اندھیرے تنگو کے ساتھ حویلی چلا جائے اور اب اُسی وقت وہاں سے لوٹے جب اُس کے پاس خانم کے سلسلے میں کوئی خبر ہو یا کوئی اور ضروری بات ہو۔ بجھل نے ابا جان کو کہلوایا کہ وہ ابھی نواب حشمت جنگ سے کوئی تذکرہ نہ کریں، خانم کا انتظار کرتے رہیں۔

زورا سورج نکلنے سے پہلے تنگو کو ساتھ لے کے اڈّے سے چلا گیا تھا۔

پھر وہ دن بھر نہیں آیا، رات کو بھی نہیں۔ پانچواں دن تھا۔ روز کی طرح دن بھر اڈّے پر بھیڑ جمی رہی۔ یہ اجتماع اگر ایک طرف بجھل کے ایما کے مطابق تھا تو دوسری طرف اُن کی اپنی بے چینی بھی تھی۔ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ نئے دادا کو اپنے دو آدمیوں کا انتظار ہے اور جب تک وہ نہیں آ جائیں گے، نیا دادا اڈّا سنبھالنے کی رسم انجام نہیں دے گا مگر وہ لوگ کب آئیں گے؟ وہ کہاں ہیں؟ اڈّا سنبھالنے کے بعد بھی تو اُن کا انتظار کیا جا سکتا ہے؛ کہیں موجود ہے؟ اڈّے پر اُس کے دوبارہ نمودار ہونے سے بھی اُن کے ذہن میں جاگزیں ہوا ہو گا کہ کہیں وہی پھر بے نگاہ نہیں تھے کہ بجھل کے جسم کا تناؤ محسوس نہ کر سکیں۔ انھوں نے زورا کی رات کو اڈّے پر آمد اور سالے دن گم محسوس کی ہو۔ انچارج سے بجھل کی گفتگو کے دوران اڈّے پر موجود تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں سے بجھل اور انچارج ہونے والی باتوں کی جانے کس کس طور سے تشریح کی ہو۔ چوکی پر گو بجھل ہی جا بیٹھا تھا مگر وہ موجودہ صورتِ حال طرح مطمئن معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اِس عرصے میں کانتے سے کئی آدمی اچھی طرح کھل مل چکے تھے، ہرچند کہ انھوں نے تشویش ظاہر نہیں کی تھی لیکن کانتے، جمرو اور شامو اُن کی سرگوشیوں سے بے خبر نہیں تھے۔

دیر کسی طرح نہیں ہونی چاہیے تھی۔ وہ دن جیسا کہ انھوں نے کانٹوں پر لوٹ کے گزارا تھا۔ رات کو وہ تینوں پر بھی نہیں گئے تاکہ زورا آئے تو سامنے ہی آئے۔ رات کو آنے کی توقع زیادہ تھی مگر وہ نہیں آیا۔ تینوں کی نظریں بار بار کی جانب لپکتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہہ سُن کے ہلکا کر لیتے تھے۔ استاد تو نہ کسی سے اِس سلسلے میں بات کر آٹھ کے ایک پہر کمر ٹکانے اڈّے کے کسی کمرے میں جاتا۔ رات اڈّے کے چند آدمیوں کے اصرار پر وہ تینوں بازار کی گئے۔ گلیوں میں جہاں جہاں سے وہ گزرے، ہلچل سی مچ گئی۔ کے لوگ انھیں اپنے ہاں بلانے آئے مگر وہ بس گلیوں میں رہے اور علاقے کا ایک چکر بھی پورا نہیں کیا تھا کہ واپس آ گئے۔ بجھل کا خیال تھا کہ وہ اڈّے پر اکیلا رہ گیا ہو گا۔ بجھل کو دیکھ کر اُن کا دل اُمڈنے لگتا تھا لو بجھل ہی تھا جسے دیکھ کے اُن میں دوبارہ کونپلیں پھوٹنے لگتی تھیں۔

چھٹے دن دوپہر کو کھانے کے بعد کانتے نے ہمت کی۔ بجھل کے گرد وہ تینوں تھے۔ کانتے نے جھجکتے ہوئے اُس سے ... زورا نہیں آیا ہے؟"

"ہاں رے نہیں آیا۔" بجھل نے بھاری آواز میں جواب ...

"اُس کو آنا چاہیے تھا استاد!" وہ بے تابی سے بولا۔

"آ جائے گا رے۔"

...اور نا دادا مگر اُس کے آنے میں اور دیری ہو گئی ہے؟ اگر وہ... نے بھی زبان میں کہا: "اُدھر آپی خانم بیمار بھی ہو سکتی ہیں۔ اِس ... سے کہا کہ حیدر آباد کا نام سُن کے خانم تو بہت گھبرا گئی ہو گی۔"

"ابھی دیکھتے ہیں رے!" بجھل نے تنک کے کہا۔

کانتے سے یہ بات نہ پوچھی گئی کہ دوسری صورت میں بجھل ... کون سی تدبیر ہے۔ وہ اُس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ... اور پریشان نہ کرنے کے خیال سے ٹھٹک کے رہ گیا۔

انچارج کے جانے کے بعد سے اب تک علاقے کے تھانے کی ... کوئی ہرکارہ نہیں آیا تھا مگر پولیس کی جانب سے وقت کی ... بہت چھوٹ کا کانتے کو ایسا اعتبار نہیں رہا تھا۔ یہ رعایت ... کا اپنا گمان تھی۔ پولیس کسی بھی لمحے اڈّے کا رُخ کر سکتی تھی۔ آنے ... لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس پر تو دروازہ کھٹ ... نے کی رسم کی بھی قید نہیں ہے۔

کل سہ پہر کا وقت تھا۔ انھوں نے زورا کو دروازے میں ... ہوتے دیکھا۔ عمارت میں لوگ تھے، اِس کے باوجود زورا کو دیکھ کے ... بے اختیار اُٹھ گئے۔ انھوں نے دُور سے زورا کے چہرے کی سُرخی ... آنکھوں کی دہکتی روشنی بھانپ لی تھی۔ قریب آ کے زورا نے انھیں ... لرزتی آواز میں بتایا کہ خانم کل حیدر آباد پہنچ رہی ہے۔ انھیں ایسا لگا ... جیسے زورا اُن سے مذاق کر رہا ہو۔ زورا کے بیان کے مطابق دوپہر وہ ... پہنچا تھا، وہاں فیض آباد سے آیا ہوا تار ملا۔ ہوٹل کا مینیجر تار ... پہنچانے کا انتظام کر رہا تھا۔ زورا تار لے کے سیدھا حویلی گیا۔ ... پڑھتے ہی ابا جان نے اُسے فوراً یہاں کے لیے روانہ کر دیا۔ بجھل نے ... اُسے واپس نہیں بھیجا۔

دھوپ ہر سو پھیل چکی تھی۔

کانتے نے ایک جھرجھری لی اور بازو جھٹکتے ہوئے بولا: "ایک ... کال رہ گیا تھا لاڈلے! اپنے کو اُمید تھی کہ آج کے دن تیرا اور ... کا درشن ضرور ہو جائے گا پر اُوپر والے کو اپنا پہلے خیال آ گیا۔"

میں گُنگ بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔

"کیا ہو گیا تجھ کو؟" وہ مجھے چٹکی بھرتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے گھُٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"بولتا کیوں نہیں؟"

"کیا بولوں کانتے بھائی؟"

"ارے بابا، تو نے اُدھر کیسے کاٹی؟"

"میں کانتے بھائی!" میں نے بے تابانہ اُس کا ہاتھ سینے سے لگاتے ہوئے کہا: "اب اُسے دُہرانے سے کیا حاصل۔" میری آواز بھرّانے لگی تھی۔

"جانے دے۔" اُس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور مجھے دبوچ لیا۔ پھر میں نے خود کو بہت روکنا چاہا مگر مجھے بھی نہ جانے کیا ہوا، میری سسکیاں نکل پڑیں۔ "ہائیں لاڈلے! لاڈلے!" وہ بے قراری سے بولا۔ "یہ کیا، یہ کیا، اب تو سب لوٹ گیا ہے جانی! کوئی نیا تھوڑی تھا۔ اُدھر سپاہیوں سے زیادہ تو نہیں تھا اور بمبئی میں کرشنا جی... وہ سب بھول گیا کیا؟ اپنے کو پتہ ہے، اُدھر نواب نے تم لوگوں کے ساتھ کوئی آدمی پتا نہیں کیا ہو گا۔ قسم سے، اُستاد سامنے پڑھا تا تھا۔ میں نے اُس کو دیکھا ہے، جان پڑتا ہے، وہ وہی حرام کا جنا خان تھا جو اُدھر حویلی میں چوہے کی طرح دبکا کھڑا تھا۔ دن باقی تھے، حالے کے تجھ کو کیسے بولوں، ماں قسم اِدھر ایک پل بھی کسی کو چین نہیں تھا۔ تجھ کو پتہ ہے، اپنے کو زیادہ ہیرا پھیری نہیں آتی۔ استاد نے سالی بہت خواری کر رکھی تھی ورنہ تیرا بھائی حویلی کی دیوار اُتر کے ہی دم لیتا۔ اِدھر ایک ہی بات کا دھڑکا لگا تھا، خانم کے آنے کے بعد نواب پھر کہیں دھیٹ پنا نہ کرے۔ اپنے کو اُسی کا انتظار تھا۔ کل یا تو تُو ملتا یا پھر کوئی کسی کو نہ ملتا۔ اس سے زیادہ اپنے بس کا نہیں تھا۔ پھر شاید اپنے کو ہی اُستاد کے آگے آنا پڑتا۔"

کانتے جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ انھیں نہ نیند آتی تھی، نہ کچھ کھایا جاتا تھا۔ اُن کے جسموں پر ہر لمحے جیسے چیونٹیاں رینگتی رہتی تھیں۔ زورا، جمرو اور شامو نے مجھے گھیر لیا۔ وہ سب میرے ہاتھ، میرے گال چوم رہے تھے۔ جتنا وہ مجھے بہلاتے تھے، اُتنی ہی میرے سینے میں جلن بڑھتی جاتی تھی۔

"چھوڑ دو اس کو۔" کانتے انھیں میرے پاس سے دھکیلتے ہوئے بولا اور مجھ سے کہنے لگا: "رو لے پھر، جی بھر کے رو لے۔" اُس کی آواز ڈھل رہی تھی: "مجھ کو یہ سب کچھ تجھ سے نہیں بولنا چاہیے تھا پر تُو نے ہی تو...."

"کانتے بھائی!" میں نے سسکتے ہوئے کہا: "مجھے معاف کر دو۔"

"کیا! کیا بول رہا ہے تُو؟" وہ وحشت سے بولا۔

"میں نے بہت، میں نے تم سب کو...."

اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آگے سنبھل کے بولنا۔" اُس نے بلکتی آواز میں کہا اور میرے سینے سے اپنا چہرہ رگڑنے لگا۔ "بولے تو ابھی چھاتی کاٹ کے دکھائیں تجھ کو؟"

زورا نے مجھے اُس سے چھین لیا اور چارپائی سے کھڑا ہو گیا۔ میری آنکھوں سے کوئی سوتا پھوٹ پڑا تھا۔ زورا مجھے گلے لگائے

لمحوں خاموش کھڑا رہا۔ "ابھی نیچے چلو راجا اُستاد! دن سالا اوپر چڑھ آیا ہے۔ اپن لوگ کو ابھی نیچے چلنے کا ہے۔ اُودر سب لوگ کب سے جاگا پڑا ہے۔"

جہاں ہم چاروں بیٹھے تھے، وہاں ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ زورا غلط نہیں کہہ رہا تھا، کب سے نیچے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ جمرو نے اپنے دامن سے میرا چہرہ پونچھا۔ خود اُن سب کے چہرے بھیگے ہوئے تھے۔ میں نے قدم آگے بڑھایا تو مجھے چکر سا آنے لگا۔

نیچے چوکی پر بجھل اور پیرو کے ساتھ بھورے دادا موجود تھا۔ تینوں صاف کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پیرو خاص طور سے بہت اُجلا اُجلا نظر آ رہا تھا، بال پیچھے کی طرف کڑھے ہوئے، بیچ میں مانگ نکلی ہوئی۔ مجھے دیکھ کے وہ اُچھل پڑا۔ میری ڈوبتی نظریں بجھل کی طرف اُٹھیں تو اُس کے ہونٹوں پر لرزش سی طاری ہوئی اور اُس نے مجھے چوکی پر اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ مجھے پیروں پر اپنا جسم بوجھ لگ رہا تھا۔ وہیں چوکی پر ہم چاروں کے لیے ناشتہ لگا دیا گیا۔ زورا کے کہنے کے مطابق گاڑی گیارہ بجے آنی تھی، اُس وقت دس سے کم نہیں ہوں گے۔ کانتے نے سرگوشی میں بجھل کو وقت کا احساس دلانا چاہا تو اُس نے کانتے کو جھڑک دیا۔ "بیٹھا رہ۔"

میں یہاں آ تو گیا تھا لیکن مجھ سے ایک لمحے کے لیے بھی یہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ کانتے اور زورا دھیمے لہجے میں سب کچھ بتلاتے رہے تھے لیکن شاید آوازوں کا اصل شور تو اُن کی بازگشت میں ہوتا ہے، لفظ لفظ جیسے میرے جسم میں پیوست ہو گیا تھا، میری رگ رگ میں گونج رہا تھا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ یہاں سے بھاگ کے کہیں چھپ جاؤں، کسی کمرے میں بند ہو جاؤں اور کسی کو اپنی شکل نہ دکھاؤں۔ کانتے کہہ رہا تھا کہ صرف ایک دن کا بل رہ گیا تھا بلکہ ایک رات کا۔ ایک رات کے لیے میں اور پیرو تحمل کر لیتے تو ہمیں آج مل ہی جانا تھا مگر اچھا ہوا کہ ہم نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ کر لیا۔ کانتے کا اندیشہ اگر سچ نکلتا تو جانے پھر کیا ہوتا، خانم کے آنے کے بعد اگر واقعی نواب انکار کر دیتا تو؟ اُسے ہم سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن ہمارے بارے میں ایک مرتبہ لاعلمی کا اظہار کرنے کے بعد اگر اُس کے دل میں اپنے قول پر جمے رہنے کی کوئی ضد آجاتی تو ہم سے اُس نے کوئی رعایت نہیں برتی تھی سو ہمیں آزاد کر دینے کا فیصلہ کرنا اُس کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ بہت سے دُور دراز کے خدشے اُس کے ذہن میں گھر کر سکتے تھے چاہے وہ کتنے ہی بے سر و پا ہوتے۔ اگر نواب کے سر میں سما جاتا کہ ہماری رہائی سے زیادہ ہماری قید یا ہمیں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے میں بہتری ہے تو وہ کوئی پیش و پس نہ کرتا۔

کہتے ہیں نوابوں کو اپنے فیصلوں پر نظرِ ثانی کرنے کی عادت نہ[illegible] بجھل بھی ان امکانات سے بے خبر نہیں ہو گا لیکن خانم کے آنے [illegible] اُسے ہماری رہائی کی اتنی ہی توقع تھی جو اُس نے کسی اور طرف [illegible] ضروری نہیں سمجھا۔ کسی اور طرف دیکھا کہاں جا سکتا تھا۔

اور کون سا نشیب تھا۔ وہی دو راستے، پولیس یا بڑا[illegible] نواب کی حویلی کی فصیلیں۔ پولیس میں جا کے نواب کا نام [illegible] پہلے بجھل کو اپنی صحیح الدماغی کا ثبوت پیش کرنا ہوتا اور [illegible] فصیلیں عبور کرنے سے مُراد ہم تک پہنچنا نہیں تھا۔ متبنی [illegible] کو اپنے منصب کی غیرت آتی اور متبنی دیر میں بجھل اور کانتے [illegible] سے ہمارے زنداں تک کا فاصلہ طے کرنے میں کامیاب [illegible] میں ہمارا نام و نشان ہمیشہ کے لیے مٹا دیا جاتا۔ ایک راستہ [illegible] بھی تلاش کیا تھا گو وہ ایسا نامعتبر نہیں تھا مگر ہم دونوں کے [illegible] کے اندیشے سے مستثنا نہیں تھا، ان سب کو بعد میں ٹٹولنا ہی [illegible] تھا۔ بعد میں معلوم نہیں بجھل نے ہم دونوں کے خوں بہا کا کیا [illegible] تھا۔ جو کچھ بھی ہو گا، وہ نواب کے وہم و گماں سے کہیں سوا ہو گا۔ نواب کو اشارہ کر آیا تھا کہ بہ صورتِ دیگر کیا کچھ ممکن ہو سکتا [illegible] اُس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کچھ کہتا مگر اُس سے ملنے کے بعد [illegible] نے اِن لفظوں کے وہی معنی لیے ہوں گے جو بجھل نے کہنا چاہا [illegible] اِس میں کوئی شبہ تھا تو بعد میں تصدیق کے لیے بازار کے اڈ[illegible] بجھل کی موجودی کافی تھی اور جو بجھل اُس سے کہہ نہیں پایا تھا [illegible] سے ملنے والی اطلاعات سے نواب کو سُننے کو مل گیا ہو گا۔ بجھل [illegible] پیرو کے گویا اُسے مسلسل یہی کچھ کہتا رہا تھا۔ اُس نے نواب [illegible] اِسی لیے عجلت کی تھی کہ وہ اُس کے حیدرآباد میں آنے کی خبر سُن [illegible] ہیجان میں مبتلا نہ ہو جائے، بہتر ہے کہ اس سے پہلے اُسے اپنی [illegible] دی جائے مگر بجھل بھی وہاں حویلی میں کچھ جان کے اور دیکھ کے [illegible] حویلی کی فصیلیں، شیشوں کی دیواریں، مسلح دربانوں اور خدمت گار[illegible] کی ایک فوج۔ ممکن ہے، اُس نے وہاں اصطبل کے گھوڑوں اور فیل[illegible] کے ہاتھیوں کی چنگھاڑ بھی سنی ہو جنھیں سال میں کبھی کبھار ہی اپنے آ[illegible] خدمت نصیب ہوتی ہو گی اور یہ سب بجھل کو نظر نہیں آتا یا یہ لاؤ ل[illegible] اُس کی آنکھوں کے لیے نیا نہیں تھا تو بھی اُس کے سامنے ایک شخص [illegible] جس نے راہ چلتے دو آدمیوں کو باقی ساری دنیا کی نگاہوں سے او[illegible] دیا تھا اور لُٹے اُن کے پوچھنے والوں کی کوئی فکر نہیں تھی کہ وہ کون [illegible] اور کس دروازے پر جا کے شور مچا سکتے ہیں۔ اُن کے اشاروں کی [illegible] اُس کی حویلی بھی آ سکتی ہے۔ کانتے نے محسوس نہ کیا ہو مگر بجھل نے نو[illegible] اخذ کیا تھا، یہی کہ بڑے نواب کو میرے اور پیرو کے بارے میں [illegible]

[illegible]ے کسی سنگ دل لمحے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ ان لمحوں کی [illegible] کے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔

مگر اب میرے دماغ پر سناٹا سا طاری تھا، اگر وہ سب ہم دونوں [illegible] بڑھانے کے لیے تھا نواب تو ہم آ گئے تھے۔ کانتے کے بہ قول خانم [illegible] آنے کے بعد اُسے نواب کی طرف سے کوئی خدشہ تھا اور اُس کے [illegible] کے مطابق بجھل بھی اُس کے اِس سوال کا کوئی معقول جواب نہ دے [illegible] تھا نواب کسی سوال کا جواب باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ساری گرہیں ہمارے [illegible] پر کھل گئی تھیں، وہ سب ہماری وجہ سے تھا، ہمارے کھو نہ جانے [illegible] خیال سے تو وہ سب ختم ہو چکا تھا، ایک رات پہلے ہی۔ بجھل کو [illegible] رات ہی اڈے سے اٹھ جانا چاہیے تھا؟ اُسے اس طرح یہاں بیٹھنے [illegible] اڈے اور نئے دادا کی رسم کی ادائی کی اجازت دینے کی کیا ضرورت [illegible] جیسا کہ کانتے نے ہمارے آنے سے پہلے کے دنوں کے متعلق بتایا تھا [illegible] کچھ اب بھی تھا، ہمارے آنے کے بعد اس میں کوئی تبدیلی نظر نہیں [illegible] تھی۔ رات ہی کو ہم حیدرآباد سے بہت دُور ہو سکتے تھے، کہیں اور [illegible] نہ تو ابا جان کی حویلی میں منتقل ہو کے کسی وقت بھی وہاں سے نکل سکتے [illegible] خانم کی آمد کی اطلاع آ گئی تھی تو اُس کا انتظار حویلی میں رہ کے بھی [illegible] جا سکتا تھا یا ابا جان کو اطلاع پہنچائی جا سکتی تھی کہ وہ خانم کو اسٹیشن [illegible] کے فلاں جگہ آ جائیں یا سیدھے بمبئی کی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ [illegible] بہرحال اڈے سے زیادہ محفوظ اور پُرسکون جگہ تھی۔ اڈے پر ہم [illegible] ہر لمحے پولیس کے نرغے میں تھے۔ رات کو ہمارے آتے ہی اڈے [illegible] باہر نکلنا مشکل تھا یا مناسب نہیں تھا تو صبح منہ اندھیرے یہاں [illegible] رخصت ہوا جا سکتا تھا۔ آنے والوں کی پذیرائی نہ کی جاتی تو کوئی بھی [illegible] نہ ٹھیرتا۔ بجھل شاید ابا جان کو بھی بھول گیا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی [illegible] کو اُن کے پاس بھیج دینا چاہیے تھا تاکہ ایک رات تو انھیں سکون [illegible] نیند آ جاتی۔ ہو سکتا ہے، اُن کے لیے یہ خبر خزانے کی بازیابی سے [illegible] ہو کہ ہم صحیح سلامت بجھل کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اب بھی بجھل [illegible] اُٹھنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ رات میں باہر نکلنا اُس کی [illegible] میں اگر نامعقول تھا تو دن میں اور بھی غیر محفوظ تھا۔ یا تو بجھل کو [illegible] نواب کی جانب سے کسی جوابی اقدام کا کوئی تردد نہیں تھا کہ اب [illegible] شب کے اندھیرے اور دن کی روشنی سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کسی [illegible] بھی ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں یا پھر اُسے اتنا تردد تھا، جیسے نواب [illegible] حویلی سے ہمارے نکلتے ہی ہمارے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے [illegible] جتنی دیر ہم حیدرآباد سے دُور ہونے کی کوشش کریں گے، [illegible] میں شہر سے جانے والی تمام سڑکوں پر پولیس پہرا لگا چکی ہو گی [illegible] زیادہ محفوظ جگہ تھی۔ نواب کو مطمئن رکھنا چاہیے تھا کہ اس

کے ہاں سے بھاگے ہوئے دونوں آدمی مفرور نہیں ہیں، نہ انھوں نے پولیس کا رُخ کیا ہے۔ یہی ہو سکتا تھا کہ بجھل کو کسی اور وقت کا انتظار ہو مگر ایسے تو جتنا وقت گزر رہا تھا، بڑے نواب کے آدمیوں کو اڈے کے گرد حصار ڈالنے اور سنبھلنے کا موقع فراہم ہو رہا تھا۔ پیرو نے اُسے ہمارے حویلی سے نکلنے کی ساری تفصیل بتائی ہو گی، یہ بھی کہ چلتے چلتے نواب کو ہم نے کس حالت میں چھوڑا ہے اور شاید اُس نے اپنا یہ قیاس بھی ظاہر کیا ہو کہ نواب کی طرف سے مزید کسی حیل و حجت کا امکان نہیں ہے۔ پہلے کی بات اور تھی، مجھے اور پیرو کو دُور دُور سان گمان نہیں تھا کہ یہاں شہر میں بس ہمارے آنے کی دیر ہو گی۔ ضروری نہیں کہ بجھل نے پیرو سے اتفاق کیا ہو۔ بے شک ہم نواب کی تحویل میں نہیں رہے تھے اور نواب کو خوب احساس ہو گا کہ دوبارہ ہماری جانب ہاتھ بڑھانے سے پہلے اپنے سر اور گریبان کا خیال رکھنا چاہیے مگر کیا خانم کا پتہ جاننے والوں سے ایسے دست بردار ہو جانا چاہیے جو اتنے عرصے کی تگ و دو کے بعد دکھائی دیے تھے؟ کچھ اور نہیں تو شہر سے باہر جانے والے راستے ہمارے لیے ممنوع قرار دیے جا سکتے ہیں، ریاست کی تعزیری دفعات بھی کم نہیں ہوں گی۔ ریاست میں نوابوں کی عمل داری اُن کی حویلیوں کی چار دیواریوں تک محدود نہیں ہوتی۔ ہم بڑے نواب کی حویلی کے زنداں سے نکل آئے تھے لیکن زنداں تو ریاست کی سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ نواب کے آدمی اس وقت بھی یہاں اڈے پر موجود ہوں اور نواب کے نمک کا فرض ادا کرنے کے لیے کسی بہانے کے منتظر۔ وہ ہمارے سائے سونگھتے سونگھتے بمبئی تک جا سکتے ہیں، ہمارے ٹھکانے جاننا ہی اُن کے لیے بہت ہو گا، اس طرح یہ سلسلہ کہیں تو خانم کی دہلیز پر جا کے تمام ہو گا۔ رات اڈے پر نئے دادا کی رسم کی ادائی سے بجھل کی مُراد بڑے نواب کو یہی باور کرانا ہو گا کہ اب اُس کا مستقلاً اڈے پر رہنے کا ارادہ ہے۔

جیسے کوئی میرے اندر چھپا میرا سینہ نوچ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ بڑے نواب کی جانب سے بجھل کو کچھ تقین نہیں ہے مگر پھر وہ کون سے اعتبار پر یہاں بیٹھا ہے۔ گیارہ بجے گاڑی آنی تھی۔ اب ایک گھنٹے سے اُوپر ہو چکا ہو گا۔ کانتے اور زورا پہلو بدلتے بار بار بجھل کی طرف دیکھتے تھے۔ گاڑی کبھی گھنٹوں کی تاخیر سے بھی آتی تھی لیکن ہم سامنے ہی بیٹھے تھے، کسی کے علم میں نہیں تھا کہ بجھل نے کسی سے گاڑی کے وقت کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش کی ہو۔ میں نے سوچا کہ میں ہی اُسے ٹوکوں، شاید میری بات کا اثر ہو مگر میری زبان اٹک کے رہ گئی۔ دوپہر کا کھانا ہم سب نے بس ٹونگ ٹونگ کے،

دوسروں کو دکھانے کے لیے کھایا حالانکہ کھانا نہایت لذیذ تھا۔ بریانی، قورمہ اور ماش کی دال بازار کے کسی ہوٹل والے نے ماش کی پھریری دال بطورِ خاص پکوائی تھی، واقعی ایک ایک دانہ الگ تھا۔ پیرو کے بہ قول ماش کی دال وہی ہے جسے مٹھی بھر کے دیوار پر پھینکو تو ایک دانہ بھی دیوار پر نہ ٹکے۔ ساتھ میں ناریل کی چٹنی بھی تھی۔ کھانے کے وقت لوگوں کی تعداد اور بڑھ گئی تھی۔ اس دوران کالنتے نے کئی بار زورا سے پوچھا کہ خانم کے متعلق بجّل نے ابا جان کو کچھ اور تو نہیں کہلوایا تھا۔ بجّل نے ایسی کوئی ہدایت اُسے نہیں دی تھی اور ابا جان سے رابطے کا ایک ذریعہ زورا ہی تھا۔ اب سب کچھ بعد از وقت تھا، گاڑی اگر وقت پر آئی تھی تو آگے بھی روانی ہو گئی ہو گی۔ شاید بجّل نے اپنے طور پر سمجھ لیا تھا کہ ابا جان اور ماسی اسٹیشن سے خانم کو لے ہی آئیں گے۔ ہم میں کسی کا اسٹیشن جانا ویسے بھی نامناسب تھا لیکن اگر ابا جان نے بھی احتیاط کی تو؟ وہ بھی کہیں ہمارے بھروسے پر رہے تو؟

تقریباً تین بج چکے تھے۔ اُس وقت صحن اور دالان میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ نام پلّی کا دادا ساجن بھی آ گیا تھا۔ سکندرآباد کا دادا ادّو نیا بھی موجود تھا، ادّو نیا شہرِ ادونی کا رہنے والا تھا اس لیے اُس کا نام ادّو نیا پڑ گیا تھا، آدھی ہندوستانی، آدھی تلنگانہ بولتا تھا۔ بجّل نے کالے دادا سے چائے کی فرمائش کی۔ چائے تیار ہو رہی تھی، تھوڑی ہی دیر میں آ گئی۔ چائے پینے کی دیر تھی کہ بجّل اُٹھ کھڑا ہوا، پیرو بھی اُس کے ساتھ اُٹھ گیا۔ اُن دونوں کے پاس بیٹھے ہوئے بوڑھے بھولے دادا نے حیرانی سے انھیں دیکھا۔ "کدھر! کدھر دادا؟"

وہ بے چینی سے بولا۔

"بس دادا! ابھی اپنے کو اجازت دو۔"

"ایک دم! ایک دم کیسے اُٹھ گئے؟"

"بس دادا! کبھی نہ کبھی اُٹھنا ہی تھا۔"

"ایسا کیسے؟" بھولے دادا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی بیٹھو، کچھ دیر ادھر اور بیٹھو۔"

"کیا فرق پڑے گا دادا!" بجّل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جانے سے پہلے اِدھر کو آئیں گے، پر پکّا نہیں ہے۔"

"کیسا لگتا ہے اپن سے کوئی غلطی ہو گیا۔" بھولے دادا مضطرب انداز میں کھڑا ہو گیا اور بجّل کا بازو تھام کے اُس نے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"ابھی ایسا مت بولو دادا!" پیرو نے بیچ میں کہا۔ "ماں قسم اپن کے پاس وقت ہوتا تو اید تمھارے پیروں میں ہی بیٹھا رہتا۔"

بھولے دادا سر جھٹکنے لگا اور اُس نے والہانہ انداز میں پیرو کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں، کالنتے، جمرو اور شامو بھی اُس پر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، صحن اور دالان میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اپنی جگہ پر بیٹھے نہ رہ سکے۔ ہر سُو یکایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ "اپنے کو بھول مت جانا!" بھولے دادا نے بھری ہوئی آواز میں بجّل سے کہا اور اُس کے گلے سے لپٹ گیا۔

"جلدی، جلدی ہی ملیں گے۔" بجّل بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"اِن کے پاس ابھی زیادہ ٹیم نکو دکھائی پڑتا۔" بھولے دادا کی آواز دھندلا گئی تھی۔ "تھوڑا اپنی بات مان لیتے تو...."

"اپنا جی بولتا ہے، ابھی پورا جگ پڑا ہے تمھارے پاس۔" بجّل نے اڈّے پر موجود لوگوں کی طرف نظریں گھماتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "ابھی ان سب کو دیکھنا ہے تم کو، وہ کبیرے اور آکا، اُن اُچکّوں نے ان کو بے دھار بنا دیا ہے، تم کو نئے سرے سے ان کی اٹھک بیٹھک کرانا ہے۔"

"جیسا تم بولتے ہو، اپن سب ویسا ہی بھگتنے کی ہمت کریں گے۔ پر تم، تم....."

بجّل نے سر کے اشارے سے تسلّی دی اور اُسے بازو میں بھینچتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ابھی وہ چوکی سے نہیں اُترا تھا کہ ٹھیر گیا۔ آنگن میں سب لوگ کھڑے اُسے گھور رہے تھے۔ بجّل چند لمحے گم صم سا کھڑا رہا۔ عمارت پر سکوت چھا گیا تھا۔ بجّل نے نسبتاً بلند آواز میں کہا۔ "ہم کو جانا ہے، ابھی کچھ پتہ نہیں کہ کب اپنی واپسی ہو، پر جب بھی آئیں، ہماری منتی پر بھولے دادا مان گیا ہے کہ وہ اسی جگہ پہ رہے گا۔ بیچ میں اپنے پیچھے کسی کو چل اُٹھے تو تم کو جو بولنا ہے وہ ہم کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ ادھر ابھی سب بھولے دادا کے حکم پہ چلے گا۔ کالے بھی ساتھ میں اتّا دیکھے گا پر کالے چوپٹ چلے گا تو بھولے دادا کسی کو اُس کی جگہ بدل دے گا۔ ہم نے یہ سب خوب جان کے کیا ہے۔ اب آگے تمھارا کام ہے۔ یہ تم پہ ہے کہ تم دادا سے کتنا مانگتے اور سمجھتے ہو۔ ہم نے اس سے بولا ہے کہ ادھر اڈّے کے ہی آدمی تیار کرے، ادھا اور کبیرے لوٹ لوٹ کے آتے رہیں گے۔" بجّل نے ایک لمحے تک کے اُن کی طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "اِدھر ہم کچھ لوگ کو اپنا پتہ بول کے جا رہے ہیں۔ دادا کو کوئی تکلیف نہ ہو، اس دو بلّا کھو دو گے تو اپنا کچھ نہیں بگڑے گا، سب تمھارا ہی گھاٹا ہے۔ دھیان رکھنا، تم کو ہم بھولے دادا کے ہاتھ سونپ کے جا رہے ہیں تو اس کو تمھارے....."

عمارت پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ بھولے دادا بجّل کے پہلو سے چپکا سر جھکائے کھڑا تھا۔ کالے کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ بجّل

نے پھر کچھ نہیں کہا، چوکی سے اُتر گیا۔ سامنے کھڑے ہوئے آدمی خود پیچھے ہٹ گئے تھے اور دروازے تک اُن کے درمیان گلی نما راستہ بن گیا تھا۔ سب دم بہ خود سے تھے اور جیسے اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ہمارا حال بھی کچھ یہی تھا۔ دروازے کے قریب ادھیڑ عمر فتّو سے صبر نہیں ہوا، بجّل اُس کے پاس سے گزرا تو وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ جب سے بجّل اڈّے پر آیا تھا، فتّو اُس کے پاس ہی پھٹکتا رہتا تھا، کبھی اُس کے پیر دباتا، کبھی حقّہ تازہ کرتا۔ بجّل نے رُک کے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور اُس کے بال جھنجھوڑے تو وہ اپنے حواس اور کھو بیٹھا۔ دروازے تک ہمارا پہنچنا مشکل ہو جاتا، سب ہمیں گھیر لیتے مگر بجّل نے ہاتھ بلند کر کے انھیں خود سے دُور رکھنے کی کوشش کی۔ کالے اور بھولے دادا بھی انھیں ہمارے پاس سے ہٹ جانے کی تاکید کر رہے تھے پھر بھی کئی آدمی بجّل کے پیروں سے لپٹ گئے اور اُسے اڈّے پر رُک جانے کی دہائیاں دینے لگے۔ "آئیں گے سجنا، جلدی آئیں گے۔" بجّل اُن سے یہی کہتا رہا۔ کالے دادا کی مداخلت پر بہ مشکل تمام وہ بجّل سے دُور ہوئے۔

باہر گلی میں بھی اُن کا ہجوم ہمارے پیچھے آنا چاہتا تھا مگر بجّل نے بلند آواز میں انھیں روک دیا۔ "شرابہ مت کرو۔" اُس نے کسی قدر تندی سے کہا اور بھولے دادا سے بغل گیر ہو کے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ بھولے دادا پیرو اور ہم سب سے ملنا چاہتا تھا لیکن بجّل کے بڑھ جانے کی وجہ سے اُس کے بازو اُٹھے رہ گئے۔ چند منٹ بعد ہی مختلف گلیوں میں گھومتے ہوئے ہم بازار کی خاص گلی کے نکڑ پر آ گئے تھے۔ چار بجے ہوں گے، سورج غروب ہونے میں دیر تھی اور اسی نسبت سے بازار کا سورج طلوع ہونے میں دیر تھی پھر بھی خاصی چہل پہل تھی۔ کچھ دُور تک تو کسی کو احساس نہیں ہوا لیکن نکڑ پر ہوٹل کی تپائیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی جیسے ہی ہم پر نظر پڑی، وہ بدحواس ہو گئے۔ پھر آگے نہ جانے کس طرح سارے راستے کے بالاخانوں، دکانوں اور راہ گیروں کو جیسے ہمارے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ ہم کُل سات تھے، بجّل، پیرو، کالنتے، زورا، جمرو، شامو اور میں۔ ویسے بھی گلی میں اتنے آدمیوں کا ساتھ گزرنا گلی کے لوگوں سے کیسے اوجھل رہ سکتا تھا خصوصاً جب اُن کا تعلق اڈّے سے ہو اور اڈّے پر بھی وہ نو وارد ہوں۔ آگے تمام راستے پر بالاخانوں کے دروازے اور کھڑکیاں کھلتی گئیں اور راہ گیر یا تو سمٹ کے ایک طرف ہوتے گئے یا جہاں موجود تھے، وہیں ٹھٹک کے رہ گئے۔ دکانوں پر بیٹھے کئی آدمیوں اور راہ گیروں نے بجّل کو سلام بھی کیا لیکن بجّل نے جیسے اُن کی جانب دیکھا ہی نہیں۔ ہم اُس جگہ سے بھی آگے آ گئے جہاں خانم کا مکان تھا اور جہاں نیساں رہتی تھی مگر گلی کے خاتمے سے کچھ پہلے پان کے ایک دکان دار نے ہمیں روک لیا، وہ تیزی سے نیچے اُتر کے بجّل کے مقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ کولہے مٹکاتا اور ہاتھ لہراتا آیا تھا اور اُس کی آواز میں بھی کچھ ایسی لٹک تھی کہ بجّل کو ہنسی آ گئی۔ "بندی کا پان کھائے بغیر ادھر سے گزر جائیے گا سرکار؟" بجّل اُس کی دکان پہ مڑ گیا۔ دکان دار اچھل کے دکان پہ چڑھا۔ اُس کے پان لگانے کا انداز بھی دیکھی تھا، پہلے مٹکتا تھا، سر کو نرت کرتے ہوئے چھالیا اور مسالے ڈالتا تھا۔ نفاست اور تیزی سے اُس نے ہم سب کے لیے بیڑے بنائے اور انھیں چاندی کے ورق میں لپیٹ کے اپنے ہاتھوں سے ہمیں کھلائے۔ بجّل نے اُسے پیسے دینے چاہے تو وہ مچل گیا، بجّل نے بھی زیادہ تکرار نہیں کی۔ اُس سے کچھ آگے مٹھائی کی دکان پر دو پولیس والے موجود تھے۔ ہم نے انھیں دُور سے دیکھ لیا تھا اور دیکھا تھا کہ حلوائی نے اشارے سے انھیں ہماری جانب متوجہ کیا ہے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی اُن کے جسم تن گئے تھے لیکن انھوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی، وہیں کھڑے ہمیں گھورا کیے۔ اڈّے کا کوئی آدمی اب تک ہمارے پیچھے نہیں آیا تھا مگر گلی کے کنارے پر وہ اڈّے سے متعلق ہی آدمی تھے جو ادھر گلی میں داخل ہوئے۔ اُدھر ہم اُن کے سامنے تھے۔ وہ کچھ بوکھلا گئے تھے تاہم اُن میں سے ایک نے جھینپتے ہوئے انداز میں درمیان کا مختصر فاصلہ طے کیا اور قریب آ کے اُس کا جسم دُہرا ہو گیا اور اُس کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ اس اثنا میں ہم گلی سے نکل چکے تھے۔

باہر چند گز کی دُوری پر تانگے موجود تھے، بجّل اور پیرو پوچھے بغیر اُس میں بیٹھ گئے۔ تانگے والے نے منہ بنایا مگر دوسرے لمحے وہ سیدھا ہو گیا۔ پیچھے دوسرے تانگے میں ہم چاروں سوار ہو گئے تھے۔ زورا، بجّل اور پیرو کے ساتھ اگلے تانگے پر چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم چار مینار تک آ گئے تھے اور درمیان میں نہ کسی پولیس والے نے ہمارا تعاقب کیا تھا نہ اڈّے کے کسی آدمی نے۔ کوئی ہوتا تو ہماری نظروں سے چوک نہیں سکتا تھا۔ تانگے کے اگلے حصّے پر شامو اور جمرو بیٹھے تھے، پچھلے پر کالنتے اور میں۔ اڈّے سے نکل کے کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ چار مینار سے ہم اسٹیشن کی طرف بھی جا سکتے تھے اور ابا جان کی حویلی تک بھی۔ حویلی کا فاصلہ مجھے معلوم نہیں تھا لیکن چار مینار سے دونوں اسٹیشنوں کا فاصلہ خاصا طویل تھا۔ وہ کتنا ہی ہمارا وہم و گمان ہو لیکن کسی محفوظ جگہ پہنچے بغیر کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ آگے کون سی رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ سب کی خاموشی کا سبب شاید یہی دھڑکا تھا۔ آگے کے تانگے پر بجّل، پیرو اور زورا بھی خاموش خاموش

نظر آرہے تھے۔ چار مینار کے چوک پر کانتے نے میری طرف متوحش نگاہوں سے دیکھا۔ میں اُس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ گیا تھا مگر میں اُس سے کیا کہتا۔ بجّھل کا شہر سے باہر جانے کا ارادہ ہوتا تو وہ پہلے زورا کو اباجان کے پاس ضرور بھیج دیتا، اُنھوں نے اڈّے پر موجود اپنا مختصر سامان بھی ساتھ نہیں لیا تھا۔ بہرحال چند لمحوں بعد تانگا جب چار کمان کی طرف جانے والے راستے کے بجائے دائیں طرف مُڑ گیا تو بات واضح ہوگئی۔ کسی اور طرف جانے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا، بجّھل اباجان کے پاس ہی جا رہا تھا۔ گویا اُس کا ارادہ سب کو ساتھ لے کے ہی حیدرآباد سے رخصت ہونے کا تھا۔

چار مینار سے خاصی دُور آگے گنجان آبادیوں کی بستیاں ختم ہوجاتی تھیں اور بڑے مکانات کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ یہی راستہ بڑے نواب کی حویلی کو جاتا تھا۔ موٹروں، ٹم ٹموں اور بڑی سواریوں کے لیے الگ سے ایک راستہ موجود تھا۔ جیسے جیسے فاصلہ کم ہو رہا تھا، اباجان کے ملنے کے خیال سے میری رگوں میں آگ سی جلنے لگی تھی، اُنھیں کچھ خبر نہیں ہے۔ بجّھل کے ساتھ مجھے اور پیرو کو دیکھ کے اُن کا کیا حال ہوگا، اُنھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔ رات زورا واپس نہیں گیا تھا، اُس کے انتظار میں وہ یوں بھی لمحے گن رہے ہوں گے۔ خانم کو اگر اُنھوں نے سب کچھ بتا دیا ہے تو اُس کے لیے بھی یہ کسی کرشمے سے کم نہیں ہوگا۔ ممکن ہے، اباجان نے اُسے ابھی کچھ نہ بتایا ہو۔ اباجان اُس سے کیسے کہہ سکے ہوں گے کہ اُن کا بیٹا ایک نواب کی قید میں ہے اور خانم کی سفارش کے بغیر اُس کی رہائی ممکن نہیں ہے۔ اباجان کو خانم سے یہ کہنے کے لیے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔ خانم سے اُن کا واسطہ ہی کتنے دن رہا ہے، صرف اتنے دن جب تک وہ فیض آباد میں زرّین کی حویلی میں بیٹھے۔ خانم کے اصرار کے باوجود اُنھوں نے اُس سے کچھ نہیں کہا ہوگا اور بجّھل پر ہی سب کچھ چھوڑ دینا مناسب سمجھا ہوگا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم ایک سرسبز علاقے میں آگئے تھے جہاں ہر طرف قلعہ نما حویلیاں بنی ہوئی تھیں۔ تانگے والے کو زورا کے راستہ بتانے کے انداز سے ظاہر تھا کہ اب اباجان کی خریدی ہوئی حویلی زیادہ دُور نہیں ہے۔ حویلی پہنچنے کے بعد اب شاید اتنی دیر نہ لگے، کاش کہ ایسا ہی ہو۔ رات کا وقت سفر کے لیے زیادہ بہتر ہوگا۔ رات کو بمبئی کے لیے ایک گاڑی روانہ ہوتی ہے۔ نہیں ہوتی تو بھی ہمیں یہاں سے کسی اور سمت نکل جانا چاہیے، جتنی جلدی اس شہر سے چھٹکارا مل جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔ بجّھل کو بھی اِن سب باتوں کا احساس ہوگا کہ یہاں مزید ایک لمحہ بھی نہیں گنوانا چاہیے۔ اباجان کی اتنی طویل غیر حاضری سے فرخ، فریال، فارحہ اور اکبر تو بالکل ہی مایوس ہوگئے ہوں گے۔ مولوی اکرم بہت نیک آدمی ہیں لیکن کوئی کب تک دوسروں کا اتنا خیال رکھ سکتا ہے۔ بمبئی جیسے شہر میں لڑکیوں کی ذمّے داری۔ مولوی اکرم اُنھیں زمانے کی نگاہوں سے رکھنے میں خود بہت نڈھال ہوگئے ہوں گے۔ تبّت سے خط جانے ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہوسکتا ہے، اباجان نے کلکتے یا فیض آباد اپنی جلد واپسی کے بارے میں اُنھیں کچھ لکھا ہو اور لکھا ہو کہ اُن کا بڑا بیٹا بھی اُن کے ساتھ آ رہا ہے یا اباجان نے یہ سوچ کے اتنے دن گزر گئے ہیں، وہاں چند دن اور سہی، اُنھیں کچھ بھی نہ لکھا بہرحال زیادہ سے زیادہ اب ایک ہی دن کا بَل رہ گیا ہے کہ سا دُوریاں ختم ہوجائیں گی۔ ماں کے سامنے جانے کے تصوّر سے میرا بند ہونے لگتا تھا۔ معلوم نہیں، وہ اپنے بھائی کو پہچانیں بھی کہ نہیں اُس شخص کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہیے جس کی وجہ سے اُن کا گھر اُجڑ گیا اور اُن کی ماں۔ اُنھیں امّی سے بہت شکوہ ہوگا کہ اُنھوں نے کا خیال نہیں کیا۔ باپ میں ہی تو اُن کا بیٹا نہیں تھا مگر میں اُن کے ضرور جاؤں گا اور اُن سے کہوں گا کہ وہ جتنی چاہیں مجھے سزا دے لیں، اپنے بھائی کو سنگسار کریں اگر اس طرح کوئی تلافی ہوسکتی ہے۔

تانگا چوراہے سے مڑ کے ایک بڑی حویلی کے دروازے گیا۔ پتھر کی اُونچی چار دیواری اور اُونچے اُونچے درختوں کے درمیان جھانکتی ہوئی لال عمارت کا بالائی حصّہ باہر سے نظر آ رہا تھا۔ در موجود تھا۔ زورا کو دیکھتے ہی اُس نے جھک کے سلام کیا اور دروا کھول دیا۔ میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا اور سارا جسم پتھر کا ہوگیا تھا۔ تانگے سے اُتر کے کانتے نے میرا ہاتھ زور سے اُس کی سانسیں بھی تیز تیز چل رہی تھیں۔ دربان نے چھوٹا دروازہ تھا، کانتے اور میں سب کے بعد اندر داخل ہوئے۔ دونوں جانب لگی ہوئی پھلواری کے بیچ سرخ رنگ کی ایک چوڑی گزرگاہ ہما سامنے تھی۔ میرے پیر ڈگمگا رہے تھے۔ پیرو، جمرو اور شامو کی اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ کیاریوں میں گلاب کے بڑے بڑے کھِلے تھے اور دُور چار دیواری تک پیڑوں کا قطار در قطار سلسلہ تھا۔ گزرگاہ کا گھماؤ عبور کرتے ہی عمارت ہمارے مقابل تھی۔ لال پتھروں سے بنی ہوئی دو منزلہ حویلی طُول و عرض میں اتنی بڑی نہیں مگر سارا نقشہ کسی محل سے مشابہ تھا۔ اس وقت دھوپ اُدھ اور ہر جانب سانولی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم عمارت سے کے فاصلے پر تھے کہ ہمیں مارٹی دکھائی دیا۔ وہ مارٹی ہی تھا، وہ تھا کہ اُس نے ہماری آہٹیں سُنیں، یکایک اُس کے جسم میں بجلی سی بے تحاشا چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آگیا۔ پیرو نے

بڑھ کے اُسے پکڑ لیا۔ "ماسٹر، ماسٹر!" وہ اُسے جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ "سالا تم تو ابھی ایک دم فنتوش کی مافک بدل گیا ہے۔"

مارٹی کی آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں۔ وہ بدحواسی میں سب کے چہرے دیکھ رہا تھا، مجھ پر اُس کی نظر پڑی تو بوکھلا سا گیا۔ "راجا، راجا اُستاد!" پیرو کے بازوؤں سے خود کو چھڑا کے وہ تڑپتا ہوا میری طرف بڑھا اور مجھے دبوچ دبوچ کے دیکھنے لگا۔ وہ بالکل پاگل ہوگیا تھا۔ معًا اُسے کچھ خیال آیا اور وہ وحشت کے عالم میں سیڑھیاں طے کرتا ہوا اندر کی جانب بھاگ پڑا۔ ہم چبوترے پر چڑھے ہی تھے کہ اندر سے تیز تیز قدموں کی آوازیں سُنائی دیں اور مارٹی کی بھڑکتی آواز بھی۔

وہ ایک وسیع و عریض گول کمرہ تھا۔ اُوپر گنبدی چھت پر جا بجا رنگ برنگے شیشے جڑے تھے۔ بیچ میں ایک بڑا فانوس تھا۔ دیواروں پر ہر طرف بیل بوٹے کھدے ہوئے تھے اور فرش پر نیلا قالین تھا۔ دیواروں کے ساتھ تین جانب گدیلے رکھے ہوئے تھے اور درمیان میں ایک جانب چوکی کی نشست تھی۔ اُن سب کی آوازوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ سبھی موجود تھے۔ اباجان، مارٹی، زورا، ٹنگو، کانتے، جمرو، شامو، پیرو، بجّھل اور میں، منیر علی بھی۔ منیر علی کو وہاں دیکھنے کے بعد خانم کی آمد کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی مگر یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ وہ خانم کے بجائے کوئی عذر لے کے آئے ہوں۔ تار کے ذریعے اباجان کا بجّھل کو بلوانا اور بجّھل کے بعد خانم کی طلبی، خانم تو اس افراتفری اور سراسیمگی میں نیم جاں ہوگئی ہوگی شاید اِس لیے منیر علی کو آنا پڑا ہو مگر مجھے تصدیق کی کوئی ایسی اُلجھن نہیں تھی۔ وہاں تو سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ کسی کو کچھ اور سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔ اباجان کے ایک جانب بجّھل بیٹھا تھا اور دوسری جانب پیرو۔ میں اُن کے بالکل سامنے تھا۔ وہ مجھے گلے سے لگا کے، خوب ٹٹول ٹٹول کے دیکھ چکے تھے لیکن شاید ابھی تک اُنھیں کسی فریبِ نظر کا گمان تھا۔ بار بار اُن کی متوحش نگاہیں میری اور پیرو کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔

حویلی پر چھائی ہوئی خاموشی صرف چند لمحوں میں بدلیوں کی طرح چھٹ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سب کے سب ایک دوسرے سے مُدّتوں بعد ملے ہوں اور سب دُنیا سے دُور کسی جزیرے میں آ بسے ہوں، کسی گم شدہ جنّت میں۔ ؎

مجھے دیکھا ہے آج برسوں بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں

کچھ دیر تک کسی کو ہوش ہی نہیں رہا۔ پھر اباجان کو احساس ہوا۔ اُنھوں نے مارٹی کو اشارہ کیا کہ وہ ہم تھکے ہوؤں کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست کرے۔ تھکن تو یہاں آتے ہی دُور ہوگئی تھی۔ مارٹی بڑبڑاتا اُٹھ کھڑا ہوا۔ چائے آنے سے پہلے اباجان نے حکم دیا کہ پہلے سب اپنا حلیہ درست کرلیں، لباس تیار ہے اور غسل کے لیے گرم پانی بھی۔ اِن دنوں میں اباجان نے اندازے سے سب کے کپڑے تیار کرا لیے تھے، ایک کے بجائے دو دو جوڑے۔ نواب حشمت جنگ سے تعلق کے باعث اُنھیں اس اہتمام کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی کہ نواب کا سامنا ہونے پر مکینوں کا لباس بھی مکان کے شایاں ہو۔ کسی کا جی وہاں سے اُٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن سب مختلف کمروں میں چلے گئے۔ گول گنبدی نشست گاہ کے تینوں دروازے ایک گول راہ داری میں کھُلتے تھے، وہیں سے کمروں کے لیے مختلف راستے نکلتے تھے۔ ساری کی ساری حویلی بیش قیمت سامان سے مرصّع تھی، کہیں بھی کسی ویرانی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ آئینے، پردے، کھڑکیوں کے شیشے، منظروں کی تصاویر اور دیگر آرائشی چیزوں پر کہیں گرد کا نشان تک نہیں تھا۔ میں راہ داری میں آیا ہی تھا کہ منیر علی نے میرا بازو تھام لیا اور آنکھ کے اشارے سے مجھے اپنے ساتھ آنے کی ہدایت کی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے خانم کے متعلق کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ میرا دل گھبرانے لگا کہ کہیں وہ کوئی ایسی ویسی بات نہ بتائیں۔ راہ داری ہی سے اوپر کی منزل کو سیڑھیاں جاتی تھیں۔ "اپنی آپی سے نہیں ملو گے؟" وہ سرگوشیانہ مجھ سے بولے۔ "وہ تمھیں دیکھنے کے لیے بہت بے تاب ہے۔"

"آپی آئی ہیں؟" میں نے دھڑکتی آواز میں کہا۔

"اُنھیں بہرحال آنا تھا۔" وہ تمتماتے لہجے میں بولے۔

"اور کون کون ہے؟"

"آنے کو تو سبھی تیار تھے، میں نے روک دیا۔ جہاں گیر مچلا جا رہا تھا۔" منیر علی نے افسردگی سے کہا۔

"کیا!" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپی کو سب کچھ معلوم ہے؟"

"نہیں۔" وہ متانت سے بولے۔ "بھائی صاحب نے صرف مجھی کو کچھ بتایا ہے۔ میں نے خانم کو تسلّی دینے کی اپنی سی کوشش کی ہے لیکن وہ ماشا اللہ سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک ہے۔ طرح طرح کے سوال کر رہی تھی۔ تمھیں یہاں نہ دیکھ کے بہت پریشان تھی۔ نہ پوچھو سارے راستے ہم نے وقت کس طرح کاٹا ہے۔ کیسے کیسے وہم ستا رہے تھے۔ خانم میں پھر بھی بہت تحمّل ہے لیکن سفید ہوگئی ہے۔ پہلے تم اُس سے جا کے مل لو۔"

میرے قدم رُکنے لگے تھے مگر پھر میں نے جلدی جلدی سیڑھیاں طے کیں۔ بالائی منزل کے پہلے کمرے کے باہر جھروکے کے پاس ہی خانم کھڑی تھی، سرتاپا نیل گوں لباس میں۔ تنگ مہری کا پاجامہ اور کڑھا ہوا کرتا، دوپٹا بھی اُسی رنگ کا تھا۔ ہاتھوں میں طلائی

پچھڑیاں۔ اُس نے سیڑھیوں پر ہماری چاپیں سُن لی تھیں۔ اُس کا رُخ ہماری ہی طرف تھا۔ منیر علی نے غلط نہیں کہا تھا خانم پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ بڑی بڑی پھٹی پھٹی آنکھیں، چہرے کی ساری سُرخی پھیکی۔ مجھے دیکھ کے اُس کے سراپا میں لہریں سی اُٹھیں اور اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے وہ بے تابانہ میری طرف بڑھی میرے ہاتھ بھی بے اختیار پھیل گئے۔ میں اُسے تسلّی دینے آیا تھا لیکن مجھے اپنی ہی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ خانم نے مجھے بازوؤں میں چھپا لیا، اُن میں بہت نرمی اور ٹھنڈک تھی۔ میرا بند بند ٹوٹنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا کہ میں چکرا کے گر جاؤں گا، جیسے میرے جسم کی ساری قوت ڈھیر ہو گئی ہو اور خانم کا قد بہت بڑا ہے اور اُس کا سینہ کوئی سمندر ہے اور جیسے میں اُسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں اُس کے اتنے قریب رہ کے بھی اُس سے کتنا دُور رہا تھا۔ اُس نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور اُس کی بے قرار اُنگلیاں میرے بالوں، میری گردن اور کمر پر لرزاں ہوئیں میری آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہو گئے۔ مجھے نہیں معلوم، کتنا عرصہ گزر گیا۔ منیر علی نے میری کمر پہ تھپکی دی اور میرا شانہ پکڑ کے جھنجوڑا تو میں بوکھلا سا گیا۔ "بابر میاں! یہ کیا! ایں! میں نے تم سے اس لیے تو یہاں آنے کو نہیں کہا تھا۔" منیر علی کی بھرّائی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ اُنھوں نے مجھے اُس سے جُدا کر دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کے وہیں کمرے کے باہر پڑی ہوئی چوکی پر لے آئے۔ خانم بھی آ کے میرے برابر بیٹھ گئی۔ میری نظر اُس کے چہرے پر گئی، میری آنکھیں اور دھندلانے لگیں خانم کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ ہم دونوں دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ منیر علی بھی کچھ نہیں بولے، پھر آخر وہی کہنے لگے۔ "میرا خیال ہے، بابر میاں! اب نیچے چلو۔ خانم بیٹی تم بھی اپنا حال کچھ ٹھیک کرو۔ سب لوگ نیچے بیٹھے ہیں، تجمّل اور پیرو بھی ہیں، اُن لوگوں کے لیے تمھیں کچھ انتظام وغیرہ بھی کرنا ہے۔"

"تھوڑی دیر انھیں یہیں رہنے دیجیے۔" خانم نے بہ مشکل زبان کھولی اور ڈوبتی ہوئی آواز میں منیر علی سے کہا۔

"یہ اب یہیں ہیں اور اب تو سب یہیں ہیں۔" منیر علی گہری سانس بھر کے بولے۔ "میں انھیں یہاں عمداً نہیں چھوڑنا چاہتا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم دونوں اتنے لبالب ہو اور تم بیٹی! تم تو بہت حوصلے والی ہو۔ میں تو ابھی بابر میاں سے یہی کہہ رہا تھا، دھوپ چھاؤں ہی زندگی ہے۔ میں نے تم سے راستے میں کیا کہا تھا کہ اللہ نے چاہا تو سب خیریت ہو گی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" منیر علی نرم آواز میں بولے۔ "بابر میاں سے پوچھو اب ایسی کوئی اُلجھن درپیش نہیں ہے۔"

"ہاں آپی!" میں نے اٹکتے لہجے میں کہا۔ "اب سب ٹھیک ہی ہے۔"

"مگر، مگر۔" خانم دبی زبان میں بولی۔

میں نے اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا۔ "تو بہت کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہوں گی مگر اب سب کچھ ہو چکا ہے۔ اب اُسے دہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ آپ اطمینان رکھیے"

"اطمینان تو تمھیں دیکھ کے ہی ہو گیا مگر مجھے کچھ بتاؤ تو سہی کون سی بات ہے جو آپ لوگ مجھ سے چھپا رہے ہیں؟"

"سمجھو کہ ایک معاملے میں تمھاری ضرورت پڑ گئی تھی۔" منیر علی بیچ میں بولے۔ "لیکن اب سب درست ہو چکا ہے۔"

"کیا معاملہ تھا؟" خانم اضطراب سے بولی۔

"کچھ میری بات تھی آپی! میری وجہ سے آپ کی ضرورت پڑی"

خانم حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگی، اُس کے ہونٹ کچھ کہنے کو پھڑک کے رہ گئے۔ میں نے پھر جھرّاتی آواز میں کہا۔ "آپ کا آنا ضروری ہو گیا تھا۔ بہتر ہے، مجھ سے کچھ مت پوچھیے۔ تجمّل بھائی سب کچھ بتا دیں گے۔ سب کو احساس تھا کہ آپ کس قدر پریشان ہو جائیں گی لیکن لیکن...... اب کچھ بھی نہیں ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ آ گئیں اور یقین کیجیے، میں نے نہیں، تجمّل بھائی نے آپ کو بلوایا مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" وہ آزردگی سے بولی۔

"میں آپ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں، مجھ سے مشورہ کیا جاتا میں شاید منع کر دیتا میرے ذہن میں تو دُور دُور تک نہیں تھا کہ آپ کو تار دے دیا جائے گا مگر سمجھیے کہ تجمّل بھائی کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں رہا تھا۔ چارہ تو دوسرا بھی تھا لیکن نتائج کا یقین نہیں تھا ایسا ہی تھا۔"

"مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتلاتے۔" وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔ "یقین کرو، سوچ سوچ کے میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔"

"میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ کچھ مت سوچیے۔ آپ کی اذیت کا مجھے خوب اندازہ ہے لیکن میرے بس میں کچھ نہیں تھا بلکہ کسی کے بس میں بھی......"

"کوئی ایسی بات ہے تو تجمّل بھائی نے بالکل ٹھیک کیا۔ اذیت تو میرے لیے عین راحت ہے۔" اُس کی آواز رُندھنے لگی۔ "اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ میں تمھارے یا تجمّل بھائی کے کسی کام آؤں، میں سمجھوں گی کہ میری زندگی کا بھی کوئی مقصد ہے۔"

"یہ تو آپ دوسروں سے پوچھیے۔ آپ کی ذات ہی آپ کا مقصد ہے، مقصد صرف اپنے لیے تو نہیں ہوتا۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "جو بہتر سمجھا، وہی کیا مگر مجھے یہ سب کچھ اس طرح اچھا نہیں لگتا تھا۔"

"کیا اچھا نہیں لگتا تھا؟"

"یہی کہ...... یہی کہ آپ کو دوبارہ، دوبارہ کسی، میرا مطلب ہے اس شہر میں......" لفظ میرے حلق میں منتشر ہو گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اُس سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُسے اور ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔

"تم رُک کیوں گئے؟" وہ اضطراری انداز میں بولی۔ "میں نے زندگی میں بہت صدمے سہے ہیں لیکن شاید یہ صدمہ نہ سہا جا سکے کہ تم اپنی آپی کو کسی آزمائش کے لیے مشتبہ سمجھو۔ یہ سارا رتبہ تم نے اور تجمّل بھائی نے دیا ہے، میرے نگہبان موجود ہیں، پھر مجھے کاہے کی فکر ہو سکتی ہے، ہاں اگر، اگر تمھاری نظروں میں...... مجھ سے کوئی لغزش......"

اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"معلوم نہیں آپی! آپ کیا سمجھ رہی ہیں، ایسی باتیں مت کیجیے۔ رتبہ کون کسی کو ایسے ہی دیتا ہے، رتبہ تو رتبے کے لائق لوگوں ہی کو ملتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ آپ سے لغزش کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسی ویسی ہر بات دل سے نکال دیجیے۔" میرے لہجے میں تُندی آ گئی تھی۔ میں نے اُس سے کہا۔ "کسی مان پر ہی تو آپ کو اطلاع دی گئی تھی۔ وہ وقت اب ٹل گیا ہے، کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے۔ تھی بھی تو اب بالکل نہیں رہی ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ میری کوئی بات اُسے مطمئن نہیں کر سکے گی۔ ایک بار جی میں آئی کہ اُسے سب کچھ بتا دوں۔ اُس کی جگہ کوئی بھی ہوتا اسی طرح مضطرب ہوتا۔ اُسے بلانے کے لیے دو ارجنٹ تار دیے گئے تھے اور خط لکھا گیا تھا نیز کسی اور جگہ نہیں، حیدرآباد آنے کو لکھا گیا تھا جہاں اُس نے ایک عرصہ گزارا تھا۔ یہاں آنے کے بعد ہمارا یہ رویّہ اُس کے لیے بہت ناقابلِ فہم ہو گا، جانے کیسے کیسے شبہے اُس کے دل میں پنپ رہے ہوں گے مگر میں اُسے کیا بتاتا۔ میری زبان سے شاید کچھ بھی نہ نکلتا۔ میں نے اُس کی منت کی۔ "مجھ سے کچھ مت پوچھیے آپی! شاید میرے لیے آپ کو بتانا مناسب نہ ہو۔"

اُس کا چہرہ سُلگ رہا تھا، آنکھیں انگارے جیسی ہو رہی تھیں، ہونٹوں کے گوشے لرز لرز اُٹھتے تھے مگر اُس نے پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ منیر علی کرسی سے اُٹھ کے چوکی پر آ گئے اور کہنے لگے۔ "تم اتنی ہراساں کیوں ہو رہی ہو بیٹی! بابر میاں واقعی ٹھیک کہہ رہے ہیں، اب اُسے دہرانا بے نتیجہ ہے۔ میرا خیال ہے، ہم جلد ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ ممکن ہے آج ہی رات۔" خانم کچھ نہیں بولی۔ اُنھوں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کے آہستگی سے کہا۔ "میں تمھارے باپ کی جگہ ہوں اور بخدا تم مجھے زہرہ سے زیادہ عزیز ہو، کوئی تکدّر نہ کرو۔ میرا کہا تو مانو گی؟" خانم نے ڈبڈبائی نظروں سے بے تابانہ اُن کی طرف دیکھا۔ منیر علی نے اُسے سینے سے لگا لیا اور اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ خانم سسکنے لگی۔ اچھا ہوا کہ مُعاً زینے پر کسی کی آہٹ ہوئی۔ وہ ابّا جان تھے۔ خانم نے دوپٹے سے چہرہ چھپا لیا اور کمرے میں چلی گئی۔ ابّا جان ہمیں آوازیں دیتے ہوئے آئے تھے مگر ہم دونوں کے چہرے دیکھ کے ٹھٹک گئے۔ پہلے اُنھوں نے منیر علی کو غور سے دیکھا، پھر مجھے۔ زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"ہم نیچے آ ہی رہے تھے بھائی صاحب!" منیر علی نے زیرِ لبی سے کہا اور ابّا جان کا ہاتھ پکڑ کے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترنے لگے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ گول کمرے کا بڑا فانوس روشن کر دیا گیا تھا اور ساری فضا بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ وہاں کانتے اور جمرو دُھلے دُھلائے بیٹھے تھے۔ گریبان کڑھا سفید کُرتا، چھوٹی مہری کا سفید پاجامہ اور واسکٹ۔ دونوں کی واسکٹوں کے رنگ مختلف تھے۔ بال سلیقے سے کڑھے ہوئے۔ میں بھی ایک ثانیے کو چونک پڑا تھا۔ دونوں شہزادے لگ رہے تھے۔ کمرے کا ماحول بھی ایسا ہی تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کانتے اور جمرو ہیں۔ مجھے دیکھ کے دونوں مسکرانے لگے۔ کانتے نے اِتراتے ہوئے اپنی واسکٹ کی گرد اُنگلی سے صاف کی، مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ اتنی دیر میں شامو اور زہرا بھی آ گئے پھر پیرو اور تجمّل۔ سب کے سب تر و تازہ، شگفتہ شگفتہ نظر آ رہے تھے۔ سب آ چکے تو ایک معمر ملازم نے چپکے سے ابّا جان کے کان میں آ کے کچھ کہا، ابّا جان اُٹھ گئے اور اُنھوں نے سب کو اُٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ ہم اُنھی کی پیروی میں گول کمرے سے نکل کے راہ داری کا چند قدمی فاصلہ طے کرتے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں آ گئے۔ یہاں ایک لمبی چوڑی میز لگی تھی۔ میز پر قسم قسم کی چیزیں چنی ہوئی تھیں چائے، دوسرے مشروبات، پھل میوے، مٹھائیاں اور کئی طرح کی نمکین چیزیں۔ کھانے کا اہتمام بھی اس سے بڑھ کے کیا ہو گا۔ میں نے نہ غسل کیا تھا، نہ لباس بدلا تھا۔ نیچے آ کے منیر علی نے مجھے روک لیا تھا کہ چائے تیار ہے۔ اب ناشتے وغیرہ سے نمٹ کے ہی لباس تبدیل کرنا۔ رات کے کھانے میں بھی اب کتنا وقت رہ گیا تھا لیکن تجمّل کے سوا سب نے خوب سیر ہو کے کھایا، اُس نے صرف ایک پیالی چائے اور تھوڑی سی آلو کی چاٹ کے سوا کچھ نہیں لیا۔ تجمّل ویسے بھی اُن سب سے الگ دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ شاید اور کسی نے خیال نہ کیا ہو لیکن مجھے تجمّل کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں بھاری بھاری تھیں، چہرہ سُوجا ہوا تھا اور ماتھے پر شکنوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اتنے دنوں تک وہ تقریباً جاگتا ہی رہا تھا۔ ممکن ہے، یہ حال تھکن کی وجہ سے ہو۔ اُسے گہری نیند کی ضرورت تھی۔ ہجوم سے آنے کے بعد شروع شروع میں تو یہاں کی خاموشی

بہت عجیب معلوم ہوئی لیکن جلد ہی یہاں کے در و دیوار سے سب مانوس ہو گئے۔ مارٹی سب کا میزبان بنا ہوا تھا اور بس یہ کسر رہ گئی تھی کہ وہ پلیٹیں ہمارے منہ میں ٹھونس دے۔ اِدھر سے اُدھر دوڑا دوڑا پھر رہا تھا، ہر ایک کے منہ میں مٹھائی کا پورا دانہ رکھ دیتا پھر خود ہی بُری طرح کھِل کھِلانے لگتا۔ میرا خیال تھا کہ چائے کے دوران وہ بمبئی روانگی کے بارے میں کوئی فیصلہ ضرور کرلیں گے، آج رات یا کل صبح کی گاڑی سے لیکن کسی نے سفر کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ابھی وقت تھا۔ دیواری گھڑی میں ساڑھے سات بجنے والے تھے، گاڑی نو بجے سے پہلے نہیں جاتی تھی۔ اسٹیشن تک پہنچنے کے لیے بڑا وقت پڑا تھا لیکن جانے والوں کے انداز ہی اور ہوتے ہیں، کوئی اور وقت ہوتا تو ایک رات آرام کر کے چلنے کا مشورہ مناسب رہتا حالانکہ صحیح آرام تو منزل ہی پر پہنچ کر ملتا ہے۔ ہم حویلی میں آ گئے تھے لیکن حویلی تھی تو اسی شہر حیدرآباد میں۔ چائے پینے کے بعد سب پھر نشست گاہ میں آ کے بیٹھ گئے۔ ایک ملازم نے تجمل کے آگے پرانی طرز کا بڑا سا حقہ رکھ دیا۔ سیاہ قلم کی فرشی، نیچے پہ زری جیسا کام، تانبے کی جالی کٹی ہوئی چلم، سرپوش کے ساتھ تمباکو کی بھینی بھینی خوشبو کمرے بھر میں پھیل گئی تھی۔ یہ حقہ ابا جان ہی تجمل کے لیے لائے ہوں گے کیونکہ بالکل نیا معلوم ہوتا تھا مگر تجمل نے چند ہی کش لیے ہوں گے کہ تخت سے اُٹھ گیا اور ابا جان کو ساتھ لے کے کمرے سے نکل گیا۔ یقیناً وہ کچھ طے ہی کرنے گئے ہوں گے مگر یہ بات یہاں سب کے سامنے کرنے میں کیا مضائقہ تھا؟

میری دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ کہیں کسی موزوں موقع، شبھ گھڑی کے لیے تجمل کے ذہن میں یہاں کچھ اور وقت گزارنے کا خیال تو نہیں ہے جو راستے مخدوش ہونے کا کوئی اندیشہ؟ مگر وقت گزرنے پر تو راستے اور مخدوش ہو سکتے ہیں۔ تجمل کو واپسی میں دیر ہو گئی۔

میں مارٹی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ شامو بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ کانتے اور زورا پہلے ہی کسی طرف نکل گئے تھے۔ مارٹی حویلی دکھانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ میرا جی نہیں چاہ رہا تھا مگر میں اس کی خاطر انکار نہ کر سکا، ویسے بھی مجھے یہاں کون سا کام تھا۔ میں نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اُن میں سے کسی کو اس شہر سے جانے کی جلدی نہیں ہے۔ شاید میرے ہی حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ اُن سب کی دانست میں اب کچھ کرنا باقی نہیں رہا تھا اور دیر سویرے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

حویلی کا کوئی ایک حصہ نہیں تھا۔ مردان خانہ، زنان خانہ، مہمانوں کے لیے خاص حصہ اور مختلف نوعیت کے کمرے۔ نچلی منزل پر تقریباً اور خصوصی محفلوں کے لیے ہال جیسا ایک بڑا کمرہ۔ اوپری منزل جانے کے بھی کئی راستے تھے۔ نیچے کی طرح اُوپر بھی مختلف اقامتی ... ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی اور ایک دوسرے سے الگ بھی ... کے علاوہ تہہ خانہ، زمین دوز ٹھنڈے اور گرم کمرے۔ ہر جگہ قیمتی ... بھی موجود تھا۔ میزیں، کرسیاں، پلنگ، آئینے اور تصویریں۔ دیوار ... الماریوں کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ کئی کمروں میں ہوٹلوں کی طرح ... وغیرہ ملحق بھی تھے۔ دیواریں اور چھت منقش اور کھڑکیاں ... رنگ کے پردے آراستہ۔ اندر ساری کی ساری عمارت بھول ... جیسی تھی، جدھر سے نکلو، گھوم کے اُدھر ہی آ جاؤ۔ عمارت کے ... میں نوکروں کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ زنان خانے کا باغ ... تھا، عام باغ الگ۔ گھر کی ضرورت کے لیے ترکاریاں اُگانے کو ... ایک مختصر قطعہ بھی مخصوص کیا گیا تھا۔ ٹینس کھیلنے کے لیے کورٹ ... تھا اور باغ میں ایک تالاب بھی۔ تالاب میں مارٹی کے کہنے کے ... مطابق رنگ برنگی مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں۔ حویلی کے مکین نے ... سے غلط نہیں کہا ہوگا کہ کسی انگریز افسر کی عمارت پر نظر تھی۔ ا... نے اس کے عوض بڑی رقم ادا کی تھی مگر دیکھنے کے بعد اندازہ ... کہ حویلی کی عمارت ادا کی جانے والی رقم سے گراں بہا ہے۔ ہو... نواب حشمت جنگ نے حویلی کے مکین سے اپنے مخصوص مرا... میرا ابا جان کے لیے کوئی رعایت کرائی ہو اور اُس رعایت کا بار ... خود برداشت کیا ہو۔ حویلی کی سج دھج برقرار رکھنے کے لیے ملازموں ... بڑی تعداد لازم تھی۔ مارٹی مجھے ایک ایک چپا اس طرح دکھا رہا ... جیسے یہ سب کچھ اُسی نے تعمیر کیا ہو اور ہمارا مستقل یہیں رہنے کا ... ہو۔ اُسی کا اشتیاق مجھے روک لیتا تھا، میں باقی پھر پر اُٹھا رکھے ... واپس اندر چلنے کے لیے کہتے کہتے رہ جاتا تھا۔ پچھلے حصے میں ا... ہمیں ننگو مل گیا۔ وہ ہمیں کو ڈھونڈتا ہوا اِدھر آ نکلا تھا۔ میرے ... پر اُس نے بتایا کہ ابا جان اور منیر علی سے الگ کمرے میں کچھ دیر ... کر کے تجمل اُوپر خانم کے پاس چلا گیا ہے اور ابھی تک وہیں ... باغ میں تھوڑی دُور جا کے ہم اندر واپس آئے۔ کانتے ... موجود نہیں تھے۔ میں سمجھا کہ وہ کسی کمرے میں آرام کے لیے چلے ... ہوں گے لیکن اپنے اطمینان کے لیے میں نے جمرو سے اُن کے با... میں معلوم کیا۔ جمرو نے میرے سر میں اور ریت بھر دی۔ اُس ... کہ وہ دونوں تجمل کی ہدایت پر کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔

"حویلی سے باہر؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں لاڈلے بھائی!" اُس نے سکون سے جواب دیا۔

"کہاں؟"

جمرو ہونٹ لٹکا کے رہ گیا۔ اِس وقت حویلی سے باہر وہ کہاں ... گئے ہیں؟ واپس اڈے پر؟ یا سواری لینے؟ مگر سواری کے انتظام ... لیے نوکروں کی کیا کمی ہے۔ میری رگوں میں برف سی جمنے لگی۔ تجمل ... نشست گاہ میں واپس آ چکا تھا اور حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ پیرو بھی وہیں ... میں نے سوچا، پیرو سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کروں لیکن ایک ... تجمل کے بہت قریب بیٹھا اُس سے باتوں میں منہمک تھا، دوسرے ... خود اچھا نہیں لگا۔ مبادا میری وحشت اُسے گراں گزرے یا وہ مذاق ... نے لگے۔ میں وہیں خاموش بیٹھا کانتے اور زورا کا انتظار کرتا رہا ... وہ نہیں آئے۔ گھڑی میں نو بجنے والے تھے۔ گھڑی دیکھ کے مجھے ... قدر سکون ہوا۔ روانگی کا امکان اب خارج از بحث تھا۔ بہتر یہی ... کہ میں کسی کمرے میں جا کے آنکھیں بند کر لیتا لیکن میں خود پر بوجھ ... وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے اپنے آپ سے چڑ ہونے لگی تھی، خود کو بہت ... تھا کہ ایک مجھی کو ایسی تلابیلی کیا پڑی ہے، سب ایک ہی کشتی میں ... ہیں مگر دو کے رہی لمحے میری آنکھیں بھٹکنے لگتی تھیں۔ پھر میں ... وہاں سے اُٹھنے کا ارادہ کر لیا۔ اُٹھ کے میں ابھی دروازے سے ... ہی رہا تھا کہ تجمل کی گونجتی آواز نے میرے قدم روک لیے۔ "تو نے ... نہیں بدلے رے۔"

"نہیں!" میں نے مُڑ کے ترشی سے کہا۔

"کھینچ لے۔"

"اب سویرے ہی بدل لوں گا۔"

"کہیں چلنا پڑے رے۔"

"کہاں؟" میں نے تذبذب سے پوچھا۔

"چلنا ہے لاڈلے۔" تجمل نے تنک کے کہا۔ میں نے اُس سے ... بارہ پوچھنا چاہا لیکن میرے زبان کھولنے سے پہلے ہی اُس نے آنکھ ... اشارے سے مجھے تحمل کی تلقین کر دی۔ میں اُسے دیکھتا رہ گیا اور ... لمحے وہیں دروازے پر منجمد کھڑا رہا۔ یہ کیا ضروری ہے کہ گاڑی ... ت گزر جانے کے باوجود ہم یہاں سے نہ نکل سکیں۔ ہم کسی بھی سواری ... اِس رات شہر سے دُور ہو سکتے ہیں، کم سے کم سکندرآباد تک تو ... سکتے ہیں، وہاں ایک بڑا ریلوے جنکشن ہے۔ ممکن ہے کانتے اور ... حفظ ماتقدم کے لیے حویلی کے آس پاس علاقے کا جائزہ لینے نکلے ہوں ... بلوے اسٹیشنوں پر کوئی کان لگائے تو نہیں کھڑا ہے۔ وہ سیر و تفریح کو ... میں گئے ہوں گے۔ اڈے پر واپس جانے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا، لباس ... ل کرنے کے لیے تجمل کی ہدایت بے سبب تو نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی ہو ... سکتا ہے کہ اِس دوران نواب حشمت جنگ آ جائے یا ابا جان ہمیں لے ... اُن کے پاس جانا چاہتے ہوں۔ میں باہر نکل آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابا جان کے سلوائے ہوئے کپڑے کون سے کمرے میں رکھے ہیں۔ وہیں سے سب نے اپنے ناپ کے کپڑے منتخب کیے تھے۔ ابھی وہاں کئی جوڑے رکھے تھے۔ میں نے شانے سے اپنے لیے ایک کرتا ناپ کے دیکھا، اسی اثنا میں مارٹی ہانپتا ہوا آ گیا اور ایک چھوٹا سوٹ کیس میرے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "راجا اُستاد! اپن سالا ابھی ایک دم بھول گیا، خانم بہن اپن کو بولا تھا! اید تمھارے لیے زری بہن کا ایک چیز اُس کے پاس پڑا ہے۔"

"یہ یہ کیا ہے؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"ابھی کھول کے دیکھنا ہے راجا!" مارٹی جھل ملاتی آواز میں بولا۔ میں دم بخود سا کھڑا تھا، مارٹی نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی چابی لہرائی۔ "ابھی بولے تو کھول کے دیکھے؟"

"زریں نے بھیجا ہے؟" میری آواز لرز رہی تھی۔

"ہاں ہاں راجا! اپنی زری سسٹر نے۔ ہاؤ ونڈرفل شی اِز! اپن بولتا ہے قسم سے ٹاپ ٹو باٹم ایک دم گاڈیس ہے۔" اُس نے چابی قفل میں گھما دی تھی مگر رُک گیا۔

"کھولتے کیوں نہیں؟" میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نئیں راجا اُستاد! اپن ایک دم اُلو کا پٹھا ہے، ابھی تمھی اِس کو کھولو۔" وہ کسمساتے ہوئے بولا۔ "اور جلدی سے ریڈی ہو کے آ جاؤ۔"

وہ کمرے سے جانے لگا۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ "تمھیں کیا ہو گیا ہے؟" میں نے ناراضی سے کہا، مارٹی کا جسم چور سا بن گیا تھا، معذرت خواہانہ سا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ اُس کی جھجک کا کیا سبب ہے۔ مجھے اس پر غصہ بھی آیا اور پیار بھی۔ اچانک اُسے خیال آ گیا تھا کہ میرے لیے بھیجی گئی چیز مجھی کو کھولنی چاہیے۔ میں نے حکمی لہجے میں پھر اُس سے کہا کہ سوٹ کیس وہی کھولے۔ مارٹی نے بہ جبر تعمیل کی اور اچھلنے لگا۔ "دیکھا، دیکھا راجا! ابھی کیا کیا زری سسٹر نے بھیجا ہے۔" سوٹ کیس میں ضرورت کا سارا سامان موجود تھا۔ دو جوڑی کپڑے، سیاہ شیروانی، واسکٹ، بنیان، جرابیں اور سلیم شاہی جوتے، آئینہ، کنگھی، تولیا، منجن کا ڈبا، رومال اور عطر کی شیشی۔ سب چیزیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ میری نظروں میں زریں کی تصویر گھومنے لگی۔ چلتے وقت اُس نے مجھ سے کہا تھا، ابھی سارے کپڑے تو تیار نہیں ہوئے ہیں۔ منیر علی بتا رہے تھے کہ ہمارا تار ملنے کے وقت وہ گھر پر نہیں تھے، اُنھیں زمینوں پر اطلاع دی گئی۔ اِس دوران دوسرا تار پہنچ گیا مگر کوئی دوسرا شخص بھی تو تجمل کے نام سے تار دے سکتا تھا، اسی تذبذب میں دو دن لگ گئے اور جب تک خط نہیں ملا، اُنھوں نے سفر کا ارادہ نہیں کیا۔ خانم کے آنے میں اسی وجہ سے دیر ہو گئی تھی، دیر شاید اسی لیے ہونی بھی تھی کہ ہمیں حیدرآباد میں اُس کے آنے سے پہلے نواب عالم تاب کی حویلی سے نکل کے آنا تھا، درمیان کے

ان دو دنوں میں زرّیں کو یہ چیزیں اکٹھی کرنے کا موقع مل گیا ہوگا۔ نارتی ایک ایک چیز احتیاط سے نکال کے مجھے دکھا رہا تھا، نیساں کے ہاتھ کا کڑھا ہوا رومال بھی تھا۔ جب میں چلا تھا، نیساں نے یہ ادھورا رومال مجھے دکھایا تھا اور مجھ سے پوچھا تھا کہ پھول اُس نے کیسا بنایا ہے۔ یہ سارا کام زرّیں ہی نے اُسے سکھایا تھا۔ اُسی نے نیساں کو مشورہ دیا ہوگا کہ سفید رومال کے کونے پر سفید تارکشی سے پھول بنایا جائے تو رومال زیادہ نفیس اور دیدہ زیب ہو جائے گا۔ یہ نفاست اُسی کو آتی تھی کچھ دیر کے لیے میں خود کو بھول گیا، زرّیں جیسے میرے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی، سفید لباس میں ملبوس کسی مجرم کی طرح، میری پتھرائی آنکھیں اُسی کو دیکھ رہی تھیں۔ مارتی نے مجھے چونکایا اور ہنسنے لگا "ابھی کدھر چلا گیا راجا؟"

مجھے اُس کے سامنے خفت سی ہوئی۔ میں نے جلدی سے ایک جوڑا نکال کے الگ رکھا۔ مارتی نے شیروانی بھی نکال لی تھی، اُس کی خواہش تھی کہ میں آج یہی لباس پہنوں۔ حیدرآباد میں شیروانی کا عام رواج تھا مگر میں نے شیروانی سوٹ کیس میں واپس رکھ دی اور واسکٹ نکال کے سیدھا غسل خانے میں آگیا۔ مجھ سے ٹھیک طرح غسل بھی نہیں کیا گیا۔ گرم پانی موجود تھا مگر وہ اتنا گرم تھا کہ ٹھنڈا پانی ملا کے معتدل کرنے میں دیر لگتی۔ میں نے ٹھنڈے ہی پانی پر اکتفا کیا۔ پاجامے میں کمربند پڑا ہوا تھا، کمربند نیفے میں اندر سرک جانے کے خیال سے گرہ بھی لگا دی گئی تھی۔ باہر مارتی میرا منتظر تھا۔ میں اندر سے تیار ہو کے نکلا تو مارتی ایسی سیٹی بجانے لگا جیسی نوٹنکی میں کوئی بازی گر آنے پر تماشائی بجاتے ہیں۔ وہ جسم نچا نچا کے مجھے مختلف زاویوں سے دیکھتا رہا پھر اُس نے میرے پیروں کے آگے سلیم شاہی جوتی رکھ دی۔ جوتی میرے پیر میں بالکل فٹ آئی۔ زرّیں کو میرے کپڑوں اور جوتوں کی پیمائش کا کیسا اندازہ تھا۔ میں نے سوچا، کتنی بار باہر گیا ہوں، مہینوں مہینوں کے لیے لیکن مجھے کبھی خیال تک نہیں آیا کہ اُس کے لیے کوئی چیز لیتا چلوں۔ اُس نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا مگر شاید شکوہ کرنا اُسے آتا ہی نہیں تھا۔

کمرے میں نصب قدِ آدم آئینے میں خود کو دیکھ کے مجھے جھینپ سی محسوس ہوئی۔ بالوں کی ترتیب بھی آدمی کو کتنا بدل دیتی ہے۔ مجھے اچھے نہیں لگ رہے تھے لیکن مارتی نے کاڑھے تھے اس لیے میں نے انھیں جوں کا توں رہنے دیا۔ ہم کمرے سے نکلنے ہی والے تھے کہ ٹنگو دوڑتا ہوا آیا۔ "لاڈلے بھائی! اُستاد تم کو بلاتے ہیں۔"

"مجھے؟" میں نے بے چینی سے کہا۔ "کیا کالے تتے اور زورا واپس آگئے ہیں؟"

"ہاں ہاں۔" وہ پھولی ہوئی سانسوں سے بولا۔

میں کسی تاخیر کے بغیر دروازے کی طرف جھپٹا۔ تیز تیز قدموں سے میں نے راہ داری عبور کی۔ وہ سب مجھے نشست گاہ سے باہر ہی کھڑے نظر آگئے۔ تجمّل کے کندھے پر شال پڑی تھی، پیرو کے کندھے پر بھی۔ تجمّل شیروانی میں تھے۔ انھیں جیسے میرا ہی انتظار تھا۔ میرے پہنچتے ہی وہ آگے بڑھے اور چبوترے پر چلے آئے۔ باہر موٹر گاڑی کے سائبان میں دو تم ٹم بھی موجود تھیں۔ اُن سب کے چہرے بوجھل تھے، سب گم سم سے تھے جیسے موت ہو گئی ہو۔ میں اُن کے قریب جا کے ٹھٹک سا گیا تو تجمّل نے مجھے پاس آنے کا اشارہ کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ جتنی دیر میں ہم ٹم ٹم کے قریب پہنچے، چبوترے کے دوسری جانب سے مجھے منیر علی اور خانم آتے دکھائی دیے۔ خانم بُرقع پہنے ہوئے تھی۔ چبوترے پر روشنی اتنی تیز نہیں تھی مگر کالے نقاب کے بیچ میں خانم کا چہرہ چاند کے مانند دمک رہا تھا۔ بُرقع میں اُس کا قد کچھ اور بڑا ہو گیا تھا۔ پہلے ایک لمحے کو مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ کہیں اور نہ جا رہے ہوں مثلاً نواب حشمت جنگ کے ہاں لیکن خانم کو آتے دیکھ کے اس شبہے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ نواب حشمت جنگ کے ہاں خانم کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھ سکتے تھے۔ آخر انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ میرے سینے میں بھرا ہوا اندھیرا چھٹ گیا۔ ٹم ٹم پر چڑھتے وقت کسی نے مجھے ٹوکا دیا کہ انھوں نے کوئی سامان ساتھ نہیں لیا ہے لیکن اس کا جواب دوسرے ہی پل مل گیا۔ ملاتی، شامو، جمرو اور ٹنگو ہمارے ساتھ ٹم ٹم میں نہیں بیٹھے تھے۔ وہ ہمارے پیچھے پیچھے چبوترے تک آئے تھے لیکن ابا جان نے انھیں وہیں روک دیا تھا۔ تجمّل نے یہی طے کیا ہوگا کہ وہ سامان لے کے بعد میں آئیں مگر مارتی اتنی دیر سے میرے ساتھ تھا، ایسی کوئی بات تھی تو وہ مجھے ضرور بتاتا۔ ممکن ہے ملاتی کے موجود نہ ہونے پر جمرو کو سمجھا دیا گیا ہو۔ پہلی والی ٹم ٹم میں خانم، ابا جان، منیر علی اور تجمّل بیٹھ گئے۔ دوسری میں پیرو، زورا، کالے تتے اور میں۔ جلد ہی دونوں ٹم ٹمیں عمارت سے نکل کے بڑی سڑک پر آگئیں۔ میں نے پیرو اور کالے تتے سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ تینوں اپنے آپ میں گم بیٹھے تھے۔ میں بھی چپ رہا۔ اب تھکن اُن پر اچھی طرح غالب آ رہی ہوگی۔

سڑک کے دو رویہ کھمبوں پر روشنی کی قطاریں حدِ نظر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ دونوں ٹم ٹموں کی ٹاپیں دور دور تک سنائی دے رہی ہوں گی۔ ہوا نرم اور خنک تھی، کبھی کبھی کوئی تیز جھونکا جسم میں کھب سا جاتا تھا۔ ٹم ٹم میانہ رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کسی کے تعاقب کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔ کالے تتے اور زورا نے یہ یقین کر لینے کے بعد ہی تجمّل نے باہر نکلنے کا ارادہ کیا ہوگا تاہم

میری نظریں سڑک پر بکھری ہوئی تھیں۔ دونوں اطراف حویلیوں کے برجوں، شہ نشینوں اور جھروکوں میں روشنیاں جھل ملا رہی تھیں۔ ہر سُو سکون چھایا ہوا تھا۔ ٹم ٹم خاصی دور آنے کے بعد بھی شہر کے گنجان علاقے میں داخل نہیں ہوئی تو مجھے بے کلی ہونے لگی۔ میں نے کچھ دیر اور انتظار کیا پھر سَر نکال کے باہر جھانکا۔ دور تک آبادی علاقہ ہی نظر آ رہا تھا اور اُن تینوں کو سمت کی کوئی فکر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے پیرو سے جھجک کے پوچھا۔ "دادا! یہ یہ کہاں جا رہا ہے؟"

پیرو نے سَر اُٹھا کے میری طرف دیکھا اور کسی قدر حیرت آمیز لہجے میں بولا۔ "تجھ کو نہیں پتہ جانی؟"

"ہم، ہم بمبئی جا رہے ہیں نا؟" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔

اُس نے اپنے پنجے سے میری گردن دبوچ لی اور میرے سَر کو جھٹکے دیتے ہوئے بولا۔ "ابھی کیدر رے!"

"پھر، پھر تم کہاں جا رہے ہو؟"

"بڑے نواب کے ہاں۔" وہ آہستگی سے بولا۔

مجھے یک لخت جھٹکا سا لگا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھا کیا۔

"ہاں جانی! اپن اُودر ہی جا رہا ہے۔" پیرو بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔ میرا جسم سُن ہو گیا تھا، مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔ "ابھی تجمّل بھائی یہی مانگتا ہے کہ اپن لوگ کو اُودر چلنا چاہیے، بولتا ہے کہ اُودر خانم کا ضرورت ہے۔"

"مگر، مگر دادا!..." میں نے بہ مشکل کہا۔ میری آواز بھرّانے لگی تھی۔

وہ میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ "کبھی ایسا بھی چلتا ہے راجا!"

میرے جی میں آئی کہ ٹم ٹم سے کود پڑوں۔ پیرو کی آواز میرے کانوں میں چیخ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تجمّل بھائی بولتا ہے، اُودر چھوٹا نواب ایک دم رُوٹھ گیا ہے۔"

"تم نے اُن سے یہ نہیں کہا، تم نے یہ نہیں کہا کہ خانم کوئی؟..."

"وہ اپن سے زیادہ جانتا ہے۔"

"روکو دادا! گاڑی روک دو۔" میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "خانم کو ایسے وہاں نہیں جانا چاہیے۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا، تم سب کچھ بھول گئے، ابھی تک تمھارے جسم پر نشانات ہوں گے، کل ہی رات کی تو بات ہے۔ کتنی کسر رہ گئی تھی، تم نے نہیں بتایا دادا کہ ہم سے؟..."

"پر وہ بولتا ہے کہ چھوٹا نواب کا حال ٹھیک نئیں ہے۔"

"لیکن خانم کوئی کھلونا نہیں ہے۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔ "وہ بازار میں نہیں بیٹھی ہے۔"

"پر کیا وہ کسی گھر سے نہیں جا سکتی؟"

"تم، تم کیا کہہ رہے ہو دادا؟"

"اپن ٹھیک ہی بول رہا ہے۔"

"دادا! مجھے تجمّل بھائی سے بات کرنے دو۔" میں نے فریاد کی۔ "گاڑی رُکوا دو۔"

"کالے تتے اور زورا بڑے نواب کو بول کے آیا ہے کہ ہم لوگ ابھی خانم کے ساتھ اُودر آتا ہے۔"

"نہیں نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے دادا! ضروری نہیں کہ تجمّل بھائی کا ہر فیصلہ درست ہو۔ مجھے اُن سے بات کرنے دو، ایسا کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے ہر پہلو پر سوچ سمجھ لینا چاہیے۔ وہ نواب لوگ ہیں، تم نے انھیں خوب دیکھ لیا ہے، اُن کے دل پتھر کے ہیں، اپنی غرض کے سوا انھیں کچھ نظر نہیں آتا، وہ دو آدمیوں کو جانوروں کی طرح قید رکھ سکتے ہیں، انسانوں کو اصطبل میں گھوڑوں کے ساتھ باندھ دیتے ہیں، ایسا ہی ہے تو اُن سے کوئی باقاعدہ بات کیے بغیر ---- اور یہ سب کچھ تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے، فی الحال ہمیں یہاں سے نکلنے پر توجہ دینی چاہیے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "اور خانم، دادا! وہ اب تمھاری بیٹی ہے اور وہ میرے لیے بھی تم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔"

"پر وہ اُستاد کا بھی تو کچھ بنتا ہے۔" پیرو نے جواب میں تلخی سے کہا۔ "اُس نے خانم سے بات کر لیا ہے۔"

"خانم اُن کے سامنے کیا بول سکتی ہے، یہ تو ہمارے سوچنے کا کام ہے۔ چھوٹے نواب کا حال ٹھیک نہیں ہے تو کیا خانم کو اُس پر قربان کر دینا چاہیے؟ خانم دل سے اس پر تیار نہیں ہوگی۔ مجھے یقین ہے، وہ کبھی وہاں جانا نہیں چاہے گی۔ میں جانتا ہوں، اُسے اپنی موجودہ زندگی عقیدت کی حد تک عزیز ہے۔"

"اپن کو پتہ ہے پر جانی ...." وہ کسمسا کے رہ گیا۔
"پر کیا، کیا؟" میں نے وحشت سے کہا۔ "تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟
اُس وقت کی بات دوسری تھی جب ہم نواب کے قبضے میں تھے اور وہ
بھی تھے جس نے خانم کا پتہ بتانے سے انکار کر دیا تھا اور بدلے میں
سلاخوں سے بدتر قید قبول کر لی تھی۔ جھل بھائی کو کوئی اور راستہ نہ دیکھ
کے اُسے بُلانا پڑ گیا، ٹھیک ہے مگر اب تو ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔
اب کیا بات ہے؟ یہاں رہنے سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ پہلے ہی کیا کم ہوا ہے۔
سوچو دادا! میری بات ذرا دھیان سے سن لو۔ ہم کون ہیں، نواب کون ہے،
خانم کون ہے۔ آدمی کے حوالے مُشکل سے ملتے ہیں۔ نواب خوب جانتا ہے،
ہمارا تعلق اڈّے سے ہے۔ وہ ہمیں کبھی اس طرح کی حیثیت ...." میری آواز
ہانپ رہی تھی۔ "نہ خانم کو .... اگر تمھارے اور جھل بھائی کے اندازے غلط
ہو گئے، غلط تو ہو سکتے ہیں نا، تو پھر؟ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے،
اِس کام کے لیے یہ وقت کسی طور موزوں نہیں۔" پیرو کی بے حسی دیکھ کے
میرے جسم میں کھولن سی ہونے لگی۔ گاڑی اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔
کانتے اور زورا بھی مجھے جھل کا واسطہ دے کے خاموش رہنے کی تلقین
کرنے لگے۔ وہ نہ میری بات سُننے کی کوشش کر رہے تھے، نہ سمجھنے کی۔
مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں پیرو سے بازو چھڑا کے نیچے اُترنے کے لیے لپکا۔
ٹم ٹم کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی کہ میں اُتر نہ سکتا۔ آگے کچھ ہی فاصلے پر
دوسری ٹم ٹم چل رہی تھی۔ میں تیز رفتاری سے درمیانی فاصلہ عبور کر کے
اُسے آسانی سے پکڑ سکتا تھا۔ مجھے بہر حال جھل سے بات کرنی چاہیے تھی۔
میں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ اگر اُس کی یہی منشا ہے تو نواب کے پاس
جانے کا یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ گو ٹم ٹم میں ابا جان اور منیر علی بھی
بیٹھے تھے، خانم بھی تھیں۔ مجھ پر ہیجان سا طاری تھا۔ اس کے سوا
کوئی یارا ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے نواب کی حویلی آ جانے سے پہلے اُسے
روک لینا چاہیے۔ اگر ابا جان اور منیر علی کے سامنے کچھ کہنا مناسب نہیں
تھا تو میں جھل سے چند لمحے نیچے اُترنے کی درخواست کر سکتا تھا۔
یقیناً اُس نے فیصلہ کرنے میں عجلت کی ہے۔ مجھے اُس سے اتنا ہی کہنا
تھا۔ اس کے بعد اُس کی جو مرضی لیکن میں نے پائدان پر قدم ہی رکھا
تھا کہ کانتے نے جھپٹ کے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ ٹم ٹم زیر و زبر
ہو گئی تھی۔ پیرو نے میرا بازو کھینچ کے مجھے پھر نشست پر دھکا دے
دیا۔ "دادا! میری بات سنو۔" میں نے ٹوٹی ہوئی سانسوں سے کہا۔ "جو
ختم ہو گیا ہے، اُسے دوبارہ کریدنا اور چھیڑنا کون سی ہوش مندی ہے،
پھر کوئی اُلجھاؤ ہو سکتا ہے اور یہاں کوئی ایک آدمی نہیں ہے۔ سبھی کسی نہ کسی
طرح ملوث ہو جاتے ہیں، وہ دوسرے لوگ ہیں دادا! تم تو انھیں بہت
قریب سے دیکھ چکے ہو۔ جھل بھائی جانے کیا سمجھ رہے ہیں۔ نواب عالم تاب
کا یہ وقت تو کسی نہ کسی طرح گزر جائے گا مگر اُس کے لیے ...."
"استاد اس کو دیکھ کے آیا ہے جانی! اور تُو بھول رہا ہے اور
نواب کا بیگم اور بہن آ کے کیا بولتا تھا۔"
"مجھے یاد ہے لیکن وہ جلد ہی یا دیر میں ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی
تک بھی وہ زندہ ہی ہے۔"
"اُس کو ایسے ٹھیک ہونا ہوتا تو کبھی کا ہو جاتا دادا!" پیرو
زہر خند سے بولا۔ اُس کی آنکھوں میں گہری چمک آ گئی تھی۔ "خون میں
اپن اُدھر کوئی جاگیر لینے نہیں جا رہا ہے سالا۔ بعد کو ہم بھی ادھر ہی
کبھی آدمی ایسے ٹھیک نہیں ہوتا، اور تو بھی ایسا بولتا ہے۔ ابھی
تنبیہ دیکھ کے نہیں آیا ہے۔ وقت کی کیا بات کرتا ہے، سالا کبھی
ہے تو اتنا ہی اُبھر کے آ جاتا ہے۔ ابھی بیچ جھانک کے اپنے سے
وقت تو تُو نے بھی کم نہیں لیا ہے۔" اُس کی نگاہیں مجھے اپنے جسم
چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں گُنگ بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا۔ پیرو نے
پھر سر جھکا لیا اور تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "اپنی زبان بھی نہیں سمجھتا کیا؟"
پیرو کا ایک ایک لفظ میرے سینے میں کسی خنجر ہی کی طرح
اُتر رہا تھا۔ "بول رے۔" وہ مجھے جھنجھوڑ کے بولا۔ "چپ کیوں ہو گیا؟"
میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب کا مجھے یارا ہی نہیں
تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اُس کے سامنے ننگا ہو گیا ہوں۔ پیرو
نے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور مجھ سے جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن
شاید کچھ بھی نہیں سُنا۔ میں اُس کے آگے ہاتھ جوڑنا چاہتا تھا لیکن
سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ میرا سارا جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا۔
مجھے نہیں معلوم، ٹم ٹم کتنی دیر تک چلتی رہی۔ جب رُکی تو کانتے
نے میرے گھٹنے پر تھپکی دے کے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ ٹم ٹم چند
لمحے رُک کے پھر چل پڑی۔ وہ بڑے نواب کی حویلی کا دروازہ تھا جس
نے کل رات ہی اُسے عبور کیا تھا۔ دروازے کے اطراف روشنیاں جلی
ہوئی تھیں، کل کے مقابلے میں بہت زیادہ۔ بڑا دروازہ فوراً کھول دیا گیا
تھا۔ باہر کئی آدمی ہمارے انتظار ہی میں کھڑے تھے اور ان کی آوازوں
سے باہر چھایا ہوا سکوت تھوڑی دیر کے لیے درہم برہم ہو گیا تھا۔ دروازے
سے عمارت تک روشوں کے درمیان گزرگاہ میں فاصلے فاصلے
مجھے کئی آدمی مستعد کھڑے نظر آئے۔ ٹم ٹم خاص کاریڈور میں جا کے
ٹھہری اور میں نے عمارت کی سیڑھیوں پر بڑے نواب کی جھلک دیکھی
وہ ٹم ٹم ٹھہرتے ہی ہماری جانب لپکا۔ پیرو نے میرا ہاتھ بڑے زور
سے تھام رکھا تھا۔ اُس نے مجھے کھینچ کے اُٹھایا۔ میں ہڑبڑا کے
نیچے اُتر آیا تھا اور میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن
دل اندر ہی اندر جیسے کٹ رہا تھا۔ زمین پر آ کے پیرو نے ایک بار میرا

جانب جھپکتی آنکھوں سے دیکھا تو میرا سارا وجود لرزنے لگا۔ اُس کی نگاہوں میں خفت اور یاسیت کی آمیزش تھی جیسے اُس نے سب غلط کہا تھا اور میں نے غلط سُنا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ میں وہیں سر پھوڑ لوں یا اُس کے پاؤں پکڑ کے التجا کروں۔ داوا! بس کرو، مجھے جو چاہے سزا دے دو مگر میں کسی بخشش اور درگزر کا اہل نہیں ہوں۔ میں اپنے سوا واقعی کسی کو نہیں پہچانتا، اپنے سوا میں سب کے لیے اوزان اور پیمانے رکھتا ہوں۔ میں بہت وحشی ہوں، مجھ سے میری اوقات ہی کے مطابق سلوک کرو مگر شاید اس سے بڑی ذلت کوئی نہیں ہوتی کہ آدمی اپنی ہی نظروں میں ارزاں ہو جائے۔ پیرو مجھے کھینچتا ہوا چند قدم آگے بڑھ گیا۔ وہاں آگے والی ٹم ٹم کھڑی تھی، پیرو کو مجھے کھینچنے، گھسیٹنے کی ضرورت نہیں تھی، اب میرے لیے اگر تلافی کا کوئی گوشہ بچا تھا تو یہی کہ میں خانم کا ہاتھ تھام کے اُسے خود اندر لے جاؤں۔ ہر چند اب اس سے بھی کیا فرق پڑتا تھا۔ پیرو کو مجھ پر بہت رحم آتا یا بہت ہنسی آتی۔

تجمل کے اُترتے ہی بڑے نواب نے اُس کے ہاتھ جکڑ لیے، اُس کی آنکھیں جل سی رہی تھیں، لمحوں تک وہ تجمل کے سامنے اُس کے ہاتھوں میں ہاتھ پیوست کیے گم صُم کھڑا رہا، پتھر کی مورتی کی طرح اور اُس کے ہونٹ مسلسل سسکتے، پھڑکتے رہے۔ معًا اباجان درمیان میں آ گئے۔ اُسے کچھ احساس ہوا اور اُس نے حواس باختہ انداز میں چبوترے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خانم بھی منیر علی کے پیچھے پیچھے نیچے اُتر گئی تھی۔ برقع پوش خانم کو دیکھ کے اُس کی حالت اور اضطراری ہو گئی۔ تجمل نے چبوترے کی سیڑھیاں آہستہ آہستہ طے کیں اور اُس کے ساتھ ہم سب نے، نواب سب سے پہلے تیزی سے اُوپر چلا گیا تھا۔ چبوترے کے سائبان میں سامنے پہلا کمرہ روشن تھا، نواب کی پیروی میں ہم بھی اندر داخل ہو گئے۔ منیر علی خانم کا سایہ بنے ہوئے تھے۔ کمرے میں آ کے نواب کے اوسان کچھ درست معلوم ہوتے تھے، اُس نے چھلکتی نظروں سے باری باری ہمیں دیکھا۔ جیسے ہی اُس کی نظر پیرو پر گئی، اُس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ کسی توقف کے بغیر جھپکتی پلکوں اور سٹ پٹاتے قدموں سے پیرو کے پاس آیا اور اس سے پہلے کہ اُس کے لرزیدہ ہونٹ کچھ کہتے، پیرو نے اُس کے شانے پکڑ لیے۔ "ابھی کچھ نہیں بولنا نواب صاحب!" وہ دہکتی آواز میں بولا۔

"ہم، ہم آپ سے..." نواب کا گلا رُندھنے لگا۔

"بعد میں بہت وقت پڑا ہے۔"

کل رات ہم اُس کی بندوق کی باڑھ پر تھے اور گولی چلنے میں بس کسی اندھے لمحے کی کسر رہ گئی تھی۔ ابھی نہیں، کل رات تو وہ بھی ہماری زد پر تھا اور ہم نے اُس کی گردن پر دباؤ ڈال کے اُسے بے بس کر رکھا تھا۔ پیرو نے آنکھیں میچ لیں اور گھٹتی ہوئی آواز میں بولا: "ابھی اپن ادھر ہی ہے۔"

نواب نے بے تابانہ اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور اُنھیں چومنے لگا۔ میں پیرو کے پاس ہی کھڑا تھا، وہ میرے مقابل آیا تو آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے اُسے نہیں دیکھا کیونکہ اُس کے چہرے سے دھواں سا اُٹھ رہا تھا۔ چند لمحوں تک سامنے بے حس و حرکت کھڑا رہا، اُس کی تیز تیز سانسیں میرے کانوں میں دھمکتی رہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ لمحے بھر میں وہ میرے سامنے سے اور میرے جسم سے کوئی پہاڑ سا بوجھ اُتر گیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہتا نہیں جواب میں میرے منہ سے کیا نکل جاتا۔

کمرے میں وہ اکیلا تھا، حویلی کا کوئی ملازم یہاں تک کہ بھی موجود نہیں تھے۔ وہاں ہر جانب دیواروں کے ساتھ مو ہوئے تھے لیکن ہم سب کھڑے رہے۔ نواب نے ہم سے مسند پر کہا۔ تجمل کے قریب جا کے وہ پھر کہیں کھو گیا تھا۔ اُس کی نگاہیں کبھی خانم کی جانب اُٹھتی تھیں، کبھی میری اور پیرو کی جانب۔ ثانیوں کے لیے کمرے پر سناٹا چھایا رہا۔ آخر تجمل کی آواز پر انگیز خاموشی ٹوٹی۔ "ابھی اپنی بات تھوڑا دھیان سے سن لو نواب۔" اُس کے اچانک تخاطب پر نواب اُچھل سا گیا تھا۔ "ہم آ گئے" نے بظاہر بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ نواب ترخستی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ "اِدھر سے اپنے جانے کے بعد آپ کا اور اُس کا کوئی سایہ بھی اپنے کو دکھائی پڑ جاتا تو اپنا دوبارہ آنا جاتا۔" نواب نے کچھ کہنا چاہا مگر تجمل نے اُسے کچھ نہیں۔ "خانم کسی اور جگہ سے نہیں، اپنے گھر سے آئی ہے۔ وہ گھر آپ جیسا بڑا نہیں ہے لیکن کسی طرح کم بھی نہیں ہے۔ آپ نے جان لیا ہوگا کہ گھر اُونچی دیواروں سے بڑا نہیں ہوتا، اُس کے ہوتے ہیں۔"

"ہم نے بہت کچھ جان لیا ہے ہم نے..." نواب میں بولا۔ "ازراہِ کرم اب ہم سے کچھ نہ کہیے۔"

"ہم کو زیادہ نہیں بولنا، بس اتنا ہی کہ ابھی آپ کچھ سمجھنا، بولی ہر جگہ نہیں لگتی۔"

"یہ تو آپ اُس سے کہیں جس کے پاس بولی لگانے کے ہمارے پاس تو شاید یہی آنسو..." نواب نے منہ چھپا لیا۔ "ہم بہت بہت..." اُس کی آواز بھرانے لگی۔

"خانم اپنی امانت ہے نواب صاحب!"

"یہ ہمارے سر کا تاج ہیں۔" نواب تیزی سے بولا۔ "ہم کی قسم کھاتے ہیں، بشرطیکہ آپ کی نظروں میں اِس کی کوئی گنجا رہی ہو۔ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم نے زندگی محض ضائع ک کچھ جاتا ہے تو یقین کیجیے آج ہی جانا ہے۔"

"ابھی اتنا مت بولو نواب صاحب!" تجمل نے بکھرے لہجے میں کہا۔ "خانم کو اندر لے جاؤ۔"

نواب ایک لمحے کے لیے سُن سا ہو گیا لیکن جیسے اُسے دیر میں آواز ہو۔ اُس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں آگے بڑھ کے خانم کے سر پر رکھا۔ "آپ نے ہم پر بڑا کرم کیا، اس گھر پر۔ آپ نے بہت احسان" اُس نے بمشکل تمام سر جھکا کے بے اختیار خانم کے برقع کے پلو کو دیا۔

تجمل نے مضطرب نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: "لاڈلے! آپی کو اندر لے جا۔"

میں نے سُن لیا تھا لیکن میرے پیر منجمد ہو گئے تھے۔ میں وہیں رہا۔ پیچھے سے پیرو نے مجھے آگے دھکیل دیا۔ خانم کے قریب آ کے دل کی دھڑکن جیسے بند ہو گئی تھی۔ اُسی لمحے نواب خانم کی کمر پر ہاتھ کے اندر کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میں نے سراسیمگی تجمل کی طرف نگاہیں اُٹھائیں، اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ نواب اور خانم چند قدم آگے بڑھ گئے تھے۔ میں نے دھڑکتے قدموں سے اُن کا فاصلہ طے کیا۔ دروازے پر یہ جان کے مجھے کچھ تقویت ہوئی کہ منیر علی میرے ساتھ ہیں۔ اندر تیز روشنی تھی۔ یہ ایک کشادہ، لمبی چوڑی ہال جیسی تھی۔ یہاں سے گلیوں جیسے متعدد راستے نکلتے تھے اور فاصلے فاصلے سے دروازے بنے ہوئے تھے۔ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں سے ہم کل رات گزرے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی ہمیں وہاں کئی ملازم نظر آئے اور سیدھے ہاتھ کے انتہائی جانب دروازے کے پاس بکھری کھڑی ہوئی کئی عورتیں۔ ہمیں دیکھ کے وہ سٹ پٹاتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔ ملازم جہاں جہاں تھے اُلٹے قدموں چل کے دیواروں کے ساتھ جم گئے۔ میں خانم کے پہلو بہ پہلو تھا اور میرا سارا جسم سن سنا رہا تھا، برقع میں ہونے کے باوجود میں نے محسوس کر لیا تھا کہ خانم پر ارتعاش طاری ہے۔ میں نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا، خانم کا ہاتھ برف کے مانند سرد تھا۔

نواب کی رفتار تیز تھی۔ ہم ابھی ہال کے وسط میں تھے جدھر عورتیں اندر گئی تھیں، وہاں سے چوڑیوں کی کھن کھناہٹ اور لپکتے قدموں کی سرگوشیاں سنائی دیں، دروازہ کھلا ہوا تھا، نواب سیدھا اُسی دروازے کی طرف بڑھا۔ منیر علی اور میں وہیں رُک گئے تھے، ہمیں اندر جانے میں جھجک سی ہوئی مگر خانم کی اُنگلیوں کا دباؤ میرے ہاتھ پر بڑھ گیا تھا، اُدھر نواب نے منتشر لہجے میں ہم سے اندر چلنے کی درخواست کی۔

وہاں کئی عورتیں دروازے کے پاس ہی کھڑی تھیں، باندیاں اور لڑکی عورتیں ہمیں آتے دیکھ کے وہ ایک طرف بھاگنے لگیں لیکن نواب کی آواز پر ٹھٹک کے رہ گئیں۔ "گیتی گیتی! خانم آ گئی ہیں، خانم آ گئی ہیں!" کمرے میں نواب کی بھڑکتی آواز گونجی تو ایک شور بپا ہو گیا۔

جو عورت ایک جانب سے دوپٹا سنبھالے دیوانہ وار لپکتی جھپکتی ہوئی آئی تھی، وہ چھوٹے نواب عالم تاب کی بیگم تھی، میں اُسے پہلی جھلک میں پہچان گیا۔ اُس کے ساتھ نواب کی بہن بھی تھی۔ سفید پاجامے اور نیلے کُرتے میں ملبوس دونوں کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں اور چہروں پر آگ سی دہک رہی تھی۔ میں نے خانم کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ نواب کی بیگم اور بہن نے بے تابانہ خانم کو سینے سے لگا لیا، خانم اُن کے ساتھ آگے چلی گئی تھی اور نواب بھی۔ میں اور منیر علی وہیں خاموش کھڑے سب کچھ دیکھتے رہے، وہ جیسے ہماری موجودگی بھول گئے تھے۔ میں نے واپسی کے لیے منیر علی کی طرف دیکھا ہی تھا کہ ایک دم سامنے کوئی جھماکا سا ہوا۔ وہ نواب کی بہن تھی، اُس نے اچانک پیچھے مُڑ کے مجھے جلدی سے آداب کیا، اُس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور رخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی۔

میں اُسے دیکھتا رہ گیا، اس سے پہلے کہ میں اُسے جواب دیتا۔ وہ باندیوں کے جھرمٹ میں اوجھل ہو گئی۔

دوسرے لمحے کمرے میں ہم تنہا رہ گئے۔

منیر علی نے جھپکتی پلکوں سے میری جانب دیکھا۔ اُنھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں تھا۔ میں نے از خود اُنھیں بتایا کہ وہ نواب کی بہن تھی۔

"میں سمجھ گیا تھا" وہ تذبذب سے بولے۔ "وہ نواب کی بہن یا بیٹی ہی ہو سکتی ہے۔ ماشاء اللہ بالکل کسی شہزادی کے مانند ہے۔"

منیر علی غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ اُس رات حویلی کے قید خانے میں جب وہ اور چھوٹے نواب کی بیگم چھپتی چھپاتی مجھ سے اور پیرو سے ملنے آئی تھیں تو صرف اُن کے چہرے کُھلے تھے، بدن چادروں میں لپٹے ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا اور وہاں روشنی بھی کم تھی لیکن اُن کے رنگ، نقش و نگار، قد و قامت، لب و لہجہ سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ سرتاپا حوروں جیسی ہوں گی۔ میں نے ابھی چند لمحے پہلے چھوٹے نواب کی بیگم کو بھی دیکھا تھا جسے بڑے نواب گیتی کے نام سے پکار رہے تھے اور جو خانم کو دیکھ کے بے قرار ہو گئی تھی۔ اُس کے سراپا کی یہ تصویر میرے تصور سے اتنی مختلف نہیں تھی اور اگر تصویر کچھ دھندلی بھی تھی تو اب روشن ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا عکس نظر آتی تھیں۔ عمروں میں بھی بس اُنیس بیس کا فرق ہوگا۔ لباس بھی اُنھوں نے ایک جیسا پہنا ہوا تھا۔ چوڑی دار پاجامے، لمبے گھیر دار منقش کُرتے، ہرے دوپٹے، کانوں میں ہلکے بُندے اور کلائیوں میں طلائی چوڑیاں۔ البتہ اُس رات وہ بہت سا زیور پہنے ہوئے تھیں

غالباً اس لیے کہ کہیں ہم کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھیں۔

سب اندر چلے گئے تھے۔ اندر سے سٹ پٹاتے قدموں اور ہڑبڑاتی سرگوشیوں کا شور کچھ دیر سنائی دیتا رہا پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ ہم سے اور دُور چلے گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اندر سے کوئی آکے ہمیں پوچھے گا لیکن لمحے گزر گئے اور کوئی نہیں آیا تو منیر علی نے واپسی کا ارادہ کیا۔ کمرے کا دروازہ عبور کر کے ہم اُسی کشادہ ہال جیسے دالان میں آ گئے جہاں سے گلی جیسے متعدد راستے نکلتے تھے۔ دالان میں داخل ہوتے ہی میری نظر سب سے پہلے خاں صاحب پر پڑی، وہی شخص جو تھانے میں ہمارا نجات دہندہ بن کر آیا تھا اور جس نے ہمیں ایک زنداں سے نکال کر دوسرے زنداں میں ڈال دیا تھا۔ یہاں حویلی میں قدم رکھتے ہی اُس کا رنگ گرگٹ کی طرح بدل گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو خاں صاحب کا جسم اکڑ سا گیا مگر دوسرے ہی پل وہ بے تابی سے میری طرف بڑھے ”میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔“ وہ بدحواسی سے بولے۔

صرف اتنی سی بات تھی۔ بٹھل کے بقول کتنی آسانی سے اُسے کہہ دیا گیا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ اُلٹے ہاتھ کا طمانچہ رسید کروں، کم از کم بتیسی تو باہر آجائے۔ اس کی عاجزی پہ میرے سینے میں آگ سی بھڑک اُٹھی تھی۔ میرے اور پیرو کے جسم پر ابھی تک اُن بیدوں کے نشانات ہوں گے جو یہاں حویلی میں ہم پر برسائے گئے تھے۔ ہمیں اصطبل کی غلیظ کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ منیر علی پاس کھڑے تھے، میں نے بہت ضبط کیا اور ہونٹ بھینچے چپ کھڑا رہا۔

”میں۔ میں آپ سے کیا کہوں۔“ خاں صاحب اضطراری لہجے میں بولے ”یوں سمجھیے کہ ایک غلام نے محض اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اس میں غلام کی کوئی غرض شامل نہ تھی اور آقا بھی اپنی جگہ بہت بے بس تھے۔“

میں نے اُس سے نہیں کہا کہ وہ آدمی سے اچانک کیسا وحشی بن گیا تھا۔ اُس نے ہماری کوئی بات سننی گوارا نہیں کی تھی۔ ہم نے اُسے کتنے واسطے دیے تھے، کیسی فریاد کی تھی۔

”جانے بھی دیجیے۔“ منیر علی نے اضطراب سے کہا ”یقیناً آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ قصور شاید کسی کا بھی نہیں تھا۔ جو وقت اللہ نے اچھا بُرا مقدر میں لکھ دیا ہے، اُس سے نمٹنا تو بہرحال لازم ہے۔“

خاں صاحب کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ یکایک وہ میرے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے ”یقین کیجیے میں نے آپ سے دُگنی عمر گزاری ہے مگر خود کو کبھی اتنا پست محسوس نہیں

کیا۔ سب کچھ صحیح ہے لیکن ۔ ۔ ۔ لیکن سب کچھ بہت غلط ا[...] شرم ناک حد تک نارو! تھا۔ میری درخواست ہے کہ آپ اِس [...] کے لیے ضرور کوئی سزا تجویز فرمائیے تاکہ اس کی نجات کی کوئی [...] بن سکے۔“

”جانے اب آپ، اب آپ ۔ ۔ “ لفظ میرے حلق [...] گھُٹ گئے۔

”چھوڑیے بھی، رات گئی بات گئی، بُری گھڑیاں یاد رکھنے سے اذیت اور رسوا ہوتی ہے۔“ منیر علی نے اُن کی کمر تھپکتے ہوئے کہا ”آیئے اندر بیٹھتے ہیں، میں وضو کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور، ضرور۔“ خاں صاحب مستعدی سے بولے ”میرے ساتھ تشریف لایئے۔“ مڑتے مڑتے اُنھوں نے مجھے گلے لگانے کی کوشش کی، میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ خاں صاحب نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور اُنھیں سینے پر رکھتے ہوئے بولے ”ہو سکے تو اِس گناہ گار کو بخش دیجیے۔“ اُن کی آواز جھرجھرا رہی تھی۔ میں سر جھکا کے گیا اور منیر علی کو وہیں چھوڑ کے آگے بڑھ گیا۔

سارا دالان روشن تھا۔ خانم کو لے کے ابھی ابھی میں یہاں سے گزرا تھا لیکن اب مجھے اپنا کچھ ہوش نہیں تھا۔ اندازے سے [...] کھُلے دروازے کے ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ ابّا جان، بٹھل، [...] زدرا اور پیرو وہیں موجود تھے۔ سب کھوئے کھوئے، ایک دو[...] سے بے گانہ مخملیں صوفوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ میرے آنے پر سبھی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ بٹھل نے ہاتھ بڑھا کے مجھے اپنے پاس بلا لیا ”دھواں کیوں دے رہا ہے رے؟“ اُس نے بوجھل [...] میں مجھ سے پوچھا۔

”کچھ نہیں، بس وہ اُدھر، اُدھر ۔ ۔ “ مجھے بروقت احساس ہو گیا۔ اُسے پریشان نہ کرنے کے خیال سے میں نے خاں صاحب کا نام نہیں لیا۔

”اُدھر کوئی بھوت تھا رے؟“

”نہیں۔“ میرے مُنہ سے نکل گیا ”اُس طرف ایک جنگلی [...]“

وہ سیدھا ہو گیا اور اُس کی گھورتی نظریں مجھ پہ مرکوز ہو [...]

”کیا ہے لاڈلے!“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے ترشی سے کہا۔

اُس نے مجھ سے حجت نہیں کی اور صوفے کی پشت سے سر ٹکائے گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ کمرے میں ملازمین مسلسل آجا رہے تھے۔ اُنھوں نے اگربتی جیسی کوئی چیز سلگا دی تھی

[...]طرف بھینی بھینی خوشبو رچ گئی تھی جیسے ہوا میں گلاب گھول دیے گئے ہوں۔ ساری کھڑکیاں کھول دی گئی تھیں اور اُن پر پڑے پردے ہوا کے جھونکوں سے سرسرا رہے تھے۔ ملازموں نے کمرے [کا] فانوس روشن کر دیا تھا اور درمیانی میز پر مختلف قسم کے مشروبات، میووں کی طشتریاں اور پھلوں کے طشت کے علاوہ ایک بڑا [خاص] دان بھی لا کے سجا دیا تھا۔ پیرو نے خاص دان کھول کے دیکھا، [...]ذی کے اوراق میں لپٹی ہوئی گلوریوں سے بھرا تھا۔ پیرو نے [ایک] گلوری اٹھا کے مُنہ میں رکھ لی اور اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں ”بٹھل [...]“ وہ خاص دان اٹھائے لپکتا ہوا بٹھل کے پاس آیا ”ابھی ذرا [دانتوں] تلے دبا کے دیکھو، قسم سے ایک دم سالا پھول مافک مُنہ میں [...]یا ہے۔“

بٹھل نے بھی گلوری مُنہ میں رکھ لی۔ پیرو اس طرح خاص دان [لیے پھر ر]ہا تھا جیسے کوئی عجوبہ ہاتھ آ گیا ہو۔ وہ زدرا، کانتے [...] ابّا جان کو گلوریاں کھلاتا میرے پاس بھی آ گیا۔ میرا جی اُڑا اُڑا [سا] تھا۔ میں بٹھل کے کہنے پر خانم کو اندر پہنچا آیا تھا لیکن میری سمجھ [میں] کچھ نہیں آ رہا تھا۔ طرح طرح کے سوال میرے ذہن میں بھٹک [رہے] تھے۔ یہاں سے واپسی کے بارے میں، خانم کے بارے میں، ابّا جان [کی چھو]ڑی ہوئی حویلی کے بارے میں۔ بے شک اب پولیس کی گرفت [...]ڈے کے کسی آدمی کے سبب راہ میں رکاوٹ پڑنے کا امکان نہیں [ر]ہا۔ جس شخص کی وجہ سے پولیس کے حرکت میں آجانے کا اندیشہ [...]ے کے آدمیوں کے بہک جانے کا احتمال تھا، ہم اُسی کے گھر میں [...]تھے۔ اب بظاہر کوئی گرہ باقی نہیں رہی تھی لیکن راستے صاف [ہو]نے سے مُراد اس شہر سے رہائی تو نہیں تھی۔ ممکن ہے، بٹھل نے [...] کے بارے میں اپنے طور پر کچھ نہ کچھ طے کر رکھا ہو۔ میں نے [...] چہرہ پڑھنے کی کوشش کی مگر اُس پر کھنچی ہوئی آڑی ترچھی لکیروں [...] مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ اُس کی نیم وا آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، کتنی راتوں [سے] جاگ رہا تھا اور شب و روز لوگوں کے درمیان بندھا بیٹھا تھا۔ [...] تھی کہ اب صوفے پر اُس کا جسم گرا گرا، بکھرا بکھرا لگتا تھا۔ شاید [...] کا کوئی اندازہ نہیں تھا اور نہ اُن میں سے کسی اور کو۔ اُن [کے چہ]روں پر اضطراب آمیز سکون چھایا ہوا تھا۔ وہی سکون جو کوئی [...] تمام کر لینے کے بعد ممکن ہوتا ہے اور وہی اضطراب جو کوئی منزل [...] لینے کی بے یقینی سے ہوتا ہے۔ وہ چونکنے کے انداز میں بار بار ایک [دو]سرے کے چہرے دیکھتے تھے اور اپنے آپ میں کھو جاتے تھے تاہم [...] کسی کو کوئی جلدی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ نہ پیرو کو اپنی

بیوی اور بیٹی سے ملنے کی کوئی جلدی تھی، نہ ابّا جان کو فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر کو دیکھنے کی جو بمبئی میں ایک اجنبی کے گھر نہ جانے کب سے اُن کی راہ تک رہے ہوں گے۔ پھر مجھے ایسی جلدی کیا ہے؟ وہ بھی اسی کشتی میں سوار ہیں۔ ایک مجھی پر یہ وحشت کیوں طاری ہے۔ کیا میں اُن سے زیادہ دیکھتا اور سُنتا ہوں یا مجھے اُن سے کم دیکھنا اور سُننا آتا ہے۔ اُنھوں نے تو مجھے نہیں ٹوکا تھا لیکن میں خود اپنے سامنے تو موجود تھا۔ بے شک کبھی ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب آدمی اپنی ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یقیناً اُن سب کا یہ سکوت اطمینان کی کوئی کیفیت تھی کہ اب اُنھیں بہرحال گھر ہی جانا ہے سو دیر سویر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے فرخ، فریال، فارہہ اور اکبر سے دُور ہوئے نو برس سے اُوپر ہو چکے ہیں تو اب چند دن، چند ہفتوں میں کیا رکھا ہے۔ وہ کون سے میرے منتظر ہوں گے۔ اُنھوں نے تو اپنی دانست میں کب کی اپنے بھائی پر مٹی ڈال دی ہوگی، مُردوں کا انتظار کون کرتا ہے اور ابھی خانم کو اس گھر میں آئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے جو مجھے روانگی کی بے کلی شروع ہو گئی۔ اچھا ہی ہوا جو میرا ہذیان مجھی تک محدود رہا ورنہ بٹھل مجھ پر بہت ناراض ہوتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خانم کو یہاں چھوڑ دینے کے بعد ہم اپنے راستے پہ چل پڑیں۔ خدا کرے، نواب عالم تاب جلد ٹھیک ہو جائے۔ خانم کے آنے کا کوئی نتیجہ نکلے۔ کوئی کسی کا اتنا ہی طلب گار ہو سکتا ہے، کسی کے لیے اتنا ہی ویران۔ میں بھول گیا، ابھی راستے میں پیرو نے مجھے کیا طعنہ دیا تھا کہ میری آنکھیں اپنے سوا کسی کو کیوں نہیں دیکھتیں۔ ابھی راستے میں اُس نے میرے مُنہ پہ طمانچہ مارا تھا۔

پیرو نے خاص دان میری طرف بڑھایا تو ایک گلوری میں نے بھی اٹھا لی۔ اُس نے بالکل سچ کہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے مُنہ میں پھول کھِل اُٹھے ہوں، گلاب کے پھول۔ میں نے زندگی بھر ایسا پان نہیں کھایا تھا۔ زرّیں نے گھر میں پان دان کا خاص اہتمام کیا تھا۔ پان کا شوقین وہاں کوئی نہیں تھا لیکن زرّیں کا کہنا تھا کہ پان دان کے بغیر گھر سُونا سُونا محسوس ہوتا ہے۔ وہ بھی بہت نفیس پان بناتی تھی مگر اِس پان کی لذت ہی کچھ اور تھی۔ نہ ایسی تیز خوشبو کہ جی لوٹ جائے، نہ ایسی کم کہ محسوس ہی نہ ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب چیزیں ناپ تول کے ڈالی گئی ہیں۔ ذائقوں کی بھی اپنی تاثیر ہوتی ہے۔ مجھے اپنا سینہ کھُلتا سا محسوس ہوا۔ اگر واپسی میں سیدھے فیض آباد جانا ہوتا تو میں یہاں کی ایک گلوری زرّیں کے لیے ضرور لے جاتا۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتی ہے۔

ایک ملازم ہمارے صوفوں کے آگے اسٹول جیسی گول چھوٹی میز میں رکھ رہا تھا کہ خاں صاحب کے ساتھ بڑا نواب تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اُس کی چال سے بے چینی عیاں تھی۔ آتے ہی اُس نے گھبرائے ہوئے انداز میں معذرت کی اور بٹھل سے مخاطب ہو کے بولا "یقیناً آپ حضرات نے رات کا کھانا نہیں کھایا ہوگا۔"

"تکلف کی ضرورت نہیں۔" بٹھل کے بجائے ابّا جان نے جواب دیا۔ "ہم نے ابھی کوئی سات بجے سیر ہو کے ناشتہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے، کسی کو بھی بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہوگی۔"

بٹھل نے بھی ابّا جان کی تائید کی لیکن بڑے نواب نے کسی کی نہ سُنی، "کوئی مضائقہ نہیں، توشے کا اہتمام کچھ دیر میں ہو جائے گا۔" ملازموں کو اشارہ کر کے وہ بٹھل کے سامنے والی نشست پر بیٹھ گیا۔ گلے تک شیروانی میں بند اُس کا سینہ زیر و زبر ہو رہا تھا اور خنکی کے باوجود پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ خاں صاحب بھی اُس کے دائیں جانب کونے میں سمٹے سمٹائے بیٹھ گئے تھے۔ کمرے میں لمحوں تک سناٹا سا رہا۔ سب جیسے گونگے ہو گئے تھے۔ نواب کچھ کہنے کے لیے مضطرب نظر آتا تھا لیکن شاید اُسے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں جلتی بجھتی رہیں۔ ابّا جان کو یہ خاموشی سب سے گراں گزر رہی تھی، اُنھوں نے نواب سے حویلی کے بارے میں رائے ظاہر کی، کسمساتے لہجے میں بولے "یہ عمارت تو خاصی نئی معلوم ہوتی ہے۔"

"جی، جی ہاں۔" نواب نے چونک کے سر اٹھایا۔ "پانچ سال کے قریب اس کی تکمیل کو ہوئے ہیں۔"

"نہایت شاندار عمارت ہے۔"

"جی ہاں۔" نواب نے شائستگی سے کہا "بس بن گئی۔"

"برس لگے ہوں گے؟"

"جی، برس۔ کوئی چار سال۔" نواب نے مختصراً کہا۔

"ہر گوشے سے نفاست ٹپکتی ہے۔"

نواب پہلو بدل کے رہ گیا۔ ابّا جان کو جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک بے محل گفتگو ہے۔ اُنھوں نے عمارت کے بارے میں پھر کوئی رائے زنی نہیں کی۔ وہی اجنبی سکوت پھر کمرے پہ چھا گیا۔ نواب نے مضطربانہ خاں صاحب کو دیکھا پھر اچٹتی بھٹکتی نظروں سے ہم سب کو۔ نواب کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اُس کا یہی عالم ہوتا۔ وہ اُن لوگوں کے درمیان تھا جو اُس سے پہلی یا دوسری بار مل رہے تھے۔ اُسے اچھی طرح کسی کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔ صرف ایک مرتبہ بٹھل اور کانتے

اُس سے مل کے گئے تھے اور پیرو اور میں بارہ دن تک اُس کی
رہے تھے مگر اُس کی یہ کیفیت صرف اجنبیت کے سبب سے ہی نہیں ہ
بہت کچھ ہوگا۔ وہ ہمارے بارے میں کچھ جانتا تھا تو اڈ
حوالے سے اور اڈّے کی طرف سے۔ اس دوران اُسے عجیب
خبریں سننے کو ملی ہوں گی۔ ہمارے حیدرآباد آنے کے بعد
اڈّے پر پیش آنے والے ایک ایک واقعے کا اُسے علم ہو
آکا کی بے دخلی، بھورے دادا کی آمد، موسیٰ ندی کا واقعہ، ہ
ہے، مخبروں نے اپنی طرف سے اور حاشیہ آرائی کی ہو۔ پھر
پیرو تو اُس کے سامنے ہی تھے۔ کل رات ہی کی بات تھی ہم
کس طرح اُسے بندوق کی زد پر رکھ کے حویلی سے فرار ہو
اور بارہ دن طرح طرح کے ستم برداشت کرنے کے باوج
خانم کے متعلق ایک حرف بھی نہیں اگلا تھا۔ انھی لوگوں ک
اب وہ بیٹھا ہوا تھا۔ گو ہمارا لباس اڈّے سے ہماری وابستگی کی چغل
تھا اور ادھر ہمارے ساتھ منیر علی اور ابّا جان ایسے بزرگ
تھے لیکن یہ تضاد تو اُس کے لیے اور کشمکش کا باعث ہو
چند ثانیوں تک سب جیسے کسی اَن ہونی کے منتظر گم بیٹھے
نواب ہی نے خاموشی توڑی۔ "ہم، ہم کچھ عرض کرنا چاہتے
رُک رُک کے بولا۔

"اب کچھ مت بولو نواب صاحب!" بٹھل نے ہ
ہوئے کہا۔

"ہم پر بہت بوجھ ہے۔" اُس نے تیزی سے کہا
کہنے دیجیے، گو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ہم کیا کہیں
آپ کے سامنے زبان کھولیں۔"

"ہم لوگ کو تھوڑا آنکھوں سے بھی سننا آتا ہے
آہستگی سے کہا۔ "اچھا ہے، آپ زبان بند ہی رکھو۔ سمجھو
سب سُن لیا ہے۔"

"آپ کی نوازش، بخدا ہم اپنے قلبی اظہار سے قا
پر اتنا بڑا احسان کبھی نہیں کیا گیا۔ ہمیں بار بار احساس ہ
نے آپ جیسے بلند۔ ۔ ۔" اُس کی آواز بھرا گئی۔

"بس نواب صاحب ابھی بس کرو۔" پیرو نے درمیا
دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "قسم سے نواب صاحب! اپن
کیا بولا تھا، اپن نے جیسا بولا تھا، آپ اپن لوگ کا خلا
ہم راستہ بدل کے سیدھا خانم بی بی کے پاس جاتا اور اُس
آگے ہی دم لیتا۔"

"اب اس کو مت کو لوٹو دادا!" بٹھل نے ناگواری سے کہا۔

"مُنہ پر آ گیا بٹھل بھائی!" پیرو نے لجاجت سے کہا۔

"انھیں کہنے دیجیے، ہم چاہتے ہیں کہ سب کچھ ہمارے مُنہ پر
جائے۔ یہ کچھ کم ہی کہیں گے، حقیقت اُس سے بہت زیادہ ہے
ت یہ ہے کہ ہم کسی طور قابلِ معافی نہیں۔ ہماری وجہ سے انھیں
ت سے دُکھ اٹھانے پڑے ہیں۔ ہمیں ناز تھا کہ اس گھر سے ہمیشہ
ں کو سُکھ دینے کی خواہش کی گئی ہے۔ اس مرتبہ یہاں کے مکین
ے آبا کی روِش بھول گئے، محض ندامت کا اظہار کافی نہیں ہے۔"

"ازراہِ کرم۔" ابّا جان نے بے تابی سے کہا۔ "ازراہِ کرم نواب
احب! اب یہ باتیں نہ کیجیے، ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ آدمی اپنی
ہیں کرتا ہے۔ غلط فہمیاں، غلط تخمینے زندگی کا حصّہ ہیں، کہیں
ی آدمی کو اس سے مفر نہیں۔"

"نہیں، صرف اتنا نہیں ہے۔" نواب کی آواز گلوگیر ہو گئی۔
ہیں معلوم ہے کہ آپ کا قلب کتنا کشادہ ہے۔ آپ ہمیں دو لفظوں
ا بھیک دے کر معاف کر دیں گے لیکن کیا اس طرح ہمیں سُرخ روئی
یب ہو جائے گی؟ ہمارے سینے کا تلاطم کم ہو جائے گا؟ ہم آپ
ے معذرت نہیں چاہیں گے۔ یہ مت سوچیے کہ ہم صورتِ حال کی
ہدیلی سے معذرت خواہی پہ مجبور ہیں کیوں کہ اب یہی تیور ہمارے
لیے مناسب ہے بلکہ ہم آپ سے عرض کریں کہ ہمیں ان دونوں
زیزوں سے کوئی عناد نہیں تھا۔ ہماری کوشش یہی تھی کہ دونوں پر
وئی آنچ نہ آئے لیکن سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکلتا گیا۔ سب ارادۃً
تھا۔ ہم اپنی غرض میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ کچھ اور سجھائی سنائی
ہیں دیا۔ یقیناً یہ ہمارے اجداد کی دی ہوئی اور ہمارے اندر چھپی
ہوئی کوئی سرکشی تھی جس نے ہمارے حواس سلب کر لیے تھے۔ انھوں
نے ابتدا میں ہمیں سب کچھ جتا دیا تھا مگر ہم سننے کے اہل نہیں تھے۔
ہمیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ جن لوگوں سے ہمیں خانم بی بی کا سُراغ
مطلوب ہے، اُن سے خانم بی بی کا کوئی واسطہ بھی ہو سکتا ہے اور
دو ایسے معزز بھی ہو سکتے ہیں۔ ہم اپنے ہوش ہی میں نہیں تھے۔ جگہ
جگہ کی خاک چھاننے کے بعد کہیں ہمیں ان دو معززین کی صورت میں
اُمید کی کرن نظر آئی تھی۔ موسیٰ ندی پر انھوں نے ہمارا ارادہ پسپا
کر دیا تھا تو ہمارے پاس پہلے سے متبادل راستہ موجود تھا۔ بھلا نے
تھے ہم کہ بھائی اِن پر دست رس حاصل کر سکتے تھے۔ یہاں گھر آ کے
انھوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ہمیں ہر دم وقت نکلتا محسوس
ہوتا تھا۔ ہر گزرنے والی رات ہمارے بھائی کو ہم سے اور ناراض

کر دیتی تھی۔ ہم پر ایک وحشت طاری تھی لیکن اس کی وجہ صرف ہمارے بھائی کی زار و زبوں حالت ہی نہیں تھی، ہم جانتے ہیں، اس کی وجہ دوسری بھی تھی۔ یہ حویلی تھی۔ یہ حویلی آئینے میں ہمیں صرف ہمارا چہرہ دکھاتی تھی۔"

"ابھی جانے دو نواب صاحب! اپن آپ سے بنتی کرتا ہے، ابھی کچھ مت بولو۔" پیرو نے تندی آمیز نرمی سے کہا۔ "اپن آپ سے بولا تھا کہ ایسا لوٹ پلٹ ہوتا رہتا ہے، کوئی نوا بات نئیں ہے۔"

"مگر ہم اس افتاد سے پہلی بار دوچار ہوئے ہیں۔" نواب نے جلتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمیں قطعی خیال نہیں تھا کہ اس طرح کبھی آپ لوگوں کا سامنا بھی ہو سکتا ہے، آپ ہمیں یوں آئینہ دکھانے آ جائیں گے۔ ہمیں بس اپنے شیش محل کا گمان تھا اور کچھ خبر نہیں تھی کہ لوگ ایسے شیشوں کے بھی ہوتے ہیں، اتنے دریا دل بھی ہوتے ہیں۔"

"نواب صاحب!" بٹھل نے نسبتاً اُونچے لہجے میں کہا۔ "ہم آپ کو بولیں، ہماری صورت کبھی آپ لوٹ کے نہ دیکھتے اگر ہم کو اِدھر دیکھنے کے بعد آپ سے کچھ اور اُلٹا سیدھا ہو جاتا۔ آپ نے ٹھیک کیا جو ہم کو بازار کے اڈّے پر نہیں چھیڑا اور اِدھر ان لوگ کے حویلی سے نکلنے کے بعد لگام کھینچے رکھی۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں، آپ ہم سے سب کچھ کہہ کر گئے

تھے مگر ہم آپ سے عرض کریں۔ ہم آپ کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ ہمیں اپنی اس کوتاہی کا اعتراف ہے کہ ہم نے آپ کی باتیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھی تھیں۔ ہم نے آپ سے اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا تھا لیکن اس کا سبب اگر ایک طرف آپ کے دل میں کسی نرم گوشے کی توقع تھی تو دوسری جانب اس طرح ہمیں اپنی دانست میں یہ جتانا بھی مقصود تھا کہ آپ کے دونوں آدمی اُس وقت تک ہماری تحویل میں رہیں گے جب تک ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہم نے ایسا ہی جانا تھا۔" بتّھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"اور، اور بازار کے علاقے میں آپ کے ہر اقدام سے باخبر ہونے کے باوجود ہمیں اعتماد تھا کہ آخر ہمی اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ ہمیں مطلق اس کی پروا نہیں تھی کہ آپ کسی اور طرف دادرسی کے لیے جا سکتے ہیں اور ریاستی نگہ داروں کا رُخ ہماری حویلی کی جانب ہو سکتا ہے۔ ہمیں اپنے ذرائع اور وسائل پر یقین تھا۔ ایوانِ اقتدار تک رسائی کا شرف ہمیں اور بہت سے اعزاز و امتیاز کے ساتھ ورثے میں ملا ہے۔ ہمارے عم زاد نواب حشمت جنگ تو ان دنوں ریاستی انتظامیہ میں اعلاتر منصب پر فائز ہیں۔"

نواب حشمت جنگ کے نام پر اباجان سیدھے نہ بیٹھے رہ سکے۔ اُنھوں نے اضطراری انداز میں بتّھل کی طرف دیکھا۔ بتّھل نے آنکھیں میچ لیں اور اباجان کی زبان پر کچھ آتے آتے رہ گیا۔

نواب نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ہمیں علم ہو گیا تھا کہ آپ نے اُس طرف بازار کے علاقے میں آکا نامی مشہور سرغنہ کو کیسا رُسوا کیا ہے۔ اُس طرف سے آنے والی اطلاعات ہمارے لیے بہت حیران کُن اور کسی حد تک تشویش انگیز تھیں۔ ہم یہاں دور بیٹھے بیٹھے آپ کے ایک ایک لمحے کے شاہد تھے اور ہمیں کوئی شبہ نہیں تھا کہ آپ کو مآلِ کار پلٹ کے ہماری طرف آنا ہے، ہمیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ آپ کو اپنے دو آدمی ہم سے زیادہ مطلوب ہوں گے اور اگر، اگر آپ نے کسی دوسرے ارادے سے اس چار دیواری میں قدم رکھا تو ۔ ۔ ۔" نواب پلکیں پٹ پٹانے لگا اور گہری سانس لے کے بولا۔ "ہم نے محافظوں کو چوکنا کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ممکن ہے، اب نمک آزمانے کا وقت آجائے۔ ہم نے احتیاطاً نفری بڑھا دی تھی۔ ہر چند کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم آپ سے سچ کہتے ہیں، ہمارے عزم میں کوئی لچک نہیں تھی۔ ناامیدی کی صورت میں ہم ان دو شریف النفس صاحبان کے لیے کسی دم کوئی بھی فیصلہ کر سکتے تھے، کوئی بھی آخری فیصلہ۔ اور یہاں تک کہ کسی کی نگاہ دراز ہوتے ہوتے ہم ہر شہادت مٹا دینے پر قادر تھے۔"

ہم سب ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہے تھے۔ بتّھل، اباجان سب خاموشی سے سنتے رہے۔ "فیصلے میں ہر بار ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تھی۔" نواب نے جھرجھری لے کے کہا۔ "... طور پر اتنا ہی صبر و ضبط بہت کیا تھا۔ آپ نے ہمیں نتائج ... کرنے اور کسی مذموم فیصلے سے باز رکھنے کے لیے ایک برمحل کوشش کی تھی۔ ہم نے سُن لیا تھا اور بعد میں بازار کے علاقے سے ملنے والی اطلاعات ہمیں کبھی آپ کا مشورہ آزمانے پر راغب ... تھیں لیکن ہمارے بزرگ غالباً ہمیں ایک درس دینا بھول ... یا وہ خود اس کا درک نہیں رکھتے تھے۔ ہم سوچتے ہیں، جب ... آئے تھے، کاش ہم اُسی وقت آپ کی بات مان لیتے اور ان ... کو آپ کے ساتھ ہی کر دیتے۔ اُس وقت نہیں تو ایک ... دیتے مگر اِس اقدام میں ہمیں سُبکی محسوس ہوتی تھی یا پھر ... ہمیں آپ کی جانب سے کسی بھی گداز کی توقع نہیں تھی۔ ... کے بارے میں شاید تا بہت کچھ دیا گیا تھا۔"

"آپ کو کم بولا گیا ہوگا نواب صاحب!" بتّھل کی آواز کمرے میں گونجی۔

"یقیناً، یقیناً۔" نواب نے شائستگی سے کہا۔ "ہماری ... اطلاعات سے ہے۔ ہمیں یقیناً ایسی اطلاعات پہنچائی گئی ... تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کرتی تھیں اور یہ ہماری گراں ... تھی کہ ہم نے اُنھیں جوں کا توں قبول کر لیا۔ رات، صرف ... ہمارے بزرگ۔" اُس نے پیرو کی طرف سر اُٹھا کے کہا۔ "... ہمارے بزرگ نے ہمیں زندگی کا وہ مشاہدہ کرایا تھا جس ... کبھی آشنا نہیں ہوئے تھے۔ کل رات ہم نے اپنے آپ کو ... ہم پر اپنی پیمائش منکشف ہوئی تھی، اور کل رات ہم ... ہو گئے تھے۔ ہم نے اپنے بھائی کو خدا کے حوالے کر دیا تھا ... چارہ گروں سے کہہ دیا تھا کہ اب ہمیں بازار کے علاقے کی ... کوئی خبر نہ پہنچائی جائے۔ حالانکہ ہمیں مشورہ دیا گیا تھا۔ ... ہمارے خیراندیشوں نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہمارے ... بازار کے علاقے میں موجود ہیں۔ ہم ایک آخری تدبیر ... کیوں نہ اپنے وسائل حرکت میں لائیں۔ ہم ریاست ... پہرا بٹھا سکتے ہیں، دربار سے ہمارے آبا کی رفاقت ... اُس کے عظمت و جلال اور جاہ و حشم میں کچھ ہمارے آبا ... شامل ہے۔ ہم بجا طور پر امید کر سکتے تھے کہ ایک رعایت ... سے اپنی قدیم وفاداری کے صلے میں ضرور دی جائے گی۔ ہم یہ رکاوٹیں ... کھڑی کر سکتے تھے اور ہمیں خوب اندازہ تھا کہ اس کے نتائج کتنے ... سنگین ہو سکتے ہیں۔ ان چند دنوں میں کم از کم ہمیں یہ احساس ہو چلا تھا کہ ہم کن لوگوں کی طرف انگلی اٹھائیں گے۔ وہ لوگ جنھوں نے ... ہمیں محتاط رہنے کی طرح طرح تلقین کی ہے۔ انھوں نے بازار کے علاقے کا رُخ جان بوجھ کے کیا ہوگا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اُنھوں نے ... ہمیں کچھ باور کرانے ہی کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ ایک خدشہ ہمیں ... بدنامی رسوائی کا بھی تھا لیکن جہاں اس نوع کی کوئی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہو، وہاں رسوائی کیا اہمیت رکھتی ہے۔ ہمیں خوش گمانی تھی کہ اس شہر کے لوگ بازار کے علاقے سے وابستہ لوگوں کے مقابلے میں ہماری بات پر یقین کرنا چاہیں گے کیونکہ ہم یہاں ایک زمانے سے شرافت اور اعتبار کا کاروبار کر رہے ہیں۔ کوئی عجب نہیں کہ کسی دن ہم اپنے مشیروں کے فرمودے پر آمادہ ہو جاتے مگر رات ہم نے اپنے بزرگ کو دیکھ لیا تھا۔" نواب کا اشارہ پیرو کی طرف تھا۔ کہنے لگا۔ "ہم ایک شکست خوردہ کی حیثیت سے کوئی مجنونانہ قدم اٹھا لیتے لیکن ایک حقیقت ہم پر عیاں ہو چکی تھی کہ ہمارے مطلوب ہم سے بڑا ارادہ رکھتے ہیں۔ اُن کی ضد ہم سے قوی ہے اور جو بے سبب نہیں ہوگی۔ اس توانائی کے عقب میں کوئی بڑا یقین مضمر ہے۔ کسی بڑے سچ، کسی بڑے اصول کا یقین، اور چاہے ہم کچھ بھی کر لیں، اُن کی مرضی کے بغیر اُن سے کچھ نہیں جان سکتے۔ ہمیں خوشی ہے کہ وہ بدبخت لمحہ نہیں آیا، ہم نے سرے سے اس پر غور ہی نہیں کیا۔"

"آپ نے اچھا کیا نواب صاحب۔" بتّھل نے کہا۔

"مگر فردِ عمل بڑی طویل ہے۔ بہرحال، ہم نے بے کم و کاست سب کچھ بیان کر دیا ہے۔" نواب شکستہ آواز میں بولا۔ "اس رُوداد سے ہماری غرض و غایت اپنی تنگ دلی و کوتاہ نظری کا اظہار ہے۔ ہم سے کچھ بھی بعید نہ تھا اور ہم نے کل رات کے سواہت سا کینہ اپنے سینے میں بھر رکھا تھا۔ ہم نے یہ اقبال محض اس لیے کیا ہے کہ آپ ہمارے لیے کسی بہتر سزا کا تعیّن کر سکیں اور ہم سے کوئی رعایت روا نہ رکھیں۔"

"آپ، آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔" اباجان نے بے چینی سے کہا۔

"اپن لوگ کیا ابھی ایدر سے اٹھ جائے نواب صاحب؟" پیرو تند لہجے میں بولا۔

"نہیں، نہیں۔" بڑے نواب نے ہیجانی انداز میں کہا۔ "آپ ہمارے سر آنکھوں پر، مگر ہم آپ کو کیا بتائیں، ہمارا سینہ جیسے کوئی دھنک رہا ہے۔ یہ عجز نہیں، نہ یہ ہذیان ہے۔ ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے لیکن یہ سب بے اختیار زبان پر آگیا، آپ کو ضرور گراں گزر رہا ہوگا۔ خدا کے لیے ہماری یہ عرضِ حال کسی اندازِ بیان یا سخن آرائی پر محمول نہ کیجیے، معذرت اور معافی کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔ وہ خنجر خوش قسمتی سے آپ کو نہیں لگے جو ہم نے جانے کتنی بار آزمائے تھے۔ ہماری درخواست ہے کہ ہمیں سزا سے مستثنا کرنے کا رحم نہ کیا جائے۔ ہمارے لیے کوئی سزا تجویز کیجیے، کوئی عبرت ناک ۔ ۔ ۔ ۔"

"ابھی آپ، آپ کیسا بولتے ہو نواب صاحب!" پیرو نے اُمڈتی آواز میں کہا۔

"ہمیں احساس ہے کہ ہم کن لوگوں سے کس قسم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اُن لوگوں سے جن کے دل سمندر ہیں۔ آپ نے ہم سے بہت سلوک کیے ہیں، اب ایک سلوک اور کر دیجیے۔ ہمیں کوئی حکم دیجیے۔ بخدا ہم نظرِ ثانی کے لیے نہیں کہیں گے۔ بہتر ہے، ہم سے یہ اقبال ہی چھین لیجیے جو ہمیں صرف اپنا جلوہ دکھاتا ہے، جس نے اپنے سوا ہمیں سب سے دور کر رکھا تھا۔"

معلوم نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا، شاید اُسے خود بھی معلوم نہیں تھا مگر اُس کی آواز فریادی تھی۔ التجا میں کھوٹ ہو تو صاف نظر آجاتی ہے۔ مجھے وہ نواب یاد آرہا تھا جو پہلی بار ہم سے یہاں حویلی کے کمرے میں ملا تھا، پھر جو ہمارے زنداں میں ہمیں حکم دینے آیا تھا۔ وہ کوئی اور شخص تھا، اِس شخص کا کوئی بہروپ۔ مگر اس وقت بھی اُس میں کوئی آویزش نہیں تھی۔ سب بار بار کبھی بتّھل کی طرف دیکھتے تھے، کبھی اُس کی طرف۔ بتّھل دم بخود سا بیٹھا نواب کو گھور رہا تھا۔ کمرے میں جلتے فانوس کی روشنیاں جیسے دھیمی پڑ گئی تھیں، ہوا بھی بند بند سی معلوم ہوتی تھی۔ نواب کے عقب میں خاں صاحب سر جھکائے بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔

"ہمیں اپنا سارا جسم بندھا ہوا، جکڑا ہوا ۔ ۔ ۔" چند ثانیوں کے توقّف کے بعد نواب کی بھڑکتی ہوئی آواز دوبارہ کمرے میں گونجی۔

بتّھل یک لخت صوفے سے اُٹھ گیا۔ "ہم لوگ کا بھی تھوڑا دھیان کرو نواب! اتنا ہی بولو جتنا سُنا جا سکے۔" بتّھل کو اُٹھتا دیکھ کر نواب بھی بے قراری سے کھڑا ہو گیا۔ چند قدم کا فاصلہ تھا۔ بتّھل اُس کے سامنے جا کے ٹھہر گیا اور اُس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ نواب کا جسم بل کھا گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بتّھل کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ "آپ کیا بولتے ہو۔" بتّھل نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم کو جان کاری تھی۔ اِدھر ہم آپ سے جو جان کے گئے

تھے، ویسا آپ نے اپنے سے نہیں سمجھا۔ ہم کو سب پتہ تھا کہ ادھر آپ کتنے ہتھیار رکھتے ہو اور خون آپ کا کتنا گرم ہے۔ دادا نے ابھی ٹھیک بولا تھا، ہم آپ کے لیے ضرور نئے ہیں، آپ ہمارے لیے نہیں ہو۔ ہم کو ایسے اصیلوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ آپ نہیں جانتے تھے تو کیا ہوا خنجر اپنے نشانے کو بھی کچھ پہچانتا ہے۔"

سبھی اپنی نشستوں سے اُٹھ کے اُن کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ نواب کا قد بِٹھل سے خاصا کم تھا تاہم بِٹھل کے شانے سے اُوپر اُس کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ کہتے ہیں کہ چہرہ اندرونی کیفیات کا غماز ہوتا ہے۔ نواب کی بھنچی ہوئی آنکھیں، لرزتے پھڑپھڑاتے ہونٹ اور چہرے پر ہر آن بدلنے والی لکیریں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں گی۔ بِٹھل نے اپنا حلقہ اور تنگ کر لیا اور نرم آواز میں بولا "ہم لوگ تو سزا پانے کے لیے ہیں، سزا دینے والے دوسرے ہیں۔ پر آپ کا ایسا بولنا ہی اپنے لیے بہت ہے۔ ہم اِدھر لوٹ کے یوں ہی نہیں آ گئے ہیں۔ آپ کو اور چھوٹے صاحب کو دیکھ کے گئے تھے اس لیے آئے ہیں۔ پتہ تھا کہ کدھر واپس جا رہے ہیں۔ ذرا بھی آپ کے ہاں دھبا اپنے کو دکھائی پڑتا تو پھر دوسری طرح ہی آتے۔" بِٹھل نے اُسے تھپتھپاتے ہوئے کہا "اب کچھ اور مت بولنا نواب! پھر ہم اِدھر نہیں ٹھہریں گے۔ سمجھیں گے تم اپنا ہی پلّا بھاری رکھنا چاہتے ہو۔"

جواب میں نواب نے زور سے بِٹھل کو بھینچ لیا اور اپنے سسکتے ہونٹوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

بِٹھل نے کچھ دیر بعد نواب سے جانے کی اجازت کے لیے کہا تھا۔ کہا تھا کہ رات بہت ہو گئی ہے، سب کل صبح پھر آ جائیں گے۔ اُس نے خانم کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ خانم یہیں رہے گی مگر بِٹھل کی زبان سے جانے کا ذکر سُن کے نواب اور مضطرب ہو گیا "اتنی عزت دے کر آپ ایسے چلے جائیں گے؟" اُس نے کچھ سننے سے انکار کر دیا اور شکایتی لہجے میں بولا "جیسا کہ ہمارا قیاس ہے، آپ سب حضرات اس شہر میں مسافر ہیں۔ یقیناً کسی جگہ ٹھہرے ہوں گے مگر اب کہیں اور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ گھر ہوتے ہوئے ہمارے عزیز، ہمارے محسن کہیں اور قیام فرمائیں۔" اُس نے حتمی انداز میں فیصلہ صادر کیا کہ اب ہم جب تک اس شہر میں رہیں گے، یہیں قیام کریں گے۔

ابا جان نے اُس سے نہیں چھپایا کہ وہ کسی ہوٹل میں مقیم نہیں ہیں، اس علاقے میں کچھ فاصلے پر اُنھوں نے حال ہی میں ایک حویلی خریدی ہے، سب اُسی میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی ہماری واپسی کے منتظر ہوں گے مگر نواب پہلے سے ہر بات کا جواب موجود تھا۔ کہنے لگا کہ سب کو بھیج جائے گا ورنہ انھیں اطلاع پہنچا دی جائے گی۔ کانتے اور زورا تک خاموش بیٹھے رہے تھے، انھوں نے بھی دبے لہجے میں سے منت کی کہ سر دست انھیں جانے ہی دیا جائے مگر نواب جیسے سُنا ہی نہیں۔ اُس کے التجا آمیز اصرار کے آگے انکار کی نہیں تھا۔ بِٹھل کے پس و پیش پر وہ اداسی سے کہنے لگا "آپ یہ سمجھیں کہ ہم اپنے محسنوں کے دل میں اعتبار قائم کرنے میں رہے ہیں؟"

اسی اثنا میں خاں صاحب لپکتے ہوئے باہر گئے تھے واپس آ گئے اور آ کے انھوں نے توشہ تیار ہو جانے کی اطلاع کسی کو بھی بھوک نہیں لگ رہی ہو گی لیکن جب نواب نے دوسرے کمرے میں چلنے کی درخواست کی تو اُس نے کوئی رد بھی نہیں کی۔ دوسرے کمرے میں روشنی بکھری ہوئی تھی۔ ہر رنگ برنگے شیشے جڑی دیواروں سے روشنی جیسے پھوٹی پڑ قالین کے فرش پر وسط میں وسیع دسترخوان بچھا تھا اور ہر کی خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں۔ بڑے نواب اور خاں صاحب ہم کُل دس افراد تھے لیکن دسترخوان اور اُس پر سجے ہوئے ط کے کھانے دیکھ کے کسی برات کے کھانے کا گمان ہوتا تھا۔ بے آواز قدموں سے اِدھر اُدھر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے طرف آفتابے ہاتھوں میں اُٹھائے دو خادمائیں بھی موجود تھ وہیں سلپچیاں رکھی تھیں۔ اُدھر خاں صاحب سرگوشیوں میں دینے میں مصروف تھے۔ دسترخوان پر نواب کی نگاہیں ہم پر تھیں۔ کچھ تو اُس کی ترغیب اور نگہ داری اور کچھ کھانوں کی خواہش نہ ہونے کے باوجود سبھی نے کچھ نہ کچھ کھایا۔ شیرینی کی قاب کے جانے کیوں میری نظریں وہ حلوہ ڈھونڈنے لگی تھیں جو نواب کی بیگم اور بہن نے چپکے سے ہمیں زنداں میں بھجوایا تھا۔ بھی اُس کا ذائقہ نہیں بھولا ہو گا۔ میں نے کن انکھیوں سے اِدھ نظر دوڑائی لیکن وہاں حلوے کی قاب نہیں تھی۔

کھانے کے بعد ہم دیوار سے لگی ہوئی آرام کرسیوں پر گئے۔ تین نوجوان لڑکیاں ایک جیسے لباس میں نمودار ہوئیں۔ ا ہاتھوں میں پھل، فنجان اور چائے دانیوں کے طشت تھے۔ تین سر ڈھکے ہوئے تھے اور چھوٹا سا گھونگٹ نکلا ہوا تھا۔ لمبے چھوٹی مُہری کے پاجامے اور چادر نما دوپٹوں میں اُن کا سارا

چھپا ہوا تھا۔ تینوں کی رنگت بھی تقریباً ایک جیسی تھی۔ جیسے سانولے میں چمپئی رنگ کی آمیزش ہو گئی ہو۔ اُن کا رنگ رُوپ دیکھ کے بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خادمائیں ہوں گی۔ ڈری ڈری سہمی سہمی سی۔ نگاہیں جھکی جھکی۔ اُنھوں نے نفاست سے طشت ہمارے سامنے کی میزوں پر رکھ دیے اور جب تک نواب نے انھیں جانے کا اشارہ نہیں کر دیا، ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑی رہیں۔ نواب نے اپنے ہاتھوں سے فنجانوں میں قہوہ انڈیلا۔ یہ شکر کے بغیر پیا جانے والا عربی قہوہ تھا۔ میں نے ایک بار بمبئی میں کرشنا جی کے ساتھ پیا تھا۔ پچھلے کمرے کی نسبت یہاں کی فضا یکسر بدلی ہوئی تھی۔ نواب بھی اب نسبتہً ٹھہرا ٹھہرا لگ رہا تھا۔ اُس کے لب و لہجہ میں بھی شگفتگی لوٹ آئی تھی۔ سبھی کا کچھ یہی حال تھا، میرا بھی۔ مجھے بھی اپنے دست و بازو کھلے کھلے محسوس ہو رہے تھے۔ نواب نے اب تک ہمارے بارے میں کچھ جاننے کی جستجو نہیں کی تھی۔ یہ کیسی عجیب بات تھی کہ اُسے اپنے ان مہمانوں کے نام بھی ٹھیک طرح معلوم نہیں تھے جن کی خوشنودی و خاطر داری کے لیے وہ بہت مستعد اور بے تاب نظر آتا تھا۔ ظاہر ہے یہ درگزری دانستہ ہو گی اور مقصد ہماری دل داری کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ ایسے ہر سوال و جواب سے اجتناب ہی مناسب تھا جس میں مہمانوں کے لیے سرگرانی کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ یہ رسم اُس نے ہم پر چھوڑ دی تھی مگر ایسا کوئی موقع آتا تو جانے ہم سب کیسے ایک دوسرے کا تعارف کراتے۔ ابا جان اور منیر علی کی بات دوسری تھی لیکن بِٹھل، پیرو، کانتے، زورا اور خود میرے بارے میں کیا اُسے سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا کہ ہمارا تعلق باقاعدہ اڈّوں سے ہے اور اب اڈّوں پر پہچانے جانے والے نام ہی ہمارے نام ہیں۔ تاہم نواب کی گفتگو میں مغائرت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی بیٹھا رہا حالانکہ خانم کی آمد کے بعد اُسے اپنے چھوٹے بھائی کا حال جاننے کی بے چینی ہونی چاہیے تھی۔

بارہ سے اُوپر ہو گئے ہوں گے۔ نواب حویلی کی نقاشی کے بارے میں ابا جان کے کسی سوال کا جواب دے رہا تھا کہ اُسے خیال آیا اور وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "اتنی رات ہو گئی ہے، ہمیں آپ کی خلوت کا دھیان ہی نہیں رہا۔" پیرو نے مسکرا کے کہا بھی کہ اپنے لیے دن رات کی بندش نہیں ہے۔ وہ اپنی بات جاری رکھے لیکن نواب اُسے پیرو کا تکلف سمجھا اور متانت سے بولا "ہم ایک گزارش کرنا چاہتے ہیں۔" سب اُس کی جانب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ نواب نے شائستگی سے کہا "حویلی میں مہمانوں کے لیے مہمان خانہ الگ موجود ہے لیکن ہماری خواہش ہے آپ حضرات حویلی کی عمارت میں ہمارے ساتھ قیام فرمائیں۔" اُس نے خود ہی جھجکتے ہوئے وضاحت کی کہ اُس کی نظر میں ہماری حیثیت دیگر مہمانوں سے مختلف ہے۔ اُسے خوشی ہو گی اگر ہم حویلی میں اُس کے عزیزوں کے مانند ٹھہریں، یہ جان کے کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے، اس گھر کی ہر چیز پر ہمیں تصرف حاصل ہے۔ وہ ڈبڈبائی آواز میں کہنے لگا کہ جن لوگوں نے اس گھر کے سکھ کا اس قدر خیال کیا ہے، اُن کی قدر و منزلت کے لیے نہ ہمارے پاس لفظ ہیں، نہ اُن کی خدمت و خاطر کے لیے جرأت و ہمت۔ "ہم آج خود کو بہت بے وسیلہ محسوس کر رہے ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ یہ ساری حویلی کھلی ہے، جہاں آپ چاہیں، جب تک چاہیں، رہیں۔ ملازمین سے کہہ دیا گیا ہے کہ پہلی بار ایسے مہمان آئے ہیں جن کا مرتبہ اُن کے آقا سے بلند ہے۔ وہ لوگ آئے ہیں جنھوں نے اس گھر کی شادمانی کے لیے بہت ایثار کیے ہیں جنھیں دوسروں کے دُکھ درد کا ایسا احساس ہے،" نواب کی آواز بھرّانے لگی۔ نزدیک و دُور موجود خادماؤں اور ملازموں کا بھی اُسے لحاظ نہیں رہا تھا، کہنے لگا "ہم نے اس گھر کی خواتین سے کہہ دیا ہے کہ نووارد مہمانوں کے لیے زنان خانے کی کوئی بندش نہیں ہونی چاہیے۔ جن لوگوں نے اس گھر کو زندگی کی نوید دی ہے، جو اپنے گھر کی آبرو، خانم بی بی کو یہاں لا سکتے ہیں، کسی بڑی قدر کے لیے اُسے ایسی نازک صورتِ حال سے دوچار ہونے پر آمادہ کر سکتے ہیں جنھوں نے ایک روٹھے ہوئے اجنبی کو منانے اور ایک برگشتہ شخص کی نشاطِ خاطر کے لیے اتنا بڑا حوصلہ کیا ہے۔ وہ اس گھر کے ہر فرد کے لیے واجب احترام ہیں۔ اُن کے سامنے کسی چلمن سے مغائرت کا گمان ہو سکتا ہے۔ ہمیں اندازہ ہے کہ خانم بی بی نے کن لوگوں کے ہاں جا کے پناہ لی ہے۔ وہ گھر کیسا عزت مند، احترام کے لائق ہو گا جس کے پاسبان ایسے ہوں جنھیں رشتوں کی یہ پاسداری آتی ہو اور جو اپنے عہد کے، کسی شخص سے کیے گئے عہد کے لیے اتنی دور تک جا سکتے ہوں۔ ہمیں اندازہ ہے کہ خانم بی بی کسی بڑے گھر سے آئی ہیں۔"

کسی نے اُسے نہیں ٹوکا اس لیے کہ ٹوکنے پر اُس کے بکھرنے، بپھر جانے کا خدشہ تھا۔ اُسے خود ہی احساس ہوا اور اُس نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی لیکن جیسے اُسے پھر کچھ یاد آ گیا، ایک تامّل کے تذبذب کے بعد وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا "مال و زر آپ نے ٹھکرا دیا ہے، جو زندگی بھر ہمیں فریب دیتا رہا۔ ہم سوچتے ہیں، ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟"

"بہت ہے، بہت ہے نواب صاحب!" اُبیردو نے تیزی سے کہا اور بتھل کی جانب دیکھتے ہوئے بولا "آپ ایسا سمجھتے ہو، اتنا ہی اپن کے لیے زیادہ ہے۔"

ابھی نواب اور بھیڑنا گر خاں صاحب نے بروقت مداخلت کی اور مودّبانہ کہا "بالائی منزل پر مہمانوں کی خلوت کا اہتمام کر دیا گیا ہے۔"

"ہاں، ہاں، بے شک۔" نواب نے ندامت سے کہا "ہم تو بھول ہی گئے، اس دوران رات اور نکل گئی۔ بالائی منزل نسبتاً ہوا دار اور پُرسکون ہے۔ ہم سے پوچھا جاتا تو ہم بھی وہی جگہ تجویز کرتے۔ شاید آپ حضرات کو بھی پسند آئے۔ بصورتِ دیگر کوئی تکلف نہ کیجیے گا۔"

وہ اُٹھ گیا۔ اُس کی معیت میں ہم بھی کمرے سے نکل آئے۔ پاس ہی خم دار زینہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں کا روشن زینہ۔ دونوں طرف دیواروں پر نقاشی کی گئی تھی اور اُوپر تک سُرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ نواب نپے تلے قدموں سے سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ کانتے میرے پہلو بہ پہلو تھا۔ میں جانے کس خیال میں تھا، اُوپر پہنچ کے اُس نے زور سے میرا ہاتھ دبایا، میں ہڑبڑا گیا۔ اُوپر آ کے واقعی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کسی اور عمارت میں آ گئے ہوں۔ بالائی منزل کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ ہمارے سامنے صحن کے بیچ میں فرش سے ایک بالشت بلند وسیع و عریض بیضوی چبوترے پر سبزہ زار کھلا ہوا تھا اور پھولوں کے تختے تھے۔ سبزہ زار کے وسط میں ایک حوض تھا، اُس میں ایک بڑا مجسمہ نصب تھا۔ چار سمتوں سے چار نوجوان لڑکیاں لہراتی ہوئی باریک قبائیں پہنے بے نیازانہ، صراحیوں سے پانی انڈیل رہی تھیں اور نیچے اُن کے گھٹنوں تک آتے دو زانو بیٹھے ہوئے متعدد مرد پانی کے لیے ترساں تھے۔ چبوترے سے پرے سنگِ مرمر کے بھاری بھاری ستونوں کا بڑا دلان تھا اور دُور دالان میں فاصلے فاصلے سے بنے ہوئے جھروکوں کی دیواروں کے پیچھے کمرے نظر آ رہے تھے۔ دالان کے سارے فرش پر اس طرح نقاشی کی گئی تھی جیسے پھول بکھرے ہوئے ہوں۔ سب مجسمہ دیکھنے کے لیے رُک گئے، مجسمہ دودھیا روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ لڑکیوں کے پانی انڈیلنے کا انداز ایسا دل نشیں تھا کہ بےساختہ آدمی کا جی چاہے کہ ان کے گرد بیٹھے ہوئے پیاسے مردوں میں شامل ہو جانا چاہیے۔ مجسمے کا شبہ تو اُس کے سفید رنگ سے ہوتا تھا ورنہ ایسا لگتا تھا جیسے بس ابھی ابھی انھیں پتھر کر دیا گیا ہے اور ایک پل میں یہ متحرک ہو جائیں گے۔ ابّا جان حیرت زا نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ نواب سے ضرور کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن نواب آگے بڑھ چکا تھا۔ دالان عبور کر کے ہم جھروکوں کے پیچھے آ گئے اور نواب سامنے کے ایک بڑے دروازے میں داخل ہو گیا جو مخملی پردوں اور سازوسامان سے مرصع تھا۔ کسی راجا کی خلوت گاہ کا منظر بھی زیادہ کیا ہو سکتا تھا۔

"مکینوں کے حسین ذوق کے بغیر یہ نفاست ناممکن ہے" منیر علی چُپ نہ رہ سکے اور تمتماتے لہجے میں بولے "اچھی چیز کے دل کتنا خوش ہوتا ہے۔ سب کسی مصوّر، کسی شاعر کا خواب ہوتا ہے۔"

"آپ نے درست فرمایا۔" نواب یاسیت سے بولا "یہ ہمارے اُسی حرماں نصیب بھائی کی کارستانی ہے۔ تعمیر کی ابتدا اختتام تک ہماری حیثیت تو محض ایک تماشائی کی رہی۔ یوں کہ گوشہ گوشہ اُس نے اپنے ہاتھ سے تراشا ہے۔ نقشے بنانا، اُن رنگ بھرنا پھر انھیں مسترد کر دینا اور نئے زاویے سے پھر ترتیب یورپ میں تعلیم کے دوران اُسے شاہی محلات غور سے دیکھنے کا مل گیا تھا لیکن وہ تو عموماً یورپ جانے والے دیکھ کے آتے ہی اصل چیز تو مشاہدے کی ہے، کون کتنا اخذ کرتا ہے۔ کوئی برسوں کُھلی رکھنے پر کچھ حاصل نہیں کر پاتا، کسی کے لیے ایک جھلک ہوتی ہے۔ بچپن ہی سے اُس کی حسّیات کا عالم دگر تھا۔ ہمیں یاد ہے، اُس وقت اس کی عمر بارہ سال ہوگی، اسکول میں زیرِ ایک روز ہمیں اُس کے ذوقِ شعرگوئی کا علم ہوا۔ موسمِ بہار پر اُس ایک مرصع نظم سُن کے ہم سب حیران رہ گئے تھے۔ اچھے شعر کہنے لیکن سب کچھ اپنے آپ تک محدود رکھا۔ اُسی زمانے میں مصوّری شوق ہوا اور صرف مصوّری کے مطالعے اور تصویریں دیکھ دیکھ کر پختہ تصویریں بنانی شروع کیں کہ لوگ یقین نہیں کرتے تھے۔ میں تصویروں کی نمائش گاہیں دیکھ کے یہ شوق اور فزوں ہوا۔ کو شاید تعجب ہو کہ یہاں نقاشی کا جتنا کام نظر آ رہا ہے، سب کے بنائے ہوئے خاکوں کا کرشمہ ہے، حتّاکہ خطّاطی بھی۔ موسیقی باب میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ہمارے خاندان کو موسیقی سے ایک شغف رہا ہے۔ والدِ مرحوم کی حیات تک یہاں نامی گرامی استاد جمع ہوتے تھے۔ اُن کے بعد اُسی نے یہ روایت زندہ رکھی۔ اُس نے اتنی جلد جانے کہاں سے ایسا درک حاصل کر لیا تھا کہ پھر وہی جمگھٹ ہونے لگا۔ ہم آپ سے کیا عرض کریں کہ ہمارا کن گوناگوں صفات کا حامل ہے۔ ہم پانچ بھائی تھے، بہن صرف تھی۔ اب ہم صرف دو رہ گئے ہیں اور چھوٹی بہن سلامت ہے۔ عالم تاب ہمارا بھائی ہے لیکن یقین کیجیے، ہم نے اُسے اولاد کی

پرورش کیا ہے۔"

نواب ابھی تک رُکا ہوا تھا، چھوٹے نواب کے ذکر میں وہ ایسا کھو گیا تھا کہ اُسے اپنے اردگرد ہمارے کھڑے رہنے کا احساس بھی نہ رہا۔ بھائی کے نام پر اُس کی آواز ڈگمگانے لگتی تھی۔ سب گم صم کھڑے تھے۔ نواب کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو ابّا جان نے اُس سے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ ابّا جان کی دخل اندازی پر اُس کے جُھکے ہوئے شانے سیدھے ہو گئے اور وہ پشیمانی سے بولا "ہمیں وقت کا پھر خیال نہیں رہا۔ آئیے ہم آپ کو آپ کے کمروں تک پہنچا آئیں۔ باقی باتیں ان شاء اللہ صبح ہوں گی۔"

وہ مُڑ کے کمرے کے وسط میں ایک کُھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا کہ معاً ابّا جان نے اُس کا شانہ تھام لیا "نواب صاحب! آپ زحمت نہ فرمائیے۔ ہم خود کمرے تلاش کر لیں گے اور یہ خاں صاحب قبلہ تو راہ بری کے لیے موجود ہیں ہی۔ قطع کلامی سے مراد یہی تھی کہ آپ تشریف رکھیں۔ ہماری فکر نہ کیجیے۔ ہم میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ البتّہ آپ کی بے آرامی کا۔۔۔"

"اب کیسا آرام۔" نواب شکستگی سے بولا "ہم تو اب عادی ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنی نیند لیے تو دن گزر گئے لیکن، لیکن آج ضرور سکون سے سو سکیں گے۔"

ابّا جان اُس کا بازو تھامے تھامے اُسے کمرے میں ایک جانب پڑی ہوئی بڑی بڑی کرسیوں کی طرف لے آئے۔ جب تک ہم سب بیٹھ نہیں گئے، نواب کھڑا رہا۔ اسی اثنا میں خاں صاحب نے ہم سے مشروبات وغیرہ کے لیے پوچھا لیکن سب نے شدّومد سے منع کر دیا۔ کرسی پہ بیٹھے بیٹھے نواب صاحب کا سینہ ہانپ رہا تھا۔

"تو یہ سب چھوٹے نواب صاحب کی فسوں طرازی ہے۔" منیر علی نے اشتیاق سے کہا۔

"جی۔" نواب اُکھڑی ہوئی سانسوں سے بولا "سب اُسی کی خلّاقی و خیال پردازی ہے۔ اُس کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا اور ہم سے تو یہ قطعی ممکن نہ تھا۔ یورپ میں چار سال گزارنے کا موقع ہمیں بھی ملا ہے اور سیر و سیاحت ہم نے بھی خوب کی ہے مگر ہم وہ امتیازی نقوش اپنے ذہن پر ثبت نہیں کر سکے جو عالم تاب نے محفوظ کیے تھے۔ یہاں واپس آ کے ہمارے مشاغل بھی مختلف رہے، شکار، مطالعہ اور جاگیر وغیرہ کے انتظامات۔ عالم تاب کو جاگیر کے بکھیڑوں سے کبھی سروکار نہیں رہا لیکن اپنے خاندان کی انفرادیت قائم رکھنے اور نام روشن کرنے میں جو کچھ عالم تاب نے کیا ہے، ہم سے اس کا عشرِ عشیر بھی نہ ہو سکا۔ اُس کے بغیر عمارت کی کوئی بھی حیثیت ہو سکتی تھی مگر یہ نہیں جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ جب مکمل ہوئی تو دُور دُور تک شہرہ ہوا۔ کئی نوابوں نے عالم تاب سے اپنی عمارتوں کی تعمیر کے لیے مشوروں کی درخواست کی۔ ہمارے عم زاد نواب حشمت جنگ تو گویا عالم تاب کو باقاعدہ گرفتار کر کے لے گئے۔ اُن کی حویلی بھی خوب ہے، کبھی آپ کو دکھائیں گے۔" سب نے ابّا جان کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش ہی رہے، اُنھوں نے نواب سے نہیں کہا کہ وہ مذکورہ حویلی دیکھ چکے ہیں۔ "پھر سلسلہ دربارِ سرکار تک جا پہنچا۔" نواب نے بات جاری رکھی "نئے محلات کے لیے عالم تاب کے پاس سواریاں آنے لگیں۔"

"اس عمارت کو بھی محل ہی کہنا چاہیے۔" ابّا جان نے قدرے اُونچی آواز میں کہا "کوئی محل بھی اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔"

"ہاں! مگر اب تو کچھ بھی نہیں۔" نواب بجھے ہوئے لہجے میں بولا "اب تو یہ سب ہمیں کھنڈر نظر آتا ہے، جیسے ان در و بام کی روح کوئی کھینچ کے لے گیا ہو۔ عرصے سے کوئی محفل آرائی نہ ہو سکی۔ ایک وقت تھا کہ یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی تقریب برپا ہوتی رہتی تھی۔ ہر وقت ایک جشن سا رہتا تھا۔ عالم تاب کی حالت جب سے بگڑی ہے، حویلی کے مکین گوشہ نشیں سے ہو گئے ہیں۔ لوگوں کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی ہے۔ اب یہاں حکیم ڈاکٹر آتے ہیں، چند عیادت کرنے والے یا یہاں کے ملازمین ہیں۔ معلوم ہوتا ہے حویلی کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ عمارت کا ہر گوشہ اپنے خالق کو پہچانتا تھا اور اب اُس کی کبیدہ خاطری پر سوگوار ہے۔ ہمیں تو بہت بعد میں علم ہو سکا۔ ہم سے چھپایا گیا تھا۔ ہماری بہن نے ہم سے چھپایا تھا، امّی جان نے بھی ہمیں خبر نہ ہونے دی پھر جب ہمیں علم ہوا تو وقت بہت نکل چکا تھا اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ عالم تاب جو سخن سر تھا وہ کسی سخن کا اسیر کیسے ہو گیا۔ بہت دنوں سے ہمیں اُس کا رنگ متغیّر معلوم ہو رہا تھا۔ بہت دنوں سے ہم محسوس کر رہے تھے کہ عالم تاب بزم آرائیوں سے کچھ اُکتانے لگا ہے لیکن ہم نے جانا کہ یہ ایک عارضی امر ہے۔ اب وہ عمر کی اُس منزل میں ہے جہاں ایک ٹھہراؤ آ جانا چاہیے۔ ہمارے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ ہم سے زیادہ بھی کوئی اُسے عزیز ہو سکتا ہے۔ خاں صاحب نے جب ہمیں بتایا اُس وقت ہمارے اختیار میں کچھ نہ رہا تھا ورنہ ہم خود خانم بی بی کے ہاں جا کے عاجزی کر لیتے تاہم ہم نے اپنی جیسی ہر کوشش کر لی۔ عاملوں اور غیب دانوں پر ہمیں کبھی اعتبار نہیں تھا لیکن ہم نے اُنھیں بھی آزما کے دیکھا۔ جس جس مسیحا نفس کی نشان دہی

کی گئی، ہم نے اُس کی خدمت میں حاضری دی لیکن ہوا وہی جو ہمارے لیے طے کر دیا گیا تھا۔ ہر دوا بے اثر ٹھہری، ہر تدبیر بے سود قرار پائی۔ عالم تاب اپنے آپ میں گم، اپنے ہم نفسوں سے بے نیاز ہوتا گیا۔ طبیبوں نے مشورہ دیا کہ اب عیادت کرنے والوں سے معذرت کر لینی چاہیے کیونکہ اُن کی آمد عالم تاب کے لیے اور سرگرانی کا سبب بن سکتی ہے۔ ہمارے لیے یہ انکار مشکل تھا لیکن ہم نے اپنے احباب اور اعزا سے معافیاں مانگ لیں۔ ہم اُس کے لیے ایک چاند سی دُلھن لائے تھے۔ پہلے تو وہ سرے سے شادی پر آمادہ نہیں ہوتا تھا لیکن امّی جان اور ہماری ضد پر بہر حال اُس نے سپر ڈال دی۔ دُور و نزدیک ہماری نظر ایک ہی لڑکی پر تھی جو رشتے میں ہماری عم زاد ہوتی ہے، ہمارے بھائی حشمت جنگ کی ہمشیرہ۔ ہم نے حشمت بھائی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو شش و پنج میں پڑ گئے۔ گیتی کے لیے خاندان کے ایک بزرگ پہلے سے کسی ذی قدر صاحب زادے کے لیے تجویز پیش کر چکے تھے۔ گیتی کو دربار ہی میں کسی شہزادے کے محل کی زینت بننا چاہیے تھا مگر حشمت جنگ ہماری بات کیسے مسترد کر سکتے تھے۔ خود عالم تاب کو وہ عشق کی حد تک چاہتے ہیں۔ مان گئے اور ہم بہت دُھوم دھام سے گیتی کو دُلھن بنا کے لائے۔ گیتی کو سُکھ کے چند سال، دو ڈھائی سال ہی دیکھنا نصیب ہوئے تھے کہ عالم تاب پر یہ گانگی چھا گئی۔ اُسے اپنی ضعیف ماں کا بھی خیال نہ رہا، اپنے بڑے بھائی کا بھی نہیں، جس نے پہلے ہی کم صدمے نہیں سہے۔ اُسے معلوم ہے کہ اُسے دیکھے ہوئے دیر ہو جاتی ہے تو ہمارا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اُسے سب کچھ معلوم تھا پھر اُس نے ہمیں اتنی بڑی آزمائش میں کیوں ڈالا، بھلا بھائی ہم سے۔۔۔۔" نواب اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا، اُس کی آواز حلق میں ڈوب گئی۔

ابّا جان نے تسلّی کے دو لفظ کہنے چاہے تو اُس کی سسکیاں نکل پڑیں۔ سب پریشان ہو گئے۔ نواب کی طرف نگاہ نہیں اُٹھائی جا رہی تھی، اُس کا وجود ریت کا ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ میری آنکھیں بھی جلنے لگی تھیں۔ نواب نے اپنا چہرہ رومال سے چھپا لیا تھا اور بچے کی طرح ہڑک ہڑک کے رو رہا تھا۔ شاید بہت دنوں سے اُس کے آنسو رُکے ہوئے تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں جھپٹ کے اُسے گلے لگا لوں۔

"ایسا، کبھی ایسا ہی پھیر ہو جاتا ہے نواب صاحب!" پیرو نے اٹکتی زبان سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ "آدمی دوسرے کو کیا، اپنے آپ کو بھی دکھائی نہیں دیتا پر تسلّی رکھو، ابھی سب دُور ہو جائے گا۔ سب ابھی ایک دم ختم سمجھو نواب صاحب!"

"ہاں نواب صاحب!" ابّا جان اُمڈتی آواز میں بولے "حوصلہ رکھیے، آپ نے تو خود ابھی فرمایا ہے کہ سب کچھ لکھا ہوا، اپنا لکھا ہوا مٹانے کی قدرت بھی اُسی کو ہے۔ آدمی اپنی سی کرتا ہے لیکن وقت کی گردش کس نے روکی ہے۔ کبھی کوئی شخص کسی کو۔۔۔" جانے کیوں ابّا جان کی آواز کپکپانے لگی اور اُنھوں نے اپنے ہونٹ سی لیے۔ میری طرف اُنھوں نے نہیں دیکھا تھا لیکن میرا سارا جسم لرز کے رہ گیا۔ ضرور اُن کا اشارہ میری طرف تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہوں گے کہ کبھی کوئی شخص سارے رشتے ناتے توڑ کے ایسے ہی کسی پر چھا جاتا ہے، کبھی کوئی شخص کسی کے اتنا قریب آ جاتا ہے کہ اُس کی اوٹ میں ساری دنیا اوجھل ہو جاتی ہے۔ گویا ابّا جان کو احساس ہو چلا تھا۔ اتنے عرصے زمانے کی نیرنگیاں دیکھ کے، دربدر کی خاک چھان کے اُن کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی۔ کاش وہ اُسی رات کچھ جان لیتے جب کورا اُن کے گھر میں پناہ حاصل کرنے آئی تھی۔ میں نے اُن سے اصرار نہیں کیا تھا۔ میں اُن کے سامنے یہ بات کس طرح کہہ سکتا تھا کہ کورا مجھے بہت اچھی لگتی ہے مگر اُنھیں خود بھی تو کچھ جاننا چاہیے تھا۔ بڑا نواب کہہ رہا تھا کہ اگر اُسے وقت پر خبر ہو جاتی تو وہ خود خانم کے در پہ حاضری دیتا۔ ابّا جان نے تو کورا کو گھر سے نکال دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اُن کے فیصلے میں ذرا بھی لچک نظر آتی تو میں گھر سے نکلنے پر کیوں مجبور رہتا، پھر کچھ نہ ہوتا۔ نہ مجھے سات سال جیل کاٹنی پڑتی، نہ بھرا گھر اجڑتا، نہ امّی کو بے وقت موت آتی اور نہ فمی۔۔۔ ابّا جان کو کبھی اپنی بیوی، بیٹی، اپنے گھر کی یاد آتی ہو گی مگر اب اس سے کیا حاصل۔ امّی اور فمی تو لوٹ کے نہیں آ سکتی تھیں۔

کمرے میں نواب کی گھٹی گھٹی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ پیرو اور ابّا جان کی تسلّیاں مہمیز ثابت ہوئیں۔ اگر وہ بٹھل کی طرح بے حس و حرکت بیٹھے رہتے تو شاید نواب کا یہ حال نہ ہوتا۔ اُسے تو بس اشارے کی دیر تھی۔

ہم بھرے بیٹھے ہیں یوں راگ میں جیسے باجا
اِک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے!

پیرو واقعی بھول چکا تھا کہ کل رات تک ہم اسی حویلی میں قید تھے مگر خود میرا جی بھی نواب کو تھامنے، کسی طرح اُس کے آنسوؤں کا سیلاب روکنے کے لیے اُمڈ رہا تھا۔ نواب کی آواز میں سوز ہی ایسا تھا کہ وہ آدمی کی رگوں میں اُتر جائے۔ میں تو ابّا جان اور منیر علی کی وجہ سے سمٹا بیٹھا رہا۔

بہت دیر بعد نواب کو ہوش آیا مگر پیرو، منیر علی اور ابّا جان کی تشفیوں سے کم اور خاں صاحب کی دخل اندازی سے زیادہ۔ خاں صاحب دیر تک نواب کی کرسی کے عقب میں بیٹھے رہے۔ پہلے اُنھوں نے جان کے نواب کو نہیں ٹوکا ہو گا کہ آنسو تو جسم میں سلگتی آگ کی طرح ہوتے ہیں، اُن کا بہہ جانا ہی ٹھیک ہوتا ہے، اور ایسے لوگ روتے کب ہیں۔ سُنا ہے، وہ ہر وقت بندھے ہوئے، جکڑے ہوئے رہتے ہیں اور ملازمین کے سامنے تو بالکل پتھر بن جاتے ہیں۔

معلوم نہیں، وہ سب کب تک وہاں بیٹھے رہے۔ ہم تینوں اُٹھ کے چلے آئے تھے اس لیے کہ بٹھل نے ہمیں اُٹھ جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ خاں صاحب نے ہمیں بالائی منزل کے دوسرے حصّے میں پہنچا دیا۔ یہ حصّہ پہلے والے حصّے سے ملحق تھا مگر بالکل مختلف۔ یہاں کا منظر ہی اور تھا۔ خاں صاحب نے میرے، کانتے اور زورا کے لیے الگ الگ کمرے تفویض کیے تھے۔ یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے کمرے لیکن اُن کے جاتے ہی ہم تینوں ایک کمرے میں چلے آئے۔ جس وقت ہم اُٹھ رہے تھے، ہمیں دیکھ کے نواب بھی کھڑا ہو گیا تھا مگر بٹھل اور ابّا جان نے اُسے روک لیا۔ کہا نہیں جا سکتا کہ ہمیں اشارہ کرنے میں بٹھل کی کون سی مصلحت تھی، وہ ہم تینوں کے پیچھے نواب سے کون سی بات کرنا چاہتا تھا یا اُس نے محض ہمارے آرام کی خاطر اپنے طور پر ہمیں آزاد کر دیا تھا۔ نواب کے سامنے سے اُٹھنے کو ہمارا جی نہیں کرتا تھا۔ ہر چند اُس وقت جب وہ نواب عالم تاب کی کیفیت کا ذکر کر رہا تھا اور خانم کا نام اُس کی زبان پر آیا تھا، مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اُسے ہمارے مابین رشتوں کا علم نہیں ہے، کہیں اُس کے مُنہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے جو میری اور ابّا جان کی موجودگی میں مناسب نہ ہو مگر نواب نے بہت احتیاط کی۔ کہیں بھی شائستگی کا دامن اُس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا۔

کمرے میں نیند نہیں آئی۔ ہم باہر نکل آئے۔ رات کا سنّاٹا ہر سُو چھایا ہوا تھا۔ اُس حصّے کے صحن میں بھی بڑا سا باغیچہ لگایا گیا تھا۔ طرز بدلی ہوئی تھی اور درمیان میں مجسّمے کی طرح کئی سمتوں میں پانی برسانے والا فوّارہ نصب کیا گیا تھا۔ سبزہ بھیگا بھیگا سا تھا اور فضا میں خنکی گھلی ہوئی تھی۔ زورا اور کانتے بھی میرے ساتھ سبزے ہی پر پھیل گئے۔ دونوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی، بس آسمان تکتے رہے۔ میرا جی بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں موندنے کی کوشش کی لیکن مجھے کسی غفلت کا احساس ہوا جیسے آنکھیں بند کرنے سے کوئی منظر نکل جائے گا۔ میرا دل بار بار دھڑ دھڑانے لگتا تھا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب یہ کاہے کی دھڑکن ہے۔ اب مجھے راستہ بدل جانے اور بمبئی پہنچنے میں دیر ہو جانے، بارہ دن نواب کی قید میں گزارنے کا پچھتاوا نہیں تھا۔ بے شک ان سب کے بدلے میں ایک شخص کی خوشی، ایک شخص کی زندگی بڑی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہم اچانک راستہ بدل کے حیدر آباد آنے کا ارادہ نہ کر لیتے تو خانم عالم تاب کو نہ ملتی اور جانے اُس پہ کیا گزر جاتی۔ مراد آباد میں مولوی صاحب کا پتہ ملنا تو ایک بہانہ تھا۔ اصل میں اس طرح نواب عالم تاب کی مراد بر آنی تھی۔ کہتے ہیں، طلب کا سچّا ہونا لازم ہے، اسباب خود بہ خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو میری طلب میں کوئی کھوٹ ہی ہو گی اور وہی کورا کو مجھ سے دُور کیے ہوئے ہے مگر یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں تو جب سے، اُس رات سے جب سے کورا مجھ سے جدا ہوئی ہے۔۔۔ یہ تو میں جانتا ہوں، کم از کم میرے دل کا حال تو مجھ پہ عیاں ہے۔ میرا تو ہر لمحہ اُسی کے لیے دعا کرتا رہا ہے۔ اُس کی ایک ایک بات میرے دل پر نقش ہے۔ اُس رات کا ایک ایک واقعہ اور اُس سے پہلے اُس کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ، اُس کی باتیں، اُس کی صورت، اُس کی خوشبو، جب اُس نے ہوٹل کے کمرے میں میرے چہرے پر اپنے ریشم ایسے بال بکھیر دیے تھے۔ یہ سب کچھ میری آنکھوں میں کھُبا ہوا ہے۔ میں تو اُسے، اُس کی خوشبو سے پہچان سکتا ہوں۔ شب و روز میں کتنی بار مجھے اُس کی آہٹوں کا گمان ہوتا ہے۔ اگر کبھی کسی لمحے اُس کے اور میرے درمیان پردہ بھی حائل ہو گیا ہے تو پردے کے پیچھے وہی رہی ہے۔ بس یہ اتّفاق کی بات ہے یا قسمت کی۔ اگر ہم دلّی سے حیدر آباد کے لیے راستہ نہ بدلتے تو خانم عالم تاب کو نہ ملتی مگر سونیا تو بچ جاتی۔ سونیا کی موت اُسے کھینچ کے لائی تھی یا یہ نواب عالم تاب کی طلب کا اثر تھا۔

اوس نے سارے کپڑے بھگو دیے تھے لیکن نمی اچھی لگ رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کانتے اور زورا بھی سبزے پر کروٹیں بدلتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ کانتے نے اپنا بازو پھیلا کے میرے لیے تکیہ بنا دیا۔ میں نے بھی اُس کا سر اپنے بازو پر رکھ لیا۔ رات کا آخری پہر ہو گا۔ دونوں ابھی تک جاگ رہے تھے۔ میں نے اُن سے نہیں پوچھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ سوچ رہے ہوں گے دیکھیے آب و دانہ اب کہاں کھینچ کے لے جاتا ہے مگر آب و دانہ کیا، سب کچھ تو مجھ پر منحصر ہے۔ سوچتے ہوں گے کہ دیکھیں، اب کون

ساتماشا دکھانے کا سودا میرے سر میں سماتا ہے۔ بہر حال، چند دن کی گرہ اور رہ گئی تھی۔ کل پرسوں، قریب ہی کسی دن ہمیں بمبئی کے لیے روانہ ہو جانا ہے۔ انھیں جتلانے کی ضرورت نہیں تھی، میں نے پہلے ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ اب گھر کے سوا کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں اُن سے لاکھ منّت کروں کہ وہ میرے پیچھے کیوں آتے ہیں یا نہ آیا کریں مگر وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ میں نے اُن سے الگ جا کے بھی دیکھ لیا ہے۔ وہ میرے ساتھ نہیں تھے لیکن سب میرے لیے کیسے بے چین تھے۔ چمپا بیگم کی ایک اطلاع پر جھّل بمبئی دوڑا آیا تھا۔ جھّل کو مجھ پر اعتبار ہی نہیں ہے کہ میں تنہا اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہوں۔ میں انھیں کیسے روک سکتا ہوں کہ وہ میری پروا نہ کریں، میری وجہ سے کیوں اپنے دن اجیرن کرتے ہیں، میرا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔ بس یہی اُن کے قرار کے لیے مناسب ہے کہ میں اُن کے سامنے رہوں۔ میں اُن کے سامنے ہی رہوں گا۔ ابّا جان نے اب کہیں نہ کہیں تو مستقل بسنے کا ارادہ کیا ہوگا۔ اگر انھوں نے مجھ سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا تو میں فیض آباد کی رائے دوں گا۔ زرّیں کی حویلی بہت بڑی ہے، کئی خاندان سما سکتے ہیں ورنہ جہاں وہ رہیں گے، میں بھی اُنھی کے ساتھ رہوں گا پھر زرّیں اور نیلساں بھی لازماً ہمارے ساتھ رہیں گی۔ ممکن ہے ابّا جان نے یہیں حیدر آباد میں رہنے کا ارادہ کر لیا ہو۔ ممکن ہے نواب حشمت جنگ سے راہ و رسم بڑھانے کے علاوہ یہاں حویلی خریدتے میں اُن کی اس خواہش کو بھی دخل رہا ہو۔ ویسے ایک حویلی کی خریداری سے اُن کے لیے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ زرّیں کی حویلی کے تہہ خانے میں پتھروں سے اٹے کئی صندوق پڑے ہیں۔ ابھی تو اُنھوں نے صرف چند پتھر نکالے ہیں، سو ایک حویلی اس شہر میں بھی سہی۔ امیر لوگ ہر جگہ گھر بنا لیتے ہیں۔ بہر حال وہ کہیں بھی رہیں، میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔ کیا عجب کسی دن وہ یوں ہی اچانک مجھے مل جائے، کوئی ایسا حادثہ ہو جائے جیسے نواب عالم تاب کو خانم مل گئی۔ ہو سکتا ہے کبھی مولوی صاحب اُس کی نگہ بانی کرتے کرتے تھک جائیں اور اُنھیں میری یاد آجائے، اُنھیں خیال آجائے کہ وہ کسی کی امانت ہے۔ مجھ تک پہنچنا اُن کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ اُنھیں کلکتہ جیل سے جھّل کے اڈّے کا اور جھّل کے اڈّے سے فیض آباد کا پتہ معلوم ہو سکتا ہے لیکن انھیں میری جستجو ہو تبھی تو۔

میں رات بھر اپنے آپ سے سرگوشیاں کرتا رہا۔ وہی کچھ دہراتا رہا جو اشارے کنایوں میں دوسرے مجھے جتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی نہیں سمجھتا کہ آدمی اپنے آپ سے بھی بہت کچھ کہتا آپ کو بہت کچھ سناتا ہے۔ سب کچھ میری سمجھ میں آتا تھا لیکن سو کسی بھی لمحے میرے ذہن میں منتشر ہو جاتا تھا۔ میں نے پہلے کئی بار اپنے آپ سے عہد کیے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہر ارادے کو ایک لازم ہے۔ اب مجھے اپنے آپ کو باندھ کے ہی رکھنا پڑے گا۔ آدمی کی زندگی صرف اپنی نہیں ہوتی، دوسرے بھی اُس میں شامل ہوتے ہیں۔ پہلے کی بات اور تھی۔ ابّا جان نہیں ملے تھے اور محض خوش سے نہیں مل گئے ہیں، ہم نے اُن کی تلاش میں کہاں کہاں خاک چھانی۔ جہاں جہاں ہم مولوی صاحب کو پوچھتے تھے، ابّا جان کو معلوم کرتے تھے۔ وہ مل گئے، جہاں گیر مل گیا۔ فرخ، فریال اور اکبر بھی اب دُور نہیں ہیں۔ صرف چند دلوں کی دیوار حائل ہے مگر۔ ۔ ۔ مگر جو سمٹا ہے، وہ کہیں پھر نہ بکھر جائے۔ ابّا جان کو اب تبّت کے قدیم تہہ خانے میں چھپے ہوئے باقی پتھر لانے کی بے چینی نہیں ہوگی۔

رات بھر میں وہ لمحہ درگزر کر دینے کی ہمّت استوار کرتا جب میرے قدم بہکنے لگتے ہیں اور سب کچھ ریت کے محل کی طرح منہدم ہو جاتا ہے۔ جتنا میں اپنے سینے میں اپنا عزم توانا محسوس کر رہا تھا، اتنا ہی میرا جسم ٹوٹتا، ڈھیر ہوتا جا رہا تھا۔ میری رگوں میں سردی سی بیٹھنے لگی تھی جیسے میں اپنے آپ سے دُور ہو رہا ہوں۔

فجر کی اذان کے وقت ہمیں وقت کا اندازہ ہوا۔ اذان کی آواز سُن کے کانتے ہڑ بڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ ابھی اندھیرا بہت گہرا تھا۔ کانتے اور زورا اپنے اکڑے ہوئے ہاتھ پاؤں کھولنے کے لیے بیٹھک لگے۔ اندھیرا پھیکا پڑنے پر ہم نے اپنے اپنے کمروں کا رُخ کیا۔ ہر کمرے میں الگ ایک غسل خانہ تھا اور خاں صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی نقرئی زنجیریں کھینچ جائیں ملازمین فوراً حاضر ہو جائیں گے کیونکہ وہ اُنھی کمروں سے پیوستہ عقبی حصّے میں ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ آمد و رفت کے لیے اُن کے راستے بھی مختلف ہیں اور شب و روز میں مقررہ اوقات کے علاوہ وہ طلبی ہی پر حویلی کے ان حصّوں میں نمودار ہوتے میرا سارا جسم چپ چپا رہا تھا۔ کل شام ہی ابّا جان کی حویلی میں کپڑے تبدیل کیے تھے جو اوس کی وجہ سے گیلے اور مسکے ہوئے ہو گئے تھے لیکن دوسرے کپڑے موجود ہی نہیں تھے۔ میں نے اُنھیں کھینچ کر اُن کے شکنیں درست کیں اور غسل خانے میں تولیوں کے اسٹینڈ پر ڈال دیا۔ گرم اور ٹھنڈے پانیوں کے نل الگ الگ تھے اور سارا غسل

پتھر کا بنا ہوا تھا، تین اطراف دیواروں میں قدِ آدم شیشے جڑے تھے۔ چینی کا ایک بڑا ٹب بھی موجود تھا۔ میں دیر تک نہاتا رہا، کچھ تازگی سی محسوس ہوئی۔ کپڑے اتنے سُوکھے نہیں تھے۔ میں نے انھیں یوں ہی پہن لیا، جسم پر کپڑے ویسے بھی جلد خشک ہو جاتے ہیں۔ باہر سویرے کی دُھند چھٹ رہی تھی۔ باغیچے میں مالی آ گئے تھے اور کئی خدمت گار فرش کی صفائی کر رہے تھے۔ میں نے جالیوں کی دیوار سے باہر جھانک کے دیکھا۔ نچلی منزل کا ایک حصّہ اور حویلی کے اطراف میں دُور تک پھیلا ہوا باغ یہاں سے صاف نظر آرہا تھا۔ پرندوں نے شور و غوغا مچا رکھا تھا۔ نیچے ملازموں کی چلت پھرت لمحہ بہ لحمہ بڑھتی جا رہی تھی اور روشنی بھی چپکے چپکے نکھرتی جا رہی تھی۔ ہم یہاں بارہ دن رہے تھے اور ہمیں کچھ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ حویلی میں صُبح کے وقت اتنی چہل پہل ہوتی ہے اور حویلی کا باغ وسیع اور سر سبز ہے۔ جا بجا پھولوں کے کُنج تھے، فوّارے، نہریں، مصنوعی پہاڑیاں۔ زنداں میں تو ہر موسم ایک جیسا ہوتا ہے۔ یہاں ہم رات کو بھی آئے تھے، رات ہی کو یہاں سے رہائی نصیب ہوئی تھی۔ میرے جی میں آیا کہ نیچے جا کے باغ میں گھوموں مگر کانتے اور زورا ابھی تک اپنے کمروں میں تھے۔ میں وہیں کھڑا آتے جاتے ملازمین کو دیکھتا رہا۔ ان سب کو کوئی جلدی معلوم ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے روز ہی اُن کا یہ معمول رہتا ہو یا آج کوئی خاص بات ہے، آج حویلی میں بڑے نواب کے بقول نہایت معزّز مہمان آئے ہیں۔ اُن سے چھپا نہیں رہا ہوگا کہ ہمارے ساتھ آنے والی خاتون کون ہے اور اُس کی آمد پہ ساری حویلی کیوں زیر و زبر ہو گئی ہے۔ اُن کے لیے بھی کچھ کم حیرت کی بات نہ ہوگی کہ ایک دن پہلے اُنھوں نے جن لوگوں کو قیدی کی حیثیت سے دیکھا تھا آج اُنھیں مہمانی کا شرف حاصل ہے۔ اُن میں سے کتنوں کے سامنے میں اور پیر و بندوق کی زد پر بڑے نواب کو حویلی سے لے گئے تھے۔ اُس رات چھوٹے نواب کی بیگم نے ہمیں بتایا تھا کہ حویلی کے ملازم اپنے چھوٹے مالک سے اس قدر وابستہ تھے کہ اب سبھی ویران ویران معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے اُن کے چہرے پڑھنے کی کوشش کی لیکن ایسے کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجھے یہ جاننے کی بے تابی تھی کہ خانم کو دیکھنے کے بعد نواب عالم تاب پر کیا گزری ہوگی۔ رات سے کتنی مرتبہ میری آنکھوں نے اُس منظر کا تصوّر کیا تھا جب خانم نواب عالم تاب کے سامنے پہنچی ہوگی چھوٹے نواب پر تو سکتہ طاری ہو گیا ہوگا۔ اُسے پہلے تو اپنی آنکھوں پہ یقین ہی نہیں آیا ہوگا۔ اتنے انتظار کے بعد کوئی یوں اچانک سامنے آجائے تو آدمی پاگل بھی ہو سکتا ہے۔ کاش میں بھی وہاں ہوتا مگر وہاں تو شاید خانم کے سوا کوئی موجود نہ ہو۔ وہ منظر تصوّر ہی کیا جا سکتا تھا اور اس کے تصوّر سے میرا سارا جسم دھڑکنے لگتا تھا۔ رات خانم کو زنان خانے پہنچانے کے بعد سے اب تک اُس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ خبر ملتی بھی کیسے۔ ایک ہی رات درمیان میں گزری تھی اور آدھی رات تک بڑا نواب ہمارے ساتھ رہا تھا۔

میں وہیں جھروکے کے پاس کھڑا رہا اور مجھے کچھ احساس ہی نہیں ہوا کہ صُبح کی روشنی کتنی پھیل چکی ہے۔ کانتے اور زورا ابھی تک باہر نہیں نکلے تھے۔ میں اُنھیں دیکھنے کے لیے وہاں سے ہٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میں نے اپنے کمرے کی جانب سے ایک لڑکی کو لپکتے جھپکتے انداز میں اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ میری ہی طرف آرہی تھی۔ میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کے ٹھیر گئی۔ اُس نے لجاتے ہوئے لہجے میں مجھے آداب کیا۔ میں نے بھی جواب میں جلدی سے اُسے آداب کیا۔ وہ پیازی کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ ہرے دوپٹے کے آدھے گھونگٹ میں اُس کا چمپئی چہرہ چمک رہا تھا۔ اُس کی عمر اٹھارہ بیس برس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ وہ خادماؤں کے لباس میں نہ ہوتی تو کوئی بھی اُسے حویلی کے خاندان کا فرد سمجھتا۔ اُس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ چہرے پہ ایک رنگ آرہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں تازہ گل دستہ تھا۔ آداب کے بعد وہ کچھ کہنے کے لیے ہمّت مجتمع کرتی رہی۔ میرے حواس بھی منتشر ہو گئے تھے "بندی زنان خانے سے آئی ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"جی، جی!" میں نے چونک کے کہا۔ "کہیے؟"

"چھوٹی بیگم اور بی بی صاحب نے آپ کو یہ گل دستہ بھیجا ہے۔" وہ گل دستہ میری طرف بڑھاتے ہوئے جھجکتے جھجکتے بولی۔

"میرے لیے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی! اُنھوں نے کہا ہے، یہ اِن کی طرف سے قبول کیا جائے۔" اُس کی آواز کسی قدر سنبھل گئی تھی۔

میں نے گل دستہ اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا مگر کوئی جواب نہ دے سکا۔ اُس نے انتظار بھی نہیں کیا اور اُس کی مچلتی آواز میرے کانوں میں گونجی: "اور اُنھوں نے پیغام بھیجا ہے، اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔" اُس کا بدن چر سرا رہا تھا۔ سانس لے کے بولی۔ "وہ آپ

کی خدمت میں آنے کی خواہش مند ہیں، یا آپ مناسب خیال فرمائیں تو زنان خانے میں تشریف لے آیئے۔"

"اُنھوں نے مجھے، مجھے یاد فرمایا ہے؟"

"جی۔" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

"کہاں ہیں وہ؟" میں نے بدحواسی سے پوچھا۔

"وہ نیچے زنان خانے کی طرف ہیں۔"

اُس کے جواب سے مجھے احساس ہوا کہ بھلا یہ پوچھنے کی بات تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کے وہ شائستگی سے بولی۔ "اور اُنھوں نے کہا ہے کہ وہ آپ کی منتظر رہیں گی۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ اب وہ دونوں مجھ سے کون سی بات کرنا چاہتی ہیں۔ ایک بات کے سوا کیا بات ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کچھ اور بات ہو۔ انکار بھی مناسب نہیں تھا اور یقیناً میرے دل کے کسی گوشے میں اُنھیں دیکھنے کا اشتیاق بھی تھا۔ رات ان کی بس ایک جھلک دیکھی تھی۔ اب تو وہ بہت خوش ہوں گی۔ انھی سے مجھے نواب عالم تاب کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا "مگر وہ کیوں زحمت فرمائیں، میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔"

وہ کھڑی اپنے دوپٹے کا پلّو نوچتی رہی اور دبی آواز میں بولی۔ "ابھی چلیے گا۔"

"ابھی۔" میں نے تذبذب سے کہا۔ "کیا اُنھوں نے ابھی کے لیے کہا ہے؟"

"جی نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "مگر وہ بہت مشتاق ہیں۔"

"بہتر ہے۔" میں نے غیر اختیاری طور پر کہہ دیا۔ اُس نے پہلی بار سر اُٹھا کے مجھے جھل مل کرتی آنکھوں سے دیکھا۔ اُس کا چہرہ بھی جیسے کچھ اور روشن ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا، اُسی سے چھوٹے نواب کے بارے میں کچھ پوچھوں لیکن میں چُپ ہی رہا۔ اُس نے مجھے ایک جانب چلنے کا اشارہ کیا تھا۔ گُل دستہ میرے ہاتھ میں تھا۔ گلاب کے پھولوں کی خوشبو نے میرے گرد ایک ہالہ سا بنایا ہوا تھا۔ دالان میں آ کے مجھے اپنے لباس کا خیال آیا۔ جھروکے کی تیز ہوا نے کپڑے خشک کر دیے تھے البتّہ شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس حُلیے میں اُن کے سامنے جاتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن اُنھوں نے پہلی بار زنداں میں مجھے کون سے اچھے حال میں دیکھا تھا۔ کل تک تو میں ان کی حویلی کا قیدی ہی تھا۔ دالان سے گزر کر وہ چند قدم دُور گلی جیسی ایک راہداری میں آ گئی۔ آگے جا کے جانے کیوں میرا جی گھبرانے لگا۔ میرا یوں زنان خانے میں جانا بے محل تو نہیں ہے؟ بڑے نواب نے رات ہمیں کھلی اجازت دے دی تھی اور رات وہ مجھے اپنے ساتھ زنان خانے میں لے بھی گئے تھے لیکن اُس وقت کی بات اور تھی اور یہ اجازت محض حسنِ ظن ہی پر ہے۔ سوچا، خادمہ کو منع کر دوں، پھر کسی وقت آ جاؤں گا مگر وہ [illegible] ہوئی وہیں راہ داری کے وسط میں بنے ہوئے ایک زینے میں اتر گئی۔ میں نے جھجکتے قدموں سے اُس کی پیروی کی۔ وہ بار بار مڑ کے پیچھے دیکھتی تھی کہ میں کہیں راستے میں اُس سے بچھڑ نہ جاؤں۔ اُس کی رفتار سے اضطراب صاف نمایاں تھا۔ چند سیڑھیوں کا زینہ طے کر کے ہم نچلی منزل پر تھے، یہ زنان خانے ہی کا حصہ تھا۔ زینے کے بعد وہ ایک کمرے میں چلی گئی۔ یہ ایک روشن اور مختصر نشست گاہ تھی۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک جانب تخت پر گاؤ تکیے اور بیٹھنے کے لیے اِدھر اُدھر دیواروں کے ساتھ گدّے رکھے تھے۔ خادمہ نے مؤدبانہ لہجے میں وہاں بیٹھنے کی درخواست کی اور بولی کہ وہ اطّلاع کر کے ابھی آتی ہے۔ اُس کے چہرے پر کسی لمحے ایسی حیران حیران سادگی عود کر آتی تھی کہ بس دیکھتے رہیے۔ پٹ بجنے کی طرح لمحے لمحے اُس کی آنکھیں جلتی بجھتی تھیں۔ میں یہاں آ تو گیا تھا لیکن میرا جی لوٹ جانے کو کرتا رہا۔ ابھی خادمہ کو گئے ہوئے چند منٹ سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے کہ دروازے سے اُن کی آہٹیں سنائی دیں۔ میری سانس بند ہونے لگی۔ اُن کے آنے سے پہلے میں اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ میری آنکھوں میں ایک ثانیے کے لیے دُھند چھا گئی۔ میں دن کی روشنی میں اُنھیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ دن کی روشنی میں رنگ ایسے نمایاں ہو جاتے ہیں، مجھے اس کا اندازہ شاید پہلے کبھی اتنا نہیں ہوا تھا۔ سُرخ اور سفید رنگ اُن کے چہروں سے اُبل سا رہا تھا، شہابی رنگ کی جیسے شعاعیں پھوٹی پڑتی ہوں۔ اُن کے نقش و نگار بھی میری آنکھوں کو پہلے اتنے روشن نہیں تھے۔ دونوں سادہ لباس پہنے ہوئے تھیں: دودھیا آڑا پاجامہ، بند گلوں کے ہلکے نیل گوں جمپر۔ دوپٹے بھی اُن کے اُسی رنگ کے تھے۔ اُس رات بھی دونوں ایک ہی طرز کا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ وہ کوئی پہلی مرتبہ میرے سامنے نہیں آئی تھیں لیکن مجھے لگ ایسا ہی رہا تھا۔ دونوں کو سانچے میں ڈھالا گیا تھا۔ اُن کی گُل اندامی اور ترو تازگی دیکھ کے معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بلکہ ابھی آسمان سے زمین پر اُتری ہیں۔ اُن کے آداب کے جواب میں، میں نے بھی جلدی سے اُنھیں سلام کیا۔ وہ میرے سامنے کی دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے گدّوں پر خاص انداز سے بیٹھ گئیں۔ اُن کے لباس کی بھینی بھینی خوشبو کمرے میں پھیل گئی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اُنھیں دیکھنے کی کوشش کی لیکن اُن کی طرف نظر بھر کے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ "ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کی۔" چھوٹے نواب کی بیگم نے جھن جھناتی آواز میں کہنے کی کوشش کی۔

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا، میں ہونٹ کاٹتا رہ گیا۔

"ہمیں یقین نہیں تھا کہ ہم دوبارہ کبھی آپ سے مل سکیں گے۔" وہ ہکتے لہجے میں بولی۔ "لیکن ہماری تمنا تھی کہ ہم، ہم۔" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

"آپ کیسی ہیں؟" میں نے بہ مشکل تمام کہا۔

"ہم کیا بتائیں۔" وہ اضطراری انداز سے بولی۔ "ہم نے زندگی میں کبھی ایسا سکون، ایسا سُکھ نہیں دیکھا تھا۔ سب آپ کا دیا ہوا ہے۔ ہم آپ کا کس طرح، کن لفظوں میں۔۔۔"

"نہیں، نہیں۔" میں نے حواس باختگی سے کہا۔ "آپ کچھ نہ کہیے۔ ازراہِ نوازش اب آپ کچھ نہ کہیے۔ رات بڑے نواب صاحب ہی بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔"

"ہمیں اندازہ ہے، اُنھوں نے کس طرح اپنے آپ کو سنبھالا ہوگا۔ ہمیں بھی آپ کے سامنے آنے کی ہمّت نہیں ہو رہی تھی لیکن پھر شاید ہم اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتے تھے۔"

"ہم نے آپ سے پہلے کہا تھا۔" میں نے زیرِ لب کہا۔ "ہم یہاں سے نکل کر سیدھے خانم آپی ہی کے پاس جائیں گے اور کوشش کریں گے کہ اُنھیں یہاں آنے پر آمادہ کر سکیں مگر۔۔۔"

"ہمیں یقین آ گیا تھا۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "یقین کیجیے، ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتے اور ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم کبھی ایسا سوچتے بھی نہیں۔ یہاں شہر میں آپ کی موجودگی کا علم ہونے پر ہم آپ کی خدمت میں یوں ہی درخواست لے کے حاضر ہو جاتے۔ آپ کے پاس سے آنے کے بعد ہم دونوں مسلسل اپنی جیسی کوششیں کرتے رہے۔ ہم نے آپ کی نگرانی کرنے والے خادموں سے رابطہ قائم کیا اور اُنھیں ایک لمحے کی غفلت کے لیے انعام و اکرام یا یوں کہیے کہ رشوت کی پیش کش بھی کی لیکن ہماری کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ آخر ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک جرأت کی، ہم دونوں نے جہانی بھائی کے پاس جا کے آپ کا تذکرہ کیا۔"

"آپ نے بڑے نواب صاحب کو بتا دیا تھا کہ آپ ہمارے پاس آئی تھیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"نہیں، ہم اُن سے یہ اعتراف کس طرح کر سکتے تھے۔ یہاں گھر کے مردوں کے معاملات میں زنان خانے کی کسی خاتون کے دخل

دینے کی رسم نہیں ہے لیکن ہم نے یہ رسم توڑ ڈالی۔ ہمیں ڈر تھا کہ جہانی بھائی ہماری اس گستاخی پر بہت برہم ہوں گے۔ ہم اشارۃً ہی اُن سے آپ کا تذکرہ کر سکتے تھے۔ وہ ہماری زبان پر آپ کا ذکر سُن کر بہت حیران ہوئے۔ یقیناً اُنھیں غصّہ بھی آیا ہوگا۔ ہماری توقع کے خلاف اُنھوں نے بہت برداشت کا ثبوت دیا۔ اُنھوں نے ہم سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ دونوں کے متعلق کس نے ہم سے مخبری کی ہے۔ غالباً اس لیے کہ اتنے ملازموں کی موجودی میں کوئی بھی، اُن کے خیال میں کوئی بھی ہمارے کان بھر سکتا تھا۔ وہ یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہم آپ سے کوئی رابطہ قائم کر سکتے ہیں اور اگر خدانخواستہ اُنھیں اس کا علم ہو جاتا تو ہم اب تک اس دنیا میں نہ ہوتے۔"

"آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔" میری آواز دھڑک رہی تھی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ یہ سُن کر نواب کوئی بھی انتہا پسندانہ فیصلہ کر سکتا تھا۔ اُس وقت اُس کا کچھ یہی عالم تھا۔

"آپ سمجھتے ہیں، ہم نے غور نہیں کیا ہوگا؟" وہ سیمابی لہجے میں بولی۔ "ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا مگر ہم ایک آخری جتن کے طور پر آپ کے پاس آئے تھے۔ ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ جہانی بھائی آپ تک جو کچھ منتقل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ ہم نے سوچا کہ ایک بار ہم بھی اپنا دامن پھیلا کر دیکھیں۔ شاید ہماری بات کا زیادہ اثر ہو۔ شاید ہماری التجا رائگاں نہ جائے۔ ہم نے بہت غور کیا تھا اور آخر ہم اور برجیس اسی نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لینا چاہیے۔"

"آپ نے بڑا حوصلہ کیا تھا لیکن آپ کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ہم پہلے ہی اچھی طرح صورتِ حال سمجھ چکے تھے۔ بڑے نواب کی بات ہم تک منتقل ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی اور اُنھوں نے پہلے ہم سے نرم رویّہ ہی اختیار کیا تھا۔ ہم نے اُن سے صاف کہہ دیا تھا کہ اُس وقت تک ہم کوئی وعدہ نہیں کر سکتے جب تک خانم آپی سے مل نہ لیں۔ کاش آپ کو بھی کسی طرح معلوم ہو جاتا کہ ہمارے پاس جواب میں کہنے کے لیے صرف یہی ہے، کچھ اور نہیں ہے۔ پھر آپ کو ہم تک پہنچنے کی اذیت نہ اٹھانی پڑتی۔ آپ کے سامنے ہمیں بھی اپنے انکار سے بہت دُکھ ہوا تھا۔ ہمیں اپنی بے بسی کا احساس اور سوا ہو گیا تھا۔ اِدھر واقعی اگر بڑے نواب صاحب کو علم ہو جاتا تو۔ ۔ ۔"

"ہمیں اسی پر حیرت ہے کہ اُنھوں نے ہماری لب کشائی درگزر کیسے کر دی، ہمیں سزا کیوں نہیں سُنائی۔ اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہماری درخواست سُن کر سر ہلا کے رہ گئے۔ ہمیں محسوس ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ آزردہ اور شکستہ ہو گئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں، اُن کے لیے یہ کوئی خوش گوار بات ہرگز نہ ہوگی کہ دو بے قصور آدمی اُن کے زنداں میں اسیر ہیں۔ ایک بار غلط فیصلہ کرنے کے بعد آپ کی رہائی ہی سے کچھ ازالہ ہو سکتا تھا۔ وہ اُلٹا اصرار کرتے رہے۔ اس طرح اُنھوں نے صرف آپ ہی پر ستم نہیں کیا، اپنے آپ پر بھی کیا۔ ہماری دخل اندازی پر اُن کی آزردگی پشیمانی کے اسی احساس کے سبب سے ہوگی یا وہ آپ سے قطعی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ یقیناً اُن کے ذہن میں اُمید کی کوئی رمق موجود تھی کہ آخر کبھی تو، کسی طور تو آپ کا لوہا پگھلے گا۔ ہم اُن سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم آپ سے مل کے، آپ کو دیکھ کے آئے ہیں۔ اُنھیں اپنی جان سے زیادہ اپنی وضع عزیز ہے۔ وہ لوگ دوسرے ہیں۔ کاش ہم اُنھیں یہ باور کرا سکتے۔"

یہ کہتے ہوئے چھوٹے نواب کی بیگم گیتی آرا کی آواز تمتمانے لگی تھی، اُس کا چہرہ کچھ اور سُرخ ہو گیا تھا۔ اُس کے لہجے میں پہلے کوئی جِھجک اور لُکنت تھی تو اب بڑی حد تک ٹھہراؤ آ گیا تھا اور اتنی دیر میں مجھے بھی اپنے حواس یک جا کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اُس نے ایک لمحے ٹھیر کے جھل ملاتی آنکھوں سے پہلے میری جانب دیکھا پھر اپنے قریب بیٹھی ہوئی نند کی جانب جس کا نام مجھے ابھی چند لمحے پہلے معلوم ہوا تھا۔ برجیس بظاہر کسی مورتی کی طرح خاموش بیٹھی تھی لیکن اُس کی آنکھیں خاموش نہیں تھیں۔ اُس کے چہرے پر آتے جاتے رنگ بول رہے تھے۔ کتنی بار بے اختیار میری اُس کی نگاہیں چار ہوئی تھیں اور ہر بار اُس کی پلکیں تھرتھرا اُٹھی تھیں۔ اُس نے درمیان میں کوئی دخل نہیں دیا تھا لیکن اُس کا اضطراب آمیز انداز، اُس کا متلاطم سا انہماک بتا رہا تھا کہ گیتی کی آواز میں اُس کی آواز بھی شامل ہے اور کہیں گیتی سے کوئی کوتاہی ہوگی تو وہ فوراً ٹوک دے گی۔ کئی اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کا عکس معلوم ہوتی تھیں۔ عُمروں میں بھی بس چند برس کا فرق ہوگا۔ اُن کے لباس اور نشست و برخاست کی یکسانی ایک دوسرے سے گہری رفاقت کی شاہد تھی۔ یوں بھی نند بھاوج کے علاوہ رشتے میں وہ ایک دوسرے کی بہنیں بھی تھیں۔

"ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔" ایک لحظے کے تحمّل کے بعد چھوٹے نواب کی بیگم مایوسی سے بولی۔ "اور پہلی مرتبہ ہمیں یہاں اِس حویلی میں اپنی بے چارگی، اپنی کم حیثیتی کا اندازہ ہوا۔ برجیس بار بار ہمیں ٹوکتی تھیں کہ گیتی خدا کے لیے کوئی تدبیر کرو۔ اُن لوگوں پر بہت ظُلم ہو رہا ہے مگر ہم کیا کر سکتے تھے۔ ایک ہی صورت تھی کہ ہم اپنے بھائی حشمت جنگ کو سب کچھ بتا دیں، جہانی بھائی کے لیے اُن کی بات رد کرنا مشکل ہو جاتی

لیکن برجیس نے ہمیں منع کر دیا۔ واقعی جہانی بھائی پھر ہمیں کبھی
ف نہ کرتے۔ ہمیں یہ بھی خدشہ تھا کہ اس غم اور غصّے میں وہ آپ کے
لق کوئی جنونی فیصلہ نہ کر لیں۔ بس ہم آپ کے لیے دعائیں ہی کرتے
ہے۔ گو ان پر سے ہمارا یقین اُٹھ گیا تھا لیکن ایک یہی چارہ ہمارے
ں تھا۔ برجیس ابتدا ہی سے بہت حسّاس اور نازک طبع ہیں۔ برجیس
ل پھول کی طرح مرجھا جاتا ہے، پھول کی طرح کِھل اُٹھتا ہے۔ ہمیں
وم ہے، اُس رات کے بعد اُنھیں کسی پل نیند نہیں آئی۔" میں نے
ینی سے برجیس کی جانب دیکھا تو اُس کا چہرہ گُلنار ہو گیا اور اس
شے جیسی آنکھیں چھلک چھلک پڑیں۔ میری آنکھیں بھی اُمڈ نے
ں اور ایک ثانیے کے لیے میرا سارا جسم سُن سا ہو گیا۔

"یہ ہمی سے کچھ کہہ سکتی ہیں۔" چھوٹے نواب کی بیگم بولی۔ "بچپن
، ہم دونوں تقریباً ساتھ ہی رہے ہیں۔ یہ سامنے بیٹھی ہیں۔ آپ
دل کے لیے یہ مجھے اس طرح تلقین کرتی تھیں جیسے آپ کے پاس
ن یہی گئی تھیں۔ جیسے ہم نے آپ کو نہیں دیکھا تھا اور آپ کا دُکھ
وس نہیں کیا تھا۔ یہ ہم سے کہتی تھیں، گیتی! خدانخواستہ اُن لوگوں
ساتھ کچھ ہو گیا تو ہمیں کبھی سکون نہیں ملے گا۔ یہ ہمیں جتاتی تھیں کہ
ن لوگوں سے مل کر آئے ہیں۔ جو حویلی اُن کے لیے قید خانہ بنی ہوئی
، اُسی حویلی کی دو نوجوان خواتین کا اُنھوں نے کیسا احترام کیا تھا۔
آپ کہہ رہے تھے کہ ہمیں آپ کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہم بھی
نتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا پُل صراط پر گزرنے سے کم نہیں
۔ آپ کے متعلق ہم سے بہت ڈراؤنی باتیں کہی گئی تھیں۔ آپ
رکشی اور شوریدہ سری کی ایسی تصویر ہمارے سامنے پیش کی گئی
کہ کبھی ایسا ارادہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں اِس کے سنگین نتائج کا
طرح احساس تھا لیکن ہمارا تو گھر جل رہا تھا اور ہمیں ایک طرف
آپ پر اعتماد تھا، اپنے صدق پر یقین تو دوسری طرف ایک یہ
بھی ہمیں طمانیت دیتا تھا کہ بہرحال آپ آدمی ہی ہیں۔ آدمی کی
آدمی ہی سُنتا ہے۔ گوشت پوست سے مختلف تو آپ نہیں
ہوں گے۔ گھر تو آپ کا بھی ہوگا اور ہم ایسے متعلقین بھی۔ ہم آپ
ائیں کہ ہم اپنے ساتھ خنجر لے کے گئے تھے۔ آپ کے لیے نہیں،
لیے، کہ بہ صورتِ دیگر ہمیں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے میں دیر
ہ جائے۔ ہم اپنا سب کچھ ترک کر کے، اپنی ساری کشتیاں جلا
آپ کے پاس پہنچے تھے۔ ہمیں یاد ہے ہم نے آپ سے کیا کہا تھا، ہم نے
تھا، ہم بہرحال، ہر قیمت میں خانم سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔
جواہر کے علاوہ بے شک وہ قیمت ہم بھی ہو سکتے تھے۔ ہم اپنے
شوہر کے لیے اور برجیس اپنے بھائی کے لیے یہ قیمت ادا کرنے پر آمادہ تھے۔ کیا ہم اتنا نہیں جانتے تھے کہ وہ اجنبی زندانی اپنی ناکردنی پر کتنے مشتعل ہو سکتے ہیں۔ ہمیں سامنے دیکھ کے اُن کے غضب کا کیا عالم ہو سکتا ہے۔"

میں بے حس و حرکت بیٹھا اُسے تک رہا تھا۔ اُسے جھرجھری سی آ گئی اور وہ گہری سانس بھر کے بولی۔ "ہم ناکام واپس آئے تھے لیکن ہمیں ایک قلبی اطمینان حاصل تھا کہ ہم اپنی جیسی تمام کر کے آئے ہیں اور ہمارے دامن، ہمارے آنچل پر کسی آلودہ نگاہ کا کوئی نشان نہیں ہے۔ برجیس بار بار ہمیں یہی سب یاد دلاتی تھیں۔ آپ کی نجابت اور نکوکاری کے یہی حوالے دیتی تھیں۔ برجیس کو معلوم تھا کہ ہماری حالت اُن سے مختلف نہیں ہے، اگر کوئی فرق ہے تو اتنا کہ ہمارا سینہ اپنے زخم چھپانے پر کسی قدر قادر ہو گیا ہے۔ برجیس میں شاید ابھی یہ حوصلہ نہیں۔"

اُس نے اپنے سر سے ڈھلکتا ہوا دوپٹّا ٹھیک کیا۔ میں نے اُسے نہیں ٹوکا کہ اب بیتا ہوا دُہرانے سے کیا حاصل ہے۔ بہتر ہے اسے کوئی بُرا خواب سمجھ کے بھلا دیا جائے۔ اس ذکر سے بہت گھٹن ہوتی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ مجھے اُس کی زبانی یہ سب سُن کے کچھ اچھا ہی لگ رہا تھا۔ بیچ میں کتنی مرتبہ میں نے اُسے روکنا چاہا لیکن یہ سوچ کے خاموش رہا کہ پھر اس کے پاس کہنے کو رہ بھی کیا جاتا ہے۔ نہ میں نے اُس سے کہا کہ اُنھیں ہم سے ایسا خوف کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنا تو ہم بھی جان سکتے تھے کہ حویلی کی معزّز خواتین نے کسی بڑی مجبوری کے عالم میں ہمارے پاس آنے کا قصد کیا ہوگا۔ مجھے ڈر تھا کہ میرے دخل دینے سے اُس کے اُمڈتے ہوئے اظہار میں کوئی رخنہ نہ پڑ جائے۔ بعض لوگ باتیں کرتے ہوئے اور دل کش ہو جاتے ہیں۔ اُس کی آواز کے اضطراب میں بھی ایک شگفتگی قائم تھی۔ آدمی سنتا رہے تو کھو جائے۔ مُنہ سے پھول جھڑنے کی تشبیہ لوگوں نے یوں ہی نہیں تراشی ہوگی۔ مجھے اُن کے سامنے بیٹھے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں جھروکے کے پاس سے پھیلا ہوا باغ دیکھ رہا تھا۔ آدمی بھی تو پھولوں اور پتّھروں کی طرح ہوتے ہیں، اور کچھ وقت کی دُھوپ چھاؤں کی بات بھی ہوتی ہے۔ اُس رات بھی زنداں میں وہی آئی تھیں مگر اُس رات مجھے اُن کی شائستگی اور دل آویزی کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ چھوٹے نواب کی بیگم نے سارا وقت حویلی کی جنت میں عیش و آرام سے نہیں گزارا ہوگا۔ وہ تعلیم یافتہ بھی خوب نظر آتی تھی، اور علم تو جبر سے آتا ہے۔ تحمّل سے آتا ہے اور عالم و فاضل اُستاد

سے زیادہ اپنی طلب ہے۔ جیل میں کتابوں کے سوا میرا ابھی کوئی اُستاد نہیں تھا۔ تاہم کتابیں لہجہ نہیں سکھاتیں۔ مجھے شبہ تھا کہ مجھے بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے، گیتی کو آتا تھا۔ اُس کی آواز بجائے خود ایک ساز تھی جیسے دریا بہتا ہو۔ اُس کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ بناوٹ میں شاید ایسی روانی نہ ہوتی۔ ہر دم میرا تجسّس بڑھتا جاتا تھا کہ آگے اُس کے لبوں سے کیا کیا ادا ہوتا ہے، کیسی کیسی حیرانیاں سنانے والے ایسے ہوں تو آدمی کو خود پر بیتا ہوا بھی کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔

"اور جب خادموں کی زبانی ہمیں اطّلاع ملی کہ آپ جہانی بھائی کو بندوق کی زد پر حویلی سے لے گئے ہیں تو ہم سناٹے میں آگئے لیکن دوسرے ہی لمحے ہم نے اپنے سر سے کوئی بوجھ اُترا ہوا محسوس کیا۔ یہاں خادموں میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص کی نگاہیں ہمی پہ مرکوز ہوگئی تھیں۔ ہمیں طرح طرح کے مشورے دیے جا رہے تھے۔ ہم سے کہا گیا کہ ہم فوراً اپنے بھائی حشمت جنگ سے رابطہ قائم کریں اور کہا گیا کہ مسلح خادموں کو تعاقب کا حکم دیا جائے۔ گو آپ نے اُنھیں تنبیہ کر دی تھی کہ کسی نے کوئی غلطی کی تو آپ جہانی بھائی۔ ۔ ۔" اُس کی زبان اٹکنے لگی اور بولی "اگر حویلی سے جاتے وقت نہیں تو حویلی سے آپ کے نکل جانے کے بعد ہم حشمت بھائی کو فون کر سکتے تھے یا کسی کو بھی مگر ہم نے نہیں کیا۔ برجیس نے بھی منع کیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ جہانی بھائی کن ہاتھوں میں ہیں اس لیے یقین تھا کہ جلد واپس آجائیں گے۔"

"آپ کو یقین تھا؟ میں نے جھینپتی آواز میں کہا۔

"ہاں، ہمیں اچھی طرح معلوم تھا، شاید عورتیں مردوں سے زیادہ نگاہ شناس ہوتی ہیں۔ ہم نے آپ کو دیکھا تھا اور ہم خود جو اپنے گواہ تھے۔ اُن کے جانے کے بعد ہمیں شدّت سے احساس ہوا کہ آپ نے ہم سے کیسا خسروانہ سلوک کیا تھا۔ ہمیں بھی تو آپ یرغمال بنا سکتے تھے۔ جہانی بھائی کے مقابلے میں یہ نسبتہً آسان تھا۔ ہمیں شاید اپنا خنجر نکالنے کی بھی مہلت نہ ملتی۔ اس طرح آپ کو کچھ اور پہلے یہاں سے نجات مل سکتی تھی۔ یقین کیجیے، ہمیں ذرا بھی تشویش نہیں تھی البتہ ہم اور برجیس جہانی بھائی کی جلد از جلد واپسی کے منتظر تھے اور ہمیں یہاں حویلی کے حواس باختہ مکینوں کو قابو میں رکھنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ وہ ہمیں مسلسل ٹوک رہے تھے۔ ہم اُنھیں اپنے اطمینان کا کوئی جواز پیش نہیں کر پا رہے تھے۔ بہر حال زیادہ دیر نہیں لگی کہ ہمیں جہانی بھائی کی واپسی کی خوش خبری سُنائی گئی اور بتایا گیا کہ اُنھیں کوئی گزند نہیں پہنچا۔ یہ سُن کے ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم حویلی کے پریشان حال مکینوں کے سامنے سُرخ رو ہوگئے ہیں، جیسے جہانی بھائی ہماری سفارش پر واپس آئے ہوں اور آپ نے ہمارا مرتبہ بڑھایا ہو۔ اُس وقت جہانی بھائی کے سامنے ہمارا جانا مناسب نہیں تھا لیکن ہم مسلسل ٹوہ میں لگے رہے کہ واپسی کے بعد وہ آپ کے خلاف کیا قدم اٹھاتے ہیں۔ ہمارے بعض خادموں نے اُس موقع پر ہم سے مہربانی کی کہ ہماری ہدایت پر ٹیلی فون کا سلسلہ ناکارہ کر دیا۔ ہم نے یہ ہدایت اُنھیں بوجوہ دی تھی۔ حویلی میں تیز رفتار سواریاں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں لیکن اُن میں اور ٹیلی فون کے رابطے میں بڑا فرق ہے۔ ہماری آرزو تھی کہ آپ یہاں سے جتنی دُور ہو سکتے ہیں، ہو جائیں اور ہم نے طے کر لیا تھا کہ اگر جہانی بھائی نے حشمت بھائی سے آپ کے سلسلے میں کوئی بات کی تو ہمیں آخر زبان کھولنی پڑے گی۔ گو جہانی بھائی کے مقابلے میں ہماری التجا کی پذیرائی کا کم ہی امکان تھا لیکن ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہم حشمت بھائی کو منع کر دیں گے۔ چاہے ہماری اس جسارت پر وہ کتنے ہی برافروختہ ہوں۔ شکر ہے، ہمیں یہ سب کچھ نہیں کرنا پڑا۔ واپس آکے جہانی بھائی بہت دل گرفتہ تھے۔ اُس رات ہمیں اُن کی ایک ہی جھلک دیکھنے کو ملی تھی لیکن ہم مطمئن ہوگئے تھے کہ اُن کے چہرے پر چھایا ہوا غبار بغض و عناد کا نہیں ہے، پشیمانی اور شکستگی کا ہے۔"

میری مبہوت نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اتنے میں دو خادمائیں شانوں پر طشت اٹھائے بے آواز قدموں سے اندر داخل ہوئیں۔ میرے ساتھ وہ دونوں بھی چونک سی گئیں۔ خادماؤں نے دو زانو بیٹھ کے طشت چھوٹی میزوں پر رکھ دیے۔ ڈھکی ہوئی ریشمی جالیوں میں چاندی کے برتن چمک رہے تھے۔ برجیس نے خادمہ کے کان میں چپکے سے کچھ کہا تو وہ خفیف سی ہوگئی، بھاگی ہوئی باہر چلی گئی اور کسی تاخیر کے بغیر سلفچی اور ہاتھ دھونے کا آفتابہ لیے ہوئے پھولی سانسوں سے کمرے میں واپس آئی۔ گیتی نے خوان پوش ہٹا دیا تھا۔ طشت میں چائے کے علاوہ قابوں اور طشتریوں میں مختلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہی خادمہ جو مجھے یہاں لائی تھی، برجیس کے اشارے پر آفتابہ ہاتھوں میں اُٹھائے میری طرف بڑھی، میں گھبرا سا گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ میں اُن سے کہنا چاہتا تھا کہ اس وقت کسی چیز کی خواہش نہیں ہے لیکن میری زبان گنگ ہوگئی تھی۔ دوسری خادمہ نے تولیا میری طرف بڑھا دی اور جیسے ہی میں نے ہاتھ خشک کیے۔ اُنھوں نے سلفچی میرے سامنے سے ہٹا لی "یہ میرے لیے صرف چائے" میں نے دبے لہجے میں بہ مشکل کہا۔

"مگر آپ نے تو ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا ہے" برجیس کھنکتی آواز ں پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"جی ہاں" میں نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا "وہ میں اُوپر سب ں کے ساتھ کر لوں گا۔ آپ نے بہت زحمت کی" شکریے کا لفظ ری زبان سے ادا نہ ہو سکا۔

اُس نے گیتی کی طرف پریشان نظروں سے دیکھا، گیتی بت سے کہنے لگی "زحمت کیسی، ہم آپ سے کس طرح کہیں کہ ہمیں ں میزبانی سے کیسی مسرّت ہو رہی ہے۔ ہماری التجا ہے کہ آپ ں تکلف نہ کریں۔"

میں سوچتا رہ گیا کہ کیا کہوں۔ گیتی نے مجھ سے کچھ اور یب ہو جانے کو کہا۔ خود اُنھوں نے بھی میرے اور اپنے درمیان ملہ کم کر لیا تھا۔ خادماؤں نے ہمارے بیچ میں میزیں رکھ دیں۔ دں سے اشتہا انگیز بھاپ اُٹھ رہی تھی لیکن مجھے اُن کے ساتھ ں طرح آمنے سامنے بیٹھ کے کھاتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ ں کے اتنے قریب ہو جانے پر اُن کے لباسوں میں بسی ہوئی خوشبو ی اور قریب ہوگئی تھی۔ برجیس کی مرمریں کلائیوں میں طلائی چوڑیاں مگا رہی تھیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اُس کی کلائیاں زیادہ دیدہ زیب ں یا سونے کی چوڑیاں۔ سونا ہی اُس کے شہابی رنگ سے کچھ پھیکا پڑ تھا۔ میں اپنا جسم سکیڑے سوچ رہا تھا کہ ایسے وقت کون سے لفظ سب ہوتے ہیں۔ لفظوں کی کتنی ترکیبیں میرے ذہن میں بنتی تھیں ر منتشر ہو جاتی تھیں۔ برجیس نے طشتریاں میرے اور اپنے سامنے انے میں کوئی وقت نہیں لیا "اب آپ کوئی تکلف نہیں کریں گے" ی نے مجھ سے کہا۔ اُس کے لہجے میں عاجزی بھی تھی، حکم بھی تھا۔

"یہ تو، یہ تو بہت سا سامان ہے" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"لیجیے نا، کچھ بھی نہیں ہے" گیتی نے ملتجی لہجے میں کہا "ہم نے پہلے احتیاط کی ہے کہ تکلّف کا شائبہ تک نہ ہو۔"

میں نے قیمے کی پلیٹ سے تھوڑا سا قیمہ اپنی طشتری میں ڈال میرے منع کرنے کے باوجود گیتی نے اپنے ہاتھ سے اُسے دُگنا کر میری انگلیاں ٹھٹھر رہی تھیں۔ پراٹھے کا ایک ٹکڑا توڑ کے میں پہلا لقمہ لیا تو وہ حلق میں اٹک گیا۔ گیتی کو شاید کچھ احساس ہو گیا ، وہ میری توجّہ ہٹانے کے لیے ہمکتی آواز میں بولی "ہمیں یہ ب کچھ خواب سا معلوم ہو رہا ہے۔ ہم آپ کو کیسے بتائیں کہ ہم اِس ائت کے کتنی بے چینی سے منتظر تھے۔ کبھی آپ ہمیں زنداں سے ر بھی ملیں۔ خدا جانتا ہے، ہم کتنے آرزو مند تھے کہ کبھی آپ سے ملاقات ہو جائے تو ہم آپ کی خدمت میں اپنے جذباتِ سپاس پیش کر سکیں، اپنی ندامتوں کا اظہار کر سکیں۔ برجیس ہم سے کہتی تھیں، گیتی ہمارا دل کہتا ہے، اُن لوگوں سے ضرور ملاقات ہوگی۔ ہمیں بھی ایسی خوش گمانی ہوتی تھی۔"

"آپ کو کچھ ایسی اُمّید تھی کہ ہم، ہم۔ ۔ ۔"

"سب کچھ تو ہمارے سامنے تھا" اُس نے رومال اپنے ہونٹوں سے مَس کیا اور کھنکھتے لہجے میں بولی "آپ نے ہم سے کوئی حتمی وعدہ نہیں کیا تھا اور اُس وقت ہم بہت مایوس ہی واپس آئے تھے لیکن بعد میں جیسے جیسے ہماری آنکھوں سے دُھند چھٹتی گئی اور گزرتے ہوئے لمحے ہم پر اجاگر ہوتے گئے، ہماری مایوسی بھی اُسی نسبت سے کم ہوتی گئی اور آپ کا حتمی وعدہ نہ کرنا ہی کچھ ہماری اُمّید کا باعث بنا۔ اُس قید و بند کے عالم میں آپ ہم سے کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔ ہمیں یاد تھا کہ آپ کے ساتھ جو بزرگ تھے، اُنھوں نے ہم سے کیسی شفقت کا برتاؤ کیا تھا۔ اُنھوں نے ہمارا دوپٹا اپنی آنکھوں سے لگایا تھا اور ہمارے سر پہ ہاتھ رکھ کے ہمیں رخصت کیا تھا۔ اُنھوں نے ہم سے کہا تھا کہ وہ خانم کو آمادہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ لوگ جنھوں نے بے شمار خادموں کی موجودگی میں اپنی نجات کا عزم کیا تھا، قید و بند کی شدید اذیتوں اور داد و فریاد کا ہر دروازہ بند ہونے کے باوجود جن کا حوصلہ اتنا توانا تھا، جنھوں نے بہ عزّت ہمیں واپس کر دیا تھا اور جہانی بھائی کو اُن کی ستم کاری کے جواب میں کشادہ قلبی سے نوازا تھا۔ اُنھوں نے یہاں حویلی میں کسی کا خون بہانے سے اجتناب کیا تھا حالانکہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق تھی اور سامنے کوئی اُن کا دوست نہیں تھا۔ اِنھی ملازموں میں سے کسی نے اُن کے جسم بیدوں سے داغ دار کیے تھے۔ ہم نے کہیں سُنا تھا کہ بہادری کی پہلی شرط عزم کا صدق ہے، نیّت کی سچائی ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے ہم نے دامن پھیلایا تھا اور ایسے لوگ ہم سے کچھ کہہ گئے تھے۔ اُن کے قول و قرار پہ ہمیں اعتبار کرنا چاہیے تھا۔"

میرے جسم پر سناٹا چھایا ہوا تھا، وہ کیسی باتیں کر رہی تھی۔ "تو آپ کو، آپ کو خانم آپی کی آمد کی بھی اُمّید تھی؟" میں نے بے ربط آواز میں پوچھا۔

"ہاں، بڑی حد تک بلکہ کسی حد تک" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی "کوئی شبہ نہیں تھا کہ آپ خانم کے پاس جا کے ہماری عرض بہ تمام و کمال منتقل کر دیں گے مگر آپ کا اُن سے کچھ کہنا اور خانم کا آمادہ ہونا دو مختلف باتیں تھیں۔ آپ نے کہا تھا کہ فیصلہ خانم پر منحصر ہے۔

ہمیں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ خانم کہیں انکار نہ کردیں، وہ جانے کیا سمجھیں، اُنھیں کتنے زمانے کی تمناؤں کے بعد یہ جنت ملی ہے، وہ اب کوئی رخنہ اندازی کیوں کر پسند کریں گی۔ خانم کی جگہ ہم ہوتے تو ہمیں بھی یہ فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آتی۔ آپ نے ہمیں اُن کے متعلق زیادہ تفصیلات بھی نہیں بتائی تھیں۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی کی کن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ زنجیریں شاید ہم غلط کہہ گئے ہیں۔" وہ پشیمانی سے بولی۔ "ہماری مراد سلسلوں سے ہے، کہ وہ اپنی نئی زندگی میں کس حد تک شامل ہو چکی ہیں۔ ہمارا دل یہ سوچ سوچ کر لرزنے لگتا تھا کہ اگر خانم نے انکار کردیا تو ہم کہاں جائیں گے۔ کسی لمحے آس بندھتی تھی، دوسرے لمحے ٹوٹ جاتی تھی۔ ہم سوچتے تھے کہ اگر دیر ہوگئی تو؟ دیر پہلے ہی بہت ہو گئی تھی۔ جب تک آپ زنداں میں تھے، ہم آپ کی رہائی کے لیے حویلی کے خادموں سے التجائیں کررہے تھے کیوں کہ آپ کی رہائی سے خانم کی آمد کی توقع مشروط تھی۔ آپ کے جانے کے بعد ہمارے سر سے کوئی بوجھ اُترا تھا تو دوسری طرف ہم پر یہ وحشت طاری رہی کہ اگر خانم نے . . . !" اُس کی آواز ڈولنے لگی لیکن اُس نے جلد ہی خود پر قابو پالیا۔ "مگر ایسا اندھیرا ابھی نہیں رہا تھا جو آپ کے یہاں قید ہونے پر چھایا ہوا تھا۔ اب کوئی چراغ تو ٹمٹما رہا تھا۔ آپ کے جانے کے بعد ہمیں ایک عذاب ناک انتظار سے دوچار ہونا تھا، کب ہمارا نصیبہ کھلتا ہے۔ ہمارے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ کے جانے کی دیر ہوگی اور خانم کی صورت ہمیں اتنی جلدی دیکھنے کو مل جائے گی، یوں کوئی کرشمہ سا ہوجائے گا۔ وقت ہی کتنا گزرا تھا۔ پرسوں رات تو آپ یہاں سے گئے تھے اور ہم آپ کے لیے دعائیں کررہے تھے کہ آپ بہ عافیت جلد سے جلد ریاست سے دُور ہوجائیں اور کسی طور خانم کے پاس پہنچ جائیں اور اللہ پاک خانم کے دل میں کچھ ڈال دے۔ ہم تصوّر بھی نہیں کرسکتے تھے کہ خدا ہم پر ایسے مہرباں ہوجائے گا، ایک ہی دن درمیان میں گزرے گا کہ خانم آجائیں گی۔ کل رات ہماری مرادیں بر آنے کی رات تھی۔ ہم کچھ اور بھی مانگتے تو . . . . کچھ مگر، مگر ہم اس سے زیادہ مانگ بھی کیا سکتے تھے۔"

دو تین لقمے لے کے میرا ہاتھ رُک گیا تھا اور میں دم بخود بیٹھا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو ایسا لگا جیسے کمرے میں اچانک کسی چیز کی کمی ہوگئی ہو اور سب کچھ منجمد ہوگیا ہو، ستار کا تار ٹوٹ گیا ہو۔ چند لمحے یہ سکوت مسلط رہا اور برجیس نے مترنم آواز میں مجھے ٹوکا کہ میں نے تو کچھ لیا ہی نہیں ہے۔ گیتی کو بھی احساس ہوا اور وہ خجل آواز میں بولی۔ "ہم تو بھول ہی گئے۔ آپ نے ہاتھ کیوں روک لیا ہے۔ اب ہم اُس وقت تک اپنی زبان بند رکھیں گے جب تک آپ دل جمعی سے ناشتہ نہ کرلیں۔"

"یقین کیجیے، میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"شاید ہم نے بہت زیادہ باتیں کی ہیں مگر آپ کو سامنے دیکھ کے ہمیں احساس ہی نہیں رہا۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ "آپ کیا سوچتے ہوں گے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "کاش یہ سب اس طرح نہ ہوتا۔"

"شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ اس بہانے ہمیں کچھ دکھانا، کچھ لوگوں کا جلوہ دکھانا مقصود تھا جس سے ہم اب تک ناآشنا تھے۔"

"آپ اتنا کچھ مت کہیے، شرمندگی ہوتی ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ میرے خیال سے اتنا کچھ جان کے ہر شخص یہی کرتا۔"

"یہ آپ کی اعلاظرفی ہے، آپ کو ایسا ہی کہنا چاہیے لیکن جو ہم پر گزری ہے، وہ ہمی جانتے ہیں۔" وہ کرب آمیز لہجے میں بولی۔ "کوئی بھی ایسا نہیں کرتا۔ ہماری تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ وہ کیا (نواب عالم تاب) روٹھے تھے کہ زندگی ہم سے روٹھ گئی تھی۔ ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم نے ہر دروازے پر جاکے دستک دی اور کہیں سے ہمیں کچھ نہ مل سکا۔ کتنے مسیحا یہاں آئے اور تماشا دکھا کے چلے گئے۔ ہم آپ کو کیا کیا بتائیں، ہم پر کیسی کیسی راتیں، کیسے کیسے دن گزرے ہیں۔ جتنا ہم اُنھیں منانے کی کوشش کرتے تھے اُتنی ہی اُن کی ضد بڑھ جاتی تھی، اور اب تو اُنھوں نے کسی سے بات کرنا بھی بند کردیا تھا، اپنوں کو پہچاننا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی ماں، بہن، اپنے بھائی، ہمیں اور اپنے جاں سپار خادموں کو بھول گئے تھے۔ کتنے دنوں سے وہ بستر نشیں ہیں، آنکھیں کھولتے تھے تو صرف اپنے آپ کو دیکھتے تھے۔ اُنھیں اپنے سوا اِردگرد بیٹھے یا کھڑے ہوئے اپنے شیدائی نظر نہیں آتے تھے۔ ایسے میں خانم کا آجانا ہمارے لیے کتنی بڑی دولت اور نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے پاس ممنونیت کے لیے لفظ نہیں۔" اُس کی آواز رُندھنے لگی۔ "خدا آپ کو دُنیا بھر کی خوشیاں نصیب کرے۔ ہم تو کچھ دے نہیں سکتے لیکن خدا آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا۔"

"ازراہِ کرم اب آپ کچھ مت کہیے۔" میں نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اجر کے لیے کہہ رہی تھی۔ اجر میں تو مجھے عذاب ہی ملنا

[...]یے تھا۔ میں اُس سے کہہ دینا چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ تو اُسے بجھل [...]سامنے کہنا چاہیے۔ اس داد و امتنان کا سب سے زیادہ مستحق تو وہی [...]۔ خانم کو ہم نے نہیں، اُس نے بلایا ہے اور ہماری زنداں کی مجبوری [...] زیادہ نواب عالم تاب کی حالت دیکھ کے ورنہ ہماری رہائی [...] بعد خانم کو یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو پرسوں رات [...]سے جانے کے بعد مسلسل اِسی جستجو میں لگا ہوا تھا کہ اب ہمیں [...]یہاں سے بمبئی کے لیے روانہ ہوجانا چاہیے۔ میں نے بہت چاہا، [...]صاف صاف بتا دوں کہ سزاوارِ احسان میں نہیں ہوں، بجھل [...] اور پیرو ہے اور خود خانم ہے۔ کانتے سے خانم کی آمد کا ذکر سُن [...]میں نے یہی جانا تھا کہ بجھل کو ہماری نجات کا ایک ہی راستہ نظر [...]وگا۔ بے شک نواب عالم تاب کی جاں کنی نے بھی بجھل کو کچھ [...]رکیا ہوگا مگر اُس کی نگاہوں کا مرکز تو ہمی ہوں گے۔ حویلی سے [...]کے اڈّے پہنچنے کے بعد بجھل کے وہیں اڈّے پر جمے رہنے کا [...]ب بھی میں نے یہی سمجھا تھا کہ اب چونکہ خانم کو دورانِ سفر روکا [...]جاسکتا اس لیے بجھل کو صرف اُس کا انتظار ہے اور دوسری [...]جگہ کی نسبت ہمارے لیے اس وقت اڈّا ہی زیادہ محفوظ جگہ [...]میں نے تو گزشتہ رات یہاں آتے ہوئے پیرو سے باقاعدہ حجت [...]تھی۔ میں ٹھم ٹھم سے اُسے کے آگے بجھل کی گاڑی روک دینا چاہتا [...]میں نے خانم کو یہاں آنے سے روکنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ ہاں، [...]ضرور ہے کہ بمبئی پہنچ کے جلد از جلد فیض آباد واپس جانے اور [...]کو سب کچھ بتا دینے کا خیال کئی بار میرے دل میں آیا تھا۔ ممکن [...]میں ایسا ہی کرتا لیکن خانم کے انکار پر میں اُس سے کوئی اصرار [...] نہ کرتا۔ گیتی جتنا کچھ مجھ سے کہہ رہی تھی، مجھے اپنا وجود اُتنا ہی [...]بھر لگ رہا تھا۔ میں اُس سے یہ اعتراف کرنے کی ہمت اپنے اندر [...]نوار کرتا رہا کہ وہ میں نہیں ہوں۔ میں تو کل رات سے پیرو کی [...]ملہ بار نگاہوں کی زد پر ہوں۔ گو اُس نے اپنی تلخ نوائی پر پشیمانی [...]ظہار کیا تھا لیکن یہ تو میں جانتا ہوں کہ ابھی تک مجھ میں اُس کے [...]منے جانے اور اُس سے آنکھیں ملانے کی جراٴت نہیں ہو رہی ہے۔ [...]یہ کسی نے بروقت کسی کو چونکا دیا ہو اور وہ ایک بڑے گناہ، ایک [...]ے جرم سے بچ گیا ہو، میری حالت اُس شخص جیسی ہے۔ لیکن اپنے [...]رے میں اتنا کچھ سُننے کے بعد اب مجھ میں گیتی سے یہ کہنے کا حوصلہ [...]یں تھا کہ ایک غلط آدمی اُن کے سامنے ہے اور اُن کی یہ اضطراب [...]یز سرخوشی، اُن کی آنکھوں میں حیرت بھرے تشکر کی یہ دمک [...]صل میں بجھل کا حق ہے۔ دوسرے کا حق حاصل کرکے آدمی پھر آئینے کے سامنے کس طرح جاسکتا ہے، اور یہ آئینہ تو آدمی کے ساتھ ہی رہتا ہے، اُس کے سینے میں چھپا ہوا۔ اس کے لیے بینائی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ مجھ سے کچھ نہیں کہا جاسکا۔ اس سے حاصل بھی کیا تھا۔ میں زبان کھولتا تو وہ اِسے میرے انکسار پر محمول کرتیں۔ شاید مجھے اُن کی نظروں میں اپنا رتبہ کم کرنے کا یارا بھی نہیں تھا۔ اس طرح اپنی بڑائی کا کوئی تاثر بھی قائم ہوسکتا تھا جو اچھی بات نہیں تھی۔ میں جلتے ہوئے کانوں اور بھٹکی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا اور سُنتا رہا۔ اگر یہ سب کچھ بجھل کے لیے تھا تو کسی اور کا تو نہیں تھا۔ بجھل کا انعام بھی تو میرا ہی تھا۔ میرے سر میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ اس دوران گیتی نے مجھ سے کیا کہا تھا جو میں نہیں سُن سکا۔ اس کا اندازہ مجھے برجیس کی آواز کی دستک سے ہوا۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ مضطربانہ مجھ سے پوچھ رہی تھی، اُس کے چہرے کی سُرخی اور گہری ہوگئی تھی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے منتشر لہجے میں کہا۔

"آپ سے ایک گزارش ہے۔" گیتی شائستگی سے بولی۔ "ہماری عرض ہے کہ آپ جب تک حویلی میں قیام فرما ہیں، کوئی غیریت نہیں برتیں گے ورنہ ہمیں بہت دُکھ ہوگا۔"

"جی۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "نہیں، نہیں۔"

"رات جہانی بھائی ہمیں اور گھر کے تمام مکینوں کو ہدایتیں دے رہے تھے۔ اچھا ہوا جو ہمیں زبان نہیں کھولنی پڑی، بہ صورتِ دیگر ہم نے اور برجیس نے طے کرلیا تھا کہ اگر وہ ظرف اور حوصلے کا کوئی درس بھول رہے ہیں تو ہم اس جانب اُنھیں توجہ دلانے کی جسارت ضرور کریں گے۔ ہم اُن سے کہیں گے کہ ایک صاحب دل کا شیوہ کیا ہونا چاہیے اور ہمارے آبا کی رُوحیں اُن کے کس طرزِ عمل سے خوش ہوں گی لیکن اُن کے سامنے کسی ناروا صورتِ حال سے دوچار ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ رات جہانی بھائی اُلٹی ہمیں تلقین کررہے تھے کہ آنے والوں کی پذیرائی میں حویلی کا ہر دروازہ، دریچہ کھُلا ہونا چاہیے۔ پہلی مرتبہ ہمارے یہاں اتنے بڑے مہمان آئے ہیں۔ اُنھوں نے ہمارے مُنہ کی بات چھین لی۔ بہت عرصے بعد ہم نے جہانی بھائی کے چہرے پر ایسا سکون دیکھا ہے، اُنھوں نے ہم سے اور بھی بہت کچھ کہا تھا، شاید آپ سے بھی کہا ہو تاہم ممکن ہے وہ کھُل کے کہہ نہ پائے ہوں تو ہم اُن کی جانب سے آپ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ آپ ہمیں، ہمیں . . ."

"آپ کیسی باتیں کررہی ہیں؟"

"ہم اپنے دل کی بات کررہے ہیں۔" وہ جلتی آواز میں بولی۔ "آپ

یہاں کوئی اجنبیت برتیں گے تو ہم سمجھیں گے، آپ نے ہمارے گناہ معاف نہیں کیے۔ جہانی بھائی کی غلط اندیشی اور ذہنی انتشار کے سبب آپ کو یہ ستم برداشت کرنے پڑے ہیں لیکن اس حویلی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہم خود کو بھی کم مجرم نہیں سمجھتے۔ خاموشی اور پردہ پوشی بھی جرم میں اعانت کے مترادف ہے۔"

"خدا کے لیے اب اُسے بھول جائیے۔"

"ہم بھی یہی کہہ رہے ہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "اسی لیے ہماری درخواست ہے کہ آپ اس حویلی کو اپنا گھر ہی تصوّر کریں اور اس کے مکینوں کو اپنے دوست، اپنے عزیز۔ بخدا ہم یہ کوئی رسم ادا نہیں کر رہے ہیں، بہ صمیمِ قلب منّت گزار ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے بہکی ہوئی آواز میں کہا۔

"کتنا عجیب ہے کہ اس بار بھی ہمی کچھ طلب کر رہے ہیں لیکن شاید قرار یہی پایا ہے کہ ہمی ستم توڑیں، ہمی داد رسی چاہیں۔ ہم نے آپ کو اس لیے یہاں بلایا تھا بلکہ ہم خود حاضر ہونا چاہتے تھے کہ آپ سے ایک اور سلوک کی التجا کریں۔ آپ نے خانم کو یہاں لا کے اس ساری حویلی کو زندگی کی نوید دی مگر آپ کی آمد بھی ہمارے لیے اسی نوید کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کو دوبارہ دیکھنے کی ہمیں بہت آرزو تھی۔ رات سے ہم آپ کے پاس آنے کے لیے بے چین تھے۔ ہمیں خوف تھا کہ کہیں آپ باہر نہ چلے جائیں اور ہم اپنے احساسات کے اظہار سے قاصر نہ رہ جائیں۔ کچھ ایسا ہی تھا، رات ہی آپ واپس جانا چاہتے تھے کیونکہ خانم کو یہاں پہنچا دینے کے بعد آپ کا کام ختم ہو گیا ہے۔ آپ یوں چلے جاتے تو جانے پھر کب آتے۔ ہم جانتے ہیں کہ درمیان کا یہ عرصہ ہم پر کسی پہاڑ کی طرح گزرتا۔ وقت کا بھی کچھ طے نہیں ہے کہ کب کیسی کیسی گرہیں ڈال دے۔ سو ہمارا بس چلتا تو ہم رات ہی کو آپ کے پاس آتے۔ ہم بار بار خادماؤں سے پوچھتے رہے مگر آپ رات گئے تک جہانی بھائی کے ساتھ رہے اور ہمیں آنے کا موقع نہ مل سکا۔"

"میرا بھی جی چاہتا تھا کہ آپ سے کبھی دوبارہ ملاقات ہو۔" اُس سے اتنا کچھ سُننے کے بعد میری زبان سے بھی کچھ تو نکلنا ہی تھا۔ میں نے نرمی سے کہا۔ "اُس رات زنداں میں آپ کے جانے کے بعد دیر تک خیال رہا کہ آپ کتنی دیواریں عبور کر کے، کس اُمید سے آئی تھیں اور ہم آپ کو کچھ بھی نہ دے سکے، ہم تو ٹھیک طرح بات بھی نہ کر سکے!"

"آپ نے کچھ نہ دے کے بھی ہمیں بہت کچھ عطا کیا تھا۔ اُمید، حوصلہ، آپ نے ہمیں صبر دیا تھا اور۔ ۔ ۔ اور بھی بہت کچھ، جو ہمیں پہلے کبھی نہیں ملا تھا، جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے لیے وہ سب نیا تھا۔" اُس کی آواز ترخ رہی تھی۔ "بہرحال، اب تو سب ختم ہو گیا ہے۔" میں نے شگفتگی سے کہنے کی کوشش کی لیکن میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"ہاں، ایک باب ختم ہو گیا، دوسرا شروع ہوا ہے۔" اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ "ہم یہی کہنا چاہتے ہیں کہ خانم کی آمد سے جو نئی ڈوری بندھی ہے، اُسے ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ خانم تو یہاں آگئی ہیں لیکن آن کو لانے والے بھی ہمیں اُنھی کی طرح محترم، اُنھی کی طرح عزیز ہیں۔ ہم نے اب تک بہت کچھ کہا ہے لیکن ہمیں ہر لفظ حقیر معلوم ہوتا ہے۔ ہر لمحے یہ احساس فزوں ہوتا ہے کہ ہماری زبان ہمارا ساتھ نہیں دے رہی۔ ہمیں کہنے دیجیے کہ صرف خانم ہی ہمیں نہیں ملیں، اُن کے ساتھ ہم نے اور بھی بہت کچھ پایا ہے اور ہم اُسے کھونا نہیں چاہتے!"

"جی، جی ہاں، کھونے کا کیا، یہ سلسلہ تو قائم رہے گا۔" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔ "آپ کی نوازش ہے جو آپ ایسا سمجھتی ہیں، میرے لیے یہ اعزاز ہے۔ کم از کم میری طرف سے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہ ہو گی۔"

"نہیں نہیں، شکایت نہیں۔" وہ تڑپتی آواز میں بولی۔ "صرف شکایت ہی نہیں، ہماری مراد ہے۔ ۔ ۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس سلوک کے خواست گار ہیں۔ ہم کس طرح کہیں۔ شاید ہماری آواز اسی سبب سے گھُٹ رہی ہے کہ یہ سب کچھ قبل از وقت ہے، بہت بے محل ہے لیکن موسموں کا کیا اعتبار پھر وقت ملے نہ ملے، اس لیے ہم سب آج ہی کہہ دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمیں کسی مطالبے کا کوئی اختیار نہیں مگر ہم تو محض اپنی خواہش کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہمارا جی چاہتا ہے۔" وہ ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کہ اس حویلی سے آپ کی نسبت کسی طور قائم رہے۔ ہم آپ کو، آپ کو اس حویلی ہی کے ایک فرد کے طور پر پہچانیں۔ جیسے ہم ہیں، اِن درو دیوار کا ایک حصّہ جیسے جیسے۔" اُس کی آواز ٹوٹ گئی۔ مجھے اپنے سُننے ہوئے پر بار بار شبہ ہوتا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ "آپ جانے کیا کہیں لیکن کچھ یہی ہے۔ ہمارے لیے یہ دوسرا ہی موقع ہے کہ ہم حویلی کی ہزار روایتیں توڑ کے یوں آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ صرف اس لیے نہیں کہ خانم کی آمد کی خوشی میں جہانی بھائی پر ایک بے خودی سی طاری ہے اور آپ سے تپاک کے لیے اُن کی جانب سے ہمیں خاص ہدایتیں ملی ہیں۔ یہ رعایت اپنی جگہ لیکن ہم تو آپ کے پاس اپنے ارادے سے حاضر ہونا چاہتے تھے اور خدا جانتا ہے، اب ہم میں جہانی بھائی کا سامنا کرنے کی استقامت بھی موجود تھی۔ ہم بادر[illegible]

[...]ن کر یں گے کہ یہ محض ہمارے اندر چھُپی ہوئی ندامتیں ہیں۔ جو [...]ں آپ کے سامنے بے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کیا کوئی ازالہ کوئی [...]رک ممکن ہے۔ یہ صلہ نہیں ہے اور ہم صلہ دے بھی کیا سکتے ہیں۔ [...] دولت آپ نے پہلے ہی ٹھکرا دیا ہے۔ اس کے سوا ہمارے [...]ں اور ہے بھی کیا۔ ہم تو اُلٹا آپ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ اِسے [...]ن ظن بھی نہ سمجھا جائے۔ پشیمانی کا احساس اپنے اظہار پر تمام ہو [...]ا ہے اور صلہ اگر ممکن ہوتا یا آپ طے کر دیتے تو ہم مقدور بھر کوشش [...]تے۔ اگر اتنا ہوتا تو کیا ہماری سیری ہو جاتی۔ ہماری طلب تو پھر بھی [...] جگہ قائم رہتی۔ ہم اپنے ایک محسن سے ضرور مخاطب ہیں لیکن یقین کیجیے [...]ری نظروں میں آپ کا درجہ اسی قدر نہیں ہے۔ ہمیں کچھ ایسا محسوس [...]ا ہے کہ ہمارا کوئی کھویا ہوا مل گیا ہے۔" اُس کی آواز لرزنے لگی تھی۔ [...]م اُس شخص سے مخاطب ہیں جسے ہم نے اُس رات زنداں میں دیکھا [...] جس کی آواز ہمیں بہت شناسا معلوم ہوئی تھی۔ سو ہم تو اپنے دل کی [...]ن کر رہے ہیں جس میں آپ کے لیے کوئی دریا سا موج زن ہے۔ ہمارا [...] چاہتا ہے کہ ہم آپ کے کسی کام آئیں۔ ہمارا اِس طرح بے محابا آپ [...] پاس آنا کیا صرف اظہارِ ممنونیت کی بے کلی کے سبب ہے؟ ہم [...]ارے حجابات ترک کر کے آئے ہیں کہ آپ کو کچھ باور کرا سکیں۔ آپ [...] قدم حویلی کے در و بام کی طرف بڑھتے ہوئے رکاوٹ محسوس نہ کریں۔ [...]ریان کوئی بھید بھاؤ نہ رہے۔ آپ جان لیں کہ یہاں آپ کے کیسے [...]بے طلب گار موجود ہیں۔ یہ حویلی آپ کا زنداں ہو سکتی ہے تو آپ کا گھر بھی۔ [...]لک کیکن آپ کے صیاد ہو سکتے ہیں تو آپ کے صید بھی۔ آپ سے کسی [...]اقت کا احساس ہمارا اعزاز ہے اور یہ تو ہماری طلب کی بات ہے [...] آپ کے قرینہ عطا سے مشروط نہیں۔ اگر ہماری طلب میں کوئی نقص [...]ہے تو یقیناً یہ بار آور نہیں ہو گی۔"

میرے کان سنسنا رہے تھے اور سارا جسم جیسے پتھر ہوتا جا رہا [...]ھا۔ مجھے کوئی بھی جواب دینے کا یارا نہیں تھا۔ گیتی چُپ ہو گئی تھی لیکن اُس کی آواز کی بازگشت میرے سینے میں دھمک رہی تھی۔ ہر لمحے [...]لجے یہی گمان ہوتا تھا کہ یہ سب میرے حواس کی بے توازنی کا فشار [...]ہے۔ میرے حواس میرا ساتھ نہیں دے رہے یا میں کسی بہت عجیب [...] خواب سے دوچار ہوں۔ مجھے نہیں معلوم، کتنی دیر کمرے میں خاموشی [...]سلط رہی پھر گیتی کی آواز پر ایک دم میرا وجود جھن جھنا اُٹھا۔ "رات [...]ہمیں خانم سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔"

"کیسی بات؟" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"یہی کچھ۔" وہ ٹھیرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "گو رات کوئی محل تو نہ تھا لیکن اُن کا رسمی شکریہ ادا کرتے ہوئے ہمیں اُن سے چند غیر رسمی باتیں کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ وہ ایک نہایت شائستہ خاتون ہیں۔ ہمیں اپنے شوہر کی پسند و ناپسند کا اچھی طرح علم ہے۔ وہ ہمیشہ سے گوہر شناس رہے ہیں۔ سو ہم خانم کو دیکھنے، اُن سے بات کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ بے شک وہ کسی ملکہ ہی کے مانند ہیں۔ یہی تو ہم سوچتے تھے، وہ شخص کیسا ہو گا جو اُنھیں اس قدر مطلوب ہے۔ خانم کو صورت و سیرت میں خدا نے بہترین صفات سے نوازا ہے لیکن یہ خوبیاں تو مستزاد ہیں۔ وہ کیسی بھی ہوتیں، ہمارے لیے ہر حال میں معزز و محترم تھیں۔ باتوں باتوں میں ہم جیسں نے آپ کا ذکر چھیڑ دیا اور ہمیں اپنے اندازوں کی سند مل گئی۔"

"انھوں نے آپ سے کچھ کہا ہے؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"وہی سب جو ہم نے آپ کو دیکھ کے اخذ کیا تھا، جو ہمارے لیے نیا نہیں تھا لیکن خانم کی زبانی سُن کے ہمارا اشتیاق و اضطراب اور بڑھ گیا۔"

"آپی نے آپ کو کیا بتایا؟" میں نے ہانپتے لہجے میں پوچھا۔

"انھوں نے نہایت فخر اور مسرت سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ کیفیت جو کسی کی شدید وابستگی کے اعتماد ہی میں ممکن ہے۔" گیتی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لرزنے لگی۔ "یقین کیجیے، ہمیں بہت رشک آیا۔ آپ کے نام پہ اُن کی آنکھوں سے روشنی پھوٹنے لگی تھی۔"

"مگر آپی! وہ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"زیادہ وقت کہاں مل سکا۔ پہلی ہی ملاقات تو تھی۔ ہم تو اُن کی اجنبیت کا احساس دُور کرنے اُن کے پاس گئے تھے۔ صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی، ہم اُن سے کتنی باتیں کر سکتے تھے۔ بس اشارے کنائے تھے، اور ہم نے آپ کو بتایا تا کہ وہ بھی بس ہمارے جانے ہوئے کی تصدیق کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہم نے خود بھی تو کچھ جانا بوجھا تھا۔ اُس رات زنداں میں ہم نے آپ کو قریب سے دیکھا تھا اور ہمیں اجازت دیجیے، اگر ہم کہیں کہ ہم نے قریب سے محسوس کیا تھا۔ آپ کے ساتھی بزرگ کے بارے میں ہم ایک اچھی رائے کے سوا کوئی واضح تصوّر اپنے ذہن میں قائم نہیں کر سکتے تھے لیکن آپ کی بات دوسری تھی۔ آپ ہماری توقع سے بالکل مختلف تھے اور ہم بتائیں کہ آپ کو دیکھ کے ہمارے جسم و جاں پر چھائے ہوئے طرح طرح کے اندیشے یکسر نہیں تو ایک حد تک چھٹ گئے تھے اور ہمیں کم از کم یہ گداز مل گیا تھا کہ ہمارا واسطہ اہلِ دل لوگوں سے ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ آپ بہت خطرناک لوگ ہیں، کم از کم آپ کی حد تک یہ بہتان ہی معلوم

ہوتا تھا۔ ابتدا میں ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمارا مخاطب کون ہو سکتا ہے۔ لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ حسب نسب کے امتیاز کے علاوہ وہ تعلیمی مناصب سے بھی آراستہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی نے شاید اُس سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ اُس کی آواز کی یہ تمبیدگی بے سبب نہیں ہوگی، اور یہ تو کلام کی بات ہے۔ ممکن ہے، جیسے آپ ابتدا میں خاموش تھے، خاموش ہی رہتے تو بھی آپ کی آنکھیں، آپ کا چہرہ تو ہمارے سامنے تھا۔ ہم جان گئے تھے کہ ہمارا مخاطب نوجوان ایک اسی زنداں میں نہیں، زندگی بھی اس کے لیے زنداں بنی رہی ہے۔ اُس کے چہرے پر یہ دھواں سا کیوں چھا جاتا ہے اور اُس کی آنکھوں میں یکایک یہ ویرانیاں کہاں سے سمٹ آتی ہیں۔ اُس کی نگاہیں اچانک بھٹکنے، منڈلانے لگتی تھیں جیسے کسی کو کچھ یاد آ جائے اور اُس میں جو استقامت نظر آتی ہے، وہ امید ہی کی علامت ہو گی۔ اُس کی اُمید نہیں ٹوٹی ہے۔ اُمید ٹوٹ جائے تو بہت سے دُکھ راکھ ہو جاتے ہیں لیکن یہ اُمید بڑا عذاب ہے، یہ استقامت، یہ اوسان بجا رکھنے کی کوشش، تو دوسرا ستم ہے۔ آدمی ذرا سی ٹھیس لگنے پر رنگ بدل لیتا ہے۔ سامنے راستے میں کانٹے بچھے ہوں تو دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے مگر یہ بے حوصلہ لوگوں کا شیوہ ہے۔ جانے کیوں ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ آپ کی حالت ہم سے مختلف نہیں ہے بلکہ ہم سے کچھ سوا ہی ہے۔ ہم نے کبھی کوئی شعر پڑھا تھا، یاد تو نہیں آ رہا، مفہوم کچھ ایسا تھا کہ جن کے پاس ہم چارہ گری کی آس میں گئے، وہ ہم سے بھی زیادہ طلب گارِ نگاہ تھے۔ وہاں سے آ کے برجیس بہت روئیں۔ ہم سے کہنے لگیں، گیتی! تم نے انھیں دیکھا! ہم کیا کہتے، چپ ہو گئے۔ ہم نے ان سے نہیں کہا کہ ہماری آنکھوں پر شاید تم سے کچھ زیادہ ہی عذاب گزرا ہے۔"

میرے ہاتھ اپنا چہرہ چھپانے کے لیے اُٹھتے تھے اور جم کے رہ جاتے تھے۔ ضرور خانم نے اُس سے کچھ کہا ہو گا۔ جانے کیا کیا کہا ہو گا۔ میرے دل کی بات جیسے گیتی تک منتقل ہو گئی، گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی: "خانم کے کسی حوالے سے نہیں، ہم نے سب اپنے طور پر قیاس کیا تھا۔ اس پہلی اور سرسری ملاقات میں خانم ہمیں کیا بتا بھی سکتی تھیں۔ ہمیں اُن کی تائید کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے لہجے میں پھر ایسا تیقن، ایسا وثوق نہ ہوتا۔ ہماری آپ سے یہ دوسری ملاقات ہے لیکن یہ ہمی جانتے ہیں کہ ہم آپ کو کتنی بار دیکھ چکے، آپ سے کتنی بار مل چکے ہیں۔ خانم کی آمد سے پہلے بھی آپ سے ہماری شناسائی میں کوئی کمی نہیں تھی۔ جب آپ یہاں تھے تو آپ کے زندانی ہونے کا دُکھ تھا اور اپنی بے چارگی کا، آپ یہاں سے چلے گئے تو خوشی کے ساتھ ساتھ یہ خلش بھی ڈستی رہی کہ آپ ہم سے دُور ہو گئے ہیں۔ ہم کچھ بھی نہ کر سکے، کچھ بھی نہ کہہ سکے۔"

میرا سینہ اندر سے جیسے کوئی دھنک رہا تھا تاہم میں نے آنسو اپنی آنکھوں سے چھپائے رکھنے کی کوشش کی۔ نہ مجھ میں وہاں سے اُٹھ کے بھاگنے کی طاقت تھی، نہ اُس سے یہ کہنے کی کہ خدا کے لیے وہ خاموش ہو جائے، اتنا ہی بہت ہے۔ میں نے نہیں دیکھا، برجیس نے یا تو کوئی اشارہ کیا تھا یا گیتی کو خود ہی احساس ہو گیا تھا، وہ چپ ہو گئی تھی۔ اتنے میں ایک خادمہ طشت اُٹھائے سنبھلے قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ اُن دونوں کی نگاہیں اُس کی جانب مبذول ہوئیں، مجھے اپنی سانسیں استوار کرنے کی فرصت مل گئی۔ خادمہ نے چائے کا پہلا طشت اُٹھا کے اُس کی جگہ دُوسرا رکھ دیا۔

"آپ نے کچھ بھی نہیں لیا، چائے بھی رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی۔" برجیس کی آواز نسبتاً کھلی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، اُس نے شرمگیں لہجے میں مجھ سے شکر کے لیے پوچھا۔ اُس کی بڑی بڑی سوالیہ آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میں نے سٹپٹائے ہوئے انداز میں اُسے بتایا کہ دو چمچوں کے بہ قدر۔ برجیس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ جب وہ شکر گھول رہی تھی تو پیالی کی کھنک میں اُس کی چوڑیوں کی کھنک بھی شامل ہو گئی۔ چائے بنا کے اُس نے پیالی میری طرف بڑھائی، ایک ثانیے کے لیے میرے سارے جسم میں اندھیرا سا چھا گیا۔ اُس کے ہاتھ سے پیالی تھامتے ہوئے میرے ہاتھ ڈگمگا رہے تھے۔ میں نے جلدی سے پیالی ہونٹوں سے لگا لی، میرا مُنہ جل گیا۔ پیالی ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گئی۔

"وقت کا کچھ احساس ہی نہیں ہُوا۔" گیتی آہستگی سے بولی۔

"دن خاصا روشن ہو گیا ہے۔" میں نے بے چینی سے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کہنے لگی: "آپ نے تو کوئی بات ہی نہیں کی، اور ہم نے اس کا موقع بھی کب دیا لیکن اب ہمارے پاس کہنے کو شاید کچھ نہیں ہے۔ یقین کیجیے کہ اب ہمیں پہلے جیسی گراں باری محسوس نہیں ہو رہی، البتہ آپ کی خاموشی سے یہ خیال آتا ہے کہ کہیں۔ ۔ ۔ کہیں ہمارا غبار آپ کی سرگرانی کا سبب نہ بن گیا ہو۔ بخدا ہمارا یہ مقصد نہیں تھا۔ ہم نے آپ سے پہلے کہہ دیا ہے کہ ہماری عرضِ حال کے لیے آپ کی تائید و تردید لازم نہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ہمیں بہر طور آپ کی خوشی عزیز ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" میں نے ہکلاتے لہجے میں کہا۔ "سرگرانی کیسی

...ے بارے میں ایسی باتیں سُن کے کسے خوشی نہیں ہو گی۔ کون ایسا ...ا جو یہ سب جان کے خود پر ناز نہیں کرے گا لیکن۔ ۔ ۔" مجھے ...یہ ہوا کہ میری زبان سے کوئی اُلٹی سیدھی بات نہ نکل جائے اس ...یں نے اسی پر اکتفا کیا۔

"آپ چُپ کیوں ہو گئے؟" برجیس بے تابانہ بولی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے بے ترتیبی سے کہا۔ "میں کہنا چاہتا تھا ...ں کسی طرح اِس عزت اور احترام کے لائق نہیں۔ میں تو ایک ...ت معمولی بلکہ ایک ناکارہ آدمی ہوں، اور یہ میں کسی انکسار میں ...ں کہہ رہا ہوں، حقیقت یہی ہے۔ بہرحال یہ سب کچھ میرے ...، ایک شرف ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں۔ ۔ ۔ جہاں ...رے ایسے تپاک کرنے والے، مجھے اتنی عزت دینے والے موجود ...ں، وہ گھر میرا کیوں نہ ہو گا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اب ...ھے یہاں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔" میں نے ...بارگی سر اُٹھا کے دیکھا۔ اُن کی آنکھیں دمک رہی تھیں اور ...یس کے رخساروں پر تو بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔ میرا دل ...ی اُمڈنے لگا تھا۔ اُن کے چہروں پر وہی شفق پھوٹ رہی تھی جو ...ی اُمید بر آنے پر ہوتی ہے یا کسی بچھڑے ہوئے کے اچانک مل ...انے پر۔ اُن کا یہ عالم دیکھ کے میرا جی چاہا کہ میں اُن سے مزید کچھ ...وں تاکہ وہ اور گلنار ہو جائیں۔ وہ منظر اتنا دل نشیں تھا کہ چند لمحوں ...ے لیے مجھے اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ برجیس تو بالکل دُلھنوں کے ...ند شرما رہی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے اُس کے سارے بدن سے ...اُمڈ کے آنسو آنکھوں میں سمٹ آئے ہوں۔ میرے لیے یہ سب ...ھر دیدنی تھا۔ ان جیسی نازک اندام، حورِ شمائل کی نظر میں، میں ایسا ...معتبر ہوں کہ میری ایک جنبشِ لب سے ان کے رنگ دُھندلے پڑ ...جاتے ہیں، ان کے رنگ کھِل اُٹھتے ہیں یہ جان کے مجھے بہت آرام ...ل رہا تھا اور ایک توانائی، برتری سی محسوس ہو رہی تھی اور میں ...ہیں کھو سا گیا تھا۔

"ہمیں آپ کے ظرف کا اتنا ہی یقین تھا۔ یقیناً اب ہمارے ...بُرے دن ہم سے دُور ہو گئے ہیں۔ یہ قبولیت کی گھڑیاں ہیں سوچتے ...ہیں ہم اپنے خدا سے اور کیا مانگیں۔ خانم کے قدم واقعی بڑے مبارک ...یں۔" گیتی کی آواز کمرے میں منڈلا رہی تھی: "خدا کرے، یہ حویلی بھی ...خانم کو راس آ جائے۔"

خانم کے نام پر مجھے اچانک خیال آیا کہ مجھے اُس سے نواب ...عالم تاب کے بارے میں پوچھنا چاہیے۔ خانم کب اور کس طرح اُس کے سامنے گئی۔ خانم کو دیکھ کے تو اُس پر قیامت گزر گئی ہو گی۔ اچھا ہوا کہ مجھے وقت پر نامناسبت کا احساس ہو گیا اور لفظ میری زبان پر تلملا کے رہ گئے۔ یہ اس سے پوچھنے کی بات نہیں تھی۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا تھا کہ وہ نواب عالم تاب کی بیگم بھی ہے، وہ کیا کہہ سکتی ہے وہ تو وہاں موجود بھی نہیں ہو گی، اس کا اندازہ تو اُس کے چہرے سے بھی ہو سکتا ہے۔ نواب عالم تاب کی طرف سے مطمئن ہو کے ہی وہ دونوں میری طرف آئی ہوں گی۔ یہ فراغت اطمینان کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ نواب کو اُس کا مسیحا مل گیا تھا۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ برجیس کی آواز نے مجھے منتشر کر دیا۔ "آپ کے باوا جان بھی تو آپ کے ساتھ ہیں۔" اُس کے لہجے میں پہلے سے زیادہ اعتماد تھا۔

"جی ہاں۔" میں نے پہلو بدل کے کہا۔ "اُن کا یہاں ہونا بھی ایک اتفاق ہے اور ہم سب کا حیدر آباد میں ہونا بھی۔ ہم کہیں اور جا رہے تھے کہ راستے میں ہم نے حیدر آباد کا اِرادہ کر لیا۔ ابا جان کی فکر ہی سب سے زیادہ تھی۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ ہم یہاں ایک حویلی میں قید ہیں۔"

"بے شک۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کتنے پریشان ہوں گے۔"

"کیسا صبر آزما وقت کاٹا ہو گا انھوں نے۔" گیتی اداس لہجے میں بولی "ہم تسلیمات اور معافی کے لیے اُن کی خدمت میں ضرور حاضری دیں گے۔ کاش آپ اُس وقت ہماری گزارش توجہ سے سُن لیتے۔ یاد ہے، ہم نے عرض کیا تھا کہ ہم آپ کے پُرسانِ حال کو آپ کی خیریت کی اطلاع پہنچانے کی ایک کوشش کر سکتے ہیں۔"

"یاد ہے، اور ہمیں آپ پر پورا بھروسا بھی تھا لیکن یہ خبر سُن کے کہ ہم ریاست کے ایک بڑے نواب کے ہاں قید ہیں، وہ وحشت میں کوئی بھی ایسا قدم اٹھا سکتے تھے جو صورتِ حال مزید پیچیدہ کر سکتا تھا۔"

"آہ! آپ نے خود پر کتنا جبر کیا تھا۔" گیتی خجالت سے بولی۔ "ایسی حالت میں یہ تحمل اُنھی سے ممکن ہے جن میں خدا نے صبر و ضبط اور عقل و ہوش کی اعلا خوبیاں ودیعت کی ہوں۔"

میں نے چائے کی پیالی ختم کر لی تھی۔ برجیس نے مجھ سے مزید چائے کے لیے پوچھا۔ اُس کے انداز و اطوار میں تمکنت اور ناز کے علاوہ ایک لپک سی تھی۔ ایک ایک لفظ ترازو میں تُلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی آواز میں ایسی لپک اور کھنک تھی کہ منع کرنا مشکل ہو جاتا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اُس نے بھی اصرار نہیں کیا اور خاص دان میری جانب بڑھا دیا۔ خادمہ ابھی ابھی خاص دان رکھ کے

گئی تھی۔ رات کے پان کا ذائقہ مجھے ابھی تک یاد تھا۔ میں نے چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی ایک گلوری مُنہ میں رکھ لی۔ "سُنا ہے آپ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتے ہیں؟" گیتی نے مختصر سکوت کے بعد مجھ سے پوچھا اور حسرت آمیز لہجے میں کہنے لگی "کیا ہی اچھا ہو کہ آپ چند دن یہیں قیام فرمائیں۔"

میں نے دھیمی آواز میں کہا کہ مجھے ابا جان اور دوسروں کی بابت کچھ علم نہیں کہ اُنھوں نے روانگی کے لیے کیا طے کیا ہے البتہ اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے، ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ میرے جی میں آئی، اُنھیں بتا دوں کہ بمبئی میں ہم کن لوگوں کے پاس جا رہے ہیں۔ اُن کے پاس، جن سے بچھڑے ہوئے مجھے ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ میں اُنھیں اگر یہ بتا دیتا تو اور بہت سی باتیں نکل آتیں۔ ویسے بھی ہر لمحے مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ اِدھر اُدھر کے سوال نہ کرنے لگیں۔ نہ معلوم خانم نے اُنھیں کیا کیا اور کس طرح بتایا ہے مگر اُنھوں نے مجھ سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا یقیناً وہ مجھ سے متعلق اپنے ذہن میں بھٹکنے والے بے شمار سوالوں سے دانستہ اجتناب کر رہی ہوں گی۔ اُن کے اطمینان میں ایک خوف بھی نمایاں تھا کہ کہیں اُن سے کوئی بھول نہ ہو جائے اور میری دل شکنی میرے لیے اُلجھن کا سبب نہ بن جائے۔

"خانم کے سکون کے لیے چند دن آپ کا یہاں قیام کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس عرصے میں وہ حویلی کے ماحول سے مانوس ہو جائیں گی۔" گیتی رُک رُک کے بولی۔ "اور ہمارا، ہمارا ابھی یہی جی چاہتا ہے۔"

"میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا، اگر ابا جان نے اِرادہ کر لیا تو اُن کے ساتھ جانا پڑے گا۔ رات بڑے نواب صاحب بھی اسی خواہش کا اظہار کر رہے تھے۔ میں پھر آجاؤں گا اور جلد ہی آؤں گا۔"

"ہم ابا جان سے خود درخواست کریں گے۔" برجیس نے چہکتی آواز میں کہا۔ "ہمیں یقین ہے، وہ ہماری بات مسترد نہیں کریں گے۔"

"لیکن وہ بٹے ہوئے رہیں گے۔ جب تک اُنھیں جہاں جانا ہے، وہ نہیں آئیں گے، اُن کا دل بے چین رہے گا۔"

"ایسی کوئی بات ہے تو ہم اُن سے اصرار نہیں کریں گے، یُوں بھی آپ کی بات مناسب معلوم ہوتی ہے۔" گیتی مایوسی سے بولی۔ "آپ کو منزلِ مقصود پہ پہنچنے میں پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

دھوپ کچھ اور بڑھ گئی تھی، کمرہ خوب روشن ہو گیا تھا۔ میرا ایک دل وہاں سے اُٹھنے کو کہتا تھا تو دوسرا یوں ہی اُن کے پاس بیٹھے رہنے کو، لیکن اتنی دیر سے وہ حویلی کے دوسرے مکینوں کی نظروں سے دُور تھیں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے دبے لہجے میں اُن سے اجازت چاہی۔ اُنھوں نے مجھ سے تھوڑی دیر اور ٹھیرنے کے لیے اصرار کیا۔ میں بیٹھا رہا۔ وہ کن اَنکھیوں سے مجھے دیکھا کیں اور ... اُنھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن کہہ نہ سکیں۔ میں بھی اُن سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کیا، یہ ذہن میں کہیں گُم ہو گیا تھا۔ دریچوں سے نرم نرم ہوا اندر آ رہی تھی۔ کبھی کوئی تیز جھونکا آتا تو کمرے میں بسی گلاب کی خوشبو منتشر ہو جاتی۔ دُور دروازے کے قریب ایک خادمہ بُت کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ برجیس کی تیز سانسیں اُس کے چہرے سے صاف نمایاں تھیں۔ اَچانک اُس کے نتھنے اور ہونٹ پھڑکنے لگے تو میری سمجھ میں کچھ اور نہیں آیا تو میں نے کہا۔ "آپ کو دیر ہو رہی گی۔ میں پھر کسی وقت آجاؤں گا۔"

"ہم بھی یہی کہنے والے تھے۔" گیتی ہمکتی آواز میں بولی۔ "اور ہمیں ابھی تک یہ شبہ ستا رہا ہے کہ ہمیں از سرِ نو سب کچھ دہرانا چاہیے۔"

"نہیں، نہیں۔" مجھے اپنی زبان پر اختیار نہیں رہا تھا۔ "سب کچھ میرے دل پہ نقش ہے۔" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا اور میں اُسی وقت اُٹھ گیا۔

"ہم منتظر رہیں گے۔" برجیس مضطرب لہجے میں بولی۔

"اب آپ کو یہ راستے یاد رہیں گے نا!" گیتی نے اشتیاق سے کہا۔ "ورنہ کسی بھی خادمہ سے کہہ دیجیے گا، ہم خود حاضر ہو جائیں گے۔"

وہ دونوں بھی میرے ساتھ اُٹھ گئی تھیں۔ برجیس نے سر سے ڈھلکتا ہوا دوپٹا ٹھیک کیا اور لپکتے لہجے میں بولی۔ "آپ گل دستہ بھولے جا رہے ہیں۔"

"اوہ۔" میں نے تیزی سے مُڑ کے دیکھا۔ جو گل دستہ خا... بالائی منزل پر میرے لیے لائی تھی، وہ میں یہاں ساتھ لے آیا تھا اب اُسے چھوڑے جا رہا تھا۔ مجھے بڑی خفت ہوئی۔ میں نے گل دستہ قالین سے اُٹھا لیا۔ وہ دونوں میرے پہلو بہ پہلو چلتی کمرے سے باہر آئیں۔ میرے قدم بہک رہے تھے۔ باہر راہ دا... میں وہ اُس مختصر فاصلے تک میرے ساتھ رہیں جہاں سے بالا... منزل کے لیے زینہ جاتا تھا۔ وہ زینے پر بھی میرے ساتھ آنا چا... تھیں۔ میں نے اُنھیں روک دیا۔ زینے پر قدم رکھنے سے پہلے ... نے اُنھیں آداب کیا اور شکریہ ادا کرنا چاہا لیکن شکریے کا لفظ زبان پر آ کے رہ گیا۔ گیتی سر اُٹھائے میرے با... مقابل کھڑی تھی اور برجیس اُس سے ایک قدم پیچھے، دونو... کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں، اور رخساروں پر سُرخی چٹک ر...

...برجیس کے سراپا کا ارتعاش میری نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔ ...میں اُن سے بہت دنوں کے لیے رُخصت ہو رہا ہوں، اُن ...چہروں پر کچھ ایسا ہی ہیجان چھایا ہوا تھا۔ میری رگوں میں بھی ...کی گردش جیسے رُک گئی تھی۔ اِس موقع پر کون سا رویّہ مناسب ...ہے۔ یقیناً مجھ سے کوئی چوک ہو رہی ہے، مسلسل یہی گمان ...ے ہاتھ پیر جکڑے لے رہا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ میں جلد سے جلد ...کے سامنے سے ہٹ جاؤں۔

میں نے ابھی زینے پر قدم رکھا تھا کہ گیتی کی گونجتی آواز نے روک لیا۔ "ہم حویلی سے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔" وہ جھجکتے ...ئے بولی۔ "یہ حویلی خاصی پیچیدہ ہے لیکن یہاں ایسے کئی مقامات اور ...ہیں، جو شاید آپ کی دل بستگی کا باعث ہو سکیں۔ گو خادموں کو ...ت کر دی گئی ہے لیکن آپ جب ضرورت سمجھیں، اُنھیں طلب ...نے میں کوئی تکلف نہ کیجیے گا۔ وہ آپ کے قریب ہی رہیں گے۔ ...میں نہانے کا تالاب، مختلف کھیلوں کے انتظامات، اُن کے ...مخصوص کمرے اور سیر کے لیے دوسرے کئی مقامات ہیں۔ ایک ...مدت کی رعایت دی جائے تو خادم موسیقی کا اہتمام بھی کر سکتے ...، حویلی سے بیس میل کی دُوری پر گول کنڈے کی جانب شکار گاہ ...، چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا یہ سبزہ زار اب کسی قدرتی جنگل ...شکل اختیار کر گیا ہے۔ موٹریں آپ کو ایک گھنٹے سے کم مدت ...وہاں تک پہنچا سکتی ہیں۔ وہاں فیل خانہ بھی ہے اور گھڑ سواری ...انتظام بھی۔ مصنوعی جھیل میں کشتی چلتی ہے۔ غرضیکہ وہاں شکار ...ے علاوہ دل کش مناظر بھی کثرت سے موجود ہیں۔ ہر چند کہ ...تفصیل کی ضرورت نہیں تھی لیکن ہم نے سوچا، آپ کے گوش گزار ...دیں تو بہتر ہے۔"

میں سُنتا رہا۔ گیتی چپ ہوئی ہی تھی کہ برجیس مُسکراتے ہوئے ...لی۔ "اور یہاں ایک زنداں بھی ہے۔"

"جی، جی ہاں۔" میں نے بے خیالی میں سر ہلا دیا تھا لیکن ...سرے لمحے بے ساختہ مجھے ہنسی آ گئی۔ اُن کے موتیوں جیسے دانت ...دمکنے لگے۔ میں نے اُنھیں اس عالم میں پہلی بار دیکھا تھا۔ ایسا ...لگا جیسے ہر جانب پھُل جھڑیاں سی چھُوٹ پڑی ہوں۔ کسی نے غلط ...نہیں کہا ہوگا۔ اُس لمحے خود مجھے ایسا لگا جیسے فضا میں جل ترنگ ...بج اُٹھے ہوں، ہر سو پھول کھِل اُٹھے ہوں مگر جلد ہی وہ میری ...آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔

بالائی منزل پر اُن میں سے کوئی نہیں تھا۔ خادم سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ناشتے کے بعد ابھی ابھی سب بڑے نواب کے ساتھ باغ کی طرف نکل گئے ہیں۔ میں بھی نیچے اُتر آیا۔ عمارت سے کچھ فاصلے پر باغ کے اِبتدائی حصّے میں بنی ہوئی سُرخ پتھروں کی بارہ دری میں وہ مجھے نظر آ گئے۔ بارہ دری کے فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ اُن کے سامنے جاتے ہوئے میرے پیر اٹک رہے تھے۔ اُنھوں نے ضرور میری تلاش کی ہو گی۔ میں اُنھیں اپنی غیر حاضری کی وجہ کیا بتاؤں گا۔ درمیان میں بڑا نواب بیٹھا تھا۔ اُس کے پاس دائیں طرف ابا جان اور بیٹھل، اُدھر بائیں طرف منیر علی اور پیرو۔ خاں صاحب بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے اور تین چار دوسرے آدمی، شیروانی میں ملبوس۔ میں نے اُنھیں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ زورا اور کانتے وہاں نہیں تھے۔ چلتے چلتے میں اُن کے اتنے قریب پہنچ چکا تھا کہ کسی اور طرف نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اُنھوں نے اگر کچھ پوچھا تو صاف صاف بتا دوں گا۔ مجھے دیکھ کے وہ سب شگفتہ انداز میں چونک پڑے اور بڑے نواب نے بے اختیارانہ میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اُسے آداب کیا اور اُس کے پاس ہی جا بیٹھا۔ نواب نے اپنے اُٹھے ہوئے ہاتھ سے مجھے دبوچ لیا اور میری پیشانی چوم لی۔ میری سانس پھُول رہی تھی لیکن کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ میرا خیال تھا، نواب ناشتے کے بارے میں ضرور پوچھے گا مگر میرے بیٹھتے ہی وہ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ ظاہر ہے، اُسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں نے اتنا وقت زنان خانے میں گزارا ہے اور وہاں سے ناشتے کے بغیر نہیں آیا ہوں گا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا اُس کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں تھی۔ سبھی ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ بیٹھل کے سامنے طشت میں بڑی فرشی، اُونچے منقش نیچے کا حقہ رکھا ہوا تھا اور مُشک کی نقرئی منال اُس کے لبوں سے لگی ہوئی تھی۔ وہ اطمینان اور توجّہ سے نواب کی باتیں سُن رہے تھے۔ جو ریاست کی سرکاری عمارتوں میں انفرادیت قائم رکھنے کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ اُنھیں دیکھ کے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ نواب سے اُن کی شناسائی کا دوسرا دن ہے۔ میں نے بھی نواب کی باتیں توجّہ سے سُننے کی کوشش کی لیکن کچھ دیر بعد ہی میرا جی گھبرانے لگا۔ آتے ہی اُن کے درمیان سے اُٹھ جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ میں اپنے آپ کو باندھے بیٹھا رہا۔ بارہ دری کے مقابل فوّارہ چل رہا تھا اور سامنے دُور تک نظر آنے والی نہر میں شفاف پانی رواں تھا۔ اگر ہمارا رُخ مغرب

کی طرف تھا تو یہ نہر مشرق سے چلتی اور بارہ دری کی چوکی کے نیچے سے گزرتی ہمارے سامنے مغرب میں کہیں دُور جا کے مڑ گئی تھی۔ نہر کے دونوں اطراف کوئی دس دس قدم بعد اُونچے درخت لگے ہوئے تھے اور جگہ جگہ پھولوں کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے سے بنے ہوئے تھے۔ بڑا نواب اُنھیں حویلی کے نہایت خوب صورت مقام پر لایا تھا۔ بارہ دری کے پیچھے متعدد خادم سر جھکائے کھڑے تھے۔ میں وہاں سے کسی بہانے اُٹھنے کے لیے پَر تولتا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار گیتی اور برجیس کے چہرے آجاتے تھے۔ دیر ہو گئی تو مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ اب ایک ہی صورت تھی اور میں ایسے کسی موزوں وقت کا منتظر ہی تھا۔ کسی خادم کو ہدایت دینے کے لیے نواب کی توجہ چند لمحوں کے لیے اُس طرف مبذول ہوئی تھی کہ میں نے پیرو سے کانتے اور زورا کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اِدھر ہی کہیں باغ میں ٹہل رہے ہوں گے۔ میں فوراً اُٹھ گیا اور اُن کی طرف دیکھے بغیر نیچے اُتر آیا۔ اُنھوں نے مجھے روکا بھی نہیں۔ باغ طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ کانتے اور زورا مجھے بہت دُور جا کے ایک جگہ بمبہ خانوں کی طرف ملے۔ وہ بڑی بڑی جالیوں میں اُچھلتی کودتی رنگ برنگی چڑیوں کو اتنے انہماک سے دیکھ رہے تھے کہ میری آہٹ کا احساس بھی نہیں ہوا لیکن جیسے ہی مجھ پر اُن کی نظر پڑی، وہ بے قابو سے ہو گئے۔ "کدھر چلا گیا تھا رے؟" کانتے شکایتی لہجے میں بولا۔ "کم از کم اپنے کو تو بول کے جانا چاہیے تھا۔"

میں نے اُسے بتایا کہ اس کا وقت ہی نہیں ملا اور مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ اتنی دیر لگ جائے گی۔ "کیا تمھیں نہیں معلوم تھا کہ میں کس طرف گیا ہوں؟" میں نے تجسّس سے پوچھا۔

"اپن کو نوکر لوگ نے بولا تھا کہ تم اُودر نیچے کو گیا ہے اور ابھی اُدھر ہی بیٹھا ہے۔" زورا نے مجھے بتایا۔

"اور اُس نے کیا کہا تھا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اور وہ کچھ نہیں بولا۔" زورا نے تردّد سے کہا۔ "کیا بات ہے راجا! ابھی سب ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں، ہاں۔" میں نے جلدی سے سر ہلا کے کہا۔

"اپن سمجھ گیا تھا، اُودر خانم آپی نے تم کو مانگا ہوگا، ایسا ہی تھا نا! کیسا ہے وہ؟"

"نہیں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں اُن کے پاس نہیں گیا تھا۔"

"پھر کدھر کو گیا تھا؟" کانتے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ میں نے توقف کیا اور سوچتا رہا کہ اُسے کیا بتاؤں۔ میری خاموشی پر کانتے کی جستجو بڑھ گئی۔ "کیا بات ہے لاڈلے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے منمناتے لہجے میں کہا۔ "چھوٹے نواب کی بیگم نے شکریہ ادا کرنے بلایا تھا۔"

"اتنی سی بات ہے سالی تو پھر تیرا رنگ کیوں اُڑ رہا ہے۔ لگتا ہے، ابھی چوری کر کے اُدھر سے آیا ہے۔"

"کیسی بات کر رہے ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"کانتے بھائی ابھی ایک دم ٹھیک بولتا ہے راجا!" زورا دانت نکالتے ہوئے بولا۔ "قسم سے اپن کو بھی ایسا ہی کچھ جان پڑتا ہے۔"

مجھے اُن کا یہ مذاق بُرا لگ رہا تھا۔ "تم دونوں پاگل ہو گئے ہو۔" میں نے تنک کے کہا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ آخر اس تندی و برہمی کی کیا ضرورت تھی۔ "بس دیر لگ گئی۔" میں نے اُنھیں سنبھالنے کی کوشش کی کہ وہاں چھوٹے نواب کی بیگم نے ناشتے وغیرہ کا اہتمام بھی کر دیا تھا۔

"مگر تجھی کو کیوں بلایا تھا؟" کانتے معنی خیز لہجے میں بولا۔

"مجھی کو؟" میری آواز سٹ پٹانے لگی۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے ترشی سے کہا۔

"باپ، ابھی اپن سچ بولتا ہے۔" زورا دیدے مٹکاتے ہوئے بولا۔ "اپن کو لگتا ہے، تم کچھ چھپا رہا ہے۔"

"کیا چھپا رہا ہوں۔"

"اپنے کو یہ جان کاری ہوتی تو تجھ سے کیوں پوچھتے۔"

"تم نہ جانے کیا سمجھ رہے ہو۔"

"جانے دے جانی!" کانتے مجھے دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں وضاحت کرنا چاہتا تھا مگر کس بات کی وضاحت؟ میں اُسے بتاتا بھی کیا۔ سو میں نے حجت کے بجائے خاموشی مناسب سمجھی اور اُن کے ساتھ باغ میں گھومتا رہا۔ جیسا کہ گیتی نے بتایا تھا، حویلی کے عقب میں ذرا فاصلے فاصلے پر سُرخ پتھر سے کٹی ہوئی جالیوں کے اندر نہانے کا تالاب بنا ہوا تھا، بالکل انگلش طرز کا۔ جالیوں پر لمبے لمبے پردے پڑے تھے جو ضرورت پڑنے پر کھینچ دیے جاتے ہوں گے۔ وہاں کے چوکی دار نے ہم سے نہانے کے لیے پوچھا بھی۔ پانی بھی ایسا نکھرا ستھرا، آئینے کے مانند تھا کہ خود بخود نہانے کے لیے آدمی کا جی مچلے لیکن ہم اور آگے بڑھ گئے۔ باغ میں درختوں کے بیچ چھوٹی چھوٹی کئی عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ سب کی طرز منفرد تھی۔ جہاں جہاں سے ہم گزرتے، خادم سر جھکا کے اور ہاتھ باندھ کے ہمیں تعظیم دیتے۔ حویلی کے سارے ملازموں کو نئے مہمانوں کے متعلق ہدایات دی گئی تھیں۔ ٹینس کورٹ کی طرف

ے گزرتے ہوئے زورا حیرتی لہجے میں بولا۔ "راجا! ابھی تم دیکھتا ہے، لا بادشاہ بھی ایسا ہی مانک محل دو محلے میں رہتا ہوگا۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو بادشاہ بادشاہ پر منحصر ہے۔ شاید بہت ے بادشاہوں کو بھی ایسی جگہ نصیب نہ ہو۔"

"ایدر رہی زمین کا لوگ نے اُوپر جیسا جگہ بنا لیا ہے، اُوپر پھر ا ہوگا۔ اس سے جاستی کیا ہوئے گا۔"

"ابے، ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے۔" کانتے مُنہ بنا کے بولا۔ ھر ولایت میں گورے لوگ کے آگے، لوگ بولتے ہیں، سب سالے ، بھرتے ہیں۔ اُدھر اندر باہر سب جگہ جنّت ہے۔"

وہ یہی فضول باتیں کر رہے تھے کہ ایک جگہ زورا نے اشارہ کیا۔ ارے دائیں جانب کچھ دُوری پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ یہ حویلی دوسرا دروازہ تھا جو ملازموں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص ہوگا ونکہ اطراف میں بنے ہوئے مکانات ملازموں ہی کے ہو سکتے تھے۔ قریب پہنچے تو اُن کی تعداد، وضع قطع اور موجودی کے سبب کا ازہ ہوا۔ ایک جانب میدان میں دری بچھی ہوئی تھی اور بہت سے بڑے قرآنِ پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ ایک طرف دیگیں چڑھی ئی تھیں اور دروازے کے قریب چوکیوں پر رکھے ہوئے ملبوسات ، سامنے قطار در قطار لوگ بیٹھے تھے۔ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ی۔ خانم کی آمد ہی کے سلسلے میں غربا اور مساکین کو لباس اور کھانا تقسیم نے کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر سے باری باری بہت سے لوگ اندر آ رہے تھے اور ملازمین اُنھیں نظم و ضبط تلقین کر رہے تھے تاہم شور مچا ہوا تھا اور لوگ اپنی باری جلد آنے لیے ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری آمد ے ملازمین میں کسی قدر افراتفری سی ہو گئی۔ ہم پر توجہ دینے کے لیے اپنے کام سے غافل ہو گئے تھے اس لیے ہم وہاں نہیں ٹھیرے۔ چلتے تے پیر دُکھنے لگ گئے تھے۔ میں تو بس یُوں ہی اُن کا ساتھ دے رہا ا۔ بارہ دری سے اُٹھ کے مجھے کانتے اور زورا کی تلاش میں جانا ہی نہیں ہیے تھا۔ میں اپنے کمرے میں جا کے سارے دروازے بند کر کے ٹ جانا چاہتا تھا۔ برجیس اور گیتی کی باتیں میرے دماغ میں گونج ی تھیں جیسے سب از سرِ نو سُن رہا ہوں اور جیسے اب کچھ اُن کے معانی نکشف ہو رہے ہوں۔ اُس وقت تو میں نے کچھ سُنا ہی نہیں تھا، سُنا تھا تو اُس کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں بار بار مفاہیم رتیب دے دیتا اور سب کچھ جیسے کسی جھونکے سے منتشر ہو جاتا۔ انتے ابھی اور آگے جانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں دخل دیتا، زورا نے میری مدد کر دی۔ اُس نے تھوڑی دیر ستانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ کانتے نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ بھی تھکا تھکا سا معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنی طرف سے کچھ کہتا تو وہ اُلٹی سیدھی باتیں شروع کر دیتا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ دونوں دوبارہ بارہ دری کی طرف جانے کا ارادہ نہ کر لیں لیکن وہ بالائی منزل پر آ گئے۔ یہاں ہماری شب بسری کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ اُنھیں چھوڑ کے میں سیدھا اپنے کمرے کا رُخ کر لیتا چنانچہ مجھے اُن کے ساتھ کانتے کے کمرے میں جانا پڑا۔ خادم وہاں موجود تھا۔ اُس کے پوچھنے پر زورا نے اُسے چائے لانے کی ہدایت کی۔ دوپہر ہو رہی تھی، کھانے کا وقت ہوا ہی چاہتا تھا لیکن زورا کو بار بار چائے کی طلب ہونے لگتی تھی۔ پلنگ کے قریب ایک آبنوسی ڈبّے میں سگریٹ رکھے تھے۔ ولایتی لائٹر بھی اُس سے پیوستہ تھا۔ کانتے نے بستر پر پھیل کے اور نوابوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے سگریٹ سلگائی اور گہرے گہرے کش لینے لگا پھر صرف دو تین کشوں میں اُس نے سگریٹ بُجھا دیا اور جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کر بیڑی پینے لگا۔ مجھے اُن سے بہت سی باتیں پوچھنی تھیں۔ اُنھیں شاید معلوم ہو کہ ابّا جان اور بڑے نواب نے روانگی کے لیے کیا طے کیا ہے۔ نواب بیے خانم کے بارے میں اُن کی کوئی گفتگو ضرور ہوئی ہو گی۔ اُدھر ابّا جان کی حویلی میں ہمارے منتظر مارٹی، شامو، جمرو اور ٹنگو کو اطلاع دے دی گئی ہے کہ ہم ابھی یہیں رہیں گے یا اُنھیں بھی یہیں بلا لیا گیا ہے؟ ہو سکتا ہے، کانتے اور زورا کو بڑے نواب سے نواب عالم تاب کے بارے میں کوئی سُن گُن ملی ہو؟ میں نے اُن سے کچھ نہیں پوچھا۔ جانے کیوں، مجھے اندیشہ تھا کہ کانتے تلخ ہو جائے گا۔ اُن کے چہروں سے بظاہر بے دلی یا بے آرامی ظاہر نہیں ہو رہی تھی لیکن اندر کا کیا معلوم، نہ جانے اندر کتنا دُھواں بھرا ہو۔ میرے ٹوکنے پر اُنھیں کوئی بھی تاثر مل سکتا تھا کہ شاید میں پہلے کی طرح یہاں سے جانے کے لیے بہت مضطرب ہوں۔ یا میں یہ رائے ظاہر کرتا کہ کیا حرج ہے، اگر وہ چند دن اور ٹھیر جائیں۔ دونوں صورتوں میں طرح طرح کی باتیں اُن کے ذہن میں گھر کر سکتی تھیں۔ نہ مجھ میں وہ سب کچھ دہرانے کی ہمت تھی، نہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں اُنھیں کہاں تک بتاتا کہ گیتی اور برجیس نے کیسی کیسی التجائیں کی ہیں، ایسی التجائیں کہ اب نہ رُکنا بد دماغی ہو گی۔ اُنھوں نے اُن دونوں کو نہیں دیکھا تھا کہ وہ کیسی پھولوں کی طرح نرم و نازک ہیں، بالکل پریوں کے مانند۔ وہ تو شیشے کی بنی ہوئی لگتی ہیں، ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹنے کا ڈر لگے۔ وہ خود گیتی اور برجیس کے سامنے ہوتے تو یہی کہتے۔ غرض میں نے اپنی زبان بند ہی رکھی۔ گیتی

اور برجیس نے وہ سب کچھ میرے اعتماد میں کہا تھا، صرف مجھ سے۔ مجھے وہ خود تک ہی محدود رکھنا چاہیے تھا۔

تھوڑی دیر میں خادم چائے لے آیا تھا۔ میں نے بھی پی۔ وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے، زورا اڈے کی باتیں کرنے لگا کہ اِدھر حیدرآباد میں اڈا گیری ایسی مشکل بات نہیں ہے ورنہ آکا جیسا آدمی اُوپر نہ آتا۔

"آکا میں بل کتی نہیں تھا، بس سالا کھوپڑی کا اُلٹا تھا۔" کاتتے بولا "نظر کا بھی تھوڑا گرا ہوا تھا۔ ایک دو پھیروں میں ہی سُونگھ لینا چاہیے تھا کہ سامنے کون ہے، اُستاد تو جان کے سالے کو گھمائی دیتا رہا۔ اُدھر لوگ بھی کم نہیں تھے۔ اُستاد کو، اُن کو بھی تو کچھ بولنا تھا۔"

زورا نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ لیے اور بلکتے لہجے میں بولا "قسم سے کاتتے بھائی، ابھی اپن کا جی کرتا ہے۔ پُوری عمر بس اُستاد کے چرن میں کاٹ دے۔" وہ کاتتے سے التجا کرنے لگا کہ اگر وہ سفارش کر دے تو شاید بجھل اُسے اپنے ساتھ رکھنے پر تیار ہو جائے۔ کاتتے نے وعدہ کیا کہ وہ موقع دیکھ کے بجھل سے بات کرے گا۔ اڈے کی باتیں کرتے کرتے بھورے دادا کا ذکر آ گیا۔ زورا کہنے لگا "اپن کو شک لگتا ہے کہ بھورے دادا سے اس عمر میں اڈا اُٹھایا جا سکے گا۔" مگر کاتتے کا خیال زیادہ درست معلوم ہوتا تھا کہ اب بہت دنوں تک اڈے پر تبدیلی نہیں آئے گی، کوئی آکا نمودار نہیں ہوگا اور اس عرصے میں بھورے دادا اڈے کے لیے مناسب آدمی تیار کر لے گا۔ کالے دادا کے ذکر پر دونوں ہنسنے لگے۔ زورا نے اُس کے حیدرآبادی لہجے اور کولھے مٹکانے کی نقل اُتارنے کی ناکام کوشش کی۔ میں نے بھی اس خیال سے درمیان میں کئی مرتبہ دخل دیا کہ کہیں میری خاموشی اُنھیں مکدر نہ کر دے اور وہ دوبارہ مجھ سے کوئی تکرار نہ کرنے لگیں۔ ہمیں آئے زیادہ وقت نہ گزرا ہوگا کہ دوپہر کے کھانے پر ہماری طلبی ہو گئی۔ وہیں بالائی منزل کے ایک لمبے چوڑے کمرے میں کھانے کا فرشی اہتمام کیا گیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک بچھے ہوئے دسترخوان پر اتنی اقسام کے کھانے چُنے تھے کہ انتخاب تو درکنار، سب کا ایک ایک لقمہ چکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ کئی ملازم دو دو ڈشیں اِدھر سے اُدھر منتقل کرنے کی خدمت پر مامور تھے۔ مجھے پہلے ہی بھوک نہیں لگ رہی تھی، چائے نے اور کم کر دی تھی لیکن میں نے کسی کو احساس نہیں ہونے دیا کہ صرف لقمے ٹُونگ رہا ہوں۔ کھانے کے دوران میری نگاہیں بیشتر اُن کے چہروں پر بھٹکتی رہیں۔ اُن پر کوئی بوجھل پن طاری نہیں تھا بلکہ وہ بڑے نواب سے کچھ اور مانوس معلوم ہو رہے تھے اور بڑے نواب بھی۔ مجھے سب سے زیادہ ابا جان کی طرف سے بے چینی تھی۔ لیکن ابا جان اور منیر علی تو سب سے زیادہ خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ پیرو نواب کے پہلو میں بیٹھا کھانوں کی تعریف کر رہا تھا۔ کہنے لگا کہ اگر زنداں میں ہمیں ایسے کھانے کھلائے جاتے تو ہم کبھی فرار کا ارادہ نہ کرتے۔ اس جملے پر نواب کی آنکھیں بُجھ گئیں، ہر چند کہ دوسرے ہی لمحے وہ کِھل کھلا پڑا تھا لیکن اُس کی ہنسی بے ساختہ نہیں تھی۔ پیرو کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اُسے خود بھی احساس ہو گیا۔ اُس نے فوراً موضوع بدل دیا اور بڑے نواب سے پوچھنے لگا کہ کیا اُس نے کبھی جلتی ریت میں بھُنی ہوئی مچھلی کھائی ہے؟ نواب نے بتایا کہ ہمیں اتفاق نہیں ہوا لیکن سُنا ہے کہ نہایت لذیذ ہوتی ہے۔"

وہ دسترخوان سے اُٹھ کے منتشر ہوئے ہی تھے کہ میں آہستگی سے نکل آیا۔ میں نے اپنے کمرے ہی میں آ کے دم لیا۔ کمرے میں داخل ہو کے میرے قدم ٹھٹک پڑے، کہیں میں کسی دوسرے کمرے میں تو نہیں آ گیا؟ تمام ساز و سامان اپنی جگہ موجود تھا لیکن سب کچھ بدلا بدلا معلوم ہو رہا تھا۔ پلنگ پر نئی چادریں، نئے تکیے، غلاف، میز پوش، سبھی کچھ بدلا ہوا تھا۔ سرہانے کی چھوٹی میز پر ٹائم پیس، پھلوں کی قاب، پانی ٹھنڈا رکھنے والا تھرماس، پلنگ کی دوسری جانب ایک گول میز پر ریڈیو گرامو فون کا ڈبا، خاص دان میں گلوریاں، عطر دان اور کئی تہہ کیے ہوئے سفید رومال رکھے تھے۔ سگریٹ کیس بھی تھا۔ گل دستوں میں تازہ تازہ پھول سجے ہوئے تھے اور سارے کمرے میں موتیا کی بھینی بھینی خوشبو بسی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ابھی ابھی کوئی یہاں سے گیا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ نفاست اور سلیقے سے رکھی گئی تھی۔ میں سمٹی ہوئی نظروں سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ کہیں نگاہ جمتی ہی نہیں تھی۔ یہ آرائش تو تمام کمروں میں کی گئی ہوگی لیکن ابھی کچھ دیر ہوئی، کھانے سے پہلے میں کاتتے کے کمرے میں بیٹھا تھا، وہاں تو یہ سب چیزیں نہیں تھیں۔ میں نے ایک بار سارے کمرے کا چکر لگا کے دیکھا۔ یک بارگی مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے مگر یہ محض میرا وہم تھا۔ سارا کمرہ روشن تھا۔ مجھے اپنے آپ سے گھٹن ہونے لگی۔ کوئی ہوتا تو اُسے چھُپنے کی کیا ضرورت تھی۔ سامنے کی بڑی میز پر لکڑی کے ریک میں چند کتابیں چُنی ہوئی تھیں اور انگریزی، اُردو کے نئے پرانے رسالے۔ پلنگ پر آ کے میں اُن کی ورق گردانی کرتا اور تصویریں دیکھتا رہا۔ چند تصویریں دیکھ کے میرا جی اُکتا گیا، میں نے آنکھیں موندنے کی کوشش کی۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ پلنگ پر پڑے پڑے میں ہانپتا رہا۔ دروازہ بند کرنے کے لیے مجھے دوبارہ اُٹھنا پڑا۔ کھلے دروازے سے کوئی بھی اندر آ سکتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے میں اپنے پاس ہی رہنا چاہتا تھا۔ کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ ہوا بھی بند بند سی تھی۔ ابھی مجھے بستر پر لیٹے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ پہلے تو میں اسے اپنے دماغ کا خلل سمجھا تھا لیکن دستک کی آواز پھر میرے کانوں میں گونجی میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر لگی کہ دستک اُس دروازے پر ہوئی ہے جو خادموں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص ہے۔ میں اُٹھ کے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا لیکن اسی لمحے مجھے یاد آیا کہ ملازموں کی دستک پر اُٹھ کے دروازہ کھولنے کے بجائے پلنگ کے قریب لٹکی ہوئی ریشمی ڈور کھینچنی چاہیے۔ بشرطیکہ اُن کی طلبی مقصود ہو۔ یہ بات رات خاں صاحب نے مجھے یہاں کمرے میں پہنچاتے وقت بتائی تھی۔ میں کمرے کے درمیان شش و پنج میں کھڑا رہا کہ کیوں نہ خاموش رہوں مگر کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس خیال سے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ معاً دستک ایک بار پھر ہوئی۔ میں نے ڈوریوں کی طرف واپس جاتے جاتے بڑھ کے دروازہ کھول ہی دیا۔

ایک ثانیے کے لیے میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ سر تا پا سفید لباس پہنے ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ گندمی رنگ، کشیدہ قامت، ہاتھوں میں گجرے، گلے میں موتیوں کا ہار، آڑا پاجامہ اور لمبا کرتا۔ چادر کی طرح چکن کا دوپٹا اُس کا بدن ڈھانپے ہوئے تھا۔ مجھے یوں اچانک سامنے دیکھ کے وہ اُچھل سی گئی اور اُس نے بہ عجلت مجھے تسلیم کی۔ حویلی کی ہر چیز کی طرح خادمائیں بھی منتخب کر کے رکھی گئی ہوں گی۔ پہلی دو خادماؤں کو میں قریب سے دیکھ چکا تھا چنانچہ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہ خادمہ ہی ہو سکتی ہے۔ میری سوالیہ نظریں اُس پر مرکوز تھیں، معاً وہ ہچکچاتے ہوئے بولی "بندی کو نفیس کہتے ہیں۔"

"جی!" میں نے سر ہلا کے کہا۔

"آپ کو زحمت ہوئی۔" وہ کسی قدر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "بندی صرف یہ عرض کرنے حاضر ہوئی ہے کہ آپ کو اپنی موجودی کی اطلاع دے دے۔"

"اطلاع!" میں نے تذبذب سے کہا۔

"بندی کو آپ کی خدمت کے لیے مامور کیا گیا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی "بندی یہیں آپ کے کمرے سے ملحق گوشے میں موجود رہے گی۔"

"مگر۔ ۔ ۔ مگر مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا "یہاں سبھی کچھ تو موجود ہے۔ آپ کو کس نے یہ ہدایت دی ہے؟"

"چھوٹی سرکار نے۔" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

"چھوٹی سرکار؟ چھوٹی بیگم صاحب نے؟"

"برجیس بی بی نے۔" وہ جھجکتی آواز میں بولی "مگر چھوٹی بیگم صاحب کی خواہش بھی یہی ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "اُن سے میرا آداب کہیے گا اور بہت بہت شکریہ، اور اُن سے کہیے گا کہ کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں خود بھی آ سکتا ہوں۔ ویسے بھی یہاں ملازموں کی کمی نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ آپ ۔ ۔ ۔ آپ نیچے زنان خانے میں واپس چلی جائیں۔"

اُس نے نگاہیں اُٹھا کے بے چارگی سے میری طرف دیکھا اور کھڑی رہی۔ اُس کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ مجھے بھی اُس کے سامنے سے اس طرح ہٹ جانا ٹھیک معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ میں بھی کھڑا رہا۔ وہ لاکھ خادمہ سہی، آدمی کی اپنی حیثیت بھی تو ہوتی ہے۔ اُس کے سراپا میں بڑا وقار تھا۔ "بندی کو جناب کی خدمت سے بہت خوشی ہوگی۔ بندی کے لیے یہ عزت ہے۔" اتنی دیر تک کھڑی ہوئی وہ شاید یہی لفظ سوچ رہی تھی۔

"مگر، مگر کس لیے؟ کس لیے؟" میں نے بدحواسی سے کہا "خوامخواہ آپ کا وقت ضائع ہوگا۔" اُسے تم کہہ کر مخاطب کرنے کو میرا جی نہیں چاہا۔

چند لمحے وہ گم سُم رہی، پھر اُس نے چونکنے کے انداز میں مجھے آداب کیا اور اُلٹے قدموں واپس ہونے لگی۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ وہ بہت مایوس دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے دروازہ بند نہیں کیا۔ وہ چند ہی قدم گئی ہوگی کہ میں نے ٹھہرنے کے لیے کہا۔ اُس کا بدن لہرا سا گیا۔ "اندر آ جائیے۔" میری آواز جھرجھرا رہی تھی۔ وہ جھجکتی ہوئی اندر آ گئی۔ میں نے اُسے بیٹھ جانے کو کہا لیکن وہ کھڑی رہی۔ میں نے دوبارہ کہا تب بھی اُس کے سراپا میں جنبش نہیں ہوئی تاہم وہ لرزتی ہوئی سی آواز میں بولی "بندی حکم کی منتظر ہے۔"

"بیٹھ جائیے۔" میرے لہجے میں غالباً کسی حد تک حکم شامل تھا۔ اُس نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا اور قریب رکھی ہوئی کرسی کے کنارے بیٹھ گئی۔ اُس کا گندمی رنگ سفید ہو گیا تھا۔ یہ حالت دیکھ کے میں بھول گیا کہ میں نے اُسے اندر آنے کے لیے کیوں کہا تھا۔ برجیس اور گیتی کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کے لیے یا نواب عالم تاب کے متعلق کچھ جاننے کے لیے۔ مگر میں اس سے کس طرح پوچھوں۔ زبان سے کہیں کوئی نامناسب لفظ نہ نکل جائے۔ برجیس اور گیتی کی خادمہ سے اُن کے سلسلے میں کچھ معلوم کرنا نازیبا تھا اور وہ چھوٹے نواب اور خانم کے بارے میں بھی کتنا بتا سکتی تھی۔ لیکن میں نے اُسے روکا تھا تو اب کوئی نہ کوئی بات کرنی ہی تھی۔ میں نے دبے لہجے میں اُس سے نواب عالم

کے بارے میں پوچھا۔

"سُنا ہے، خدائے پاک کا شکر ہے مگر بندی کو۔ ۔ ۔" وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

"آپ کو زیادہ علم نہیں ہے ؟"

"جی" وہ دھیمی آواز میں بولی۔"ہر کسی کو اُس طرف جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"سب خیریت تو ہے نا ؟"

"جی ہاں" وہ چُرمُراتے ہوئے بولی۔"خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہی ہوگا۔"

"آپ برجیس بی بی کی، میرا مطلب ہے بقول آپ کے، آپ دونوں میں سے کس کی خدمت پر مامور ہیں ؟"

"دونوں کی۔"

ایک دم میرے جی میں آئی، پوچھوں کہ اُسے دونوں میں سے کون زیادہ پسند ہے مگر میری زبان ہکتے ہکتے رہ گئی۔ بہتر یہی تھا کہ میں اسے واپس چلی جانے دوں۔ آخر وہ گیتی اور برجیس کی خادمہ ہے۔ میرا ایک ایک لفظ اُنھیں منتقل کر دے گی اور نہ جانے کس انداز میں بیان کرے لیکن اندر بُلا کے کچھ کہے بغیر اُسے واپس کر دینا اور یوں خاموش بیٹھے رہنا دونوں باتیں عجیب تھیں۔ اُس کے جھکے ہوئے سر کے باعث مجھے کم سے کم اُس کا چہرہ ٹٹولنے کی آسانی تھی۔ مجھ پر ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا تھا، اُس کا بھی یہی حال معلوم ہوتا تھا۔"آپ یہاں حویلی میں کب سے ہیں ؟" کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے پوچھا۔

وہ اُڑی اُڑی آواز میں بولی۔"بندی نے دوسرا گھر نہیں دیکھا۔"

"یعنی آپ نے بس یہی دنیا دیکھی ہے ؟"

"بندی کی یہی دُنیا جنّت ہے۔"

"واقعی، یہ جگہ بہت خوب صورت ہے، جنّت نظیر ہے۔"

"بندی کا خیال ہے کہ مناظر اور عمارتوں سے زیادہ جنّت کی دل کشی کا باعث اُس کے نیک مکیں ہوں گے۔" وہ زیرِلبی سے بولی۔

"بے شک، یقیناً" میں نے تعجب سے کہا مگر تعجب کی کیا بات تھی، گیتی اور برجیس کی خادمہ کا لب و لہجہ بھی کم و بیش اُنھی جیسا ہونا چاہیے تھا۔ کبھی میں نے سُنا تھا کہ ملازم اپنے آقاؤں سے پہچانے جاتے ہیں، گو یہی بات آقاؤں پر بھی تو صادق آتی ہوگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ گیتی اور برجیس کی کچھ زیادہ ہی مقرّب تھی۔ اُنھوں نے اپنی خاص ہی خادمہ کو بھیجا بھی ہوگا۔ اُس کا جواب سُن کے میری جستجو بڑھ گئی۔ لیکن مجھے اُس کے سامنے بے سوچے سمجھے زبان نہیں کھولنی چاہیے تھی۔

میں سوچتا ہی رہ گیا۔ ذہن میں نہ جانے کتنے سوال گردش کر رہے تھے لیکن کوئی موزوں نہیں لگتا تھا۔ شاید میں اُسے ایسے ہی جانے کی اجازت دے دیتا کیونکہ خاموشی نہایت ناروا تھی لیکن معاً میرے ذہن میں آیا کہ اُسے کمرے میں بلانے کے جواز کے طور پر کیوں نہ اُس سے کوئی فرمائش کروں۔ فرمائش کتابوں سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ کیا حیدر آباد کی تاریخ پر کچھ کتابیں فراہم کی جا سکتی ہیں ؟

اُس کے لبوں پر پہلی بار مُسکراہٹ کِھلی اور وہ سر اُٹھا کے مستعد آواز میں بولی۔"بندی کا علم محدود ہے لیکن اسے کتب خانے کی کچھ شُد بُد ہے۔ وہاں کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ اِس موضوع پر بھی ضرور کتابیں ہوں گی بلکہ اس موضوع پر تو وافر ہوں گی کیوں نہ جناب زحمت فرما کے ایک بار کتب خانہ ملاحظہ فرمالیں۔" مجھے خیال آیا، اُس سے کہوں کہ وہ اس انداز میں مجھے مخاطب نہ کرے لیکن میں نے بیچ میں دخل نہیں دیا۔ اُس کے لہجے میں سنجیدگی کے باوجود ایک ہیجان بھی تھا، سبھی کچھ ایک سانس میں کہہ دینے کی بے تابی۔ وہ روانی سے کتب خانے کے متعلق مجھے بتاتی رہی کہ وہاں مطالعے کے لیے سکون کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ پرندوں کا شور غل کم سے کم کرنے کی غرض سے اطراف میں اُونچے درختوں اور بیلوں سے پرہیز کیا گیا ہے۔ کتابوں کے سلسلے میں اُس کی معلومات میرے لیے حیران کن تھیں۔ وہ تو بہت کچھ جانتی تھی۔ مثلاً فلاں کتاب بڑے نواب نے کس طرح حاصل کی۔ اورنگ زیب کے زمانے کا لکھا ہوا قرآن شریف کا ایک مخطوطہ حاصل کرنے کے لیے اُس نے کیسی تگ و دو کی تھی۔ باتیں کرتے وقت اُس کے چہرے کے رنگ بدلتے رہتے تھے۔ پل میں دھوپ پل میں چھاؤں۔ میں نے کُتب خانے کے بارے میں اس سے کرید کرید کے پوچھا تاکہ وہ بولتی رہے۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر سی ہو جاتی میں اُسے سُنتا کم، دیکھتا زیادہ رہا۔ وہ لائبریری کی خصوصیات کا ذکر بڑے اشتیاق سے کر رہی تھی۔ میں نے درمیان میں پوچھا۔"آپ کو کس موضوع سے دل چسپی ہے ؟"

وہ خفیف سی ہو گئی۔"بندی کو داستانیں زیادہ پسند ہیں۔"

"اور، اور شاعری ؟"

"جی ہاں، کچھ وہ بھی۔" وہ شرم گیں لہجے میں بولی۔"مگر جناب کو کس نے بتایا ؟"

"کسی نے نہیں۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔"خود ہی اندازہ لگایا۔" اُس کی آنکھیں جھلملانے لگیں اور اُس کا بدن اِس طرح سمٹنے لگا

یے اُس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔"کیا آپ شعر کہتی ہیں ؟" اُس کی وشی پر میں نے دوبارہ پوچھا۔

اُس نے سر جھکا لیا۔"بندی کیا عرض کرے، یوں ہی کوشش نی ہے۔" وہ رُک رُک کے بولی۔

"چھوٹی بیگم صاحب اور بی بی کو بھی تو شاعری سے خاص دلچسپی ئی ؟" میں نے چپکے سے پوچھا۔

"بہت بہت زیادہ، چھوٹی سرکار تو بہت عمدہ شعر موزوں نی ہیں۔ کاش بندی کو اس کا عشرِ عشیر بھی مل جاتا۔" وہ حسرت آمیز ، میں بولی۔

"کیا وہ بہت اچھے شعر کہتی ہیں۔"

"بندی کس منہ سے تعریف کرے کہ خدا نے اُنھیں کیسا نوازا ہے ن یہ سب حویلی تک محدود رہتا ہے، چند قریبی لوگوں تک۔ خصوصاً ، بی سرکار کے سوا وہ کسی کو بھی نہیں سُناتیں۔"

"اور بی بی ؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"بی بی سرکار شعر نہیں کہتیں لیکن بَلا کی سخن فہم ہیں۔ ایسی کہ بھی کبھی تو شک گزرتا ہے، ضرور کچھ چھپاتی ہیں لیکن یہ تو سب بیتی ہوئی باتیں ہیں۔" اچانک اُس کی آواز پُرغُبار چھا گیا، کہنے لگی کہ"ایک زمانہ تھا کہ ہر وقت یہی چرچے، یہی مشاغل رہتے تھے۔"

"اب کیا بات ہے ؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اب تو سب کچھ اُجڑ گیا ہے، جب سے چھوٹے سرکار نے۔ ۔" اُس کی آواز بھرا گئی۔

اس سے پہلے کہ اُس کی آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسو چھلک پڑتے، میں نے بات کاٹ کے کہا۔"ہاں، ہاں، مجھے معلوم ہے۔"

"بہت دنوں کے بعد جناب کے آنے سے حویلی میں کہیں پُرانے دِنوں کی جھلک نظر آئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہوا کا رُخ بدل گیا ہے۔ جناب کے قدم بڑے مبارک ہیں۔"

"اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اُسے تسلی دی۔

"بندی کو یقین ہے۔" وہ یاس بھرے لہجے میں بولی۔

"آپ کو اس حویلی سے بہت محبّت ہے ؟"

"یہ حویلی بہت سے لوگوں کا سایہ ہے۔"

"بے شک، یہاں آ کے یہی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے بدبداتے ہوئے کہا۔

وہ پھر کہیں کھو گئی۔ چھوٹے نواب کے ذکر ہی نے اُسے منتشر کیا تھا ورنہ وہ کتنی دل چسپ اور دل نشیں باتیں کر رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی طرح اُس کی دل جوئی کروں اور موضوع بدل دوں۔ مجھے گُم دیکھ کے چند لمحوں بعد وہ خود ہی بولی۔"کیا جناب کچھ نوش فرمانا پسند کریں گے ؟"

"نہیں۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔"میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ۔" وہ ندامت سے بولی۔"بندی یقیناً مخل ہوئی۔"

"نہیں، بلکہ آپ کے آنے سے آرام ہی ملا، سر میں کچھ درد محسوس ہو رہا تھا، نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔" میں نے اُس کا دل رکھنے کے لیے یُوں ہی کہہ دیا۔

"اب کچھ اِفاقہ ہے ؟" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بڑی حد تک۔"

"اجازت ہو تو بندی مالش کر دے ؟"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے اضطرابی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا مگر اُس کے چہرے پر اطمینان چھایا ہوا تھا۔"جناب کی خدمت بندی کے لیے عزّت ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"مگر آپ، آپ۔ ۔ ۔"

"بندی کو جناب کے آرام کے لیے بھیجا گیا ہے۔"

"جی، جی ہاں۔" میری آواز گھُٹ رہی تھی۔

"جناب کو ضرور سکون ملے گا۔"

"جی۔" میں نے بدحواسی سے کہا۔"مگر مجھے عادت نہیں ہے۔"

اُس نے دوبارہ نہیں کہا لیکن میرے جواب سے اُسے مایوسی ضرور ہوئی تھی اسی لیے اُس نے اجازت طلب کی اور اپنی نشست سے اُٹھ کھڑی ہوئی، اُس کی اجازت طلبی پر میں نے جلدی سے سر ہلا دیا تھا۔ پھر میں اُسے دیکھتا اور پکارتا ہی رہ گیا۔ ایک لحظے میں اُس نے سر جھکا کے مجھے آداب کیا، دوسرے لمحے وہ کمرے میں نہیں تھی۔

اُس کے جانے سے کمرہ خالی خالی ہو گیا تھا۔ میں دیر تک مسہری کے پائنتی بے حس و حرکت بیٹھا دروازہ تکتا رہا، وہ جاتے جاتے دروازہ آہستگی سے بند کر گئی تھی۔ دیواری گھڑی کی ٹِک ٹِک نے کمرے میں اور سنّاٹا کر رکھا تھا۔ اُس سے تو میں نے سر درد کا بہانہ کیا تھا لیکن اب واقعی میرا سر چکرا رہا تھا۔ گھڑی نے چار بجائے تو مجھے وقت کا اندازہ ہوا۔ جانے کتنی بار مجھے دروازے پر دستک کا شبہ ہوا تھا لیکن وہ دوبارہ نہیں آئی۔ اب شاید وہ کبھی نہ آئے۔ وہ میرے بارے میں کوئی اچھا تاثر لے کے نہیں گئی ہوگی۔ مجھے بات کرنا ہی کہاں آتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر مجھے یہ کیا ہو جاتا ہے۔ آخر مجھے اُس کی بات ماننے میں تامّل کیوں تھا۔ اُس نے خود ہی تو پیش کش کی تھی۔ چند لمحوں کے لیے

سہی، مجھے اجازت دے دینی چاہیے تھی۔ کیسے دل کش اور دل نشیں انداز سے باتیں کر رہی تھی۔ آتنا ہی اُس کے سر دبانے کے انداز میں نفاست اور دل کشی ہوگی۔ اُس کے نرم ریشم جیسے ہاتھ میں نے اچھی طرح دیکھے تھے۔ لمبی لمبی انگلیاں، ہتھیلی اور پوروں پر مہندی لگی ہوئی اس طرح، اتنی دیر میں وہ مجھ سے اور مانوس ہو سکتی تھی اور مجھے بہت سی باتیں بتا سکتی تھی جنھیں جاننے کی جستجو مجھ میں کم نہیں تھی اور پھر اُسے تو اُنھوں نے ہی بھیجا تھا جن کا کوئی لحاظ مجھے مانع ہو سکتا تھا۔ میں نے کتنی مرتبہ ارادہ کیا، خادموں کو بلانے کی ڈوری کھینچ کے دیکھوں کہ وہ پھر آتی ہے یا نہیں، اگر وہ اب کے آگئی تو میں اپنے آپ کو مجتمع رکھوں گا لیکن میں نے ڈوری نہیں کھینچی، بس بستر پر پڑا اپنے آپ کو نوچتا کھسوٹتا رہا۔

کیا عجب کہ اس مرتبہ وہ خود آجائیں یا اُن میں سے کوئی ایک میں نے اُن کی بھیجی ہوئی خادمہ کی پزیرائی نہیں کی ہے لہٰذا وہ خود آ سکتی ہیں۔ اُن کی آمد کے تصور ہی سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے بستر سے اُٹھ کے کمرے کا عام دروازہ دیکھا کہ کہیں ایسا نہ ہو، ایک طرف وہ اندرونی دروازے سے داخل ہوں، دوسری طرف کانتے اور زورا وغیرہ میں سے کوئی آجائے۔ عام دروازہ بند ہی تھا۔ سُورج غروب ہونے کی وجہ سے کمرے میں روشنی بتدریج کم ہو رہی تھی۔ میں نے ایک بار یوں ہی سارے کمرے کا چکر لگایا اور کھڑکی سے باہر جھانک کے دیکھا۔ اطراف میں سکوت چھایا ہوا تھا، پھر میں بستر ہی پر آگیا۔ کوئی نہیں آیا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی کہ آخر یہ سب کیا ہے۔ مجھے کاہے کی بے کلی ہے، جانے کب تک میں خود سے باتیں کرتا رہا اور جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

دوبارہ دستک کی آواز پر میری آنکھ کھُلی اور میں لیٹے لیٹے اُچھل گیا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا طاری تھا۔ میری نظریں سیدھی اندرونی دروازے پر گئیں۔ اندھیرے کی وجہ سے دروازہ بالکل نظر نہیں آرہا تھا لیکن کان بھی تو سمتیں دیکھتے ہیں، اس طرف کے بجائے کوئی شخص عام دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ جی میں آئی کہ جوں کا توں پڑا رہوں زورا اور کانتے میں سے کوئی ہوگا۔ خود ہی واپس چلے جائیں گے مگر پھر میں نے اُٹھ کے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ کانتے تھا۔ "سو رہا تھا کیا؟" وہ دروازے پر کھڑے کھڑے بولا۔

"ہاں۔" میں نے آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔ "نیند آگئی تھی۔"

"تو پھر سو ہی جا۔ میں چلتا ہوں۔" وہ جانے لگا۔

میں نے اُس کا بازو پکڑ کے روک لیا۔ "بیٹھو نا، کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"کچھ نہیں لاڈلے! دوپہر کھانے کے بعد سے دکھائی نہیں پڑا تھا، سو چا جا کے پوچھتا کر لوں۔"

"کیا وقت ہوا ہے اب؟"

"آٹھ بج رہے ہوں گے رے۔"

"آٹھ!" میں نے حیرت سے کہا۔

"نیند آرہی ہے تو تھوڑی سی اور کھینچ لے، سالی کب کی رُکی ہوئی ہوگی۔"

میں نے اُسے اندر کھینچ لیا اور دیوار ٹٹول کے روشنی کی۔ لا... ہوتے ہی وہ سیٹیاں بجانے لگا۔ "لاڈلے! لاڈلے!" وہ سرسراتی آ... میں بولا۔ "یہ تیرا ہی ٹھکانا ہے کیا؟"

"ہاں! کیوں؟"

"اِدھر تو نقشہ ہی دوسرا لگتا ہے۔"

"کیسا نقشہ؟"

"ریڈیو، باجا اور، اور۔۔۔" وہ دیدے نکال کے بو...

"ادھر تو سالی دنیا ہی بدلی پڑی ہے۔"

"ہاں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "تمھارے کمرے میں اُدھر نہیں ہے؟"

"تو نے دیکھا نہیں کیا؟"

"میں اُدھر کب گیا ہوں۔"

دوپہر کھانے سے پہلے تو کِدھر بیٹھا تھا۔"

"ہاں، میں تو بھول ہی گیا۔" میں نے خجالت سے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے رے تجھ کو؟"

"کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ مجھے یہ کمرہ مل گیا۔ کسی نے انتخاب تو نہیں کیا تھا۔"

"پرسوں سویرے اِدھر یہ سارا مال پانی نہیں تھا، تجھ کو پتہ نہیں کہ سویرے ہم لوگ اِدھر جھانک کے گئے تھے جب تو نیچے گیا تھا۔"

"مگر، مگر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے تندی سے کہا۔

"چکر کیا ہے لاڈلے؟"

"کاہے کا چکر؟"

"کاٹ کھانے کو کیوں دوڑتا ہے، قسم سے اپنے کو تیرا رنگ ہی بدلا لگتا ہے۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا اور میری ٹھوڑی اُٹھا کے آنکھ میں جھانکنے لگا۔ میں نے اُس سے نگاہیں ملانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ ہنکاری بھرتا ہوا بولا۔ "ایک بات بولیں لاڈلے؟"

"کیا ہے؟"

"اچھے لوگ جان پڑتے ہیں۔"

"کون لوگ؟" میں نے تنک کے کہا۔

"یہی حویلی کے لوگ باگ۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اپنے کو کچھ نہیں بولنا، پر لاڈلے۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رُک ... اُس کا چہرہ بھاری ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں جانی! جا، جا کے مُنہ ہاتھ دھولے۔"

"نہیں بتاؤ۔ تم کیا کہہ رہے تھے؟"

وہ آنا کانی کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری ضد سے وہ اُڑ ...ئے گا لیکن مجھے بے چینی رہی۔ اُس کے کہنے پر میں نے غسل خانے ... کے جلدی جلدی مُنہ ہاتھ دھویا اور کنگھی کی۔ کانتے نے خاص دان ...، پان نکال کے ایک بیڑا مجھے کھلایا، ایک خود کھایا اور مسہری کے ...ملنے نصب شیشے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوا باہر آگیا۔ باہر ہلکی ہلکی ...چل رہی تھی اور حویلی میں دُور و نزدیک روشنیاں جل رہی تھیں۔ ...تے نے بتایا کہ شام تک سبھی اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے، ...کچھ دیر پہلے نیچے آترے ہیں۔ وہ سب نچلی منزل کی اُس نشست گاہ ...موجود تھے جہاں ہم کل رات بیٹھے تھے۔ اُن کے علاوہ کمرے میں ...نہیں تھا۔ تمام دروازے اور کھڑکیاں کھُلی ہوئی تھیں اور درمیان ...بڑے فانوس نے سارا کمرہ بقعۂ نور بنایا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ...اپنے پاس بلا لیا اور میری گردن پکڑ کے کئی جھٹکے دیے۔ میری چیخ نکلتے رہ گئی۔ "کیسے ہو سجنا؟" وہ مُسکراتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہوں۔" میں نے آہستگی سے جواب دیا اور بے ارادہ ...ے مُنہ سے روانگی کے بارے میں نکل گیا، شاید اُس کے چہرے ...ں گواری دیکھ کے۔

"چلیں گے رے، جلدی چلیں گے۔" وہ میرا ہاتھ تھپکتے ہوئے ...جیا نہیں ٹِک رہا ہے کیا؟"

"نہیں، نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں تو یوں ہی پوچھ رہا ...میں نے یہ جتانا ضروری سمجھا کہ میں اُسے ٹوک نہیں رہا ہوں۔

"ہاں، ہاں، اپنے کو پتہ ہے۔ متھا تیرا کچھ صاف دکھائی دے ...ہے۔ اچھا ہے، ذرا کمر ایک دو دن سیدھی کر لے۔"

وہ مجھ سے یہ کہہ ہی رہا تھا کہ بڑا نواب کمرے میں داخل ہوا۔ ...نے کچھ دیر ضرور آرام کیا ہوگا، تازہ دم نظر آرہا تھا۔ سب اُٹھ گئے

تھے لیکن نواب تیزی سے ابّا جان اور منیر علی کے پاس چوکی پر بیٹھ گیا اور باری باری ہم سب کا حال پوچھنے لگا۔ اُسے آئے ابھی چند لمحے ہوئے تھے کہ ایک خادم لپکتا ہوا اندر آیا۔ اُس نے نواب کے پاس جا کے سرگوشی میں کچھ کہا۔ "کہاں ہیں؟" نواب اُونچی آواز میں بولا۔

"باہر تشریف فرما ہیں۔" خادم نے مؤدبانہ جواب دیا۔

نواب نے اضطراب سے ابّا جان کی طرف دیکھا پھر بتّھل کی جانب اور شائستگی سے بولا۔ "ہمارے عم زاد نواب حشمت جنگ آئے ہوئے ہیں۔"

ابّا جان کوئی جواب نہ دے سکے، اُن کی متذبذب نظر فوراً بتّھل کی جانب اُٹھی۔ بتّھل نے بوجھل آواز میں کہا۔ "اُن کو اِدھر ہی بلا لیا جائے۔"

"ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ آپ حضرات اُن سے مل کے یقیناً خوش ہوں گے۔" نواب تمتماتے لہجے میں بولا۔ "وہ ایک نفیس آدمی ہیں۔ اُنھوں نے فون پر آپ صاحبان سے ملنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔"

"ہم بھی اُن کو دیکھنا چاہتے تھے۔" اگر نواب کے لہجے میں کوئی معنی خیزی نہیں تھی تو بتّھل کی آواز بھی آلودگی سے صاف تھی۔

"آپ اُنھیں جانتے ہیں؟"

"تھوڑا بہت۔" بتّھل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "رات آپ بھی اُن کے بارے میں کچھ بول رہے تھے۔"

"جی ہاں، وہی۔" نواب خوش دلی سے بولا اور چوکی سے اُٹھ گیا۔ "اُن سے ہمارے کئی رشتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اسی گھر کے ایک فرد ہیں۔"

نواب کے منع کرنے کے باوجود ابّا جان اور منیر علی بھی اُس کے ساتھ اُٹھ گئے۔ میں، پیرو، بتّھل، زورا اور کانتے بھی کھڑے ہو گئے۔ ابّا جان اور زورا کو یہاں دیکھ کے نواب حشمت جنگ کا کیا حال ہو سکتا ہے۔ آنے والے لمحوں کا تصور میری طرح سبھی کے لیے ہیجان انگیز ہوگا۔ میں نے ابّا جان اور زورا کے چہرے دیکھنے چاہے، لیکن وہ دونوں آگے بڑھ چکے تھے۔ خادم پہلے ہی باہر چلا گیا تھا۔ بڑا نواب ابھی اندر ہی تھا، معاً دروازے پر درمیانے قد، گہرے سُرخ رنگ کا، ترکی ٹوپی اور سیلٹی شیروانی پہنے ایک بھاری بھرکم شخص اندر داخل ہوا۔ وہ نواب حشمت جنگ ہی ہوگا، اتنا بھاری بھی نہیں تھا کہ اُسے موٹا کہا جائے۔ دروازے ہی سے اُس نے سب کو آداب کیا۔ بڑے نواب نے ہمارے بارے میں کچھ کہنا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے جیسے سب کچھ غت ربود ہو گیا۔ نواب حشمت جنگ صرف چند قدم بعد ٹھٹک کے رُک گیا۔ اُس کی آنکھیں اچانک پھیل گئیں۔ ابّا جان

اور زورا پر اُس کی نظر پڑ گئی تھی مگر ابّا جان نے اُسے حیرانی کی اتنی مہلت نہیں دی، لرزتے اور مسکراتے لبوں سے اُسے سلام کیا اور دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ نواب حشمت جنگ استعجاب کے عالم میں اُن سے بغل گیر ہوا۔ "آپ ؟ - - -"

"شاید صدقِ طلب کا کرشمہ ہے" ابّا جان کی آواز بھٹک رہی تھی۔ نواب کو پھر بھی یقین نہیں آیا۔ اُس نے سر گھما کے متوحش نظروں سے ہم سب کو دیکھا پھر اُس کی نظریں ابّا جان کے چہرے پر آکے جم گئیں۔ "ہمیں شبہ ہے کہ ہم کسی خواب سے دوچار ہیں"

"ایک اچھے خواب سے" ابّا جان نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بے شک، بے شک" نواب حشمت جنگ سٹ پٹاتے انداز میں بولا۔ "ہمیں آپ کو یہاں دیکھ کے مسرت ہوئی۔ یہ بھی ہمارا ہی گھر ہے مگر بخدا، ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے"

"آپ تشریف تو رکھیے" سلسلے ملانے پر آئے تو قسمت عجب تماشے دکھاتی ہے" ابّا جان نے سکون سے کہا۔ "ہمارے لیے بھی اس حویلی سے آپ کے تعلق کی خبر بہت حیران کُن تھی۔ رات ہی نواب صاحب قبلہ نے آپ کی نسبت کچھ فرمایا تھا"

"آپ ہمارے بھائی سے واقف ہیں ؟" بڑے نواب نے بے کلی سے کہا۔ "مگر آپ نے، آپ نے ہمیں نہیں بتایا تھا ؟"

"ہم اس ملاقات کا لُطف کھونا نہیں چاہتے تھے" ابّا جان نے اعتماد سے کہا۔ "اور کوئی معتبر حوالہ دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی اور پھر نواب صاحب قبلہ سے ہماری شناسائی کو دن بھی کتنے ہوئے ہیں"

"چند دن، محض چند دن" نواب حشمت جنگ تیزی سے بولا۔ "جہانی میاں! ہم نے آپ کو بزرگِ محترم کے متعلق بتایا نہیں تھا ؟ یاد نہیں آپ کو؟ اوہ، یہ سب کتنا عجیب ہے۔ جہانی میاں! یہ ہمارے وہی کرم فرما ہیں جنھوں نے بہ کمال عنایت ہمیں وہ نادر، بیش بہا پتھر عطا فرمایا تھا"

بڑے نواب کی پیشانی سکڑ گئی۔ سنسناتے لہجے میں بولا۔ "آپ سچ کہہ رہے ہیں حشمت بھائی ؟"

"ہاں ہاں، اور ہم نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ ہم کسی مناسب وقت پر اپنے اجنبی بزرگ، اپنے حاتم صفت محسن سے آپ کو ملوائیں گے۔ آپ ادھر اپنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے اس لیے ہم ٹھیرے رہے مگر یہ کیسے ؟ یہ سب کیسے ؟" وہ متلاطم آواز میں بولا۔ "جہانی میاں! براہِ کرم ہمیں بتایئے"

"کیا عرض کریں، ایک طویل رُوداد ہے" بڑے نواب نے بکھرے لہجے میں کہا۔ "یوں سمجھیے حشمت بھائی! ہماری باری آگئی تھی اس بار ہمارے مہربان بزرگ کے جود و سخا کے لیے ہمارے خانوادے کی باری آگئی تھی۔ قبلۂ محترم نے اگر آپ کو ایک بے نظیر ہیرے سے نوازا ہے تو ہمارے لیے سب سے بے بہا سوغات لائے ہیں۔ یقین کیجیے، ہمیں آپ سے زیادہ ملا ہے، اُس کا کوئی مول نہیں ہے"

"کہیں قبلۂ عالم کا تعلق بھی اُنھی حضرات سے تو نہیں جو عالم تاب عالم تاب . . ." نواب حشمت جنگ کی حیرت زدہ آواز حلق میں اٹک گئی۔

بڑے نواب نے سر جھکا لیا۔ "آپ کو اگر اپنے گرامی قدر نوشناساؤں کی دید سے ہمیں مشرف کرانے کا اشتیاق تھا تو ہم بھی ادھر اپنے مسیحا نفس، اپنے والا مرتبت مہمانوں سے آپ کو ملوانے کے لیے بے تاب تھے"

نواب حشمت جنگ کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ جلتی بجھتی آنکھیں، وہ ششں و پنج کی کیفیت میں دوچار لمحوں تک ساکت کھڑا رہا۔ پھل، پیرو اور ہم سب بھی خاموش کھڑے کبھی ابّا جان کو دیکھ رہے تھے، کبھی بڑے نواب کو اور کبھی اُسے۔ پھر ابّا جان ہی نے پہل کی، اُنھوں نے ایک قدم آگے بڑھ کے نواب حشمت جنگ کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اُس نے دیوانہ وار اُنھیں گلے لگا لیا۔ بڑے نواب اور ابّا جان کے ساتھ وہ تخت پر آگیا تھا۔ اُس کا سارا وجود کھلا ہوا تھا۔ ابّا جان نے اُس کی خیریت پوچھی تو اُس نے شکایت آمیز شائستگی سے جواب دیا کہ وہ کل رات ابّا جان کی نئی حویلی گیا تھا، پھر صُبح دفتر جاتے ہوئے گیا تھا۔ رات اُسے بتایا گیا تھا کہ ابّا جان کسی ضروری کام سے دُور گئے ہیں۔ صبح اُسے بتایا گیا کہ شہر سے دُور گئے ہیں۔ اُسے حیرت تھی کہ ابّا جان نے اچانک کہاں کا قصد کر لیا، اُس سے ذکر بھی نہیں کیا۔ کہنے لگا کہ یہ تو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ابّا جان اُس کے اتنے قریب ہیں، اُس کے اپنے گھر میں ہیں پھر ابھی وہ ابّا جان کے پہلو سے لگا شیفتہ و وارفتہ انداز میں یہ باتیں کر رہا تھا کہ خاں صاحب نے آکے کھانا چُنے جانے کی اطلاع دی۔ نواب حشمت جنگ بھی ابّا جان کا ہاتھ تھامے تھامے کھانے کے کمرے میں آیا اور اُس نے میزبان ہی کی طرح ہم سب کو بٹھایا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جلد یا بدیر اُس پر نئی نئی حیرتیں مسلّط ہونی چاہئیں۔ اُس کی یہ بے ساختگی غیر اختیاری تھی۔ ابّا جان کو یہاں دیکھ کے پہلا فطری ردِ عمل، لیکن رفتہ رفتہ اُس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال گونجنے بھی لازم تھے، اور یہی ہوا، کھانے کے دوران وہ کھویا کھویا نظر

نے لگا۔ اُس کا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا اضطراب اُس کے چہرے سے یاں تھا۔ یہ مجلسی آداب کے خلاف تھا کہ اتنے لوگوں میں وہ کوئی سوال کرے جس کا جواب ماحول کی شگفتگی مُرجھا دے، کچھ نہیں جا سکتا تھا کہ بڑے نواب نے اس دوران اُسے کیا کیا بتایا کہ خانم کو ساتھ لانے والے لوگ کون ہیں۔ یہ تو اُسے معلوم ہی گا کہ خانم بازار سے کن لوگوں کے ساتھ گئی تھی، جنھوں نے اُس ت شاہ کبیر جیسے آدمی سے بازار کا اڈّا چھین لیا تھا اور جنھوں نے رے اسٹیشن پر نواب عالم تاب کی گردن پر چاقو رکھ دیا تھا۔ بازار ایک عورت ابّا جان اور اُن کے ساتھ آنے والوں سے وابستہ تھی۔ سب کچھ نواب حشمت جنگ کو بہت پُراسرار نظر آرہا ہوگا۔ ابّا جان یدر آباد کے سب سے بڑے ہوٹل میں قیام، اُس کے گھر کسی تعارف ے بغیر آمد اور کسی جائز و ناجائز کام کی گزارش و سفارش کے بغیر ایک معمولی ہیرے کا نذرانہ۔ ایک بڑی حویلی کی نقد خریداری اور یہاں ن کے ساتھ موجود نئے لوگوں کے چہرے۔ ابّا جان اور زورا کے سوا ہم میں سے کسی کو اُس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ خود بڑے نواب دا ابّا جان اور حشمت جنگ کے تعلق، ہیرے کی سخاوت وغیرہ کی یرت کم نہیں ہوگی لیکن اُس کی بات دوسری تھی۔ درمیان میں ایک مل دن گزر چکا تھا۔ اڈّے پر آنے والے لوگوں اور وہاں گزرنے لے واقعات سے وہ پہلے ہی واقف تھا۔ اتنی انوکھی باتیں جاننے کے بعد اُس کے خیال میں اب سب کچھ ممکن ہوگا۔ اُس کی مطلوبہ ستی خانم بہرحال حویلی میں موجود تھی اس لیے باقی سب جوں کا توں ی قبول کر لینا چاہیے تھا۔ خانم کی آمد کے بعد سارے سوال غیر ضروری تھے۔

"ہمیں بھی وہ نادرِ روزگار ہیرا دیکھنے کا موقع ملا ہے، یقیناً ہی مثال آپ ہے۔ ایک عرصے بعد ہم نے ایسا نفیس پتّھر دیکھا ہے" کھانے کے دوران بڑے نواب نے کہا۔ اُسے نواب حشمت جنگ کی مضطربانہ کیفیت کا کچھ احساس ہو چلا تھا، حشمت جنگ چند لمحے پہلے گم سُم سا ہو گیا تھا۔ یہ بات اُسے ٹوکنے کے مترادف تھی۔

نواب حشمت جنگ سنبھل گیا اور مچلتے لہجے میں بولا۔ "روز بہ روز ہم پر اُس کی قدر و قیمت منکشف ہو رہی ہے۔ ہم سے رہا نہ گیا تھا، و سب سے پہلے اُسے لے کے ہم اپنے بھائی جہانی میاں ہی کے اں آئے تھے۔ یہ اُسے دیکھ کے دنگ رہ گئے تھے۔ پوچھنے لگے، شمت بھائی! سچ بتایئے، کہاں سے دستیاب ہوا۔ ہم نے کہا، بس ک سخی دے گیا، سمجھو، آسمان سے بھیجا گیا ہے۔ دروازے پر سائل کا آتے رہے ہیں، اب کے ایک سخی آیا تھا۔ انھیں یقین نہیں آیا۔ کسی کو بھی نہیں آتا۔ اِدھر ہم نے ریاست کے ایک جوہر شناس کو دکھایا تھا۔ دیر تک زاویے بدل بدل کے نظّارہ کرتے رہے۔ پوچھا، کس سے ملا؟ ہم نے وہی بات بتائی جو جہانی میاں کو بتائی تھی۔ اُنھیں بھی کیوں یقین آتا چنانچہ اُن کی تسلّی کے لیے ہمیں بات بنانی پڑی کہ ہمارے خاندان کے ایک قدیم مربی، ایک بزرگ زمانے بعد ریاست تشریف لائے تھے، اُنھوں نے ہمارے جد سے اپنی کسی وابستگی کے اظہار میں ازراہِ لُطف و عنایت ہمیں عطا فرمایا ہے۔ اُن کے خیال میں ہمارے سوا اب اور کوئی اِس کا مستحق نہیں تھا" نواب حشمت جنگ نے پشیمانی کے انداز میں ابّا جان سے کہا۔ "ہم یہی کچھ کہہ سکتے تھے، مگر اُنھیں دکھانا ہی غلط ہوا۔ پھر جانے ریاست کے کِس کِس صاحبِ ذوق نے ہم سے فرمائش کی۔ بات کِنگ کوٹھی تک بھی پہنچ گئی۔ اتّفاق سے اِن دنوں مہاراجا بنسی دھر بھی میسور سے آئے ہوئے ہیں۔ اُن کے بارے میں مشہور ہے کہ والیانِ ریاست کو چھوڑ کے اگر کسی کے پاس نادر ترین ہیروں کا ذخیرہ ہے تو مہاراجا بنسی دھر کے پاس۔ کیوں جہانی میاں ؟"

"جی ہاں، ہیروں سے مہاراجا کے شوق کی تو عجب عجب داستانیں مشہور ہیں" بڑے نواب نے متجسس لہجے میں حشمت جنگ کی تائید کی اور ابّا جان کو بتایا کہ بس اُسے کسی اچھے ہیرے کی بھنک ملنی چاہیے۔ مہاراجا کو اُس وقت تک چین نہیں آتا جب تک اُسے دیکھ نہ لے۔ اور دیکھنے کے بعد اگر کہیں پسند آجائے تو سمجھیے مہاراجا کی نیندیں حرام ہو گئیں۔

"اس مرتبہ بھی کچھ یہی ہوا" نواب حشمت جنگ دمکتی آواز میں بولا۔ "مہاراجا نہایت ذوق و شوق کے عالم میں آئے تھے۔ ہم نے ہیرا سامنے رکھ دیا، نہ پوچھیے، کیا حال ہوا اور سچ پوچھیے تو اُس وقت ہمیں اُس کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا، مہاراجا کی خیرہ آنکھیں اور اُن کے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھ کے۔ ہیروں کی تھوڑی بہت پہچان ہمیں بھی ہے لیکن مہاراجا کا تو مشغلہ یہی ہے۔ اس معاملے میں اُن کی نگاہ مستند ہے۔ مہاراجا نے بے تابانہ وہی سوال کیا۔ ہمارے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے، جھجکتے ہوئے کہنے لگے، آپ کا کچھ اور خیال تو نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا، جنابِ والا یہ ایک تحفہ ہے۔ وہ خاموش ہو گئے، کچھ توقف کے بعد بولے "کون ایسا دھنی تھا جس نے آپ کو یہ انمول چیز بھینٹ کی ہے۔ ہمیں بتایئے، شاید ہم بھی جانتے ہوں۔ آپ کے والدِ گرامی کے بیشتر اعزا و احباب سے ہمیں نیاز حاصل ہے" ہم نے جواب دیا۔ ایک زمانے بعد وہ ریاست تشریف لائے

ہیں۔ والدِ محترم کے حوالے کے بغیر ہمارے لیے بھی وہ اجنبی ہی تھے۔ اُن کا تعلق ریاست سے نہیں، شمالی ہندوستان سے ہے۔ مہاراجا سے اور لُطف لینے کے لیے ہم نے کہا، گمان ہے کہ اُن کے پاس اور بھی نادر پتھر ہوں گے۔ سر ہلانے لگے اور فرمایا، کیا اُن سے ہماری ملاقات ممکن ہے؟ جواب میں ہمارے تامّل و تذبذب سے وہ اور بے قرار ہو گئے۔ بولے، برِصغیر اور کسی حد تک یورپ میں بھی شاید ہی ہیروں کا کوئی بڑا پارکھ رہ گیا ہو جس سے ہم واقف نہ ہوں۔ مہاراجا غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا، ہم اپنے بزرگ کو ملاقات کی خواہش ضرور منتقل کر دیں گے، ہر چند کہ وہ ایک گوشہ نشین شخص ہیں۔ اُنھیں حیدرآباد سے جانے کی بھی جلدی ہے۔ اگر قیام طویل ہوا تو اب ورنہ دوبارہ واپسی پر انشا اللہ۔ فرمایا، ہم اسے عزت افزائی سمجھیں گے۔"

"گویا آپ نے مہاراجا کی آتشِ شوق اور بھڑکا دی ہے؟" بڑے نواب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اُن کی حالت دیدنی تھی۔ بعد میں احساس بھی ہوا کہ ہمیں صاف منع کر دینا چاہیے تھا۔ ہم کوئی بھی عذر کر دیتے۔ مہاراجا کی حالت بے چارگی کی سی تھی، اور بخدا، حویلی کی کسی اور چیز میں وہ ایسی رغبت ظاہر کرتے تو ہم اُن کی نذر کر دیتے۔ ہم تو گھبرانے لگے تھے کہ مہاراجا ہم سے زیادہ تفصیلات نہ پوچھنے لگیں، ہم اُنھیں کیا بتا پائیں گے۔ کیوں کہ اس سے زیادہ ہم خود کتنا جانتے ہیں۔ ہم اُن سے کیا عرض کریں کہ ابھی تو خود ہم پر ایک طلسمِ حیرت طاری ہے۔ ہم اپنے اس بزرگ کی اس نوازش کی ہزار تشریحیں کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ ضرور ہماری کوئی آزمائش ہے۔ ہم اس بے کراں، بے پناہ شفقت و محبت کے متحمل بھی ہو سکیں گے کہ نہیں۔" نواب حشمت جنگ کے لہجے میں معذرت اور تشکر کے علاوہ تشویش بھی شامل تھی۔ وہ بڑے نواب سے پوچھنے لگا۔ "جہانی میاں! آپ ہی بتائیے، اگر مہاراجا واقعی اِدھر اُدھر کے سوال کرنے لگتے! قبلۂ عالم سے۔" اُس کا اشارہ ابّا جان کی طرف تھا۔ "کوئی بات کیے بغیر، کچھ جانے بغیر ہم واضح طور پر کیا کہہ سکتے تھے۔ مہاراجا، ہمارے گھر تشریف لائے تھے۔ اُن سے قدیم روابط کا تقاضا تھا کہ ہم اسی طرح کچھ عرض کریں اور کم و بیش یہی کچھ تھا۔"

"آیندہ کبھی ضرور مہاراجا سے نیاز حاصل کریں گے۔" ابّا جان نے تیزی سے کہا۔ اُن کے ہونٹوں پر پھیکی پھیکی مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ "ہمیں جلد ہی واپس جانا چاہیے۔ قبلہ نواب صاحب کا اصرار تھا، ٹالنا مشکل ہو گیا۔ انشا اللہ جلد واپسی ہو گی۔"

"ہمیں یقین ہے کہ کل صبح مہاراجا کا کوئی قاصد آئے گا یا ٹیلی فون وہ خود بھی تشریف لا سکتے ہیں۔" نواب حشمت جنگ نے کسی قدر اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"سرِدست تو ہماری طرف سے معذرت ہی چاہ لیجیے۔" ابّا جان اٹکتی آواز میں بولے۔

"ہماری بھی یہی منشا ہے مگر اندیشہ یہ ہے کہ مہاراجا کچھ اور نہ خیال فرمائیں۔ جہانی میاں کے بہ قول یہ عذر کہیں مہمیز کا کام نہ دے۔ بہرحال ہم اُن سے کسی طرح نمٹ لیں گے۔ اپنے محترم بزرگ کے لیے کسی طرح بھی بارِ خاطر ہونا ہمیں گوارا نہیں۔ یہ ذکر تو یوں ہی آ گیا تھا۔ یہاں ملاقات کا یہ خوش گوار حادثہ پیش نہیں آ جاتا تو شاید ہم تذکرہ بھی نہ کرتے۔ اصل میں بات اتنی بھی اس باعث بڑھی کہ ہمیں کچھ ایسا گمان ہوتا ہے، ہمارے محترم نے فرمایا تھا کہ آپ کے پاس کچھ اور بھی نوادر ہیں۔ یہ بات ہمارے ذہن میں کہیں محفوظ تھی چنانچہ ہماری یہ خواہش غیر ارادی سہی مگر غیر شعوری نہیں تھی کہ مہاراجا سے بہتر کون ان کا قدر داں ہو سکتا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ بٹھل کے ماتھے پر سلوٹیں پڑی ہوئی ہیں مگر اُسے درمیان میں نہیں بولنا چاہیے تھا، وہ نہیں بولا۔ قہوہ پیتے ہی سب کھانے کے کمرے سے اُٹھ گئے اور موضوع خود بہ خود بدل گیا۔ نشست گاہ کی طرف آتے ہوئے راستے میں بڑے نواب نے میری طرف اشارہ کر کے نواب حشمت جنگ کو میری اور ابّا جان کی نسبت بتائی۔ حشمت جنگ چلتے چلتے رُک گیا۔ اُس کی آنکھوں میں تیز چمک ہویدا ہوئی۔ میرے قریب آ کے اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ "ماشا اللہ، ماشا اللہ۔ ہم یہی سوچ رہے تھے کہ عزیزِ مَن کے خال و خط میں قبلہ محترم سے کون سی مشابہت موجود ہے۔" وہ میرے شانے پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا۔ "کیا خوب! آپ سے مل کے عجب شادمانی محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے بدبداتے ہونٹوں سے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اُس کی آنکھیں سراپا میرے گرد منڈلا رہی تھیں۔ "یہی صحت اور تناسب رکھیے گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ہماری طرح نہیں۔ کسی زمانے میں ہم بھی آپ کے مانند دل کش اور چاق و چوبند نظر آتے تھے۔"

"اب بھی آپ لاکھوں میں منفرد ہیں۔" بڑے نواب نے کھل کھلا کے لقمہ دیا۔

"کہاں جہانی میاں! اب تو آئینہ دیکھتے ہوئے شبہ ہوتا ہے جب سے ٹینس چھوٹی ہے، سارا جسم ناراض ہو گیا ہے۔" معاً وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "آپ بھی کچھ کھیلتے ہیں؟"

"جی، جی ہاں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"یقیناً کسی میں کمال بھی حاصل ہو گا۔"

"کسی میں بھی نہیں۔"

"دل چسپی کس میں ہے؟" وہ اشتیاق سے بولا۔

میں اُسے کیا بتاتا۔ چاقو بازی، لاٹھی، بلم، پٹا، بل اور اڈا گیری۔ میں نے یہی کھیل کھیلے ہیں۔ میں کون کون سے کرتب کا نام لیتا۔ اسکول کے زمانے میں فٹ بال، بیڈمنٹن اور کبڈی تھوڑی بہت کھیلی تھی۔ اُس کے بعد موقع ہی نہیں ملا۔ دونوں کی سوالیہ نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو بتانا تھا۔ اگر میں یوں ہی کسی کھیل کے بارے میں کہہ دیتا تو وہ مجھ سے اور تفصیلات پوچھنے لگتا۔ میرے مُنہ سے نکل گیا "نشانے بازی۔"

"اچھا۔" اُس کی آنکھیں کھُل گئیں۔ بڑے نواب کی نگاہیں بھی مجھ سے چار ہوئی تھیں مگر دوسرے لمحے اُس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ "کون سا نشانہ؟" نواب حشمت جنگ نے تعجب سے پوچھا۔ "ہماری مراد ہے کس ہتھیار کی نشانے بازی سے آپ کو شغف ہے؟"

"سبھی سے تھوڑا بہت۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"پھر تو ہماری آپ سے خوب نبھے گی۔" وہ جوشیلی آواز میں بولا۔ "جواں مردوں کو یہی شوق ہونا چاہیے لیکن کوئی خاص ہتھیار، ہمارا خیال ہے بندوق؟"

"ہتھیار کوئی بھی ہو، نشانہ تو نگاہ کا ہوتا ہے۔" مجھے بٹھل کی بات یاد آ گئی، میں نے دُہرا دی۔

"کیا خوب!" وہ اچھل کے بولا۔ "بے شک، بے شک۔"

بڑے نواب نے اُس سے دوسرے لوگوں کا تعارف نہیں کرایا تھا۔ حشمت جنگ نے بھی جستجو ظاہر نہیں کی۔ وہ ایک معاملہ فہم اور مجلسی آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بڑے نواب نے باقاعدہ تعارفی رسم انجام نہیں دی تھی لہٰذا اُسے بھی کرید نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس حویلی سے اُس کا تعلق بڑے نواب جتنا نہیں تو کم بھی نہیں تھا۔ خانم کے آنے کی خبر نواب حشمت جنگ نے کسی بھی طرح سُنی ہو، خانم کی موجودگی اُس کے لیے کوئی معمولی واقعہ نہیں ہو گی۔ اُس کی بہن گیتی نواب عالم تاب کی بیگم کی حیثیت سے حویلی میں موجود تھی مگر گیتی کے مانند اُس کے چہرے پر کوئی تردد دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگ چہرہ چھپانے میں بہت طاق ہوتے ہیں، ایسے تو یہ ہنر کسی نہ کسی حد تک سبھی کو آتا ہے اور ہمیشہ لوگ ایک دوسرے سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

نشست گاہ میں وہ کچھ ہی دیر بیٹھے۔ پھر خادم کی اطلاع پر حویلی کے ایک اور حصّے میں چلے آئے۔ یہاں قالین بچھے ہوئے اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ بٹھل کے لیے حقہ بھی تیار تھا۔ فرش کے وسط میں گلابوں کے ڈھیر میں اگر دان رکھا تھا۔ اگر بتیاں سلگ رہی تھیں اور ہر طرف خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ یہ ایک ہال کمرہ تھا، حویلی کے دوسرے مرصّع کمروں کے مانند۔ یہاں آ کے معلوم ہوا کہ موسیقی کا اہتمام ہے۔ ہمارے لیے مخصوص نشستوں کے عین مقابل کچھ فاصلے پر سیاہ شیروانیوں میں ملبوس قوال بیٹھے تھے۔ یہ منظر دیکھ کے کانتے اور زورا مجھ سے چمٹ گئے۔ "قسم سے راجا! ابھی تھوڑا جان بنے گا۔" زورا بے تابی سے بولا۔ کانتے نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔ "نواب تو تاتھیا کا ڈول ڈال رہا تھا، دونوں بابوں کی وجہ سے دبارہ گیا۔"

"اُس نے ابّا جان اور منیر علی سے پوچھا تھا کیا؟"

"اشارہ کیا تھا۔" وہ سرگوشی میں بولا۔ "دونوں گردن ڈالے بیٹھے رہے، پھر قوالی پہ ہی اُترنا تھا اُس کو۔ اِدھر کا مُجرا بھی سالا ایک ہوتا لاڈلے! سوچا، استاد کو ٹھیکا لگاؤں کہ الگ الگ بٹھوا دو، پر سالی زبان آگے کو نہیں چلی۔"

"کانتے بھائی!" میں نے اُس کا شانہ تھام کے کہا۔ "میں چلتا ہوں۔"

"کیوں لاڈلے؟" وہ تُرشی سے بولا۔

"میں کمرے میں جا کے آرام کروں گا۔"

"آرام تُو نے ابھی تھوڑا کیا ہے۔"

"مگر مجھے نیند آ رہی ہے، ابھی موقع ہے، میں جا سکتا ہوں۔"

"ایسی کیا جلدی ہے تجھ کو!"

"کیا ضروری ہے کہ میں بھی شریک ہوں۔"

"چھوٹے موٹے لوگ نہیں آئے ہوں گے لاڈلے! اصیلوں کو ہی بلایا گیا ہو گا۔ اِدھر اُنیس مال نہیں چلتا۔ تھوڑی دیر ٹھیر جا، رنگ دیکھ کے فیصلہ کرنا۔ اُدھر کمرے میں اکیلا بھاڑ جھونکے گا کیا؟"

"یہ مجھے جانے ہی دو کانتے بھائی!"

مجھی سے غلطی ہو گئی تھی۔ کاش دوپہر کی طرح کھانے کے کمرے سے، میں چپکے سے نکل پڑتا۔ کانتے نے مجھے آگے کی طرف دھکیل دیا اور اس سے پہلے کہ میں لوٹ کے دروازے کا رُخ کرتا، نواب حشمت جنگ میرے پاس آ گیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "آپ نے نشانے بازی کا کہہ کے بے قرار کر دیا ہے۔ دل یہی کہتا ہے کہ ابھی ریوالور نکال کے باہر چلیں اور آپ کا کمال دیکھیں۔"

"میں نے آپ سے پہلے کہا تھا کہ مجھے کوئی کمال حاصل نہیں ہے۔"

"مگر ہم نے اس طرح نہیں سنا جس طرح آپ نے کہا ہے۔"

وہ کانا پھوسی کے انداز میں بولا۔ "ہم بھی کچھ اسی طرح کہتے ہیں۔"

"آپ اچھے نشانے باز معلوم ہوتے ہیں۔"

"اگر یوں کہیے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ ہمیں اچھی نشانے بازی بہت مرغوب ہے۔ نہ پوچھیے، کتنے دنوں بعد کوئی ہم شوق نصیب ہوا ہے۔"

"لیکن مجھے آپ میری عُمر کا مارجن تو دیں گے؟"

"اور ہمیں آپ ہماری جاتی عُمر کا؟" وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

چلتے چلتے ہم اُس جگہ آ گئے تھے جو ہمارے لیے مخصوص تھی۔ اب واپسی کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی قوّال اُٹھ کھڑے ہوئے، آدھا جھک کے اُنھوں نے ہمیں سلام کیا اور اُس وقت تک کھڑے رہے جب تک ہم سب بیٹھ نہیں گئے اور نواب حشمت جنگ نے اُنھیں باقاعدہ اجازت نہیں دے دی۔ اب کچھ وہی ہمارا میزبان معلوم ہوتا تھا۔ اُسی نے قوّالوں کے بارے میں مختصراً بتایا کہ عرصہ ہوا، دلّی سے آئے تھے، پھر لَوٹ کے نہیں گئے۔ دربار تک باریاب ہوئے ہیں اور کئی خطابات پا چکے ہیں۔ کم گاتے ہیں اور اپنی خاص طرز بنانے میں کوشاں ہیں۔ نواب حشمت جنگ ابا جان کے پہلو میں بیٹھا تھا، بڑا نواب اُس کے پہلو میں۔ مَیں، کانتے اور زدرا پیچھے ایک کونے میں سمٹ گئے تھے، اس طرح کہ اُن کی آڑ بھی ہو گئی تھی۔ کانتے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ حویلی میں آئے ہیں تو نامی گرامی لوگ ہی ہوں گے۔ نواب حشمت جنگ نے اُن کے بارے میں بتاتے ہوئے احتیاط سے کام لیا تھا۔ ابتدا میں تو وہ تانیں ملاتے رہے مگر پھر اُنھوں نے سب کو سحر زدہ سا کر دیا۔ ابا جان گنگ ہو گئے تھے۔ منیر علی باقاعدہ جھوم رہے تھے اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کا ورد کر رہے تھے۔ پیرو پر اضطراری کیفیت طاری تھی۔ بِتھل کی آنکھیں بھی بھاری بھاری ہو گئی تھیں۔ میں شروع ہی سے اُٹھنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا مگر کوئی معقول عُذر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نیند آنے کا عُذر بد ذوقی کی بات تھی۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ اُن کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے مترادف تھا۔ رفتہ رفتہ قوّالوں کی آواز کھل رہی تھی۔ درمیان درمیان میں وہ فارسی کلام کی آمیزش کر دیتے تھے۔ اُن کی صدائیں سازوں میں رَل مِل کے تھوڑی دیر میں کیا سے کیا ہو گئی تھیں۔ میں نے اُن کی طرف سے اپنے کان اور آنکھیں بند رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ ممکن نہیں رہا۔ اُن کی آوازیں کبھی کبھی تو سارا جسم جھن جھنا دیتی تھیں۔ میں بھی جانے کہاں بھٹک گیا تھا۔ مجھے تو اُس وقت کچھ ہوش آیا جب اُن کے سُر خاموش ہوئے۔ جیسے ہی وہ سانس لینے ٹھیرے، مجھے پھر وقت گزرنے اور دیر ہو جانے کی اُلجھن ہونے لگی۔ ابھی اُٹھا جا سکتا تھا ورنہ دوسرے کلام کے خاتمے تک بیٹھنا پڑتا۔ میں اُسی لمحے اُٹھ گیا لیکن کھڑے ہو جانے کے بعد مجھے اپنی وحشت کا احساس ہوا۔ میں اِن سے کیا کہوں گا۔ سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ "میں اجازت چاہوں گا۔" بہ دقت تمام یہ لفظ میری زبان سے ادا ہوئے۔ وجہ معلوم کرنا بھی شاید آداب کے خلاف تھا۔ کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ البتہ سبھی کے چہروں پر لکیریں کھنچ گئیں۔ کانتے نے اُسی وقت میرا ہاتھ پکڑ لیا لیکن جب میں نے آگے قدم بڑھایا تو اُس نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔ میں نے پھر کسی سے نگاہیں نہیں ملائیں، نہ پیچھے مڑ کے دیکھا اور لپکتا ہوا کمرے سے آ گیا۔ آتے وقت مجھے بِتھل کی آواز سُنائی دی تھی، وہ اُن سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ وہاں موجود ہی تھا، اُس نے ضرور میری طرف سے کوئی مناسب عُذر کر دیا ہوگا۔

ابھی ایسا زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ تقریباً ساری روشنیاں جل رہی تھیں۔ راہ داریوں میں چہل پہل بھی نظر آ رہی تھی۔ میں تیز قدموں سے چند منٹوں میں بالائی منزل پر آ گیا اور کمرے میں جانے سے پہلے کچھ دیر باہر ٹہلتا رہا۔ قوارہ بند ہو چُکا تھا لیکن وہاں اِکا دُکا خادم تعینات تھے۔ اُنھوں نے مجھے دیکھ لیا ہوگا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت میرے پیر ڈگمگا رہے تھے۔ اندر ہر چیز روشن تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا لیکن کوئی آیا ضرور تھا۔ بستر کی چادر بے شکن تھی اور تکیے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ مسہری کے سرہانے میز پر مجھے کئی کتابیں نظر آئیں۔ میں نے اُنھیں اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔ سب حیدر آباد کی تاریخ سے متعلق تھیں۔ میں نے کتابیں رکھ دیں اور پہلے اپنی اکھڑی ہوئی سانسیں بحال کرنے کی کوشش کی، ٹھنڈے پانی کی بوتل سے پانی نکال کر پیا اور خاص دان کھول کے دیکھا، تازہ گلوریاں رکھی تھیں، گویا کسی کو گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ نہ معلوم کون آیا ہوگا۔ میں نے گراموفون ریکارڈ ٹٹول کے دیکھا اور خراب ہو جانے کے خیال سے یوں ہی چھوڑ دیا۔ میں کچھ دیر کبھی اِدھر، کبھی اُدھر کمرے میں گھومتا رہا، کبھی یہ اور کبھی وہ چیز کھکھوڑتا رہا پھر کتاب لے کے آرام کرسی میں بیٹھ گیا لیکن مجھ سے ایک صفحہ بھی نہ پڑھا جا سکا۔ تھوڑی ہی دیر میں احساس ہونے لگا کہ میں یہاں بے کار آ گیا۔ جانے مجھ پر وہاں کیا آفت ٹوٹ رہی تھی۔ کیا مجھے یہاں کسی کے منتظر ہونے کی توقع تھی؟ مجھے یہاں کس نے وقت دیا تھا؟ وہ لوگ کیا سمجھ رہے ہوں گے، اُنھوں نے صرف

ہماری خاطر یہ بزم آرائی کی تھی۔ یہاں کمرے میں تو وحشت ناک تنہائی چھائی ہوئی تھی۔ اب میرا لوٹنا بھی مناسب نہیں تھا۔ پھر میں کیا کروں۔ بیٹھے بیٹھے مجھے خفقان سا ہونے لگا۔ میں یہاں کیوں آیا تھا؟ میں نے کتنی ہی بار خود سے یہ سوال کیا۔ یقیناً مجھے توقع تھی کہ کمرے میں دوسرا منظر ہوگا، کوئی کمرے میں موجود ہوگا۔ نہیں ہوگا تو میرے پہنچتے ہی آ جائے گا حالانکہ دوپہر کو میں نے خود آنے والی خادمہ کو منع کر دیا تھا۔ ویسے بھی اب گیارہ بج رہے ہیں۔ میرے جی میں آئی، کیوں نہ ایک بار ڈوری کھینچ کے دیکھوں۔ وہ تو میں نے کہا تھا اور اُس نے سُن لیا تھا، لیکن اگر وہ آ گئی تو میں اُس سے کیا بات کروں گا۔ دوپہر کون سی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ اب بھی اگر مجھ سے کوئی بات نہ ہو سکی تو؟ بہتر ہے کہ ایک مرتبہ مجھے باہر جا کے خادموں کو دکھا دینا چاہیے کہ میں آ گیا ہوں، سماع کی محفل میں شریک نہیں ہوں۔ ممکن ہے، ابھی اُنھوں نے مجھے نہ دیکھا ہو مگر اس سے پہلے ایک مرتبہ ڈوری کھینچ لینے میں کیا حرج ہے۔ میں نے کسی تاخیر کے بغیر ڈوری کھینچ دی۔ لمحے گزر گئے۔ دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ میری آنکھیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اُسے بلانے کا یہ کوئی وقت نہیں تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ کوئی نہیں آیا۔ میرا ہذیان خود بہ خود بڑی حد تک کم ہو گیا تھا لیکن ابھی ڈوری کھینچے پانچ منٹ سے زیادہ نہ گزرے ہوں گے کہ دروازے پر چاپ اُبھری اور چوڑیوں کی کھن کھناہٹ ہوئی۔ میرا دل دھڑ دھڑانے لگا۔ جس وقت دروازہ کھلا، میری آنکھوں میں اندھیرا سا اُتر آیا تھا۔ وہی سامنے تھی۔ دوپہر والی خادمہ، جس کا نام نفیس تھا۔ اُس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ اُس کا سارا چہرہ ہی جگمگا رہا تھا۔ وہ دوسرا لباس پہنے ہوئے تھی۔ گہرے نیلے رنگ کا لمبا کُرتا، سفید پاجامہ، کُرتے پر بڑے بڑے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ دوپٹا بھی نیلا تھا، روشنی میں اُس پر ٹکے ہوئے ستارے دمک رہے تھے۔ اُس کی "تسلیم" پر چند لمحوں تک میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے گھورتا رہا۔ "بندی اُمید کرتی ہے، جناب کے مزاج بخیر ہوں گے۔" اُس کی آواز میں پہلے سے زیادہ کھنک تھی۔

"جی ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ کی کتابوں کا شکریہ۔"

"سرِ دست یہی دستیاب ہو سکیں۔ مہتمم کتب خانہ کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ کل وہ جناب کے لیے اس موضوع پر مستند کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر دے۔"

"میں نے ابھی انھیں سرسری طور پر دیکھا ہے۔"

"بندی کو علم ہے، جناب کو مہلت ہی کتنی ملی تھی۔" وہ شرماتے ہوئے بولی۔ "مہتمم کا کہنا ہے کہ اگر جناب کو ضرورت پیش آئی تو وہ ریاست کے کتب خانے سے بھی بعض نادر نسخے فراہم کر سکتا ہے۔"

"آپ بیٹھیے گا نہیں؟" میں نے گھُٹی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ جھجکتی ہوئی میرے مقابل کرسی پر ترچھی ہو کے بیٹھ گئی۔ میں نے اُس سے کہا۔ "میں نے آپ کو ناوقت زحمت دی۔"

"بندی کب سے منتظر تھی۔" وہ برجستہ بولی۔

"آپ یہیں موجود تھیں؟"

"جب تک جناب آرام فرما رہے تھے۔"

"آپ کے جانے کے بعد مجھے گہری نیند آ گئی تھی۔"

"بندی نے اسی لیے زحمت نہیں دی۔"

"آپ کو معلوم تھا کہ میں۔ ۔ ۔ میں؟"

"کمرے میں رات تک روشنی نہیں تھی۔" وہ چہکتی آواز میں بولی۔ "دروازے بھی بند تھے۔"

"ہاں!" میں نے سانس لے کے کہا۔ "دنوں بعد مجھ پر ایسی غفلت طاری ہوئی تھی۔"

"گہری نیند تو نعمت ہوتی ہے۔" وہ شستگی سے بولی۔ "چھوٹی سرکار اور بی بی آنا چاہتی تھیں۔ اُنھوں نے آداب کہا ہے اور مزاج پرسی کی ہدایت کی ہے۔"

"میری طرف سے اُنھیں بہت بہت سلام عرض کر دیجیے گا۔ میں خود آتا لیکن وقت ہی نہیں ملا۔ کیا وہ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟"

"اب تو عرصے سے کوئی وقت طے نہیں ہے۔"

"جی، جی۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں، لیکن سب خیریت تو ہے؟"

"پروردگار کا شکر ہے۔"

اُس سے پوچھنے کے لیے مجھے کوئی اور بات سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ اُسے شاید میری اس خالی الذّہنی کا احساس ہو گیا تھا، گنگناتی سی آواز میں بولی۔ "جناب کچھ نوش فرمانا پسند فرمائیں گے؟" میں نے انکار کر دیا تھا لیکن پھر میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ کو زحمت ہوگی۔"

"بندی جناب کی خادمہ ہے۔"

"مگر میرے لیے تو آپ خادمہ نہیں ہیں۔"

"جناب کی نوازش ہے کہ بندی کو رُتبہ دے رہے ہیں لیکن اسے یہی منصب سونپا گیا ہے۔" اُس کی مستعد آواز میں کسی قدر لرزش آ گئی تھی۔

"آپ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں۔"

اُس کے رُخسار لال ہوگئے۔" آپ کا حُسنِ سماعت ہے۔"

اُسے یہی جواب دینا چاہیے تھا لیکن مجھے پھر کیا کہنا چاہیے۔ دوپہر کی طرح میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سی باتیں آئی تھیں، میں ایک ایک کرکے ہر بات رد کرتا رہا۔ یہ اندیشہ میری زبان جکڑ لیتا تھا کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی کوئی ایسی ویسی بات گیتی اور برجیس کے لیے سرگرانی کا سبب نہ بن جائے۔ سو میں خاموش بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ کمرے کی روشنی میں اُس کا گندمی رنگ اور گہرا ہوگیا تھا۔ وہ بار بار اپنا دوپٹا درست کرتی تھی اور لمحے لمحے اُس کے بدن میں کوئی لہر سی اُٹھتی تھی۔ یکایک میرے ہاتھ میں جیسے کوئی سرا آگیا۔ میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔" آپ کی چھوٹی سرکار اور بی بی اس وقت کیا کر رہی تھیں؟"

اُس کے لبوں پر مُسکراہٹ بکھر گئی، شگفتگی سے بولی۔" کچھ دیر پہلے تک چھوٹی سرکار خادماؤں کو ہدایات دے رہی تھیں۔ اس کے بعد بندی سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"اور برجیس بی بی؟"

"بندی اُن کے ساتھ تھی۔" اُس کی آواز ٹمٹمانے لگی۔

"وہ کیا کر رہی تھیں؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔" مناسب ہو تو بتائیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ گھبرا کے بولی۔" بی بی سرکار اپنے کمروں میں موجود ہیں۔"

"آرام کر رہی ہیں؟"

"بندی کیا عرض کرے۔" وہ پریشانی سے بولی۔" سچ پوچھیے تو بی بی اپنے کمرے میں اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"بی بی سرکار پر کبھی کبھی ایسی خاموشی چھا جاتی ہے۔"

"اچھا! مگر ایسا کیوں؟"

"بندی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کب سے اپنے کمرے میں خاموش بیٹھی ہیں۔" وہ اداسی سے بولی۔

"اُن کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"بظاہر خدانخواستہ ایسی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔ ابھی شام تک تو سب سے باتیں کر رہی تھیں، اچانک اُنھیں نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔"

"آپ کی بی بی بہت، بہت اچھی لڑکی ہیں۔"

"بے شک۔" وہ وارفتگی سے بولی۔" خدا اُنھیں ہمیشہ خوش رکھے۔ بی بی سرکار تو پھولوں کی طرح ہیں، آئینے کے مانند ہیں۔"

"ایک بات پوچھوں، بتائیں گی؟" میں نے سرگوشیانہ

"بندی تعمیلِ حُکم کے لیے بھیجی گئی ہے تاہم اس کی درخواست ہے کہ اس کی بساط ملحوظِ خاطر رہے۔"

"نہیں نہیں۔" یوں ہی ایک بات ذہن میں آگئی، آپ سے کہ دونوں میں آپ کو کون زیادہ پسند ہے؟" میں نے جان بوجھ کر ایک فضول بات کہی۔

"بندی نے کبھی اُنھیں جُدا جُدا تصوّر نہیں کیا۔"

"مجھے یقین تھا کہ آپ یہی جواب دیں گی۔"

"بندی نے احوالِ واقعی عرض کیا ہے۔" وہ مُسکراتے ہوئے

"اور، اور یہ چھوٹی بیگم صاحب اور برجیس بی بی کے مشاغل رہتے ہیں؟" میں نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔

"مشاغل کی بات تو پہلے کبھی تھی۔" وہ ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔" اب تو عرصے سے ایک ہی مشغلہ رہ گیا تھا۔ دعاؤں کا اہتمام کا اور عیادت کے لیے آنے والوں کی پرسش کا۔ پہلے کبھی چھوٹی صاحب کو ایک پل کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ حویلی میں اُن کے آ کے بعد بڑی سرکار نے سارا انتظام اُن کے سپرد کر دیا تھا۔ سا حویلی کی دیکھ بھال، ایک ایک گوشے پر اُن کی نگاہ رہتی تھی۔ ملاز کا خیال، اُن کی غمی خوشی میں شرکت، تقریبات کا اہتمام۔ آنے والے اعزا اور مہمانوں کی پذیرائی۔ اُنھوں نے اپنے ذمّے کتنے لیے ہوئے تھے۔ حویلی کے مصارف کی بھی وہی نگرانی کرتی تھیں تمام مصروفیات کے علاوہ مطالعے کے لیے بھی وقت نکال لیتی کبھی شطرنج سے بھی شوق فرما لیتی تھیں۔ شادی سے پہلے بیڈمنٹن خوب کھیلا کرتی تھیں۔ شادی کے بعد ترک کر دیا لیکن سرکار کی خواہش پر دوبارہ مشق شروع کر دی تھی۔"

"اور برجیس بی بی؟"

"دونوں کو ایک دوسرے کا سایہ سمجھیے۔"

"واقعی، یہی محسوس ہوتا ہے۔"

میری نظروں میں برجیس اور گیتی کے سراپا گھوم رہے اُن کا ذکر کرتے ہوئے خادمہ نفیس کی آواز بہکنے مچلنے لگتی تھی جیسے اپنا ہی ذکر کر رہی ہو۔ میں نے طے کیا کہ صبح ہوتے ہی زنان خانے کی طرف جاؤں گا لیکن یہ میں نے اُسے نہیں بتایا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی اپنے دوپٹے کے تاسے کرید رہی تھی۔ جیسے ہی اُسے احساس ہوتا کہ میری نگاہیں اُس کے چہرے پر مرکوز ہیں، اُس کا بدن لگتا اور اس کی لمبی لمبی پلکوں پر ارتعاش طاری ہو جاتا۔ وہ

اُس سے کچھ اور پوچھوں گا، اُسے کوئی حُکم دوں گا یا اُسے جانے اجازت ہی دے دوں گا۔ میری خاموشی اُسے بہت گراں گذری ہوگی میرے سر میں پھر سب کچھ منتشر ہوگیا۔ کیا میں اُس سے یہی جاننا چاہتا تھا؟ مگر اتنا کم و بیش میں بھی جانتا تھا۔ پھر میں نے رات گئے اُسے زحمت کیوں دی اور اُسے بے جواز اتنی دیر روکنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ وہ بُت کی طرح بیٹھی ہے اور میں اُس کی صورت دیکھتا رہوں۔ جو لمحہ گزر رہا تھا، میرے کا سناٹا بڑھتا جاتا تھا اور رفتہ رفتہ میرے ہاتھ پیر ٹوٹنے سے تھے۔ میں ایک غبی، ایک فضول آدمی ہوں۔ میری زبان بار بار بہکنے لگتی ہے۔ جب تک یہ موجود رہے گی، میرے رگ و پے میں یہ سی سلگتی رہے گی۔ بہتر یہی ہے کہ وہ چلی جائے۔ میرا اندازہ درست وہ اِس سکوت سے اُکتا گئی تھی، کتراتے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔ ری لب کُشائی پر معذرت خواہ ہے۔ ناچیز کا گمان ہے کہ آپ بھول رہے ہیں۔ جناب نے بندی کو یاد فرمایا تھا۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے بدحواسی سے کہا۔" آپ کو جلدی ہے؟"

"بندی کی یہ مراد نہیں۔" وہ سراسیمگی سے بولی۔" اُس نے محض یاد دہانی کے لیے یہ جسارت کی ہے۔"

"میں آپ کو سچ بتاؤں۔" میں نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔ مجھے یہاں آکے بہت تنہائی محسوس ہو رہی تھی جب کہ میں اس تنہائی کے لیے سماع کی ایک بہت اچھی محفل چھوڑ کے آیا تھا مگر اب سب ٹھیک ہے۔ اب کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو جا سکتی ہیں۔"

"بندی نہایت شرمندہ ہے لیکن خدا گواہ، اس کا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بندی خود کو گناہ گار سمجھ رہی ہے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے، ایسا مت سمجھیے، میں آپ سے کسی بیزاری سے نہیں، صاف دلی سے کہہ رہا ہوں۔" میں نے اُس کی خاطر یہ ضروری سمجھا کہ ضرورت پڑنے پر اُسے پھر بُلا لوں گا۔

"جی، جی۔" وہ لرزتے ہونٹوں سے بولی۔

بلوں اِس صورت میں اُس کے لیے خود کو کمرے سے چلے جانے پر آمادہ کر لینا آسان نہیں تھا۔ نہ مجھے اُس سے دوبارہ کہنا چاہیے تھا۔ میرے ذہن میں یہی بات آئی۔ میں نے اُس کی دل دہی کے لیے کہا اس وقت دستیابی ممکن ہو تو مجھے نزلے کی کوئی دوا فراہم کر دی جائے۔"

"نصیبِ دشمناں، بندی کو پہلے ہی شبہ تھا کہ جناب کے مزاج ناساز ہیں۔"

"کوئی خاص بات نہیں لیکن احتیاط بہتر ہے۔"

"بندی ابھی لے کے حاضر ہوتی ہے۔ حویلی میں ہر وقت ایسی ادویات موجود رہتی ہیں۔ طبیب آنے میں بھی کوئی دیر نہیں لگے گی۔ فون پر ڈاکٹر کو بھی بلایا جا سکتا ہے۔ جناب کے لیے انگریزی دوائیں زیادہ مناسب ہوتی ہیں یا یونانی؟"

"کوئی بھی جو آسانی سے فراہم ہو سکے مگر کسی حکیم ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یقیناً سر درد کی بھی شکایت ہوگی۔"

میں نے سر ہلا کے اقرار کیا۔ وہ دوبارہ جلد واپسی کا کہہ کے کمرے سے فوراً چلی گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے سے اچانک شور کم ہوگیا ہو اور میں کسی چھاؤں میں آگیا ہوں۔ جیسے میں اپنے آپ سے دُور چلا گیا تھا اور اب اپنے آپ تک واپس آگیا ہوں لیکن کشادگی و طمانیت کا یہ وہم سب عارضی تھا۔ چند لمحوں بعد ہی جیسے مجھے سب کچھ یاد آنے لگا اور میرے جسم سے پسینہ پھوٹتا رہا۔ وہ کیا سوچتی ہوگی، وہ میرے حواس کی درستی پر ضرور شبہ کرتی ہوگی۔ یہ رویّہ اُس کے لیے ناقابلِ فہم ہوگا۔ وہ تو بہت نرم و نازک، بہت خوب صورت لڑکی ہے۔ اتنے دل نشیں انداز میں باتیں کرتی ہے۔ میرا کیسا خیال رکھ رہی تھی۔ میں اُس سے دُنیا جہان کی باتیں کر سکتا تھا۔ شہر کے متعلق، حویلی کے متعلق، موسموں کے بارے میں مگر میرا دم گھٹنے لگتا ہے، میرا دماغ جو خراب ہونے لگتا ہے۔

اُسے جلد ہی واپس آجانا چاہیے تھا لیکن دیر ہوگئی اور وہ نہیں لوٹی۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اُبھرنے لگے۔ اچھا ہے کہ وہ واپس نہیں آئے۔ میں اس دوران خود کو طمانچے ہی مارتا رہا۔ اب کے وہ آگئی تو میں اس طرح نہیں کروں گا۔ میں نے ایک بار پھر عزم کیا اور آرام کرسی سے اُٹھ کے ایک گلاس پانی پیا۔ بیٹھے بیٹھے میرا جسم اکڑ سا گیا تھا۔ سامنے ہی آئینہ نصب تھا۔ میں نے ایک نظر اپنا چہرہ دیکھا۔ سُوجا چہرہ، بکھرے بال، گریبان کے اُوپر کا بٹن بھی کھلا ہوا۔ غسل خانے جا کے میں نے منہ پر تین چار چھپکے مارے۔ بالوں میں کنگھی پھیر کے میں جلد سے جلد کمرے میں واپس آگیا۔ وہ نہیں آئی تھی لیکن میرے آرام کرسی پر بیٹھنے کی دیر تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ وہی تھی۔ وہ ہانپتی ہوئی اندر آئی، ہاتھ میں ایک چھوٹی ٹرے تھی جس پر ریشمی کپڑے سے ڈھکا ہوا مگا رکھا تھا۔ آتے ہی اُس نے پھولی

سانسوں سے مجھے بتایا کہ وہ میرے لیے جوشاندہ تیار کر کے لائی ہے اور کڑواہٹ کے خیال سے اُس نے ذرا سی شکر بھی ملا دی ہے۔ ابھی گرم ہے۔ جوشاندہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو پینے کے لائق ہو جائے گا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ کھڑی رہی۔

"جناب سے ایک گزارش کرنی ہے۔" وہ رُکی رُکی آواز میں بولی۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"بی بی سرکار یہاں آنے کی خواہش مند ہیں۔"

"بی بی سرکار! برجیس بی بی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہ جناب کی مزاج پُرسی کے لیے آنا چاہتی ہیں۔"

"مگر میں تو بالکل ٹھیک ہوں، مجھے کوئی ایسی خاص ۔ ۔ ۔"

میں نے اپنی ہی بات کاٹ کے کہا۔ "لیکن اگر اُن کی یہی خواہش ہے، وہ تشریف ہی لانا چاہتی ہیں تو بسر و چشم لیکن رات خاصی ہو گئی ہے، اُنھیں خواہ مخواہ زحمت ہو گی۔ آپ نے اُن سے کچھ زیادہ تو نہیں کہہ دیا؟"

"بندی نے اپنی جانب سے احتیاط کی تھی لیکن بی بی سرکار پریشان ہو گئیں۔ اُنھوں نے ہی یہ جوشاندہ تجویز کیا ہے۔ وہ تو طبیب کو بلانے کے لیے اصرار کر رہی تھیں۔ بندی نے اُن سے عرض کیا کہ جناب نے منع کیا ہے۔"

"ارے!" میں نے خجالت سے کہا۔ "وہ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اور کیا کہوں۔

"اُنھیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی، بس جناب کا خیال ہے، اجازت ہو تو بندی اُن سے جا کے کہہ دے۔"

میں نے تذبذب سے کہا۔ "بہر حال اگر اُن کی یہی مرضی ہے تو ۔ ۔ ۔"

اس نے میری بات پوری بھی نہیں ہونے دی، اتنا سنتے ہی تیزی کے ساتھ کمرے سے اوجھل ہو گئی۔ میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر تک تو میں کرسی پر گم سُم بیٹھا رہا، یکا یک میری نظریں گھڑی پر گئیں۔ اُس وقت پونے بارہ بج رہے تھے۔ میں فوراً کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا آمد و رفت کے عام دروازے کی طرف لپکا۔ وہ بند ہی تھا۔ پھر میں نے کمرے پر ایک نظر ڈالی۔ فرش پر میرے پیر بہک رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ اِدھر خادمہ نفیس گئی، اُدھر اُس کی آہٹ گونجی۔ گویا برجیس پہلے ہی اُدھر آ گئی تھی۔ اُسی لمحے میرا سارا جسم جھن جھنانے لگا تھا جب میں نے خادمہ کے پیچھے برجیس کا چہرہ دیکھا۔ وہ برجیس ہی تھی۔ جیسے بدلیوں سے اچانک چاند نکل آئے۔ عنابی رنگ کا جوڑا پہنے، اسی رنگ کے دوپٹے سے اُس کا سر ڈھکا ہوا تھا جس کی وجہ سے چہرے کا شہابی رنگ اور کھل اُٹھا تھا۔ وہ نپے تلے قدموں سے اندر داخل ہوئی تھی۔ میں دزدیدہ نگاہوں سے اُسے آتے دیکھ رہا۔ اُس کی تسلیم کا جواب بھی میں نے جانے کس طرح دیا۔ "نفیس کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ اس وقت کچھ بہتر محسوس نہیں کر رہے ہیں۔" ایسا لگا جیسے کمرے میں اُس کی آواز کی کرچیاں بکھر گئی ہوں۔

"جی! مگر کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔" میں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہا۔ "آپ نے اتنی، اتنی ۔ ۔ ۔"

"نہیں نہیں، ہم جاگ ہی رہے تھے۔" وہ سیمابی لہجے میں بولی۔ "اب کیسے ہیں آپ؟"

میں نے مُسکرانے کی کوشش کی۔ "بس یوں ہی ذرا سر بھاری سا تھا۔"

"موسم بھی کچھ تبدیل ہو رہا ہے۔ آج خنکی نسبتاً زیادہ ہے۔" وہ لپکتی آواز میں بولی۔ "ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آپ محفلِ سماع میں شامل ہوں گے۔"

"وہاں کچھ دیر ہی بیٹھا جا سکا۔"

"کیا اچھے قوال نہیں تھے؟"

"وہ تو اپنے فن میں یکتا تھے، بس جی نہیں لگا۔"

"اچھا ہوا، آپ اس طرف چلے آئے۔"

مجھے خیال نہیں رہا تھا، وہ ابھی تک کھڑی تھی۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے اُس سے بیٹھنے کی درخواست کی۔ وہ تمکنت سے کہنے لگی کہ بس اب ہم چلیں گے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے، رات بہت ہو گئی ہے۔

"مگر کچھ دیر تو بیٹھیے۔ میں دن میں خاصا سو چکا ہوں۔ شام کو اُدھر آنے کا ارادہ تھا لیکن کھانے کے بعد ایسی نیند آئی کہ ہوش ہی نہیں رہا۔"

"ہم بھی یہی توقع کر رہے تھے کہ شاید آپ آ جائیں۔" اُس کی آواز اُمڈ رہی تھی۔ "خود ہم بھی شام کو آنے کی سوچ رہے تھے لیکن یہی اطلاع ملتی رہی کہ آپ آرام کر رہے ہیں۔"

"بیٹھیے نا۔" میں نے التجائی لہجے میں کہا۔ اُس نے نگاہیں اُٹھا کے میری جانب دیکھا، اُس کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ اُس نے پھر انکار نہیں کیا، اپنا بدن سمیٹے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ چند ثانیوں تک میں خاموش رہا پھر میں نے تھمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چھوٹی بیگم صاحب کیسی ہیں؟"

"اُنھیں بھی آپ کا انتظار تھا۔" وہ بے تابی سے بولی۔ "وہ عالم بھائی کی طرف گئی ہوئی ہیں ورنہ ہمارے ساتھ ضرور آتیں۔"

"چھوٹے نواب صاحب کا کیا حال ہے؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔ اُس کے چہرے پر یکایک دھواں سا چھا گیا۔ مجھے فوراً اپنے سوال کی نامناسبی کا احساس ہو گیا تھا لیکن میں کیا کرتا، منہ سے نکلی ہوئی بات لوٹائی نہیں جا سکتی۔

"ہمیں اُن کی جانب سے اب ایسی فکر نہیں ہے۔" وہ ڈوبے لہجے میں بولی۔ "اس کے بعد سب کچھ خدا پر چھوڑ دینا بہتر ہو گا اور اُس نے اپنے کرم کے دروازے ہم پر کھول ہی دیے ہیں۔"

میں نے اس بابت پھر کچھ نہیں پوچھا۔ خادمہ نفیس دروازے کے پاس ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ مجھے اُس سے بھی بیٹھ جانے کو کہنا چاہیے تھا لیکن برجیس کے خیال سے چُپ رہا۔ دوبارہ جب میری نظر اُس طرف گئی تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ اندرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ نیچے تو نہیں گئی ہو گی، یہیں کمرے سے ملحق ملازموں کے گوشے میں موجود ہو گی۔ میں اور برجیس کمرے میں اکیلے رہ گئے تھے۔ نفیس نہ جاتی تو اچھا تھا۔ اُس کے جاتے ہی میرا جسم سُن سا ہونے لگا اور میری زبان اینٹھنے لگی۔ اس سے کہنے کے لیے میں کوئی برمحل اور خوش اثر بات سوچ رہا تھا کہ اُس کی سُریلی آواز کمرے میں گونجی۔ "یہاں آپ کو کسی چیز کی شکایت تو نہیں ہے؟"

"کاہے کی شکایت!" میں نے تعجب سے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ "کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اتنے تکلفات سے ہمیں کبھی سابقہ نہیں پڑا۔"

"تکلفات کہاں ہیں؟" وہ شائستگی سے بولی۔ "یقین کیجیے، ہمیں ہر لحظے یہ احساس کھٹکتا ہے کہ ہم سے ۔ ۔ ۔ ہم سے۔"

"کہ آپ سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے۔" میں نے اُس کی بات مکمل کر دی۔ "ہم سے پوچھیے تو اب ہمیں شرمندگی ہونے لگی ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" وہ بے تابانہ بولی۔ "ایسا مت سوچیے۔ ہم سے تو کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

"اِس سے زیادہ کیا ممکن ہے۔"

"یقیناً ہمارے پاس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔"

"میں آپ سے التجا کرتا ہوں، اب اِسے نہ دُہرایئے۔" میں نے اُس کی منت کی۔ "ہمارے لیے یہی کیا کم ہے کہ اس بہانے اتنے اچھے لوگوں سے مل لیے اور، اور کسی کے کام آ جانے کی خوشی کچھ کم ہوتی ہے کیا؟"

"یہ آپ کا حوصلہ ہے۔ ہم سے آپ کے سامنے سر نہیں اُٹھایا جاتا۔ اچھے ہونے کا ثبوت ہم نے پہلے بہت دے دیا ہے۔"

"دیکھیے پھر وہی۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں، زندگی ہم سے کیسا سلوک کرتی رہی ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ ہمارے لیے کوئی نیا نہیں تھا بلکہ پہلے سے کچھ کم ہی تھا۔"

"یہ بھی خوب ستم ہے کہ آپ ہمی کو یہ یاد کرا رہے ہیں۔"

"آپ سے غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔ "اُس مشقت اور آپ کے دیے ہوئے اُس عذاب کے بعد اگر ایسا ثمر ملتا ہے تو آدمی بہت سے عذابوں سے گزر سکتا ہے۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ عذاب، وہ قہر ہمارے لیے نیا نہیں تھا، یہ ثمر البتہ بالکل نیا ہے۔"

اُس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ کپکپاتے ہونٹوں سے بولی۔ "آپ بہت مہربان ہیں۔" پھر خود ہی کہنے لگی۔ "آپ درست کہتے ہیں، ہمیں اس ذکر سے اجتناب ہی کرنا چاہیے۔"

"جی ہاں، بہتر یہی ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "میں آپ کو بتاؤں کہ اگر بڑے نواب صاحب کی جگہ ہم ہوتے تو ہم بھی اس صورتِ حال میں شاید یہی کچھ کرتے۔"

"شاید کبھی نہ کرتے۔" وہ مچلتی آواز میں بولی۔ "آپ پہلے بھی ہمیں یہ دلاسا دے چکے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں، آپ ایسا کبھی نہ کرتے۔"

"بہر حال۔" میں نے پہلو بدل کے کہا۔ "اور بھی بہت سی باتیں، بہت سے موضوعات ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم جب بھی ملیں اُسی اندھیرے کو تازہ کریں۔"

"ہم بہت کوشش کرتے ہیں لیکن ہماری آنکھوں سے وہ رات اوجھل نہیں ہوتی جو ہم زنداں میں دیکھ کر آئے تھے۔"

"وہ رات اگر جہنم تھی تو یہ رات جنت بھی تو ۔ ۔ ۔" لفظ میرے حلق میں گڈ مڈ ہو گئے اور ایک ثانیے کے لیے میرا سر گھوم کے رہ گیا۔ اُس کی چمکتی آنکھیں میرے سارے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ شرارے سے لپک رہے تھے۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ یہ کون سی کیفیت ہے، سو میرا وجود اندر ہی اندر لرزتا رہا۔ اُس کے رُخساروں پر بھی آگ سی روشن تھی اور ناک کے گوشے پھڑک رہے تھے۔ اُس کے نیم وا ہونٹوں میں جنبش ہوئی تو میرے دل کی دھڑکن بند ہونے لگی۔ "ہمارے لیے اس سے بڑی مسرت اور عزت کیا ہو سکتی ہے کہ آپ ایسا محسوس کرتے ہیں۔" اُس کی آواز دھڑک رہی تھی۔ "لیکن یہ کانٹا ہماری رگِ جاں میں شاید ہمیشہ پیوست رہے کہ وہ جہنم بھی تو ہماری طرف سے تھا۔"

میں نے ایک گہری سانس بھری۔ "وہ آپ کی طرف سے کب تھا۔"

میری آواز بھرّا رہی تھی۔ "دیکھیے، اب آپ اپنے دل سے یہ غبار نکال دیجیے۔"

وہ خاموش رہی۔ اس اثنا میں مَیں اپنے آپ سے نبرد آزما رہا۔ اِس لمحاتی عرصے میں مجھے جیسے اپنی بکھری ہوئی بینائی سمیٹنے کی فرصت مل گئی تھی۔ میں نے شگفتگی سے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کی کیا خاطر کی جائے۔ اس وقت تو میزبان میں ہوں۔"

اُس کا چہرہ پھول کی طرح کِھل اُٹھا۔ "شکر ہے کہ آپ ایسا سمجھ رہے ہیں۔"

"کیا آپ اس وقت میری مہمان نہیں ہیں؟"

"مگر بن بلائے۔" وہ چٹکتی آواز میں بولی۔

"بظاہر تو یہی ہے مگر بہ باطن شاید ایسا نہیں۔"

"کیوں؟ کیا آپ، آپ۔" وہ اضطراب سے بولی۔ "کیا آپ ہمارے بارے میں سوچ رہے تھے؟"

"کچھ یہی سمجھیے۔" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔

"تو پھر آپ نے خادمہ سے کہہ کیوں نہیں دیا؟"

"بس کہتے کہتے رہ گیا۔" میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یاد ہے، آپ نے کیا وعدہ کیا تھا؟"

"کون سا وعدہ؟" میں نے تذبذب سے کہا۔

"کہ آپ کوئی تکلف نہیں کریں گے۔" وہ تمتماتی آواز میں بولی

ع "اے ذوق! تکلف میں ہے تکلیف سراسر"

"مجھے یاد ہے مگر دیکھیے نا، وقت ہی کہاں ملا۔ شام ہی کو ممکن تھا اور شام سونے میں غارت ہوگئی۔ پھر رات کو کھانے پر بلا لیا گیا، وہاں سے واپسی میں دیر ہی اتنی ہوگئی تھی۔"

"اب آپ کا یہاں دل لگ رہا ہے نا؟" وہ سرسراتے لہجے میں بولی۔

"یہ جگہ تو ایسی ہے کہ یہاں ساری زندگی گزار دی جائے۔"

"اس سے بہتر بات کیا ہوگی۔" اُس کی آواز دمک رہی تھی۔

"آپ چاہیں تو ساری زندگی رہیے۔ یہ تو ہمارے لیے سب سے بڑی راحت ہوگی۔"

"میں نے طے کیا ہے کہ جلد ہی یہاں آؤں گا۔"

"ابھی جلد جانے کا ارادہ تو نہیں ہے؟"

"میرا ارادہ دوسروں سے مشروط ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہمیں جلد جانا چاہیے، پہلے ہی دیر ہوگئی ہے۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔ آپ کو کیا بتاؤں۔"

"ایسا ہے تو ہم اصرار نہیں کریں گے مگر جلد واپس آیئے گا، اور اپنا گھر سمجھ کے۔"

"لیکن ایک بات کا خیال رکھیے گا، تکلف سے میرا جی بہت گھبراتا ہے۔ میرا خیال ہے سبھی کا گھبراتا ہوگا۔ میں اِسے اپنا گھر ہی سمجھ کے آؤں گا۔"

"ہم نے خود آپ سے یہ رسمی آداب و قواعد ترک کر دینے کی گزارش کی ہے اور ایک بات، ہم اور کہنا چاہتے ہیں۔" وہ بولتے بولتے ٹھہر گئی۔

"کیوں؟ آپ رُک کیوں گئیں؟"

"ہم مناسب لفظ ڈھونڈ رہے تھے۔" وہ بے کلی سے بولی۔ "ہم چاہتے ہیں، وہی جو گیتی آپ سے کہہ چکی ہیں کہ ان حوالوں سے الگ بھی تو کچھ ہے۔ اِن سے الگ بھی آپ کی ذات ہے، ہماری ذات ہے۔ نہ جانے کیوں بار بار ہمیں اس صراحت کی خلش ستاتی ہے۔"

"آپ یہی کہنا چاہتی ہیں نا کہ اگر یہ سب اس طرح نہ پیش آتا تو بھی۔ ۔ ۔ تو بھی۔ ۔ ۔ لازم نہیں کہ لوگ ایک دوسرے کو ایسے حادثوں ہی کے سبب جانیں پہچانیں۔"

"ہاں ہاں، یہی کچھ۔"

"وہ بات جو آپ کے دل میں کھٹکتی ہے، میرے سینے میں بھی کبھی کبھی چبھتی ہے۔ کسی بدل یا اجر کا احساس آپ کے لیے شاید اتنا تکلیف دہ نہ ہو جتنا میرے لیے ہے مگر یقین کیجیے کہ میں کسی ایسے کرب سے دوچار نہیں ہوں۔ کوئی اچھا بُرا حادثہ آدمی کو آدمی کے قریب کرنے کا جواز ضرور بنتا ہے لیکن یہ محض بہانہ ہے۔ آدمی، آدمی کے تعلق تمام فیصلے ایک ہی مرحلے پر تو نہیں کر لیتا اور کبھی کر لیتا ہے تو اُس سے حادثے کے منفی اور مثبت پہلو کا آپس میں کوئی تعلق ضروری نہیں کیونکہ ایک ہی پیمانہ تو نہیں ہوتا۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔ "شاید میں وضاحت نہیں کر پا رہا ہوں۔"

"نہیں نہیں، ہم سمجھ رہے ہیں۔" وہ جھپکتی پلکوں سے بولی۔

"میری مراد ہے کہ کسی صراحت کی ضرورت نہیں۔ صراحت کے لیے کیا لفظ ہی ضروری ہیں۔ آپ میرے سامنے ہیں، میں آپ کے سامنے۔"

اُس کی آنکھوں میں یکایک آنسو منڈلانے لگے۔ "آپ نے ہماری مشکل حل کر دی۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہماری ایک گزارش ہے، جس طرح آپ کی ذات کے سوا ہمارے لیے آپ کا کوئی حوالہ مستند نہیں ہے، نہ ہمیں اسے جاننے کی جستجو ہے، اسی طرح ہماری بھی یہ التجا ہے کہ آپ ہمیں اس حویلی کی نسبت سے نہ جانیے۔ اب ہم اپنے لیے اس حویلی کا حوالہ معتبر نہیں سمجھتے۔ یہ ہمارے لیے کسی امتیاز کا سبب

ں ہے۔ پہلے ہمیں اس نسبت پر ضرور فخر تھا لیکن یہ تب کی بات ہے ب ہم آپ سے نہیں ملے تھے۔ آپ ہی نے ہمیں یہ عزم دیا ہے۔ اب اپنے اندر ایک عجب توانائی محسوس کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری ں تو ایک حیثیت ہے۔ یہ حویلی ہمارے قد سے بڑی نہیں ہے۔ ہمارے یہ داحساس سے سوا نہیں ہے۔ ہمیں اس کی عزت بہت عزیز ہے ں یہ ہماری قیمت پر نہیں، اُن اقدار کی قیمت پر نہیں جو ہم پر پہلی نکشف ہوئی ہیں۔" اُس کی آواز میں تمکنت کے ساتھ ساتھ تندی و ہی کی آمیزش بھی تھی۔ لوگوں نے غلط نہیں کہا ہے، اُس کے منہ ، پھول جھڑ رہے تھے، ایسا لگتا تھا جیسے پھُل جھڑیاں چھوٹ رہی ہوں ، کے گلابی چہرے میں سفید دانت جگ مگ جگ مگ کرتے ، میں حیران نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں ، تو وہ آزردگی سے بولی۔ "آپ چُپ کیوں ہو گئے؟ کیا سوچ رہے ، کیا ہم غلط کہہ رہے ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے ہڑبڑا کے کہا۔ "سوچ رہا ہوں کہ کیا کہوں۔ ن سی بات جواب طلب ہے۔ سب کچھ تو آپ نے خود کہہ دیا ہے۔ ر یوں ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے منہ کی بات چھین رہے ، بلکہ ہم تینوں۔ صبح چھوٹی بیگم صاحبہ بھی تو یہی کچھ کہہ رہی تھیں۔ شاید ۔رتِ حال کی نیرنگی اور نزاکت اِس تکرار کا سبب ہے تاہم میں پ ایک بات کہوں کہ جو حوالے عزّت و مرتبت کا سبب ہوں، اُن ، دست برداری کیوں کی جائے۔ یہ حویلی بے شک آپ سے بڑی نہیں ہے لیکن یہ کوئی کم تر حوالہ بھی نہیں ہے۔ اچھی نسبتوں کو یوں مسترد ں کیا جانا چاہیے۔ رہی اقدار کی بات، تو آپ کے بقول اُن کے انکشاف ے تو اب ایک اور بہتر تناسب قائم ہو سکتا ہے۔ کیا حویلی اِن اقدار ے منحرف ہے، اِن کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ کیا حویلی کے حوالے ے اِن اقدار کا خیال نہیں رکھا جا سکتا۔ آپ کوئی توانائی سی محسوس ی ہیں تو کیا حویلی کی نسبت سے اس میں کوئی فرق پڑنے کا امکان ہے۔ کوئی اچھا حوالہ ہو تو اُسے رَد کیوں کیا جائے۔" نہیں معلوم میں نے سب کس طرح کہہ دیا لیکن اچانک میری زبان بہکنے لگی اور میں نے متوحش ہے میں کہا۔ "کیں آپ کو میرے گداز کا تو خیال نہیں کہ میرا کوئی حوالہ چونکہ پ کے سامنے نہیں ہے اور جو ہے وہ نہایت اذیت ناک ہے؟"

"بخدا ایسا نہیں ہے۔" وہ بے ساختہ بولی۔ "اور اگر، اور اگر یہ ی ہے تو کیا مناسب نہیں ہے۔ ہم اس طرح آپ کے تئیں کچھ ماری کرنا چاہتے ہیں۔"

"یقیناً۔" میں نے خجالت سے کہا۔ "بس یوں ہی یکایک ایک خیال آگیا اور میں نے آپ سے کہہ دیا۔ میرا مقصد کچھ اور نہیں تھا۔ اُسے درگزر کر دیجیے۔ نہ جانے میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"آپ نسبتوں کے بارے میں کہہ رہے تھے۔" وہ اشتیاق سے بولی۔

"ہاں! میں کہہ رہا تھا کہ وقت، مقام، حادثے اور آدمی کا تناسب بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ایسی اکویشن، میری مراد ہے بصورت وجود میں آجاتی ہے جس سے کوئی نسبت الگ نہیں کی جا سکتی۔"

"لیکن اصل تو فرد ہوتا ہے، باقی سب کچھ ضمنی ہے۔"

"بے شک اصل تو فرد ہے، اس سے برتر کچھ نہیں۔"

"ہم حویلی سے اپنی نسبت ترک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم تو دوسری بات کہہ رہے ہیں کہ حویلی کو اپنی ناموس سے زیادہ اپنے مکینوں کے جذبوں کا احترام کرنا چاہیے۔"

وہ یہی کہہ رہی تھی کہ خادمہ نفیس کمرے میں نمودار ہوئی۔ اُس کی آمد سے پہلے چاہیں کمرے میں آچکی تھیں۔ نفیس اپنے ہاتھوں میں خوان پوش سے ڈھکا ہوا طشت اٹھائے ہوئے تھی۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے تردد سے پوچھا۔ "آپ کیا لے آئیں؟"

"ہم آپ کے لیے لونگ کی چائے کہہ کے آئے تھے۔ نزلے میں مفید ہوتی ہے۔" نفیس کے بجائے برجیس نے جواب دیا۔ "یہ ہماری امّی جان کا نسخہ ہے۔ زعفران کے علاوہ وہ اس میں جانے کیا کیا آمیزش کرتی ہیں کہ سکن ہو جاتی ہے اور نیند میں حارج نہیں ہوتی۔"

"آپ نے انھیں اس وقت زحمت دی تھی؟"

"نہیں، یہ تو خادماؤں نے اُن کے نسخے پر بنائی ہوگی۔"

"آپ انھیں امّی جان ہی کہتی ہیں۔"

"ہمیں یہی اچھا لگتا ہے۔" وہ لجائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "خود وہ بھی اسے پسند کرتی ہیں۔"

"میں بھی اپنی ماں کو امّی کہا کرتا تھا۔"

"کہا کرتے تھے؟" وہ چونک کے بولی۔ "کیا وہ، وہ خدانخواستہ ۔ ۔ ۔" وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

"ہاں وہ چلی گئیں۔ اب تو زمانہ ہو گیا۔"

"ارے! ہمیں یہ سُن کے دُکھ ہوا۔" وہ اداسی سے بولی۔ "کب اُن کا انتقال ہوا؟"

"کئی سال ہو گئے۔" میری آواز بھرّانے لگی۔ اُس نے پھر مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میری آنکھوں کے سامنے امّی جان کا چہرہ گھومنے لگا اور بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو اُن سے بہت محبت تھی۔" وہ نرم اور

شفیق آواز میں بولی۔

"نہیں" میں نے تُندی سے کہا "مجھے اُن کا کوئی خیال نہیں تھا۔"

"جی!" وہ پلکیں پٹ پٹانے لگی "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں" "مجھے اُن سے محبت ہوتی تو، تو میں۔ ۔ ۔"

میں نے اپنی آواز حلق میں گھونٹ لی۔ مجھے اُس سے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی تجسّس ظاہر کرتی، میں نے اُس سے کہا کہ کل صبح جب میں نیچے آؤں تو وہ مجھے اپنی امّی جان سے ضرور ملائے، میں اُن کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

"ضرور، ضرور" وہ شادمانی سے بولی "وہ آپ کو دیکھ کے بہت خوش ہوں گی۔ ہم بتا نہیں سکتے کہ خانم آپی کے آنے سے وہ کس قدر پُرسکون ہو گئی ہیں۔"

خادمہ نفیس چائے رکھ کے واپس چلی گئی تھی۔ پرجیس نے اپنے ہاتھ سے فنجانوں میں چائے انڈیلی اور اب کے مجھ سے شکر کے لیے نہیں پوچھا۔ وہ دُودھ کے بغیر نہایت خوش ذائقہ چائے تھی۔ میں نے ایک کے بجائے دو فنجان پیے "اور اب جوشاندے کا کیا ہوگا" میں نے مُسکراتے ہوئے اُسے ٹوکا۔

"ارے ہاں، ہم تو بھول ہی گئے" وہ پریشان سی ہو گئی اور معصومیت سے بولی "اب تو ٹھنڈا بھی ہو گیا ہوگا۔ ویسے سوتے وقت ہی پینا مناسب ہوتا ہے۔ بہتر ہے ہم دوسرا پیالہ بھیج دیتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے اس چائے والے نسخے پر اکتفا کرنا چاہیے۔"

"آزمودہ ہے، انشا اللہ اسی سے افاقہ ہو جائے گا لیکن بہتر ہے کہ اُسے بھی پی لیجیے۔"

"آپ رہنے دیجیے، رات کو بے آرامی رہی تو کسی کو بلا کے کہہ دُوں گا۔"

اُسے آئے ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ چلی جائے۔ اُس کے چہرے سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا مگر رات بہت ہو گئی تھی۔ چائے پیتے ہی وہ اُٹھ گئی "ہمیں اُمید ہے، صبح تک آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"میں تو ابھی سے بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔"

"ہم اور بیٹھتے لیکن اب ہمیں جانا چاہیے۔"

"مجھے بھی اس کا خیال ہے ورنہ میں آپ سے درخواست کرتا۔"

"ہم پھر آجائیں گے۔ ہو سکا تو کل ہی۔ ویسے کل صبح تو آپ آئیں گے ہی ہے؟"

"ہاں، ہاں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کل اس طرف نہ آئیں۔"

"ہم ضرور آئیں گے، کل اسی وقت، بلکہ کچھ پہلے۔"

"میں انتظار کروں گا۔"

"ہم بھی رات آنے کے منتظر رہیں گے۔" وہ سر جُھکا کے آہستگی سے بولی۔ لرزتے ہونٹوں سے اُس نے شب بخیر کہا۔ اُس کے رُخساروں پر شفق سی پھُوٹ رہی تھی۔ جاتے ہوئے اُس نے ایک اچٹتی نگاہ سے مجھے دیکھا اور معاً اندرونی دروازے میں چھُپ گئی۔

اُس کے جاتے ہی میں نے بستر پر اپنا جسم پھیلا دیا تھا۔ میں نے نہ کھڑکیوں کے پردے ہٹائے، نہ روشنی گل کی، نہ آمد و رفت کے عام دروازے کی چٹخنی گرائی اور نہ چپل اُتارے۔ میں یُوں ہی بے سُدھ سا بستر پر لیٹا رہا۔ آدمی کی اپنی بھی ایک خوشبُو ہوتی ہے۔ وہ کمرے میں اپنی خوشبُو چھوڑ گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرنی چاہیں لیکن نیند نہیں آئی۔ بار بار اُس کا چہرہ، اُس کا سراپا سامنے آجاتا تھا۔ شاید میں خود سونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ نیند سے وہ سب کچھ معدوم ہو جانے کا خدشہ تھا جو اُس کے جانے کے بعد بھی موجود تھا۔ اُس کی آوازیں، اُس کی آہٹیں اور اُس کی خوشبُو، بھینی بھینی، لطیف سی، عجیب سی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ خوشبُو چمپا کی تھی، نہ جوہی کی، نہ گلاب کی۔ وہ تو کچھ اور ہی تھی۔ وہ خوشبُو میری سانسوں میں لسی ہوئی تھی۔ جب تک وہ بیٹھی رہی، میرا جسم بندھا ہوا سا، کھنچا ہوا سا رہا۔ میری نگاہ اُس پر جمتی ہی نہیں تھی۔ ایک نظر اُسے دیکھتا اور آنکھیں خیرہ ہونے لگتیں۔ وہ سامنے نہیں تھی تو اب جیسے میں اُسے اطمینان سے دیکھ سکتا تھا۔ یہ اتفاق بھی خوب ہوا، میرا یہاں آنا اور نفیس سے یوں ہی نزلے کی شکایت کر دینا۔ اگر میں نہ آتا اور نفیس سے یہ نہ کہتا تو وہ کم از کم اس وقت کبھی اُوپر نہ آتی۔ یہی تو میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنے کمرے میں جانا چاہیے، شاید وہاں کوئی میرا منتظر ہو۔ اچھا ہی ہوا جو میں قوّالی چھوڑ کے اِدھر آگیا۔ قوّالی سے لاکھ درجے دل کش اُس کی بزم تھی۔ قوّال تو باقاعدہ کوشش کرتے ہیں۔ ساز اور آواز کے ساتھ ساتھ کلام بھی پُراثر ہونا ضروری ہے، تبھی بات بنتی ہے۔ اُس کی تو آواز ہی ساز ہے، سر بہ سَر نغمہ۔ اُس کے لہجے میں ترنّم کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ صنّاعِ فطرت نے اُس کے سلسلے میں ہر اعتبار سے فیّاضی برتی ہے۔ کرنیں سی اُس کے گلابی، شہابی رنگ سے پھوٹتی تھیں۔ پھول توڑتے وقت آدمی کے ہاتھ نرم پڑ جاتے ہیں۔ پھول کیا، کسی بھی نازک چیز کے سامنے آدمی میں احتیاط خود بہ خود آجاتی ہے کہ کہیں چھُونے سے میلی نہ ہو جائے، اُس پر شکن نہ آجائے، کہیں وہ ٹوٹ نہ جائے۔ میں بستر پر پڑا پڑا اُس کی اور اپنی ایک ایک بات دُہراتا

[۔۔۔]ا کہیں میں نے اُس سے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کہہ دی ہے جس [۔۔۔]ے اُس کی دل شکنی کا پہلو نکلتا ہو۔ اُس کے سامنے تو اُونچی آواز میں [۔۔۔]ت بھی نہیں کی جا سکتی۔ میں نے اپنے طور پر پوری احتیاط کی تھی تاہم [۔۔۔]ب مجھے بہت سی باتوں کا خیال آرہا تھا۔ میں اُس سے اور نرم اور ٹُھک لہجے [۔۔۔]ں بات کر سکتا تھا۔

کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ اندرونی دروازے کے اُس طرف [۔۔۔]زموں کے گوشے میں خادمہ نفیس ضرور موجود ہوگی۔ میں اُسے بلا سکتا تھا۔ [۔۔۔]ں مرتبہ اُس کے سامنے زبان کھولتے ہوئے شاید مجھے اتنی دشواری نہ [۔۔۔]ہو۔ میرے جی میں ایک بار آئی تھی لیکن میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ اس [۔۔۔]نّاٹے میں بہت سکون چھُپا ہوا تھا۔ گھڑی نے دو بجائے، پھر ڈھائی [۔۔۔]گھنٹا بجا اور پھر تین کا۔ میں مسہری سے اُٹھ کے کھڑکی پر آگیا۔ کھڑکی کے [۔۔۔]ردے اور پٹ کھولنے پر ٹھنڈی ہوا در آئی، باہر تا حدِّ نظر فرش، دیواریں [۔۔۔]ور جھروکے چاندنی میں نہا رہے تھے اور جھینگروں، مینڈکوں کی صداؤں [۔۔۔]سے فضا گُونج رہی تھی۔ کتنا عجیب ہے کہ یہ صدائیں رات کی خاموشی اور بڑھا دیتی ہیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں باہر نکل پڑتا۔ میرے باہر نکلنے [۔۔۔]سے جگہ جگہ تعینات حویلی کے خادم خواہ مخواہ پریشان ہوتے، سو میں [۔۔۔]یں کھڑکی سے لگا کھڑا انگڑائیاں لیتا، ہاتھ پیر کھولتا اور تازہ تازہ ہوا سینے [۔۔۔]یں بھرتا رہا۔ میرا بند بند جیسے کھل رہا تھا۔ پھر کھڑکی سے ہٹ کے [۔۔۔]یں نے دو ایک روشنیاں گل کر دیں، لیکن کمرے کی مدّھم روشنی سے [۔۔۔]مجھے اُلجھن ہونے لگی تو میں نے سارے قمقمے دوبارہ روشن کر دیے اور [۔۔۔]کتابوں کے ورق پلٹنے لگا۔ کسی کتاب کا ایک پیرا بھی دھیان سے [۔۔۔]نہ پڑھ سکا۔ بمبئی میں کرشنا جی کے گھر بھی ریڈیو موجود تھا۔ میں نے اُس کا بٹن گھما پھرا کے دیکھا تو ہر جگہ سے انگریزی اور غیر مُلکی پروگرام [۔۔۔]آرہے تھے۔ گڑگڑاہٹ بھی بہت تھی۔ میں نے ریڈیو بھی بند کر دیا۔ سکوت ہی زیادہ بھلا تھا۔ نیند اور بیداری کے درمیان جو کیفیت ہوتی ہے، جس میں آدمی سوتا بھی ہے، جاگتا بھی ہے۔ نہ جاگتا ہے اور نہ سوتا ہے۔ [۔۔۔]یری بھی کچھ یہی حالت تھی۔ دل و دماغ پر غنودگی سی چھائی ہوئی تھی [۔۔۔]مجھے اپنے ہوش و حواس کا بھی پورا یقین تھا۔ دن میں، میں نے کئی پان کھائے تھے۔ دانت مانجھ کے میں نے پھر آنکھیں موندنے کی کوشش کی اور پھر ابھی چار نہیں بج پائے تھے کیونکہ میں نے چار بجنے کی آواز نہیں سُنی تھی، جانے کس وقت مجھے نیند آگئی۔

کمرے میں قمقموں کی تیز روشنی میں صبح کی روشنی بھی شامل ہو گئی [۔۔۔]تھی۔ میں نے ہڑبڑا کے آنکھیں کھول دیں۔ کانتے بُری طرح مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اُس کے چہرے اور آواز پر دحشت چھائی ہوئی تھی "لاڈلے! لاڈلے! اُٹھ جا، جلدی سے اُٹھ جا۔"

میں نے تُرش نگاہوں سے اُسے دیکھا "کچھ دیر اور سونے دو کانتے بھائی! رات کو بہت دیر سے آنکھ لگی تھی۔" میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"پر جانی! اِس ٹائم اُٹھ جانا ہی ٹھیک ہے۔"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

"بس جلدی سے منہ ہاتھ دھولے۔"

اُس کی آواز مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہو رہی تھی "بتاؤ نا، کیا بات ہے؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"پہلے منہ ہاتھ دھولے، پھر نیچے کو چلنا ہے۔"

"نیچے کیا ہے؟ بتاتے کیوں نہیں؟"

"ضد مت کر لاڈلے! جو بولتا ہوں، پہلے وہ کر" کانتے نے تلخی سے کہا "ہر بات پر تو ایسا کیوں کرنے لگتا ہے؟"

"جب تک تم بتاؤ گے نہیں، مجھ سے کچھ نہیں ہوگا۔"

"تجھ کو بولنے ہی آیا ہوں۔"

میں نے جھپٹ کے اُس کے شانے پکڑ لیے۔ کانتے کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور وہ مجھ سے نظریں چُرا رہا تھا "کانتے بھائی!" میں نے لرزتی آواز میں اُس سے پوچھنا چاہا۔

"کیا بولوں لاڈلے!" وہ بھینچے ہوئے ہونٹوں سے بولا "چھوٹا نواب چلا گیا۔"

"کیا؟ ۔ ۔ ۔"

"ہاں لاڈلے! وہ چلا گیا۔"

"کانتے نے جیسے میرے سینے میں خنجر اُتار دیا ہو۔ میں پھٹی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔

"ابھی نیچے اندر سے خبر آئی ہے" کانتے جیسے بہت دُور سے بول رہا تھا مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ کانتے میرے گلے سے لپٹ کے ہڑکنے لگا "اپنے کو پتہ تھا لاڈلے، سُن کر تیرا بھی یہی حال ہوگا۔"

"نہیں نہیں کانتے بھائی! یہ غلط ہے۔"

"تیرا بھائی بھی یہی جان رہا تھا، پر اُوپر نیچے ساری حویلی میں کہرام پڑا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ہو گیا لاڈلے! ہو گیا" کانتے رو رہا تھا "چل، اُٹھ کھڑا ہو۔ نیچے بڑا نواب بیٹھا ہے۔"

میں فوراً بستر سے اُٹھ گیا لیکن مجھ سے اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہوا جاسکا۔ میرا سارا جسم پتھر ہو گیا تھا۔ کانتے نے مجھے سنبھال لیا مجھے بستر پر بٹھا کے لوٹا، پانی، تولیا اور سلفچی لے آیا، میرے ہاتھ کام نہیں کر رہے تھے۔ کانتے بھیگی تولیا سے میرا مُنہ خشک کرنے لگا۔ میں اُسے ایک طرف ہٹا کے اندرونی دروازے کی جانب بھاگا۔ کانتے نے مجھے دروازے کے پاس پکڑ لیا۔ "کدھر کو جا رہا ہے؟"

"تم ٹھہرو کانتے بھائی! میں ابھی آتا ہوں۔ میں نیچے زنان خانے میں جا رہا ہوں۔" میں نے دروازہ عبور کر لیا اور نیچے آخری سیڑھیوں تک چلا گیا لیکن میرے قدم وہیں جم کے رہ گئے۔ لمحوں تک میں زینے میں بیٹھا ہانپتا رہا۔ اندر سے بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ مجھے وہاں کوئی دیکھ لیتا، میں کمرے میں واپس آ گیا۔ کانتے دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اُس کے کہنے پر میں نے مُنہ پر پانی کے دو چھپکے مار لیے تھے اور بالوں میں کنگھی بھی کر لی تھی۔ باہر صحن اور دالان ویران پڑے تھے۔ کانتے کا ہاتھ پکڑے پکڑے میں نے سیڑھیاں طے کیں۔ نیچے چند قدم کے فاصلے پر نشست گاہ کے باہر بنے ہوئے چبوترے پر وہ سب موجود تھے۔ سب سے پہلے میری نگاہ بڑے نواب ہی پر پڑی تھی۔ منیر علی، ابا جان، بتھل اور پیرو اُس کے اِرد گرد دم بخود بیٹھے تھے۔ بڑا نواب سر جھکائے جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ ہماری آہٹ پر اُس نے ایک بار سر اُٹھا کے مجھے دیکھا۔ میرا جسم لرز کے رہ گیا۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُس کی آنکھیں بھاری بھاری تھیں اور اُن میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ شیروانی کے سارے بٹن بند تھے اور مانگ بھی سلیقے سے کڑھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے کانتے نے مجھ سے بہت بڑا مذاق کیا ہو، جیسے سبھی مجھے دھوکا دے رہے ہوں اور جیسے سب نے جان بُوجھ کے مجھے ستانے کے لیے یہ خاموشی اختیار کی ہو۔ یا جیسے یہ سب میرے دماغ کا خلل ہو۔ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔ بڑے نواب کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن اُس کا سارا وجود ریت کا ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں نے بتھل کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بُت کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ چبوترے کے باہر حویلی کے خادم اِدھر اُدھر لپک رہے تھے۔ کانتے مجھے یہاں کیوں لے آیا تھا۔ مجھ سے ایک پل کے لیے بھی نہیں ٹھہرا جا رہا تھا۔ بار بار میری نگاہ بڑے نواب کی طرف اُٹھتی تھی۔ اُس کے جسم میں کوئی جنبش نہیں تھی۔ پلکیں بھی بے حرکت تھیں۔ میں وہاں سے اُٹھ جاتا مگر اتنے میں چبوترے کے سامنے ایک موٹر آ کے رُکی اور نواب حشمت جنگ تیزی سے باہر نکلا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا چبوترے پر چڑھا، بڑے نواب نے چونک کے اُس کی طرف دیکھا اور کُرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ہم سب کھڑے ہو گئے تھے۔ نواب حشمت جنگ پر دیوانگی طاری تھی۔ ہماری جانب اضطراری نظروں سے دیکھتا ہوا بڑے نواب سے لپٹ گیا اور چیخیں مارنے لگا۔ "یہ کیا ہو گیا جانی میاں! یہ کیا ہو گیا؟" بڑے نواب کے نتھنے پھُولے ہوئے تھے اور ہونٹ کپکپا رہے تھے لیکن اُس کی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوا۔ نواب حشمت جنگ اُس کے شانوں سے سر رگڑنے اور سینے پر سر مارنے لگا۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کے میری سسکیاں نکل پڑیں۔ کانتے بھی رونے لگا۔ زورا نے کمر سے میرا کُرتا پکڑ لیا تھا مگر وہ خود سسک رہا تھا۔ ابا جان نے نواب حشمت جنگ کو بڑے نواب سے الگ کیا تو وہ اُن کے سینے سے لپٹ گیا۔ ابا جان اُسے تھپکیاں دیتے اور بُدبُداتے ہوئے جانے کیا کیا تلقین کرتے رہے۔ منیر علی نے بھی اُسے کُرسی پر بٹھانا چاہا لیکن وہ اُن سے اپنا بازو چھڑا کے دفعتہً اندر نشست گاہ کی طرف بھاگ پڑا۔ بڑا نواب وہیں بیٹھا رہا۔ ابھی حشمت جنگ کو آئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک دوسری موٹر آ کے رُکی، پھر تیسری، چوتھی۔ بتھل پیرو اور منیر علی بڑے نواب کے پاس سے ہٹ گئے۔ دیکھتے دیکھتے آنے والوں سے چبوترا ابھر گیا تھا۔

وہاں سے اُٹھنا اب کوئی مشکل نہیں تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ میں چبوترے سے اُتر آیا۔ میں اُتر تو آیا تھا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، کہاں جاؤں، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ بڑے دروازے سے لوگ مسلسل چبوترے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں حویلی کے عقب میں ایک طرف نکل گیا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد میری سانس پھولنے لگی۔ میں قریبی پتھر کی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ یہ باغ کا ایک حصہ تھا اور یہاں بہت سناٹا تھا۔ مجھے کسی ایسی ہی جگہ کی ضرورت تھی جہاں ذرا دیر ٹھہر کے خود کو یکسُو کر سکوں اور سمجھ سکوں کہ یہ سب کیا ہے لیکن اچانک میرے جسم میں کوئی جھٹکا سا لگتا تھا اور میرا سر دھمکنے لگتا تھا۔ مجھے یہاں آئے چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ یک لخت میں بینچ سے اُٹھ گیا اور میں نے چبوترے کی جانب واپس جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں لوگ اکٹھے ہو رہے ہوں گے اور میں یہاں آ گیا ہوں۔ کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو کیا ہو گا اور اس طرف کوئی مجھے ڈھونڈ نہ رہا ہو۔ میں نے صرف ایک دو قدم طے کیے تھے کہ مجھے چکر سا آنے لگا اور میں دوبارہ بینچ پر ڈھیر ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں زمین میں دھنستا جا رہا ہوں، اندھیرے میں ڈوب رہا ہوں۔ جیسے سب کچھ ختم ہونے کو ہے۔ یہ باغ، یہ پھُول، یہ پتّے، سب آن کی آن میں ختم ہو جائیں گے میری آنکھیں جیسے میری آنکھیں نہیں رہی تھیں۔ مجھے سب کچھ اجنبی اور مصنوعی لگ رہا تھا۔ پھولوں کے رنگ، پرندوں کی آوازیں، اپنا وجود۔ یہ سب ایک فریبِ نظر ہے۔ سب اکارت۔ ابھی کوئی آندھی چلے گی یا آگ بھڑکے گی اور سارا کچھ اپنی اصل شکل میں آ جائے گا۔

کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مجھے یہاں آئے کتنا وقت گزر چکا ہے۔ کانتے اور زورا نہ آجاتے تو شاید میرا جسم وہیں بیٹھے بیٹھے اکڑ جاتا۔ کانتے نے آتے ہی مجھے دبوچ لیا تھا۔ "کدھر چھُپا بیٹھا ہے تو؟" وہ برہمی سے بولا۔ "سارے میں چھان مارا۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھ میں جواب دینے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ زورا نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور اپنے سینے سے لگا کے بولا۔ "قسم سے راجا! اپن نے اس کو ایک دم نہیں دیکھا تھا۔ پر ابھی اپن کو ایسا لگتا ہے کہ اپنا کوئی بھائی چلا گیا، اپنا ماں باپ مر گیا ہے۔" زورا رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"اُدھر لوگ باگ بہت آ گئے ہیں لاڈلے!" کانتے نے ترش لہجے میں مجھے ٹوکا۔

"ہاں راجا! اور اُدھر استاد نے بولا ہے کہ ابھی ترت اس کو ادھر لے کے آؤ۔ اُس کو ادھر ہی ہونا چاہیے۔ ابھی کچھ دیر میں میّت اُٹھنے والا ہے۔"

میں نے متلاتی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ کانتے نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کے ایک جھٹکے سے مجھے کھڑا کر دیا۔ اُن دونوں نے دونوں جانب سے میرے ہاتھ جکڑ رکھے تھے لیکن میں اپنے ہی پیروں سے واپس آیا۔ ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور چبوترے کے پاس ایک اژدہام نظر آ رہا تھا۔ اُس طرف جانے کے بجائے کانتے اور زورا پہلے ہی ایک سیڑھی پر چڑھ گئے اور راہداری سے ایک کمرے میں آ گئے۔ بتھل اور پیرو کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ دونوں آرام کُرسیوں پر ایک دوسرے کے قریب خاموش بیٹھے تھے۔ میرے داخل ہوتے ہی بتھل نے بوجھل آواز میں مجھ سے پوچھا۔ "کدھر چلا گیا تھا رے؟"

"یہیں، میں یہیں تھا۔" میں نے منمناتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جا، برات اُٹھنے ہی والی ہے۔"

میرے سینے میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ میں نے بیتابانہ اُس کی طرف دیکھا۔ بتھل کی آنکھوں میں خُون بھرا ہوا تھا۔

"ادر جانی! اندر جا کے کپڑے ذرا بدل لے۔" پیرو نے تھکے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔ وہ سبھی اُجلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

"یہی ٹھیک ہیں دادا!" میں نے آہستگی سے کہا۔

"بدل لے رے۔" بتھل تنک کر بولا۔ "بابا نے اُدھر حویلی سے خاص کر منگوائے ہیں۔"

"دادا! ابھی تمی اس کو بولو۔" زورا نے مچلتی آواز میں بتھل سے کہا۔ "ابھی کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

بتھل ہنکاری بھر کے رہ گیا۔

"اپن کو یاد ہے۔" پیرو کہنے لگا۔ "اپن کا جامنی بائی کبھی ایک گانا سناتا تھا جس کا بول تھا کہ مرنے کا ایک دن لکھا ہے۔ اُس کا مطلب تھا کہ آدمی اپنا وقت لے کر آتا ہے۔"

"کدھر کو دادا؟" کانتے کے ہونٹوں پر پھیکی مُسکراہٹ عود کر آئی۔ "ہر دن سالا موت کا دن ہے۔ کوئی بھی طے نہیں لگتا دادا! بس آگے کو ٹلتا، کھسکتا رہتا ہے۔ لکھا ہوا کسی کو سُوجھتا نہیں تو سب برابر ہے۔"

پیرو سر ہلانے لگا۔ زورا نے میرے کپڑے لا کے سامنے رکھ دیے تھے اور کہنے لگا کہ میں یہ عجلت پہن لوں کیونکہ کسی وقت بھی جنازہ اُٹھنے کی اطلاع آسکتی ہے۔ میں نے ضد نہیں کی۔ وہیں کمرے سے ملحق غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ زورا میرا ہاتھ تھام کے مجھے وہاں لے آیا جیسے میں کوئی بچہ ہوں، جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں۔ میں نے اندر جا کے لباس تبدیل کر لیا۔ وہ میرے ہی کپڑے تھے۔ کُرتا، پاجامہ اور واسکٹ۔ میرے باہر نکلتے ہی وہ چاروں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ بتھل نے دروازہ عبور کرتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ "سنبھل کے رے۔" وہ جھنجھلاتے لہجے میں مجھ سے کہنے لگا۔

چبوترا دُور نہیں تھا۔ وہاں بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے، سرگوشیوں، دھیمی دھیمی آوازوں اور سسکیوں کا ملا جُلا شور گونج رہا تھا۔ بیچ میں جنازہ رکھا تھا۔ سب اُس کے اطراف گھومتے ہوئے چھوٹے نواب کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ کانتے نے مجھے بھی اس حلقے کی طرف دھکیلنا چاہا لیکن مجھ سے آگے نہ جایا جا سکا۔ مجھے چھوڑ کے وہ سب ہجوم میں شامل ہو گئے تھے۔ میں ایک ستون سے کمر ٹکائے وہیں پیچھے کھڑا رہا۔ اس دوران خاں صاحب میرے سامنے سے گزرے۔ اُن پر گریہ طاری تھا۔ کئی آدمی اُنھیں کھینچتے گھسیٹتے ہوئے ایک جانب لے گئے۔ جنازہ جس وقت اُٹھا، ایسا لگا جیسے ساری حویلی بین کر رہی ہو، در و دیوار بلک رہے ہوں۔ حویلی کے کتنے خادم خود کو نوچ کھسوٹ رہے تھے، پھُوٹ پھوٹ کے رو رہے تھے۔ میں کسی تماشائی کی طرح نظارہ کرتا رہا۔ جب وہ آگے بڑھے تو میں بھی اُن کے ساتھ چلنے لگا۔ بڑے دروازے تک جانے والے راستے پر آدمی ہی آدمی نظر آ رہے تھے۔ بڑا دروازہ پورا کھُلا ہوا تھا۔ وہاں سے گزر کے وہ حویلی کی فصیلوں کے باہر میدان میں آئے پھر سڑک پر آ گئے۔ آگے کسی جگہ کانتے اور زورا نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ "تو نے دیکھا

لاڈلے" کانتے سنلتے لہجے میں بولا۔ لگتا تھا، کوئی سپنا دیکھ رہا ہے، کوئی بہت اچھا سپنا۔ سپنا دیکھتے دیکھتے جیسے کسی بات پر کھل اُٹھا ہو۔ کیوں زورا؟"

"ہاں راجا! اپن نے بہت لوگوں کو کندھا دیا ہے پر ایسا کبھی نہیں دیکھا۔ مُنہ پھول کے مافک کھلا ہوا تھا۔"

"پر وہ مَرا ہوا ہی تھا نا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں لاڈلے!" کانتے مرجھائے لہجے میں بولا۔ "پر اپن کو یقین ہے، وہ بہت آرام سے گیا ہے۔ اُس کو اِدھر دیکھے ہوئے اپنے کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ جب میں اِدھر اُستاد کے ساتھ آیا تھا اور بڑا نواب ہم کو اُسے دِکھانے لے گیا تھا۔ لاڈلے! اُس وقت وہ مرا ہوا لگتا تھا، اب تو وہ زندہ معلوم ہوتا تھا۔ اُدھر جو دیکھتا تھا یہی بولتا تھا۔ اُس کا تو رنگ ہی ایک دم بدلا ہوا تھا۔ مُندی ہوئی انکھیاں، جیسے آدمی جاگ رہا ہو اور جاگتے میں کچھ سوچ رہا ہو، کوئی بہت اچھی بات سوچ رہا ہو۔ ابھی قبر کے پاس شاید دوبارہ منہ دکھائیں تو خود دیکھ لینا۔"

قبرستان حویلی سے میل بھر کے فاصلے پر تھا۔ وسیع وعریض احاطے کے اندر صرف چند قبریں بنی ہوئی تھیں اور باغ کا سا منظر تھا۔ ایک طرف بنی ہوئی چھوٹی سی لال مسجد کے صحن میں پہلے سے کلامِ پاک کی تلاوت ہو رہی تھی۔ احاطے میں آ کے سب بکھر گئے تھے۔ طرح طرح کے لوگ وہاں موجود تھے۔ کہتے ہیں اتنا بڑا مجمع کسی خوش بخت، کسی جنتی کی موت پر ہوتا ہے۔ دھوتی اور بند گلے کے کوٹ میں ملبوس سو ڈیڑھ سو آدمیوں کے سوا تقریباً سبھی شیروانیوں اور ترکی ٹوپی میں ملبوس تھے۔ ابا جان اور منیر علی بھی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ صرف ہمی چند سب سے مختلف نظر آ رہے ہوں گے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگوں کی نظریں بار بار ہماری جانب اُٹھتی تھیں۔ نواب عالم تاب کا گہوارہ مسجد کے صحن میں رکھ دیا گیا۔ بہت سے لوگ راستے بھر سسکتے رہے تھے، یہاں بھی اُن کا یہی حال تھا۔ میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اس لیے میں مسجد سے کچھ دُور ایک اونچی جگہ بیٹھ گیا تھا۔ کانتے کسی طرف نکل گیا تھا مگر تھوڑی ہی دیر میں لپکتا ہوا میرے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہنے لگا۔ "لاڈلے! وہ پولیس افسر اِدھر بھی موجود ہے۔"

"کون پولیس افسر؟" میں نے اُچھل کے پوچھا۔

"وہی جو اڈّے پر اُستاد کے پاس آیا تھا۔" کانتے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہی اکڑی باز۔ اپنے آپ کو بڑا شکاری بولتا تھا، بولتا تھا کہ اُس رستم کے جینے کو ریاست میں خاص کر کے بلایا گیا ہے۔ وہی جو اُستاد سے اُلٹی سیدھی ہانک رہا تھا اور اُستاد نے اُس کو آگا پیچھا دیکھ کے ہاتھ ڈالنے کو بولا تھا۔ میں نے تجھ کو سارا بتایا تھا نا؟"

"ہاں، ہاں" میں نے تذبذب سے سر ہلایا۔

"وہ اِدھر بھی ہے، وردی میں نہیں ہے۔ پتہ نہیں، اُس نے اُستاد کو ابھی دیکھا ہے کہ نہیں۔ میں تو اُدھر سے کنی کاٹ کے آ گیا ہوں" کانتے مضطرب آواز میں بولا۔

"تو کیا ہوا؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کھوپڑی کا سیدھا نہیں ہے لاڈلے!" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

"یہاں تو ایسے اور بھی لوگ ہوں گے۔ اڈّے اور بازار کا کوئی آدمی یہاں نہیں ہو سکتا کیا؟ اور پولیس کا کوئی اور شخص؟ اتنے دن ان پر تم پردے میں تو نہیں بیٹھے رہے تھے۔"

"پر اس کی بات دوسری ہے!" کانتے جز بز ہو کے بولا۔

"کیا کر لے گا؟"

"خار لے کے گیا تھا لاڈلے! اُستاد کو اِدھر دیکھ کے بدک سکتا ہے۔ مجھ پر تو اُس نے ایسا دھیان نہیں دیا تھا پر اُستاد کا نقشہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ اچھی تو تکرار ہوئی تھی۔ کم کٹ کھنا نہیں ہے۔ متھے میں کوئی بھی بات اٹک گئی تو ......"

"تو کیا ہو جائے گا؟" میں نے ترشی سے کہا۔

"خواہ مخواہ کا اڑنگا لگا سکتا ہے۔"

"اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہو سکتا کانتے بھائی!" میں نے چھوٹے نواب کی میت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں لاڈلے!" اُس کی آواز بجھ گئی۔

"یہ بات تو یہاں آنے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی!"

"میرے جی میں آیا تھا کہ اُستاد کو منع کر دوں۔"

"یہ کیسے ممکن تھا، گھر میں ٹھہرے ہوئے مہمان، گھر کے آدمی کے مرنے پر چھپے بیٹھے آرام کرتے رہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ کانتے کے پاس کوئی جواب نہیں ہو گا۔ وہ چپ ہو گیا لیکن مطمئن نہیں تھا۔ میرے پاس سے اُٹھ کے چلا گیا۔ صرف ایک پولیس افسر کا کیا ذکر، کانتے نے بے وردی لوگوں کے متعلق غور نہیں کیا جن کی صبح سے حویلی میں قطار بندھی ہوئی تھی۔ ابا جان اور منیر علی تو مستقلاً بڑے نواب کے اِرد گرد موجود رہے تھے اور اُنھیں رہنا بھی چاہیے تھا لیکن تعزیت داروں کے لیے بڑے نواب کے قریب اِن اجنبیوں کی موجودگی تجسّس کا باعث نہ رہی ہو گی کیا۔ نواب حشمت جنگ کے علاوہ بڑے نواب کے کتنے اعزا اور قرابت دار وہاں آئے ہوں گے اور یہاں موجود ہوں گے۔ ہمارے بارے میں اُن کے اشارے پر بڑے نواب نے نہیں حویلی کے خادموں نے تو کچھ نہ کچھ ضرور بتایا ہو گا کہ یہی سبز قدم دو دن پہلے حویلی میں وارد ہوئے تھے۔ آدمی کی زبان سب سے بے قابو چیز ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں کسی کو کتنا احساس ہو سکتا ہے کہ کون سی بات مناسب ہے، کون سی نہیں۔ ابا جان، منیر علی، بجھل اور پیرو بھی کیا یہ سب کچھ نہیں جان رہے ہوں گے۔

کانتے کو یہ اندیشے ڈسنے لگے تھے۔ سامنے مسجد کے صحن میں ایک کنارے چھوٹے نواب کی میت رکھی ہوئی تھی۔ کانتے نہیں جانتا تھا کہ جو نظر آتا ہے، وہی ایک مرنے والا نہیں ہوتا۔ مرنے والے کو ایک بار مر کے چین پڑ جاتا ہے لیکن اُس کے رونے والے بار بار مرتے ہیں اور اُنھیں کبھی چین نہیں ملتا۔ کانتے نے اتنا کہاں دیکھا اور سُنا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ ایک آدمی کے چلے جانے سے کبھی کتنا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ میں اُس سے کیا کہتا کہ ذرا ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں سے دیکھنے، میرے کانوں سے سُننے کی کوشش کرے۔ کیسی کیسی صدائیں، کیسے کیسے چہرے اُس کا سینہ جلاتے ہیں۔ اُن سوالی چہروں کے سامنے یہ پولیس افسر کیا حیثیت رکھتا ہے۔

ظہر کی نماز کے فوراً بعد لوگ جنازے کی نماز کے لیے صفیں باندھنے لگے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ صبح مجھے غُسل کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی لیکن اور بھی بے شمار لوگ مسجد سے دُور الگ کھڑے تھے۔ ان میں غیر مسلم بھی ہوں گے اور وہ بھی جو میری طرح نماز میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ نماز ختم ہوتے ہی چھوٹے نواب کی سواری صحن سے اُٹھا کے سنگِ مرمر کے سائبان میں رکھ دی گئی تھی۔ ایک ہی موقع تو آتا ہے۔ نہ گھوڑا، نہ ہاتھی، جب اتنے بہت سے آدمی کسی کی سواری اُٹھاتے ہیں۔ شاید دوبارہ رونمائی ہو رہی تھی جو سائبان کے اطراف ہجوم جمع ہو گیا تھا اور قبرستان کی فضا سسکیوں اور چیخوں سے گونجنے لگی تھی۔ ہر جانب سے لوگ سمٹ سمٹ کر اُس طرف بڑھ رہے تھے۔ مجھے بھی اُٹھنا چاہیے تھا ورنہ میں اکیلا سب کی نظروں میں آ جاتا۔ میرے دل میں بھی اُس کا چہرہ دیکھنے کی ہمک اُٹھی تھی مگر وہاں بہت بھیڑ تھی۔ میں سائبان کے قریب ایک درخت کے نیچے کھڑا لوگوں کے ہٹ جانے کا انتظار کر رہا تھا کہ منیر علی نے مجھے دیکھ لیا۔ "بابر میاں!" وہ گلوگیر آواز میں بولے۔ "دیکھا تم نے! بس یہی آدمی کا مآل ہے۔ ہر شخص کی زندگی اُس پر قرض ہے جو ایک دن اُسے چکانا لازم ہے۔" میں خاموشی سے سُنتا رہا، مجھ سے پوچھنے لگے "چہرہ دیکھا؟" میں نے انکار میں سر ہلایا تو بولے "دیکھو، کیسا نور برس رہا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ اس عاجز نے کبھی ایسا شگفتہ اور پُرسکون چہرہ نہیں دیکھا۔"

میری کمر تھپکتے ہوئے اُنھوں نے مجھے آگے کر دیا۔ میں لوگوں سے ٹکراتا ہوا جنازے کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن یک بارگی مجھے بڑے نواب کا چہرہ نظر آ گیا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے بڑا نواب جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لے گا اور بھرے مجمع میں مجھے طمانچے مارنے لگے گا۔ اُس کی آنکھوں میں آگ بھڑک رہی تھی۔ میرا دل بُری طرح ہولنے لگا تھا۔ پیچھے آ کے ہی مجھے کچھ سکون ملا۔ پھر میں نے دوبارہ اُس طرف رُخ نہیں کیا۔ منیر علی بھی کہیں گم ہو گئے تھے۔ میں اور پیچھے چلا آیا۔

نیچے حویلی میں کچھ دیر ٹھہر کے منیر علی اور ابا جان کے سوا ہم چاروں بالائی منزل پر چلے آئے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے بڑے ہال میں انتظام کیا گیا تھا۔ بہت سے لوگ اس میں شریک تھے۔ نہایت سادہ کھانا تھا۔ کئی قطاروں میں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ موت کا کھانا مجھ سے ویسے بھی نہیں کھایا جاتا۔ ایک لقمہ بھی میرے حلق سے نہیں اُترا۔ میں نے منیر علی کو منع کیا تھا لیکن اُنھوں نے اصرار کیا کہ شریک ہونا ہی مناسب ہے چنانچہ میں بھی ایک قطار کے آخری سرے پر بیٹھ گیا تھا بلکہ ہم سبھی کسی سے بھی کچھ نہیں کھایا گیا۔ سب دکھاوا کرتے رہے تھے اور اُوپر اپنے اپنے کمروں میں جانے کے بجائے بتھل کے کمرے میں آ گئے تھے۔ کمرے میں گنجائش ہی گنجائش تھی۔ پیرو کا کمرہ بھی بازو ہی میں تھا۔ اندر سے ایک دروازہ دونوں کمرے ملا دیتا تھا لیکن پیرو بتھل کے ساتھ ہی بستر پر لیٹ گیا۔ ہم تینوں صوفوں اور آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ ہمیں آئے دس پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ ایک خادم نے آ کے بتھل کے سامنے تازہ حقہ رکھ دیا اور چائے کے لیے پوچھا۔ بتھل نے انکار کر دیا۔ خادم کے آنے پر کانتے اور زورا کو بہت حیرت ہوئی، وہ مستقل اُس کی شکل دیکھتے رہے تاہم اُنھوں نے ایک دوسرے سے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ کمرے میں سانسوں اور کروٹوں کی آہٹیں، گھڑی کی ٹک ٹک اور گاہے گاہے بتھل کے حقّے کی گڑگڑاہٹ گونجتی رہی۔ زورا نے کانتے سے قبرستان میں آنے والے اُن دو آدمیوں کے بارے میں تجسس ظاہر کیا تھا جو مسلح سپاہیوں کی نگرانی میں عین دفن کے وقت پہنچے تھے اور جن کی آمد پر باہر سے سیٹیوں کی گونج سنائی دی تھی۔ اُنھوں نے چھوٹے نواب کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی تھی اور اُن کے ساتھ آنے والے سپاہیوں نے سیلوٹ کیا تھا۔ کانتے مُنہ بنا کے رہ گیا تو زورا بھی چُپ ہو گیا۔ سب جیسے گونگے ہو گئے تھے۔ کسی کی بھی آنکھ ایک پل کے لیے نہیں لگی تھی۔ شام ہو جانے کا اندازہ بھی ایک خادم کی مداخلت پر ہوا۔ اس مرتبہ ہم سے پوچھنے کے بجائے وہ چائے لانے کی اطلاع دینے آیا تھا۔ بتھل نے بھی پھر اُسے نہیں روکا۔ چائے کے ساتھ دیگر لوازم بھی تھے لیکن مُنہ ہاتھ دھو کے اور ایک ایک پیالی انڈیل کے ہم نیچے اُتر آئے۔

چبوترے کے باہر اب بھی موٹروں کی قطار لگی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بڑا نواب نشست گاہ میں موجود ہے۔ ابا جان اور منیر علی بھی وہیں ہیں۔ یہ سُنتے ہی میرے پاؤں اٹکنے لگے۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں اُن سے کچھ پیچھے ہو جاؤں۔ نشست گاہ میں جاتے وقت کسی کو خیال نہیں رہا کہ میں اُن کے ساتھ نہیں ہوں۔ دروازے تک جا کے میں آہستہ قدموں سے لوٹ آیا اور کوئی مجھے بلانے بھی نہیں آیا۔ کچھ ہی دُور جا کے مجھے احساس ہونے لگا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ اُن سے الگ ہو کے میں اپنے آپ کو بہت اکیلا اور غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ میری کوئی حس کہہ رہی تھی کہ میرے گرد نشانے تنے ہوئے ہیں۔ راستے میں کئی خادم مجھ سے ٹکرائے۔ مجھے دیکھ کے گو اُنھوں نے نظریں نیچی کر لی تھیں اور سلام کرتے ہوئے گزر گئے تھے لیکن ہر قدم پر مجھے شبہ ہوتا تھا کہ وہ کسی جگہ بھی میرا راستہ روک سکتے ہیں۔ کچھ ہی آگے آ کے کوئی سمت طے کرنے کے لیے میں رُک گیا اور دیر تک ٹھٹکا کھڑا رہا۔ مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں میں خود کو چھپا سکوں۔ اپنے کمرے ہی میں واپس جایا جا سکتا تھا لیکن وہاں جانے کے خیال سے میرا جسم اینٹھنے لگتا تھا پھر بھی اِس طرح کب تک میں بیچ راستے میں کھڑا رہتا۔ میرے سر میں یہی سمایا کہ واپس ہو جاؤں اور نشست گاہ کے کسی کونے میں بیٹھ جاؤں لیکن اندر جاتے جاتے باہر چبوترے پر مجھے کرسیاں نظر آ گئی تھیں۔ وہاں میں اکیلا نہیں تھا۔ چند بوڑھے ادھیڑ لوگ بیٹھے چھوٹے نواب کی عادات و خصائل کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ میرے کان اُس وقت کھڑے ہوئے جب اُنھی میں سے کسی کی زبانی میں نے گیتی کا نام سُنا۔ کوئی سرگوشی میں گیتی کی حالتِ زار پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اُس کی عمر یہ قیامت ٹوٹنے کی نہیں تھی، خدا اس پر رحم کرے۔ اُسے سُکھ کا وقت ہی کتنا ملا تھا۔ کسی نے کہا کہ حشمت جنگ سے زندگی میں ایک ہی غلطی ہوئی تھی لیکن وہ کر بھی کیا سکتے تھے، وہ انکار کیسے کر دیتے۔ یہ تو گیتی کے نصیب کی بات تھی۔ اس کے رشتے تو دُور دُور سے آئے تھے۔ کاش وہ نصیب بھی اپنی صورت جیسا لاتی۔ اُن کی کانا پھوسیوں سے میرا دل اور ڈوبنے لگا تھا۔ میں نے طے کیا کہ بتھل اور ابا جان سے کہہ کے آج ہی بلکہ ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ وہ میری طرف سے کوئی بھی عذر کر سکتے ہیں۔ ایک آدمی کے نہ ہونے سے کیا فرق پڑے گا لیکن یہ تو سبھی کا حال ہو گا۔ کیا وہ سب پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ میری کرسی کا رُخ عام دروازے کی طرف نہیں تھا۔ اس عرصے میں موٹروں کی تعداد کم ہو گئی تھی اور چبوترے پر بھی متعدد کرسیاں خالی ہو گئی تھیں۔ حویلی میں کل کی طرح اتنی ہی روشنیاں جل رہی تھیں لیکن روشنی اور رنگ کا تعلق تو بینائی سے بھی ہے۔

چبوترے پر صرف میں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اتفاق سے نواب حشمت جنگ اُدھر سے گزرا۔ وہ کسی کو چھوڑ کے واپس جا رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑ گئی، وہ سیدھا میرے پاس آ گیا اور حیرانی سے بولا "ارے آپ یہاں تنہا بیٹھے ہیں؟"

میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے سٹ پٹاتے ہوئے اُسے سلام کیا اور کہا "جی ہاں، بس یہیں بیٹھ گیا۔"

"آیئے، اندر آیئے۔ ہم تو آپ کو پوچھ ہی رہے تھے۔ ابھی جہانی میاں بھی آپ کے والد سے معلوم کر رہے تھے۔" اُس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو میں کسی ردّ و قدح کے بغیر اُس کے ساتھ چل پڑا۔ نواب حشمت کی آواز کی شکستگی صاف نمایاں تھی۔ نشست گاہ میں داخل ہوتے وقت میری رگوں میں برف جمنے لگی۔ بڑا نواب کسی شخص کو رُخصت کرنے کے لیے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہی خون بھری اُس کی آنکھیں تھیں، اُبلی اُبلی شعلہ بار سی۔ میں دروازے کے قریب ہی بیٹھ جانا چاہتا تھا مگر بڑے نواب نے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کے قریب آنے کو کہا۔ میرا سارا جسم سُن ہو گیا۔ نواب حشمت جنگ رُخصت ہونے والے شخص کی طرف متوجہ ہو گیا تھا لیکن بڑے نواب کی آنکھیں مجھی پر مرکوز تھیں۔ میں ڈگمگاتے پیروں سے اُس کے پاس پہنچا تو اُس نے میرے دونوں بازو تھام لیے اور بے اختیار مجھے گلے لگا لیا۔ مجھے جانے کیا ہوا، اُس کے سینے سے لگتے ہی میری آنکھیں کھولنے لگیں، میں نے خود کو روکنے کی کوشش کی لیکن میری سسکیاں نکل پڑیں۔ اُس نے مجھے اور زور سے بھینچ لیا۔ "ہمیں اندازہ ہے، ہمیں اندازہ ہے کہ آپ ۔ ۔ ۔" خود اُس کی آواز رندھنے لگی، جیسے کوئی سوتا کھل گیا ہو۔ اُس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اُس کے سینے سے لگ کے مجھے ایسا لگا جیسے اُس میں کوئی بھٹی سُلگ رہی ہو، جیسے اندر ایک سمندر متلاطم ہو۔ میری طرح اِن چند لمحوں میں شاید اُسے بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں ہے، کس کے سامنے ہے۔ اُس کی گردن میرے شانے پر ڈھلک گئی تھی اور بازوؤں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ خود بہ خود میرے ہاتھوں میں سختی آ گئی۔ میں اگر اُسے تھام نہ لیتا تو شاید وہ نڈھال ہو کے گر جاتا۔ نواب حشمت جنگ اور بتھل نے درمیان میں آ کے اُسے مجھ سے الگ کیا۔ حشمت جنگ نے مجھے تھاما، بتھل نے اُسے۔ بڑے نواب کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری تھا۔ ابا جان نے اُس کی کمر تھپکی تو بتھل نے اُنھیں روک دیا۔ "بہہ جانے دو بابا! اِن کا رُکنا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

بہت دیر تک بڑا نواب بتھل کے بازوؤں میں سمٹا سسکتا بلکتا رہا۔ پھر نواب حشمت جنگ کی دخل اندازی پر اُسے کچھ ہوش آیا۔ خود نواب حشمت جنگ کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ "مشیتِ ایزدی میں کسی کو کیا دخل ہے۔" منیر علی کہنے لگے "باری باری کی بات ہے۔ کسی کی پہلے، کسی کی بعد میں۔ ٹھہرنے والا یہاں کوئی نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم مغفرت کی دُعا کریں۔" منیر علی یہی کچھ بڑبڑاتے رہے۔ بڑا نواب گردن ڈالے سُنتا رہا اور رومال سے آنسو خشک کرتا رہا۔ اچھا ہوا کہ اُس وقت خادم نے ایک شخص کے آنے کی اطلاع دی۔ نواب حشمت جنگ نے تند نظروں سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ آنے والا ریاست کا کوئی بڑا آدمی ہی ہو گا، وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کی پیروی میں ہم سب بھی۔ نو وارد آتے ہی دوپہر کو اپنی غیر حاضری کا عذر پیش کرنے لگا اور وہی سب دُہراتا رہا جو ایسے موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ ایک ہی دلیل، ایک ہی انداز۔ معلوم نہیں تعزیت کرنے والے کیا کہنے، کیا جاننے آتے ہیں۔ حکیم ڈاکٹر کی طرح موت کی وجہ پوچھتے ہیں جیسے ابھی کوئی مداوا، کوئی تدارک باقی ہے۔ موت کے بعد پوچھنے کو کیا رہ جاتا ہے۔ تعزیت کرنے والے بار بار یہ احساس دلانے آتے ہیں کہ کوئی مر گیا ہے۔ وہ شخص بھی بڑے نواب کو چھیڑنے، اُسے تنکے چبھونے آیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں تعزیت کا مقصد دُکھ بٹانا ہوتا ہے، یہ باور کرانا کہ صرف تمھی اکیلے نہیں مگر اس سے کیا حاصل؟ کیا دُکھ تقسیم ہو جاتا ہے۔ ہزار آدمی شامل ہو جائیں مگر ایک آدمی کے چلے جانے کی کمی تو اپنی جگہ رہتی ہے۔ آنے والا جلد ہی واپس چلا گیا اور خاں صاحب کے اشارے پر نواب حشمت جنگ نے بڑے نواب کو فوراً وہاں سے اُٹھا دیا۔ سب ملحقہ کھانے کے کمرے میں آ گئے جہاں ہمارے ساتھ آنے والے لوگوں کے علاوہ پہلے سے لوگ موجود تھے۔ دسترخوان پر سب رسمی طور پر بیٹھے تھے۔ ویسے بھی آدمی کو صرف خوشی کے لیے توانائی کی ضرورت نہیں پڑتی، کھانے کے بعد بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ حویلی کے خاص ملازم، بڑے نواب کے چند اعزّا، نواب حشمت جنگ، خاں صاحب اور ہم سب۔ بڑا نواب جیسے بھیڑ چھٹنے کا منتظر تھا، جھجکتے جھجکتے ابا جان سے مخاطب ہو کے بولا "اس وقت آپ سبھی یہاں موجود ہیں، ہم آپ سے ایک گزارش کرنا چاہتے ہیں۔" اُس کی آواز پر نقاہت طاری تھی۔ ابا جان پلکیں جھپکانے لگے تھے۔ ابھی وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بتھل نے بھاری آواز میں کہا "ہم کو پتہ ہے نواب صاحب! آپ کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اپن ابھی ادھر ہی ہے۔" پیرو نے تیزی سے کہا "آپ ایسا ہی بولنا چاہتے ہو نا؟"

"ہاں، جی ہاں۔" وہ کھوئی ہوئی آواز میں بولا "ہم کہنا چاہتے ہیں کہ اُس کے جانے سے ۔ ۔ ۔"

"ہم کو معلوم ہے۔" بتھل نے پھر بیچ میں دخل دیا۔ نواب حشمت جنگ نے بھی بتھل کی تائید کی کہ ابھی سب یہیں حویلی میں موجود ہیں۔ بڑے نواب کی وحشت زدہ نگاہیں ہم پر منڈلا

رہی تھیں۔ اُس کا مدعا کچھ اور بھی معلوم ہوتا تھا لیکن وہ چُپ ہوگیا۔ کاش آدمی کا دُکھ سمیٹنے کی صلاحیت آدمی میں ہوا کرتی۔ کاش آدمی کا بدل آدمی ہوا کرتا۔ آدمی کو آدمی کی عُمر لگ جایا کرتی۔ میں اپنی ساری عُمر چھوٹے نواب کو دے دیتا۔ میں اسی لیے بڑے نواب کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کے چہرے سے جیسے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔

ہم لوگ جلد ہی اُٹھ گئے۔ وہ دن بھر لوگوں کے درمیان گھرا رہا اور اب بہت گرا گرا نظر آرہا تھا۔ نواب حشمت جنگ اُسے اندر لے گیا، گو وہ ہمارے ساتھ ہی بیٹھا رہنا چاہتا تھا۔

اُس رات میں اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ کاشتے کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلا آیا۔ زدرا بھی وہیں آگیا تھا۔ رات بھر میں صُبح ہو جانے کا انتظار کرتا رہا اور علی الصباح تیار ہو کے کمرے سے نکل گیا لیکن بالائی منزل کے فوّارے تک چکر کاٹ کے واپس آگیا۔ نیچے جانے والے راستے کی طرف بڑھتے ہوئے میری آنکھوں میں دُھند اُترنے لگتی تھی۔ نیچے بڑے نواب کے سامنے کچھ دیر بیٹھے رہنے کے سوا سارا دن میں کاشتے ہی کے کمرے میں پڑا رہا۔ دوسرے دن بھی حویلی میں لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ ایک رات اور گزر گئی۔ دن میں کتنی ہی بار میں نے ارادے باندھے کہ ایک بار اپنے کمرے میں جا کے دیکھنا تو چاہیے کہ خادمہ نفیس وہاں موجود ہے یا نہیں جب اِدھر سارے ملازم جوں کے توں موجود ہیں تو وہ بھی وہیں ملازموں کے گوشے میں موجود ہوگی۔ نہ ہوگی تو میرے آنے کی اطلاع سُن کے آجائے گی۔ نیچے زنان خانے میں گیتی اور برجیس کے سامنے جانے کے تصوّر سے میرے ہاتھ پیر لوٹنے لگتے ہیں تو کیا ہوا، میں نفیس کو بُلا کے کچھ کہہ سکتا ہوں مگر مجھے اُس سے کیا پوچھنا ہے، کیا کہنا ہے۔ تیسرے دن حویلی میں قرآن خوانی کا اہتمام تھا۔ اُس روز بڑے ہال میں اور باہر چبوترے پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ دوپہر کو کھانے پر بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ اُوپر بالائی منزل پر چلے جانے اور نیچے لوگوں کے درمیان آجانے کے سوا ہمیں کوئی کام نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ رات تخلیے کے وقت جب سب لوگ چلے جائیں گے تو ابّا جان بالتفصیل زبان کھولنے کی کوشش کریں گے۔ رات گئے تک وہ بڑے نواب کے ساتھ رہے اور کچھ نہیں بولے لیکن اب وہ کسی وقت بھی وہ بات اُس کے سامنے کہہ سکتے تھے جو اُن کی زبان پر آآکے رہ جاتی ہوگی۔ پہلے کی بات اور تھی میری طرح اُن سب کو حویلی کے در و دیوار اجنبی سے لگتے ہوں گے۔ سوئم سے پہلے تو ویسے بھی کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن سوئم کے بعد روانگی کی اجازت کے لیے اُنھیں بڑے نواب کو اشارہ کرنا ہی چاہیے۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اپنی کوتاہی کا احساس میرے سینے پر بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ میں خود بھی عذر تراشتا رہا۔ مردانے کی طرح زنان خانے میں بھی یہی ہجوم ہوگا۔ پہلے کی بات اور تھی جب اُنھوں نے مجھے زنان خانے میں آنے کے لیے اطلاع و اجازت کی رسم سے مستثنا قرار دیا تھا اور اس سے سوا بھی بہت کچھ کہا تھا۔ اب تو اُنھیں کسی طرف دیکھنے کا ہوش ہی کہاں ہوگا اور میں اُنھیں کیا تسلی دے سکوں گا۔ کیا مجھے اُن کے پاس جا کے بھی لفظ دُہرا دینے چاہئیں جو میں یہاں آنے والوں سے سُنتا رہا ہوں؟ وہ مجھ سے اتنی ہی توقع کرتی ہوں گی مگر میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ میری کوئی بات اُن کے پھپھول کو ہوا دینے کا سبب بھی تو بن سکتی ہے۔ وہاں جا کے میری زبان ٹھٹھری رہی تو یہ اور بھی نامناسب ہوگا۔ اُنھوں نے کس کس طرح مجھ سے منت کی تھی کہ میں اسے اپنا ہی گھر سمجھوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ اُنھوں نے از رُوئے وضع ہی نہیں کہہ دیا تھا۔ وہ لہجہ دوسرا ہوتا ہے۔ میں ایک لمحے اپنا عزم استوار کرتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ پارا پارا ہو جاتا تھا اور جیسے کوئی میری جان کھینچنے لگتا تھا۔ میرے نہ جانے سے کوئی بدگمانی اُن کے دلوں میں نہ بیٹھ جائے۔ کبھی مجھے خیال آتا تھا کہ رسم بھی تو کوئی چیز ہے۔ کہیں وہ میرا انتظار نہ کر رہی ہوں۔ اُنھیں اِس عالم میں میرا خیال تو آیا ہوگا۔ خانم تو اُن کے سامنے ہی تھی۔ اُسے دیکھ کے میں اُن کی نظر میں مزید اُجاگر ہوتا ہوں گا۔ ممکن ہے، میرے دو ایک ہی لفظ اُن کے لیے سہارا ثابت ہوں۔ وقت کا کچھ اعتبار نہیں پھر ملے نہ ملے۔ اگر میں یوں ہی چلا گیا تو شاید پھر کبھی اس کی تلافی نہ ہو سکے۔ جانے پھر کب یہاں آنا ہو، آنا ہو بھی یا نہیں۔ کون اُنھیں جا کے بتائے کہ میں اُن کے سامنے نہیں گیا ہوں لیکن وہ مسلسل میرے سامنے رہی ہیں۔ میں اُن کے لیے آرزوئیں ہی کرتا رہا ہوں۔ آرزو بھی تو دُعاؤں کا درجہ رکھتی ہے۔ خدا اُنھیں صبر دے۔ وہ خود بہت ہوش مند ہیں، بہت تحمل ہے اُن میں۔ سمجھتی ہوں گی کہ کون سا احساس میرے قدم روک لیتا ہے۔ میرے پاس اُنھیں قائل کرنے کے لیے کوئی دلیل نہ ہوگی۔

وہی ہوا، چوتھے دن سویرے ناشتے کے وقت بڑا نواب کسی قدر ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ابّا جان نے اشارۃً اُس سے ذکر کیا۔ اُنھوں نے ہر ممکن احتیاط کی تھی لیکن بڑے نواب کا چہرہ بھاری ہوگیا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سوچتا رہا پھر بولا "ہم کیا کہیں، ہم خود کو بہت بے جواز محسوس کرتے ہیں۔"

"نہیں، نہیں" ابّا جان نے بے تابی سے کہا "آپ کیا فرماتے ہیں۔ آپ کے پاس تمام جواز ہیں، آپ خود سب سے بڑا جواز ہیں۔"

"ہم، ہم بہت اکیلے ہو جائیں گے۔" وہ پژمردگی سے بولا۔

"بخدا، ایسے عالم میں یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ کیا عرض کریں۔ جانا بھی ضروری ہے لیکن ہم جلد ہی واپس آئیں گے۔"

"ہمیں احساس ہے، ہم نے پہلے ہی آپ کا راستہ کم کھوٹا نہیں کیا ہے۔"

"نئیں نواب صاحب! ابھی ایسا مت بولو۔" پیرو نے اضطراب سے کہا۔ "اپن نے اِدھر آکے بہت کچھ پایا ہے پر اپن کو دُکھ ہے کہ اپن...."

پیرو کی آواز بھرّا گئی۔

نواب نے ڈُوبی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔

"خدا آپ کو حوصلہ دے۔" منیر علی لجاجت سے بولے "ہماری یہی دُعا ہے۔ یقین کیجیے، ہمارا دل یہیں اٹکا رہے گا۔"

"ہم بھی آپ سے یہی کہنا چاہتے تھے کہ اُس کے جانے کے بعد ہمیں آپ کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ کاش آپ کچھ دن اور قیام کرتے۔"

"ہم نے عرض کیا کہ ہم جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے، یوں بھی کسی دن تو جانا ہی ہے نواب صاحب!"

"ضروری نہیں ہے، یہ حویلی بھی تو آپ کا گھر ہے۔"

"یہ آپ کی کرم گستری ہے۔ بے شک یہ ہمارا ہی گھر ہے۔ ہم یہی سمجھ کے یہاں آتے رہیں گے۔"

"اُس کے جانے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہماری سزا ختم ہوگئی ہے آپ کے سلوک و نوازش کا وزن کم ہوگیا ہے۔ وہ کبھی اتنے سکون سے نہیں جاتا۔ ہم آپ سے سچ عرض کریں کہ اُسے دیکھ کے ہمیں ایک اطمینان بھی نصیب ہوا تھا کہ وہ اپنی مراد پا کے گیا ہے۔ اِس کے بعد اُس کے لیے کیا رہ گیا تھا۔" بڑے نواب کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ کسی نے کچھ نہ کہا تو بڑا نواب بھر بھراتے لہجے میں بولا "آپ کو معلوم ہے، اُس نے خانم کے زانوؤں پر آنکھیں بند کی ہیں۔ یقیناً اُسے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ سحر ٹوٹ نہ جائے، کہیں یہ حقیقت پھر کسی عذاب سے دوچار نہ ہو جائے۔ اُس نے بے شمار شب و روز انتظار کی جاں کنی میں گزارے تھے۔ اب اُس میں مزید سکت نہیں تھی۔ کب سے وہ اپنے آپ پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ اُسے جیسے ہی یقین آیا کہ اُس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی ہیں، اُس کی منزل آسان ہوگئی۔" بڑے نواب کی آواز کپکپا رہی تھی، کہنے لگا "ہم نے کچھ اور نہیں تو اُس کی موت آسان کر دی تھی۔"

"بس کرو جہانی میاں!" نواب حشمت جنگ عاجزی سے بولا "کوئی نہ کوئی بہانہ ہی بنتا ہے۔ آدمی نہ اپنے وقت سے پہلے جاتا ہے، نہ بعد میں۔" پھر ابّا جان سے مخاطب ہو کے بولا "قبلۂ عالم! کیسا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ دو ایک دن اور قیام فرمائیں؟"

"ضرور، ضرور" ابّا جان نے تیزی سے کہا "یوں بھی ہم یہاں سے جاتے ہی روانہ نہیں ہو جائیں گے۔ اُدھر گھر میں بھی کچھ دیکھنا بھالنا ہے۔ دو ایک دن، جب تک شہر میں ہی ٹھہرے ہیں یہاں آمد و رفت رہے گی۔"

"ہماری گزارش ہے کہ آپ کل تک ضرور ٹھہریں۔" نواب حشمت جنگ شائستگی سے بولا "کل صبح ختم شریف ہو رہا ہے۔ اتفاق ہے کہ کل ہی آجی (عالم تاب) کی سال گرہ کا دن بھی ہے۔"

گلبرگہ اور نظام آباد شہروں کے چند لوگ بڑے نواب سے ملنے آگئے تھے اس لیے موضوع بدل گیا۔ میں فوراً وہاں سے اُٹھ گیا۔ صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ یہ ایک دن بھی یوں ہی گزر جائے گا۔ مجھے اپنے کمرے میں جا کے خادمہ نفیس کو ٹٹول کے دیکھنا چاہیے اسی طرح زنان خانے اور اُن کے حال کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ ہو سکے گا مگر وہ جو کچھ بتائے گی، کیا میں نہیں جانتا ہوں۔ اُس کی کوئی ایسی ویسی بات میرا رہا سہا ارادہ بھی نہ چھین لے۔ اِس طرح مجھے اُن کے پاس جانے کا ایک اور عذر مل جائے گا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ کیوں نہ خانم سے ملنے کے لیے زنان خانے کا رُخ کروں۔ یہ عُذر نسبتاً معقول ہے۔ جب سے وہ آئی ہے، میں اُس سے ملا بھی نہیں ہوں۔ وہیں کوئی صورت نکل آئے گی۔ پھر میں نے یہ خیال بھی مسترد کر دیا۔ خانم کا حال بھی اُن سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ کچھ دیر میں اُنھیں علم ہو جائے گا کہ ہم لوگ کب یہاں سے جا رہے ہیں۔ گیتی کو شاید ہوش نہ ہو۔ ممکن ہے، برجیس خود مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے اور اس کے لیے ایک خادمہ نفیس ہی لازم نہیں ہے۔

میرے قدم خود بہ خود مجھے بالائی منزل کی طرف لے گئے۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کے مجھے احساس ہوا کہ کہاں آگیا ہوں۔ کمرے میں

آ کے میرا دل دھڑ دھڑانے لگا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی تھی، کسی جگہ گرد کی ذرا سی بھی تہہ نہیں تھی، نہ بستر پر کوئی شکن۔ میں نے ٹھنڈے پانی کی بوتل دیکھی۔ اُس میں ٹھنڈا پانی موجود تھا۔ دوسری بوتل میں گرم چائے بھری ہوئی تھی۔ خاص دان میں گلوریاں بھی تازہ تھیں۔ ابھی نہیں تو کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے کوئی گیا تھا۔ گویا نفیس ابھی تک ملازموں کے گوشے میں تعینات ہے۔ میرے ہاتھ اُسے بُلانے کی ڈوری کھینچنے کے لیے بڑھتے بڑھتے رہ گئے۔ پہلے مجھے اپنے اوسان درست کر لینے چاہئیں۔ میں یہاں آ گیا ہوں تو کسی وقت بھی اُسے بلا سکتا ہوں۔ پہلے مجھے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اُس سے کیا کہنا ہے، کیا پوچھنا ہے۔ کیا میں اُس سے صرف ہر جبیں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کروں۔ کیوں نہ میں ہر جبیں کو ایک رقعہ ہی لکھ دوں۔ یہ طریقہ سب سے مناسب رہے گا۔ میں جو کچھ اُس کے سامنے نہیں کہہ سکوں گا، وہ خط میں لکھ سکتا ہوں۔ میں اُسے لکھوں گا کہ اُس کی ایک ایک بات میرے دل پہ نقش ہے اسی اعتماد میں یہ عریضہ لکھنے کی بھی جسارت کر رہا ہوں اور سرِ دست اُس سے تخاطب کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت سمجھ میں نہیں آ رہی ہے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں یہ سب کچھ میرے ذہن سے نکل نہ جائے میں نے پنسل اور کاغذ تلاش کیا۔ مسہری کے ساتھ رکھی ہوئی میز کی دراز میں دوات قلم موجود تھا۔ میرے دماغ میں جو بھی اُس وقت آتا گیا میں نے کاغذ پر اُتارنا شروع کر دیا۔ میں نے لکھا، مجھے اندازہ ہے کہ آپ کس قلبی و ذہنی کیفیت سے دوچار ہوں گی۔ میں آپ کو کیا بتاؤں، یہی سوچتا رہا کہ اس عالم میں میرا جانا مناسب بھی ہے یا نہیں۔ ہر لمحے اِس مناسبت نامناسبت کا خیال آڑے آتا رہا اور یہ بھی کہ کہیں میری آمد آپ کے دُکھ اور نہ بڑھا دے، آپ کو اور نہ منتشر کر دے۔ زنان خانے میں عزادار خواتین کے ہجوم نے بھی مجھے روکے رکھا اور میں یہ بھی سوچتا رہا کہ وہاں جا کے کروں گا کیا۔ اگر محض بر بنائے رسم میرا جانا ضروری ہے تو بہتر ہے کہ نہ جاؤں۔ کبھی کبھی یہ رسم و وضع بھی بہت اذیت پہنچاتی ہے۔ کم از کم آپ مجھ سے اِس کی توقع نہ کرتی ہوں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی میری کیفیت کا بہ خوبی احساس ہوگا اور مجھے ایسی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے قلم روک دیا کہ الجھاؤ کے بجائے مجھے سیدھے سادے لفظوں میں لکھنا چاہیے سو چند لمحے توقف کے بعد میں نے لکھا، ہم کل کسی وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں دوسرے لوگوں کے ساتھ نہ ہوتا تو یقیناً رُک جاتا لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا میرا جانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ مجھے ہر دم یہاں کا خیال رہے گا۔ اُمید ہے کہ مجھے وہاں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ بہر حال میری کوشش یہی ہوگی کہ جلد از جلد آ جاؤں۔ اُس وقت تک حویلی میں آنے والوں کی بھیڑ بھی ختم ہو جائے گی اور اس عرصے میں آپ کو بھی کچھ استقامت ضرور نصیب ہوگی۔ خدا آپ کو صبر و سکون دے۔ آپ کا اور چھوٹی بیگم کا خیال آتا ہے تو دل بہت گھبراتا ہے۔ دُکھ میں آدمی خود کو بہت تنہا اور کمزور محسوس کرتا ہے شاید یہی احساس مٹانے کے لیے لوگ اُس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں مگر وقت تو اپنی گردش ضرور پوری کرتا ہے۔ کاش آدمی کے بس میں اس سے سوا ہوا کرتا۔ میں آپ کے لیے دُعا کرتا رہوں گا۔ میری طرف سے چھوٹی بیگم صاحبہ کو بہت بہت پوچھ لیجیے گا۔ اُس وقت تو آپ نے سب کچھ کہا تھا، میں سُنتا رہا تھا۔ اب میری درخواست ہے کہ آپ میرا انتظار ضرور کیجیے گا

میری اُنگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اتنا لکھ کے میں نے سانس لینے کے لیے قلم روک دیا اور لکھے ہوئے کاغذ پر ایک نظر ڈالی۔ وہ مجھے اپنا خط ہی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ایک لفظ اِدھر، ایک اُدھر۔ میں نے بہت جلدی جلدی لکھا تھا۔ قلم دماغ کا ساتھ ہی نہیں دے رہا تھا۔ دماغ میں ایک ساتھ اتنی بہت سی باتیں آ رہی تھیں کہ قلم تک پہنچتے پہنچتے گم ہو جاتی تھیں۔ میں نے شروع سے آخر تک اسے دوبارہ پڑھا۔ مجھے سب بکھرا بکھرا، بے ربط معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح کا خط میں نے پہلے کبھی کسی کو نہیں لکھا تھا۔ میں دیر تک لفظ اور جملے بدلتا رہا۔ بعد میں میں نے اُسے پڑھا تو وہ کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اڑا اڑا، بے ہنگم۔ میں جو کہنا چاہتا تھا، وہ لکھ ہی نہیں سکا تھا۔ شاید میں لکھنا ہی بھول گیا ہوں۔ جیل سے آنے کے بعد مجھے لکھنے پڑھنے کی مہلت ہی کتنی ملی ہے۔ اتنے طول طویل متن کے بجائے مجھے چند سطری تحریر پر اکتفا کرنا چاہیے۔ میں نے وہ کاغذ پھاڑ دیا اور دوبارہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ میرا قلم اٹک رہا تھا تاہم میں نے لکھا کہ کتنی ہی بار آنے کا ارادہ کیا مگر نہ آ سکا۔ اب میں جا رہا ہوں۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے کم از کم ایک بار یہاں ضرور آؤں گا اور جلد ہی، اِس یقین کے ساتھ کہ آپ میری منتظر ہوں گی۔

اختصار ہی مناسب ہے۔ میں نے تحریر صاف کرنے کے لیے نیا ورق لیا اور ابھی ایک لفظ بھی نہ لکھ پایا تھا کہ لقب کا خیال آیا۔ مجھے کسی نہ کسی لقب سے تو اُسے مخاطب کرنا ہے۔ کوئی موزوں لقب ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ زیادہ ادب و احترام سے تخاطب اُسے گراں گزر سکتا ہے۔ صرف اُس کا نام لکھنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے کچھ لکھنے کے بجائے صرف تسلیم لکھ دیا۔ میں نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کے لکھا تھا کیونکہ میری اُنگلیاں ٹھٹھری جا رہی تھیں۔ آخر میں میں نے اپنا نام بھی نہیں لکھا۔ خط لکھنے کے بعد مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا، کوئی اَن ہونی سی بات۔ اس خیال سے کہ کہیں میں نے کوئی نازیبا بات تو نہیں لکھ دی ہے، میں نے اپنی تحریر متعدد بار پڑھی۔ ہر بار اپنی تحریر مجھے پہلے سے زیادہ اُکھڑی ہوئی اور بے جان نظر آتی تھی۔ اس کے مقابلے میں تو پہلے والا خط زیادہ مؤثر تھا۔ اتنا زیادہ اختصار بھی اچھا نہیں ہوتا۔ یہ بہت رسمی سی تحریر ہے۔ اُس میں کچھ محسوس تو ہو رہا تھا اور ایک اور بات میرے سینے میں کھٹکنے لگی تھی کہ اِس مراسلت میں آداب سے متجاوز ہونے کا کوئی پہلو تو نہیں نکلتا ہے۔ میں نے رقعہ چاک کر دیا اور میرے جی میں آئی کہ ساتھ ہی اپنا گریبان بھی چاک کر لوں۔ کمرے کی ساری چیزیں توڑ پھوڑ ڈالوں۔ مجھے اپنے آپ سے بہت چڑ ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ کمرے میں میری موجودی کی سُن گُن خادمہ نفیس کو مل جائے اور وہ میری اِس ابتری کے دوران اندر داخل ہو، مجھے باہر نکل جانا چاہیے۔ ابھی کچھ وقت ہے کسی اور تدبیر کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔

صبح سے شام ہو گئی اور شام سے رات۔ ایک ہی رات درمیان میں باقی تھی۔ میں اُس رات بھی اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ جیسے جیسے روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا، میری ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ وقت کھو جانے کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنے آپ سے نگاہیں نہیں ملائی جا رہی تھیں کاتتے اور زورا کے ساتھ رہنے سے میں اپنے ساتھ کم رہتا تھا اس لیے ایک لمحے کو بھی اُن سے دُور نہیں ہوا تھا۔ ساری رات کاتتے کے بستر پر آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ صبح دس بجے سے ختم شریف شروع ہو گیا تھا۔ آیۂ کریمہ کا ورد تھا۔ اُس دن بھی بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے لیکن میں وہاں کچھ ہی دیر بیٹھا۔ ظاہر ہے، ختم کے بعد کھانے کا اہتمام ہوگا اور کھانے کے بعد ہی ہماری روانگی ممکن ہو سکتی ہے۔ پھر میں نے یہی طے کیا کہ اپنے کمرے میں جا کے خادمہ نفیس کو بلاؤں اور کوئی عریضہ سپرد کرنے کے بجائے سب کچھ اُسی سے کہہ دوں۔ میں اُس سے بہانہ کروں گا کہ اس دوران میری طبیعت ہی ٹھیک نہیں رہی تھی اور میں یہ بتا کے کسی کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں تیز قدموں سے اُوپر کی طرف جا رہا تھا کہ کھانے کے بعد شاید موقع نہ مل پائے مگر ابھی میں نے آدھا زینہ ہی عبور کیا ہوگا کہ پیچھے سے کاتتے کی آواز پہ مجھے ٹھہرنا پڑا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اُوپر ہی چلا آیا۔ "کدھر کو جا رہا ہے؟"

"بس یُوں ہی اُوپر کی طرف۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"اپنے کو بھی تھوڑی پان کی طلب ہو رہی تھی۔"

"تم ایسے تو پان نہیں کھاتے۔"

"اِدھر کی گلوریوں کی بات ہی اور ہے لاڈلے! نہ جانے پھر کب کھانے کو ملیں۔ سوچا چلتے وقت دو چار اور ڈال لوں۔"

"یہاں سے ہم کب چل رہے ہیں؟"

"اُستاد کھانے کے بعد کو بول رہے تھے۔" اُس نے سرسری لہجے میں کہا اور اچانک میرا ہاتھ دبا کے کہنے لگا۔ "تُو نے کچھ اور بھی سُنا؟"

"کیا! ۔ ۔ ۔" میرے پیر وہیں جم گئے۔

"خانم آپی اپنے ساتھ نہیں جا رہی ہیں؟"

"کیا، آپی نہیں جا رہی ہیں؟"

"ہاں لاڈلے! اپنے کو ابھی پتہ چلا۔ آپی نے انکار بول دیا ہے۔ بولا ہے کہ ابھی وہ اِدھری رہیں گی۔"

میں اُسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا کیا۔

"اُستاد اور پیر دادا ابھی ابھی اُدھر اندر کو گئے تھے۔ لوٹ کے اُن لوگ نے اباجان اور بڑے صاحب کو ایسا ہی بولا ہے۔"

"تم نے کچھ غلط تو نہیں سُنا ہے؟"

"اپنے کو خود بھی بہت اچنبھا ہوا تھا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے! آپی یہاں اکیلی رہیں گی؟"

"آپی نے بولا ہے جب اُن کو آنا ہوگا، وہ چِٹھی بھیج دیں گی۔ اُنھوں نے ہم سب کے لیے بولا ہے کہ ہم لوگ چلے جائیں۔"

"نہیں کاتتے بھائی!" میں نے تذبذب سے کہا۔ "اور اُوبھل بھائی کیا کہہ رہے تھے؟"

"اور کچھ نہیں، اباجان اور بڑے صاحب بھی سُن کے چُپ ہو گئے۔ اُدھر اندر اُستاد نے آپی کو کچھ بولا ضرور ہوگا۔ ایسے لوٹ کے آ گیا ہے تو کوئی بات ہی ہوگی۔"

میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ خانم نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے۔ وہ تو یہاں آنے پر آمادہ ہی نہیں تھی۔ کاتتے کچھ اور نہیں جانتا تھا۔ کمرے میں آ کے اُس نے مُنہ ہاتھ دھویا، بال سنوارے اور چائے پی کے پان چبانے لگا۔ میں گم سُم بیٹھا رہا۔ مجھے خانم سے ملنا چاہیے۔ مجھے خود جا کے دیکھنا چاہیے کہ آخر اُس نے یہاں ٹھہرنے کا اِرادہ کیوں کر لیا ہے۔ اب وہ یہاں کے مطلوب ہے۔ ہو سکتا ہے گیتی آرا نے اصرار کیا ہو مگر وہ زیادہ دنوں تک جہاں گیر کے بغیر کیسے رہ سکتی ہے، اور زرّیں کے بغیر بھی۔ دونوں ایک دوسری کی بہنیں لگتی ہیں۔ اُن میں بہنوں سے زیادہ یگانگت ہے۔ کچھ دیر کے لیے کوئی ایک نظروں سے اوجھل رہے تو دوسری پریشان ہو جاتی ہے۔ زرّیں کی حویلی تو اُس کا گھر ہے، اُس کی پناہ گاہ۔ زرّیں نے حویلی کی ساری چابیاں اُس کے حوالے کر دی تھیں۔ یہاں کسی کے مجبور کرنے کا بھی اب سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کے خادمہ نفیس کو بلانے کا ارادہ ترک کیا۔ اگر مجھے زنان خانے کی طرف جانا ہی ہے تو پہلے وہاں

صورتِ حال کا جائزہ لے لوں۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ایک بجنے والا تھا۔ کانتے کسی رسالے کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ میں اُس سے کچھ کہے بغیر باہر نکل آیا۔ نیچے اب بھی بھیڑ تھی۔ میں عمارت کی پُشت میں خاص زنان خانے جانے والے راستے کی طرف مُڑ گیا۔ قریب پہنچ کے میں نے ایک خادم سے کہا کہ وہ اندر جا کے خانم کو مطلع کر دے۔ خادم کی واپسی میں دیر لگ گئی لیکن میں وہیں کھڑا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ واپس آنے پر وہ کچھ دُور تک میرے ساتھ چلا۔ اُس کے اشارے پر جیسے ہی میں ایک دروازے میں داخل ہوا، ایک خادمہ نے مجھے آداب کیا اور بتایا کہ اندر خانم میری منتظر ہے۔ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں خانم موجود تھی۔ اُسے دیکھ کے مجھے جھٹکا سا لگا۔ صرف چند دنوں میں وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ بکھرے بکھرے بال، زرد رنگت، لباس صاف مگر جا بجا شکنیں پڑی ہوئی۔ میں دروازے کے قریب ٹھٹھک کے رُک گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مضطربانہ میری طرف بڑھی اور اُس نے میری پیشانی کو بوسہ دیا، میرے ہاتھ چومے۔ میں نے اُس کے ہاتھ زور سے تھام لیے۔ "آپی! آپ کیسی ہیں؟" میں نے گھُٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ بے اختیار میرے سینے سے لگ کے سسکنے لگی۔ میرے حواس گُم ہو گئے تھے۔ "آپ نہیں جا رہی ہیں آپی؟"

"مجھے ابھی یہیں رہنا ہے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی اور ہڑک ہڑک کے رونے لگی۔

اُس سے کچھ اور پوچھنا لاحاصل تھا۔ سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ تمام سوالوں کا جواب مجھے مل گیا تھا۔ یہ جان کے میرا سینہ بھی دُکھنے لگا۔ اُسے تسلی دینے کے بجائے مجھے اپنے آپ کو ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ "آپ کہیں تو ہم اور رُک جائیں، میں رُک جاتا ہوں۔" میں نے بہ دقت تمام کہا۔ "آپ یہاں اکیلی رہیں گی۔"

"نہیں بابر میاں! یہ بھی میرا ہی گھر ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرا کوئی ایسا گھر بھی ہے۔" اُس کی آواز بَین کر رہی تھی۔ "تم جاؤ۔ تمھارا جانا بہت ضروری ہے۔ خدا تمھیں اپنے بچھڑے ہوؤں سے ملائے۔ خدا کرے وہ سب خیریت سے ہوں۔ اُنھیں لے کے فیض آباد ہی چلے جانا۔ اور رجّو (جہاں گیر) کا خیال رکھنا۔ اُس سے کہنا کہ تمھاری آپی تمھارے لیے بے چین رہے گی اور جلد ہی تمھارے پاس پہنچے گی۔ زرّیں سے بھی یہی کہہ دینا۔ گھر میں اور سب سے۔ زہرہ اور زیباں سے بھی۔"

"میں بمبئی سے واپس فیض آباد نہیں جاؤں گا۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "یہیں آ جاؤں گا۔"

"اگر میری خاطر یہاں آنا چاہتے ہو تو مت آنا۔ تمھیں وہیں جانا چاہیے۔ اتنے زمانے کے بعد بھائی بہنوں سے ملنا ہوگا۔ کچھ عرصے بھی اُن کے ساتھ نہیں رہو گے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور بھنچے ہوئے ہونٹوں سے بولی "میری فکر مت کرو، میں یہاں ٹھیک رہوں گی۔" اُس نے میرے گریبان کا بٹن بند کیا، میرے بال درست کیے، وہ اپنی قابو یافتگی کے اظہار کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور اُس کے سارے بدن پر ارتعاش طاری تھا۔ مجھ سے کہنے لگی "اپنا بھی خیال رکھنا اور اب، ہو سکے تو اب کہیں اور مت جانا۔"

میں سُنتا رہا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں جتنی دیر تک اُس کے سامنے موجود رہوں گا، اُس پر یہی اضطرابی کیفیت طاری رہے گی۔ پھر میں وہاں ایک لمحے بھی نہیں ٹھہرا۔ اُس نے بھی مجھے نہیں روکا۔ وہ میرے ساتھ دروازے کے باہر دوسرے کمرے میں آ گئی۔ باہر نکلتے ہی میری نگاہ اچانک دائیں جانب ستون کی آڑ میں کھڑی ہوئی برجیس پر گئی۔ مجھ پہ کوئی بجلی سی گری، میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ وہ برجیس ہی تھی، سادہ لباس میں ملبوس، پھٹی پھٹی بھری بھری آنکھیں، چہرے پر گھٹا سی چھائی ہوئی۔ اُس نے آہستگی سے ہاتھ اُٹھا کے مجھے تسلیمات کی۔ میرا سارا جسم سَن سَنا رہا تھا۔ جانے کس طرح میں نے اُس کے سلام کا جواب دیا۔ میں بے تحاشا اُس کی جانب بڑھ جانا چاہتا تھا لیکن پیروں نے ساتھ نہیں دیا، معاً مجھے خانم کی موجودگی کا خیال آیا اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دوسرے لمحے جب میں نے نگاہ اُٹھا کے دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھی، شاید ستون کی آڑ میں ہو گئی تھی۔ چند لمحوں تک میں بُت بنا کھڑا رہا۔ "میں یہیں واپس آؤں گا آپی! چند روز بعد ہی آنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے سٹ پٹائی آواز میں کہا۔ وہ موجود ہو گی تو اُس نے بھی میری آواز سُن لی ہو گی۔ اس سے پہلے کہ خانم مجھ سے کچھ کہتی میں تیز قدموں سے وہاں سے چلا آیا۔

دھوپ ابھی اُتری نہیں تھی کہ نواب حشمت جنگ اور بڑے نواب کی موٹروں نے ہمیں ابّا جان کی حویلی میں پہنچا دیا۔ ہارن کی آواز سُن کے مارٹی، شامو، جمرو اور ٹنگو فوراً باہر نکل آئے۔ اُچھلتے کودتے شور مچاتے ہوئے اُنھوں نے چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگیں اور دیوانہ وار ہم سے لپٹ گئے جیسے ہم طویل مسافت کے بعد کہیں سے آئے ہوں، کوئی بڑی مہم سر کر کے۔ خود مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میں ایک عرصے بعد اُنھیں دیکھ رہا ہوں حالانکہ اُن سے رخصت ہوئے ابھی ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ہوا تھا۔ موٹریں ہمیں چھوڑ کے واپس چلی گئیں۔ اندر

جا کے سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ سب پر کسی لمبے سفر کی تھکن سوار تھی۔ گھر آ کے یہی ہوتا ہے، آدمی چور چور ہونے لگتا ہے۔ ابا جان اور منیر علی نے شیروانیاں اُتار دیں، بٹھل اور پیرو نے واسکٹیں، اور اندر داخل ہوتے ہی بٹھل نے مارٹی کو حقہ تیار کروانے کا حکم دیا۔ عمارت کے سامنے وسیع سبزہ زار پر بید کی کرسیاں رکھی تھیں۔ اس اثنا میں دھوپ کچھ اُوپر چلی گئی تھی اور باہر کا منظر خوشگوار ہو گیا تھا۔ سب سبزے پر آ گئے۔ ٹنگو بٹھل کے پیر دبانے لگا۔ ملازم چائے لے آئے اور ساتھ میں بہت سا سامان۔ مارٹی، جمرو، شامو اور ٹنگو اس طرح ہماری پذیرائی کر رہے تھے جیسے ہم اُن کے مہمان ہوں۔ مارٹی تو پاگل سا ہو گیا تھا، ناچا ناچا پھر رہا تھا۔ کبھی میرے پاس آتا تھا اور کبھی زورا اور کانتے کے پاس جاتا تھا، کبھی بٹھل اور پیرو کے سامنے جا کے کھڑا ہو جاتا۔

پہلے یہ سبزہ زار ایسا ہرا بھرا نہیں تھا۔ سب کچھ دُھلا دُھلا، رنگا رنگا نظر آ رہا تھا۔ چبوترے کی سیڑھیوں پر گملوں کی تعداد بھی بڑھا دی گئی تھی۔ گملوں پر تازہ تازہ سُرخ رنگ کیا گیا تھا۔ وہ چار دن ان دنوں شاید پھول پودوں ہی کا کام کرتے رہے تھے۔ حویلی کے ملازم بھی اُن سے بہت مانوس معلوم ہوتے تھے، اشاروں پر دَوڑے دَوڑے پھر رہے تھے۔ بید کی بڑی گول میز پر انھوں نے کھانے پینے کے سامان کا انبار لگا دیا تھا۔ سب کھانے پینے میں مصروف تھے کہ مارٹی میرے پاس چلا آیا اور سبزے پر میرے قدموں کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے اُس کے تپاک کے جواب میں ہر بار مُسکرانے کی کوشش کی تھی اور اُسے اپنے بازوؤں میں زور سے بھینچا بھی تھا لیکن مارٹی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ چپکے سے کہنے لگا "کیوں راجا اُستاد! ابھی تم ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں مارٹی! بالکل ٹھیک" میں نے مستعدی سے جواب دیا۔

"ابھی تم اپن کو سب سے الگ لگتا ہے۔ جب سے آیا ہے اپن نوٹ کر رہا ہے۔ لگتا ہے، تم ابھی ادھر کو واپس نہیں آیا۔"

"نہیں مارٹی! میں نے ہنستے ہوئے کہا "تھکن کی وجہ سے شاید تمھیں ایسا محسوس ہو رہا ہو۔"

"لگتا ہے، کئی رات سے سویا بھی نئیں ہے۔"

"ہاں" میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا "وہاں نیند ہی بہت کم آتی تھی۔"

"تم ابھی کچھ بھی نئیں لے رہا ہے؟"

"یہ چائے پی جو رہا ہوں۔"

"بولے تو کچھ اور لائے۔ ادھر لگ ایک دم فنٹاسٹک حیدرآباد کا ڈشیز بناتا ہے۔ ابھی میٹھا ملا ہوا پوری بنایا ہے۔ کیا بولتا ہے اس کو؟"

وہ جوشیلے انداز میں بولا "ہاں لُقمی۔"

"میں نے وہاں کھائی ہیں۔"

"کھایا ہے! پھر کیسا لگا تم کو؟" وہ اشتیاق سے بولا۔

"بہت مزے کی بناتے ہیں۔"

"ایک چیز کیا، سالا روز نیا آئٹم بناتا ہے۔ اپنا باڈی نئیں د[یکھتا] ہے، ماں قسم، اپن سوچتا ہے، اگر کچھ دن اور ادھر رہ گیا تو ایکدم [پھول جائے] گا۔" وہ عجیب انداز سے منہ پھلا کر بولا "گول گپا ماقک۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ مارٹی کچھ یہی جتن کر رہا تھا۔ میں اُس سے کیا کہتا کہ وہ مجھ سے ایسی باتیں نہ کرے۔ مارٹی نے وہ آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ میں اُسے کیا بتاتا کہ وہ آنکھیں راستے بھر میرا تعاقب کرتی رہی ہیں۔ بڑی بین کی بڑی بڑی ڈوبی ڈوبی آنکھیں، میں نے یہاں آ کے سب بھلا دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ آنکھیں یہاں بھی مجھ سے دُور نہیں ہوئی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بس چھلکا ہی چاہتی ہیں، میں ان کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے لرزہ سا ہونے لگتا ہے۔ مجھے یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ خود چل آئی تھی اور میں وہاں سے بھاگ آیا۔ مجھے کچھ دیر تو رُکنا چاہیے تھا۔ وہ سوچتی ہو گی۔ میرے جی میں آتا تھا کہ فوراً یہاں سے واپس چلا جاؤں، جا کے ایک بار، صرف ایک بار اُس سے ملنے کی کوشش کروں۔ [میں] نے مارٹی سے معذرت کرنی چاہی تو وہ اور میرے پیچھے پڑ گیا۔

اندھیرا نہیں ہوا تھا لیکن سبزہ زار کے تمام قمقمے روشن کر دیے گئے تھے۔ اُس وقت وہاں سبھی موجود تھے۔ چائے کے بعد کانتے نے چاندی کی منقش ڈبیا اور چمکتا ہوا رنگین بٹوا نکالا تو سب حیران رہ [گئے]۔ ڈبیا میں پان بھرے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً انھیں حویلی سے لایا ہو گا۔ اس سے پہلے کہ بٹھل اور پیرو کی آنکھوں میں سُرخی آتی، کانتے نے خود وضاحت کر دی کہ چلتے وقت اُس نے کسی خادم سے پان کی فرمائش کی تھی۔ خادم اندر سے واپس آیا اور اُس نے یہ ڈبیا اور بٹوا اُس کے حوالے کر دیا۔ کانتے نے لَوٹانا چاہا لیکن خادم نے انکار کر دیا کہ راستے میں پانوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کانتے نے سب کو چاندی کے ورق میں لپٹا ہوا ایک ایک پان کھلایا۔ ابا جان اور منیر علی نے بھی منع نہیں [کیا]۔

مارٹی منتظر ہی بیٹھا تھا کہ سب ذرا فراغت سے بیٹھیں گے تو وہ زبان کھولے گا۔ سب ٹانگیں پھیلائے سستا رہے تھے۔ ٹنگو ابھی تک بٹھل کے پیر دبا رہا تھا اور بٹھل حُقے کی نے مُنہ میں لگائے جانے کس خیال میں گُم تھا کہ مارٹی کی آواز پر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ مارٹی نے لُقمی چباتے ہوئے ابا جان کو بتایا کہ اس دوران کئی آدمی اُن سے ملنے آئے۔

"کیا بولتا ہے رے!" بٹھل نے دھمکتی آواز میں پوچھا۔

"مارٹی رٹ پٹا گیا" تم لوگ کے جانے کے اگلے دن ہی وہ ادھر آیا۔ ایک بڑی [عمر کا]، دوسرا بیچ کا۔ دونوں اپن کو ٹھیک ٹھاک ہی لگتا تھا۔ دادا بولتا تھا بابا سے ملنے کا ہے۔"

"کھل کے بول رے!" بٹھل نے درشتی سے کہا۔

"میرا نام لے رہے تھے؟" ابا جان نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہی نام جو آپ نے اُدر ہوٹل میں لکھایا تھا۔"

"اکبر علی خاں! کیا وہ ہوٹل کے آدمی تھے؟"

"اپن نے پوچھا تھا" مارٹی سہمی ہوئی آواز میں بولا "پر وہ لوگ بولا کہ بابا سے خاص کام ہے۔ اپن نے پوچھا، کون سا کام؟ بولا اُنھی کو بولنے [کا]۔ اپن بولا، وہ ادھر شہر میں نئیں ہے۔ آئے گا تو ایک دم بولے گا۔ [تیسر]ے دن شام کو پھر آیا۔ تیسرے دن پھر اور لوگ آیا۔"

"اور لوگ!" بٹھل نے تندی سے پوچھا "اور لوگ کون؟"

"وہ دوسرا تھا دادا! وہ بھی ایسا ہی بولتا تھا، پھر دونوں کا آنا [بند ہو گ]یا۔ ابھی تین دن پہلے پھر ادھر کو آیا تھا، پہلے والا۔" مارٹی نے کسمساتے [ہوئے] بتایا کہ اُس نے اُن کی ٹوہ لینے کی بہت کوشش کی لیکن وہ [ٹا]لتے رہے کہ انھیں صرف ابا جان سے کام ہے اور کوئی ایسی بات [نہیں] ہے، وہ پھر آ جائیں گے۔ پہلے دن اُس نے چائے وغیرہ سے اُن [کی تواض]ع کی تھی، انھوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران مارٹی سے [اُن] کی سکونت وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ مارٹی کے بقول اُس نے [کوئی وا]ضح بات نہیں بتائی۔ دیکاجی ہوٹل کے رجسٹر میں ابا جان نے اپنے [جو کو]ائف درج کرائے تھے، اُسے اُن کا خیال تھا۔ مارٹی نے اُن کے سامنے [اُ]ن کے اظہار میں ممکنہ طور پر اجتناب ہی کیا تھا۔ جس طرح وہ نرمی و شگفتگی سے [با]تیں کرتے رہے تھے، مارٹی نے بھی اُن سے یہی کچھ سلوک کیا تھا۔ پیرو [کے پو]چھنے پر اُس نے بتایا کہ دونوں کے حلیے عام حیدرآبادی لوگوں جیسے [تھے۔ و]ہ کم از کم اڈّے سے وابستہ لوگ معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن [با حیثی]ت پھرت کے آدمی نظر آتے تھے، تیز طرّار، مفاہمت پسند اور [باتوں ہی با]توں میں اُڑانے والے۔ مارٹی کہنے لگا۔ اُسے سادہ لباس [پولیس ک]ا شک بھی ہوا تھا لیکن اُن کی وضع قطع پولیس والوں سے بہت [مختلف ت]ھی۔

سب کو چُپ لگ گئی تھی۔ بات اتنی سادہ نہیں تھی جتنی سادگی [سے م]ارٹی نے کہہ دی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ لہجے کا اضطراب چھپانے [میں ناکا]م رہا تھا۔ ہمارے آنے کے اتنی دیر بعد اُس کا زبان کھولنا ہی [اُس کے] اضطراب کی غمازی کرتا تھا۔ مارٹی سب کی نگاہوں کا ہدف بنا ہوا [تھا اور] کسی مجرم کی طرح پلکیں پٹ پٹا رہا تھا۔ پیرو نے شامو، جمرو اور

ٹنگو سے پوچھا تو انھوں نے مارٹی کے بیان کی تائید کے سوا کوئی نئی بات نہیں بتائی۔ دیکاجی ہوٹل میں ابا جان نے جو نام درج کرایا تھا، اُس کا علم ہوٹل والوں اور نواب حشمت کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ بعد میں بڑے نواب کی حویلی میں جانے کے بعد بھی ابا جان نے اس نام میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ بڑے نواب اور نواب حشمت جنگ ہی کے پاس سے وہ آ رہے تھے۔ اتنی بات سب کی سمجھ میں آ رہی ہو گی کہ ابا جان کے اس بدلے ہوئے نام کا علم ابھی تین جگہوں سے ہو سکتا ہے۔ ہوٹل والوں کا کوئی معاملہ ہوتا تو وہ مارٹی سے بھی سلسلہ جنبانی کر سکتے تھے کیونکہ وہ بھی ابا جان کے ساتھ وہیں مقیم رہا تھا۔ مارٹی کے بقول ابا جان تمام ادائی کر کے چلے تھے اور اُن کے پاس نواب حشمت جنگ کی آمد و رفت کی وجہ سے یوں بھی ہوٹل میں انھیں محترم مہمانوں کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے منتظمین کے لیے شاید یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہو کہ رُخصت کے وقت نواب حشمت جنگ کی گاڑی ابا جان کو وہاں سے لینے آئی تھی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو حویلی میں اُن کی واپسی تک ہوٹل والے کچھ تحمّل کر سکتے تھے، اور بات بھی کیا ہو سکتی تھی۔

مارٹی نگاہ کا بھی اتنا کمزور نہیں ہے۔ اُسے کوئی ایسا گمان نہیں تھا کہ اُس نے ہوٹل میں آتے جاتے ہوئے اُن لوگوں کو بھی دیکھا ہو جو ابا جان کو پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ ہمارے جانے کے دوسرے دن اُن کے آنے سے ظاہر تھا کہ انھیں بڑے نواب کے ہاں ہماری منتقلی کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ گویا نواب حشمت جنگ اور بڑے نواب تک اُن کی رسائی نہیں تھی لیکن ایک اور جگہ بھی تھی جہاں ابا جان نے اپنا ہوٹل والا نام دہرایا تھا۔ نواب حشمت جنگ کے توسّط سے یہ حویلی خریدتے وقت انھیں حویلی کے مالک کو بھی یہی نام بتانا چاہیے تھا۔ گو منتقلی کے کاغذات کی تکمیل ابھی نہیں ہو پائی تھی کیونکہ درمیان میں نواب حشمت جنگ جیسا صاحبِ حیثیت آدمی تھا لیکن تکمیل کا مرحلہ آ جاتا تو بھی ابا جان کو اُسی نام سے منتقلی کے کاغذات تیار کروانے پڑتے جس سے وہ خود کو متعارف کرا چکے تھے۔ حویلی کے سابق مالک نے حویلی کی فروخت کے لیے کئی معقول پیش کشیں ناپسندیدہ خریداروں کی وجہ سے مسترد کر دی تھیں۔ ابا جان اُسے پسند آ گئے تھے۔ اس میں ابا جان کی ذات کو کم، نواب حشمت جنگ کی سفارش کو زیادہ دخل تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والوں کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہو جو حویلی کی خریداری میں پہلے ناکام ہو چکے تھے اور اب حویلی ابا جان کی تحویل میں آ جانے کے بعد وہ انھیں بڑی پیش کش کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ کاش ایسا ہی ہو لیکن دوسری بات میری طرح بٹھل، پیرو اور ابا جان کے ذہن میں بھی کلبلا رہی ہو گی کہ آنے والوں کا مقصد اس کے سوا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

یہاں آتے ہوئے راستے میں بتھل نے اباجان سے کہا تھا کہ ہم دو ایک دن قیام کے بجائے اگر فوراً روانگی کا ارادہ کر لیں تو کیا حرج ہے۔ اباجان نے جواب میں کئی پہلوؤں پر بتھل کو توجہ دلائی تو وہ بھی چپ ہو گیا۔ اباجان نے اُس سے کہا تھا کہ اُنھوں نے بوجوہ یہ عجلت مناسب نہیں سمجھی۔ اُن کے خیال میں روانگی کے لیے کسی جلد بازی کا اظہار اُس خوش اسلوبی کے منافی تھا جس کا وہ بڑے نواب کی حویلی میں ہر مرحلے پر خیال رکھتے رہے تھے۔ وہاں سے آجانے کے باوجود اُنھیں کسی بھاگ دوڑ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا جیسے بس پا بہ رکاب بیٹھے تھے، جیسے بس زنداں سے چھوٹنے کی دیر تھی۔ جو حویلی اُنھوں نے خریدی تھی، اُس کے جواز اور بھرم کے طور پر بھی اُنھیں ایک دو دن وہاں ٹھیرنا چاہیے تھا۔ اباجان کو خانم کا خیال بھی تھا جو ابھی تک بڑے نواب کی حویلی میں موجود تھی۔ جب تک وہ وہاں موجود ہے، دونوں نوابوں سے ربط و تعلق کی اُستواری ضروری ہے۔ اُن پر اب تک ہمارا جو تاثر مرتب ہوا ہے بہتر ہے کہ وہی قائم رہے۔ یہ تاثر ہمارے اطمینان اور تحمل کے سبب سے تھا۔ ہمارے بارے میں اُبھرنے والے تمام سوالوں کا جواب ہمارا اطمینان تھا۔ اباجان نے بتھل سے تھکن کا عذر بھی کیا تھا۔ کہا تھا کہ ویسے بھی دو ایک دن آرام کے بعد ہی سفر کرنا ٹھیک رہے گا۔ وہ نواب حشمت جنگ سے آنے والی کل کے لیے ملاقات کا وقت بھی طے کر چکے تھے۔ نواب نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اباجان کے گھر والوں کے لیے چند تحائف پیش کرنا چاہتا ہے۔ اباجان نے منع کیا تھا کہ یہ ان رسوم کا موقع نہیں ہے لیکن نواب حشمت جنگ نے اُنھیں قائل کر دیا تھا کہ زندوں کے لیے تو یہ زندگی رواں ہی ہے۔ کہنے لگے، اگر بتھل پہلے اُنھیں کوئی مشورہ دے دیتا تو وہ اسی نسبت سے بڑے نواب کی حویلی میں حیدرآباد سے اپنی بہ عجلت روانگی کا تاثر دے دیتے۔

دیر تک سب خاموش بیٹھے رہے۔ بتھل مسلسل حُقّہ گڑگڑاتا رہا تھا۔ یک بارگی سٹک مُنہ سے ہٹا کے وہ بڑبڑاتی آواز میں اباجان سے بولا۔ "اُدھر بڑے نواب کے پاس مہاراجا سے تو آپ کی بھینٹ نہیں ہوئی؟"

اباجان کرسی سے اُچھل سے گئے۔ وہ بات جو مجھے کھٹک رہی تھی، بتھل کے سر میں بھی چُبھ رہی تھی۔ اباجان نواب حشمت جنگ کی وہ باتیں شاید بھول گئے تھے جو اُس نے میسور کے ایک دولت مند کے متعلق بتائی تھیں۔ بڑے نواب کی حویلی میں جانے کے دوسرے دن کی بات ہے جب وہاں پہلی بار نواب حشمت جنگ سے اباجان کا آمنا سامنا ہوا تھا اور وہ اُنھیں وہاں دیکھ کے ششدر رہ گیا تھا پھر اُس نے فخریہ انداز میں بڑے نواب کو بتایا تھا کہ وہ نادر ہیرا اباجان ہی کا عطیہ تھا۔ ہیرے کی قدر و قیمت کی سند کے طور پر اُس نے مہاراجا دھرم ویر کا ذکر کیا تھا۔ مہاراجا کو کسی طرح یہ سُن گُن مل گئی تھی کہ نواب حشمت جنگ کی تحویل میں ایک بیش بہا ہیرا آیا ہے۔ مشہور ہے کہ مہاراجا دھرم ویر ہیروں کی خوشبو سونگھ لیتا ہے۔ بہرحال نواب حشمت جنگ کو اندازہ تھا کہ کس ذریعے سے مہاراجا کو ہیرے کی خبر پہنچی ہوگی۔ نواب حشمت جنگ سے ضبط نہیں ہوا تھا۔ اُس نے اپنے ایک ہم رُتبہ نواب کو کہیں یہ ہیرا دکھا دیا تھا، نواب پتھروں کی پرکھ میں ایک حیثیت رکھتا تھا، اُسی جوہر شناس نے مہاراجا کے ذوق و شوق کی آگ بھڑکائی تھی، سُن کے مہاراجا ایسا بے چین ہوا کہ نواب حشمت جنگ کے پاس آ کے ہیرے کی دید کے لیے اصرار کرنے لگا۔ نواب حشمت کے بقول، وہ اُسے دیکھ کے گُنگ رہ گیا تھا۔ اُس کا عالم دیدنی تھا۔ اُس کی آنکھوں کی خیرگی اور جلتا ہوا چہرہ دیکھ کے نواب کو بہت لُطف آیا تھا۔ مہاراجا نے اُسی وقت اباجان سے متعارف کرانے کے لیے اُس سے درخواست کی تھی جسے نواب ٹال گیا تھا۔ اُس کے بیان کے مطابق یہیں تک بات ٹھیک تھی اور وہ اپنے مربّی اباجان کا پتہ بتا کے اُنھیں کسی اُلجھن میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ہیروں کے شوق کے معاملے میں مہاراجا کی دیوانگی کا اُسے خوب علم تھا۔

بتھل کی زبانی مہاراجا کا نام سُن کے اباجان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اُنھوں نے اقرار کیا کہ دفن کے روز تو نہیں لیکن پرسوں کے روز مہاراجا دھرم ویر سے اُن کی ملاقات ہوئی تھی۔ "مگر مگر، وہ ایک نہایت رسمی ملاقات تھی۔" اباجان نے بہکی بہکی آواز میں کہا۔ "مہاراجا کو خاں صاحب نے مجھ سے متعارف کرایا تھا۔ مہاراجا نے مجھ سے ملنے کی خوشی کا رسمی اظہار کیا اور بس، اُس نے کوئی اور بات نہیں کی۔"

بتھل سر ہلانے لگا۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں آنے والے اُن لوگوں کا تعلق مہاراجا دھرم ویر سے تھا مگر اُنھیں یہاں ہماری حویلی کے متعلق؟" اباجان تذبذب سے بولے۔ "مہاراجا نے جیسا کہ نواب حشمت جنگ بتا رہے تھے، کسی قسم کے اشتیاق کا اظہار نہیں کیا بلکہ اُسی دن نواب حشمت جنگ کی زبانی مہاراجا کے ذکر سے اگر کوئی تکدّر ذہن پر چھایا تھا تو مہاراجا سے ملاقات کے بعد وہ چھٹ گیا تھا۔ اُنھوں نے اشارۃً بھی اس بابت ایک لفظ نہیں کہا۔"

"وقت سیدھا نہیں تھا بابا!" بتھل نے سرد مہری سے کہا۔ "اور پتہ کھوجنا کون سا جوکھم کا کام ہے۔ نواب نہیں بول رہا تھا تو اُس کا موٹر چلانے والا پورب پچھم جانتا تھا۔ اُدھر کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں، ہاں۔" اباجان نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔ "مگر ٹھیک ہے، آنے دیکھیے۔ اگر یہی صورت ہے تو ہم اُن سے معذرت کر لیں گے۔ جہاں تک میرا قیاس ہے، مہاراجا ایک معقول اور بردبار آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

بتھل کو اب یہ باور کرانے سے کیا حاصل تھا کہ یہاں حویلی میں ... کی مسلسل آمد ہی مہاراجا کی بے چینی کی مظہر ہے اور آنے والوں کا ... رانہ انداز ہی مہاراجا کی شدّتِ شوق کی علامت ہے۔

"مگر مارٹی کا کہنا ہے کہ تیسری مرتبہ آنے والے آدمی دوسرے تھے۔" ... کچھ توقف کے بعد بے تابی سے بولے۔

"آدمیوں کی کمی ہے اُن کے پاس!" بتھل نے سپاٹ لہجے میں ... ہو سکتا ہے کہ اُن کی ڈوری کسی دوسری طرف سے کھینچی گئی ہو۔"

"دیکھ لے گا اُستاد! ابھی دیکھتا ہے۔ اپن کے ہوتے میں کون آتا ... کیا بولتا ہے سالا!" پیرو نے بہ ظاہر بے پروائی سے کہا۔

"ایسا کیا مسئلہ ہے۔" منیر علی نرمی سے بولے۔ "کوئی ملنا چاہتا ہے ... جائے۔ بخدا میری عقل سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس قدر وہم و تردّد ... ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حسّاسیت اعصاب شکنی کے سبب ہے۔ ہم سب کو ایک رات مکمل آرام کرنا چاہیے۔ اُن کی دوبارہ آمد ... قسم کی قیاس آرائی مجھے تو فضول معلوم ہوتی ہے۔"

کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو منیر علی نے بھی چُپ سادھ لی۔ سبزہ زار ... بڑھ گئی تھی۔ ابھی اندھیرا اتنا گہرا نہیں ہوا تھا مگر اوس پڑنے لگی ... بھی نہیں بجے ہوں گے۔ پیرو کے مشورے پر سب اندر چلے آئے۔ ... زدرا، شامو، جمرو، کانتے اور ڈنگو وہاں بیٹھے ایک دوسرے کی صورت ... ہے، پھر یکے بعد دیگرے اُٹھ اُٹھ کے باہر جانے لگے۔ میں بھی اُٹھنے ... کر رہا تھا کہ مارٹی بھاگتا ہوا آیا اور اُس نے تیز سانسوں سے اباجان ... کہ وہی دونوں آدمی پھر آئے ہوئے ہیں۔ اباجان نے کوئی جواب دینے ... پہلے اضطراری نگاہوں سے بتھل کی طرف دیکھا۔ بتھل نے مارٹی کو ... کر دیا۔ اباجان کرسی پر پہلو بدل رہے تھے۔ میں بھی سیدھا ہو کے بیٹھ ... اُنھیں اندر آنے میں کوئی دیر نہیں لگی۔ اِدھر مارٹی باہر گیا، اُدھر ... شیروانیوں میں ملبوس، پکّی عمر اور پکّی سانولی رنگت کے دو آدمی نیچے ... سے اندر داخل ہوئے۔ ایک لمبا چھریرے جسم کا، دوسرا اوسط قد ... ہوئے جسم کا تھا۔ دونوں ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ شکل و صورت ... معتبر لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ وہ اباجان کو نہیں پہچانتے تھے اس ... کے بعد اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اُنھوں نے شائستگی سے اباجان ... پوچھا۔ اس سے پہلے کہ اباجان کوئی جواب دیتے، بتھل نے ... آواز میں اُن سے کہا۔ "کام بولو صاحب!"

چھریرے جسم کے آدمی نے مضطرب انداز میں اپنے ساتھی کی جانب نظر کی پھر متانت سے بولا۔ "ہمیں جناب اکبر علی خاں سے کچھ کام ہے۔"

"فرمائیے۔" اباجان نے بہ عجلت کہا، بتھل کو نہیں بولنے دیا۔

"کیا ہم اپنے معزز مطلوب ہی سے مخاطب ہیں؟"

"کہیے، کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اباجان نے اُکھڑی ہوئی آواز میں کہا۔ "جناب سے ایک درخواست کرنی ہے۔" اُس شخص نے روانی سے کہا۔

"کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"یہیں شہر سے۔" وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "ہم اپنا تعارف کرانا تو بھول ہی گئے۔ ہم دونوں دوست بھی ہیں اور کاروباری شریک بھی۔ خادم کو محمود علی کہتے ہیں۔ میرے رفیق کا نام قطب الدین ہے۔"

"جی، جی۔" اباجان نے اٹکتے لہجے میں کہا۔ "مگر اس فقیر سے جناب کو کیا کام ہے۔ ہمیں آج رات کچھ اور مصروفیات بھی ہیں، ہو سکے تو اپنا مدّعا جلد بیان کر دیجیے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے آپ کو پہلے کبھی دیکھا ہو۔"

"بلاشبہ، جناب نے ہمیں پہلے نہیں دیکھا۔" وہ شستگی سے بولا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ ہم نامناسب وقت پر آئے۔ اگر ایسی کوئی مصروفیت ہے تو ہم کل کسی وقت آ جائیں گے۔"

"کل کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" اباجان نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بہرحال ابھی اتنا وقت ہے کہ میں آپ سے بات کر سکوں، آپ فرمائیے۔"

"جی" وہ جھجکتے ہوئے بولا "کیا ہی اچھا ہو کہ ہمیں چند لمحوں کے لیے خلوت میسر آجائے" یہ کہتے ہی وہ ہماری جانب دیکھتے ہوئے ندامت سے بولا۔ "آپ حضرات کو یقیناً زحمت ہو گی لیکن ہمارا خیال ہے، ہم خلوت میں قبلہ سے اپنا مدعا مناسب طور پر گوش گزار کر سکتے ہیں۔"

"نہیں" ابا جان نے کوئی توقف کیے بغیر جواب دیا "اس کی ضرورت نہیں۔ اِن سب کو میرا رفیقِ کار سمجھیے۔"

مارٹی دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ کاتتے بھی آگیا تھا۔ بتھل نے ہم تینوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں خاموشی سے چلے گئے۔ منیر علی خود بخود اٹھ گئے، کسی نے اُنھیں روکا بھی نہیں۔ بتھل نے مجھے بھی اشارہ کیا تھا لیکن میں اپنی کرسی پر جما رہا۔ کمرے میں ہم چاروں ہی رہ گئے تھے۔ ابا جان، پیرو، بتھل اور میں۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے" گٹھے ہوئے جسم کے شخص قطب الدین نے پہلی مرتبہ زبان کھولی اور مودب لہجے میں بولا "جناب بجا فرما رہے ہیں لیکن ہماری گزارشات کے بعد ہی سب کو شریک کیا جائے تو بہتر ہے۔"

"آپ بولو صاحب!" بتھل نے بھن بھناتی آواز میں کہا "ہم لوگ الگ کوئی بات نہیں کرتے۔ بعد کو دوبارہ اِن کے لوٹانے سے اچھا ہے کہ آپ ہی کی زبان سے ہم سُن لیں۔ گھبراؤ نہیں صاحب! بولو۔"

"نہیں، نہیں، گھبرانے کی ایسی کیا بات ہے۔" لمبے آدمی محمود علی نے قدرے ترشی آمیز شائستگی سے کہا "ظاہر ہے، یہ تو جناب پر منحصر ہے کہ وہ آپ حضرات سے بعد میں مشورہ کرتے ہیں یا نہیں۔ ہماری تو عرض اتنی ہے کہ یوں ہمیں اپنا مدعا بیان کرنے میں کسی حد تک سہولت ہو جائے گی۔"

"اپنے کو ساتھ سُننے میں آسانی ہو گی۔" بتھل نے نسبتاً اونچی آواز میں کہا "جو بولنا ہے صاحب! صاف بولو۔"

"جیسی آپ کی مرضی" قطب الدین کی پیشانی شکن آلود ہو گئی لیکن فوراً وہ مفاہمانہ انداز میں بولا "جیسا کہ ہم نے آپ کو بتایا، ہم کاروباری آدمی ہیں اور اپنی طرف سے کاروبار کے آداب و اصول کی پابندی کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ بات کچھ آگے بڑھے گی تو جناب کو خود اندازہ ہو جائے گا۔"

"بولو صاحب! کام کی بات بولو۔" بتھل نے تند لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔" قطب الدین سنبھل کے بولا اور اپنے ساتھی محمود علی سے کہنے لگا "کیوں محمود بھائی! آپ ہی بات شروع کیجیے۔"

"بہتر ہے" محمود علی نے سانس لے کے کہا "اصل میں اپنے اجنبی ہونے کی رکاوٹ آڑے آتی ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ ہمارا کوئی ریفرنس، حوالہ آپ کے سامنے نہیں ہے۔ ایسے میں ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ کسی معاملت سے پہلے آپ ہمارے بارے میں اچھی طرح چھان بین کر لیجیے۔"

"اپن لوگ ایک دم سیدھا بات مانگتا ہے۔" پیرو نے تلخ

"ہماری بھی یہی خواہش ہے کہ ہم دو ٹوک انداز میں بات محمود علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پر آپ تو ابھی ایک ٹوک بھی پورا نئیں بول رہا۔"

میرے کان اُنھی کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ابا جان کی آنکھ جل بجھ رہی تھیں۔ ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ معاملت سے دونوں کی کیا مراد ہے۔ کاش وہ اس حویلی کی خریداری کے سلسلے میں ہوں لیکن پھر اُنھیں اِدھر اُدھر کی اتنی باتیں کرنے کی کیا ضرورت پیرو کی بات سُن کر دونوں ہنس پڑے "کیا خوب کہا ہے" محمود علی نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے جناب کا تعلق بمبئی شہر سے ہے۔"

"اپن بمبئی کا دادا ہے، نمبر ایک دادا۔ ابھی کچھ اور بتائے"

"نہیں جناب!" محمود نے سنجیدگی سے کہا "معاف کیجیے، آپ تو" اپنے ساتھی کے ٹوکنے پر وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ قطب نے فوراً نرم لہجے میں کہا "میرا خیال ہے، ہمیں اصل مقصد پر آجا میں ہی بیان کرتا ہوں۔ براہِ کرم میری طرف توجہ دیجیے اور یہ ہے کہ پہلے میری بات پورے طور پر سُن لیجیے۔ صورت یہ ہے ج وہ ایک لمحے ٹھہر کے بولا "ہم نوادر کا کاروبار کرتے ہیں۔"

میری نگاہیں بے اختیار ابا جان پر منڈلانے لگیں۔ ان کا تمتما رہا تھا اور اُنھوں نے اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔

قطب الدین کے لہجے میں پہلے جیسی لچک نہیں تھی۔

"ہمیں اپنے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جناب کے پاس اعلا قسم موجود ہیں، خصوصاً نادر پتھروں کی شکل میں۔ ابھی سے کچھ کہنا لیکن ایک بار ہماری خدمات حاصل کر کے دیکھیے، انشا اللہ آپ کو کوئی شکایت نہ ہو گی۔ یہاں ریاست میں ہمارا کام یہی ہے کہ اِدھر سے نوادر اکٹھے کر کے صاحبِ ذوق حضرات کی خدمت میں پیش ہم اپنی اس خدمت کا معاوضہ دو صورتوں میں وصول کرتے ہیں۔ باقاعدہ خریداری کی صورت میں، اگر معاملہ ہماری بساط کے مطابق ہم خود سودا طے کر لیتے ہیں۔ دوسری شکل، موصولہ قیمت پر اور مقررہ کمیشن کی ہے۔ یعنی ہماری کوشش سے نوادر کی جو رقم ہو گی، اُس میں ہمارا حصہ۔ جو بھی خوش اسلوبی سے ہمارے آپ کے طے پا جائے۔ نوادر کا معاملہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہر کسی آنے والے پر اعتبار کر لیا جائے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ لوگ بہت ٹھوک بجا کے معتبر آدمی ہی سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ یہاں شہزادگان، نوابین اور صاحبِ ثروت حضرات کی ایک بڑی فہرست ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا ذکر آدمی رہ جاتا ہو جو ہم سے اور ہمارے کام سے واقف نہ ہو۔ یہ ایک ف اور سیدھا کام ہے۔ ہماری حیثیت درمیان کے آدمی کی بھی ہے باقاعدہ اہلِ معاملہ کی بھی۔ غالباً ہم نے اپنے منشا کی وضاحت ی ہے۔"

"ابھی اپن کچھ بولے" جیسے ہی وہ چُپ ہوا، پیرو نے کہا۔

"جی ہاں، لیکن، لیکن" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "ایک بات رہی ا ہے۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے اتنی توجہ اور تحمل سے ہماری گزارش ۔ نوادر کے سلسلے میں ہمیں اکثر ایسے حضرات کے پاس جانا پڑتا ہے سے پہلے کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ اُن میں قسم قسم کے لوگ ہوتے ۔ ایسے لوگ جنھوں نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کوئی کام کی چیز کھوج ۔ ایسے لوگ جنھیں اتفاقاً یا قسمتہً کچھ مل گیا ہو اور، اور برسبیلِ تذکرہ ا ہے۔" اُس نے کسماتے اور مسکراتے ہوئے کہا "ہمیں ایسے لوگوں بھی واسطہ پڑتا ہے، کسی اور طرح بعض نوادر جن کے ہاتھ آ گئے۔" قطب الدین نے فوراً معذرت چاہی اور تیزی سے بولا "عرض یہ ر چیز چاہے کسی بھی ذریعے سے آئی ہو، رازداری کا خیال فطری ہے، بھی کبھی یہ احتیاط حد سے گزر جاتی ہے، غیر ضروری ہو جاتی ہے ی چیز اچھے ہاتھوں تک نہیں پہنچ پاتی۔ مثلاً کوئی چیز دیکھ کے تر آدمی کی نشان دہی کر سکتے ہیں کہ کہاں اُس کی صحیح قیمت وصول یقین کی کوئی جرأت تو بہرحال کرنی پڑتی ہے۔ ہم اپنی جانب سے ہہ سکتے ہیں کہ رازداری پر ہمارے کاروبار کا دار و مدار ہے اور یک گھسی پٹی بات کہ آزمائش شرط ہے، آپ ہمیں صرف ایک بار ضرور دیں۔"

"آپ اپنے کو کون سے لوگ میں جانتے ہو؟" بتھل نے آہستگی لہا۔

"جناب! جناب! خدا کے لیے دل پہ کوئی میل نہ لایئے۔ ہم نے تذکرۃً ایک حقیقت عرض کی تھی کہ کیسے کیسے لوگوں سے ملنے کا ہوتا ہے اور اُن کے دل میں اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے ہمیں کیا ئز کرنے پڑتے ہوں گے۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں ذریعہ جاننے ی دل چسپی نہیں ہوتی۔ ہمارے لیے چیز کی اہمیت ہوتی ہے اور اُس کی جس کی تحویل میں ہے، لوگوں کو دیکھتے دیکھتے اور یہ کام کرتے کرتے بھی عمریں گزر گئی ہیں۔ تھوڑی بہت آدمی کی پہچان ہو گئی ہے۔ ندبات نظر آتی تو ہم دوسری طرح بات کرتے۔"

"پھر کس طرح کا بات کرتا؟" پیرو نے تنک کے کہا۔

"وہ تو صاحب دوسرے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ آدمی دیکھ کے بات کی جاتی ہے۔" قطب الدین کے بجائے محمود علی نے کتراتے ہوئے کہا۔

"اگر اپن بولے کہ اپن وہی دوسرا لوگ ہے۔"

"جی، جی! آپ ضرور بُرا مان گئے۔"

"نئیں نئیں، ابھی بولو، پھر آپ کیسا بات کرے گا۔"

"بات پہلے سے طے نہیں ہوتی جنابِ والا!" قطب الدین نے کہا

"آپ یقیناً مذاق کر رہے ہیں۔" محمود علی بولا۔

"اپن ایک دم ٹھیک بولتا ہے۔"

"لگتا ہے، گلی کوئی بھٹک گئی ہے۔ رستے میں کوئی ایک دیدے والا ٹکرا گیا تھا کیا؟" بتھل نے سرد لہجے میں کہا "اِدھر تلے اپنے سوا کچھ بھی نئیں ہے، اور اس میں بھی اپنے کو تھوڑا شک ہے۔"

"ہم دیکھ بھال کے آئے ہیں جناب!"

"آپ اِس قدر وثوق سے کیوں کہہ رہے ہیں؟" ابا جان نے برہمی سے کہا۔

"جناب! عرصہ ہو گیا ہے اس دشت کی سیاحی میں۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"دیکھیے" وہ لجاجت سے بولا "ہمیں ایک بار کچھ ثابت کرنے کا موقع ضرور دیجیے۔"

"ہم ابھی کیا بولا۔ آپ ایک گلی بیچ میں چھوڑ کے آگیا ہے۔ ادھر کس نے بھیجا ہے آپ کو؟"

"ہمارے اپنے ذرائع ہیں۔ شہر میں نوادر کی نقل و حرکت ہو، کوئی نئی چیز آئے اور ہمیں خبر نہ ہو۔"

"آپ تو اپن کو پولیس کا آدمی لگتا ہے۔"

"لعنت بھیجیے پولیس پہ حضت" محمود علی نے بے ساختہ کہا۔

"پولیس میں ہی ایسا کھوجی لوگ ہوتا ہے۔"

"اسی کھوج سے ہمیں آج ریاست کے سب سے بڑے نوادر فروش کی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ پولیس کھوج لگا کے ہتھ کڑیاں ڈال دیتی ہے۔ ہم اس کے برعکس کرتے ہیں، ہاں ہم سونے کی ہتھ کڑی پہنا دیتے ہیں۔"

"ابھی آپ کیا پیے گا، شربت، چائے یا کھانا منگوائے؟"

"شکریہ، بہت مہربانی آپ کی۔"

"نئیں نئیں، ابھی آپ بولو، آپ کی کیا خاطر کرے۔ ابھی کچھ اور نہیں آیا ہے تو ایدر سے کچھ کھا پی کے جائے۔"

"اِس کے لیے تو وقت پڑا ہے جناب! کھائیں گے، پئیں گے

بھی بلکہ جناب سے غریب خانے کو عزت بخشنے کی درخواست بھی کریں گے۔"
ابھی وہ یہ کہہ رہا تھا کہ ملازم کو اندر داخل ہوتا دیکھ کے چپ ہو گیا۔ دونوں ملازموں نے چائے اور ... کا دیگر سامان وغیرہ اُن کے سامنے کی میز پر سجا دیا۔ "یہ آپ نے کیا زحمت کی۔" قطب الدّین نے خوش اطواری سے کہا۔ "یوں بھی آپ کو دیر ہو رہی ہو گی۔"

"اپن نے سوچا، ابھی آپ کو تھوڑا نمک کھلا دے۔"

"اوہ، اوہ" قطب الدّین کھل کھلانے لگا۔ "بے شک بے شک، انشا اللہ حق ہی ادا کیا جائے گا۔ ایک ضروری بات شاید ہم کہہ نہ سکے۔ آپ کے اطمینان کے لیے عرض ہے، آپ چاہیں گے تو بڑی سے بڑی ضمانت بھی پیش کی جا سکتی ہے۔"

"نمک سے بڑا ضمانت ابھی اور کیا ہوئے گا۔"

"آہا ہا۔" قطب الدّین اُچھل گیا۔ "آپ نے کیا خوب کہا ہے۔"

"ایک بات پوچھے؟" پیرو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اپن لوگ شکل سے ابھی کیا لگتا ہے؟"

"جی!" دونوں گھبرا گئے۔ "کیا فرما رہے ہیں آپ؟"

میری رگوں میں خون جل رہا تھا۔ پیرو یہ کیسی باتیں کر رہا ہے، بتّھل بھی اُسے نہیں ٹوکتا، صاف صاف بات کرتے ہوئے منہ کیوں چھوٹ رہا ہے۔ ممکن تھا، پیرو کی زبان سے کوئی اور بات نکل جاتی کہ میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمیں اب معذرت کر لینی چاہیے۔"

"ہاں ہاں۔" بتّھل بس سر ہلا کے رہ گیا۔

میری دخل اندازی پر پہلی بار اُنھوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ "ہمیں احساس ہے۔" محمود علی نے جیبی گھڑی ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "ہم پھر آجائیں گے۔ اجازت ہو تو کل آجائیں؟"

"کل سے کیا فرق پڑے گا۔" ابّا جان ترش روئی سے بولے۔ "اگر یہی کام ہے تو آپ کا آنا لاحاصل ہے۔"

"اِدھر وقت اکارت کرنے سے اچھا ہے کہ آپ کوئی اور گھر جا کے دیکھو۔" بتّھل نے جمی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہم آپ کو کس طرح یقین دلائیں کہ آپ۔ ۔ ۔"

"اپنے کو سارا یقین ہے، پر ہم کیا بولیں۔"

"ابھی لوٹ کے آئے گا نا۔" پیرو پچکارتے لہجے میں بولا۔ "تو ایسا کوئی چیز کھوج کے آپ لوگ کے لیے ضرور لائے گا۔ آدمی اپن کو آپ کام کا لگتا ہے۔"

"جناب! ہم تو اس وقت کی بات کر رہے ہیں۔"

"اپن کے پاس ایک پرانا چاقو ہے، بولے تو دکھائے؟"

"براہِ خدا جناب کچھ توجہ دیجیے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم یہاں یوں ہی منہ اُٹھائے چلے آئے ہیں، ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے! ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے حال ہی میں کیسا نادر پتھر ریاست کے ایک بڑے آدمی کو دیا ہے۔"

"ایسا!" پیرو حیرت سے بولا۔ "پر آپ کو کیسے پتہ لگا؟"

"اسی ہنر کی روزی کھاتے ہیں جناب!" محمود علی کی آواز کسی قدر اُٹھ گئی تھی۔ "بتائیے کیا ایسا نہیں ہے؟"

"ہے، ایک دم ہے، اپن جھوٹ نہیں بولے گا پر ایسا کس نے آپ کو بولا؟"

"بس یہی ہم سے نہ پوچھیے۔ راز داری ہی پر ہمارے کام، ہماری کامیابی کا انحصار ہے۔ ازراہِ کرم یہ ہم سے نہ پوچھیے۔"

"نئیں، آپ بولو، قسم سے اپن کسی سے نئیں بولے گا۔"

"نہیں جناب! ہمیں مجبور سمجھیے۔"

"ٹھیک ہے اپن بھی مجبور ہے۔"

"ویسے تو ہم کسی کا بھی نام لے سکتے ہیں مگر اس سے نہ آپ کو کچھ حاصل ہو گا، نہ ہمیں۔"

"اپن سوچتا ہے، ابھی اپن نے کسی کو کچھ دیا تو سالا کوئی بیچ میں ٹانگ اُڑانے والا کون ہوتا ہے۔" پیرو کی آواز بھرنے لگی۔

"قطعاً نہیں۔" محمود علی نے عاجزانہ انداز میں کہا۔ "یہ تو آپ کا اختیار ہے، آپ لکھ لٹا دیں اور بقول شخصے لٹا ہی دیا۔ ہماری پیش کش کا مقصد آپ کے معاملات میں دخل دینا نہیں ہے۔ ہم تو ایک مختلف بات کہہ رہے ہیں۔ شاید جناب نے غور نہیں کیا۔"

"اور ایدر اپن نے کیا بولا! ایدر آپ بے کار آیا ہے۔ سمجھا؟ ایک دم بے کار مخول کرنے۔"

"ہمارا خیال ہے، آپ کو سوچنے کے لیے کچھ وقت کی ضرورت ہے۔ کوئی بات نہیں۔" محمود علی یاسیت سے بولا۔

"آپ کیا بولتا ہے۔" پیرو نے بھڑکتے لہجے میں کہا۔ "ایک آدمی کو کچھ دینے کا مطلب ہے کہ اپن دُکان لگائے بیٹھا ہے۔ اپن ایدر مٹھی میں ... بیٹھا ہے کہ اُس کو دیا ہے تو آپ کو بھی دے گا یا اپن سے آپ یہ بولتا ہے کہ واپس لے کے آپ کے آگے ڈال دے۔ ایسا؟"

دونوں مضطرب نظروں سے پیرو کو دیکھتے رہے پھر اچانک اُٹھ گئے۔ اُن کے اُٹھنے کے انداز میں جتنی تیزی تھی، آواز میں نہیں تھی۔ قطب الدّین نے زیرِ لبی سے زحمت کی معذرت چاہی۔ اُنھوں نے نمک پاروں کے دانوں اور چائے پر اکتفا کیا تھا۔ جانے سے پہلے اُنھوں نے سب ...

...یا، محمود علی ٹمٹماتی آواز میں بولا۔ "ہم ایک بار پھر آئیں گے۔"

"اپن کیا بولے۔" پیرو نے منہ بنا کے کہا۔ "آؤ، ضرور آؤ، بار بار ...ؤ۔ اپن ایدر ہی ہے پر ایک بات دھیان سے سن لو۔ لوٹ کے یہی ...لے گا تو ایسا ہی اُلٹا جائے گا۔"

دونوں کے ہونٹ پھڑک کے رہ گئے۔ اُن کے ساتھ دروازے ...ے سبھی باہر نکل آئے تھے۔ چبوترے تک خاموشی رہی۔ سیڑھیاں اُترتے ...تے قطب الدّین ٹھہر گیا اور دبے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "ایک بات ...ان پر آ کے رہ جاتی ہے۔ بہرحال ہمارا فرض ہے کہ گوش گزار کر ...ں۔ یہ ریاست ہے، یہاں کے رنگ ڈھنگ ذرا مختلف ہیں۔ اگر ...تعی کوئی ایسی چیز آپ کے پاس ہے تو احتیاط رکھیے گا۔"

پیرو اُس کے سامنے آ گیا۔ "اپن نئیں سمجھا؟"

"مراد یہ کہ جناب ایک سے ایک بڑا ٹھگ یہاں پڑا ہے۔" قطب الدّین ...بل کھاتی آواز میں کہا۔ "اور ایک سے ایک شوقین، ٹھرک باز۔ گرگے اُن ...ے اِدھر اُدھر بھٹکتے ہی رہتے ہیں۔ آپ یہاں نو وارد ہیں۔ بر بنائے احتیاط ...ش ہے کہ فیصلہ کرنا ہو تو زیادہ دیر نہ لگائیں۔ چرچا کچھ کم نہیں ہے۔"

"ابھی ایدر آپ کو کس نے بھیجا ہے؟" پیرو نے تڑختی آواز ...ں پوچھا۔

"نہیں جناب!" وہ جلدی سے بولا۔ "یہ بدگمانی نہ کیجیے۔"

"پھر آپ ایسا زور کیوں لگا رہا ہے؟"

"شاید اس لیے کہ ہماری اُمید نہیں ٹوٹی ہے۔"

"ایک دم کُتّے کا دُم مافک ہے۔"

دونوں کی آنکھوں میں ایک ثانیے کے لیے آگ سی بھڑکی لیکن ...سرے ہی لمحے محمود علی نے سنبھل کے کہا۔ "جو آپ مناسب سمجھیں، ...ئیں، ہم آپ کے گھر میں ہیں۔"

"ماں قسم ایدر بھی ایسا ہی ہے۔ آپ لوگ گھر میں آیا ہے، اپن بار بار یہی دھیان سالا اٹکتا رہا ہے۔"

"ہماری حیثیت طلب گار کی سی ہے اس لیے ہم آپ سے کوئی ...ج نہیں کریں گے لیکن یقین کیجیے کہ جرح کے لیے ہمارے پاس ...ادتوں کی کمی نہیں ہے۔"

"نئیں نئیں، ابھی آپ سب بول کے جاؤ۔"

محمود علی نے پیرو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تھپکی دی اور ...رلتے، لجاتے لہجے میں بولا۔ "اس کا یہ وقت نہیں ہے۔ آپ تو ناراض ...نے لگے۔ میں آپ سے اپنی اور اپنے ساتھی کی کسی بھی تلخ نوائی کے لیے ...فی چاہتا ہوں۔ ہمیں معاف فرما دیجیے۔"

"آپ کیسا آدمی ہے؟" پیرو نے برہمی سے کہا۔

"کسی وقت بھی آپ کو ہماری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ خوشگوار فضا قائم رہے۔" محمود علی عاجزی سے بولا۔ "اتنی دیر آپ نے وقت دیا، ہماری گزارش سُنی۔ اس کا بہت بہت شکریہ۔ انشا اللہ پھر ملاقات ہو گی۔" یہ کہتے ہی وہ قطب الدّین کا ہاتھ تھام کے نیچے اُتر گیا۔ پیرو آگے بڑھ کے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بتّھل کے اشارے پر ٹھہر گیا۔

"شاید اب نئیں آئے بتّھل بھائی!" کمرے میں واپس آ کے پیرو تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں دادا! ہو سکتا ہے۔" بتّھل کی آواز میں یقین نہیں تھا۔

"اپن نے تو بہت کوشش کیا بتّھل بھائی!"

"اور کیا بول سکتے تھے دادا!"

"میں آپ سے متفق ہوں۔" ابّا جان نے پیرو سے کہا۔ "گمان یہی ہے کہ اب اُنھیں نہیں آنا چاہیے۔ آپ نے اُنھیں کوئی رائے قائم کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اگر وہ کوئی رائے لے کے گئے ہیں تو وہ اُن کی دانست میں مایوس کُن ہی ہو سکتی ہے۔ میں نے اِسی لیے درمیان میں آ کے دخل نہیں دیا تھا۔"

"پر کچھ ٹھیک نہیں ہے بابا!"

اُن کی باتیں سُن کے مجھے احساس ہوا کہ میں نے اچھا ہی کیا جو خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے یہی حیرت تھی کہ بتّھل پیرو کی یہ طول بیانی، فضول گوئی کیوں برداشت کر رہا ہے۔ ابّا جان ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ وہ لوگ بہت منتشر رائے لے کے گئے ہوں گے۔ ابّا جان اور بتّھل فوراً سمجھ گئے، وہ صاف اور سیدھی بات جانے کیوں میرے دماغ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں تو کئی بار پیرو کو ٹوکتے ٹوکتے رہ گیا تھا۔

"ابھی یہ کیدر سے آسکتا ہے؟" پیرو نے تردّد سے پوچھا۔

"کوئی نواب راجا ہی ہو گا۔" بتّھل نے حقّہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"اُسی مہاراجا کی طرف ابھی تمھارا دھیان جاتا ہے؟"

"اور بھی ہو سکتا ہے دادا!"

"ہاں اپن بھی کچھ یہی سوچتا ہے بتّھل بھائی!" پیرو منمناتے ہوئے بولا۔ "کبھی اپن کے سر میں ایک دم اندھیرا بھر جاتا ہے۔ اپن کے من میں ایک اور بات آتا ہے۔ سوچتا ہے تو اپن کا سر گھوم جاتا ہے۔"

"کیا دادا؟" بتّھل نے سر اُٹھا کے پوچھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" ابّا جان نے تجسّس سے کہا۔

"کچھ نئیں، اپن ابھی کچھ نئیں بولے گا۔"

"بتائیے نا۔"

"کیا بولے بابا!" پیرو نگاہیں چرانے لگا۔

"کیا بات ہے دادا؟" بھٹل نے چونک کے پوچھا۔

پیرو چپ رہا۔ جب ابّا جان نے بہت اصرار کیا تو اُس نے سر جھکا کے بہ مشکل تمام اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ابّا جان گنگ ہو گئے۔ بھٹل بھی اُسے گھورنے لگا۔ مجھے بھی پیرو کی صحیح الدماغی پر شبہ ہونے لگا تھا۔ پیرو نے ہکتی اٹکتی زبان سے نواب حشمت جنگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اُس کا قیاس تھا کہ کہیں یہ آدمی نواب حشمت جنگ کی طرف سے نہ بھیجے گئے ہوں۔ ابّا جان نے شدومد سے تردید کی تو پیرو شرم سار سا ہونے لگا، ندامت زدہ لہجے میں بولا کہ اُسے خود بھی یقین نہیں ہے، کاش یہ اُس کا وہم ہی ہو لیکن اُس نے آدمی کے اتنے چہرے، اتنے رُوپ دیکھے ہیں کہ معدودے چند لوگوں کے سوا اب اُسے مشکل سے کسی شخص پر اعتبار آتا ہے۔ ابّا جان کسی حد تک برافروختہ ہو گئے تھے۔ کہنے لگے کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اُنھوں نے پیرو کو نواب حشمت جنگ کی ایک ایک بات یاد دلائی۔ اُس کی عزت و تکریم، اُس کی سپاس گزاریاں اور رُخصت کے وقت اُس کی آنکھوں میں نمی وغیرہ وغیرہ۔ کہنے لگے کہ پھر ہماری عدم موجودی میں یہاں ہمارے متلاشیوں کی آمد کا کیا جواز ہے۔ یہاں سے ہمارے جانے کے پہلے دن نہیں تو دوسرے دن نواب حشمت جنگ کو علم ہو گیا تھا کہ ہم بڑے نواب کی حویلی میں ہیں، اُسے اپنے مربیوں کے ساتھ اِس ہیر پھیر کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں تو کسی موقع پر اُس کے رویّے سے اس تکدر کی جھلک نظر آتی۔ ابّا جان نے پیرو سے کہا کہ اُنھوں نے نواب حشمت جنگ کے ساتھ اُس سے زیادہ وقت گزارا ہے۔ بھٹل اور پیرو کی عدم موجودی میں بھی تو وہ گھنٹوں اُس کے ساتھ رہے ہیں۔ وہ پیرو کو اُس کی ایک ایک بات بتاتے رہے۔ پیرو نے اُن سے کوئی تکرار نہیں کی بلکہ اُس نے اُن سے معافی مانگی کہ یہ محض اُس کا گمان تھا اور کچھ نہیں۔ یوں ہی اُس کے دماغ میں ایک بات آئی اور اُس کے مُنہ سے نکل گئی ورنہ وہ خود جھجک رہا تھا۔ جو سوال میں اُس سے کرنے والا تھا وہی بات ابّا جان نے اُس سے پوچھی کہ آخر کوئی تو شہادت اس وہم کی بنیاد بنی ہو گی؟ پیرو کوئی جواب نہ دے سکا۔ مجھے پیرو پر حیرت ہو رہی تھی۔ گویا منیر علی نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا کہ اب ہم پر اعصاب شکنی طاری ہے۔ پیرو کو شاید ہم سب سے زیادہ آرام کی ضرورت تھی۔ اُسے اپنے گھر سے نکلے عرصہ ہو گیا تھا۔ اب گھر اتنا دور بھی نہیں رہا تھا۔ ایک رات کی مسافت اُس کی بیٹی، بیوی اور اُس کے درمیان حائل تھی۔ مگر یہ رات نہیں گزرتی تھی۔

پیرو اپنے وہم کی وجہ کا جواب نہیں دے سکتا تھا یا وہ ابا کی خاطر جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ ابّا جان کی دلیلوں کے سلـ اُسے گھٹا گھٹا دیکھ کے یہ خیال اچانک میرے ذہن میں گونجا تھا ا میرے سینے میں جلن ہونے لگی تھی۔ میں نے بھٹل کی جانب دیکھا نے پیرو سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ پیرو واقعی کوئی ایسی اَن ہونی نہیں کہہ رہا تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ اس طرح نواب حشمت جنگ ہ بارے میں وہ کچھ جاننا چاہتا ہو جو ہم سے ربط و تعلق کی اس فضا جاننا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ انکسار اور تپاک، وہ لحاظ اور مروت ا جگہ۔ نواب حشمت جنگ کی جگہ کوئی بھی ہوتا، یہی کرتا مگر اُس کی حیثیـ ریاست کے ایک حاکم کی بھی تو ہے اور ایک باہوش آدمی کی بھی۔ تمام وقت تو اُس کے سامنے نہیں رہے تھے، ہم سے الگ ہو کے تو اُس سارا وقت اپنے سامنے گزارا ہے۔ مجھ اندھے کو جیسے روشنی کے تـ مل رہے تھے۔ ریاست کے ایک اہم منصب دار کی یہ جستجو غیر منطـ نہیں تھی۔ یہ نو وارد جو اُس کے اتنے قریب آ گئے ہیں، کون ہیں ا کیا مقصد رکھتے ہیں؟ دیکا جی ہوٹل میں ابّا جان کا قیام، اُس کے پا کسی غرض کے بغیر اُن کی آمد اور ایک بیش بہا ہیرے کا عطیہ، جو کی یہ عجلت خریداری، ابّا جان کا اپنے بارے میں کچھ بتانے کے سلـ میں محتاط رویّہ، پھر اپنے عم زاد بھائی بڑے نواب کی حویلی میں ہما موجودی اور خانم سے تعلّق۔ خانم کی بازار سے وابستگی کے بارے اُسے پہلے سے علم ہو گا اور شاید بڑے نواب سے اُسے یہ بھی معلوم ہو گ کہ ابّا جان اور منیر علی کے ساتھ کے لوگ بازار کے اڈّے پر باقاعدہ ا گیری کرتے رہے ہیں، سرِعام اُن کی چاقو بازی کا تماشا دیکھا گیا۔ منیر علی اور ابّا جان سے بھٹل، پیرو اور کانتے وغیرہ کی گہری رفاقت نواب حشمت جنگ کے لیے کئی لحاظ سے حیرت و تجسّس کا باعث گی۔ وہ نادر ہیرا اُس نے قبول تو کر لیا تھا کیونکہ ابّا جان نے انکار کی گنجائش نہیں رہنے دی تھی لیکن اس شرفِ قبولیت کا یہ مطلب نہ تھا کہ اُس کا ذہن ابّا جان کی اس خسروانہ مرحمت کی غرض و غایت سلسلے میں اُلجھتا نہ ہو۔ کہیں یہ عطیہ آیندہ اُس کے رتبے کے لیے ک زیاں، کسی رُسوائی کا سبب نہ بن جائے؟ کہیں اس داد و دہش کے میں ابّا جان کا کوئی اور ارادہ نہ چھپا ہو؟

ابّا جان نے اُس کی وکالت کرتے ہوئے پیرو سے کہا تھا کہ جب نواب حشمت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ ہم بڑی حویلی میں ہیں دوسرے دن اور گزشتہ کل یہاں میری تلاش میں آنے والے آدمیو

کا اُس کی طرف سے آنے کا کیا جواز ہے، دوسرے دن اُسے اُن آدمیوں کو روک لینا چاہیے تھا۔ پیرو ابّا جان کو جواب نہیں دے سکا تھا حالانکہ جواب صاف تھا کہ پھر اُن کی آمد اور ضروری ہو گئی تھی۔ اسی طرح تو نواب حشمت جنگ اپنی بابت ہمارے دلوں میں اُبھرنے والے ہر شبہے کا امکان ختم کر سکتا تھا۔ ایک طرف اُسے ہمارے بارے میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے یا ایک اطمینان حاصل کرنے کی بے چینی ہو گی، دوسری طرف اُسے ابّا جان سے ہونے والے تعلّق کی پاس داری کا خیال بھی ہونا چاہیے۔ اُس نے بڑے نواب کی حویلی میں ہمیں دیکھنے کے بعد اور اس سے پہلے ابّا جان کے ساتھ جس وارفتگی اور تعلقِ خاطر کا اظہار کیا تھا وہ محض ظاہر داری نہیں تھی، ظاہر داری ہمیں ضرور محسوس ہو جاتی۔ یہی تو ابّا جان پیرو کو باور کرا رہے تھے۔ ہمارے لیے اُس کے یہی احساسات ہوں گے جن کا وہ برملا اظہار کرتا رہا تھا لیکن ان احساسات کے لیے کسی تائید، کسی یقین کی ضرورت اُسے ہر لمحے محسوس ہوتی ہو گی۔ بڑے نواب کی حویلی میں اُس نے نازکی کا اتنا خیال رکھا تھا کہ ہمارے مابین رشتے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ صرف میرے اور ابّا جان کے رشتے کا اُسے علم ہوا تھا۔ ابّا جان نے باقی سب کو اپنے رفقائے کار کے طور پر متعارف کرایا ہو گا۔ یہ ایک نہایت تشنہ تعارف تھا۔ اسی تشنگی کا احساس گو اُس نے ہمیں نہیں ہونے دیا تھا لیکن تشنگی تو اپنی جگہ تھی۔ لس کے عم زاد بھائی نواب عالم تاب کے لیے ہماری طرف سے دوسرا بڑا طیہ خانم تھی۔ حویلی میں خانم کی آمد اتنا بڑا حادثہ تھی کہ پھر ہم سے ہنے سُننے، جاننے، پوچھنے کے لیے ایک جرأت لازم تھی، ایک سنگ دلانہ جرأت۔ پیرو نے ابّا جان کو یہی اشارہ کرنا چاہا تھا کہ بہ صورتِ دیگر نواب شمت جنگ کے پاس ہمارے سلسلے میں اپنے سر کی دُھند دُور کرنے یہی چارہ رہ گیا تھا کہ ہمیں شائبہ تک نہ ہو۔ اُسے کسی نتیجے پر پہنچنے لک اس نزاکت کا بہر طور خیال رکھنا چاہیے تھا۔ یقیناً اُس کی خواہش ہو گی کہ سارا تاثر یوں ہی قائم رہے۔ یہ تو ابّا جان بھی اچھی طرح سمجھتے ہوں گے۔ اُس کی مہر بہ لبی بجائے خود اضطراب کی علامت ہے۔ گویا ُسے اندیشہ تھا کہ مبادا ہمارے پاس معقول جواب نہ ہوں اور اُسے ہمارے سامنے اور ہمیں اُس کے سامنے کسی اذیت ناک مرحلے سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

بڑے نواب کی حویلی میں خانم کی آمد نے نواب حشمت جنگ کے ہن میں رینگنے والے اَن گنت سوالوں کے آگے دیوار سی کھڑی کر دی ی۔ ظاہر ہے، سوالات ختم نہیں ہو گئے تھے بلکہ اور گہرے ہو گئے ہوں گے۔ شاید اسی لیے نواب نے ہمارے سامنے بہ طورِ خاص مہاراجا دھرم ویر کا ذکر کیا تھا۔ ہو سکتا ہے، اِن پتھروں سے خود اُس کی رغبت مہاراجا سے کم نہ ہو اور وہ اپنے آدمی بھیج کے ابّا جان کے دوسرے ہیروں کی ٹوہ لینا چاہتا ہو۔ ایک ہیرا قبول کر لینے کے بعد اس سلسلے میں مزید گفتگو بھی تو ممکن نہیں رہی تھی۔ ابّا جان خود بتا رہے تھے کہ مہاراجا دھرم ویر نے ان سے ملنے کے بعد کوئی خاص اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا۔ اُن کے خیال میں وہ ایک رسمی ملاقات تھی۔

پیرو نے کچھ نہیں کہا۔ ابّا جان نے بھٹل سے پوچھا کہ کیا اس قدر رسم و راہ کے بعد نواب حشمت جنگ کی طرف سے اس قسم کی بدگمانی کا امکان ہے؟ بھٹل ہنکاری بھر کے رہ گیا۔ ابّا جان بھی چُپ ہو گئے۔ نو بج چکے تھے۔ کانتے، شامو، جمرو وغیرہ میں سے کوئی نہیں لوٹا تھا۔ کمرے میں حبس زدہ سی خاموشی طاری تھی۔ ملازم نے آ کے رات کے کھانے کے لیے پوچھا۔ سبھی نے انکار کر دیا تاہم ابّا جان نے اُسے لیموں کا شربت لانے کا حکم دیا۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ملازم آ گیا۔ لیموں کے شربت میں عرقِ گلاب کی آمیزش کی گئی تھی۔ نہایت خوش ذائقہ شربت تھا۔ میں نے بھی ایک گلاس پیا۔ شربت پینے کے دوران بھی وہ ایک دوسرے سے بے خبر خاموش بیٹھے رہے۔ میں باہر جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دفعتہً کانتے اور مارٹی نے اندر داخل ہو کے اطلاع دی کہ ایک بڑی موٹر میں کوئی آدمی ابّا جان سے ملنے آیا ہے۔

ابّا جان کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا۔ وہ کرسی پہ پہلو بدلنے لگے۔ "کون ہے؟" اُنھوں نے ہذیانی انداز میں پوچھا۔

"اپنے کو کوئی مہاراجا بولتا ہے!" کانتے نے جواب دیا۔

"مہاراجا! مہاراجا دھرم ویر؟"

"ہاں، ایسا ہی نام بولا ہے اُس نے۔"

"مہاراجا اِس وقت آئے ہیں؟ تم نے کیا کہا؟"

کانتے نے بتایا کہ اُس نے اپنے طور پر کہہ دیا ہے کہ ابّا جان شاید سو گئے ہیں لیکن جواب میں مہاراجا نے کہا کہ بہتر ہے، ایک بار اندر جا کے دیکھ لیجیے۔

ابّا جان کھڑے ہو گئے اور پیرو کی طرف دیکھ کے پوچھنے لگے۔

"کیا جواب دیں؟"

"ابھی بُلا کے دیکھتا ہے بابا! کیوں بھٹل بھائی؟" پیرو نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے، اس وقت منع ہی کر دیں!" ابّا جان نیم ہذیانی انداز میں بولے۔ "کانتے سونے کا کہہ ہی چکا ہے۔"

"اب نمٹا ہی دو بابا!" بھٹل کی آواز بدلی ہوئی تھی۔

"جیسی آپ کی مرضی" ابّا جان نے تذبذب سے کہا "یہ بھی مناسب ہی ہے" دوسرے لمحے انھوں نے کانتے سے کہا کہ مہاراجا کو عزت سے اندر لے آئے۔

"ابھی سب لوگ چلتا ہے" پیرو کے ٹوکنے پر ابّا جان کو خیال آیا۔ انھوں نے کانتے کو آواز دے کے ٹھہر جانے کی ہدایت کی۔ پھل بھی اُٹھ گیا تھا۔ ہم چاروں تیز قدموں سے باہر آئے تھے۔ ابّا جان پر سراسیمگی سی چھائی ہوئی تھی مگر دروازے سے گزرتے وقت وہ پیرو کو جتانا نہیں بھولے کہ "دیکھا آپ نے! میں نے کیا کہا تھا"

چبوترے کے باہر سیاہ موٹر کھڑی تھی۔ جو شخص کمرے کے باہر سائبان میں کرسی پر بیٹھا تھا، وہی مہاراجا دھرم دیو ہوگا۔ وہ تن و توش ہی سے مہاراجا لگتا تھا۔ چوڑی دار پاجامے اور شیروانی میں ملبوس۔ شیروانی پر شانوں سے گزرتی ہوئی سلکی شال پڑی تھی۔ سر پر پگڑی اور ماتھے پگڑی کے عین وسط میں ہیروں سے جڑا ہوا ایک تمغہ نما طلائی زیور آویزاں تھا۔ پچپن۵۵ کے قریب عمر، درمیانہ قد، بھاری بھرکم جسم، بھرا ہوا چہرہ اور ہلکی ہلکی مونچھیں گلے میں موتیوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ سانولی رنگت کے باوجود چہرہ دمک رہا تھا۔ ابّا جان لپکتے ہوئے اُس کے پاس پہنچے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہیرے کی مانند دمکنے لگیں "ہمیں احساس ہے کہ ہم ناوقت آئے ہیں، ہمیں اطلاع دے کے آنا چاہیے تھا لیکن بس اچانک ارادہ ہوگیا"

"یقین نہیں آتا کہ مہاراجا غریب خانے پر قدم رنجہ ہیں۔ جنابِ والا طلب فرما لیتے" ابّا جان نے اپنے لہجے کی لرزیدگی دُور کرنے کی پوری کوشش کی۔

"ہم نے سوچا، اس تکلّف کی کیا ضرورت ہے۔ اِدھر دکن میں آپ کی حیثیت مہمان کی ہے۔ ہمی کو پہلے آنا چاہیے تھا" مہاراجا نے تمکنت سے کہا "یوں کہیے کہ ہمارا اشتیاق ہمیں کھینچ لایا"

"زہے نصیب" ابّا جان خوش خلقی سے بولے "مگر اب ہم مہمان کہاں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم نے یہاں گھر بنا لیا ہے"

"ہمیں معلوم ہوگیا تھا" مہاراجا نے کھِل کھلا کے کہا "ہمارے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ شمال سے ایک اور عزت مند گھرانا دکن آ کے بس گیا ہے۔ غالباً آپ کا میسور کی طرف کبھی جانا نہیں ہوا۔ پھر آپ وہیں رہنے کا ارادہ کرتے۔ ریاست حیدرآباد کے دوست ہم سے خفا ہو جاتے ہیں جب ہم اُن سے کہتے ہیں کہ یہ تو میسور کے آگے بیابان ہے"

"ایک مرتبہ اتفاق ہوا ہے مگر سرسری" ابّا جان نے کہا۔ "جنوبی ہندوستان کا سارا مرغزار ہے لیکن میسور اور بنگلور کی تو بات ہی اور ہے"

"آپ نے دیکھا ہے؟" مہاراجا جوشیلے لہجے میں بولا۔

"دیکھنے کی طرح نہیں دیکھا۔ ایک ضروری کام سے جانا ہوا تھا۔ چند روز قیام رہا لیکن ایک اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے"

"اس بار آپ ہمارے مہمان بن کے آئیں تو ہم آپ کو دکھائیں کہ اُس دیس پر قدرت کتنی مہربان ہے"

"ناچیز کے لیے اس سے بڑی عزت کیا ہوگی" ابّا جان نے مستعدی سے جواب دیا۔ پیرو کے اشارے پر انھوں نے معذرت خواہانہ لہجے میں مہاراجا سے اندر چلنے کی درخواست کی۔ مہاراجا پہلے ہی اِس توجّہ کا منتظر تھا۔ ابّا جان نے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ پھرتی سے آگے بڑھ گیا۔ حویلی کا خاص کمرہ کھول دیا گیا تھا، یہ آرائش و زیبائش کے اعتبار سے حویلی کے دوسرے تمام کمروں سے مختلف تھا۔ ہمارے داخل ہونے سے پہلے ملازموں نے روشنیاں جلا دی تھیں۔ دیواروں پر بیلوں اور پھول پتّوں کی شکل میں نصب شیشوں کی وجہ سے کمرے کا منظر کسی شیش محل جیسا ہوگیا تھا۔ ساری چھت رنگ برنگی روشنیوں سے جھل ملا رہی تھی۔ مہاراجا سامنے کے صوفے پر آ کے بیٹھ گیا۔ پھل، پیرو، ابّا جان اور میرے سوا کوئی اور اندر نہیں آیا تھا۔

"کیا خوب صورت حویلی ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے، ہم پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں" مہاراجا نے ستائشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "آپ نے اچھی جگہ منتخب کی ہے"

"قسمت سے مل گئی" ابّا جان انکسار سے بولے "لیکن آپ کو یہاں کا پتہ کس طرح معلوم ہوا؟"

"ہاں!" مہاراجا نے ہنستے ہوئے کہا "وہ جو ایک شاعر نے کہا ہے، کیا حسبِ حال کہا ہے۔ بس ایک صدقِ طلب شرط ہے چنانچہ ہم نے منزل کھوج ہی لی"

"ضرور قبلہ نواب حشمت جنگ صاحب نے بتایا ہوگا" ابّا جان نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہمارے اُن کے قدیم خاندانی مراسم ہیں" مہاراجا شگفتگی سے بولا "وہ ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن انھوں نے ہمیں نہیں بتایا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ ہمیں اتنی جلدی نہیں بتائیں گے، ہمارے صبر کا امتحان لیں گے۔ ہمیں صبر نہیں تھا، سو ہم نے اُنھی کے ذرائع آزمائے اور آخر کامیاب ہوگئے"

"یہ کوئی ایسا راز بھی نہیں تھا" ابّا جان کے لہجے میں کسی قدر ترشی کی آمیزش ہوگئی تھی "آپ سے اُس روز تو نواب عالم تاب مرحوم کے سوم میں نیاز حاصل ہوا ہی تھا۔ جنابِ والا اشارہ فرما دیتے"

"ہم نے وہ موقع مناسب نہیں سمجھا" مہاراجا نے مچلتی آواز میں کہا "لیکن آپ یقین کیجیے، ہم نے اُس دن بہت ضبط کیا"

"نیاز مند کو حیرت ہو رہی ہے" ابّا جان اضطراب آمیز وضاحت سے بولے "اس کے لیے مہاراجا کا اشتیاق باعثِ عزّت و مسرّت ہے لیکن ساتھ ہی کسی حد تک باعثِ تشویش بھی ہے۔ تشویش اس امر کی کہ کہیں والا مرتبت نے فقیر کے متعلق اس کی بساط سے زیادہ نہ سُن لیا ہو۔ بہرحال، کھانے کا وقت ہے، جنابِ والا سے درخواست ہے کہ پہلے دعوتِ شیراز تناول فرمائیں"

"ہمیں افسوس ہے" مہاراجا پشیمانی سے بولا "ہم کھانے کے بعد ہی نکلے تھے لیکن کیا، کیا آپ حضرات نے! ۔ ۔ ۔ ؟"

"یوں سمجھیے کہ آپ کا انتظار تھا" ابّا جان نے مسکرا کے کہا۔

"اوہ!" مہاراجا مسرّت سے بولا "ہمیں اندازہ تھا کہ ہم کن اہلِ دل صاحبان کے پاس جا رہے ہیں۔ شاید اسی اعتماد میں ہم نے اطلاع اور وقت کا ایسا خیال نہیں کیا، ارادہ کیا اور آ گئے"

ابّا جان نے پھر اُس کا شکریہ ادا کیا اور کہنے لگے "ہمیں مہاراجا کے ذوق و شوق کا علم ہوگیا تھا۔ اگر ہم یہ کہیں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ مہاراجا کے اوصاف سُن سُن کے ہمیں خود باریابی کی بے تابی تھی"

"یقیناً یقیناً نواب حشمت جنگ کی کارستانی ہوگی" مہاراجا کی آنکھوں میں روشنی بھر گئی "مگر انھوں نے کتنا کہا ہوگا۔ یہ اُن کی نوازش ہے کہ انھوں نے ہمیں اس غیر معمولی ہیرے کے دیدار سے مشرّف کیا۔ وہ دنیا کے نادر ہیروں میں سے ایک ہے، ایسے ہیرے ہم نے زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔ اُس کا نظّارہ کر کے ہم سے برداشت کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ ہم نے اُن سے بہت سے سوال کیے۔ جاننے کے باوجود کہ وہ ایسی آسانی سے ہمیں سب کچھ نہیں بتا دیں گے۔ ہوا بھی یہی۔ نواب صاحب کو ہماری کمزوری کا اچھی طرح علم ہے، وہ ٹال مٹول کر کے گویا ہمیں ستاتے رہے، ہم سے لُطف لیتے رہے۔ اُن کی بے نیازی نے ہمیں اور مشتاق کر دیا"

"نواب صاحب قبلہ نے کیا فرمایا آپ سے؟"

"کچھ بتایا ہو تو کہیں۔ ہم نے پوچھا، کون ایسا سخی ہے؟ اُس قلندر کا کہاں قیام ہے؟ ہمیں دیدار نہ کرائیے گا؟ بولے کہ ہمارے محترم کے ایک دوست ہیں طبعاً گوشہ نشیں ہیں۔ زمانے بعد ریاست آنا ہوا ہے، ہمارے لیے یہ تحفہ لائے ہیں۔ یہ بتا کے فرمایا کہ سرِدست ملاقات مشکل ہے کیونکہ انھیں واپسی کی جلدی ہے۔ البتہ دوبارہ آنے کو کہہ رہے تھے، پھر ہم آپ سے ضرور ملوائیں گے اور اب بھی اُن سے ذکر کر کے دیکھیں گے۔ ممکن ہے، اِسی مرتبہ کوئی صورت نکل آئے۔ مگر اس دوران اُن کے خاندان میں یہ الم ناک سانحہ ہوگیا اور ہم اُن سے کچھ نہیں کہہ سکے"

"انھوں نے سب درست ہی فرمایا" ابّا جان نے آہستگی سے کہا۔ وہ مخاطب مہاراجا سے تھے لیکن اُن کی نگاہیں پیرو کے چہرے پر منڈلا رہی تھیں۔

"اُن کا فرمانا اپنی جگہ درست ہے مگر اس طرف ہم اپنے اختیار کا کیا کرتے" مہاراجا تمتمائی آواز میں بولا "آخر ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ ہم خود ایک کوشش کر کے دیکھتے ہیں"

"ایسا بھی کیا جنابِ والا!" ابّا جان خفیف سے ہوگئے "ہم مہاراجا کی دل چسپی سے ناآشنا نہیں تھے لیکن ہمیں دل چسپی کی اِس شدّت کا ذرا بھی گمان ہوتا تو ہم خود حاضر ہو جاتے"

"ہم کیا عرض کریں۔ زندگی انھی پتھروں کو پرکھتے تولتے گزر گئی ہے۔ نواب حشمت جنگ نے چیز ہی ایسی دکھائی تھی کہ ہماری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ کیا سجل، ترشا ہوا پتھر ہے۔ کیا آب و تاب، رنگ رُوپ ہے۔ ہمیں اُس دن حسد کی حد تک نواب حشمت جنگ پر رشک آیا۔ وہ ہم سے چھوٹے ہیں اور ایک چھوٹے کی حیثیت سے ہماری تعظیم

کرتے ہیں۔ ہمیں اپنا پاس بھی لازم تھا ورنہ جی چاہتا تھا کہ اُن سے چھین لیں۔"

اباجان نے افسوس کا اظہار کیا۔ وہ یہی کہہ سکتے تھے کہ اگر اُن کی ملاقات مہاراجا دھرم ویر سے پہلے ہو جاتی تو وہ یہ ہیرا اُس کی نذر کر دیتے۔

"ہمیں یقین ہے، ایسا ہی ہوتا لیکن ایسا ہوا جو نہیں۔" مہاراجا نے بے قراری سے کہا۔ "ہم اسی لیے آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ سے اُس ہیرے کی بابت کچھ جان سکیں اور اگر اب بھی کوئی گنجائش ہو تو آپ سے درخواست کر سکیں۔"

"کیسی گنجائش؟" اباجان تعجب سے بولے۔

"یہی کہ وہ ہیرا کسی طور ہمیں دست یاب ہو جائے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے! وہ نذر کیا جا چکا ہے۔"

"ہم اس حقیقت سے واقف ہیں لیکن نواب حشمت جنگ سے زیادہ ہم خود کو اُس کا مستحق سمجھتے ہیں۔ آپ ہی کوئی صورت نکالیے۔ سمجھیے کہ ہم یہاں آپ کے در پر سوالی بن کے آئے ہیں۔"

"آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"ہم کسی ریاست کے والی نہیں لیکن اس کے سوا جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے، ہم اُسے آپ کے اختیار پر چھوڑ دیتے ہیں کہ آپ جو چاہیں، ہم اُسے ترک کر دیں گے۔ پلٹ کے اُس جانب نہیں دیکھیں گے۔"

"جناب والا کے علم میں ہے کہ ہم نے یہ ہیرا تحفتاً نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا ہے۔" اباجان کی آواز اُونچی ہوتی گئی۔

"اپنی طلب کا جنون ظاہر کرنے کے لیے ہمارے پاس مال و دولت کی اس پیش کش کے سوا کیا رہ جاتا ہے، کوئی اور نقش قائم کرنے کا ہمیں وقت ہی کہاں ملا ہے۔ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ اپنی طلب کی بنیاد پر حق ہمارا بنتا ہے۔"

"مگر مہاراجا! یہ سب بعد از وقت ہے۔" اباجان نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "اب چیز ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"آپ اُسے واپس بھی لے سکتے ہیں۔"

"یہ جرأت کرنے سے پہلے ہم اپنی زبان قلم کر لیں گے۔"

"ہمیں اسی جواب کی توقع تھی۔" مہاراجا نے ہٹیلی آواز میں کہا۔ "لیکن پھر ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

اباجان اس بات کا کیا جواب دے سکتے تھے۔ چند لمحوں تک کشمکش و پیچ میں پڑے رہے پھر بولے "بہتر ہو گا کہ آپ اس سلسلے میں نواب صاحب ہی سے بات کریں۔ اب یہ اُنھی کی ملک ہے۔ ہمارا کوئی حق نہیں بنتا۔ ہم اُسی دن بالکلیہ دست بردار ہو گئے تھے جب ہم نے اُسے بہ صد خوشی نواب صاحب قبلہ کے ہاتھوں میں منتقل کیا تھا۔ آپ کا حق ہمیں دل سے تسلیم مگر آپ ہی فرمایئے، اب کس طرح ہم اُن کے سامنے اس سلسلے میں لب کشائی کر سکتے ہیں؟"

"آپ نہیں کر سکتے۔ ہم جانتے ہیں، یہ آپ کے لیے کتنا مشکل ہے لیکن کیا آپ ہمیں اس گھر سے خالی ہاتھ واپس کر دیں گے؟"

"جی، جی!" اباجان کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے۔ اُنھوں نے پہلے بھّل کی پھر پیرو کی جانب دیکھا۔ دونوں بُت کی طرح ساکت بیٹھے رہے۔

"کیا ہم بھی نواب حشمت جنگ کی طرح آپ سے تعلقِ خاطر کے مدعی نہیں ہو سکتے؟" مہاراجا نے بے اختیارانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں!" اباجان تیزی سے بولے۔ "یہ تو ہمارے لیے سعادت ہے، مگر، مگر کہیں آپ کا یہ خیال تو نہیں کہ ہمارے پاس اس نوع کے دوسرے نوادر؟ ۔ ۔ ۔"

"از راہِ نوازش پہلے ہماری بنتی سُن لیجیے۔" مہاراجا نے اباجان کی بات کاٹ کے جلدی سے کہا۔ "یہ ہمارا خیال نہیں، یقین ہے۔ ہمیں اپنا یہی یقین آپ کے دروازے پر کھینچ لایا ہے۔ یہی تو ہم کہنا چاہتے ہیں۔ جو شخص ایک بھولے بسرے نواب کو محض ایک پرانی، ایک زمانے کی گرد پڑی ہوئی شناسائی کی تجدید کے لیے ایسی بیش قیمت سوغات نذر کر سکتا ہے، اُس کے اقبال و حشم کا کوئی کیا تصوّر کر سکتا ہے!"

اباجان نے درمیان میں دخل دینا چاہا لیکن مہاراجا نے اُن سے معذرت کر لی اور کہنے لگا۔ "ہم نے آپ سے عرض کیا ہے کہ نواب حشمت جنگ کے خاندان سے ہمارے مراسم کی نوعیت کیا ہے۔ اُن کے والد مرحوم کے ساتھ ایک عُمر کی رفاقت رہی ہے اور یہی سے نہیں، قرابت کا یہ سلسلہ ہمارے دادا جی کے زمانے سے جاری ہے۔ ہمارا تعلق ریاست میسور سے ہے لیکن یہ ریاست ہمارا دوسرا گھر ہے۔ نواب حشمت کی والدہ ہم سے پردہ نہیں کرتیں اور ہمیں اپنے ہی گھر کے ایک فرد کا درجہ دیتی ہیں۔ دونوں خاندان ہمیشہ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک رہے ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ نواب صاحب کے خاندان سے آپ کے قدیم روابط کا ہمیں کوئی علم کیوں نہیں ہے۔ شمالی ہندوستان میں جہاں جہاں اُن کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں، ہم سب کی نشان دہی کر سکتے ہیں اور اپنے یہ نواب حشمت جنگ، کیا آپ سمجھتے ہیں، ہم اُن کا لہجہ، اُن کی آنکھیں، اُن کا چہرہ نہیں پہچانتے۔ آپ کو نہیں معلوم، وہ ہمارے سامنے آپ سے اپنے قدیم تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کیسے متذبذب نظر آ رہے تھے۔"

"یہ امر فطری ہے کیونکہ ہمارا تعلق اُن کے والدِ مرحوم سے تھا۔" اباجان کی آواز میں لرزش آ گئی تھی۔

"ایک مرحوم دوست کے فرزندِ دل بند کو ایک غیر معمولی ہیرے کی نذر گزاری جاتی ہے۔ یہ بخشش کوئی ایسا ہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے آپ سے بیزار ہو گیا ہو اور غنا کے درجے پر فائز ہو۔ یا کوئی ایسا شخص جس کے انبار میں ایک پتھر کے کم ہو جانے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو یا جسے ان پتھروں کی قدر و قیمت کا کوئی احساس نہ ہو اور اس کا امکان نہیں ہے کیوں کہ نواب حشمت جنگ جیسے صاحبِ حیثیت اور جوہر شناس کو وہی پتھر پیش کیا جا سکتا ہے جس کی قدر و قیمت کا اچھی طرح تعین کر لیا گیا ہو۔ ان پتھروں کی پہچان نہ ہر کس و ناکس کو ہو سکتی ہے، نہ ہر کس و ناکس اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اِن کے لیے تو کوئی اہلِ نظر ہی چاہیے۔"

اباجان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اُنھوں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا، مہاراجا کو گھورتے رہے اور میری توقع کے خلاف ٹھیری ہوئی آواز میں بولے۔ "پھر جناب والا کس نتیجے پر پہنچے؟"

"ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں آپ کے پاس چلنا چاہیے۔"

"ایسی صورت میں، آپ کو کم و بیش یہی اندازے قائم کرنے چاہیے تھے تاہم غالباً یہ ضروری نہیں کہ ہم آپ کے سامنے وضاحت پیش کریں۔"

"مطلق نہیں۔" مہاراجا نے بے ساختہ کہا۔ "ہم تو محض اپنی اُلجھنیں بیان کر رہے تھے۔ کیسے کیسے سوال اس دوران ہمارے دماغ میں منڈلاتے رہے ہیں۔"

"معاف کیجیے، اس کی وجہ آپ کی لاعلمی ہو سکتی ہے، لاعلمی کی اُلجھن۔ کوئی شبہ نہیں کہ نواب صاحب قبلہ سے آپ کے مراسم قدیم ہیں لیکن ہمارا گمان ہے، ابھی آپ اُس خانوادے سے متعلق بہت سے حقائق سے ناآشنا ہیں۔ بہر حال ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم نواب صاحب سے اپنے ربط و تعلق کی سند آپ کی خدمت میں پیش کریں مگر کیا واقعی ایسی کوئی جواب دہی یا ثبوت و شواہد ہم پر قرض ہیں؟"

"نہیں نہیں، آپ نے بہت آگے کی بات کہہ دی۔" مہاراجا کے تحمّل میں سرِ مُو فرق نہ آیا، نہ اُس کے لہجے کی فصاحت میں کمی ہوئی۔ یہ شائبہ تک نہ ہو رہا تھا کہ اس کا تعلق ریاست میسور سے ہے اور اُس کی مادری زبان کوئی اور ہو سکتی ہے۔ مہاراجا نے ہم تینوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا تھا جیسے ہم وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ اُس نے اباجان سے تخلیے یا خلوت کی خواہش بھی ظاہر نہیں کی تھی۔ ہنستے ہوئے بولا۔ "ہم ثبوت و شواہد کے لیے نہیں آئے، نہ ہمارا یہ کام ہے۔ ہماری بے چینی ایک تو ان پتھروں سے ازلی دوستی کے سبب تھی، دوسرے نواب حشمت جنگ سے ہمارے تعلق کا تقاضا تھا کہ ہم اُن کی حیثیت کے تحفظ کا خیال رکھیں۔ آپ درست فرماتے ہیں۔ اِس اضطراب کی وجہ ہماری لاعلمی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے پہلوؤں پر بھی احباب نے ہماری توجہ مبذول کرائی تھی۔ دیگر امور پر ہمیں خود بھی نگاہ رکھنی چاہیے تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ جناب نے براہِ راست نواب حشمت جنگ کے پاس جانے کے بجائے ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ دیکا جی ہوٹل میں اور نواب صاحب سے اُن کے دفتر میں ملنے کی کوشش کی تھی جہاں اپنی مصروفیت کے سبب نواب صاحب نے انکار کر دیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے گھر پر ملاقات کا وقت بہ اکراہ دیا تھا۔ گھر پر ہی ملاقات ہوئی۔ بعد ازاں ہوٹل ہی میں جناب کا قیام رہا۔"

مہاراجا کو یہ ساری باتیں نواب کے معتمدِ خاص یا ڈرائیور وغیرہ سے معلوم ہو سکتی تھیں۔ اباجان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ "پھر اطلاع دینے والے نے یہ بھی آپ کے گوش گزار کیا ہو گا کہ نواب صاحب قبلہ نے ہم سے گھر پر قیام کے لیے بے پناہ اصرار کیا تھا، ہمی نے انکار کر دیا کیوں کہ ہمارے ساتھ اور لوگ بھی تھے جن کا نواب صاحب کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں تھا۔" اباجان کی آواز تڑخ رہی تھی۔ "اُنھیں اس صراحت کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے چھپٹتی نگاہوں سے بھّل کی جانب دیکھا کہ وہ اباجان کو روکے۔ جواب میں بھّل نے پلکیں موند لیں اور اشاروں اشاروں میں مجھے تحمّل کی تلقین کی مگر میری رگوں میں خون جل رہا تھا۔ اباجان کہنے لگے۔ "ظاہر ہے، ایک زمانے بعد ہمارا ریاست کی طرف آنا ہوا تھا۔ ہمارا واسطہ نواب صاحب کے والدِ مرحوم سے تھا اور ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اُنھیں والدِ مرحوم کی رواداری کس حد تک ورثے میں ملی ہے۔"

"اور جنابِ من ہمیں تو یہاں تک بتایا گیا کہ آپ نے ہوٹل میں قیام کے کئی دن بعد نواب حشمت جنگ کے دفتر کا رُخ کیا تھا۔"

"ہم اُن کی طرف سے مطمئن ہوئے بغیر کس طرح اُن کے دروازے کا رُخ کر سکتے تھے، اور بھی بہت سی ناگفتنی مانع ہو سکتی ہے۔" اباجان کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی، اکھڑی ہوئی آواز میں بولے۔ "مگر جناب! ان باتوں سے کیا حاصل۔ جنابِ والا کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" مہاراجا نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "ہم نے تو سب کچھ اپنی فکر مندی کے اسباب کے طور پر عرض کیا ہے۔ اِس حالت

میں ہماری جانب سے یہ تردد و تشویش غیر حقیقی نہیں تھی۔ ہم آپ سے کیا عرض کریں۔ اس کے سوا بھی جانے کتنی باتیں ہمارے علم میں آئی تھیں مگر ان کی تفصیل فضول ہے؟"

"اور کیا؟" اباجان سے ضبط نہیں ہوا۔ اُنھوں نے بھڑکتی آواز میں مہاراجا سے پوچھا۔

"چھوڑیے بھی" مہاراجا نے بے نیازی سے کہا۔ "اصل میں ہم آپ کو بتائیں کہ ہماری توجّہ کا مرکز و محور نواب حشمت جنگ کو آپ کا دیا ہوا عطیّہ ہی رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دوسرے امور ذیلی ہیں۔ پتھروں سے شغل کرتے کرتے سر میں دُھوپ اُتر آئی ہے۔ اُن کے تعاقب میں ہمیں کیسے کیسے عجیب تجربوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، یہ ہمی جانتے ہیں۔ داستانیں سُنانے پر آئیں تو برس بیت جائیں۔ اچھّی چیز کے لیے ہم نے کہاں کہاں دشت پیمائی نہیں کی۔ اب کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ پتھر ہمیں اپنی طرف بُلاتے ہیں۔ وہ دیواروں کے پار ہوں تو ہماری رگ پھڑکنے لگتی ہے، لیکن یہاں آنے کا ارادہ ہم نے چھٹی حس کی خواہش ہی میں نہیں کیا ہے۔ مناسب تھا کہ ہم پہلے گرد و پیش کے مختلف زاویوں کا بھی تجزیہ کر لیں۔ تجزیے سے گویا شگون مل گیا۔ دیگر باتیں بعد کی ہیں۔ ہم آپ سے درخواست گزار ہیں۔ ہمارے اطمینانِ قلب کے لیے بتائیے کہ یہ ناقابلِ فراموش ہیرا آپ تک کس طرح منتقل ہوا؟ ہوسکے تو ہماری یہ وحشت دُور کر دیجیے۔"

"بخدا! ہمیں حیرت ہو رہی ہے۔" اباجان نے نسبتہً پُرسکون آواز میں کہا۔ "آپ کا تجسّس دیکھ کے ہمیں کچھ کھونے کا احساس ہو رہا ہے۔ اُس ہیرے کی نُدرت و عظمت کا تھوڑا بہت اندازہ ہمیں بھی تھا لیکن اتنا نہیں جتنا آپ کے اشتیاق سے ہوا ہے۔ بے شک اس ضمن میں آپ کی نگاہ مستند ہے۔ ہم اس بارے میں اتنا کچھ جانتے تو ممکن ہے کوئی دوسرا فیصلہ کرتے اور اسے زیادہ مطلوب و مشتاق ہاتھوں کی نذر کرتے۔ یقین جانیے، ہم وہ ہیرا آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے مگر اب یہ ذکر ہی بے معنی ہے۔ دی ہوئی چیز کا ملال ہمارے مسلک میں نازیبا ہے جب کہ اس میں صد فی صد ہماری خوشی کو دخل تھا۔ نواب صاحب نے ہم پر کوئی جبر نہیں کیا تھا۔ رہی آپ کے تجزیے کی بات اور دیگر امور پر نگاہ کی تو ہمیں نہیں معلوم، اِن سے آپ کی کیا مراد ہے۔ بہرحال آپ سے اتنا عرض ہے کہ باقی امور کا تعلق کسی طور بھی اس پیش کش سے نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان پر توجّہ نہ دی جائے۔ بین السطور میں بھی آپ نے بہت کچھ فرمایا ہے۔ اِن سب کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا کہ ہم اپنی مرضی و منشا میں آزاد ہیں، مختارِ کُل ہیں لیکن ہر لمحے آپ کی ذاتِ گرامی پیشِ نظر رہی، اس کا احترام ملحوظ ہے۔ اسی لیے ہم خود کو بہت بے بس اور مجبور محسوس کرتے ہیں۔"

اباجان کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ پہلی مرتبہ اُن کے لہجے میں یہ قطعیت نظر آئی تھی۔ اتنی دیر میں جیسے انھوں نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو، جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہوں یا انھیں اب کوئی اور صورت نظر نہ آ رہی ہو۔ یہ شکست خوردگی کی بھی علامت ہو سکتی تھی۔ دو آدمی پہلے اُچکے تھے۔ اب مہاراجا آ گیا تھا۔ ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ آدمی مہاراجا کے کارندے تھے یا کسی اور کے۔ بیٹھل اور بیرو کی خاموشی اباجان کے دوٹوک انداز کی تائید ہی ہو سکتی تھی۔ اب نتائج کچھ بھی برآمد ہوں۔ آدمی پہلوتہی ایک حد تک ہی کر سکتا ہے۔ اس اثنا میں ملازم نے چائے اور کھانے پینے کا سامان لا کے رکھ دیا تھا۔ مہاراجا نے چائے پر قناعت کی اور خاموش بیٹھا رہا۔ اباجان نے اُس سے نرم لہجے میں کہا۔ "مہاراجا کے سکونِ قلب کی خاطر عرض ہے کہ ہمیں یہ ہیرا ورثے میں ملا تھا۔ والدِ گرامی کے پاس کہاں سے آیا تھا؟ اس کے متعلق ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن اغلب ہے کہ انھیں اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملا ہو گا۔ یہاں ریاست میں زندگی کے آخری دن گزارنے کا ارادہ ہے۔ والدِ گرامی کا ارشاد تھا کہ نواب صاحب حشمت جنگ کے خانوادے سے تجدیدِ مراسم کی صورت میں یہاں زندگی ہمارے لیے آسان ہو جائے گی۔ نئی جگہ گھر بنانے اور معززینِ شہر سے تعارف حاصل کرنے سے کئی عبوری مسائل آڑے نہیں آئیں گے۔"

اباجان نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ وہ یہی کچھ کہہ سکتے تھے۔ مہاراجا کچھ پرسیدہ سا ہو گیا تھا اور توجّہ سے سُن رہا تھا۔ اباجان نے اُس سے کہا۔ "آپ نے غور فرمایا؟ ہیرا نواب صاحب سے اپنی رفاقت کی نشانی کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ یہاں آنے کے بعد ہمیں ایک مضبوط و مستحکم اور اقبال مند گھرانے کا تحفّظ حاصل رہے۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے، ایک پتھر کیا حیثیت رکھتا ہے۔ پتھر تو پتھر ہی ہوتا ہے۔ ہمارے پاس نہ ہوا، ہمارے کسی مُربّی، کسی عزیز کے پاس ہوا! آپ نے جن دیگر امور کی طرف اشارہ کیا ہے، اُن کے جواب میں یہ حویلی کافی ہے۔ ہم نے یہاں یہ حویلی خریدی ہے، اور ایک دن، دو دن کی بات نہیں۔ ہم یہاں مستقل سکونت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم یہاں موجود ہیں اور آپ بھی یہیں ہیں۔ بلاشبہ نواب صاحب قبلہ کے مانند ہمیں آپ کے سلوک کی بھی قدم قدم پہ ضرورت پڑے گی۔ اس کے سوا۔" اباجان تھکی ہوئی آواز میں بولے۔ "مزید ہم آپ سے اور کیا عرض کریں۔"

"ہم نے سُنا ہوا سب محفوظ کر لیا ہے۔" مہاراجا نے کسی قدر دہشت زدہ

لہجے میں کہا۔ پہلی بار اُس کے چہرے پر لکیریں اُبھری تھیں۔ "ہمارے لیے یہ بات اتنی اہم نہیں کہ آپ نے ایک دُور افتادہ شناسا کو ایک بیش قیمت پتھر سے نواز دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم اُس سے کیوں محروم رہے اور اس سے زیادہ یہ کہ ہم اُس کے متعلق اتنا کچھ کیوں نہیں جان پا رہے ہیں۔ اُس کا وجود ہیروں سے متعلق ہمارے علم کے لیے ایک آزمائش، ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے لیے یہ ایک علمی اور تحقیقی مسئلہ ہے۔ ہم زندگی بھر پتھروں کے طالبِ علم رہے ہیں۔ ہم مجرم پتھروں کے لیے کسی پولیس والے یا کسی عدالت کا درجہ رکھتے ہیں۔ پتھروں سے دوستی کم ہی لوگوں کو راس آتی ہے لیکن ہمارا ان کا معاملہ اب دوستی کی حد سے گزر گیا ہے۔ یہ عشق کی منزل ہے۔ ہم نے ان کی نسلوں اور شاخوں کی درجہ بندی کی ہے۔ اُن کے باقاعدہ خاندان ہوتے ہیں، شجرے، تاریخ اور ان کے اپنے کردار ہوتے ہیں۔ یہ کچھ غلط نہیں کہ پتھروں میں سیاروں کی سی خصوصیات ہوتی ہیں۔ عجب نہیں کہ وہ سیاروں ہی کی زمینوں کی سوغات ہوں۔ ازراہِ کرم ہمیں تفصیل سے بتائیے کہ آپ اُس بے بہا پتھر کے بارے میں اور کیا کیا جانتے ہیں؟ ہماری علمی پیاس کے لیے، ہماری سیری کے لیے ذہن پہ زور دے کر یاد کیجیے۔ شاید اسی طرح ہمیں کچھ قرار آ جائے۔"

"ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔" اباجان نے جھجکتے لہجے میں کہا۔ "والدِ مرحوم نے اسے سُپرد کرتے وقت ہدایت کی تھی کہ اگر تم اس کی مناسب حفاظت نہ کر سکو تو کسی صاحبِ نظر، کسی صاحبِ دل کو پیش کر دینا اور کچھ یہ بھی یاد پڑتا ہے، اُنھوں نے ہمیں اس کی قیمت لینے سے منع کیا تھا۔"

"قیمت لینے سے منع کیا تھا؟" مہاراجا اُچھل کے بولا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بُجھ کر رہ گیا۔ "اور کیا فرمایا تھا اُنھوں نے؟"

"اور کچھ نہیں۔" اباجان نے بظاہر سادگی سے کہا۔ "مگر جنابِ والا! کیا آپ ہمیں نہیں بتائیں گے کہ آخر وہ پتھر کون سی خصوصیت سے ممیز و مشرف تھا جو مہاراجا جیسے جوہر شناس اتنے بے چین ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق ریاست کے بعض دوسرے نوابین بھی فکرمند ہو گئے ہیں۔"

"یہاں کوئی بھی اتنا نہیں جانتا۔ اُن کی بے چینی نمائشی ہے، حرص و ہوس، حسد کی ہے۔" مہاراجا تند لہجے میں بولا۔ "یہ صرف ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے کیسا نادر پتھر نواب حشمت جنگ کو عطا کیا ہے۔ اُس کی اپنی ایک تاریخ ہے اور اگر ہمارا قیاس درست ہے تو اس کی ایک طویل اور شان دار تاریخ ہے۔"

"مناسب ہو تو کچھ ہمیں بھی بتائیے ہر چند کہ اب یہ غیر ضروری ہے۔" اباجان نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیا بتائیں۔" مہاراجا اضطراری انداز میں بولا۔ "ابھی ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ صدیوں سے گم شدہ ایک پتھر ہے۔ صدیوں سے اس کی تلاش جاری ہے اور یہ صدیوں کی گردشوں کے بعد نمودار ہوا ہے۔ اشوکا کے زمانے سے بھی اس کا تعلق ہو سکتا ہے۔ آپ نے اُس کی ساخت پر غور نہیں کیا۔ اُس کا ایک حصّہ پچکا ہوا ہے جیسے کوئی بڑا پتھر دو لخت کر دیا گیا ہو یا کسی حادثے کے سبب ایسا ہو گیا ہو۔ پچکا ہوا حصّہ تراشا نہیں گیا ہے حالانکہ ایسا ہو سکتا تھا۔ اس کی آب و تاب بالکل تر و تازہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے امینوں کو اُس کی حفاظت کا پورا احساس تھا۔ ہمیں اُس کا دوسرا حصّہ بھی دیکھنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔"

"دوسرا حصّہ!" اباجان نے حیرت سے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"وہ برطانیہ میں ہے۔"

اباجان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ گھٹی ہوئی آواز میں بولے۔ "کاش ہم آپ کو کچھ اور بتا سکتے۔"

"بہرحال، ہماری درخواست ہے کہ اپنی یادیں کریدنے کی کوشش کیجیے۔ ہم نواب حشمت جنگ سے کہیں گے کہ وہ کم از کم ہمیں اُس کا نظارہ کرتے رہنے کی خاص اجازت عطا فرما دیں۔ ممکن ہے، اسی طرح ہم کوئی کڑی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"ہمیں یہاں سے کچھ عرصے کے لیے جانا ہے۔ کوشش کریں گے کہ اس کی بابت کوئی اور سراغ مل سکے۔ آپ سے یہ سب کچھ جان کے ہمیں بھی بے کلی سی ہو گئی ہے۔"

"یہ ایک نہایت عمدہ بات ہو گی۔" مہاراجا نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "ورنہ ہم اپنے طور پر تو جستجو کرتے ہی رہیں گے۔ آپ کو دیگر امور والی بات ناگوار گزری تھی۔ ہمارا تجربہ ہے کہ اِدھر اُدھر کی انھی جزئیات اِنھی تانوں بانوں سے گوہرِ مقصود تک رسائی سہل ہوتی ہے۔ پتھر والی کی مالک شخصیات کا بھی ہمیں خوب تجربہ ہے۔ بڑے نو بہ نو لوگ ہوتے ہیں اور متضاد رویّوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک صورتِ حال میں ہر ایک کا ردِّعمل جُدا جُدا ہوتا ہے۔ ہمارا کام پہلے اُن کے رویّوں اور ردِّعمل کا تعیّن ہوتا ہے پھر اسی نسبت سے ہم اپنا طرزِ عمل طے کرتے ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت مشترک بھی ملتی ہے کہ وہ آسانی سے پردے نہیں ہٹاتے۔ بعض تو کسی کیمیاگر کی طرح دوسرے کی شرکت گناہ سمجھتے ہیں۔ سو ہمیں کبھی کبھی ایک شکاری کی طرح اُن کا تعاقب کرنا پڑتا ہے۔"

"ہمارے لیے آپ نے کون سا طرزِ عمل طے کیا ہے؟" اباجان نے

ہنس کے کہا۔ اُن کی ہنسی سے مصنوعی پن صاف عیاں تھا۔

"ہم آپ سے سچ کہیں۔ آپ کی ہر دلیل ہمیں تسلیم ہے لیکن وہ جو ایک مصرع ہے پر طبیعت اِدھر نہیں آتی۔ ہمارا یقین ابھی تک متزلزل نہیں ہوا کہ ہم ایک غلط جگہ آ گئے ہیں لیکن یہ شاید ہماری ہی کوئی کوتاہی ہے کہ اپنا اعتماد قائم نہ کر سکے۔ ہمیں شبہ ہے کہ آپ ہم پر اعتبار نہیں کر رہے ہیں۔ ہم اپنے بارے میں صرف اتنا کہیں گے کہ ہمارا خون آمیزش سے پاک ہے، ہمیں اس کے خالص ہونے پر فخر ہے۔ جہاں تک سوداگری کی بات ہے، ہم ایک بہترین سوداگر بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمارا سینہ بے شمار رازوں اور امانتوں کا امین ہے۔ اسے خود ستائی پر محمول نہ کیجیے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہم میں رفاقت کا حق ادا کرنے کی اعلا ترین صلاحیت ہے، اور جہاں تک آزمائش اور چیلنج کا تعلق ہے، ہم خندہ پیشانی سے ہمہ وقت اس کے لیے تیار رہتے ہیں چیلنج قبول کرنا ہمارا مشغلہ ہے۔ اپنے تمام اوصاف کے باوجود ہم بہرحال ایک انسان ہیں اور انسان کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔"

اباجان اُس کی صورت دیکھا کیے پھر جھرجھراتی آواز میں بولے "اِن کلمات کے جواب میں ہمارے پاس آپ کے لیے احترام اور عزّت کا اظہار ہے۔ ہمیں اپنی رفاقت کے طلب گاروں ہی میں سمجھیے۔ اجازت ہو تو ہم آپ سے عرض کریں کہ ہم بہت بے وصف لوگ ہیں۔ آپ آئے تو صحیح جگہ ہیں مگر غلط تصوّر میں۔ آدمی بھی بہت اَن مول ہوتے ہیں۔"

مہاراجا چند لمحے بے سدھ سا بیٹھا رہا، پھر دفعتہً کرسی سے اُٹھ گیا۔

"کیوں، کیوں جنابِ والا! آپ اُٹھ کیوں گئے؟" اباجان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا ہماری زبان سے کوئی ناگوارِ خاطر...؟"

"نہیں، نہیں، آپ کا بے حد شکریہ، آپ نے اتنا وقت دیا۔ ہم کھانے اور آرام کے وقت حارج ہوئے تھے۔" مہاراجا سنجیدگی سے بولا۔ "آپ سے دوبارہ مل کے خوشی ہوئی۔ امید ہے جلد ہی پھر ملاقات ہوگی۔"

"ہم حاضر ہوں گے۔" اباجان نے بے تابی سے کہا۔

"کب تک یہاں سے جانے کا ارادہ ہے؟"

"ابھی کچھ طے نہیں ہے لیکن جلد ہی۔" اباجان نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"ابھی شاید دیر لگے۔" بجھل نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ مہاراجا نے گھوم کے اُس کی طرف غور سے دیکھا اور مسکرا کے رہ گیا۔

"واپسی میں۔ آپ ہمیں مہمانی کے لیے کچھ وقت دیں گے۔" دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بولا۔

"ضرور، ضرور، یہ تو ہمارے لیے عزّت ہے۔" اباجان نے کہا۔

مہاراجا کمرے سے نکل کے چبوترے پر آ گیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا سامنے کھڑی ہوئی موٹر میں بیٹھ گیا۔

کانتے اور مارٹی کمرے کے باہر ہی منڈلاتے رہے۔ وہ مہاراجا کے جاتے ہی لپکتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ کانتے بہت بے قرار نظر آ رہا تھا۔ اُس سے ایک لمحے بھی چُپ نہ رہا گیا، آتے ہی بجھل سے پوچھنے لگا "سب ٹھیک تو ہے اُستاد؟"

"ہاں رے!" بجھل نے جھڑکتے لہجے میں جواب دیا۔

"کون تھا یہ؟"

"کوئی بے تاج کا تھا۔"

کانتے ہنسنے لگا۔ بجھل نے اُسے گھور کے دیکھا تو اُس کا سارا جسم بل کھا گیا۔ اچھا ہوا، کانتے اُس وقت بجھل کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اسی دوران پیرو بجھل کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے آگے بڑھ گیا۔

میرا خیال تھا، کمرے میں واپس آ کے اباجان پیرو سے ضرور پوچھیں گے کہ اب اُس کی کیا رائے ہے لیکن وہ کرسی پر سر جھکائے بیٹھے رہے اُنھوں نے کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ممکن ہے مہاراجا کی باتیں سُن کے اب اُنھیں ملال ہو رہا ہو کہ اُنھوں نے نواب حشمت جنگ کو ہیرا پیش کرنے میں ایسی عجلت کیوں کی۔ اُن کے پاس تھیلی میں اور بھی ہیرے تھے۔ ہو سکتا ہے، سوچ رہے ہوں کہ اُنھوں نے کوئی دوسرا، دوسرا کم تر درجے کا پتھر کیوں نہ منتخب کر لیا۔ مارٹی اور کانتے بھی ہمارے پیچھے پیچھے اندر آ گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں شامو اور جمرو بھی چپکے سے آ کے بیٹھ گئے۔ اُن کے اضافے کے باوجود کمرے پر چھائے ہوئے سنّاٹے میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بہت دیر بعد پیرو کی آواز نے یہ خاموشی توڑی۔ جو سوال اباجان کو پیرو سے کرنا چاہیے تھا، وہ پیرو نے بجھل سے کیا۔ "ابھی کیا بولتا ہے بجھل بھائی؟"

"کیا بولیں دادا!" بجھل نے حُقّے کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"ابھی ٹھیک سے گیا ہے نا وہ راجا کا جنا؟"

"دکھائی تو ایسا ہی پڑتا تھا دادا!"

"ہاں قسم، اپن تم کو دیکھ کے رہ جاتا تھا۔" پیرو مچل کے بولا۔

"لگتا ہے، ایدر کچھ دن اور رہ گیا تو سب بھول جائے گا۔ یہ زبان، ہاتھ پیر ابھی سب اکڑ کے رہ جائے گا بجھل بھائی! اپن اودر لوٹ کے آدھا بھی نئیں رہے گا۔"

"اپنا بھی کچھ یہی ہے دادا!"

"اُستاد!" کانتے دبی دبی آواز سے بیچ میں بولا۔ "ابھی تم کو ایک بات بولنا تھی!"

"لگتا ہے کمر تیری پھر مچیا گئی ہے۔"

"قسم سے اُستاد مُنہ کی بات چھین لی۔ کمر کیدر سے سیدھی ہوگی۔ بھتا ملے دن بھی کتے ہو گئے۔" کانتے تیز لہجے میں بولا۔ "بعد کو جو من میں آئے کر لینا، پر پہلے اپنی بات ذرا دھیان سے سُن لو۔"

"کیا ہے دادا؟" پیرو نے نرمی سے پوچھا۔

"دادا!" کانتے نے لپکتی آواز میں کہا۔ "ابھی ہم لوگ باہر تھوڑی ہوا کھانے کو نکلے تھے، اُدھر اپنے کو شبہ ہے کہ آدمی لگے ہوئے ہیں۔"

بجھل کی تُند نظریں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ "کیا بولتا ہے؟"

"ہاں اُستاد!" کانتے نگاہیں چُرا کے بولا۔ "مارٹی سے پوچھو، اِدھر یہ کئی دن سے اُن کو چکّر کھاتے دیکھ رہا ہے۔"

اباجان بھی چونک پڑے۔ "کیا کہہ رہے ہو کانتے؟"

"ہاں بابا! اپنے کو ایک نہیں، اِدھر کئی آدمی پر شبہ ہے۔"

"تم نے اپن کو پہلے کیوں نئیں بولا ماسٹر؟" پیرو نے پُھنکارتے لہجے میں مارٹی سے پوچھا۔

"اپن بولنے ہی کو تھا۔" مارٹی نے سراسیمگی سے کہا۔ "اپن سوچا، ابھی تم تھوڑا ایسٹ ہو جاؤ۔ ایک دم سب تھکا ہوا لگتا تھا۔"

"ماسٹر! تم ایک دم اُلّو کا پٹھا ہے۔" پیرو کو اباجان کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ مارٹی کو گالیاں دینے لگا۔

"ذرا صبر سے۔" اباجان نے دھڑکتی آواز میں کہا اور مارٹی سے پوچھا کہ اُسے کیسے شبہ ہوا؟ کتنے آدمی ہیں؟ کب سے وہ اُنھیں دیکھ رہا ہے؟ مارٹی نے جھجکتی زبان میں اُنھیں بتایا کہ وہ کوئی چار روز سے اُنھیں دیکھ رہا ہے۔ ابھی وہ ٹھیک طرح تین آدمیوں کی نشان دہی کر پایا ہے۔ اُن کی ڈیوٹیاں بدلتی رہتی ہیں۔ ایک تو دن بھر نکڑ پر واقع پان اور پرچون کی واحد دُکان کے اِردگرد ٹہلتا رہتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اُنھوں نے چوں کہ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی اس لیے وہ بھی چُپ رہا۔ اُسے ہم لوگوں کی واپسی کا انتظار تھا۔

مارٹی کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ پیرو اُٹھ گیا۔ "اپن کے ساتھ چل ماسٹر! اپن بھی اُس کو دیکھنا مانگتا ہے۔"

بجھل بھی اُٹھ گیا۔ اباجان بھی ہمارے ساتھ باہر آنا چاہتے تھے لیکن پیرو نے اُنھیں روک دیا۔ مارٹی اور شامو بھی اُن کی وجہ سے ٹھیر گئے۔ صرف میں، بجھل پیرو اور کانتے باہر نکلے۔

رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ دوسری حویلیوں کی روش کے مطابق اُونچے فیل قامت دروازے کے ایک پٹ میں کھڑکی دروازہ بھی بنا ہوا تھا — چوکی دار نے وہی کھول دیا۔ باہر نکلتے ہی کانتے نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے بھی دیکھ لیا تھا کہ سڑک کے اُس پار سامنے والی حویلی کے میدان میں ایک ٹھیلے والا موجود ہے۔ آگے بڑھنے کے بجائے ہم اردگرد کا جائزہ لینے کے لیے کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہے۔ حویلی سے آگے گزرنے والی سڑک دروازے سے کچھ فاصلے پر تھی۔ یہ سڑک دونوں اطراف سے کُھلے ہوئے ایک میدان کے بیچ سے گزرتی تھی۔ میدان میں کہیں کہیں درخت اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور ہر جانب خاموشی طاری تھی۔ آگے نکڑ پر پان اور پرچون کی دُکان بھی بند ہو گئی تھی۔ یہ سارا علاقہ بڑے بڑے مکانات، کوٹھیوں اور حویلیوں پر مشتمل تھا۔ رات کو ویسے بھی یہاں سکوت چھا جاتا ہو گا۔ سڑک پر نصب کھمبوں کی قطار کے علاوہ مکانات کے جلتے قمقموں نے یہاں سے وہاں تک سڑک روشن کر رکھی تھی لیکن درختوں کی وجہ سے سڑک پر روشنی دھبّوں کی شکل میں پڑ رہی تھی۔

اتنی رات کو اس جگہ ٹھیلے والے کی موجودگی بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس پر کاربوریٹ کا مشعل نما چراغ روشن تھا اور مونگ پھلی کا ڈھیر، گزک ریوڑیاں وغیرہ دور سے صاف نظر آ رہی تھیں۔ دو آدمی ٹھیلے والے کے پاس کھڑے تھے، اُن کا رُخ ہماری طرف نہیں تھا۔ پھر ٹھیلے والے ہی نے اشارہ کیا ہو گا، جبھی وہ دونوں تیزی سے پلٹ پڑے، عین اُسی لمحے ٹھیلے والے نے ہانک لگائی۔ اِدھر سے سائکل کی گھنٹی کی آواز آئی۔ ٹھیلے پر کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک آگے بڑھ گیا اور سائکل سوار ہماری جانب سرسری انداز میں دیکھتا ہوا ٹھیلے والے کے پاس جا کے ٹھیر گیا۔ پیرو کی ہدایت کے مطابق میں اور کانتے دائیں طرف نکڑ کے راستے پر چل دیے تھے۔ وہ اور بجھل ہماری مخالف سمت نکل گئے۔ کچھ دُور جانے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ کانتے ٹھیک کہہ رہا تھا، سڑک پر سائکلوں کی گھنٹیوں کی آواز بڑھ گئی تھی اور ٹھیلے والے کی ہانکیں بھی۔ نکڑ تک ہمارے پہنچتے پہنچتے دو سائکل سوار اِدھر سے اُدھر تیزی سے گزر گئے تھے۔ رات میں ان کی پہچان مشکل تھی۔ سردی بس خنکی کی حد تک تھی لیکن ایک سائکل سوار نے جسم پر چادر لپیٹ رکھی تھی، دوسرا اُوور کوٹ جیسے کسی لباس میں ملبوس تھا۔ نکڑ اصل میں ایک چوراہا تھا۔ اس کے بائیں طرف کی سڑک پر کچھ آگے جا کے ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ وہاں ہوٹل، مٹھائی اور پان کی دکانیں شاید کُھلی ہوئی تھیں، اب تک تیز روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ہم اُس طرف نہیں گئے بلکہ نکڑ سے دائیں طرف اپنی حویلی کی چار دیواری کی طرف مُڑ گئے۔ ہماری حویلی کی چار دیواری اور پڑوس کی دوسری حویلی کی چار دیواری کے درمیان ایک کشادہ اور غیر آباد گلی تھی، جہاں بے تحاشا جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور اندھیرا غالب تھا۔ اُس جگہ آسانی سے کئی آدمی چُھپ سکتے تھے لیکن ہم اُدھر اُن کی تلاش میں نہیں گئے کیونکہ وہاں اُن کے چُھپنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اتنی دیر میں تین

تانگے، دو موٹریں، ایک سائکل رکشا، کئی سائکل سوار اور چند پیدل آدمی ہمیں سڑک پر گزرتے ہوئے نظر آئے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک پر شبہ کیا جاسکتا تھا۔ حویلی کے خاص دروازے کے سامنے والی سڑک نکڑ کے دونوں جانب دُور تک چلی گئی تھی۔ اِدھر اُدھر دوسری بستیوں تک جانے کے لیے یہی ایک عام راستہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں ابھی تک آمدورفت جاری تھی۔ ہم بھی اُس سڑک سے گزرتے ہوئے بڑے نواب کی حویلی سے واپس آئے تھے۔

جہاں ہماری حویلی کی چاردیواری ختم ہوتی تھی، وہاں سے چند گز آگے جا کے کلنتے لوٹ گیا اور مجھ سے سرگوشی میں پوچھنے لگا "دیکھا لاڈلے؟"

"دیکھ رہا ہوں" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

"تو کیا سمجھتا ہے، اِن لوگ کا کیا مطلب ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں"

"کوئی تو مطلب ہوگا لاڈلے!"

"ابھی تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ حویلی آنے جانے والوں پر اور ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کا کوئی اور مقصد ہوتا تو وہ راستے میں روکنے ٹوکنے کی ضرور کوشش کرتے"

کلنتے مجھ سے ایسے پوچھ رہا تھا جیسے ساری باتوں کے جواب مجھے معلوم ہوں۔ ہم دوبارہ نکڑ پر آگئے۔ ہم دونوں ہر طرح چوکنا تھے۔ چلتے وقت مارٹی نے چپکے سے چاقو میرے حوالے کر دیا تھا اور میں نے واسکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا تھا۔ نکڑ سے واپسی کے راستے میں کلنتے نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میری مرضی ہو تو وہ کسی کو روک کے دیکھے۔ میری کچھ عقل میں نہیں آرہا تھا۔ اتنے میں ایک سائکل سوار سگریٹ پھونکتا ہمارے قریب سے گزرا۔ میں کلنتے سے کہنے والا تھا کہ کسی کو روکنے ٹوکنے سے پہلے بہتر ہے، پیرو اور بجھل سے مشورہ کر لیا جائے مگر کلنتے نے سائکل سوار کو آواز دے دی۔ آواز سُننے کے باوجود وہ فوراً نہیں رُکا، اِس کا فیصلہ اُس نے کچھ دُور جا کے کیا، سائکل ٹھیرا کے اُس نے ہماری طرف دیکھا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا "کیا بات ہے؟"

کلنتے نے اُس سے جلتا ہوا سگریٹ مانگا اور اپنی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال لیا۔ سائکل سوار نے سگریٹ کے بجائے جیبیں ٹٹول کے ماچس کلنتے کے آگے کر دی۔ میں نے اچھی طرح اُس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اُس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان ہوگی۔ رنگت سیاہ تھی اور آنکھیں گہری گہری۔ نہ وہ اڈے کا آدمی معلوم ہوتا تھا، نہ پولیس سے اُس کا تعلق ہوسکتا تھا۔ ماچس دیتے ہوئے بھی اُس کے انداز میں گھبراہٹ تھی۔ کلنتے نے ایک تیلی جلا کے دانستہ بجھا دی تھی۔ دوسری تیلی سے بھی اُس نے یہی سلوک کیا اور من مناتے ہوئے کہنے لگا "سردی پڑنے لگی ہے" سائکل سوار چُپ رہا۔ کلنتے نے تیسری تیلی جلا کے بیڑی سُلگائی اور اُس کا شکریہ ادا کیے بغیر ماچس واپس کر دی "اِدھر قریب کوئی پان بیڑی کی دکان ہوگی اُستاد؟" کلنتے نے اُس سے پوچھا۔ سائکل سوار نے چند لمحوں کی جھجک کے بعد جواب دیا کہ کچھ فاصلے پر ہوٹل کے برابر والی دکان کھُلی ہے۔

"آپ کیا داڑھی لگا کے آرہے ہو؟"

سائکل سوار کلنتے کے غیر متوقع سوال پر ہکلا کر بولا "ہاں، ہاں" پھر فوراً اُس نے ترمیم کی اور خالص حیدرآبادی لہجے میں بولا "نئیں بادا! اپن ایسے ہی اپنے کاماں کو جاتے ہیں"

مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں کلنتے کے من میں کچھ اور نہ سما جائے اور وہ اُس پر ہاتھ نہ چھوڑ بیٹھے "کوئی ضروری ہی کام دکھائی پڑتا ہے" کلنتے طنزیہ انداز میں اُس سے بولا "جو ایسے سمے باہر نکلے ہو راجا!"

روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن اُس کے چہرے کے نقش و نگار آسانی سے دیکھے جاسکتے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو کلنتے کے اس اندازِ بیان پر اُس سے اُلجھ پڑتا۔ اُس شخص کی آنکھوں سے بے چینی ہویدا ہونے لگی تھی جیسے وہ رسّی تڑا کے بھاگ جانے کی فکر میں ہو۔ کلنتے نے ایک لمحے کے لیے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا، وہ میرے اشارے کا منتظر تھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اُسے منع کرنا چاہا۔ کلنتے کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کے اُسے سائکل سے نیچے کھینچ لے "کوئی ایسی ویسی بات ہو تو ایمان سے اپنے کو بولو" کلنتے آنکھ مار کے بولا۔

"آپ کیا، کیا بول رہے ہو حضت" اُس شخص نے عاجزی سے کہا۔

"سچی بولیں، اپنے کو کچھ کالا لگ رہا ہے پہلوان!"

"کیسا کالا حضت!"

اُس شخص نے بڑبڑاتے ہوئے پیڈل پر پاؤں مار کے بھاگنا چاہا لیکن کلنتے نے پہلے ہی سائکل کا مڈگارڈ تھام رکھا تھا۔ سائکل لہرا کے رہ گئی "ایسی جلدی بھی کیا ہے"

"ہم کو جانا ہے حضت" وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔

"کس کو اُدھر رُکنا ہے" کلنتے نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ہم کو معاف کرو صاحب!" سائکل سوار نے منت کی۔

"کاہے کی معافی؟"

"ہم کو دیر ہو رہی ہے"

"کدھر جانے کا ہے؟"

"ہم بولے حضت، ہم کو کام ہے"

"یہی تو پوچھ رہے ہیں اُستاد، کوئی مال وال کا چکر ہے یا کچھ اور؟"

"نئیں حضت" وہ بری طرح سٹ پٹا گیا "آپ کیا سمجھ رہے ہو؟"

"پھر کوئی پری چھم رہتی ہے اِدھر کیا؟"

"آپ کیسا بولتے ہو حضت" وہ بدحواسی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا جیسے کسی طرف سے اُسے مدد کی توقع ہو۔

"کدھر رہتا ہے تم؟"

"اِدھر، ہم یہیں قریب رہتے ہیں"

"قریب کدھر؟"

"اُس طرف پیچھے گلی میں"

"پھر اِدھر تمھاری ماں کے یار رہتے ہیں کیا؟" کلنتے نے جان بوجھ کے یہ کہا تھا۔ سائکل سوار کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھڑک اٹھی تھیں لیکن دوسرے ہی لمحے بجھ گئیں "کیوں بولتی کیوں بند ہوگئی؟ ایسا ہی ہے کیا؟"

"آپ کو ضرور کوئی دھوکا ہوگیا ہے حضت"

"پھر تم اپنے کو دیکھ کے آنا کیوں اُٹام ہوگیا ہے؟"

"نئیں بادا صاحب! اپنی کوئی غلطی دیکھی ہے آپ نے! ہم سیدھے سادے آدمی ہیں، غریب آدمی ہیں" وہ گھگھیا کے بولا۔ اُس سے صحیح طرح بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔

"وہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔ تم کتنا نیچے اُوپر ہے۔ دھوکا تم کو ہو رہا ہے سوّر کی اولاد!" میں نے کلنتے کا ہاتھ دبا کے اُسے روکا۔ کلنتے بھٹکتا جا رہا تھا۔ ہمیں اپنی جانب سے کوئی پیش قدمی نہیں کرنی چاہیے تھی حالانکہ کلنتے کی طرح میرا بھی جی یہی چاہتا تھا کہ اُسے سائکل سے نیچے گھسیٹ لوں۔ کلنتے نے جھٹکا دے کے سائکل کا مڈگارڈ چھوڑ دیا "تم اپنے کو تھوڑا قسمت کا تیز لگتا ہے پر اپنے کو دوبارہ اِدھر دکھائی دیا تو زبان سے بات نہیں کریں گے۔ جتنا تم زمین سے اُوپر ہے نا، اتنا ہی نیچے ہو جائے گا"

اُس نے کلنتے سے کچھ نہیں کہا۔ پیڈل پر پاؤں مارا اور آناً فاناً ہماری نظروں سے دُور ہونے لگا۔ اُدھر سامنے سے ایک پیدل شخص بھی تیزی سے اُس کی طرف آرہا تھا۔ دونوں کا آمنا سامنا ہوا لیکن پیدل شخص کے ٹھیر جانے اور آواز دینے کے باوجود سائکل سوار کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ گھنٹی بجاتا اُس کے پاس سے گزر گیا۔ اس موقع پر گھنٹی کوئی اشارہ ہی ہوسکتی تھی۔ کلنتے مجھ سے رائے پوچھنے لگا۔ میرا دماغ خود کام نہیں کر رہا تھا، میں اُس سے کیا کہتا۔ بہرحال اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ کلنتے نے ٹھیک آدمی پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اُسے دیکھ کے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی دشوار نہیں تھا کہ اُس کے دوسرے ساتھی بھی اُسی جیسے ہوں گے اور اُن کی حیثیت تعمیل کرنے والوں کی ہے، حکم دینے والے دوسرے ہیں۔ حکم دینے والوں نے سرِدست انھیں صرف حویلی کی نگرانی کے لیے کہا ہے۔ مگر اس نگرانی سے حاصل کیا ہے؟ اس طرح وہ کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ میں یہ مقصد اپنے ذہن میں جتنا واضح کرنے کی کوشش کرتا تھا وہ اتنا ہی دُھندلا جاتا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم بڑے نواب کی حویلی میں ٹھیرے رہتے اور وہیں سے اپنے سفر پر روانہ ہو جاتے۔ ہماری نقل و حرکت اور حویلی میں ہمارے پاس آنے جانے والوں کو نظر میں رکھنے کے لیے یہ چند لوگ تعینات کیے گئے ہیں تو آگے جلد از جلد اطلاع پہنچانے کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہوگا اور حویلی تک ہی کیوں، وہ حویلی کے باہر بھی ہمارے تعاقب کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ لازماً پھر اُن کی تعداد بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ اطلاع پہنچانے اور تعاقب کرنے کے لیے اُن کے پاس تیز رفتار سواریوں کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قریب ہی کسی مکان سے اُن کا رابطہ ہو جہاں سے دوسرا حکم فوراً جاری کیا جاسکے۔ یہاں سب بڑے بڑے مکانات ہیں۔ بعض گھروں میں ٹیلی فون بھی ہوں گے۔ سائکلیں تو ان کے پاس موجود ہیں۔ حویلی سے ہمارے پیدل نکلنے کی صورت میں انھیں سائکل کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میرے سر میں طرح طرح کے اندیشے بھن بھنا رہے تھے۔

پیدل شخص بھی ہمارے قریب آگیا تھا۔ کلنتے کے ہاتھوں میں سختی آگئی۔ میرا ہاتھ دبا کے سرگوشی میں بولا "کیا بولتا ہے لاڈلے! ابھی اس کو بھی دیکھیں، کِتّے دانت کا ہے؟"

وہ شخص چلتے چلتے دوسری جانب ہمارے مقابل سڑک کے کنارے ہوگیا تھا۔ قد کا لمبا، چادر کندھے پر ڈالے ہوئے۔ چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ کلنتے کی بازپرس کے بعد سائکل سوار کا حویلی کے گرد دوبارہ دکھائی دینے کا امکان نہیں رہا تھا۔ اس دوسرے شخص کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاسکتا تھا۔ میرا بھی یہی جی چاہ رہا تھا لیکن میں نے کلنتے کو روک دیا۔ یوں ہم بہ آسانی اُن سے اُن کے آقا کا نام معلوم کرسکتے تھے۔ آسانی سے نہیں تو ایک کوشش ضرور کی جاسکتی تھی۔ میرے پاس بھی چاقو تھا، کلنتے کے پاس بھی ہوگا اور اس کی نوبت بھی شاید نہ آتی۔ کلنتے میرے انکار پر جز بز ہونے لگا۔ بجھل اور پیرو بھی یہی کچھ جاننے کے لیے باہر نکلے تھے، اُن کی منشا کے بغیر ہمیں خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ آس پاس کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ ہم واپس حویلی کی طرف بڑھتے رہے۔ اسی اثنا میں پیدل شخص آگے نکل گیا۔ ہم نے مڑ کے دو ایک بار اُسے دیکھا بھی۔ وہ سیدھا ہی چلتا رہا مگر نکڑ پر جا کے اُس نے پلٹ کے ہماری جانب ایک اُچٹتی نگاہ ڈالنا ضروری سمجھا اور بازار جانے والے راستے کی طرف مڑ گیا۔ "لاڈلے!" کلنتے بے قراری سے بولا "اِدھر اپنے ہاتھوں میں بہت کھُجلی ہو رہی ہے اپنے کو اُن کی گنتی زیادہ نہیں لگتی"

"ذرا صبر کرو، بجھل بھائی کو واپس آنے دو"

"ماں قسم اِدھر جگر کی کمتائی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"ٹھکانے لگانے کے لیے ابھی رات بھی پوری پڑی ہے۔" کلنتے سرد آواز میں بولا۔

"تمھارا مطلب ہے، تمھارا مطلب ہے کہ؟"

"ہاں لاڈلے! جھٹکا۔" کلنتے کی آواز جل رہی تھی۔ "جس گیدڑ کی اولاد نے ان کو اِدھر بھیجا ہے، سالا زندگی بھر کتّے کی طرح گھورے گھورے سونگھتا پھرے گا۔"

"تم اپنے ہوش میں تو ہو؟"

"کیوں لاڈلے! تیری سمجھ میں نہیں آرہا؟"

"آرہا ہے لیکن کلنتے! کلنتے بھائی ---- معلوم ہوتا ہے، تم اپنے اوسان میں نہیں ہو۔ تم واقعی بہت تھک گئے ہو۔"

"شاید تو ٹھیک ہی بولتا ہے پر لاڈلے! اپنے کو آگے اچھا دکھائی نہیں دے رہا۔"

"میں تم سے خود بھی کہنے والا تھا مگر کلنتے بھائی! ابھی کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ پہلے ہمیں کسی نتیجے پر پہنچنا ضروری ہے۔"

"کیا تو سمجھتا ہے، ان کو اِدھر اپنے سُسرالیوں نے رکھوالی کے لیے بھیجا ہے؟ ہاتھ لگنے پر یہ اپنے کو چھوڑ دیں گے؟ قسم سے رتّی بھر بھی دیری نہیں کریں گے۔ اس سے پہلے ہی ان کو کچھ بول دینا ٹھیک ہوگا۔"

"تم اتنا آگے کیوں سوچ رہے ہو؟"

کلنتے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا اور بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ "میں تجھ کو کیا بولوں۔ اپنے کو لگ رہا ہے، دیر ہو جانے سے سالا بہت اُلٹ بھی ہو سکتا ہے۔"

ہم حویلی کے صدر دروازے سے ابھی دُور تھے کہ سامنے سے بتّھل اور پیرو آتے دکھائی دیے۔ ٹھیلے والا اپنی جگہ سے چند قدم آگے چلا گیا تھا۔ اب اُس کے پاس کوئی خریدار نہیں تھا۔ بتّھل اور پیرو کے نزدیک آجانے پر وہ رُک گیا اور ہانک لگانے لگا لیکن اُس کی آواز میں جھرجھراہٹ آگئی تھی۔ بتّھل اور پیرو نے اُس سے گزک اور ریوڑیاں طلب کی ہوں گی، اُس نے ترازو اُٹھا لی تھی۔ ہم دُور سے اس کے ہاتھوں کا اضطراب دیکھ سکتے تھے۔ جتنی دیر میں اُس نے سوکھے پتّوں کے دونے میں گزک اور ریوڑیاں تولیں۔ ہم دونوں بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھ کے اُس کے ہاتھوں پیروں کا ہیجان دوچند ہو گیا تھا۔ اردگرد نزدیک دُور بظاہر کوئی نظر نہیں آرہا تھا، تو پھر پھونک مار کے دوسرے ہی لمحے اُس سے نمٹا جا سکتا تھا اور نُو بجھانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اُلجھنے کے لیے ارادہ ہی کافی تھا لیکن پیرو اور بتّھل ٹھیلے پر کھڑے اُس کی صورت دیکھ رہے۔ سیاہی مائل، تنومند جسم، تلوار کی طرح چھوٹی چھوٹی مونچھیں صاف، دھوتی پر بوسیدہ کوٹ پہنے ہوئے، ٹھیلے والا نگاہیں اوپر نہ اُٹھا رہا تھا۔ دونا پیرو کے حوالے کرتے وقت بھی اُس کی آنکھیں جھکی ر ہم بھی وہاں جا کے خاموش کھڑے ہو گئے۔ بتّھل اور پیرو سے نمٹ اُسے ہماری طرف متوجہ ہونا چاہیے تھا لیکن اُس نے ہمیں پیرو اور بتّھل ساتھی ہی سمجھا تھا۔ جب کہ میں نے اور کلنتے نے وہاں پہنچ کے اُ سے کسی قسم کی وابستگی ظاہر نہیں کی تھی، نہ بتّھل اور پیرو نے ہمیں دیکھ ہم سے اپنے کسی ربط و تعلق کا اظہار کیا تھا۔ گویا ٹھیلے والے کی نظریں بھی پرکھ رہی تھیں۔ اُس نے ہمیں سامنے حویلی کے صدر دروازے سے نک کے جُدا ہوتے اور مخالف سمتوں میں جاتے ہوئے اچھی طرح دیکھا تھا بدحواسی میں اُسے اس احتیاط کا خیال نہیں رہا کہ اُسے اپنی جانب سے ہم دونوں کو الگ الگ سمجھنے ہی کا تاثر دینا چاہیے تھا۔ دونا لے کے پ نے آنکھ دبائی اور راز دارانہ لہجے میں بولا۔ "اپن کو ابھی نوا نوا دکھائی ہے سیٹھ!"

اُس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ دانت نکال کے جلدی جلدی سر ہلانے لگا۔ "ابھی رات کو کب تک یہ میلا لگتا ہے مائی باپ!" پیرو نے ہنستے ہوئے اُس سے پوچھا۔

اُس کی زبان سے بہ مشکل تمام ادا ہو سکا "بس بس، تھوڑی دیر تک اور۔" پیرو کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ بتّھل کی طرف دیکھ کے ٹھہر گیا۔ چند لمحے وہ اُس کے سامنے کھڑے ریوڑیاں ٹونگتے اُسے گھورتے رہے۔ اُنھوں نے پیسے بھی ادا نہیں کیے تھے، نہ ٹھیلے والے نے اُن سے طلب کیے۔ ہم اُن میں سے ایک ایک کو چُن کے کم از کم اتنا ضرور کر سکتے تھے کہ دوبارہ اس طرف کبھی نظر نہ آئیں۔ اس طرح اُن میں سے کسی ایک کی زبا ہمیں اُن کے بھیجنے والے کی نشان دہی بھی ہو سکتی تھی۔ ابتدا اُسی ٹھیلے والے سے ہونی چاہیے تھی مگر ابھی سے اُس کا یہ حال تھا تو چاقو کی ایک جھلک دیکھ کے کیا ہوتا۔ میں اور کلنتے دونوں مستعد تھے لیکن بتّھل نے ایسا کوئی اشارہ ہی نہیں کیا کہ ہم آگے بڑھ کے اُس کی گردن دبوچ سکتے۔ اسی دوران سڑک پر گزرتی موٹر کی تیز روشنی میں ہم چاروں نہا گئے، پھر ایک تانگا گزرا۔ بتّھل وہاں سے ہٹ گیا اور درمیانی فاصلہ عبور کر کے صدر دروازے کے پاس آگیا۔ دربان باہر ہی کھڑا تھا۔ ہم دوبارہ حویلی میں داخل ہو گئے۔

ابّا جان دالان میں ہمارے منتظر تھے۔ بتّھل اُن کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اندر لے آیا۔ ابّا جان نے ہم سے کچھ پوچھا نہیں تھا۔ کمرے میں آ کے بھی وہ خاموش رہے لیکن وہ سراپا سوال بنے ہوئے تھے۔ بتّھل نے کرسی پر بیٹھ کے حُقّے کے تین چار لمبے لمبے کش لیے اور بھاری آواز میں بولا۔ "بابا! اپنی بات ذرا ٹھنڈے دل سے سنو۔ آپ جلد سے جلد اِدھر سے نکل جاؤ۔"

"جی!" ابّا جان نے حیرت سے کہا۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہم ٹھیک ہی بول رہے ہیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب صاف ہے بابا! اپنی سمجھ میں ابھی ایک یہی بات آتی ہے۔" بتّھل نے سکون سے کہا۔

"اور آپ، آپ؟ ----" ابّا جان بے چینی سے بولے۔

"ہم لوگ ابھی اِدھر ہی ٹھہریں گے۔ اپنی بات سمجھنے کی کوشش کرو بابا!" بتّھل نے آہستگی سے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔" ابّا جان کے لہجے میں ترشی آگئی تھی۔

"اِدھر وہ حویلی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں پر ہم باہر جا کے ابھی اُن کو آسانی سے اُلجھا سکتے ہیں۔ بیچ میں آپ نکل کے کوئی بھی گاڑی پکڑ سکتے ہو۔ بعد کو کچھ ہوگا تو ہم دیکھ لیں گے۔ آپ کے جانے کے بعد پھر اُن کو اپنی اتنی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔"

"یعنی آپ کا مقصد ہے کہ مجھے آپ کو چھوڑ کے یہاں سے چلا جانا چاہیے؟" ابّا جان نے تکرار کی۔

"ہاں! یہی بولا ہے آپ سے۔ سویرے اِدھر نواب حشمت جنگ آئے گا تو ہم اُس کو کچھ بھی بول دیں گے کہ آپ کا جانا ضروری ہو گیا تھا۔ آپ کا تار آگیا تھا۔ دو تین دن کی بات ہے، پھر اُدھر بمبئی میں ہم آپ سے آکے مل ہی لیں گے۔"

"گویا آپ صورتِ حال کو اس حد تک ---- اس حد تک؟ ---" ابّا جان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"احتیاط میں کیا جاتا ہے بابا!"

"ایسا ہی ہے تو سب ساتھ ساتھ کیوں نہ چلیں؟ کیا اس وقت یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ اِدھر ہم نکلیں، اُدھر پیچھے پیچھے آپ آجائیں؟"

"کوشش کریں تو شاید ایسا بھی ہو جائے پر ایک ساتھ سب کا نکل جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ شام آپ ہی بولتے تھے کہ خانم ابھی بڑے نواب کی حویلی میں ہے۔ باری باری جانے میں بھاگنے کا مطلب نہیں لیا جائے گا۔"

"میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ میں آپ کو چھوڑ کے خود چلا جاؤں۔" ابّا جان نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہ ہم کسی دوسری صورت پر غور کریں۔"

"دوسری کوئی صورت ہو تو آپ بولو۔"

"میرا خیال ہے، ہمیں ایسی عجلت نہیں کرنی چاہیے، تحمل سے سوچنا چاہیے، عجلت سے نتائج دیگر بھی نکل سکتے ہیں۔"

"اپن نے سوچ سمجھ کے بولا ہے بابا!" پیرو نے درمیان میں کہا۔ "بتّھل بھائی ایک دم ٹھیک بولتے ہیں۔ آپ کو ابھی یاں سے چلا جانا چاہیے۔ اپن کا کوئی ایسا دھیان مت کرو، اپن دیکھ لیں گے۔ اپنے ساتھ مارٹی اور زورا کو بھی لیتے جاؤ۔"

میرے جی میں آئی کہ میں اُن سے کہہ دوں، ابّا جان کے ساتھ جانے والے لوگوں کی فہرست سے وہ مجھے خارج سمجھیں۔ میں بتّھل اور پیرو کے ساتھ یہیں رہوں گا لیکن ابّا جان کی وجہ سے میری زبان اینٹھ کے رہ گئی۔ ابّا جان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پیرو نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ وہی کچھ جو بتّھل نے ابّا جان سے کہا تھا۔ پیرو نے اُن سے کہا کہ یہ ایک ریاست ہے، یہاں کے قاعدے قانون دوسری جگہوں جیسے نہیں ہیں۔ کسی بھی لمحے کوئی گرہ پڑ سکتی ہے یا ڈالی جا سکتی ہے۔ سو وقت اب اگر کچھ رعایت دے رہا ہے تو اُسے گنوانا نہیں چاہیے۔ مزید کسی پیچیدگی سے دوچار ہونے سے پہلے ہی کوئی قدم اُٹھا لینا بہتر ہوگا۔ پیرو نے اشارۃً ابّا جان سے یہ بھی کہا کہ اُن کی موجودگی سے وہ اپنے ہاتھ بندھے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔

"میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔" ابّا جان لپکتی آواز میں بولے۔ "کیوں نہ ہم سویرے نواب حشمت جنگ سے رابطہ قائم کر کے اُنھی سے درخواست کریں کہ وہ ہمیں اپنی نگرانی میں شہر سے رخصت کریں۔ اُن کی طرف سے ممکن ہے ابھی آپ کا دل صاف نہ ہو۔ ہر چند کہ میری رائے ابھی تک بے داغ ہے تاہم فرض کر لیا جائے کہ در پردہ سب اُنھی کی کرشمہ سازی ہے تو بھی ہم اُنھی سے یہ مطالبہ کیوں نہ کریں۔ مروّت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ یوں بھی ایسی صورت میں کسی ایک شخص کو تو ہمیں اعتماد میں لینا ہی چاہیے۔ ہم اُنھی کو سپر کیوں نہ بنائیں۔ نواب حشمت جنگ ریاست کے ایک باحیثیت شخص ہونے کے علاوہ ایک ذمے دار عہدے دار بھی ہیں۔ آپ نے غور فرمایا! اس طرح ہم ----" ابّا جان نے رُک کے سوالیہ نظروں سے بتّھل کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"پر بیچ میں وقت کم نہیں پڑا ہے۔" بتّھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب!" ابّا جان بے چینی سے بولے۔ "صرف ایک رات تو درمیان میں باقی ہے۔ ہم کل سویرے پہلا کام یہی کریں گے اور صبح ہی کسی وقت یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

"پر اپن کو کوئی دیر بھی کیوں کرنی چاہیے۔" پیرو بڑبڑاتے ہوئے

بولا "آپ ایک دم سب ٹھیک بول رہے ہو۔ ابھی کچھ ایسا ہی کرنا ہو گا پر ایدر ایک اکیلا نواب حشمت نواب کا ادلاد نئیں ہے۔ ایدر گلی گلی آگے پیچھے ایک سے ایک مستی باز راجا نواب لوگ پڑا ہے۔ اپن کو لگتا ہے، بات ابھی دُور دُور تک پہنچ گیا ہے۔"

"لیکن صاف بات ہے، میرا جی نہیں چاہتا کہ اس طرح یہاں سے چلا جاؤں۔" ابّا جان نے حتمی لہجے میں کہا۔

"اس میں جی چاہنے نہ چاہنے کا بات نئیں ہے۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہاں سے جا کے سکون سے رہوں گا اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ میرے جانے کے بعد وہ لوگ آپ سے بازپُرس نہیں کریں گے۔ انھیں معلوم ہے کہ مجھ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ آپ ہی لوگ ہو سکتے ہیں وہ آپ کے لیے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر سکتے ہیں۔"

"اپن کا بات چھوڑو۔ اپن کے لیے کچھ نوا نئیں ہو گا۔ وہ لیسے اپن سے کچھ نئیں جان سکتا اور جاننے کے لیے زور دے گا تو اپن اُن کو ریاست سے باہر لے جائے گا اور اس کے بعد دیکھ لے گا۔ اکیلے میں اپن ان کو اچھی طرح بھگت سکتا ہے۔ سامنے آپ نئیں رہو گے تو وہ لوگ بھی ابھی جم کے اپنے آڑے نہیں آئے گا۔ ایدر اپن کا پہلا کام یہی ہو گا کہ کسی طرح ریاست سے باہر نکل جائے۔ ابھی کچھ سمجھ میں آیا بابا!" پیرد نے نسبتہً اونچی آواز میں ابّا جان سے کہا اور کہنے لگا "اپن کو پتہ ہے، ابھی آپ وہی کچھ بولو گے پر اپن بھی آپ سے کچھ جان کے بول رہا ہے، ماں قسم، اپن کو ٹائم ابھی بہت اینٹھا ہوا لگتا ہے۔"

ابّا جان چُپ بیٹھے رہے اُن کی پیشانی پر بے شمار شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ٹنگو اور منیر علی کے سوا سبھی موجود تھے۔ خاصی دیر بعد ابّا جان نے زبان کھولی اور شکستہ آواز میں بولے "ہمیں اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ رات گزرنے میں اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔ ایسا ہی ہے تو پھر کل صُبح نواب حشمت جنگ یا بڑے نواب کے ہاں دوبارہ منتقل ہو سکتے ہیں۔ وہاں یقیناً یہاں جیسی صُورتِ حال نہیں ہو گی۔ بہتر ہے کہ اب ہم وہیں سے روانہ ہوں۔ اپنی دوبارہ آمد کا عذر پیش کرنا ہمارے لیے ایسا دُشوار نہیں ہو گا۔"

بجّھل اور پیرد نے پھر اُن سے کچھ نہیں کہا۔ ملازم نے بجّھل کے لیے تازہ حُقّہ لا کے رکھ دیا تھا۔ کمرے میں سلگتے ہوئے خمیرے کی کڑوی میٹھی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ ایک بجنے کے قریب تھا۔ سب جاگ رہے تھے اور اس طرح مستعد بیٹھے تھے جیسے انھیں ابھی ابھی کہیں جانا ہو۔ کسی کی آنکھوں میں نیند کی رمق تک نہیں تھی۔ زورا کی کسی جماہی پر ابّا جان نے اُس سے آرام کے لیے بستر پر جانے کو کہا بھی تھا لیکن وہ وہاں سے نہیں اُٹھا۔ پیرد کی ہدایت پر ملازم کسی تاخیر کے بغیر چائے لے آیا تھا۔ اس وقت سب نسبتہً پُرسکون بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ بجّھل کی آواز پر سبھی چونک پڑے۔ بجّھل نے ابّا جان سے پوچھا تھا کہ پتھروں کی پوٹلی انھوں نے کہاں محفوظ کی ہے۔

"وہ، وہ میرے پاس ہے۔" ابّا جان نے بدحواسی سے جواب دیا۔

"اِدھر اندر ہی ہے کیا؟"

"ہاں، ہاں۔" ابّا جان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

بجّھل نے اُن سے کہا کہ پوٹلی اُس کے حوالے کر دی جائے۔ ابّا جان سمیت سبھی حیرانی سے اُس کا منہ تکنے لگے۔ چند لمحوں کے تذبذب کے بعد ابّا جان اپنی کرسی سے اُٹھ گئے اور ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے نکل گئے۔ دوسرے منٹ میں وہ واپس آئے تو اُن کے ہاتھ میں ایک مخملی تھیلی تھی، اس میں سے پتھر ٹکرانے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ابّا جان نے ہیروں پر پڑنے والی رگڑ اور ٹھیس کے اندیشے سے تھیلی کے اندر انھیں دوسرے کپڑوں میں محفوظ کر دیا ہو گا۔ یہ پُرانی طرز کی کوئی زیادہ بڑی تھیلی نہیں تھی۔ بجّھل نے ایک لمحے کے لیے ہاتھ میں لے کے اُسے تولا۔ اُس کا وزن بھی زیادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ابّا جان نے فیض آباد سے چلتے ہوئے چند منتخب ہیرے ہی ساتھ لیے تھے۔ بجّھل نے تھیلی کھول کے نہیں دیکھی اور پیرد کو اشارہ کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ ہم سب خاموش بیٹھے اُن کا انتظار کرتے رہے۔ بجّھل اور پیرد کو واپس آنے میں دیر ہو گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ دونوں تھیلی باہر سبزہ زار میں کسی ایسی جگہ محفوظ کرنے گئے ہیں جہاں آسانی سے کسی کی نگاہ نہ پڑ سکے۔

اسے احتیاط ہی کہنا چاہیے تھا لیکن یہ بے سبب تو نہ ہو گی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بجّھل کے ذہن میں کیسے کیسے خدشے سر اُبھار رہے ہیں۔ بجّھل اور پیرد واپس آ کے دوبارہ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ کسی نے اُن سے کوئی سوال نہیں کیا، نہ یہ اعتراض کیا کہ بظاہر یہ احتیاط حد سے سوا نظر آتی ہے۔ لیکن جو وہ کہہ نہیں پا رہے تھے، وہ اُن کے چہروں پر لکھا تھا۔ میری طرح اُن سب کے جسم بھی بندھے ہوئے، جکڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ سب بُتوں کے مانند بے سدھ بیٹھے تھے۔ وقت رینگ رینگ کے گزر رہا تھا۔ جیسے یہ رات کبھی ختم نہ ہو گی۔ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ مجھ سے وہاں زیادہ دیر نہ بیٹھا گیا۔ گھڑی نے ڈیڑھ کا گھنٹہ بجایا تھا کہ میں آہستگی سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔ میرے اٹھنے کی دیر تھی کہ کلنتے بھی میرے پیچھے آ گیا، مارٹی اور زورا بھی پھر شاسو اور جمرد بھی۔ ہم راہ داری سے گزرتے ہوئے دالان میں آ گئے۔ سامنے حویلی کا سبزہ زار اور اطراف میں چھوٹا سا باغ پھیلا ہوا تھا۔ حویلی کی بیشتر روشنیاں بُجھ چکی تھیں۔ سامنے والا صدر

دروازہ بھی درختوں اور درمیان کے اندھیرے کی وجہ سے چھُپ گیا تھا ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ اردگرد ہر سُو رات چھائی ہوئی تھی اور خنکی پہلے سے بہت بڑھی ہوئی تھی یا اس لیے زیادہ محسوس ہو رہی تھی کہ ہم گرم کمرے سے اُٹھ کے آئے تھے۔ آسمان بادلوں سے گھِرا ہوا تھا۔ ہم باہر کھڑے تازہ ہوا سینوں میں بھرتے رہے، تھوڑی ہی دیر میں ہمیں سردی سی محسوس ہونے لگی۔ پھر مارٹی کے کہنے پر ہم نچلی منزل کے ایک کشادہ کمرے میں چلے آئے۔ دروازے کے مقابل وسط میں برابر برابر دو بڑی مسہریاں بچھی تھیں مارٹی بتانے لگا کہ اتنی بڑی حویلی اور اتنے بڑے کمروں میں رہتے رہتے وہ کتنا اُکتا گیا تھا۔ مارٹی اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ہمیں بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب ہوں ہاں کرتے رہے۔ کسی کا جی دوسرے سے بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا یا کسی کے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

جمرد مارٹی اور کلنتے نیچے قالین ہی پر پڑ گئے۔ زورا میرے ساتھ مسہری پر آ گیا تھا۔ اور گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ ابّا جان کا یہ مشورہ غالباً بے محل نہیں ہے کہ ہم کل صُبح بڑے نواب کی حویلی میں چلے جائیں اور اب وہیں سے روانہ ہوں، کل یا پرسوں جیسا بھی مناسب ہو۔ خانم کی موجودی کی وجہ سے ہم کسی وقت بھی وہاں جا سکتے ہیں۔ ہماری دوبارہ آمد کچھ ایسی محسوس نہیں کی جائے گی بلکہ بڑا نواب تو اور خوش ہو گا۔ وہاں جانے سے معاملے کی نوعیت بڑی حد تک بدل جائے گی۔ یہ جبیں بھی بہت حیران ہو گی اور یقیناً بہت خوش بھی۔ چلتے وقت اُس کی ڈوبی ہوئی آنکھیں یہی کچھ تو کہہ رہی تھیں۔ اُسے دیکھے ہوئے پورا ایک دن بھی نہیں گزرا مگر معلوم ہوتا ہے جیسے زمانہ بیت گیا ہو۔ اس طرح مجھے بھی ایک موقع مل جائے گا اپنا بوجھ دُور کرنے کا، وہ سب کچھ کہنے کا جو میں اُس سے کہہ نہیں سکا تھا اور جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔ یوں آدمی کسی کا دُکھ کیا بانٹ سکتا ہے مگر کبھی تسلی تشفّی کے دو بول بھی بہت ہوتے ہیں۔ آدمی انھیں سُننے کا منتظر رہتا ہے۔ وہ مجھ سے نہ جانے کیا کچھ سُننے کی توقع کر رہی ہو گی۔ جو لوگ ویسے ہی ریشم اور پھولوں کے مانند ہیں، اُن کا احساس بھی تو پھولوں جیسا ہو گا، شیشے جیسا۔ میری خاموشی سے اُسے کوئی ٹھیس نہ پہنچی ہو؟ اب کے شاید پہلے جیسا نہ ہو۔ میں اپنے آپ کو سنبھالے رکھوں گا اور حویلی میں جاتے ہی اُس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ ابّا جان جانے کس وقت روانگی کا ارادہ کریں۔ ممکن ہے اس بار چھوٹی بیگم سے بھی ملنے کی کوئی صُورت نکل آئے۔ اس مرتبہ مجھے موقع مل گیا تو اُن سے کہوں گا کہ ہم تو اپنے دُکھ کا اظہار بھی نہیں کر سکتے، ہمیں اُن سے کچھ کم دُکھ نہیں ہے لیکن کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ایک کی زندگی دوسرے کو دِل جایا کرتی تو ہم میں سے کوئی اس میں بھی بُخل نہ کرتا۔ موت کا قرض آدمی خود ادا کرتا ہے۔ منیر علی کے بقول یہ تو باری باری کا معاملہ ہے، اور وہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے کہ کون سا گھر ایسا ہے جہاں موت نہ آئی ہو، جہاں موت نہ آتی ہو۔ کسی کو کیا اندازہ تھا کہ نوشتہ تو یہ تماشا ہے۔ میں اُس سے کہوں گا کہ ذرا ہماری طرف بھی غور کرو۔ ہم کس کے پاس جائیں، کسے جا کے بتائیں کہ ہم نے کیسا کیسا وقت گزارا ہے۔ ہم تو اب تک سزا کاٹ رہے ہیں۔ سب اسی سلسلے کی تو کڑیاں ہیں۔ ہم کیا کیا دہرائیں۔

مارٹی نے روشنی دھیمی کر دی تھی اور کمرے کی فضا خواب ناک ہو گئی تھی۔ سب اِدھر اُدھر لیٹ گئے تھے۔ کمرے میں اُن کی سانسوں کی آہٹیں گونجتی رہیں۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ کھُلی آنکھیں کسی حد تک آدمی کی تابع رہتی ہیں۔ جیسے ہی میں انھیں بند کرتا تھا وہ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنے لگتی تھیں۔ وہ رات کا آخری پہر ہو گا۔ میں نے گھڑی نہیں دیکھی تھی لیکن میرا اندازہ یہی تھا۔ لیکایک مجھے اپنے کانوں پہ وہم ہوا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ دوسرے لمحے میں بستر پر اُچھل کے بیٹھ گیا۔ کمرے کے باہر سے تیز تیز چاپیں مجھے صاف سُنائی دی تھیں۔ میں نے زورا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اُٹھ کے بیٹھ گیا تھا اور ایک ثانیے میں وہ سبھی اُٹھے ہوئے تھے۔ گویا میری طرح سبھی کروٹیں بدلتے رہے تھے۔ میں اور زورا فوراً مسہری سے اُتر گئے۔ زورا دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا کہ کلنتے نے اُسے روک لیا "ٹھیر کے دادا!" کلنتے نے سرگوشی میں کہا "باہر کوئی ایک آدمی نہیں ہے۔" ابھی ہم ان چاپوں کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھُلا اور ڈھاٹے باندھے ہوئے دو آدمی آناً فاناً اندر داخل ہوئے۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی آگے بڑھ کے اُن پر جھپٹتا انھوں نے بندوقیں ہمارے آگے کر دیں۔ اُن دونوں کے پیچھے بھی اور آدمی تھے جو تمنچے تانے ہوئے تھے۔ انھوں نے اندر آتے ہی ہمیں ایک طرف کھڑے ہو جانے اور کوئی حرکت نہ کرنے کا حکم دیا۔ سات آدمیوں کے بعد کوئی اور اندر داخل نہیں ہوا۔ دو دروازے پر کھڑے رہے، باقی پانچ اندر کمرے میں پھیل گئے۔ اُن کی تعمیل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کیوں کہ انھوں نے ایک پل کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ ہم سب بائیں جانب کی خالی دیوار کے ساتھ برابر برابر کھڑے ہو گئے۔ کم روشنی کے باوجود اُن کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ سرتاپا کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے، صرف آنکھیں کھُلی تھیں یا پیشانی کا کچھ حصہ۔ کاٹھی کے اعتبار سے وہ تندرست و توانا ہی معلوم ہوتے تھے۔ قد بھی اُن کے تقریباً اوسط تھے۔ یہ چیزیں پہلے ہی نظر میں رکھ لینا ضروری ہے لیکن سرِدست اس سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ کسی جانب کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اُن کی بندوقیں اور تمنچے ہر طرف سے ہمیں نشانہ بنائے ہوئے تھے اور اُن کے تیوروں سے ظاہر تھا کہ ہماری کسی حرکت پر وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کریں گے، یوں

بھی ہم چھ تھے، وہ سات۔ صرف ایک تمنچا بردار شخص بھی ہوتا تو ہمیں یہی کرنا پڑتا۔ ہم سب دم بخود کھڑے اُن کے اگلے حکم کے منتظر تھے۔ ہمارے ایک طرف ہوتے ہی کسی تاخیر کے بغیر ایک آدمی اپنی اُبلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ تمنچا اُٹھائے ہماری طرف بڑھا۔ دوسرا بندوق تانے اُسے اپنی جلو میں لیے ہوئے تھا۔

سب سے پہلے اُس نے شامو کا جسم ٹٹولا کیونکہ اِس جانب مَیں آخر میں تو دوسری جانب شامو پہلے کھڑا ہوا تھا۔ شامو کے ہاتھ بے ارادہ ہی مزاحمت کے لیے اُٹھے ہوں گے کہ بندوق والے نے اُس کے شانے پر کُندا مارا۔ شامو کراہ کے رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ اُس نے شعلہ بار نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا لیکن ہم سب ساکت کھڑے رہے۔ شامو کی سمجھ میں جلد ہی آگیا کہ غلطی اُسی کی تھی۔ پہلے ہمیں اُن کے متعلق اچھی طرح کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔ جلد بازی کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ تمنچے والے آدمی نے شامو کی جیب سے چھ انچی کھٹکے دار چاقو برآمد کر لیا تھا۔ ...ُس کی آنکھوں کی چمک اور گہری ہو گئی۔ اُسے اپنے ساتھی کی ...ے وہ مارٹی کی طرف آیا۔ مارٹی رات کو اپنا چاقو مجھے دے چکا تھا جب میں پیرو، بٹھل اور کانتے کے ساتھ حویلی سے باہر نکلا تھا۔ سو اُس کی جیب سے چند نوٹوں اور ریزگاری کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔ جمرو اور کانتے کے نیفوں میں چاقو اُڑسے ہوئے تھے۔ زورا نے اور میں نے مسہری کے تکیے کے نیچے رکھ دیے تھے اور ہمیں اتنا وقت نہیں مل پایا تھا کہ انھیں اُٹھا کے دوبارہ جیب میں ڈال لیں۔ میری بنڈی کے نیچے کوراکی مالا پڑی تھی۔ مجھے یہی خدشہ تھا کہ کہیں اُس کا ہاتھ گلے میں مالا کے دانے نہ ٹٹول لے لیکن اُسے بے حد عجلت تھی۔ اُس نے میرے جسم پر سرسری انداز میں ہاتھ پھیرا، گردن تک اُس کا ہاتھ آیا ہی تھا کہ میں نے اپنا جسم اُس کے ہاتھ بڑھنے کے ردِ عمل کے طور پر اضطراری انداز میں کسی قدر پیچھے کر لیا۔ اُسے محسوس بھی نہیں ہوا کہ یہ ایک دانستہ حرکت تھی۔ اُس کا ہاتھ گریبان چھوتا ہوا گزر گیا۔ چاقو یا کسی دوسرے ہتھیار کا گردن اور سینے پر محفوظ کرنے کا ویسے بھی کوئی امکان نہیں تھا تاہم میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ مالا پر ہاتھ پڑنے کے بعد وہ کیا کرتا اور مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ شاید میں اُس سے اُلجھ پڑتا۔ اُس کے تمنچے والے ہاتھ پر جھپٹا مارنا اور تمنچے کا رُخ موڑ دینا ایسا مشکل نہیں تھا۔ پیچھے بندوق والے کو قابو میں کرنے کے لیے مارٹی، زورا اور کانتے وغیرہ موجود ہی تھے لیکن یہ تبھی ممکن تھا جب کمرے میں صرف وہ دو ہوتے۔ باقی پانچ اپنے ہتھیاروں کے ساتھ ہم پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے برق رفتاری سے ہماری تلاشی لے لی تھی۔ مارٹی اور جمرو کی جیب سے نکلے ہوئے نوٹ انھوں نے واپس رکھ دیے تھے حالانکہ مارٹی کی جیب سے تو اچھی خاصی

موٹی گڈی برآمد ہوئی تھی۔ اس کے معنی یہی تھے کہ وہ اچکّے اور لٹیرے نہیں بلکہ کسی خاص مقصد سے آئے ہیں۔ اور وہ خاص مقصد ایک ہی ہو سکتا تھا۔ تمنچے والا آخر میں میری تلاشی لے کے میرے پاس سے ہٹا ہی تھا کہ زورا نے دبے ہوئے لہجے میں زبان کھولی "تم لوگ ابھی کیا مانگتے ہو، اپنے کو تھوڑا بول کے دو نا؟" زورا کی آواز حیرت انگیز حد تک دھیمی ہوئی تھی۔

زورا کی آواز پر تمنچے والا ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا۔ اُس نے پیچھے مُڑ کے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ بندوق والا زورا کے قریب ہی کھڑا تھا اُس نے کوئی جواب دینے کے بجائے ایک قدم بڑھ کے زورا کے گال پر اُلٹے ہاتھ کا طمانچہ رسید کیا۔ اُس نے پوری قوت صرف کی تھی، طمانچے کی چٹاخ سے کمرہ گونج اُٹھا۔ زورا سر تا پا لہرا گیا۔ وہ طمانچہ سبھی نے اپنے گالوں پر محسوس کیا تھا اور اُس لمحے سب کے جسم بل کھا گئے تھے۔ کانتے نے زورا کا شانہ تھام لیا ورنہ زورا کا جسم بکھر گیا تھا۔ اِدھر دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی نے سنناتی آواز میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ہم سب کو کمرے سے باہر لے آئے۔ اُس کا یہ حکم ہمارے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ بندوق والے نے حکم دُہرانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور بندوق کی نال مارٹی کے بازو میں گڑو کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دو آدمی اِس طرف، دو اُس طرف اور ایک ہمارے پیچھے ہو گیا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک باہر نکل گیا، دُوسرا دروازے سے ہٹ کے پاس ہی کھڑا رہا تاکہ ہم لوگوں کو راستہ مل جائے۔ کچھ اور سوچنے کا محل ہی نہیں تھا۔ صرف ایک آدمی کے باہر جانے کا مطلب تھا کہ باہر اُن کے اور آدمی بھی موجود ہیں۔ کوئی چوں وچرا کیے بغیر اُن کے کہنے پر ہم کمرے سے نکل آئے۔

وہاں ایک نہیں کئی آدمی تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اُن کے جسم پھڑکنے لگے۔ کمرے سے باہر دالان جیسی ایک چوڑی گزرگاہ تھی۔ دوسرے رہائشی کمرے، بیٹھنے کے عام اور خاص کمرے، اوپر کے زینے اور اِدھر حویلی کی پُشت، اُدھر سامنے والے حصّے کے دالان میں جانے کے لیے راستے اس گزرگاہ سے نکلتے تھے، الگ سے بھی تھے۔ بیٹھنے کے عام اور خاص کمروں کے بجائے باہر کھڑے ہوئے آدمیوں نے عمارت کے اندرونی حصّے کی جانب چلنے کے لیے کانتے کو دھکا دیا۔ کانتے خاموشی سے آگے بڑھ گیا، ساتھ میں ہم سبھی جس کمرے سے وہ ہمیں لائے تھے، وہاں سے اُن کے سارے آدمی باہر نہیں نکلے تھے۔ دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اندر اُن کے رُک جانے کا مقصد کمرے کی تلاشی لینے کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ ہم سب کے جسم ڈھیلے، ڈھلکے ہوئے اور ہاتھ پیر لٹکے ہوئے سے تھے۔ اِس طرح ان پر یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ہم اُن کے

...اروں کی تعمیل کے سوا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ اوروں کا نہیں معلوم ...ین میری رگوں میں خون جل رہا تھا۔ اُن کا حال بھی کچھ مختلف نہیں ...گا۔ سب کسی ایک موقع کے منتظر تھے جو اس صورت میں کسی طور پر ...ین نظر نہیں آتا تھا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں ایک ...ے کے کُھلے دروازے پر اُن کا ایک اور آدمی کھڑا ہوا دکھائی دیا، ایک رہائشی کمرہ تھا۔ ابھی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ ہمیں ...اں لے جا رہے ہیں لیکن جلد ہی یہ دُھند چھٹ گئی۔ سامنے جس ...دروازے پر اُن کا آدمی بندوق لیے کھڑا تھا، اُسی کی طرف وہ مُڑ ...ے۔ اُن میں سے کسی نے ہم سے پہلے یا ہمارے ساتھ اندر جانے کی ...یاط نہیں کی۔ اندر داخل ہوتے ہی کوئی نیا منظر ہمارے سامنے نہیں ...ا۔ وسیع وعریض کمرے میں فاصلے فاصلے سے اُن کے کئی آدمی بکھرے ...ئے تھے اور اُن کی جلو میں بٹھل، پیرو اور ابّا جان ایک طرف دیوار ...، ساتھ چپکے کھڑے تھے۔ ابّا جان بُری طرح ہانپ رہے تھے، اُن کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ انھیں کسی ...سری جگہ سے شاید ابھی ابھی یہاں لایا گیا تھا۔ منیر علی اور ٹنگو موجود ...ں تھے۔ دونوں چونکہ اوپری منزل پر تھے اس لیے ممکن تھا کہ اُن ...ے رسائی نہ ہو پائی ہو یا انھیں وہیں روک لیا گیا ہو۔ اندر کمرے میں ...بزدآدمیوں نے ہم سب کو پیرو، بٹھل اور ابّا جان کے ساتھ کھڑے ...نے کا حکم دیا، زبان سے نہیں بندوق کے اشارے سے۔ جس وقت داخل ہوئے، پیرو اُن سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کے وہ ...ں پٹ پٹانے لگا اور زہرخند سے بولا "ابھی دو اُوپر اور تمھارا باپ لیا ہے۔"

اس سے پہلے کہ اُن میں سے کوئی جواب دیتا، دروازے سے ...یں سُنائی دیں۔ منیر علی کی آواز پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ باہر سے کسی ...انھیں اندر کی طرف دھکیلا تھا، وہ فرش پر گرتے گرتے بچے۔ اُنھوں نے ...ں کی عمر کا بھی خیال نہیں کیا تھا۔ اس طرح اگر وہ ہمیں کچھ باور کرانا ...ہتے تھے تو اُس کی ایسی ضرورت نہیں تھی۔ اُن کی وضع قطع، تعداد اور ...کے ہتھیار ہی کچھ جتانے کے لیے بہت تھے۔ منیر علی گھگھیا رہے ...ے۔ اندر آ کے اُن کی نظر ہم پر پڑی تو اُن کی آنکھیں اور پھیل گئیں۔ ...نی انداز میں بولے "یہ کیا، یہ کیا ہو رہا ہے؟"

بٹھل نے اُن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بے تحاشا اُس کی ...ب اُمڈ پڑے وہ بٹھل سے لپٹ جانا چاہتے تھے لیکن بٹھل نے اُن ...انہ تھام کے اپنے پاس ایک طرف کھڑا کر دیا اور آہستگی سے کچھ ...ںاں کچھ نہ سُن سکا۔ منیر علی تیزی سے سر ہلانے لگے، اُن کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ یقیناً دعائیں پڑھ رہے تھے۔ منیر علی کے پیچھے کمرے تک چند اور آدمی آ گئے تھے۔ دروازے کے دو آدمیوں کو چھوڑ کے اُن کی تعداد آٹھ تھی، ہم نو تھے لیکن اُن کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کچھ لوگ ملازموں کے حصّے کی طرف گئے ہوں گے، کچھ نے صدر دروازے کے دربانوں کو قابو میں کیا ہوگا، کچھ حویلی سے باہر فصیل کے اردگرد بھی ہو سکتے تھے اور عمارت کے اندر دوسرے حصّوں میں بھی انھیں لازماً ہونا چاہیے تھا۔ گزرگاہ سے اُن کی لپکتی چاپوں کی آواز ابھی تک اندر آ رہی تھی۔ اتنی بڑی تعداد سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کچھ طے کر کے آئے ہیں اور انھیں ہمارے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے ہو سکتا ہے، انھیں ہمارے اڈّے سے متعلق ہونے کا بھی علم ہو۔

منیر علی کے ساتھ ٹنگو بھی تھا، وہ بہت سنبھلا ہوا تھا۔ خاموشی سے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا کمرے میں داخل ہوا اور پیرو کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا۔ منیر علی اور ٹنگو کے آنے کے چند ہی لمحوں بعد تین ملازم بھی ہماری طرح اندر لائے گئے۔ اُن میں سے ایک کی حالت نہایت شکستہ تھی۔ اُس کا سارا جسم پارے کے مانند تھرتھرا رہا تھا اور مُنہ سے خون کی دھار جاری تھی۔ اُن تینوں کو بھی ہمارے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ پھر باہر سے ایک آدمی نے آ کے سر کا اشارہ کیا۔ اشارہ واضح تھا کہ اب عمارت میں کوئی ذی نفس موجود نہیں ہے۔ آنے والے آدمی کو کمرے کے وسط میں کھڑے ایک بھاری بھرکم، میانہ قد آدمی نے ہاتھ جھٹک کے واپس کر دیا۔ اُس کے جاتے ہی وہ اپنی جگہ سے دو قدم آگے آ گیا اور اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے بولا "تمھاری جانان تمھارے ہاتھاں میں ہیں۔" اُس کی آواز میں گرج کے ساتھ لرزش بھی تھی۔ تمنچا اُس کے ہاتھ میں تنا تھا اور کھٹکے پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔

"اپنے کو سامنے کا ٹھیک دکھائی سُنائی دیتا ہے۔ اس ناٹک کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بولنا ہے، کُھل کے بولو۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، بٹھل نے اُس سے کہا۔

بٹھل کی آواز پر اُس کی پلکیں جھپکنے لگیں۔ اُس نے قدرے توقف کیا اور درشتی سے بولا "ہم کو مال چاہیے۔ جان کے بدلے مال۔ تمنا تمھاری جاناں پیاری ہیں تو مال ہمارے آگے کر دو۔"

"جان اپنے کو بہت پیاری ہے، تم سے زیادہ۔" بٹھل کی آواز ٹھیری ہوئی تھی۔ "ہم کو بولو تم کو کون سا مال چاہیے؟"

"بہتر! ہم کو بہتر چاہئیں۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔ "ہم کو بھی زیادہ گھما پھیری پسند نئیں ہے۔ بہتّرے نکال کے اِدھر دے دو۔ سوچنے کو ہم تم کو تھوڑا ٹیم ضرور دیں گے، پر دس منٹ سے زیادہ نئیں۔ آنا ٹیم تمھارے

پاس اپنی جان کا فیصلہ کرنے کا ہے۔ پھتّرے ہم کو مل گئے تو چلے جائیں گے ورنہ اِدھر ایک آدمی بھی زندہ نئیں رہنے کا۔ اپنی بات زیادہ لمبی چوڑی نئیں ہے۔ سمجھ میں نئیں آیا ہو تو ایک بار دوبارہ بول دیں۔" اُس کی آواز لحظہ بہ لحظہ تیز و تُند ہوتی گئی۔

"اچھی طرح سمجھ آرہی ہے۔" بٹّھل نے تحمّل سے کہا۔ "اِدھر تمھارا کھٹکا سُن کے ہی جان گئے تھے کہ پھر کسی کو دھوکا ہوا ہے، پھر کوئی شوتین آگیا ہے۔ شام سے جب اِدھر کو آئے ہیں، ایک سے ایک ٹھرکی، مستی باز منہ اُٹھائے چلا آرہا ہے۔ بڑے بڑے نواب راجا لوگ، اُونچی اُونچی بولی لگانے کو بولتے تھے۔ دھن دولت بھی ساتھ لائے تھے۔ اُن کو ہم کچھ نہیں دے سکے، تو تم کو کیا دے سکیں گے۔"

"وہ لوگاں دھن دولت کا بولتے تھے، ہم جان کی بات کرتے ہیں۔"

"پر سودا کاہے کا کریں بابو!"

"لگتا ہے، پھر تمھارا ٹیم ہی آگیا ہے۔"

"آگیا ہے تو اس کو کون روک سکتا ہے رے۔"

"ابھی تم ہم کو پورا نئیں پہچانتے۔" وہ پھنکارتی آواز میں بولا۔

"پورا پہچان رہے ہیں مائی باپ! اوپر سے نیچے تک دیکھ رہے ہیں کہ تم کون سے وقت آئے ہو منہ پہ پردہ ڈال کے، اِدھر تم کتنے آدمی لے کے آئے ہو۔ سب کے ہاتھ میں ہتھیار ہے، کھٹکا جس کا دبانے سے آدمی کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہے نا!"

"تم اپنے آپ کے ساتھ مسخری کر رہے ہو۔"

"یہی نوٹ کے ہم تمھارے لیے بولیں گے تو تم کچھ اور خفا ہو جاؤ گے۔" بٹّھل نے دبے لہجے میں کہا۔ "رستہ پوچھ ہی کے آئے تھے سردار! اِدھر اپنے پلّے تو صرف ہمی ہیں۔"

"ہم کبھی غلط جگہ ہاتھ نئیں رکھتے۔" وہ نخوت سے بولا۔ "اور ہم تم جیسے لوگاں کو خوب دیکھے ہیں۔" اُس کی آواز بھڑکنے لگی تھی، غصّے سے کہنے لگا۔ "تم ایسے نئیں مانو گے تو ہم کو دس رستے اور بھی آتے ہیں۔ ابھی ٹھیک ہے کہ سیدھی طرح مال نکال دو، اپنے پاس زیادہ ٹیم نئیں ہے۔"

"تم تو وقت خود کھوٹا کر رہے ہو۔ اپنی بات دھیان سے نہیں سُنی کیا! اِدھر برابر میں اس سے اُونچی اور بڑی حویلیاں کوٹھیاں ہیں، ایک رات میں اگلی پچھلی ساری کسر نکل جائے گی۔ اُدھر اتنے پنڈرول کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہم مسافر لوگ کے پاس کیا دھرا ہے لوٹ کے کبھی آئیں تو ہاں، پھر ایک جتن اور کر لینا۔ شاید پھر خالی ہاتھ نہ لوٹائیں۔" بٹّھل کے لہجے میں ترشی آگئی تھی۔ ایک ثانیے رُک کے وہ نسبتہً دھیمی آواز میں بولا۔ "ابھی کچھ چائے پانی پینا ہو تو بولو۔"

"مال کاں ہے؟" اُس نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں تھا، دہاڑتا ہوا بولا۔ "ہم دوسری بات سننے کو نئیں آئے۔"

"مال کے بارے ہم نے بول دیا ہے۔ دوسری سُننی نہیں پسند ہے تو دیر کاہے کی ہے، گولی چلاؤ یا پھر اِدھر سے چلے جاؤ۔ کون سی بولی سمجھتے ہو؟"

"گولی کبھی چکھی نئیں ہے تم نے! یہ حسرتاں بھی ابھی پوری کر دیں گے۔ پر ہم کو شبہ ہے کہ یہ تمھارا آخری جواب ہے۔"

"پھر تمھارے سر کی قسم کھائیں کیا!"

مجھے ڈر تھا کہ پیرو، ابّا جان یا منیر علی میں سے کوئی درمیان میں نہ بول پڑے لیکن شاید وہ سمجھ گئے تھے کہ اِس طرح کی باتوں سے بٹّھل کی کیا مراد ہے، اُس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بندوقوں اور تمنچوں سے زیادہ ہم اُن کی نگاہوں کے حصار میں تھے۔ ہتھیار کے ساتھ نگاہ کی مستعدی شرط ہے۔ یقیناً وہ گولی چلانے اور ہم سب کو ختم کرنے کے شوق میں نہیں آئے تھے لیکن کسی بھی لمحے اُن کا کوئی ساتھی اپنے ہوش گم کر سکتا تھا۔ خون سب کا ایک جیسا نہیں ہوتا۔

پہلی بار بٹّھل سے مخاطب شخص کسی قدر متذبذب نظر آیا۔ اپنے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالتا ہوا وہ دو قدم اور آگے بڑھ آیا تاہم اُس کا ہمارا درمیانی فاصلہ کم نہیں تھا۔ اُس نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے آدمیوں کو آگے آنے کے لیے ہاتھ ہلایا۔ وہ حکم سُننے کے لیے بے تاب تھے۔ اتنی تیزی سے اُس کے قریب آئے جیسے ذرا بھی دیر ہو گئی تو قیامت آجائے گی۔ اُن کے سرغنہ نے دوسرا حکم دینے میں اتنی ہی تاخیر کی۔ اُس کی نگاہیں باری باری ہم سب پر منڈلاتی رہیں اور ابّا جان پر آکے ٹِک گئیں۔ اُس نے اُنگلی اُٹھا کے اُنھی کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ ابّا جان کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ میں نے معاً بٹّھل کی جانب دیکھا مگر وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ ابّا جان نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی، سرغنہ نے اپنے دو ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ انھیں اُس کے پاس کھینچ لائیں۔ دو آدمی اِدھر اُدھر سے بندوق تانے ہوئے اُن کی جانب دوڑ پڑے۔ میرے جسم میں خون جم گیا۔ وہ شخص بالکل وحشی معلوم ہوتا تھا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ میں جھپٹ کے اُس کی گردن دبوچ لوں لیکن میں اپنا جسم جکڑے کھڑا رہا۔ اِدھر پیرو نے سختی سے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ہمیں آخری لمحے تک اپنی جانب سے محتاط ہی رہنا چاہیے تھا۔ جانے کہاں سے ابّا جان میں استقامت آگئی تھی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ ابّا جان کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیتے مگر وہ خود

بڑھے اور کسی مجرم کی طرح اُس شخص کے سامنے جا کے کھڑے ہو گئے۔ پہلے وہ انھیں سر تا پا گھورتا رہا پھر بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیوں بڑے میاں! ہم کو تم کچھ سمجھ دار آدمی لگتے ہو۔ ہم کو بولو کہ پھتّر کاں ہیں؟"

"میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ لوگوں کو کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔" مجھے حیرت ہوئی ابّا جان کی آواز میں لرزیدگی نہیں تھی۔

"تو تم بھی ایسا ہی بولتے ہو۔" وہ مضحکہ خیزی سے بولا۔ "پر ہم کو مال چاہیے۔ مال اِدھر ہی ہے۔ تمھارا وقت ویسے بھی زیادہ دُور نہیں ہے۔ لگتا ہے، تم نے ابھی جانے کا سوچ لیا ہے۔"

"ضرور آپ کو کسی نے بہکایا ہے۔" ابّا جان نے رُکی رُکی آواز میں کہا۔ "زندگی سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہ سودا ہمارے لیے زیادہ مہنگا نہیں ہے لیکن ہمارے پاس کوئی چیز ہو تو جواب دیں۔ فیصلہ ہمیں نہیں، آپ کو کرنا ہے۔ رہا موت کا خوف، تو یہ اُن لوگوں کو ہوتا ہے جو زندگی کو قائم و دائم سمجھتے ہیں۔ اگر یوں ہی لکھی ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

"تم، تم سب ہم کو ایک نمبر حرامی لگتے ہو۔" وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا اور اُس نے ابّا جان کا گریبان پکڑ لیا۔

میری آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا تھا۔ میں نے اُس پر جست لگانی چاہی تھی لیکن پیرو نے اپنے دونوں ہاتھ میری کمر میں ڈال کے مجھے جکڑ لیا۔ "ابھی تھوڑا صبر کر راجا! تجھ کو اپنا قسم، تھوڑا ٹھیر جا اپن بھی دیکھ رہا ہے۔" اُس نے سرگوشی میں مجھ سے التجا کی۔

میری آنکھوں کے سامنے اُس شخص نے ابّا جان کا گریبان پکڑ کے انھیں جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ اُن کا کُرتا پھٹ گیا تھا۔ اندر بنڈی کے بٹن بھی ٹوٹ گئے تھے۔ کہنے لگا۔ "ہم تم کو بتائیں گے کہ موت کیا ہوتی ہے اور تمھارے لیے کیسی لکھی ہے۔ تمھاری عمر دیکھ کے سالا ہاتھاں رکتے ہیں۔ ابھی تمھارے کپڑے اُتروا کے ہنٹراں برسائیں گے تو تم کو آگے پیچھے کا سب یاد آجائے گا، ہم ابھی بولے تھے نا کہ ہم کو دس رستاں ور آتے ہیں۔ تم سمجھتا ہے کہ ہم تم کو گولی کی سیدھی موت دیں گے تمھارے ساتھ ——"

یہ دیکھ کے کانتے بڑھ گیا مگر مارٹی اور جمرو نے اُسے روک لیا۔ وہ اُسے زور زور سے گالیاں بکنے لگا۔ ابّا جان سے ہٹ کے اُس شخص کی توجہ یکایک کانتے کی طرف مبذول ہو گئی۔ اُس پر وحشت طاری ہو گئی تھی۔ بھنائے ہوئے لہجے میں ابّا جان سے پوچھنے لگا کہ یہ کُتّے کی اولاد تمھارا کیا بنتا ہے۔ ابّا جان نے جواب نہیں دیا، اُس نے طیش میں آکے ایک جھٹکے سے اُن کا سینہ ننگا کر دیا۔ ابّا جان کا کرتا دامن تک پھٹ گیا۔ بٹن ٹوٹ جانے سے بنڈی بھی کھل گئی۔

"بوڑھے آدمی پر ہاتھ اُٹھاتا ہے سالا زنخا، اُلّو کا پٹھا۔" کانتے کے جو منہ میں آرہا تھا، وہ بکے جا رہا تھا۔ سارے آدمیوں نے بے اختیار اپنی بندوقوں اور تمنچوں کا رُخ اُس کی طرف کر دیا تھا۔ کانتے کے بجائے کوئی اور شخص ہوتا تو یہ لمحہ اُن پر ٹوٹ پڑنے کا تھا۔ کانتے نے اپنا سینہ خود چاک کر دیا۔ اور چلّا چلّا کے سرغنہ سے بولا۔ "لے چلا گولی!" ساتھ ہی وہ بُری طرح گالیاں بھی بکتا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ اپنے اوسان کھو چکا ہے۔ جمرو اور مارٹی مسلسل اُسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شامو نے اُس کی کمر پکڑ رکھی تھی۔ کانتے اُن تینوں کے قبضے سے نکلنے کے لیے زور کر رہا تھا۔ سرغنہ نے ابّا جان کے گریبان سے ہاتھ ہٹا لیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ کانتے کو پکڑ کے اُس کے پاس لے آئیں۔ یہ سُنتے ہی دو کے بجائے چار آدمی کانتے کی طرف لپک پڑے۔ انھیں اپنی جانب بڑھتا دیکھ کے مارٹی، جمرو اور شامو بوکھلا گئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا ہو گا کہ وہ کانتے کو اپنے بازوؤں میں جکڑے رکھیں یا آزاد کر دیں لیکن پھر اُن کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی کیونکہ دوسری صورت میں کانتے کو زیادہ زک پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اُن کے ہاتھوں سے چھوٹ کر کانتے کسی اور طرف جانے کے بجائے اپنی جگہ سینہ تانے کھڑا رہا جیسے اُسے حملہ آور آدمیوں کا انتظار ہو۔ اتنی دیر میں وہ چاروں اُس تک پہنچ چکے تھے۔ کانتے کو یوں غیر متوقع طور پر آمادہ دیکھ کے وہ کچھ گڑبڑا سے گئے۔ اور اُن کے جھپٹنے کی شدّت میں بھی کمی آگئی تاہم اُنھوں نے دونوں جانب سے کانتے کے شانے اس طرح پکڑے جیسے وہ بہت مشکل سے اُن کے قبضے میں آیا ہو یا اگر گرفت ذرا سی کمزور رہی تو وہ کسی طرف بھاگ کھڑا ہو گا۔ کانتے نے فرش پر تھوک کے سرغنہ کو ایک اور گالی دی، ماں کی گالی۔ جانے اُس کے دماغ میں کیا سمایا تھا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر سُن کھڑے تھے۔ کسی اور کے دخل دینے کا کچھ حاصل نہ تھا۔ کانتے کو کوئی احساس نہیں تھا کہ وہ گولی بھی چلا سکتے ہیں۔ اُن کے پاس ہتھیاروں کی کمی ہے، نہ آدمیوں کی۔ بٹّھل اور پیرو نے اپنے ہونٹوں پر مہر لگا لی تھی۔ زبانی طور پر اور کہا بھی کیا جا سکتا تھا۔ دلیل تو دلیل کے جواب میں دی جاتی ہے۔ وہ لوگ ایک بات چاہتے تھے کہ کسی طرح ہم ہیروں کی موجودگی کا اقرار کر لیں۔ اگر صورتِ حال دوسری ہوتی؟ واقعی ہمارے پاس ہیرے نہ ہوتے تو بھی ہم انھیں کچھ اسی طرح تو یقین دلاتے اور وہ اگر اپنی اس روش پر قائم رہتے؟ کانتے کو چاروں آدمی پکڑ کے سردار کے پاس لے گئے اور قریب پہنچ کے انھوں نے اُس کی گردن، کمر اور بازو اس طرح ہاتھوں کے شکنجے میں کس لیے کہ

کانتے کے لیے جنبش کرنا بھی آسان نہیں رہا۔ سرغنہ ابّا جان کی طرف سے منہ موڑ کے کانتے کے سامنے ہو گیا۔ اُس وقت ابّا جان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ایک موقع نکل آتا۔ ابّا جان تو گنگ کھڑے تھے۔ پھٹے ہوئے کرتے میں اُن کا حُلیہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔

سرغنہ کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ اُس نے کانتے کی گردن پر تمنچا رکھ دیا اور نیچے کی جانب سے اُس کی ٹھوڑی پر پوری طاقت سے مُکّا مارا۔ کانتے کا سر جھن جھنا گیا ہوگا، اُس نے بھی ایک پل کی دیر نہیں کی۔ جواب میں اپنے جسم کو جھٹکا دے کے جُھک گیا۔ پھر پورے زور سے اوپر اُچھلا، چاروں آدمی اُس کی جھونک میں گرتے گرتے بچے۔ کانتے نے اچھل کے سرغنہ کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ پیٹ پکڑے ہوئے دُہرا ہو گیا۔ اُس کے پیر ڈگمگا گئے تھے۔ وہ پیٹھ کے بل فرش پر گرتا گر سنبھل گیا۔ پیچھے کے ایک آدمی نے اُسی وقت کانتے کے اردگرد کھڑے ہوئے لوگوں کو نعرہ لگانے کے انداز میں تنبیہ کی کہ اپنی حفاظت کا خیال رکھیں۔ وہ بندوق کا نشانہ لیے تیّار کھڑا تھا۔ کانتے کی طرح اُس کا خون بھی کچھ زیادہ ہی گرم معلوم ہوتا تھا۔ وہ گولی چلا سکتا تھا کیونکہ اُس کے تیور ایسے ہی تھے لیکن عین وقت پر سرغنہ نے جلدی سے ہاتھ اوپر اُٹھا کے اُسے روک دیا۔

"ابھی نئیں۔ ہم کو پتہ ہے، یہ سب سے پہلے جانا چاہتا ہے پر ہم اس کو سب سے آخر میں بھیجیں گے۔ ابھی ہم اِس کے کل پرزاں ٹھیک کریں گے۔ ہم کو یہ سب سے چھٹا ہوا لگتا ہے۔" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا اور کانتے کے پاس آکے اُس نے دوبارہ اُس کی کنپٹی پر مکّے کی بھرپور ضرب لگائی۔ اس مرتبہ کانتے کو اُچھل کے اُس کے پیٹ پر لات مارنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اُسے جکڑنے والے چاروں آدمی پہلے سے زیادہ مستعد تھے۔ دو اُس کے شانے پکڑے ہوئے تھے، ایک نے اُس کی گردن اور ایک نے کمر قابو میں کر رکھی تھی۔

کانتے کو یوں بے بس دیکھ کے اُس کی دہشت کم نہیں ہوئی بلکہ کچھ اور فزوں ہو گئی۔ اُس نے اپنا تمنچا پیٹی میں اڑس لیا اور پے در پے کانتے کے منہ اور سینے پر ضربیں لگائیں۔ کانتے اُسے اور اشتعال دلا رہا تھا۔ اُسے جانے کتنی گالیاں ازبر تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں اپنے ہوش و حواس کھو چکے ہیں۔ مسلسل ضربوں سے کانتے کے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ کانتے کے لیے یہ چوٹیں بے شک کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں، بچپن سے وہ ان کا عادی تھا۔ اتنا تو بار ہا ٹھل نے بھی اُسے مارا تھا لیکن کانتے کو موقع محل کا بھی کچھ خیال رکھنا چاہیے تھا۔ ایک دو آدمی نہیں، اُس کے سامنے پورا جتھا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب اُس آدمی کی توجہ ابّا جان کی طرف سے یک سر ہٹ گئی تھی۔ گو ابّا جان ابھی تک اُس کے پاس ہی کھڑے تھے اور اُس نے انھیں اپنی جگہ واپس جانے کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ ممکن ہے، کانتے یہی سب کچھ دیکھ کے آگے بڑھا ہو۔ پھر تو وہ یقیناً اب بھی اسی کوشش میں ہے۔ اتنی دیر تک یہ بات میری عقل میں کیوں نہیں آئی تھی۔ ظاہر ہے، کانتے نے اچانک بے وجہ تو شور مچانا شروع نہیں کر دیا تھا۔ وہ ہم سب کی طرح خاموش کھڑا رہتا تو ان ضربوں سے محفوظ رہتا۔ اُس کی جگہ تو مجھے ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اپنا وجود اپنی نظروں میں بہت حقیر لگ رہا تھا۔ کانتے نے جیسے مجھے کوئی گالی دی ہو مگر اب پچھتاوے سے کیا ہوتا۔ میں نے ارادہ بھی کیا کہ کانتے کی طرح شور مچانا شروع کر دوں۔ اس طرح سرغنہ کی توجہ اُس کی طرف سے ہٹ کے مجھ پر مبذول ہو جائے گی۔ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن میں ارادہ باندھتا اور دزدیدہ نظروں سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ مجھ سے ایک قدم بھی نہ بڑھایا جا سکا۔ یہ بعد از وقت تھا۔

سرغنہ ہر ضرب کے بعد کانتے سے ہیروں کے بارے میں پوچھتا تھا۔ کانتے ہر بار گالی میں اُسے جواب دیتا تھا۔ کمرے میں خنکی کے باوجود دونوں پسینے پسینے ہو گئے تھے اور کانتے کے پسینے میں تو خون بھی شامل تھا۔ یہاں تک کہ سرغنہ تھکا تھکا دکھائی دینے لگا۔ کانتے اگر چُپ ہو جاتا تو وہ بھی رُک جاتا لیکن کانتے کو ضد سی ہو گئی تھی۔ وہ اُس سے کہہ رہا تھا "گیدڑ کی اولاد! اپنے ان کھلونوں اور چڑی ماروں کو ہٹا کے دیکھ، پھر تجھ کو بتائیں، کس کو پہلے جانا ہے۔"

ابّا جان سے ضبط نہیں ہوا۔ انھوں نے کانتے سے التجا کی کہ وہ اپنی زبان قابو میں رکھے، اُدھر انھوں نے عاجزانہ لہجے میں سرغنہ کو مخاطب کیا "جناب! میری بات سُنیے، خدا کے لیے یہ فساد ختم کیجیے۔ اِس سے کچھ حاصل نہیں، آپ یقین کیجیے کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہوتا تو اتنی اذیت اور ذلت کون برداشت کرتا۔ میں آپ سے منّت کرتا ہوں کہ ہماری بات مان لیں۔ جو کچھ یہاں ہمارے پاس ہے، سب آپ لے جائیے۔ ہمیں کسی چیز سے سروکار نہیں۔ ہمارے پاس کچھ نقدی ہے اور، اور اتنی کم نہیں ہے۔ ہم وہ آپ کے حوالے کرتے ہیں۔"

اُس کا ہاتھ یکایک رُک گیا۔ ابّا جان کی مداخلت سے اُسے سانس لینے کی کچھ مہلت مل گئی تھی اور کانتے کے ساتھ مزید حجّت سے بچنے کا ایک جواز بھی فراہم ہو گیا تھا۔ اب تک اُس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہوگی کہ کانتے کی زبان اُس کی ضربوں سے رُکنے والی نہیں ہے اور اس طرح اُسے اپنے ساتھیوں کے سامنے پشیمانی

ے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ وہ ابّا جان کی طرف پلٹ پڑا اور یوں ظاہر لیا کہ ابّا جان کو فراموش کر کے اُس سے کوئی چوک ہو گئی ہو "ہاں ڑھے!" وہ کسی قدر اُکھڑی ہوئی سانسوں سے کانتے کو ماں کی گالی دیتے ہوئے بولا "ہم تو اس کے چکراں میں تجھ کو بھول ہی گئے تھے۔ اس کو ہم بعد میں دیکھیں گے تو ابھی کیا بولتا ہے؟"

اُس کا لہجہ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ ابّا جان نے مّل سے کام لیا اور التجائی لہجے میں وہی تکرار کی۔

"تو پھر ہم یاں سے چلے جائیں؟" وہ چبلے پن سے بولا۔

"آپ کا یہ فیصلہ ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا" ابّا جان نے ی سے کہا "ہمارے آپ کے درمیان کوئی پرانی عداوت یا مخاصمت یں ہے۔ ہم نے آپ کا کبھی کچھ نہیں بگاڑا۔"

ابّا جان کی داد و فریاد کا یہ اثر ہوا کہ اُس نے اُن کی داڑھی پکڑ اور رعونت سے کہنے لگا "تو تم ایسے ہی رٹّاں لگاتا رہے گا۔"

ابّا جان نے اُس سے کہا کہ پھر وہ اُس کا مطالبہ کہاں سے راکریں۔ یہ سُن کے اُس نے انھیں ایک بے ہودہ گالی دی اور اُن کی ڑھی پکڑ کے جسم کو جھٹکے دینے لگا "ہم کو صرف نقدی پہ ٹہلائے؟ وہ بھی لے کے جائیں گے پر پتھروں کے ساتھ، سمجھا۔"

یں پیرو کو پیچھے کی جانب دھکّا دے کے اُس وحشی کی ف جھپٹا لیکن پیرو کو پہلے سے اندازہ تھا۔ میں اس کے بازو سے ٹ کے اور ایک قدم آگے نکل آیا۔ پیرو نے اپنی ٹانگ اَڑا کے ے گرا دیا۔ پھر جتنی دیر میں، میں فرش سے اٹھا، زورا اور پیرو نے ھے پیچھے سے پکڑ لیا۔ پیرو مجھے سمجھانے لگا۔ اُس کی باتیں مجھے رلگ رہی تھیں۔ میرے سارے جسم میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ سب میرے سامنے ہو رہا تھا اور میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ صرف اس لیے صُورتِ دیگر میری زندگی کو خطرہ لاحق تھا۔ اس آزار سے تو موت ہی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر پیرو اور زورا کے تسلّط سے نکلنے کی ش کی مگر ناکام رہا۔ سرغنہ نے مجھے اپنی طرف جھپٹتے دیکھ لیا تھا۔ اُس پھڑکتی ہوئی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئی تھیں، وہ پچکارتے لہجے میں بولا "آنے آنے دو، اس کتّے کے پِلّے کو بھی آنے دو۔ اب ہم تجھی کو دیکھیں گیا؟ کتنے دانت نکلے ہیں تونے؟"

یں اُسے ضرور کوئی جواب دیتا مگر ابّا جان کی طرف دیکھ کے زبان ٹھٹھر کے رہ گئی۔ انھوں نے اشاروں اشاروں میں مجھے سکون کی تلقین کرنی چاہی۔ اُدھر کانتے نے پھر شور مچانا شروع کر تھا۔ سارا کمرہ اُس کی چیخ پکار سے گونج رہا تھا۔ سرغنہ مجھ پر زیادہ توجّہ نہ دے سکا۔ کانتے کے شور سے وہ پھر برہم سا ہو گیا۔ کانتے کی گالیاں اُس کے کانوں میں نشتر بن کے چُبھ رہی ہوں گی۔ وہ ہیجانی انداز میں کانتے کو خاموش کرنے کے لیے اُس کی جانب چلا گیا لیکن اس کے مقابل جا کے ٹھیر گیا۔ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے اپنے چاروں ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ کانتے کو برابر کے کمرے میں لے جائیں اور جب تک اُس کی زبان نہ تھمے، اُسے مارتے رہیں۔ بعد میں وہ ہم سے نمٹ کے خود اُسے دیکھے گا۔

"حرام زادے! اِدھر تیری میّا مرتی ہے کیا!" کانتے زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا "اپنے کو یہ تیرے جمائی ٹھوڑے پڑیں گے۔"

کانتے اُن کے بازوؤں سے نکلنے کے لیے پورا زور صرف کر رہا تھا۔ وہ پچھاڑیں کھا رہا تھا جیسے کسی پاگل پر قابو پانے میں دُشواری پیش آتی ہے۔ اُن چاروں نے اپنی بندوقیں کندھوں سے لٹکا لی تھیں اور تمنچے پیٹیوں میں رکھ لیے تھے۔ اپنے دونوں کُھلے ہاتھوں سے وہ پوری طرح اُسے دبوچے ہوئے تھے اور کانتے کی پچھاڑوں کی جھونک میں اِدھر سے اُدھر ہو جاتے تھے لیکن وہ کانتے سے لپٹے رہے۔ کانتے فضول میں اُن سے اٹک رہا تھا۔ آخر وہی کامیاب ہوئے۔ اور اُسے کھینچتے، گھسیٹتے ہوئے کمرے سے لے گئے۔ اُن چاروں کے جانے سے سرغنہ سمیت چار آدمی کمرے میں رہ گئے۔ دو دروازے پر موجود تھے۔ اُن میں سے ایک اندر آ گیا۔ دروازے پر رہ جانے والے دوسرے آدمی کا رُخ بھی ہماری جانب تھا۔ کمرے میں سکوت ہو گیا۔ کانتے کے جاتے ہی سرغنہ واپس ابّا جان کی طرف آیا اور جھڑکتے لہجے میں اُن سے بولا "ہاں بڈّھے!" اُس نے ابّا جان کے سر کے بال پکڑ لیے اور سر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا "کچھ ٹھکانے آیا یا ابھی اور ٹھیک کریں؟"

ابّا جان کے ہونٹوں پر لفظ سسک کے رہ گئے۔ اُن کی حالت دیکھ کے یک بارگی مجھے شبہ ہوا کہ بس کچھ دیر باقی ہے، ابّا جان اقرار کر لیں گے۔ یہی بہتر تھا۔ اِس ذلت کے سامنے ہیرے کوئی حیثیت نہیں رکھتے، ابّا جان کے پاس ہیروں کی کمی نہیں ہے۔ چند پتھر نکل جانے سے اُن کے خزانے پر کیا فرق پڑے گا۔ سمجھ لیں کہ تبت کے زیرِ زمیں معبد کا ایک اور ستون نہ کھودا جا سکا اور اگر وہاں سے اتنا کچھ برآمد نہ ہوتا تو وہ کیا کر لیتے۔ کوئی دولت آدمی سے بڑی نہیں ہوتی اور آدمی عزّت کے بغیر کچھ نہیں ہے۔ ابّا جان کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اُن کے نتھنوں اور ہونٹوں پر لرزہ سا طاری تھا وہ یقیناً کوئی فیصلہ کر رہے تھے، کبھی میری جانب اُن کی بے چین

نگاہیں اُٹھتی تھیں، کبھی بِٹھل کی جانب اور کبھی وہ سرغنہ کی طرف دیکھتے تھے۔ اُس نے اُن کے سر کو متعدد جھٹکے دیے۔ گو اباجان نے اُف تک نہیں کی تھی لیکن اُن کے چہرے سے اندرونی اضطراب صاف چغلی کھا رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں کتنی بار ارادہ کیا کہ اباجان اگر اقبال کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں تو میں خود سرغنہ سے کہہ دوں کہ ہیرے یہیں ہیں، اِسی حویلی میں موجود ہیں مگر میں نے خود کو بہ مشکل روکا۔ مجھے توقع تھی کہ چند لمحوں میں اباجان خود اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے ورنہ بِٹھل اور بیرو میں سے کوئی بول اُٹھے گا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ معلوم نہیں اُن کے ذہن میں کیا تھا۔ کیا ابھی تک وہ یہ آس لگائے ہوئے تھے کہ جلد یا بدیر سرغنہ مایوس ہو کے واپس چلا جائے گا، یہ محض اِس کی گیدڑ بھبکیاں ہیں، اسے ہیروں کے سوا کسی اور بات سے سروکار نہیں۔ رات ختم ہونے میں بھی اب اتنا وقت نہیں رہ گیا ہے۔ اگر یہی بات بیرو، بِٹھل یا اباجان کے ذہن میں تھی تو یہ اُن کی خوش فہمی تھی۔ اتنی دیر میں انھیں اُس کے متعلق کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کتنا اُجڈ اور جنگلی ہے۔ لگتا ہے کہیں بھی بندھا نہیں ہے۔ اُسے تو بات کرنا بھی نہیں آتا۔ اُس سے اب کچھ بھی بعید نہ تھا۔ جانے کس وقت اُس کے من میں کیا سما جائے۔

بہرحال میں نے طے کر لیا تھا کہ وہ تینوں مزید خاموش رہے تو میں اُسے بتا دوں گا۔ چاہے بعد میں بیرو اور بِٹھل مجھ سے کتنے ہی ناراض ہو جائیں مگر بروقت مجھے ہوش آ گیا۔ میری زبان بہکتے بہکتے رہ گئی۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ میں اُسے کیا بتا سکوں گا۔ صرف یہی کہ ہیرے حویلی میں ہیں۔ سرغنہ کے اس سوال کا جواب میرے پاس کیا ہے کہ وہ حویلی کے کون سے گوشے میں چھپائے گئے ہیں۔ یہ تو اباجان بھی نہیں جانتے۔ رات کو اباجان سے تھیلی لے کے صرف بیرو اور بِٹھل باہر گئے تھے۔ یہ وہی جانتے ہیں کہ انھوں نے تھیلی کہاں محفوظ کی ہے۔ اُن کے سوا کوئی کچھ نہیں جانتا۔ کمرے میں واپس آ کے انھوں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا، نہ کسی نے اُن سے یہ پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔ میرا گمان ہے کہ وہ سبزہ زار کی طرف گئے تھے اور اُنھوں نے تھیلی کسی درخت، گملے، جھنڈ یا جھاڑی میں کسی ایسی جگہ چھپائی ہو گی جہاں کسی کو شک نہ ہو سکے مگر یہ میرا گمان ہی تھا۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے نہیں گیا تھا۔ پورے یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے، اُنھیں عمارت ہی میں کوئی زیادہ محفوظ جگہ مل گئی ہو۔ سو میرے اس انکشاف سے کون سی مشکل دُور ہو سکتی تھی۔ باقی تو سب اُنھی پر منحصر تھا۔ شاید اباجان کی خاموشی کی بھی یہی وجہ تھی کہ بِٹھل اور بیرو کے تائیدی اشارے کے بغیر یہ اعتراف بے معنی تھا۔ وہ بھی اتنا ہی بتا پاتے جتنا میں۔

مگر بِٹھل اور بیرو کیوں یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انھیں تو ایسی چیزوں سے کبھی رغبت نہیں رہی۔ تبت سے واپسی پر فیض آباد میں اباجان نے اشارۃً انھیں پیش کش کی تھی کہ اگر وہ پسند کریں تو تبت سے لائے ہوئے نوادر تقسیم کر لیں۔ بِٹھل چاہتا تو اُن سے سبھی کچھ لے سکتا تھا۔ اباجان کچھ نہ بولتے لیکن صرف بِٹھل ہی نے نہیں، اُن سب نے اباجان کی پیش کش ہنسی میں ٹال دی تھی۔ پھر بِٹھل کو یہ کیا ہو گیا تھا۔ اب اُسے کون سی توقع تھی، کس موقع کی اُمید۔ اس انتظار میں تو کوئی بھی ناقابلِ تلافی نقصان ہو سکتا تھا۔ اُسے کانتے کا بھی احساس نہیں تھا کہ وہ اب کس حال میں لوٹے گا۔ جتنی دیر ہو رہی ہے، کانتے کے لیے اتنا ہی بُرا ہو رہا ہے۔ میرے دست و بازو اینٹھے جا رہے تھے۔ سرغنہ نے اباجان کو ہدف بنا رکھا تھا۔ اباجان کا حُلیہ خاص طور پر اُس کے ذہن نشیں کرایا گیا ہو گا کیونکہ اُس نے ہم میں سے اُنھی کو منتخب کیا تھا، یا وہ اس گمان میں تھا کہ ہم زیادہ دیر تک ایک بوڑھے آدمی پر ستم برداشت نہیں کر پائیں گے۔ یہی ہوا، منیر علی چپ نہ رہ سکے۔ سرغنہ نے اباجان کے سینے پر مکّے کی ضرب لگائی تو منیر علی چیخنے لگے ”ارے ظالمو! کچھ تو خدا کا خوف کرو، اتنے بزرگ آدمی پر ہاتھ اُٹھاتے ہو۔ خدا کے لیے رحم کرو۔ خدا تمھیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ منیر علی کی فریادی آواز پر وہ شخص اور برہم ہو گیا اور اُس نے لہجہ انداز میں اُنھیں متنبہ کیا کہ اپنی زبان کو لگام دیئے دیوار سے لگے کھڑے رہیں ورنہ وہ اباجان کی جگہ انھیں بلالے گا۔ اُس نے اُن سے اور بھی بہت کچھ کہا جو منیر علی نے پہلے کبھی نہیں سُنا ہو گا۔ انھوں نے اپنا منہ چھپا لیا تھا اور بچوں کے مانند ہچکیوں سے رونے لگے تھے۔ بیرو اور بِٹھل تک دیکھا کیے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب انھیں اور کون سا نظارہ مقصود ہے۔ میرے سینے میں یکایک آگ سی بھڑکنے لگتی تھی اور میرا دماغ بالکل ماؤف ہو جاتا تھا۔ کسی لمحے تو مجھے کچھ بھی دکھائی، سنائی نہیں دیتا تھا۔ بیرو اور زورا مجھے ابھی تک جکڑے ہوئے تھے، ہر چند اُن کی گرفت میں پہلے جیسی سختی نہیں تھی۔ سرغنہ اباجان کے پیٹ میں مکّے مار رہا تھا۔ اباجان کو شدید تکلیف محسوس ہو رہی ہو گی۔ وہ اپنا پیٹ پکڑے دُہرے ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے شعلہ بار نظروں سے بِٹھل کی جانب دیکھا، وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا۔ اُس کے سُوجے ہوئے چہرے پر بے شمار لکیریں اُبھری ہوئی تھیں، اور اُس وقت مجھے احساس ہُوا کہ بِٹھل کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں۔ وہ بھی اُسے کیا اور کتنا بتا سکتا ہے۔ ہیروں کی موجودی کے اعتراف کا مطلب تو یہ ہے کہ اباجان

کی حویلی کی طرف اُٹھی ہوئی نگاہوں کو اُن کے شک کی سند مل جائے۔ سرِدست وہ ہیروں کی تھیلی لے کے لوٹ جائیں گے لیکن بعد کی کیا ضمانت ہے کہ انھیں بھیجنے والوں کو قرار آجائے گا، وہ اسی پر اکتفا کرلیں گے اور اس کے بعد شہر کے دروازوں پر کھڑے ہوئے نگراں ہماری جانب سے آنکھیں بند کرلیں گے۔ ہیروں کے حصول کے بعد تو اُن کا تجسس اور بڑھ سکتا ہے اور وہ ہمارے لیے طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر سکتے ہیں۔ نہ معلوم، تھیلی میں اور کون سے ایسے نادر ہیرے ہیں جو ہیروں کی پرکھ رکھنے والوں کو اضطراب میں مبتلا کردیں۔ ہمارا اقبال، اقبالِ جُرم کے مترادف بھی تو ہو سکتا ہے۔ کیا یہ نہ سوچا جاتا کہ جن لوگوں کی ریاست میں آمد اور موجودگی پہلے ہی مشتبہ ہے، اُن لوگوں کی طرف سے یہ اقبال کیا گیا ہے۔ سلسلے ملانے والے تو دُور تک سلسلے ملائیں گے۔ سب سے پہلے تو انھیں بازار کے اڈّے سے ہماری وابستگی کا علم ہوگا جو ہو سکتا ہے، پہلے سے ہو۔ ہمارا سارا شجرہ جانے بغیر، ہمارے بارے میں ہر طرح سے مطمئن ہوئے بغیر وہ ہمیں یہاں سے کیوں جانے دیں گے۔ یہ اعتراف تو اپنی طرف مزید توجّہ دلانے کے مصداق ہوگا۔ اُسی زمین پر مزاحمت زیادہ کامیاب ہوتی ہے جہاں آدمی کی جڑیں ہوں۔ یہاں ہر سُورا جوں، نوابوں کی عمل داری ہے۔ وہ اتنے آدمی بھیج سکتے ہیں، صرف شک پر اتنا بڑا قدم اُٹھا سکتے ہیں، ایک ہیرے کے لیے اُن کی بے چینی کا یہ عالم ہے تو اب ہماری تحویل سے دست یاب ہونے والے ہیرے دیکھ کے تو اُن کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ شاد کام ہونے کے بعد تو اُن کی سرکشی کو اور توانائی ملے گی۔ اُن میں اتنی استطاعت اور ایسی دہشت ہے کہ ہم جہاں جہاں جائیں، اُن کے آدمی ہمارا سایہ بنے پھرتے رہیں۔ بچّھل کی خاموشی کا سبب یہی اندیشے ہوں گے۔ ہمیں ایک ہی وقت نہیں ٹالنا، آنے والے وقت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ آنے والے دنوں کے تحفّظ کے لیے ہمیں آخری لمحے تک انکار ہی کرتے رہنا تھا۔ یوں اپنی پسپائی کا اعتراف تو آخری لمحے میں بھی کیا جا سکتا تھا۔

میرے سر پہ جیسے بہت سی گرہیں کُھل گئی تھیں۔ اس کے سوا اور کیا صُورت ہے کہ ہم سَرغنہ کو یقین دلانے کے لیے یہ منظر دیکھتے رہیں۔ چاہے ابّا جان کا لباس تار تار ہو جائے اور سَرغنہ کی ضربوں سے وہ نیم جاں ہو جائیں۔ ابّا جان بھی اچھی طرح یہی کچھ سمجھ رہے تھے اسی لیے اس قدر استقامت سے یہ اُفتاد جھیل رہے تھے۔ اب یہی تھا کہ کانتے کے مانند ہم میں سے کوئی غُل مچا کے سَرغنہ کی توجّہ ابّا جان کی طرف سے دوبارہ ہٹا دے اور تھوڑی دیر کے لیے انھیں سکون مل جائے۔ ابّا جان پہلے تو جیسے تیسے اُس کے سوالوں کا جواب دیتے رہے۔ وہی سوال وہی جواب، لیکن پھر ابّا جان نے خاموشی اختیار کرلی۔ اُن کے سکوت اور ان کے عزم سے اتنا ضرور ہوا کہ سَرغنہ کا ہاتھ رُکنے لگا اور اُس پر کسی حد تک جھنجلاہٹ طاری ہو گئی تاہم جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آجائے یا اپنے منصب کا خیال آجائے، چند لمحوں کے تذبذب و تردّد کے بعد وہ چونک پڑا اور اُس نے فیصلہ کن لہجے میں ابّا جان سے وہی تکرار کی۔ ابّا جان کی خاموشی پر وہ اور گرجنے لگا۔ "سالا گونگا ہو گیا ہے، بڈّھے!"

"ہم آپ سے کس طرح کہیں۔" ابّا جان نے بے چارگی سے کہا۔ "یہاں ہمارے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔ ہم آپ کو اور کس طرح اطمینان دلائیں۔"

"وہ تو اب ہم خود کریں گے۔ اِدھر کا کونا کونا چھنوائیں گے پھر تم سے پوچھیں گے، اور دیکھو، ہم بولے دیتے ہیں، سالا مال یاں نکل آیا تو تم میں سے ایک کو بھی نئیں چھوڑیں گے۔"

"اِدھر کچھ نہیں ہے۔" بہت دیر بعد بچّھل نے زبان کھولی۔ اُس کی زبان اٹک رہی تھی۔ "اپنی بات کا یقین کرو، اتنی بڑی حویلی میں کِدھر کِدھر کھو جوگے۔ ہم قسم کھا کے بولتے ہیں، تلاشی سے کچھ نہیں نکلے گا۔ بے کار اپنا وقت کھوٹا کرو گے۔ اِدھر کچھ ہوتا تو ہم تم کو اتنی دیر بھی نہ رو کتے۔"

"اِدھر کچھ نئیں ہے؟" سَرغنہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"نہیں ہے سردار۔" بچّھل نے دبی زبان سے کہا۔ "کتنی بار بولیں۔"

"مال اِدھر ہی ہے۔" وہ پیر پٹخ کے بولا۔ "پہلے اگر تم ہماری بات سالا سیدھے سبھاؤ مان لیتے تو ہم تمھاری جاناں معاف کر دیتے پر اب تم کو سیدھا جہنّم میں بھیج کے جائیں گے، ہم یاں دیواراں، زمیناں ایک دم سب کھود کے ڈال دیں گے۔"

"ہم نے بول دیا ہے، آگے تمھاری مرضی۔" بچّھل نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اور اگر اِدھر سے کچھ نہ نکلا تو تم ہم کو کیا دو گے؟"

وہ سٹ پٹا سا گیا۔ جواب میں اُس نے بچّھل کو گالی دی۔ بچّھل نے اُسے پھر تلاش سے باز رکھنا اور یقین دلانا چاہا کہ اس تگ و دو سے کوئی فائدہ نہیں لیکن وہ نہ مانا۔ بچّھل کے اصرار سے اُسے مشکوک ہو جانا چاہیے تھا۔ اِدھر پیرو نے بھی بڑبڑاتے لفظوں میں اُسے یہی باور کرانے کی کوشش کی۔ یا تو وہ جان بُوجھ کے اُس کے تجسس کو ہوا دے رہے تھے یا بچّھل اور پیرو ہیروں کی تھیلی کسی غیر محفوظ جگہ رکھ آئے تھے مگر اُن سے اِس چوک کا امکان نہیں تھا۔ پیرو کی دخل اندازی نے مہمیز کا کام کیا۔ سرغنہ نے اُسے جھڑک دیا۔ پیرو تلملا کے رہ گیا۔

"ٹھیک ہے سردار۔" بچّھل نے شکست خوردہ سے لہجے میں کہا۔ "ایسا ہی ہے تو جا کے اوپر نیچے سارے کونے بچالے اچھی طرح ٹٹول لو۔ چھُپانے کو اِدھر نہ جگہ کی کمی ہے، نہ چیز کی۔ دیوار طاق، چولھا ہنڈیا، بکسے الماری، مسہری کرسی۔" بچّھل نے متعدد چیزوں کے نام لیے اور بولا۔ "جہاں جی کرے، جا کے دیکھ لو۔"

"اصلی جگہ کا نام بھی بولو۔"

"اصلی جگہ!" بچّھل نے ترشی سے کہا۔ "کون سی اصلی جگہ؟"

"وہی، جاں تم نے سالا مال دبا کے رکھا ہے۔"

"تمھارے من میں شک جم گیا ہے، اپنے کو پتہ نہیں، وہ ابھی ہم کیسے نکالیں۔ بعد میں جو من میں آئے کر لینا پر پہلے تھوڑی اپنی بات ذرا تسلّی سے سُن لو۔ ہم نے تم کو سب صاف صاف بول دیا ہے، لگتا ہے، تم نے کچھ بھی دھیان نہیں دیا۔ ہم کو خوب نظر آرہا ہے کہ تمھارے پاس بندوق بھی ہے، تمنچا بھی، آدمی کی بھی کمائی نہیں ہے۔ اتنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک بندوق دس کو جام کر لیتی ہے اور تمنچا تو سالا پُورا جادو ہے۔ کھٹکا دبتے ہی آدمی اِدھر سے اُدھر ہو جاتا ہے۔ اپنے بابا نے پہلے ہی تم کو بولا تھا کہ ہیرے سالے جان سے بڑے نہیں ہوتے۔ ہم کو معلوم ہے، تمھارا ایک اشارہ اپنی جان کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ تم سمجھتے ہو، اپنے کو کچھ بھی پتائی نہیں دے رہا ایسے میں تو آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھ لیتی ہیں، اس کے بعد بھی تم تلاشی لینا چاہتے ہو تو شوق سے لو۔"

بچّھل نے ایک ایک لفظ سنبھل سنبھل کے بولا تھا۔ سرغنہ نے غور سے سنا بھی تھا لیکن تلاشی کے ذکر پر وہ برافروختہ ہوا اور تلخی سے بولا۔ "تلاشی، ہم ضرور لیں گے۔"

"کیا کرے گا سردار! ایک دم بے کار ہوئے گا۔" پیرو نے تیزی سے کہا۔ "اپن کا بات ابھی مان لو۔"

سرغنہ نے دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی کو فوراً اشارہ کیا۔ وہ دوڑتا ہوا اندر آیا تو سرغنہ نے کڑکتی آواز میں حکم دیا کہ عمارت کی ایک ایک جگہ کی تلاشی لی جائے اور کسی چیز کا خیال نہ کیا جائے، چاہے کچھ بھی توڑنا پڑے۔ ہمیں سُنانے کے لئے توڑنے پھوڑنے کے لفظ پر اُس نے خاص زور دیا تھا۔ ہم میں سے کسی نے احتجاج نہیں کیا پھر اُس نے کمرے میں موجود چار آدمیوں میں سے ایک کی جانب انگلی اُٹھا کے ہدایت کی کہ وہ بھی باہر چلا جائے۔ وہ دونوں دروازے پر پہنچ گئے تھے، اُس کی آواز پر رُک گئے۔ اُس نے انھیں جلد سے جلد اپنا کام نمٹانے اور اُس کے لیے دو دو تین تین آدمیوں کے گروہ بنانے کی تاکید کی۔ ابھی اُس کی ہدایتیں جاری تھیں کہ پیرو نے جھجکتے ہوئے اُسے ٹوکا۔ "بولے تو اپن بھی ساتھ چلا جائے سردار؟ اِن کو تھوڑا آسانی ہو جائے گا۔ کام میں اِتا دیری نئیں ہوئیں گا۔"

سرغنہ نے گھورتی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے آدمی پیرو کی آواز سُن کے ٹھیر گئے تھے۔ سرغنہ نے چیختے ہوئے انھیں سرزنش کی۔ اُن کے جانے کے بعد کمرے میں اُس سمیت چار آدمی رہ گئے۔ چند لمحوں تک وہ بہت مضطرب نظر آیا اور کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے اُس نے ایک اور آدمی کو تلاشی کے لیے باہر جانے کو کہا۔ اُسے احساس تھا کہ رات زوال پر ہے۔ جتنے زیادہ آدمی باہر ہوں گے، اتنی ہی جلد کام مکمل کرلیں گے۔ اُسے شامل کرکے اب کمرے میں اُن کی تعداد تین رہ گئی تھی۔ نفری کم ہو جانے پر وہ کچھ زیادہ ہی چوکنّا اور تیار ہو گیا تھا۔ اُس کے باقی دونوں ساتھیوں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ایک دروازے کی طرف جا کے، دُوسرا اُس کے بالکل مخالف، دونوں مورچا سا بنا کے کھڑے ہو گئے تھے۔ اُن دونوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں، سرغنہ کے ہاتھ میں تمنچا تھا۔ اُس نے ابّا جان کو شانے سے پکڑ کے گھسیٹ لیا۔ اُس وقت اُس کی حالت ایسی اضطراری تھی کہ ایک ذرا سی بدگمان آہٹ پر گولی چلا دے گا۔ اُس کی نگاہیں مُسلسل ہم پر منڈلا رہی تھیں بچّھل اور پیرو شانے لٹکائے سمٹے کھڑے تھے۔ یقیناً وہ اُسے اپنی طرف سے اطمینان دلانا چاہتے تھے۔ میری رگیں اُس وقت پھڑک رہی تھیں۔

دیر تک خاموشی طاری رہی۔ سرغنہ نے اِس دوران ابّا جان سے بھی کوئی سوال نہیں کیا تھا، نہ اُس نے انھیں ہمارے درمیان واپس بھیجا۔ انھیں اپنے قریب رکھنے میں اُس کی مصلحت سمجھ میں آتی تھی۔

"سردار! سردار!" کمرے میں یکایک پیرو کی گھٹی گھٹی آواز گونجی۔ سرغنہ ہڑبڑا سا گیا۔ اُس نے جھٹ اپنا تمنچا پیرو پر تان لیا۔ "اپن ابھی ایک بات بولے؟" پیرو نے ہچکچاتے ہچکچاتے کہا۔

سَرغنہ کا مُنہ بگڑ گیا۔ ابھی اُس نے اجازت نہیں دی تھی کہ پیرو اُبلتے لہجے میں بولا۔ "ابھی تھوڑا بیٹھنے کی اجازت دو، سالا کھڑے کھڑے ٹانگ کھوتا پڑا ہے۔"

"سیدھی طرح کھڑے رہو۔" سرغنہ نے گرج کے کہا۔

کرانے کے لیے اُن دونوں کی نگاہیں بالکلیہ اُسی کی طرف منڈلانے لگی تھیں کہ اِدھر سے میں نے درمیان میں پڑے ہوئے تمنچے پر جست لگائی، اُنھیں بھی تمنچے کا خیال آ گیا تھا تاہم مجھ پر بندوق اٹھانے یا تمنچے پر قبضہ کرنے کے فیصلے میں انھیں ایک لمحاتی تامّل لازم تھا۔ اُدھر بھّل کے شکنجے کی گرفت سے سرغنہ بلبلانے لگا۔ اُن کی توجہ اس طرف بھی منتشر ہوئی۔ انھوں نے مجھ پر بندوق اُٹھالی تھی مگر اس جانب سے شامو اور جمرد کے بڑھنے کی آہٹ بھی اُن کے کانوں میں پہنچی ہو گی۔ تمنچا کسی طور ہماری تحویل میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ وہ دونوں پھر اُسی کی طرف لپک پڑے، پھر وہ اُسے فرش سے اٹھانے کے لیے جھکے ہی تھے کہ مارٹی، زورا، جمرد اور شامو نے انھیں مہلت نہیں دی۔ میرے جست لگاتے ہی وہ پیچھے سے اور اطراف سے اتنی تیزی کے ساتھ آئے کہ اُن دونوں کو سنبھلنے کا لمحہ نہ مل سکا۔ میں نے اس اثنا میں تمنچا فرش سے اُچک لیا۔ شامو تیزی سے جھکتا ہوا آیا اور سامنے آ کے ایک آدمی کی بندوق کی نال پکڑے پکڑے سیدھا اُوپر ہو گیا۔ یہ شامو کی غلطی تھی، اُس نے زیادہ پھرتی دکھائی، بندوق چل گئی۔ کمرے میں زور کا دھماکا ہوا اور گولی چھت میں ترچھی ہو کے لگی۔ اُس کی آواز عمارت میں دوسری جگہوں پر بھی گئی ہو گی۔

بھّل نے فوراً سرغنہ کے جسم سے اپنے بازو ہٹا لیے، اُس نے اُسے جھٹکنے کے انداز میں ایک طرف کر دیا۔ سرغنہ بے تحاشا دروازے کی جانب بھاگا مگر وہاں بیرد موجود تھا۔ یہ دیکھ کے اُس نے کمرے کی دُوسری جانب رُخ کیا۔ میں اُس پر تمنچا چلا دیتا لیکن بھّل نے تیزی سے میرے پاس آ کے تمنچے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میرے جی میں آئی بھی کہ گولی چلا کے ہی تمنچا اُس کے حوالے کروں لیکن میرے سامنے زورا نے سرغنہ کو پکڑ لیا تھا۔ زورا نے اُس کی پسلیوں پر پے در پے شدید ضربیں لگائیں۔ میں نے تمنچا بھّل کو دے دیا۔

دونوں آدمیوں کو ایک کونے میں کھڑا کر دیا گیا۔ اُن کی بندوقیں مارٹی اور شامو کے پاس تھیں۔ شامو نے اپنی بندوق بیرد کے حوالے کر دی۔ جمرد، مارٹی، ٹنگو اور شامو اُن تینوں سے نمٹنے کے لیے بے قرار ہو رہے تھے۔ بیرد نے انھیں روکا۔ کسی وقت بھی اُن کے باقی ساتھی کمرے کی طرف لوٹ سکتے تھے اور اُن کی تعداد کم نہیں تھی۔ میں نے بھّل سے باہر جانے اور کانتے کو دیکھنے کے لیے کہا لیکن وہ سر ہلا کے رہ گیا۔ ہمیں صحیح طرح سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی کہ باہر راہ داری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آئیں۔ بیرد کے اشارے پر کسی تاخیر کے بغیر مارٹی اور شامو دروازے کے اس طرف آڑ میں ہو گئے، دوسری طرف جمرد اور زورا کھڑے ہو گئے۔ اس مہلت میں یہی ہو سکتا تھا کہ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر ہم سب جلد از جلد اِدھر اُدھر کی دیواروں سے چپک جائیں۔ گو ضروری نہیں تھا کہ آنے والے اُسی تیزی اور دہشت سے اندر داخل ہوں جو ہماری خواہش تھی۔ گولی چلنے کی آواز اگر اُن تک پہنچ گئی تھی تو انھیں پھونک پھونک کر ہی اندر قدم رکھنا چاہیے تھا۔ چاپوں سے آنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ زورا نے اشارہ کیا کہ کیوں نہ ہم دروازے سے نکل کے راہ داری میں اچانک اُن کے سامنے پہنچ جائیں، اس طرح وہ یقیناً متزلزل ہو جائیں گے۔ بے شک، یہ بھی ایک صورت تھی لیکن ہماری توقع کے خلاف اگر وہ حوصلہ برقرار رکھتے تو ناچار ہمیں بے دریغ گولیاں چلانی پڑتیں، رات کے سناٹے میں دُور دُور تک آوازیں جاتیں اور حویلی کے مختلف کمروں میں اُن کے تلاشی لینے والے ساتھیوں تک بھی ضرور پہنچتیں۔ ذرا سا وقت مل جاتا تو اور کئی تدبیریں بھی نکل آتیں۔ باہر راہ داری میں ستونوں کے علاوہ بھی بہت سی ایسی جگہیں تھیں جن کی آڑ میں ہم اُن کا انتظار کر سکتے تھے۔ اُن کے کچھ آگے نکل جانے پر ہم عقب سے برآمد ہوتے تو انھیں کوئی حکم دینے ہی کی پوزیشن میں ہوتے۔ وقت ملتا تو ہم میں سے کوئی ایک اُن کا حلیہ بنا کے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا تاکہ وہ اطمینان سے اندر آتے رہیں۔ اُن کی وضع قطع اختیار کرنا ایسا مشکل نہیں تھا۔ آنکھوں اور پیشانی کے سوا اُن سب کے چہرے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ اتنی آسانی سے شناخت نہیں کر سکتے تھے مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم اندر کمرے ہی میں اُن کا انتظار کریں۔ گولی کی آواز سننے کے باوجود اُن کے ایک ساتھ آنے کا امکان نہیں تھا کیونکہ وہ حویلی میں مختلف ڈیوٹیوں پر تھے۔ یہ اطمینان بھی کم نہیں تھا کہ وہ ٹولیوں میں آئیں گے۔ ہم نے خیال رکھا تھا کہ باہر سے دیکھنے پر کمرے میں انھیں سامنے کچھ نظر نہ آ سکے۔ اِس صورت میں وہ کمرے کے اطراف کا جائزہ لینے کے لیے اندر ضرور جھانکیں گے۔ اُن کے ہاتھوں میں اُٹھی ہوئی بندوقوں یا تمنچوں کی نالیں بھی اُن کے جھانکتے ہوئے سروں کے ساتھ یا پہلے اندر آ سکتی تھیں۔

مارٹی نے اپنی بندوق ٹنگو کی طرف اُچھال دی تھی تاکہ اُس کے دونوں ہاتھ آزاد رہیں اور بندوق کسی اُلجھن کا سبب نہ بن سکے۔ وہ اور زورا دروازے کے دونوں اطراف سب سے

...گے تھے۔ اُن کے برابر شامو اور جمرد۔ ابّا جان، منیر علی اور ...وں ملازم، دروازے کے ساتھ والی دیوار کے دائیں جانب ...ونے میں کھڑے تھے۔ بائیں جانب کے دوسرے کونے میں ...ن تینوں آدمیوں کو ٹنگو بندوق کی زد پر لیے ہوئے تھا۔ اُس کے ...ریب بھّل دیوار سے کچھ ہٹ کے تمنچا تانے کھڑا تھا اور اُس ...کے مقابل، دوسری طرف بیرد بندوق لیے کھڑا تھا۔ میں بیرد کے ...زدیک تھا۔ اتنی دیر میں یہی کچھ ہو سکتا ہے۔

دروازہ کھُلا ہوا تھا۔ روشنی بھی انھیں باہر سے نظر آ رہی ہو ...لیکن ایسی خاموشی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ یہ سناٹا انھیں مشتبہ کر ...کتا تھا۔ یہی ہوا۔ دروازے کے قریب اُن کی لپکتی چاپیں یک ...نت ٹھٹھر گئیں۔ ہم سانس روک کے کھڑے تھے۔ ہماری ذرا سی ...ک سے سب کچھ خواب کی طرح بکھر سکتا تھا۔ تین آدمیوں کے ...دا اُن کے سارے آدمی باہر تھے اور سب کے سب مسلح۔ بہرحال ...وازے پر مارٹی، زورا پر تولے کھڑے تھے۔ اُن کی آمد اس طرح شروع ...ی کہ پہلے اُن کی بندوقوں کی نالیں اندر آئیں۔ مارٹی اور زورا نے ...توقف کیا۔ ہو سکتا ہے، اس توقف کے لیے بیرد نے انھیں کوئی ...شارہ کیا ہو۔ بندوقوں کے ساتھ آنے والوں کے سروں کا اندر آنا ...ی لازم تھا۔ مارٹی اور زورا کے لمحاتی تامّل سے نالیں اور اندر ہو ...گئیں۔ انھیں بطورِ خاص یہ خیال بھی رکھنا تھا کہ نالوں کا رُخ عین ...سامنے کی جانب رہے جہاں کوئی نہیں تھا یا نیچے فرش یا اوپر چھت ...کی جانب۔

وہ دروازے پر تھے۔ یہ سوچ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ اگر اُن ...میں سے ایک اندر آیا یا اگر اُن کی تعداد تین ہوئی اور ایک باہر رہ گیا ...؟ وہ چار بھی ہو سکتے تھے۔ دروازے سے بیک وقت دو ...ہی اندر آ سکتے تھے۔ شاید بھّل کے ذہن میں بھی یہی خدشہ اُبھرا ...تھا، وہ دوڑ کے مارٹی کے پاس دروازے کے قریب چپک گیا، ...اُسے زیادہ سوچنے کے لیے اُسے وقت ہی کتنا ملا تھا۔ میرا دماغ ...نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ میں بھول گیا کہ یہ بات بھّل اور ...بیرد تو کیا، سبھی کے ذہنوں میں ہو گی کہ آنے والوں کی تعداد دو سے ...زیادہ ہو سکتی ہے۔ اُن کی تعداد کتنی بھی ہو، کمرے میں رہتے ہوئے ...ہمارے پاس اور طریقہ بھی کونسا تھا۔ بھّل عین وقت پر اس لیے نہیں ...گیا تھا کہ اُس کے ذہن میں اُن کی کمی بیشی کا کوئی اندیشہ اچانک جاگ ...اُٹھا تھا اور اس طرح وہ دروازے کے قریب رہ کے باہر رہ جانے ...والوں کا فوراً تعاقب کر سکتا تھا، وہ اپنی چاپوں کی گونج سے انھیں اندر آنے کے لیے اکسانا چاہتا تھا اور چونکہ وہ اُن کی نظروں سے اوجھل اندر ہی اندر مارٹی کے پاس آیا تھا اس لیے دروازے پر آنے والوں کا اندر کمرے کے متعلق تجسس و تردد فطری امر تھا لہٰذا دوسرے ہی لمحے اُن کے سر اندر تھے اور قدم بھی۔ مارٹی اور زورا تاک میں تھے۔ دونوں اتنی پھرتی سے اُن پر جھپٹے کہ وہ اپنے بڑھتے ہوئے قدم واپس نہ لے جا سکے۔ مارٹی اور زورا نے جست لگائی اور پوری طاقت سے اُن کے سر نیچے جھکا کے انھیں گھسیٹتے ہوئے دُور چلے گئے۔ اُن کی بندوقیں اُن کے جسموں تلے دب گئیں۔ اس عالم میں حواس قائم رکھنا مشکل تھا۔ مارٹی اور زورا کے بعد ایک ثانیے کے وقفے سے جمرد اور شامو بڑھ گئے تھے مگر باہر ایک تیسرا آدمی بھی تھا۔

مارٹی اور زورا دروازے سے ہٹے تو بھّل نے اُن کی طرف ایک نگاہ دیکھنے کا وقت بھی صرف نہیں کیا، فوراً باہر کی طرف بھاگا۔ بیرد نے اُس کی پیروی کی۔ میں بھی لمحوں میں باہر آ گیا۔ بھّل نے چند قدم بعد ہی اُسے جا لیا۔ تیسرا آدمی اپنے دو ساتھیوں کو اس صورتِ حال سے دوچار دیکھ کے یا تو اُن کی مدد کے لیے اندر آ سکتا تھا یا اُلٹے قدموں بھاگ جاتا۔ اُس نے دونوں کام کیے۔ پہلے وہ اندر آنا چاہتا تھا پھر بھّل کو آتا دیکھ کے بھاگ کھڑا ہوا۔ اگر وہ سیدھا بھاگتا چلا جاتا تو اُس کے بچاؤ کی کوئی صورت نکل آتی لیکن بھاگتے بھاگتے اُس نے پیچھے مڑ کے دیکھا، بھّل اُس سے گنتی کے قدموں کی دُوری پر تھا۔ بھّل کے ہاتھ میں تمنچا بھی اُس نے دیکھ لیا ہو گا۔ ہرچند وہ خود بندوق اٹھائے ہوئے تھا لیکن ہتھیار کے ساتھ حواس و اعصاب کی یک جائی اور درستی شرط ہے۔ بھّل کے پیچھے اُس نے مجھے اور بیرد کو بھی دیکھ لیا تھا اور جس نے دفاع کی ٹھان لی ہو اُسے حملے پر آمادہ ہونے میں ایک ہی پل کا وقفہ تو چاہیے۔ بھّل اُس کے سر پہ پہنچ چکا تھا۔ وہ بندوق کے ساتھ اپنی جگہ جم کے رہ گیا۔ بھّل نے اُس سے کچھ کہا نہیں لیکن بھّل کا یہ ارادہ شاید اُس نے بھانپ لیا تھا کہ دوسری صورت میں وہ تمنچا ہی چلائے گا، اُسے فرار نہیں ہونے دے گا۔ اُس میں کم از کم اتنا ہوش باقی تھا۔

اُس کی بندوق میں نے لے لی۔ ہم ابھی کمرے میں نہیں جا سکے تھے کہ سیڑھیوں سے مزید آدمیوں کی آہٹیں سنائی دیں۔ بیرد دروازے کے قریب تھا۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ اُسے بیرد کی طرف دھکیل دوں۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے زور سے جھٹکا دے کے اُسے دھکیلا، بیرد نے دو قدم آگے آ کے اُس کے کولھے پر

لات ماری۔ وہ دروازے کے اندر جاکے گرا۔ پیرو سامنے نہ ہوتا تو بھی وہ دروازے ہی سے ٹکراتا۔ اندر سے کسی نے جھٹ اُسے کھینچ لیا۔ پیرو بھی اندر چلا گیا۔ ہمارے پاس اندر جانے کا وقت نہیں رہا تھا چنانچہ بٹھل دروازے کے مقابل تھم کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں نے نزدیک کے دوسرے تھم کا سہارا لے لیا۔ بٹھل کی نسبت یہ جگہ زیادہ محفوظ تھی۔ پیرو کی ٹھوکر اور دروازے کے فرش سے ٹکرانے کی وجہ سے اُس شخص نے ڈکرانا شروع کر دیا تھا اسی لیے سیڑھیوں سے آنے والوں کی رفتار میں تیزی آگئی تھی۔ انھوں نے سیڑھیاں اُتر کے احتیاطاً راہ داری میں اِدھر اُدھر ضرور دیکھا ہوگا۔ جب انھیں کوئی نظر نہیں آیا تو وہ سیدھے کُھلے دروازے کی طرف لپکے۔ وہ بھی تین تھے۔ وہ دروازے میں داخل ہونا ہی چاہتے تھے کہ بٹھل نے دھیمی آواز میں انھیں ٹھیرنے کا حکم دیا۔ وہ اندر جاتے جاتے ٹھٹک گئے۔ پھر انھوں نے پلٹ کے دیکھا، بٹھل اور میں تمنچا اور بندق تانے اُن کے سامنے کھڑے تھے۔ حیرانی کی ایک لہر کے بعد وہ سنبھلے تو کمرے کے اندر پیچھے سے جمرو اور شامو نے اُن کی گردنوں میں اپنے بازوؤں کا پھندا ڈال دیا اور اسی حالت میں اُلٹے قدموں انھیں اندر کھینچ لیا مگر تیسرا آدمی اُن کی زد پر نہیں آسکا تھا۔ وہ اُن دونوں کے پیچھے تھا۔ اپنے دو ساتھیوں کی چیخوں اور کراہوں پر اُس نے ہمارے سامنے سے مڑ کے دروازے کی طرف نگاہ کی، میں نے فوراً اُس پر بندق کھینچ ماری۔ میں اتنی جلدی اُس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ بندق کی بٹ سے اُس کے سر کا نشانہ لوں۔ اتنی دیر میں وہ پلٹ پڑا۔ بندق اُس کی کنپٹی پر جاکے لگی اور ٹھیک ہی لگی، وہ چکرا گیا۔ میں بندق پھینک کے اُس کی طرف لپکا لیکن میرے پہنچنے تک وہ اپنی سُدھ بُدھ تقریباً کھو بیٹھا تھا۔

پھر میں اور بٹھل باہر ہی کھڑے رہے۔ پیرو بھی وہیں آگیا تھا۔ بار بار مجھے کانتے کا خیال آتا اور میرا دل ڈوبنے لگتا۔ کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ اُسے کون سے کمرے میں لے گئے ہیں۔ میں بٹھل کو دوبارہ ٹوکنا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کے چُپ رہا کہ بٹھل کو اُس کی فکر مجھ سے زیادہ ہوگی۔ ویسے بھی ہمیں ابھی یہاں سے نہیں ہٹنا چاہیے تھا۔ یہی تدبیر مناسب تھی جو ابھی اندر بھیجے جانے والے تین آدمیوں پر آزمائی گئی تھی۔ ہم تینوں مختلف تھموں کی آڑ میں کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بٹھل نے اس دوران اشارۃً مجھ سے کہا کہ میں بندق کے کھٹکے پر انگلیاں ڈھیلی رکھوں۔ بٹھل کو اس تلقین کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنی بات تو کسی حد تک میں
جانتا تھا۔

آخری تین آدمیوں کے کمرے میں جانے کے بعد ایک
اٹھا تھا مگر اچھا ہوا، جلد ختم ہو گیا۔ ہم تھموں کی اوٹ میں
انتظار کرتے رہے۔ لمحے گزر گئے۔ راہ داری میں کسی جانب
کوئی آہٹ نہیں اُبھری۔ ایک ایک پل ہمارے لیے پہاڑ
چار پانچ منٹ ہمیں ساکت کھڑے ہوئے گزرے ہوں گے کہ راہ دا
میں دائیں طرف سے پھر آہٹیں گونجیں، پیرو اور بٹھل نے بھی سُن
ہوں گی۔ مگر یہ کوئی ایک آدمی ہو سکتا تھا۔ اُس کی دبی ہوئی چاپیں
بھی دوسروں سے مختلف تھیں، ایک مرتبہ اُٹھ کے معدوم ہو
ہو گئیں۔ چند ثانیے بعد چاپیں دوبارہ اُبھریں تو پہلے سے زیادہ
واضح اور قریب تھیں۔ ضرور کوئی چھُپ کے اِس طرف آ رہا تھا
یکایک پیرو کی مضطربانہ سرگوشی راہ داری کے در و بام میں سرسرا

"دادا! یہ تم ہے!"

میں نے تھم کی اوٹ سے سر نکال کے دیکھا تو میری آنکھیں
کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ وہ کانتے تھا۔ پھر میں اپنی جگہ نہ ٹھیر سکا۔ چن
قدموں کا فاصلہ بجلی کی طرح طے ہوا۔ میں نے جب تک اُسے
ہاتھوں سے ٹٹول کے اچھی طرح دیکھ نہ لیا، مجھے یقین نہیں آیا۔ مجھے جانے کیسے کیسے وہم آ رہے تھے۔ وہ کانتے ہی تھا۔ اُس کے چہرے۔ شانے اور ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ بکھرے بال، سارا چہرہ سوجا ہوا، خون میں لتھڑا ہوا لیکن اُس کی آنکھوں میں خون کے بجائے روشنی سی بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنے پیروں سے چلتا ہوا آیا تھا اور اپنے پیروں ہی پر قائم تھا۔ اُس کے کندھوں سے دو بندقیں لٹک رہی
تھیں اور ہاتھوں میں دو تمنچے دبے تھے۔ میں نے اُسے بازوؤں
بھینچ لیا۔

"وہ لوگ کدھر ہے؟" پیرو نے بے تابانہ اُس سے پوچھا
"کمرے میں بند کر کے آیا ہوں حرام کے جنوں کو۔"
"ابھی کون سے کمرے میں ہے؟"
کانتے نے اُس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے وہ لوگ مجھے، کانتے، زودرا، جمرو، شامو اور مارٹی کو یہاں لائے تھے۔
"وہ سالا اُدھر زیادہ شور تو نئیں کریں گا؟"
"دیر لگے گی دادا!" کانتے نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔
کانتے سے مزید کچھ پوچھنے کا محل نہیں تھا۔ پیرو نے مجھ

سے کہا کہ اُسے اندر کے کمرے میں لے جاؤں۔
"ہم کو اِدھر ہی رکھو دادا!" کانتے نے منمناتے ہوئے کہا۔
"تم کو جیسا بولا ہے، ویسا کر دے"
کانتے ٹھیرنا چاہتا تھا۔ اُسے کوئی جواب دینے کے بجائے پیرو نے حکیمہ لہجے میں مجھ سے کہا کہ اُسے جلد از جلد اندر
دروازے تک پہنچا دوں۔ پیرو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ راہ داری
میں تادیر ہمارا یوں کھڑا رہنا مناسب نہیں تھا۔ کانتے کو بھی
اپنے پیروں پر اپنے دریدہ جسم کا اتنا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔
میں اُسے اندر لے آیا۔ کانتے کو دیکھ کے سبھی اُچھل پڑے اور
چیخنے لگے۔ جامو، شامو، مارٹی اور مُنیر علی اُس کے گرد جمع ہو گئے۔
کانتے ہی نے انھیں ٹوکا۔ میں خود اُسے وہاں سے ہٹا کے بہ عُجلت
اُس کونے میں لے آیا جہاں ابّا جان اور تینوں ملازم تھے۔ میں
نے اُس کے کندھے سے بندقیں اُتاریں اور ایک تمنچا اپنے پاس
رکھ لیا۔ آستین سے میں نے اُس کا منہ صاف کرنے کی کوشش کی۔
خون ابھی تک چھلک رہا تھا۔ انھوں نے ضرور اُس کا چہرہ نوچا
کھسوٹا ہوگا۔ یہ ناخنوں ہی کے کھرونچے ہو سکتے تھے۔ کانتے کو بہت
تکلیف ہو رہی ہوگی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس کے لیے
کیا کروں، کون سا مرہم لاؤں کہ اُس کے زخم فی الفور مندمل ہو جائیں۔ جی چاہتا تھا کہ اُسے اپنے سینے میں بھینچے رکھوں، اُس کی پیشانی، اُس کے گالوں کو خوب پیار کروں۔ ٹنگو اور زودرا، سرغنہ اور اُس کے ساتھیوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ کانتے کو دیکھ کے اُن لوگوں کی آنکھیں بھی پھیل گئیں۔ میں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پیرو اور بٹھل وہاں موجود ہی تھے۔ اِدھر جمرو، شامو اور مارٹی دوبارہ دروازے کے برابر دیوار کے ساتھ چپک کے کھڑے ہو گئے تھے۔ کانتے کا خون روکنے کے لیے مُنیر علی نے اپنا کُرتا پھاڑ دیا اور اپنے حاجیوں والے سر کے رومال سے اُس کے زخم صاف کرنے لگے۔ کانتے مسلسل اُٹھنے کی ضد کر رہا تھا۔ مان ہی نہیں رہا تھا، آخر ابّا جان کو اُٹھنا پڑا تب کہیں وہ چُپ ہوا۔ کانتے کی آمد پر ابّا جان جیسے بیدار ہو گئے تھے ورنہ وہ ننگے فرش پر کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے گم سُم بیٹھے تھے۔ کانتے اٹھنے کی اتنی ضد کر رہا تھا مگر بیٹھتے ہی کراہنے اور بے سُدھ سا ہونے لگا۔ مُنیر علی نے اُسے فرش پر لٹا دیا اور اُس کا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ وہ کبھی اُس کا سر دباتے، کبھی بالوں میں انگلیاں پھیرتے۔ اُن کی تھپکیوں سے کانتے پر غشی طاری ہو جانی چاہیے تھی لیکن اُس نے آنکھیں بند نہیں کیں۔ وہ ابھی تک اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ اتنے میں راہ داری سے پھر چاپوں کی گونج سُنائی دی۔ سب نے ایک دوسرے کو مستعد رہنے کے لیے اشارے کیے۔ میں بھی تمنچے کا رُخ دروازے کی سمت کیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر بٹھل اور پیرو کو انھیں روکنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ دو تھے، دونوں سیدھے اندر آئے۔ جمرو اور شامو تیار کھڑے تھے۔ انھوں نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ وہ اُن پر ٹوٹ پڑے۔

✿

کمرے میں اُن لوگوں کی تعداد گیارہ ہو گئی۔ چار آدمی کانتے بند کر کے آیا تھا۔ اب چند ہی آدمی باہر رہ گئے ہوں گے اور اگر وہ عمارت کے باہر نگرانی پر ہوئے تو انھیں قابو میں کرنا ایسا آسان نہیں تھا۔ آخری دو آدمیوں کے بعد بٹھل اور پیرو اندر آگئے اور انھوں نے اپنی جگہوں پر زودرا اور جمرو کو باہر بھیج دیا۔ اندر آتے ہی بٹھل نے شامو کو ہدایت کی کہ وہ اُن لوگوں کے چہروں سے ڈھاٹے نوچ لے۔ شامو کے پیچھے ٹنگو بندق لیے کھڑا تھا، میرے اور بٹھل کے تمنچے کا رُخ بھی اُنھی کی طرف تھا۔ پہلے شخص نے کسی قدر مزاحمت کی، شامو نے اُچھل کے اتنی طاقت سے اُس کے پیٹ پر ہاتھ کی ضرب لگائی کہ اُس کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ شامو نے اُس کے گلے میں اُنگلیاں گاڑ دیں، وہ بُری طرح ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔ باقی دوسرے آدمیوں کے لیے شامو کو یہ زحمت نہیں کرنی پڑی۔ کنارے پر کھڑا ہوا سرغنہ آخری آدمی تھا جس نے خود ڈھاٹا اُتارا، اُس کی شکل و صورت میرے تصور سے اتنی مختلف نہیں تھی اور تقریباً سبھی کی۔ اُن میں سے بیشتر کے رنگ سانولے تھے۔ گہرے اور پختہ رنگ۔ سب تیس سے چالیس کے لگ بھگ ہوں گے۔ ایک شخص کی چھوٹی سی داڑھی بھی تھی۔ باقی سب کی چھوٹی بڑی مونچھیں تھیں۔ اڈوں سے اُن کا دور کا بھی تعلق نہیں ہوگا، نہ وہ شہر کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے چہرے کھُردرے اور سخت تھے، بدن گٹھے ہوئے، قد اوسط یا پست، اپنی مخصوص وضع قطع اور طور طریق سے سب کسی ایک قبیلے یا کنبے کے افراد لگتے تھے، شورہ پشتی جن کا پیشہ ہو۔ عجب نہ تھا کہ وہ کسی رئیس کی جاگیر میں اسی کام پر ملازم ہوں یا باقاعدہ ڈکیت ہوں جن کی خدمات کسی راجا یا نواب نے حاصل کر لیں۔

بٹھل اور پیرو لمحوں تک اُن کے چہرے دیکھا کیے۔ پیرو بار بار پہلو بدلتا اور بٹھل کی طرف دیکھتا۔ کمرے میں بھن بھناتا سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ سب منتظر تھے کہ بٹھل اُن کے متعلق کیا فیصلہ کرتا ہے۔

زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ "ابھی اور کتنے رہتے ہیں؟" معاً بھٹل کی آواز کمرے میں گونجی۔ اُس نے سرغنہ کی طرف مڑ کر کے پوچھا تھا۔ سرغنہ نے سُنی ان سُنی کر دی۔ کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ "ہم نے بولا ہے کہ ابھی باہر اور کتنے رہ گئے ہیں؟" بھٹل نے اونچی آواز میں دُہرایا۔

سرغنہ کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ جواب دینے کے لیے اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے تھے لیکن پھر اُس نے خاموشی ہی مناسب سمجھی۔

"ابھی یہ جانگلی لوگ ایسا کیسے بولے گا بھٹل بھائی!" پیرو نے تلخی سے کہا اور لپک کے سرغنہ کے رُوبرو جا کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی بندوق اُتار کے میری طرف پھینک دی تھی۔

پیرو شاید سوچ رہا تھا کہ سرغنہ پر کون سی ضرب لگائے کہ بھٹل نے اُس سے کہا "ٹھیک ہے دادا! ابھی اس کو تھوڑا سانس لینے دو۔ اِدھر دوسرے لوگ کم نہیں ہیں۔ اِس کو اکٹھا ہی دیکھیں گے"

کسی قدر تذبذب کے بعد بھٹل کی بات جیسے پیرو کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ سرغنہ کے سامنے سے ہٹ کے اُس کے برابر کھڑے ہوئے آدمی کے مقابل ہو گیا اور وہی سوال دُہرایا۔ وہ شخص بے قراری سے سرغنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ پیرو نے اُس کے بال پکڑ کے اُسے آگے کی طرف کھینچ لیا۔ میری نگاہ اُس وقت جانے کس طرف بھٹک گئی تھی۔ میں نے بس اُس شخص کو چیخ مارتے سُنا اور اُس کے قدم زمین سے اکھڑتے دیکھے۔ وہ فرش پر گر گیا۔ پھر وہ اُٹھ کے بھاگنا چاہتا ہی تھا کہ پیرو نے اُس کے سر پہ ٹھوکر ماری۔ اُس کے منہ سے عجیب بے ہنگم آوازیں نکلنے لگیں اور اُس کا سارا جسم فرش پر پھڑکنے لگا۔ پیرو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُسے ٹھوکریں مارتا رہے۔ پیرو کے چہرے پر خون جیسے دہک رہا تھا، ہاتھ پیر اکڑے ہوئے سے تھے، اُس نے بال پکڑ کے اُسے فرش سے اُٹھایا اور سرغنہ کی طرف دھکیل دیا۔ سرغنہ اور اُس کے ساتھیوں نے اُسے سنبھالا۔

جیسے ہی پیرو دوسرے آدمیوں کی طرف بڑھا، سرغنہ جلتی آواز میں بولا "ہم بتاتے ہیں، ہم بتاتے ہیں!" اُس نے مزید ردّ و قدح کے بغیر بتایا کہ اُس کے ساتھ چوبیس آدمی تھے۔ پیرو نے استفسار کیا کہ باقی آدمی کہاں کہاں تعینات کیے گئے ہیں؟ سرغنہ نے کسی قدر تامّل کیا، پیرو نے اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور اس سے پہلے کہ اُس پر ہاتھ اُٹھاتا، وہ بول پڑا کہ دو آدمی ابھی عمارت ہی میں موجود ہیں۔ باقی پانچ عمارت کی چوکسی پر ہیں اور فصیلوں کے

باہر ہیں۔

پیرو اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ اگر اُس نے ذرا بھی ز بیانی کی تو ---- مگر اُس کی بات ادھوری رہ گئی۔ بھٹل نے شا کو تاکید کی کہ وہ ان سب کی تلاشی لے۔

"تلاشی کیسا بھٹل بھائی!" پیرو نے بھڑک کے کہا "ابھی ان کا کپڑا ہی اُتار لیتا ہے نا۔ دیکھتا ہے، سالا کتنا چربی چڑھ کے آیا ہے۔"

شامو نے پہلے آدمی کی کمر سے بندھی ہوئی کارتوسوں کی پیٹی اُتا لی، اُس کی جیبوں سے بھی چند کارتوس برآمد ہوئے۔ پیرو بھی شا کا ساتھ دیتا رہا۔ تیسرے آدمی نے کچھ ہیر پھیر کی، شامو نے نیچے سے اپنی بندوق کی بٹ اُس کی ٹھوڑی پر ماری۔ اُس کے کئی دان ٹوٹ گئے ہوں گے، آنکھیں تو ویسے ہی اُبل پڑی تھیں۔ اُس کے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تمنچا بھی نکلا۔ دونوں نے چند منٹوں میں اُن کے کوٹوں سے چھپی ہوئی کارتوسوں کی پیٹیاں، مختلف جیبوں میں پڑے ہوئے کارتوس، دو تمنچے اور ہم سے ہتھیائے ہوئے چاقوؤں کے علاوہ اُن کے تین چاقو بھی برآمد کر لیے تھے۔ اگر سرغنہ کے بیان کے مطابق اُس کے دو ساتھی واقعی عمارت میں موجود تھے وہ دو وجوہ سے یہاں نہیں آ سکے تھے۔ یا تو وہ ابھی تک تلاش میں ہوں گے یا اُنھیں شروع ہی سے عمارت کے کسی حصّے میں پاسبانی کے لیے تعینات کیا گیا ہو گا چنانچہ اُن کے یہاں آنے کا امکان نہیں تھا۔ ان کے سروں پر کسی کھٹکے کے بغیر ہمارا پہنچ جانا آسان تھا۔ بہر حال ہمارے لیے کم از کم اُن دو تک رسائی حاصل کرنا ضروری تھا۔ کسی طور بھی انھیں یہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہونا چاہیے تھا۔

بھٹل نے کچھ دیر انتظار کیا۔ اس دوران وہ سرگوشیوں میں پیرو سے کچھ کہتا سنتا رہا، کوئی مشورہ کر رہا ہو گا۔ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس وقت وہ کیسی کش مکش سے دوچار ہو گا۔ اُن سے کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی تھی۔ خود اُنھوں نے اپنے لیے کوئی گوشہ نہیں چھوڑا تھا۔ اُن کے بارے میں بھٹل نے ہم میں سے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ شاید اس لیے کہ اُسے ہمارا جواب معلوم تھا۔ سب کا ایک ہی جواب ہوتا اور وہ ہماری آنکھوں میں، ہمارے چہروں پر لکھا ہوا تھا۔ صبح ابھی دُور تھی لیکن لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ بھٹل اور پیرو کو اُن کے متعلق جلد کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ بھٹل نے اتنی دیر عمارت میں موجود دو آدمیوں کی ممکنہ واپسی کا انتظار کیا تھا یا اُسے اپنے خون کی حدت کم کرنے کے لیے اس وقفے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو گی۔ وہ پانچ آدمی بھی

اُس کی آنکھوں میں کھٹک رہے ہوں گے جن کے متعلق بتایا گیا تھا کہ عمارت کے اطراف لیکن فصیلوں کے اندر نگرانی کے لیے متعین ہیں۔ وہ سب کے سب مسلّح ہوں گے، اور اپنے ساتھیوں کی جلد واپسی کے منتظر۔ بھٹل نے شامو سے کہا کہ وہ سرغنہ کو اُس کے ساتھیوں کے درمیان سے آگے لے آئے۔ اُس نے مزید دو آدمیوں پر انگلی اُٹھائی۔ شامو نے اُنھیں بھی سرغنہ کے ساتھ باہر کھینچ لیا۔ کسی تاخیر کے بغیر وہ اُن تینوں کو لے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ بھٹل اور پیرو نے مجھے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اُنھوں نے میری طر[illegible] دیکھا ہی نہیں تھا لیکن جیسے ہی وہ سرغنہ اور اُس کے ساتھ[illegible] تمنچوں کی زد میں لیے دروازے سے باہر نکلے، میں بھی [illegible] پیچھے پیچھے ہو لیا۔ راہ داری میں آ کے پیرو ٹھیر گیا اور اُس نے سرغنہ کا شانہ تھام کے کہا "سُنو، گیدڑ کا اولاد! اپن کا بات ابھی پورا دھیان سے سنو!"

پیرو نے اُس سے کہا کہ ہمیں وہ دونوں آدمی فوراً درکار ہیں جو سرغنہ کی اطلاع کے مطابق اندر عمارت میں کہیں ہیں۔ سرغنہ جواب میں کہہ سکتا تھا کہ وہ تلاشی کے لیے گئے ہیں مگر اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا بلکہ اپنے تیوروں سے لاعلمی ظاہر کی۔ پیرو نے اُس سے دوبارہ نہیں پوچھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کے اُس کے جبڑوں پر پوری شدّت سے ہتھیلیاں ماریں۔ سرغنہ کی آنکھوں میں اندھیرا ابھر گیا ہو گا۔ پیرو نے اُس کی گُدّی پکڑ لی۔ سرغنہ اپنا منہ پکڑے ہوئے تھا اور بات کرنا بھی اُس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ اُس نے ہذیانی انداز میں راہ داری سے باہر دالان جانے والے راستے کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ گویا میرا قیاس درست تھا۔ وہ دونوں عمارت کے اندرونی حصّے میں مامور کیے گئے تھے اور تلاشی کے لیے نہیں نکلے تھے ورنہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے مانند اب تک کمرے میں آ جاتے۔ اب ہم راہ داری میں کُھل کے نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ بھٹل اور پیرو نے پھر بھی احتیاط کی، اُن کی نگاہیں ہر طرف منڈلا رہی تھیں۔ وہ چال میں بھی محتاط تھے۔ سرغنہ کے بارے میں ابھی شُبہ کیا جا سکتا تھا کہ اُس نے کوئی فریب تو نہیں کیا، گو وہ اس کے نتائج سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو گا۔ راہ داری کے اختتام پر دالان کی طرف جانے والا راستہ آگے جا کے مُڑ جاتا تھا۔ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ پیرو سرغنہ کی گُدّی پکڑے پکڑے اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ سرغنہ کے ساتھیوں پر کسی دیوانے لمحے کے غلبے کے آثار ظاہر نظر نہیں آتے تھے تاہم میں اور بھٹل اُن پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔

دالان میں داخل ہونے کے لیے محراب نما راستہ کھُلا ہوا تھا۔ یہ دروازہ اُنھوں نے کسی اور طرف سے اندر آ کے کھولا ہو گا یا ملازم ہی بند کرنا بھول گئے تھے۔ ممکن ہے، بند ہی نہ کیا جاتا ہو۔ بہر حال عمارت میں داخلے کے لیے ایک یہی راستہ نہیں تھا، پیچھے سے بھی راستے تھے اور [illegible] ہوئے مختلف کمروں کے دروازے بھی دالان میں [illegible] ات کو بیٹھک کے دروازے ہی سے دالان [illegible] ڈاکوؤں کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ عمارت میں گھُسنے کے بعد پہلے [illegible] واپسی کے لیے مختلف راستوں کی طرف سے اطمینان کر لیتے ہیں۔ راہ داری کا ہر راستہ سیدھا اور آسان تھا۔ اُنھوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اسے کھلا رکھا ہو گا۔ حویلی کے مختلف راستوں سے آگہی کے لیے، ہو سکتا ہے، اُنھوں نے کسی ملازم سے بھی مدد لی ہو سب سے پہلے ملازم ہی اُنھیں ٹکرائے ہوں گے یا اُنھوں نے سب سے پہلے انھی تک پہنچنے کی جستجو کی ہو گی۔ اندر کمرے میں ابّا جان کے قریب موجود ایک ملازم کا شکستہ حال بتا رہا تھا کہ سب سے زیادہ وہی اُن کے جبر کا ہدف رہا ہے۔ اب تک اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

پیرو محرابی دروازے سے باہر نہیں نکلا، اندر ہی ایک قدم پیچھے رُک گیا۔ اُس طرف روشنی بھی چھپلی چھپلی پڑ رہی تھی لیکن باہر دالان میں روشنی کم نہیں تھی۔ پیرو نے بڑبڑاتے ہونٹوں سے سرغنہ کو کوئی حکم دیا تھا۔ یقیناً اُن لوگوں نے واپسی کے وقت ایک دوسرے کو جمع کرنے یا کسی ہنگامی ضرورت کے وقت اُنھیں انتباہ کرنے کے لیے کچھ اشارے ضرور تجویز کیے ہوں گے۔ پیرو نے یہی کہا ہو گا۔ سرغنہ نے پھر تذبذب کیا، پیرو نے اُس کی گُدّی پر چٹکی کی گرفت اور سخت کر دی۔ سرغنہ کھڑے کھڑے پیر پٹخنے لگا۔ دالان کے سکوت میں اُس کی کراہوں سے ارتعاش سا ہو گیا تھا۔ باہر سے کسی کے اِدھر اُدھر لپکنے کی آہٹیں سنائی دیں۔ یہ کراہیں سن کے ارد گرد موجود آدمیوں کو بے چین ہو جانا چاہیے تھا۔ گمان تھا کہ تجسّس میں وہ اچانک سامنے بھی آ سکتے ہیں مگر وہ نہیں آئے۔ پیرو دوبارہ سرغنہ کو اذیت میں مبتلا کر سکتا تھا۔ پیرو یہی کچھ سوچ رہا ہو گا کہ دفعتہً سرغنہ کے دو ساتھیوں میں سے ایک نے سنسناتی ہوئی آواز میں پکارا "خیری خیری جمع!" جواب میں چاپیں ہم سے کچھ اور قریب ہو گئیں۔ وہ کوئی ایک ہی آدمی ہو سکتا تھا۔ آواز کی سمت کے تعین میں اُسے کوئی اُلجھن پیش نہیں آنی چاہیے تھی اور اب یقیناً اُسے راہ داری کے محرابی دروازے کا جائزہ ضرور لینا چاہیے تھا۔ یہی ہوا۔ میں اور بھٹل پیرو سے چند قدم کے

فاصلے پر پہلے ہی اندھیرے کی اوٹ میں ہو گئے تھے، دونوں ایک ساتھ کیونکہ اندھیرا ایک ہی طرف تھا اور دوسری طرف کوئی آڑ نہیں تھی۔ وہ ایک ہی آدمی تھا۔ سب سے پہلے اُس کی نظر اپنے تینوں ساتھیوں پر پڑی جن کے چہرے کھلے ہوئے تھے اور بندوقیں ہاتھ میں نہیں تھیں۔ "اس سے بولو کہ یہ بندوق پھینک دے۔" پیرو نے سرد لہجے میں اُنھیں حکم دیا۔

آنے والے شخص نے بھی سُن لیا، اُس نے دہشت زدہ انداز میں اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ سرغنہ سر جھکا کے رہ گیا۔ اُس کے دونوں ساتھیوں نے بھی یہی کیا لیکن نووارد کے لیے اتنی جلد بندوق چھوڑ دینے کا فیصلہ دشوار تھا۔ وہ کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ "اس کو بولو کہ بس ایک کھٹکے کی دیری ہے۔" پیرو نے درشتی سے کہا۔ وہ شخص بندوق تاننے پیرو کا نشانہ لینے کے لیے پھڑکنے لگا۔ اُس کی یہ بوکھلاہٹ توقع کے مطابق تھی، فوری ردِ عمل کا یہ لمحہ گزرنے کے بعد اُس کی سمجھ میں آجانا چاہیے تھا کہ وہ نشانہ صرف اپنے ساتھیوں کا لے سکتا ہے اور یہ بھی کہ اُس کے ساتھی کس مشکل میں گرفتار ہیں مگر وہ کچھ دیر فہم معلوم ہوتا تھا یا اُس کی قوتِ ارادی مضبوط تھی۔ اُس نے پیرو کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ مَیں اور بھّل پیچھے ہونے کی وجہ سے اُس پر جھپٹ نہیں سکتے تھے۔ میں نے کمرے میں اُس کے ساتھیوں کی جیب سے برآمد ہونے والا چاقو پاس رکھ لیا تھا۔ مَیں اُس جگہ سے اُس کے پیروں یا ہاتھ کا نشانہ لے سکتا تھا مگر احتیاط لازم تھی ایسا نہ ہو کہ بدحواسی میں اُس سے بندوق چل جائے۔ ترچھے کھڑے ہونے کی وجہ سے نشانہ بھی بہت سنبھل کے لینا پڑتا۔ نشانہ چُوک بھی سکتا تھا کیونکہ اُسے قرار نہیں تھا۔ ہم کسی چُوک کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ہاں ایک اور تدبیر بھی تھی کہ میں اپنی جگہ کے بجائے پیرو اور اُن تینوں کی عین پشت پر تیزی سے آکے نشانہ لوں لیکن میں ٹھہرا رہا۔ کسی قسم کا شور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ باہر کی جانب تھا۔ شور سے عمارت کے اطراف بکھرے ہوئے اُن کے دوسرے مسلح ساتھیوں کے کان کھڑے ہو جاتے ورنہ پھر تمنچا چلانے میں کیا قباحت تھی۔ پیرو کسی لمحے بھی اُس پر تمنچے سے نشانہ لے سکتا تھا۔

پیرو نے ایک بار پھر اُسے حکم دیا، وہ اور پیچھے ہٹ گیا۔ اُس سے کچھ بعید نہ تھا کہ سامنے ہی سے ہٹ جائے یا اپنے باہر والے ساتھیوں کو مطلع کرنے کی نادانی کر بیٹھے یا کسی جانب بھاگ جانے کا سودا اُس کے دماغ میں سما جائے۔ اُس کا ایک ساتھی نہیں، تین ساتھی ہتھیار کے بغیر بے بسی کی حالت میں سامنے کھڑے تھے اور وہ دیر کر رہا تھا۔ پیرو کو اُس کی مخبوط الحواسی کا احساس ہو گیا تھا۔ اُس نے سرغنہ کے ٹخنے پر ایڑی ماری، اُدھر اُس نے اُس کی گدّی پر پہلے ہی چٹکی جما رکھی تھی۔ سرغنہ بلبلا پڑا۔ پیرو کو جلد ہی کچھ کرنا تھا۔ سرغنہ کو مزید شور مچانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ سامنے کھڑے ہوئے شخص کی آنکھیں پھٹی اور باہر نکل آئی تھیں۔ گویا اُسے اتنی دیر بعد صورتِ حال کا اندازہ ہوا تھا۔ سرغنہ اور اُس کے دونوں ساتھیوں کے چہرے ہمارے سامنے نہیں تھے۔ ہم نہیں دیکھ سکے کہ اُنھوں نے اُسے کیا اشارہ کیا تھا، اُن کی نگاہوں نے التجا ہی کی ہو گی جبھی اُس نے جھجکتے ہوئے بندوق اُن کے آگے پھینک دی۔ مَیں اور بھّل اسی موقع کے منتظر تھے۔ دونوں ساتھ ہی تیزی کے ساتھ اندھیرے کی اوٹ سے نکلے۔ مَیں نے جست لگا کے اُس کی بندوق اُٹھائی، بھّل نے اُس کا بازو دبوچ لیا۔ ہمیں نکلتا دیکھ کے وہ بے اختیار بھاگ کھڑا ہوا تھا لیکن دالان کی روشنی میں اُسے ہمارے ہاتھوں میں دبا ہوا تمنچا نظر آگیا ہو گا۔ وہ خود ٹھٹک گیا۔

"دوسرا کیدر ہے؟" پیرو نے ایک لحظے بھی توقف نہیں کیا۔ سرغنہ نے بھی تامّل نہیں کیا۔ اُس نے حویلی کی پشت کی جانب اشارہ کر دیا۔ اُدھر زنان خانے کا حصّہ تھا۔ ہمیں اندر راہ داری کا سارا راستہ عبور کرنا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ واپس ہوتے ہوئے راہ داری کا دروازہ بند کرتا جاؤں، بھّل نے توجّہ نہیں دی۔ ہم تیز قدموں سے اُنھیں ساتھ لیے راہ داری طے کرنے لگے۔ درمیان میں وہ کمرہ بھی پڑتا تھا۔ جہاں شامو، مارٹی، ابّا جان وغیرہ اور اُن کے باقی آدمی موجود تھے۔ کمرے کے کھمبوں کی آڑ میں جبرو اور زورا مستعد کھڑے تھے، بھّل نے اُن سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ شخص بھی ہمارے ساتھ ساتھ آرہا تھا جس پر ابھی قابو پایا گیا تھا۔ اس مرتبہ بھّل اور میں، پیرو اور اُن چاروں سے کچھ آگے نکل آئے۔ پیرو تنہا اُن کے پیچھے رہ گیا تھا۔ یہ کوئی مناسب بات نہیں تھی لیکن کوئی غلطی کرنے سے پہلے وہ اپنے آگے چند گز کی دوری پر ہماری موجودگی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

اس طرف بھی زنان خانے میں ویسا ہی دروازہ بنا ہوا تھا جیسا مردانے کے دالان میں کھلتا تھا۔ یہاں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ اندر اندھیرے کی اوٹ بھی دروازے سے کچھ دور تھی۔ ہم یہاں خود کو چھپاتے تو پیرو کو دروازے سے اور پیچھے ٹھیرنا پڑتا۔ پیرو نے پھر دروازے سے قریب ہونے کے لیے ہم سے آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہی کیفیت تھی جو دالان کے دوسرے سرے کے مردانے دروازے پر تھی۔ اس بار بھی سرغنہ کے ساتھیوں میں سے ایک نے اُسے پکارا۔ اب کے اُس نے صرف ایک آدمی کا نام

لیا تھا، جمّے کا۔ جمّا کہیں قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ فوراً نمودار ہو گیا۔ ابھی وہ دروازے کے سامنے نہیں آیا تھا، اُسے پکارتے وقت ہی بھّل نے ارادہ بدل دیا تھا۔ آخری لمحے میں ہم اندھیرے سے نکل کر اُن چاروں کے پیچھے آ گئے تھے۔ جمّا پر پہلے تو وہی حیرانی طاری ہوئی۔ اُس کے نظر آتے ہی پیرو نے سرغنہ سے کہا۔ "اس کو بولو کہ سارے پٹاخے، پالتو اپن کے پاس ہیں، ایدر اندر اب کچھ بھی نہیں رہا ہے۔" پیرو کو اپنا حکم دہرانے کی ضرورت نہیں پڑی، جمّا زیادہ زود حس، معاملہ فہم اور نظر کا تیز ثابت ہوا۔ ایک ہی نگاہ میں سارا معاملہ بھانپ گیا۔ آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے۔ کچھ یوں بھی اُسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوئی ہو گی کہ اُدھر دوسرے دالان میں تعینات اُس کا ساتھی خیری نامی شخص بھی اُن میں شامل تھا۔ اپنے ساتھیوں کے شانہ بشانہ اُس نے ہمارے چہرے بھی خوب دیکھ لیے تھے۔ ہم نے اپنے چہرے اُس سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کھٹکا دبانے کی آہٹ پر ہم اُس کے ساتھیوں کی دیواروں میں اوجھل ہو جائیں گے۔

صبح اور قریب ہو گئی تھی لیکن اندھیرا گہرا تھا۔ وہ سترہ کے سترہ وہاں موجود تھے۔ جبرو اور زورا اُن چاروں کو بھی یہاں لے آئے تھے جنھیں کانتے کمرے میں بند کر کے آیا تھا۔ اُن میں سے دو کی حالت نہایت ابتر تھی۔ بھوئیں خون میں ڈوبی ہوئی، کٹے پھٹے چہرے، کبھی شانے دباتے، کبھی پیٹ پکڑتے تھے۔ کانتے نے اُن کے سروں کو بھی زخمی کیا تھا۔ کانتے کو اُس وقت ہوش ہی کہاں ہو گا کہ وہ اُن پر ضربیں لگانے میں احتیاط برتتا۔ اُسے جیسے ہی موقع ملا ہو گا، اُس نے اندھا دُھند اُن پر بندوق گھمائی ہو گی یہی ایک لاٹھی اُس کے پاس تھی۔

بھّل، پیرو، شامو، مارٹی اُن کے مقابل چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ جبرو اور زورا کو بھّل نے راہ داری میں واپس بھیج دیا تھا۔ اُس طرف سے ابھی چوکنا ہی رہنا چاہیے تھا۔ اندر کمرے میں سب کی نظریں بھّل اور پیرو پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں خاموش کھڑے رہے، ہمارے پیچھے بیٹھے ہوئے ابّا جان اور نیر علی بھی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کانتے بھی اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمرے میں موت کا سا سکوت چھا گیا تھا۔ اُنھوں نے بھی اپنی کراہیں سینوں میں گھونٹ لی تھیں۔ سب بتوں کے مانند منجمد کھڑے تھے۔ دیر ہو گئی تو پیرو نے سنجیدہ آواز میں بھّل کو ٹوکا۔ "ابھی اِن کا کیا بنائے گا بھّل بھائی؟"

بھّل نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ "ہاں دادا!" بھّل کی آواز بھی جل رہی تھی۔ "ابھی اِنھی سے پوچھو، یہ حرام کے تخم کیا بولتے ہیں؟"

"یہ سالا ابھی کیا بولے گا بھّل بھائی! اِدھر باہر مٹی زیادہ سخت نہیں ہے۔ بولے تو اپن ابھی اِن کا ایک ساتھ قبر بنا دے۔ سویرا ہونے سے پہلے اپن سب کو ایدر علاقے کے گھورے پہ بھی پھینک کے آسکتا ہے۔"

"اُستاد ٹھیک بولتے ہیں دادا!" شامو سے خاموش نہ رہا گیا۔ وہ غصّے سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی اِنھی سے پوچھو دادا! بعد میں اِن سور کے بچّوں کو کوئی شکایت نہ ہو۔"

"شکایت بولنے کو ابھی یہ رہے گا کیدر۔"

"اِس نے بابا پر ہاتھ اٹھایا تھا دادا! اپن کو حکم کرو تو ابھی اس کا دونوں ہاتھ کاٹ دے؟" مارٹی تلملاتے لہجے میں بولا۔ بھّل سنتا رہا اور اُس نے سرغنہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ "کیا نام ہے رے تیرا؟" سرغنہ پلکیں پٹ پٹا کے رہ گیا۔ بھّل نے اُس کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا، بوجھل آواز میں بولا۔ "جانے دے، نام تو تُو نے خود نہیں رکھا ہو گا۔"

"معاف کر دو نواب صاحب!" اُن میں سے کنارے پہ کھڑا ہوا ایک آدمی گڑگڑایا۔ "ہم کو معافی دے دو، بڑی غلطی ہو گئی ہے حضور نواب!"

"اپن کو ابھی نواب بولتا ہے بھّل بھائی!" پیرو زہرخند سے بولا۔ "سالا کیسا مداری ہے، ابھی معافی کو بولتا ہے۔"

"آپ لوگاں کو خدا کا واسطہ۔" ایک دوسرا آدمی عاجزی سے بولا۔

"اب خدا کو بیچ میں لاتا ہے۔" پیرو نے پھنکارتی آواز میں کہا۔ "معاف کر کے تم کو جانے دے، یہی بولتا ہے نا تم؟"

وہ شخص ہیجانی انداز میں سر ہلانے لگا۔

"تلاشی لے لیا ہے پورا تم نے؟"

"ہم کو معلوم ہو گیا ہے، یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔ "اب ہم کو کچھ نہیں چاہیے سرکار!"

"ابھی کیدر سے آیا تھا تم؟" پیرو نے اُس سے پوچھا۔

"کہیں سے بھی نہیں، ہم خود آئے تھے سرکار!" وہ ہاتھ جوڑ کے گھگھیایا۔ "ہم بالکل اندھے ہو گئے تھے۔"

"اور ابھی تم کیا سمجھتا ہے، اپن کو ابھی بھی تم اندھا ہی لگتا ہے۔ ابھی تمھارا آنکھ نکال کے باہر کرے گا تو سالا تم کو ایک

دم پورا دکھائی دے گا۔"

"ہم قسم کھاتے ہیں، ہم کو کسی نے نہیں بھیجا تھا۔"

"پھر بھیڑیے کا جان کاری سیدھا اوپر سے ہوا تھا تم کو.....! ایسا ہی نا؟" پیرو نے دہاڑتے ہوئے پوچھا۔ "اُلّو کا پٹھا، سالا، گرگٹ کا..... پیرو سے خود کو روکا نہیں گیا۔ وہ مغلظات سنانے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں ٹپک رہی تھیں تجمّل کو کسی طرح اُس کے ہاتھ سے تمنچا لے لینا چاہیے تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اگر اُن میں سے کسی نے پھر کوئی چبلاپن کیا تو پیرو کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

"اپنے کو ایسی جلدی نہیں ہے دادا!" تجمّل کے چہرے پر بھی آگ بھڑک رہی تھی۔ پیشانی سکڑی ہوئی، نتھنے پھولے ہوئے تاہم اُس نے ہاتھ اٹھا کے پیرو کو روکا اور دھیمے لہجے میں اُس سے کہنے کی کوشش کی: "یہ بے سینگے نام تو کوئی بھی بول سکتے ہیں پر اپنے کو جان کے کیا کرنا ہے۔ ابھی سامنے اپنے یہی جھٹکے کے لیے آئے ہیں کسی راجے نواب کے تھوکے۔ اپنے کو پہلے انھی کو دیکھنا ہے۔ پیچھے والے اپنے پالتوؤں کو کھوجنے ادھر ضرور پلٹیں گے۔ گندا خون ویسے زور نہیں مارتا۔ پر بھیڑیے بھی تو اُن کے پاس نہیں پہنچے۔ اُس کے لیے اُن کو اِس طرف آنا چاہیے۔ اُن لوگوں سے تب بات کریں گے۔ ابھی پہلے ان کا بولو دادا!"

"کیا بولے تجمّل بھائی!" پیرو ادراکھڑ گیا۔ بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی ہو سکے تو انھیں ایدر کمرے سے نکل جانے کا حکم کرو، اپن ان کو زیادہ دیری..... " پیرو کے حلق میں جیسے کوئی چیز اٹک گئی تھی۔ تجمّل کی طرف ایک نظر دیکھ کے وہ تلخی سے بولا "اپن ابھی زیادہ دیری نہیں ٹھیر سکتا۔"

"ہاں استاد! میرے دائیں طرف کھڑا ہوا شامو بھی بھرے لہجے میں بولا۔ "اپنے کو بس تھوڑی دیر کھلا چھوڑ دو، پھر جو من میں آئے کرنا۔"

"ہم..... ہم آپ لوگاں کو مارنے کا ارادہ نہیں کیے تھے۔" وہی شخص یکایک بلبلاتی آواز میں بولا جس نے سب سے پہلے زبان کھولی تھی۔ "ہم صرف بھیڑیے کے لیے آئے تھے۔ یہ ہتھیاراں، بندوقاں خالی دکھاوے کے لیے لائے تھے۔ ہم کسی کو مارنا نہیں چاہتے تھے ہم کبھی کسی کا جان نہیں لیے نواب حضور! ہم خونی لوگاں نہیں ہیں، ہماری بات کا یقین کرو، جھوٹ بولیں تو اولاد سے جائیں۔"

"اِن میں یہ سب سے بڑا کتا ہے استاد!" شامو بھنا کے بولا۔ "سنتے ہو تم، یہ حرامی اب کیا بولتا ہے۔ اپنے کو مار دیتے تو سالا کچھ چین آجاتا۔ سامنے بابا کی خواری دیکھنے کو تو نہ رہتے۔ یہ سور کا بچہ، اولاد کے لیے بولتا ہے۔ بابا پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے ان رنڈی کے جنوں میں سے کسی کو یہ دھیان نہیں آیا کہ وہ بھی ہم لوگ کے کوئی ہو سکتے ہیں۔" شامو کی آواز بھرّانے لگی۔

تجمّل نے پیرو کو نہ کوئی جواب دیا، نہ شامو کی دخل اندازی پر اُسے خاموشی کی تلقین کی۔ وہ ٹک کھڑا سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہا۔ شامو کی مداخلت اُسے اور اُلجھانے کے مترادف تھی۔ شامو اُس کی جگہ ہوتا تب اُسے کچھ اندازہ ہوتا کہ اُن کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا ایسا آسان نہیں ہے۔ صبح میں اب کچھ ہی دیر رہ گئی تھی۔ تجمّل کو اُن کے بارے میں فوراً کوئی حکم سنانا تھا مگر کیا حکم! وہی جو شامو کہہ رہا تھا یا جس کا اشارہ پیرو نے کیا تھا؟ خود اُس کا جی بھی انھی کی ہم نوائی کر رہا ہوگا مگر اس طرح کوئی فیصلہ کیسے کیا جا سکتا تھا۔ انھیں سخت سے سخت جسمانی اذیت بھی دی جا سکتی تھی۔ اُن سب کو انھی کے ہتھیاروں سے نیست و نابود بھی کیا جا سکتا تھا مگر کلیجے کی ٹھنڈک اور آیا جان پر کی گئی دست درازی کی تلافی یوں ممکن ہوتی تو تجمّل کو اتنی دیر نہ لگتی۔ آنے والی گھڑیوں کی ضمانت بھی کسی فیصلے سے مشروط ہونی چاہیے تھی۔ پیرو اور شامو کو اُسے یاد دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تجمّل بھی اِس کمرے میں موجود تھا اور اُس کی یادداشت اُن سے کمزور نہیں تھی۔ سرغنہ کے ہاتھ سے کھایا ہوا طمانچہ اُس کے گال میں اب تک کسک رہا ہوگا۔ اُن کے اس طرح بے بس ہو جانے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ سامنے بس وہی ہیں۔ تجمّل کو دیوار کے پیچھے بھی نگاہ رکھنی تھی۔ کوئی ایسا فیصلہ ہونا چاہیے تھا جو اُن کی واپسی کی جستجو میں دیوار کے پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں کو بھی قابلِ قبول ہو اور دیوار کے پیچھے سبزہ زار میں پھیلے ہوئے پانچ اور فصیل کے باہر تعینات اُن کے دو آدمی ہی نہیں تھے۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اُن ساتوں کے سامنے تو دو ہی راستے رہ جاتے۔ یا تو وہ اُلٹے قدموں بھاگ کھڑے ہوتے یا اپنے ساتھیوں کی تلاش میں عمارت کے اندر داخل ہونے کا ارادہ کرتے۔ وہاں راہ داری میں جبر دلور زوراُن کا انتظار کر رہے تھے۔ تجمّل کی نگاہ اُنھی سات پر نہیں ہوگی بلکہ اُن دوسروں پر بھی ہوگی جو نہ جانے کتنی دیواروں اور دروازوں کے پیچھے تھے۔

سرغنہ اور اُس کے ساتھی جیسے کسی عدالت میں فیصلہ سننے کے لیے مضطرب کھڑے تھے۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں لیکن اُن دو کے سوا کسی اور نے تجمّل سے عاجزی بھی نہیں [illegible]

ہو چکے تھے یا اُن کے خیال میں اُن کی خاموشی بجائے خود ندامت کا اظہار تھی۔ سرغنہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ کم از کم اُسے اپنے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن اُس کی حالت قطعاً اُس شخص جیسی نہیں تھی جو اپنا نوشتہ پڑھ چکا ہو اور کوئی دلیل، کوئی جواز اور سوچنے کے لیے کچھ بھی نہ رہ گیا۔ ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اور چارہ نہ ہونے کی صورت میں اُس کے اندر عزت، خودداری بے نیازی اور استغنا کا کوئی احساس بیدار ہو گیا ہے۔ اُس کی کیفیت اُس شخص سے مشابہ تھی جس پر کسی اچانک حادثے کے سبب سکتہ سا طاری ہو گیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر یہ سب میرے قیاس تھے، اُس کے دل و دماغ پر کسی بھی کیفیت کا غلبہ ہو سکتا ہے۔ وہ نہ اتنا پُرسکون تھا، نہ اپنے ساتھیوں کی نسبت اُس کے چہرے پر غیر معمولی ہیجان نظر آتا تھا۔ وہ مزید پتھر ہوتا جا رہا تھا۔

کافی دیر بعد تجمّل کے جسم میں جنبش ہوئی۔ اُس نے بھاری آواز میں پیرو کو مخاطب کیا۔ "دادا! اپنا خیال ہے کہ پولیس کو بلا لیا جائے۔"

مجھے اپنے کانوں پر دھوکا ہوا۔ "پولیس کو؟" پیرو نے چونک کے کہا۔

"ہاں پولیس کو!" تجمّل سپاٹ لہجے میں بولا۔ "ابھی وہی اِن سے ٹھیک طرح بات کرے گی۔"

"تم کیا بول رہا ہے تجمّل بھائی؟"

"دوسرے کے گھر میں ہے، ہتھیار، اوزار کے ساتھ، گنتی بھی اتنی ہے کہ دیکھ کے وردی والوں کے دیدے اُلٹ جائیں گے۔"

"پولیس بھی کس کا ہے تجمّل بھائی! انھی کوٹھی، حویلیوں والوں کا ہے سالا۔ اور اُن کے ہاتھ میں دے کے ابھی کون سا....." پیرو نے برہمی سے کہا اور عجیب نظروں سے تجمّل کا چہرہ دیکھنے لگا جیسے تجمّل نے کوئی بہت انوکھی بات کہہ دی ہو۔

"ابھی اتنا چوپٹ بھی نہیں ہوگا دادا! اپنے کو بھی شہر کے رستے تھوڑے بہت آتے ہیں۔ کون سا کدھر کو جاتا ہے۔ تھانا، کچہری، عدالت کی اِدھر بھی کمائی نہیں ہے۔ دروازوں پر اُن کے نام ایسے ہی کالے نہیں کیے گئے ہوں گے اور اِدھر نہیں تو اُدھر نیشن کے رستے میں بادشاہ سلامت کی چوکھٹ بھی پڑتی ہے۔" پیرو کو حیران و پریشان دیکھ کے اُس نے آہستگی سے کہا۔ "ذرا دھیان سے اپنی بات سنو دادا!"

"بہت بہت دھیان سے سُن رہا ہے تجمّل بھائی!" پیرو نے طنزیہ لہجے میں کہا اور تنک کے بولا۔ "پر لگتا ہے، تم ابھی ایک دم دھیان سے نہیں بول رہا ہے۔"

تجمّل کے لہجے میں بھی تندی آگئی۔ "بعد کو پولیس کو شکایت بھی ہو سکتی ہے دادا! اپنا کام یہیں ختم ہو جاتا ہے، آگے اب اُن کا شروع ہو رہا ہے۔ اپنے کو اُدھر زیادہ بولنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی اور ہم ایسے ہاتھ میں نہیں تھما دیں گے۔ رسید کرا کے دیں گے، پکی، ٹھپا لگی۔ اپنا خیال ہے، اُدھر ہی یہ زیادہ ٹھیک رہیں گے۔ ابھی وہی سب آگا پیچھا اِن سے پوچھ لیں گے۔ کون سے کھونٹے پر بندھے ہیں اور ڈوری کدھر تک جاتی ہے، کس کا رتب اِن میں زور کرتا ہے، شہر کے لوگوں میں بھی تو تھوڑا چرچا ہو کہ اِدھر بھیڑیے والے کدھر کو بستے ہیں اور کون ان کا سب سے بڑا گراہک ہے۔ اودھر حویلی تک بات اٹکی رہی تو کہانی سالی پوری نہیں ہوگی، سمجھ رہے ہو دادا؟"

"برابر سمجھ رہا ہے تجمّل بھائی!" پیرو نے بھن بھناتے ہوئے کہا کہ۔ "ابھی اپن کیا بولے، یہی تمھارا حکم ہے تو ٹھیک ہے۔ لگتا ہے، تم پولیس کو ایک دم بھول گیا ہے۔ ابھی اپن سے کچھ پوچھتا ہے تو۔"

پیرو نے نہایت درشت لہجے میں اُس سے کہا کہ یہ ہمارے مجرم ہیں، اِن سے ہمیں کو نمٹنا چاہیے۔ پولیس تو اپنی اکھاڑ پچھاڑ میں لگی رہے گی تھوڑی دیر چرچا ہوگا پھر سب بھول جائیں گے۔ پولیس برسوں لگا دے گی۔ پیرو نے انھیں پولیس کی تحویل میں دینے سے صاف انکار کر دیا۔

تجمّل نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر پولیس کے لیے یہ چشم دید شہادت بھی کم ہے اور پیرو کے خیال میں اِس کے باوجود پولیس حیل و حجت سے کام لے گی اور اِدھر اُدھر کے دباؤ میں آ جائے گی تو کیوں نہ وہ انھیں یہاں روک کے ابھی اسی وقت سیدھے کنگ کوٹھی کا رُخ کریں جہاں ریاست کا والی نظام سرکار رہتا ہے؟ وہیں جا کے زنجیر ہلائیں، پھر پولیس اپنا کام مستعدی سے انجام دے گی۔

"تم ضرور اپن سے ٹھٹھول کرتا ہے تجمّل بھائی!" پیرو نے چڑچڑاہٹ سے کہا۔ "تم کیسا بولتا ہے؟"

"اپنے کو ابھی یہی سمجھائی دیتا ہے دادا!"

"تو ایسا بولو، بولو کہ تمھارا یہی حکم ہے۔"

"ہاں دادا!" تجمّل نے زیرِ لب کہا۔ "اپنی یہی رائے ہے۔"

"پر اپن کا ایک دم نہیں ہے، اب بھی..... اب بھی تجمّل بھائی! اپن بولتا ہے۔" پیرو نے بھڑکتی آواز میں کہا کہ بہتر ہے تجمّل دوسرے کمرے میں جا کے کچھ دیر آرام کر لے۔ پھر شاید اُس کی سمجھ

میں آجائے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی، اُس نے کسی
جھجک کے بغیر ٹھل کی دماغی حالت پر شبہے کا اظہار کیا اور کہنے لگا
"اپن کے پاس ابھی ایسا فالتو ٹیم نہیں ہے کہ روز تھانے کچہری جا
کے سالا حاضری بھرے گا۔" پیرو تیکھے لہجے میں بولا۔ "اپن اِن کو ادر
ہی دیکھے گا۔"

مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں اُن کے درمیان اِس تکرار
سے کوئی گرہ نہ پڑ جائے۔ ہر چند کہ اِس کا امکان نہ ہونے کے برابر
تھا تاہم وہ دونوں ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ رہے تھے پیرو
کے لہجے میں ٹھل کے لیے ذرا بھی مروّت نہیں رہی تھی۔ میں نے
دخل دینے کا ارادہ کیا تھا مگر میں اُن سے کیا کہتا۔ دونوں ہی اپنی
جگہ کسی حد تک ٹھیک تھے۔

"ہم ہاتھاں جوڑ کے بولتے ہیں حضت! دوبارہ کبھی ایسا نہیں
ہوگا۔ ہم کو معاف کر دو سرکار!" ایک تیسرا آدمی گڑگڑا کے بولا۔
وہ سرغنہ کے برابر کھڑا تھا۔ سرغنہ نے اُسے پھیلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا
مگر چپ رہا۔ گویا بولنے والے کو اُس کی تائید حاصل تھی۔ وہ شخص
بکھرے ہوئے لہجے میں ماں باپ، خدا رسول کی قسمیں کھاتے اور
اپنے بال بچوں کا واسطہ دینے لگا اور بولا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہماری
غلامی میں آنے کو تیار ہیں۔ یہ اور اِسی قسم کی کئی بے سر و پا باتیں۔
اُسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کیا بک رہا ہے اور اُس کا
ہذیان کس حد تک ہم پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ بہرحال اِس سے یہ
ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ پولیس کے چکر میں پھنسنا اپنے لیے زیادہ مہلک
سمجھتے ہیں۔

ابھی وہ یہ واویلا کر ہی رہا تھا کہ پیرو نے جھپٹ کے اُس
کا گریبان پکڑ لیا۔ "حرام زادے! تم ابھی معافی کا رونا لگاتا ہے اپن
تم کو معاف کرے گا؟ اپن کو تم نے کیا سمجھا ہے؟ ایک دم اُتو کا
پٹھا؟" پیرو نے پھنکارتے ہوئے اُسے آگے کھینچ کے بے تحاشا
مارنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں میں پیرو نے اُس پر اتنی ضربیں
لگائیں کہ اُس کی چیخ پکار تک بند ہو گئی۔ کسی نے پیرو کو نہیں
روکا۔ ٹھل بھی خاموش کھڑا رہا۔ غصے میں پیرو کے منہ سے کف
جاری ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں اُس کے ذہن میں کیا تھا۔ سویرا ہونے
ہی والا تھا اور صرف ایک نہیں، سترہ آدمی سامنے تھے۔ پیرو ایک
ہی سے اُلجھا ہوا تھا۔ "لیکن ان سب کو ابھی ادر ہی نمٹے گا اور
اُکھا دفن نہیں کریں گا۔" مارتے مارتے وہ ہانپنے لگا تھا۔

"دادا! دادا!" پیرو کا ہاتھ نہیں رُکا تھا۔ شامو نے سراسیمہ
آواز میں اُسے ٹوکا۔ "ٹھہر جاؤ دادا! اپنے کو استاد کا بات بھی
ٹھیک لگتا ہے۔ پولیس میں ان کا تختہ ہو جائے گا۔ اوپر سے
رسّی کھنچے گی تو پولیس سالی ـــ"

پیرو پر دیوانگی طاری تھی۔ وہ شامو پر بگڑنے لگا۔ اُس
نے شامو کو بھی گالی دی اور بولا کہ اگر اُس نے اپنی زبان بند نہ
کی تو وہ اُسے بھی اُن لوگوں کے ساتھ کھڑا کر دے گا۔ "ادھر بابا
بھی موجود ہیں۔" شامو نے اٹکتی زبان سے کہنے کی کوشش کی
"استاد کی بات تم کو نہیں جچتی تو ابھی بابا سے ہی پوچھ لو۔"

پیرو کا ہاتھ رک گیا۔ اُس نے پلٹ کے مضطرب نظروں
سے ابّا جان کو دیکھا اور بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا
"ہاں بابا! ابھی تمھی بولو، اصلی مجرم یہ تمھارے کا ہی ہے۔"

ابّا جان گنگ کھڑے رہے۔ پیرو نے پھر تپتی آواز میں
پوچھا۔ "کیا ان کٹ کھنوں کو پولیس کے حوالے کر دے؟ تم ان کا
ایسا جانے دے گا!" ابّا جان کے تذبذب پر اُس نے تیز و تند لہجے
میں اُنھیں اطمینان دلایا کہ اگر اُن کی مرضی بھی یہی ہے تو وہ سامنے
سے ہٹ جائے گا

ابّا جان کی دہشت زدہ نظریں ٹھل پر منڈلانے لگیں۔ ٹھل
نے جواب میں انھیں کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ ابّا جان کے ہونٹ پھڑپھڑا
رہے، وہ کچھ کہہ نہ سکے۔ میر علی اُن سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے انھوں
نے ابّا جان کے پاس آ کے اور اُن کی کمر پر ہاتھ رکھ کے سرگوشی
کے انداز میں کوئی آیت پڑھی۔ ابّا جان کے شکستہ جسم میں ایک
ثانیے کے لیے لہر سی اُٹھی، مگر دوسرے ہی لمحے وہ اور نڈھال اور
شکست خوردہ نظر آنے لگے۔ ٹھل کے سوا سب کی نگاہیں اُنھی پر
جمی ہوئی تھیں۔ یکایک میر علی دبی آواز میں بولے۔ "ممکن ہو تو
انھیں معاف کر دو پیرو بھائی!"

پیرو اُن کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ "تم..... تم کیا بولتا ہے بڑے
صاحب!" وہ ہکلایا پھر بگڑے ہوئے منہ سے کہنے لگا۔ "اپن ابھی
بابا سے پوچھتا ہے۔" ابّا جان بے سدھ کھڑے رہے۔ پیرو نے چلّا کے
آواز میں اُن سے دوبارہ پوچھا۔ ابّا جان پر کئی رنگ آ کے گزر گئے
اُنھوں نے سر جھکا کے بمشکل اتنا کہا۔ "ہاں بھائی! شاید یہی مناسب
ہے۔" اُن کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔

●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات
چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیے